برطانیہ میں اردو

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

برطانیہ میں اردو ایڈیشن

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
جی ایچ کیو آرمی ایجوکیشن اور ایر ہیڈ کوارٹر سے منظور شدہ

جاری شدہ ـــــــ ۱۹۴۵ء
ٹیلیفون نمبر ـــــــ ۲۱۴۰۷۹

افکار

برطانیہ میں اردو ایڈیشن

مدیر
صہبا لکھنوی

قیمت ساٹھ روپے

بیرونی ملکوں سے: ۴ پونڈ - ۱۶ ڈالر

پاکستان میں زرِ سالانہ رجسٹری سے: ۲۴ روپے

مکتبہ افکار رابسن روڈ کراچی

بریڈفورڈ آفس
۲۴- پارک ہل ڈرائیو۔ بریڈفورڈ (یارکس۔ انگلینڈ)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

برطانیہ میں اردو ایڈیشن

اِنتساب

پاکستان سوسائٹی بریڈفورڈ

اور

تمام اردو دوستوں کے نام

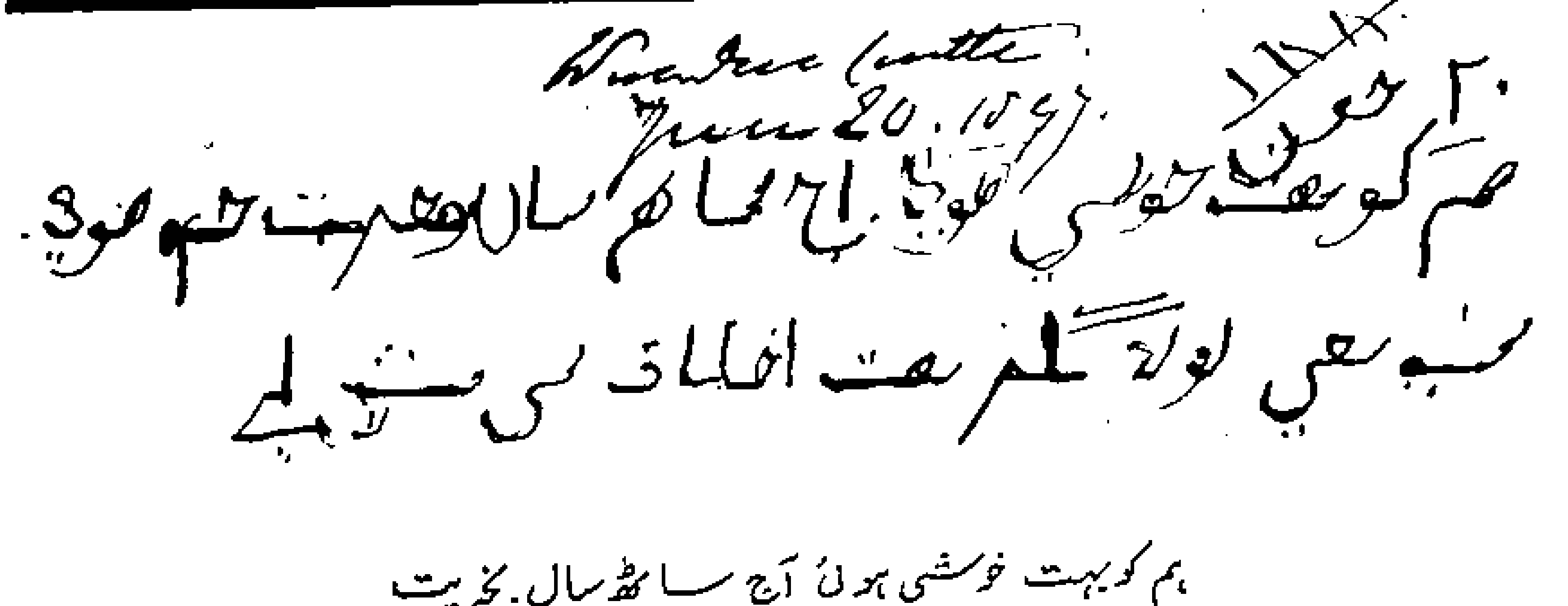

ہم کو بہت خوشی ہوئی آج ساٹھ سال بخیریت
ختم ہوئے۔ سب بچے اور دیگر بہت اخلاق سے پیش آئے

(ملکہ وکٹوریہ کی اردو تحریر کا عکس۔ ڈائری کا ایک ورق)

www.taemeernews.com

فہرست

سرورق : آذر زوبی

صہبا لکھنوی	۱۳	اشاریہ

نادر و نایاب
۱۵

مولوی عبدالحق	۱۶	اردو نثر کے ارتقا میں انگریزوں کا حصہ
ڈاکٹر عبادت بریلوی	۳۳	سیاحت نامہ
مظفر عباس	۵۲	اردو کا پہلا سفرنامہ
ڈاکٹر عبدالحلیم ناصی	۵۸	شیکسپیئر کے اردو ترجمے

تصویروں میں

انگریز مستشرقین	۶۵	انگلستان اور پاک و ہند کے اہلِ قلم

انگریزوں کے قائم کردہ ادارے
۸۱

ضمیر نیازی	۸۲	فورٹ ولیم کالج
ریاض صدیقی	۱۰۱	دہلی کالج
ڈاکٹر معین الدین عقیل	۱۱۸	ایشیاٹک سوسائٹی بنگال
عتیق احمد	۱۴۰	برطانوی عہد کی اردو انجمنیں

لسانیات
۱۵۷

پروفیسر ایس کے حسینی	۱۵۸	اردو لغت نویسی اور اہلِ انگلستان
عبدالقادر سروری	۱۶۴	انگریزی میں اردو الفاظ

www.taemeernews.com

سید شبیر علی کاظمی — ۱۷۳ — اردو زبان کا انگریزی زبان پر اثر

تحقیق، تنقید

۱۸۱

عبدالماجد دریابادی — ۱۸۲ — اردو کے چند انگریز شاعر
شانتی رنجن بھٹاچاریہ — ۱۸۶ — بنگال کے انگریز مصنفین اردو
ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۱۹۶ — انگلستان، اردو اور تعلیم و تحقیق
افسر صدیقی — ۲۰۱ — چند اکابر اردو — برطانیہ میں
ڈاکٹر آغا افتخار حسین — ۲۱۴ — برطانیہ میں اردو
ڈاکٹر فرمان فتحپوری — ۲۱۸ — برطانوی حکومت اور اردو دشمنی
شفقت رضوی — ۲۳۵ — مستشرقین کی اردو خدمات
محمد علی صدیقی — ۲۴۹ — اینگلو انڈین ادب کا فکری پس منظر
ڈاکٹر شمیم حنفی — ۲۶۱ — مشرق و مغرب کا ادبی سنگم

مطالعہ، مشاہدہ

۲۶۹

سید ہاشم رضا — ۲۷۰ — قیام انگلستان کی یادیں
ابن انشا — ۲۷۶ — تاریخ انگلستان جدید
مختار زمن — ۲۸۱ — انگلستان میں پاکستان

علاقائی ادب
اور
برطانوی اہل قلم

۲۹۷

پروفیسر شریف کنجاھی — ۲۹۸ — پنجابی ادب اور برطانوی اہل قلم
فارغ بخاری — ۳۰۱ — پشتو ادب اور برطانوی اہل قلم
ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی — ۳۱۰ — سندھی ادب اور برطانوی اہل قلم
کامل القادری — ۳۲۵ — بلوچی و براہوی ادب اور برطانوی اہل قلم
ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری — ۳۴۱ — کشمیری ادب اور برطانوی اہل قلم

www.taemeernews.com

کتب خانے، مخطوطات — ۳۵۳

مسعود حسین	۳۵۴	برٹش میوزیم لائبریری
ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو	۳۵۸	مانچسٹر کے بعض مخطوطات
جے۔ ایف۔ بلوم ھارٹ سلیم الدین قریشی افسر صدیقی	۳۶۱	فہرست مخطوطات اردو

انگلستان میں مقیم اردو کے اہل قلم — ۴۲۱

رالف رسل	۴۲۲	انگریزوں کی اردو دوستی
محمود ھاشمی	۴۳۱	ہم یہاں کیسے پہنچے ؟
غلام قادر آزاد	۴۴۸	انگلستان میں جشن ندیم و افکار
ڈاکٹر سعید اختر درّانی	۴۵۳	برطانیہ کے شب و روز
سلطان محمود	۴۶۳	برطانیہ میں اردو صحافت کا ارتقا
محسن جیلانی	۴۶۹	اردو کا ایک انگریز پرستار
قیصر تمکین	۴۷۵	ہمارے دادا میاں مرحوم
مقصود الٰہی شیخ	۴۸۰	توڑ دو دیواریں
ش۔ صغیر ادیب	۴۸۵	کتّا، بھوک اور گالی
محسن شمسی	۴۹۲	گیت
بلدیو سنگھ	۴۹۵	دس پونڈ کا نوٹ
پروین مرزا	۴۹۸	مٹّی کی گود
چاند کرن	۵۰۳	زندگی کے اس موڑ پر

شاعری — ۵۰۹

سحر انصاری۔ صہبا لکھنوی	۵۱۰	سخن ناگفتہ
ن۔ م۔ راشد	۵۱۱	نیا آدمی

www.taemeernews.com

ابن انشا	۵۱۳	جب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اکبر حیدرآبادی	۵۱۵	مہارتھ اور بوڑھا برگد
جاوید قمر	۵۱۶	نام اور آدمی
موج فرازی	۵۱۷	نذر خسرو
میر بشیر	۵۱۹	ڈولتی ناؤ
ساقی فاروقی	۵۲۰	سائے کا سفر
بشیر کوثر	۵۲۱	سوچ
ڈاکٹر ضیا الحسن قادری	۵۲۲	نسیم و جواہر کے رشتے
ڈاکٹر سعید اختر درانی	۵۲۳	نشاطِ زندگی
سوھن راھی	۵۲۴	گیت
بخش لائلپوری	۵۲۵	ناگن
ڈاکٹر مصطفےٰ کریم	۵۲۶	دو مختصر نظمیں
باقر انجم	۵۲۷	اندھیرے کا مسافر
حسین مشیر علوی	۵۲۸	جنس کا سد
ڈاکٹر صفی حسن	۵۲۹	رد سیاہی
صدیق نکار	۵۳۰	ایک نظم
حکیم غلام نبی	۵۳۱	بدمعاش
منیر احمد	۵۳۲	لندن نامہ
ابن انشا	۵۳۳	آخری نامکمل غزل
نسیم شمائلپوری	۵۳۴	آخری غزل
شعرائے انگلستان	۵۳۹	انتخاب کلام
محمد احمد سبزواری	۵۵۳	حرف آخر

مختصر ادبی خبریں

شہزاد منظر	۵۶۵	آئینۂ برطانیہ
ادارہ	۵۷۹	ہمارے مشتہرین اور کشمیری ادارے

سال اشاعت : ۳۷ —— اپریل ۱۹۸۱ء —— شمارہ : ۱۳۳

www.taemeernews.com

اشاریہ

برطانیہ میں اردو کا پس منظر

[اکتوبر] ۱۹۷۵ء کی بات ہے ــــ

افکار کے دیرینہ رفیق مقصود الٰہی شیخ جو عرصۂ دراز سے بریڈفورڈ میں رس بس گئے ہیں ایک ماہ کے لیے اپنے وطن پاکستان آئے اور ایک ہفتہ اپنے افراد خاندان کے ساتھ میرے مہمان رہے۔ دوران قیام کراچی شیخ صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ایک بار مجھے انگلستان کا دورہ کرنا چاہیے تاکہ برطانیہ میں مقیم اردو دوستوں سے ذاتی ربط و تعلق پیدا ہو جائے اور افکار کا حلقہ وسیع ہو سکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا ــــ

میں نے ان کی اس مخلصانہ پیشکش کو اصولی طور پر منظور کر لیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں خالی ہاتھ انگلستان نہیں آؤں گا بلکہ پہلے "برطانیہ میں اردو" کے عنوان سے خاص اشاعت کے پروگرام کو مکمل کروں گا اور اس کے بعد انگلستان کا قصد کروں گا ــــ شیخ صاحب اور میں نے رات کے دو بجے تک مجوزہ خاکے پر تبادلۂ خیالات کیا۔ شیخ صاحب نے انگلستان کے اہلِ قلم کی نظم و نثر کی تخلیقات فراہم کرنے کا ذمہ لیا اور میں نے برصغیر میں انگریز مستشرقین کی ہمہ گیر علمی و ادبی خدمات کے سیر حاصل جائزے کو یکجا کر کے خاص اشاعت کی صورت میں مرتب کرنے کا وعدہ کیا اور کام کی ابتدا کر دی۔ اور طے شدہ پروگرام کے تحت "افکار" میں ــــ "برطانیہ میں اردو ــ ایڈیشن" کا اعلان کر دیا ــــ

شیخ صاحب نے پاکستان سے واپس جانے کے بعد انگلستان کے اہلِ قلم کو اس خاص اشاعت کے بارے میں بذریعہ خطوط مطلع کیا اور تعاون کی درخواست کی پھر یاددہانیوں کا سلسلہ شروع کیا اور جب خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو انھوں نے متعلقہ حضرات کو بذریعہ تار بھی توجہ دلائی۔ اسی سعی و کوشش میں ۱۹۷۶ء ختم ہو گیا اور حسب توقع انگلستان کے اہلِ قلم حضرات نے اس خاص اشاعت کے لیے مطلوبہ تخلیقات ارسال نہیں کیں البتہ تھوڑا بہت مواد شیخ صاحب نے جمع کر کے مجھے ارسال کر دیا لیکن جس وسیع پیمانے پر ہم برطانیہ میں اردو ـ ایڈیشن کو انگلستان کے تمام اردو دوستوں کی تخلیقات اور انگلستان کے ادبی مسائل کے سیر حاصل جائزے پر مشتمل صورت میں پیش کرنے کے آرزومند تھے اس کی تکمیل نہ ہو سکی اور شیخ صاحب شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھے لیکن میرے لیے اس اعلان کو واپس لینے یا اس خاص اشاعت کو شایع نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اول تو میں شیخ صاحب سے وعدہ کر چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں میں نے انگریز مستشرقین اور ان کے قایم کردہ اداروں سے متعلق مضامین تیار کرا لیے تھے۔ چنانچہ میں نے شیخ صاحب کو بغیر کسی تردد کے لکھ دیا کہ آپ فکرمند نہ ہوں۔ دیر سویر میں ان ادیب اور شاعروں سے براہ راست رابطہ پیدا کر کے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر لوں گا اور اس خاص اشاعت کو ضرور شایع کروں گا ــــ

اور اب چار سال کی مسلسل سعی و کاوش کے بعد "برطانیہ میں اردو ایڈیشن" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس کا فیصلہ تو ناقدین، مبصرین اور قارئین کریں گے۔ میں صرف اتنا ہی عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ اگر مقصود الٰہی شیخ ـ پاکستان نہ آتے ـ مجھے میزبانی کا شرف نہ بخشتے اور برطانیہ میں اردو ایسے صبر آزما اور تقریباً ناممکن العمل موضوع پر میرے مرتبہ خاکے کو پسند کر کے میرا حوصلہ نہ بڑھاتے تو اس یادگار اور دستاویزی خاص اشاعت کی نوبت آتی۔

مقصود الٰہی شیخ نے بریڈفورڈ میں افکار کا دیا روشن کیا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں افکار کے مثالی "جوبلی نمبر" کی خصوصی تقریب پاکستان سوسائٹی بریڈفورڈ کے زیر اہتمام منعقد کی جس میں بریڈفورڈ کے لارڈ میئر سنگلٹن نے اس حقیر کو اعزازی سند عطا فرمائی جسے راقم اور افکار کی جانب سے ہمدم دیرینہ مختار زمن نے جو ان دنوں بی بی سی سے وابستہ تھے ـ بریڈفورڈ جا کر بنفس نفیس وصول کی اور مجھے ارسال کر دی۔ اس اعزازی سند کا عکس اور شاندار تقریب کی تفصیلات افکار کے "افسانہ ایڈیشن" جنوری ـ فروری ۱۹۷۱ء میں محفوظ ہیں ــــ

پھر جب افکار کا منفرد اور یادگار "ندیم نمبر" ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا تو شیخ صاحب نے حسب سابق پاکستان سوسائٹی بریڈفورڈ کے

www.taemeernews.com

تحت " جشنِ ندیم و افکار " منایا اور یوں مجھے اور افکار کو زیرِ بارِ احسان کیا۔ چنانچہ ناخن کے اس قرض کی ادائی کے لیے " انتساب " پر ضرور نظر ڈال لیجیے۔ یہ مجھ پر قرض تھا ___

رہ گئی " برطانیہ میں اردو ایڈیشن " کے مجموعی مواد کی بات تو اس کا فیصلہ آپ مواد کے مطالعے کے بعد ہی کر سکیں گے۔ مجھے تو اس ضمن میں اپنے اُن رفیقوں اور افکار دوستوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا ہے جو اس خاص اشاعت کی تیاری کے دوران ہمہ وقت عملی رفاقت، رہبری اور ہر ممکنہ تعاون کرتے رہے ___

انگلستان کے جن دوستوں نے اس کٹھن کام میں میرا ہاتھ بٹایا، مضامین، فہرست مخطوطات اردو، منظومات اور تصاویر وغیرہ فراہم کیں اُن میں مقصود الٰہی شیخ کے علاوہ، رالف رسل، سلیم قریشی، محمود ہاشمی، ڈاکٹر سعید اختر درانی، سلطان محمود، محسنہ جیلانی، منیر احمد، ورمو اور وج فرازی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں ___

اسی طرح کراچی میں ابتدا تا انتہا جن رفیقوں نے تعاون کیا اُن میں سرِ فہرست ضمیر نیازی ہیں۔ ان کے علاوہ افسر صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ریاض صدیقی اور شہزاد منظر کے علاوہ، وہ تمام اہلِ قلم بھی دلی شکریے کے مستحق ہیں جن کی نگارشات اس خصوصی اشاعت میں شامل ہیں ___

انوری بیگم دہلوی کا بھی ذکر ضروری ہے کہ اس ضخیم اشاعت کو اول تا آخر حسنِ کتابت سے آراستہ کیا ___

اس خاص اشاعت کے سلسلے میں میں نے جن کتب خانوں سے استفادہ کیا اُن میں انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، غالب لائبریری۔ اور جن ممتاز ادبی جرائد سے فیض اٹھایا اُن میں قومی زبان۔ کراچی۔ آجکل دہلی۔ نوائے اردو اور شاعر بمبئی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ___ برطانیہ میں اردو کے موضوع پر افکار نے کام کی ابتدا کر دی ہے۔ یقین کہ آنے والی نسل اس کام کو اور اس روایت کو آگے بڑھائے گی اس موضوع پر مزید کام کرنے کی ابھی بہت گنجایش ہے ___

فہرست مخطوطات اردو۔ نظرِ ثانی کے بعد شاید پہلی بار مکمل صورت میں افکار کو پیش کرنے کا فخر نصیب ہوا ہے۔ یہ فہرست تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمیشہ رہبری کرے گی ___

سرورق کی کہانی

ابن نشا مرحوم نے ملکہ وکٹوریہ اور اُن کے اردو کے استاد منشی عبدالکریم کی یادگار اور تاریخ ساز تصویر کی رہبری کی تھی۔ چنانچہ افکار کی جانب سے سلیم قریشی (لائبریرین انڈیا آفس لائبریری) نے رائل آرکائیوز لندن کو درخواست پیش کی کہ وہ اس تصویر کو " برطانیہ میں اردو " ایڈیشن کی زینت بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ آرکائیوز (مخطوطات) کے سربراہ نے ملکہ الزبتھ دوم کی خصوصی اجازت سے سرورق کی تصویر اور ملکہ وکٹوریہ کی اردو تحریر کا نمونہ ہمیں عطا کر دیا۔ ہم ملکہ الزبتھ دوم کی اس خصوصی اجازت کے لیے سراپا سپاس ہیں

اس سرورق کو پاکستان کے مایہ ناز آرٹسٹ زدبی نے جو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ کمال فنی مہارت سے مزین کیا ہے۔ میں اُن کی اس افکار و صہبا نوازی کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس سرورق میں تین رنگ ہی استعمال کیے گئے ہیں جو برطانوی پرچم میں ہیں۔ سرسید، اقبال اور عبدالحق، ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم اردو زبان و ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم کی یہ تاریخی تصویر ۱۸۹۵ء میں گارڈن کاٹیج۔ بالمورل میں کھینچی گئی تھی ___ افکار پاکستان کا پہلا ادبی ماہنامہ ہے جو اس تصویر کو سرورق پر شایع کر رہا ہے ___

___ ___ صہبا لکھنوی

www.taemeernews.com

برطانیہ میں اُردو ایڈیشن

مولوی عبدالحق

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مظفر عباس

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

نادر و نایاب

www.taemeernews.com

مولوی عبدالحق

اردو نثر کے ارتقا میں انگریزوں کا حصّہ

(مقدمہ بر تذکرۂ گلشنِ ہند)

"گلشنِ ہند" اردو شعرا کے تذکروں میں ایک اہم دستاویز ہے۔ جب مشہور انگریز گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے اشاعتی پروگرام میں اردو شعرا کے ایک مستند تذکرے کی اشاعت کا پروگرام بنایا تو اُن کی نظر علی ابراہیم خاں کے تذکرے "گلزار ابراہیم" بزبان فارسی پر پڑی جو شاہ عالم کی بادشاہت اور آصف الدولہ کی وزارت اور وارن ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی (۱۷۸۴ء) میں تالیف ہوا تھا۔ میرزا لطف علی نے اپنے تذکرے "گلشنِ ہند" کی بنیاد متذکرہ بالا فارسی تذکرے پر رکھی اور ۱۸۰۱ء میں دل نشیں اسلوب میں کئی قیمتی اضافوں کے ساتھ اسے سپردِ قلم کیا۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ تاریخی تذکرہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا اور مخطوطے کی شکل میں حیدرآباد دکن کے ایک کتب خانے کے نوادر میں شامل رہا تاآنکہ ۱۳۲۰ھ کے زبردست سیلاب نے جہاں حیدرآباد شہر کو تہ و بالا کیا وہاں پانی کے بہاؤ میں منجملہ دیگر دستاویزات یہ تذکرہ بھی ہاتھ لگا۔ پھر یہ ہوا کہ مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ مولوی غلام محمد نے اس تذکرے کی جانب علامہ شبلیؒ کی توجہ منعطف کرائی اور وہ اس مخطوطے کی بازیابی پر ششدر رہ گئے۔ بعد میں علامہ شبلیؒ ایسے ادیب شہیر نے اس تذکرے کی تصحیح و تحشیہ کا عالمانہ کام سرانجام دیا اور مولوی عبدالحق صاحب نے جو اُس زمانے میں مدرسۂ آصفیہ کے پرنسپل تھے۔ کتب خانۂ آصفیہ کے عبداللہ خاں کی فرمایش پر اس مخطوطے کا معرکہ آرا مقدمہ تحریر کیا اور یہ تذکرہ عبداللہ خاں نے حسن و اہتمام سے ۱۹۰۶ء میں شایع کیا۔

مولوی عبدالحق کا مقدمہ کئی لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اول تو اس لیے کہ ۱۹۰۶ء کے بعد یہ مقدمہ آج تک کہیں شایع نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مقدموں اور دیباچوں کی کتاب میں بھی شامل نہیں، جسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کیا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس مقدمے میں انھوں نے جان گلکرائسٹ کی ادبی خدمات کا فیاضانہ اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے :-

www.taemeernews.com

"حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اُسی وقت سے شروع ہوا اور ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا اُس سے زیادہ نہیں تو اُسی قدر احسان جان گلکرائسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔"

اسی مقدمے میں ایک اور مقام پر بابائے اردو ـــــ اُردو زبان کی ترقی میں مسلمانوں، ہندوؤں اور انگریزوں کی عرق ریزی کو یکساں طور پر اہم قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:ـــ

"ہندو اس کی (اردو کی) ماں ہیں، مسلمان اُس کے باوا ہیں اور انگریز اُس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اِس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قایم ہیں۔ کم از کم اُس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی۔"

افکار کو فخر ہے کہ وہ مولوی عبدالحق کے اس نادر و نایاب مقدمے کو جو ۱۹۳۰ء میں پہلی بار شایع ہوا تھا، تقریباً تین چوتھائی صدی کے بعد اس یادگار اشاعت میں پیش کر رہا ہے ـــــــــ صہبا

یہ کتاب شعرائے اُردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے، اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت[1] شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا، اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمایش کو، جو انھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا ـــ

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیرالممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد اور امیرالممالک لارڈ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کے زمانے میں، علی[2] ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا، اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔

---

[1] مولوی عبداللہ خان صاحب کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن ۱۲

[2] علی ابراہیم خاں متخلص بہ علی، مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بعہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے اور ۱۲۰۸ھ ہجری میں وہیں انتقال کیا۔ ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں:ـ

(۱) گلزار ابراہیم، تذکرہ شعرائے اُردو، جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی میں ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی ـــ

(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم، یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس ۱۲۰۱ھ ہجری میں لکھی گئی۔ اس میں ۱۱۷۱ھ سے ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی۔

(۴) ایک کتاب راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، مگر چونکہ اس کتاب

(باقی اگلے صفحہ پر)

کوئی بارہ برس کی محنت میں سنہ ۱۱۹۸ہجری مطابق سنہ ۱۷۸۴عیسوی میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرائسٹ کی نظر سے گزرا۔ انھوں نے مؤلف تذکرۂ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور اُن میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے —

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں زونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہلِ کمال اپنے وطن سے منہ موڑ اُسی طرف ہو لیے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے۔ قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو انھوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انھیں اپنی کوں منہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔ ع

"میں ہوں منہ سوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بے شک، لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لیے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی اور زوال اس لیے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لیے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا، ایک آدھ محاورہ آ گیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی۔ کبھی کبھار دو رتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا، رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں، اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیونکہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لیے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعرا کی محنت سے زبان صاف ہو گئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی، اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اردو کے استاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اُردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آ پڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لیے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اردو کو وسعت ہو تو کیوں کر؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خاں یکے از خیر خواہان کمپنی انگریز نام" لہٰذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے۔

(۵) خطوط۔ جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں، اور جس سے اُس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

www.taemeernews.com

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی، اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔ اس نے اُردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لیے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی۔ اس لیے انھوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قایم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کی تعلیم کے لیے اردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالبًا اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈر مل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی، اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے، اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان ولی نے اُردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرائسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔

چونکہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہٰذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں، یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے سنہ ۱۸۰۱ء عیسوی میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں انھوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا۔ مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرائشِ محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم، بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گلِ مغفرت یا وہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اُردو ترجمہ کیا ہے جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انھوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں پیش کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے۔ اور ایک اور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں۔

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ احمد شاہ درانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے، یہاں سے سنہ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۱-۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نو طرز مرصع رکھا تھا، میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں

www.taemeernews.com

لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے، ۱۸۰۳ء میں انھوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیارِ دانش کا ترجمہ اردو میں کیا، اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیان مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہجہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے، اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ ان کو میر حیدر علی حیران سے ہے، اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، مارکوئس ولزلی صاحب نے، مسٹر گلکرائسٹ کے مشورے سے، زبان دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چنانچہ لکھنؤ کے ریذیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپے خرچ راہ دیا، اور کلکتہ روانہ کیا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انھوں نے ایک قابل قدر کتاب آرائش محفل لکھی۔ جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سبحان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے، اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستان کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے اردو میں کیا۔

نہال چند نے ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاؤلی کو اردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انھوں نے ۱۸۰۱ء میں شکنتلا کا قصہ اردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں (۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انھوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستورِ ہند ہے، اور جو ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا، جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے، کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لال گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں، مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، ولطایف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لال اور جوان نے مل کر ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھو نل کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلکرائسٹ نے ۱۷۹۰ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے، اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ سے اول بھی ایک شخص فرگیوسن نامی نے اردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی، جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا،

www.taemeernews.com

جس کے انھوں نے تین حصے کیے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انھوں نے وہ الفاظ لیے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لیے انھیں نگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا، اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۸۱۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چونکہ ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے، اس لیے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے، اور ڈاکٹر گلکرائسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۸ء میں چھاپ دیا، مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف نشتر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ وکمانڈنٹ ملٹری اکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا، اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظرثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی۔ یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۸ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ براِئیس کی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اُردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کو ترقی دینے میں انھوں نے حتی الامکان کوشش کی۔

> میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:۔
> "جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زباں دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی چادر خواست حمالی ہے۔"

غالباً اس جگہ کے لیے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا چونکہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے، اس لیے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہلِ زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے، اور اُردو زبان میں ایک عجیب اور قابلِ قدر اضافہ ہوتا۔

www.taemeernews.com

نواب محبت خاں محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ذکر میں لکھا ہے کہ :۔

"انھوں نے نواب ممتاز یارالدولہ مسٹر جان سین کی فرمایش سے قصہ سسی پنوں کا اردو میں نظم کیا، اور نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمرالدین کے حال میں درج ہے کہ :۔

"انھوں نے میر محمد حسین۔ فرنگی لقب، کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جان سین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عمادالدولہ گورنر مسٹر ہشین (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی امانت سے پیش گاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب گیا۔"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی، سلسلۂ تعلیم کے لیے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد اصلاحیں کیں، اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں، ایک انجمن قایم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں۔ شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انھیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہال رائڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "اردو نثر کی طرح اردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر بل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اردو کی صدارت قبول فرما کر اردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اردو کتابیں بھی انھوں ہی نے چھپوائیں، اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں، اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں، وہیں چھپتی تھیں۔ اس کے بعد لیتھوگراف پریس سب سے پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا، اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی —

وہ انگریز حاکم، جس نے اس ملک میں بیٹھ کر جو اردو کا جنم بھوم اور وطن مالوف ہے، اسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا، اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب و غریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے، یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے، ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں، اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قایم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی۔

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے، دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے،

اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ اِدھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے۔

نام میرزا علی تخلص لطف تھا۔ ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، سنہ ۱۱۵۲ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد تشریف لائے، اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا مگر چونکہ مسٹر گلکرائسٹ[1] نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہٰذا میں نے اسے بہ دچشم قبول کیا۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"آج کے دن تک، کہ سنہ ۱۲۱۵ ہجری اور سنہ ۱۸۰۱ء کے ہیں، عہد سلطنت قایم ہے، اُسی بادشاہ روشن دل خدا پرست سے ......"

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمداں نے یہ تذکرہ لکھا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مؤلف نے سنہ ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا۔ اس کے مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سنہ ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی ؎

حیراں پھریں ہیں بے سر و پا بہمن اور دے
تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے
۱۲ — ۱۲۲۷ = سنہ ۱۲۱۵ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمائش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے کیونکہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انھوں نے اعظم الامرا، ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ سنہ ۱۷۹۵ء میں وزیر مقرر ہوئے اور مئی سنہ ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور سنہ ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ چونکہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے، یا اہل حیدرآباد سے، اس لیے انھوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، کہتے ہیں:

ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف، آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

---

[1] ڈاکٹر جان گلکرائسٹ ۱۲

www.taemeernews.com

جو قصیدہ انھوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فارغ بال اور خوش حال تھے، اور دکن میں جاکر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں :- ؎

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا
سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار

شکرِ خدا، کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر در پہ خوار و زار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون
لازم و گرنہ تھا بشریت کو اضطرار

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض
سو یہ ہے، اے امیرِ فلک قدر و کے تبار!

سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

خلقِ خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو رہے، کئی دن میں زباں پہ پھر
مثلِ مجردات فقط ان کا ہے شمار

تجویب ہو قدرداں نکات، اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیرِ پنجۂ چرخ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ سب بیک طرف
اور قدردانیاں بھی تری سب بہ یک کنار

ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا
اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار

از بس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے
بالفعل تو اضافے کا ہوں گا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام
کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشود کار

تضعیفِ اصل چاہتا ہے مجھ سے یہ ضعیف
کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار

تا لب ہے مجھ پہ شاق نہ ہوں میرے تین سو
چند سو جب اُمیّوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے، اور اب تک باقی ہے۔ اس قصیدے میں شاعر نے تعلی کی لی ہے، اور نادر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر ؎

اے شانِ حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

امیر الامرا نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے ؎

جز لفظِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات
ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار

آئین قدردانی میں لیکن برائے نام
لازم یہی ہے کر گیا جو خانِ باوقار

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے ؎

کہتی ہے فارسی میں مجھے طبع مطلعے — ہاں درجوابِ مطلع ناصر علی بیار
اے ذرّہ بازنامِ تو خورشید اعتبار — تاثیر اسمِ اعظم از اسم تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی رونا رویا ہے ؎

پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھ سے — کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ احتیاج کی رو سے — نہ ہوں محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بے خار میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں "

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں :۔

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے "

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں، اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل، قصیدہ، مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اردو زبان میں قابل یادگار رہے گا۔ چونکہ ایک انگریز بااقتدار کی فرمایش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافیے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اور بھی لکھے گئے ہیں، مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ حقیقت قابل قدر ہے۔

۱۔ اول تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان کو، اور نیز ان لوگوں کو جنھیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روز مرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں، اس تذکرے میں بھی جابجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :۔

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بھنا "کرکے" تھے۔

اسی طرح میر قمر الدین منت کے حال میں لکھا ہے :۔

"چنانچہ شکرستان 'کرکے' ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے "

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں۔ سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے ؎

ہے جیتے جی تو مجھے کوئی یار میں رونا — رہے گا مرگ کے 'بعد از' مزار میں رونا

www.taemeernews.com

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں۔ مثلاً فعل متعدی ہیں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے:-

دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرائے "

نقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:-

" بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے "

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قایم کہتے ہیں ؎

" میں کہا، عہد کیا کیا تھا رات،

ہنس کے کہنے لگا کہ ' یاد نہیں،

۲ - دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اردو زبان عروج پر تھی، اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے مؤلف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی، اور دوستی تھی، اور اس لیے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً: رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لیے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیونکہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو انھوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے:

" نا قدردانی سے اغنیا کی، اور نا بجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی کا اس درجہ کا سد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ فاسد، کہ میر شاعر، جو کہ سحرکاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اُس کی آج ہے "

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آب حیات میں لکھتے ہیں کہ:-

" جب میر صاحب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا، مگر چونکہ بد مزاج انتہا درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا، اور گھر بیٹھ رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی "

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ:-

" نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہے، وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا "

www.taemeernews.com

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے، یا یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں اُن کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلّی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا، اور ان کا ۱۱۷۳ھ ہجری میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے، اور اخیر میں کور نمک سنگ دل غلام قادر خاں رو ہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے، اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے، جس میں یہ واقعہ منظوم ہے اور خود اردو نظم میں ترجمہ کرکے متن میں درج کی ہے، اس لیے کہ تذکرہ اردو کا ہے اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہے، البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تانا شاہ، آصف الدولہ، اور مرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں خصوصًا میرزا محمد رضا امید کے تذکرے میں امیر الامرا حسین علی خاں اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کیے ہیں۔

۴۔ چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے، کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا، اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا انھیں اور کھو دیا۔ ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لیے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قوتی میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لیے بڑے بڑے اہتمام کیے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخنوروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی، کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے، اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے، جو شعرا کے لیے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لیے صرف کسی استاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت "شاعر گر" تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی ــــ

علاوہ اس عام حالت کے، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمنًا بیان کر دی ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا، اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہان دہلی اور ان کے گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے

www.taemeernews.com

نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کیے، خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ پرسے جاکر آداب بجالاتے تھے۔"

۵۔ پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کون کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے، اور ان کا تخلص اشتیاق تھا۔ یا عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آب حیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی، اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں۔"

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ، جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے۔ میر حسن کے حالات میں نقل کردیا ہے۔ ناظرین کو لکھنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

زبس کو فسے یہ شہر ہم عدد ہے
اگر شیعہ کہیے نیک اس کو بد ہے

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے۔ درحقیقت کلام سب اچھا ہے، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثر، کی مثنوی خواب و خیال اب تک سُنی ہی سُنی تھی، اس کے چند شعر اثر کے حالات میں درج ہیں۔ شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلہ ذیل نوٹ لکھا ہے [1] جو کتاب کے صفحہ ۳۲ پر درج ہے:۔

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہوسکتی، اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اُڑایا

[1] شمس العلما مولوی شبلی نے از راہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

www.taemeernews.com

تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنۂ دبیر و انیس میں انھیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے، اور سطح ہی پر رہتی ہے۔ مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشوونما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے، تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آ گیا ہے، اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شایق ہیں، تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا، اور وہ بت جنھیں وہ مدت سے پوجتے چلے آ رہے تھے، یکایک متزلزل ہو گئے، اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لیے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انھوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہہ دیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بے خار میں لکھتا ہے:۔

"مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است، وازیں جہت مرغوب عام۔"

مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں کہتے ہیں کہ:۔

"ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے، اور بہت اچھی لکھی ہے۔"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہے، اور یہ سب باتیں مثنوی کے لیے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے، کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہے، کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔ اور چونکہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے۔ اس لیے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً۔ جوشش کے کلام کو پسند

www.taemeernews.com

نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے، یعنی:۔

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا   کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا   (اثر)

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا   چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا   (شوق)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد نواب میرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے، کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں۔"

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی۔"

اخیر اس میں تو ظاہراً ایک حد تک کچھ گنجایش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولینا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا۔ جسے لالہ چک بست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں، اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لیے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لیے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے، صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں، جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے، مثلاً۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں۔"

حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" "خوب ہجو ملیح کی ہے" اور آخر میں یہ لکھا ہے:۔ "کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوئے ہیں اور نابکاروں کے نابکار۔ بقول شاعر کے" ؎

شیر کے بچے میں خرش شیر سے افزود ہے
بھونک میں کتے کی بلی کی سگی موجود ہے

یا مظہر جان جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"۱۱۹۴ سنہ ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسایل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینہ

www.taemeernews.com

زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا۔"

یا تانا شاہ کے حالات میں مولف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ:۔

"خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔"

مکہ مسجد کا کھدوانا بڑا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا۔ ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں، کہ مکہ مسجد موجود ہے، اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں، ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا بہیتی کی ہے، لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے:۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نا اہلوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ کا نہ پایا۔"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ:۔

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔"

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے۔ دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلائق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دھانی، کبھی سلاطین اسلام کا دار الخلافت، کبھی طغیانی کی بدولت بہہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا، کبھی معرکہ جنگ و جدل و قتل عام ہے اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے، کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے، اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے، کبھی مورد بلیات و آفات ہے، اور کبھی منزل حسنات و برکات، غرض یہ نگری یوں ہی اُجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی، مگر باوجود اس کے، اس کے حسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی۔ لیکن اخیر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔

سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا، کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا، اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا۔ اب تک جو کمال دلی میں پڑے وضع داری نباہ رہے تھے۔ ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے، جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں:۔

"جن ایام میں معمورہ شاہ جہاں آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے، اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث، اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صاحبزادہ گزیں نے

www.taemeernews.com

اور ہر ایک تونگر مال دار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمانِ استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے، اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہاں آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔"

ایسے وقت میں شاعر بے چارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضع داروں اور متوکلوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا۔ آصف الدولہ سا کہ لٹ نواب تھا، اہلِ کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اٹھا وہیں پہنچا اور پنج کر دہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے، اس کے بعد سودا تشریف لے گئے۔ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا۔

میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی، اور میر حسن، میر سوز، جرأت، سب لکھنؤ میں جا بسے، اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آ گئی، اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اُردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا اثر ہوا اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خاں کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوگی، اور کم سے کم اُس قصے کی تحقیق ہو جائے گی۔ جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ہجری میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے، یا اُسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیونکہ میرزا سلیمان شکوہ اسی سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے"۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے، اور آزاد نے کس سے سُنا۔ آبِ حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی، میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بعد کا ہے اس لیے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مؤلف نے اس دیباچے میں بیان کیا ہے:۔

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار، اور شعرائے صاحب وقار، کے حالات لکھے گئے ہیں، دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا۔"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھیں یا نہیں۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اُس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجے کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دیے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا، اور جو لوگ اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر عبادت بریلوی

سیاحت نامہ

(نواب کریم خاں کی غیر مطبوعہ ڈائری کے چند اوراق)

سیاحت نامہ نواب کریم خاں کی ڈائری ہے جو کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو دسمبر ۱۸۳۹ء میں ہندوستان سے لندن روانہ ہوا اور دریا کے راستے عظیم آباد کلکتہ ہوتا ہوا جہاز میں بیٹھ کر ۲۸ جولائی ۱۸۴۰ء کو لندن پہنچا۔ لندن میں نواب کریم خاں نے تقریباً دو سال تک قیام کیا۔ اس قیام کے دوران انھوں نے روزانہ کی تفصیل ایک ڈائری کی صورت میں لکھی جو نہ صرف ان مصروفیات اور واقعات کی وجہ سے دلچسپ ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اس میں ایک ہندوستان کے رہنے والے مسلمان کے جذبات واحساسات اور تاثرات کی نہایت خوبصورت تصویریں موجود ہیں۔

نواب کریم خاں مشرقی پنجاب کی چھوٹی سی ریاست جھجر کے رہنے والے تھے اور جھجر کے نوابوں کے خاندانوں سے ان کا تعلق تھا۔ وہ آخری مغل تاجدار ہندوستان بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں لندن بھیجے گئے۔ اگرچہ ۱۸۰۳ء کے بعد دہلی میں انگریزوں کا سکہ چلتا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے تک مغلوں کی بادشاہت کو قانونی اور اصولی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہر معاملے میں بادشاہ کی رضامندی حاصل کی جاتی تھی اور ان کے ملازموں کے ساتھ وہ تمام آداب برتے جاتے تھے جو بادشاہوں کے ملازموں کے ساتھ برتے جاتے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواب کریم خاں جب مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں لندن بھیجے گئے تو انھیں سفیر کا درجہ دیا گیا اور لندن میں جو وقت انھوں نے گزارا ہے اس میں انھیں ایک اہم سیاسی شخصیت تصور کیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ سے ان کی کئی مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ حکومت کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کا رابطہ رہا۔ ہندوستانی بادشاہوں اور امیروں میں سے جو لوگ جلاوطن کرکے یا کسی اور حیثیت سے لندن بھیجے گئے تھے اُن سے اُن کی ملاقاتیں ہوئیں۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کے بیٹے شہزادہ جہانگیر زمان جامع الدین محمد جو اس وقت لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے ان کے ساتھ نواب کریم خاں نے خاصا وقت گزارا۔ وہ آپس میں مشورے بھی کرتے تھے اور غم غلط کرنے کے لیے مختلف مقامات کی سیر کے لیے بھی جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کی تفصیلات نواب کریم خاں کی اس ڈائری "سیاحت نامہ" میں موجود ہیں۔ لطف کی بات

www.taemeernews.com

یہ ہے کہ دو سال میں قیام لندن کے زمانے میں ایک دن بھی ایسا نہیں ہے جس کی تفصیل نواب کریم خان نے اپنی اس ڈائری میں نہ پیش کی ہو۔ اس وقت کے لندن کی معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی جھلکیاں اردو میں اگر کہیں ملتی ہیں تو وہ صرف اس ڈائری میں۔ مسلمانوں کے زاویۂ نظر سے نواب کریم خان نے انگریزوں کی سیاست، ثقافت اور معاشرت کو دیکھا۔ وہ بڑے سخت مسلمان تھے۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ انھوں نے ایک سچے مسلمان کی طرح لندن میں وقت گزارا اور وہاں کی زندگی کے جو مذمومات تھے ان سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ ڈائری انیسویں صدی کے ایک سچے مسلمان کے اُن تاثرات کا آئینہ ہے جو لندن کی زندگی نے اور انگریزوں کے رویے نے اس کے ہاں پیدا کیے۔

زبان کے لحاظ سے بھی یہ ڈائری بہت اہم ہے کیونکہ اس میں جو سلیس اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے اس کا رواج اس وقت تک پوری طرح نہیں ہوا تھا اور جہاں تک ڈائری لکھنے کا تعلق ہے تو اس سے قبل کوئی ڈائری اردو کی آسان اور سادہ نثر میں نہیں لکھی گئی تھی۔ نواب کریم خان ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اس ڈائری کو پیش کیا اور آسان اور سادہ نثر میں اس ڈائری کو لکھ کر ایک مثال قایم کی۔

نواب کریم خان کی ڈائری کا یہ نسخہ جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے کسی طرح پیرس پہنچا اور اردو کے مشہور پروفیسر گارساں دتاسی کے ہاتھ لگا، چنانچہ اس پر اس کے دستخط موجود ہیں۔ پھر گارساں کی موت کے بعد یہ کسی طرح واپس لندن آیا اور اب برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ نہایت خوش خط لکھا ہوا ہے اور اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکمل اور بھرپور کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

نواب کریم خان کی اس ڈائری 'سیاحت نامہ' سے چند ایک اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ ۱۹۰۰ء صدی کے لندن کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ جو مسلمان اس زمانے میں لندن جاتے تھے، ان کے تاثرات کی کیا صورت ہوتی تھی ــــ

عبادت ــــــــــــــ

۲۸ / بست ہشتم جمادی الاول ۱۲۵۶ سنہ ہجری ــــ مقام لندن

۲۸ / بست ہشتم جولائی ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ــــــــ یوم سہ شنبہ

قریب دس بجے دن کے ایک صاحب انگریز کپتان گرنڈلے[1] صاحب کی طرف سے دا سطے لے جانے راقم کے جہاز پر آیا۔ تب بندے نے تمام اسباب اپنا میر بخش اور گیندا کے سپرد کیا اور آپ مہابت خان کے ہمراہ لے کر جریدہ صاحب موصوف کے ساتھ جہاز سے اترا۔ آخر شہر بلیک وال سے لندن تک اعرابہ دخانی میں آیا۔ حال اعرابہ مذکور کا عجائبات سے ہے۔ آیندہ بعد دریافت مفصل لکھنے میں آوے گا۔ پھر وہاں سے بگھی میں سوار ہو کر محلہ کرن ہل[2] میں نمبر ۱۶ جا کر کپتان گرنڈلے صاحب اور مسٹر ہنری پاٹنجس صاحب سے کہ وہ بھی وہاں موجود تھے، ملاقات کی۔ بعد ازاں ہمراہ صاحب مذکور کے محلہ لنڈن سٹریٹ میں جا کر ایک

---

[1] Grindley [2] Cornhill

www.taemeernews.com

مکان منسٹلر بہ عوض تین گنی کے کہ وہ ساڑھے دس روپے کی اشرفی ہوتی ہے، ایک ہفتے کے لیے لے کر قیام کیا۔ اور بہ سبب احتیاط مذہب کے کھانے کو بھی کچھ نہ کھایا۔ فقط

۲۹ ربست نہم جمادی الاول ۱۲۵۶ سنہ ہجری ــــــ مقام لندن

۲۹ ربست نہم جولائی ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ــــــ یوم چہار شنبہ

قریب دس بجے کے دن کو کچھ میوہ ترناشپاتی وغیرہ کے قسم سے منگوا کر کھایا۔ ہرچند کہ مذہب اپنا سوائے گوشت اور شراب کے کسی کھانے کی جنس کا مانع نہ تھا۔ چنانچہ حضرت عمر خطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے حال میں لکھا ہے کہ ایک روز آپ مسجد میں تشریف لائے۔ وہاں ایک ظروف میں پانی تھا۔ آپ نے اس میں سے قدرے پانی نوش کیا۔ تب ایک شخص نے عرض کی کہ "یا حضرت" یہ پانی یہود کا تھا"۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ "یہود کے باپ کا کیوں نہ ہو۔ مجھ کو بظاہر اس میں کوئی بات نجاست کی معلوم نہیں ہوتی۔ پاک ہے"۔ لیکن باوجود اس کے پھر بھی طبیعت نے بہت کراہیت کی۔ کچھ نہ کھایا۔ آخر عنایت خان کو بگی پر سوار کروا کر جہاز پر روانہ کیا تاکہ کچھ کھانا پکوا کر لا دے، اور آپ مع کپتان گرنڈے صاحب اور مسز گرنڈے کے سوار ہو کر واسطے سیر کے گیا۔ جب کہ بہ نظر تحقیق اور چشم غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ شہر مذکور رشک فردوس خوب آباد ہے اور عجائب اس کا سوا ہے۔ اس کے رنڈی مرد کوئی بدشکل نہیں۔ رنگ ڈھنگ اس کی آبادی کا دیکھ کر آنکھیں حظ اٹھائیں۔ کشادگی سے اس کی دل بستہ یک لخت کھل جائیں۔ ہوا اس کی باد بہاری کی طرح خوش آیند۔ عمارات وہاں کی ہر ایک صاحب طبع کے پسند۔ تعمیر کا طور ہے نیا۔ نقشہ ہر ایک مکان کا جدا۔ حویلیوں کی دیواریں روکار نو پختہ خشتی و سنگین چونے کی اور اندر سے سب مکان چھوٹے بڑے چوبی۔ درجے ان کے تین سے سات تک۔ چنانچہ ایک درجہ زمین میں ہوتا ہے اور چوبی تختوں پر پوشش رنگین کاغذ کی۔ بیل بوٹا اس کا عالم باغ کا دکھاتا ہے اور چھت اس کی ایسی خوش رنگ ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کے ہوش کھوتی ہے۔ اور بہ سبب موسم بہار کے ہر ایک شخص کا بام خانہ رشک گلزار و بہتر از لالہ زار۔ فضا اس کی رشک فضائے باغ ارم اور ہوا غیرت نسیم صبح دم۔ پانی میں وہاں کے شراب انگوری کا اثر ہے۔ ہر ایک طرف کو عالم طلسمات ہے۔ کوچے سے ارژنگ مانی مات۔ بازار میں ہر طرف چہل پہل۔ شیشہ آلات کی دوکان رشک شیش محل۔ ابیات ؎

کھلا بازار اور بستی کشادہ   بیاض جدولی ہو جیسے سادہ

دو رستہ اہل حرفہ اور دوکان دار   لڑی موتی کی ہو جیسے نمودار

مگر باوجود ان تمام خوبیوں کے اپنی طبیعت جو تخیلات دنیائی سے پریشان تھی شہر مذکور مزدی کی گور سے بھی بدتر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں یوں ہے کہ اب ایسی پر عمارات آبادی اور سوداگروں کی کثرت دنیا میں کہیں نہیں۔ بالفعل اکثر صنف کے اشخاص متمول اور صنایع صنعت گری میں کامل ہیں بکثرت موجود ہیں۔ بلکہ دن بہ دن ان امور کی ترقی و زیادتی ہے۔ سوائے اس کے تحفہ جات ہر ملک کے اور نادرات ہر جزیرے کے ہر وقت مہیا۔ باشندے بھی خوش معاش و اہل دولت و صاحب ثروت بیشتر اور خوب روحسن وادا میں بے مانند کیسرا اور کاروبار باہر کا عورات کی ذات سے متعلق اکثر اور مرد سے کمتر ــــــ

www.taemeernews.com

آخر سیر شہر کی کرتے ہوئے واسطے دیکھنے سینٹ پال گرجا کے کہ جو ناف شہر میں ایک عمارت کلاں ہے گیا۔ اگرچہ گرجے انگریزو پرتگیش و یہود کا تلک [1] وغیرہ عیسائیوں کے ہزاروں ہیں لیکن شہرت اس کی بہت ہے۔ علاوہ اس کے بہت اونچا کشادہ مشہور بھی سب گرجوں سے زیادہ حقیقت اس کی بنا کی یوں ہے کہ ایک مرتبہ بیچ سال ۱۶۶۶ء میں ایسی آگ لگی کہ سوائے گرجا قدیم تمام شہر لندن بھی جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ تب چارلس دویم شاہ انگلینڈ نے از سر نو اس گرجے کی تعمیر کے لیے حکم دیا۔ بعد ازاں بیچ ۱۷۰۱ء عیسوی کے جو ملکہ این تخت سلطنت پر تھی اول اُس نے مع صاحبان پارلیمنٹ و لارڈ وغیرہ کے جا کر اس میں نماز ادا کی مگر اختتام اس کی تعمیر کا سال ۱۷۱۵ء میں بیچ عہد جارج یکم شاہ انگلینڈ کے ہوا۔ بلندی اس کے گنبد کی کلس تک چار سو چار فٹ یعنی تخمیناً ایک سو تینتالیس گز۔ طول اس کا شرقاً و غرباً پانچ سو فٹ اور عرض ایک سو دس فٹ۔ روپیہ جو اس کی تعمیر پر صرف ہوا۔ سات لاکھ اور چھتیس ہزار پونڈ یعنی تہتر لاکھ و ساٹھ ہزار روپے رعایائے ملک کی طرف اور زبانی وہاں کے آدمیوں کی ایسا سنا کہ اگر اب ایسی عمارت بنے تو چہار چند روپیہ صرف ہو۔ کس لیے کہ نسبت زمانہ سابق کے اب ہر ایک شے گراں ہے اور جب کہ اس کی بلندی پر گیا تو ایک گھنٹہ اس میں لٹکا دیکھا۔ بہت بڑا بھی وزن اس کا گیارہ ہزار اور چار سو چوہتر پونڈ۔ اور ایک پونڈ چھٹانک کم آدھ سیر کو کہتے ہیں جس کا ایک سو پچیس من آدھا پاؤ کم جنسی سیر ہوتا ہے۔ قیمت اس برنج کی نو پونڈ دس فلوس جو ایک روپے کے بارہ ٹکے ہوتے ہیں۔ یعنی چار ہزار و ہفت صد بیاسی روپے اور چار آنے کہتے ہیں کہ آواز اس کی بشرط ہونے بارمراد کے اکثر اوقات قلعہ میں ونڈسر کے جو لندن سے بیس میل کی تفاوت سے ہے سنی ہے۔

پھر بعد غروب ہونے آفتاب کے جو اپنے مکان کو آیا تو برابر راستوں میں بازار کے اور ہر ایک گلی کوچوں میں شہر کے ہر درجانب چراغاں دکھائی اور روشنی ان کی نہایت نورانی اس کثرت سے روشن کہ نگاہ کام نہیں کرتی اور آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ اسی لیے لنڈن کی رات کو دن پر فخر ہے۔

آخر مکان میں آکر کھانا، جو وجاہت خان جہاز پر سے پکوا کر لایا تھا کھایا۔ اور ملک مذکور میں رسم ہے کہ ہر ایک شخص دن رات میں پانچ مرتبہ کھانے کو کھاتا ہے اور بعضے صاحب مقدوروں کو اس پر بھی اکتفا نہیں اور راقم کو ایسا اتفاق ہوا کہ ظاہر میں دو روز تک مطلق کچھ نہ کھایا۔ اس واسطے ایک پیرزن جو صاحب خانہ تھی قریب چار گھڑی رات گئے کچھ کھانا تیار کروا کر لائی۔ اور مادر مہربان کی طرح کمال الفت اور محبت کے اشارہ اس کے کھانے کو کیا۔ راقم نے عذر کیا۔ تب نہایت رنجور ہوئی۔ آخر جب کہ اُس نے دیکھا کہ منظور نہیں کرتا تو لاچار مایوس ہو کر جو کچھ کہ لائی تھی واپس لے گئی۔ اس حرکت سے جس قدر اس کو آزردگی ہوئی اسی قدر راقم کو خجالت بعد ازاں واسطے طلب اچار عرق سنانے کے اس کو اشارے سے سمجھایا۔ یعنی ایک پانی کی بوتل میں کچھ پھل تراش کر ڈالے اور کہا کہ میں ایسی چیز چاہتا ہوں۔ اور اس کو کھانے کے ہمراہ کھاتے ہیں۔ تب اس نے خوش ہو کر زبان انگریزی میں بہت کچھ کہا اور اس گفتگو سے ایسا دریافت ہوا کہ جو مافی الضمیر تھا اس نے بخوبی معلوم کر لیا۔ بعد تھوڑے عرصے کے اسی قسم کے پھل جیسے سابق اس کو دکھلائے تھے باریک باریک تراش کر پانی کی بوتل میں ڈال کر خوان میں رکھ کر بہت تکلف سے لائی۔ جب کہ یہ حال دیکھا تو بہت ہنسا اور جو کچھ کہ لائی تھی رد کرنا اس کا مناسب نہ جان کر رکھ لیا۔ بلکہ حسب دستور ملک کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ فقط

---

[1] Catholic

۳۰ رسی ام جمادی الاول ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــ مقام لندن

۲ ـ سی ام جولائی ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــ یوم پنج شنبہ

صبح کے وقت مسٹر جارج والتس صاحب جو جہاز میں رفیق تھے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ حال گزشتہ کو سن کر بہت ہنسے۔ آخر صاحب خانہ کو بلا کر کہا کہ یہ "شخص محمدی ہے۔ اس کو ہمارے ملک کی چیز کے کھانے سے نہایت پرہیز ہے اور خصوصاً "گوشت" سے۔ سوا ایسے امر میں تم خود ان کی بہت خبرداری کرنا اور کل جو تم سے اچار عرق لیمو نے کا طلب کیا تھا تم نے نہ سمجھا۔ اب تھوڑا اچار منگوانا۔ ضرور اس بات کو سن کر وہ مادر مہربان خجالت سے عرق عرق ہو گئی۔ آخر تھوڑا سا گھی جو کلکتہ سے ہمراہ آیا تھا صاحب موصوف کو دیا اور کہا کہ میں اپنے کھانے کے لیے ایسا گھی چاہتا ہوں۔ صاحب خانہ کو سمجھاؤ کہ جس قیمت پر ہاتھ آوے منگوا دے۔ چنانچہ صاحب مذکور نے بموجب کہنے کے کیا اور روغن اس پیرزن کو دیا۔ آخر وعدہ کل کے آنے کا کر کے رخصت ہوئے۔ قریب چار گھڑی دن رہے کے کپتان گرنڈلے صاحب واسطے ملاقات کے آئے اور اپنے ہمراہ سوار کر کے بازار کی سیر کو لے گئے۔ آخر بعد غروب ہونے آفتاب کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

یکم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــ مقام لندن

۳۱ ـ سی ام یکم جولائی ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــ یوم جمعہ

صبح کے وقت مسٹر جورج والتس صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اول صاحب خانہ سے گفتگو کر کے کہنے لگے کہ یہ کہتی ہے کہ تم نے جو کل گھی دیا تھا وہ بہت سے دوکان داروں کو دکھلایا لیکن کسی نے اس کو گھی نہیں تصور کیا۔ اور سب باتفاق کہتے ہیں کہ چربی ہے سور کی۔ چونکہ ایسے امر میں مجھ کو منع کیا تھا۔ اس لیے نہیں خرید کی۔ جب کہ صاحب رخصت ہوئے تو ایک بگی منگوا کر واسطے سیر ہے پارک[1] کے بادشاہی میں گیا اور بعد غروب ہونے آفتاب کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

دویم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــ مقام لندن

یکم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــ یوم شنبہ بود

مسٹر والتس صاحب تشریف لائے۔ ایک مکھن دان نقرئی معرفت ان کی خرید کر انھیں کو دیا کہ یہ ہماری طرف سے جان پٹ سن صاحب کپتان جہاز ایڈن برگ کو دینا کہ یہ نشانی ہماری طرف سے صاحب موصوف کے پاس رہے۔ بعد رخصت ہونے صاحب مذکور کے سوار ہو کر شہر کو گیا اور بعد غروب ہونے آفتاب کے اپنے مکان میں آیا۔ اور گرمی بہ شدت ہوئی۔ فقط

۳ ـ سویم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــ مقام لندن

۲ ـ دویم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــ یوم یک شنبہ

مسٹر والتس صاحب رخصت ہو کر ڈیون شہر[2] کو کہ مولد و موطن ان کا ہے روانہ ہوئے۔ فقط

۴ ـ چہارم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــ مقام لندن

۳ ـ سویم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــ یوم دوشنبہ

---

[1] Hay Park

[2] Devonshire

www.taemeernews.com

کپتان گرنڈے صاحب تشریف لائے اور ہمراہ اپنے واسطے ملاقات ایک صاحب کے لیے گئے پھر وہاں سے بعد سیر بازار واقعہ محلہ آکسفٹ سٹے[1] کے کہ اہل انگلینڈ بھی اس کو بازار ہی کہتے ہیں۔ اور دوکان دار اس میں فقط عورتیں جوان نہایت شکیل، فن خرید و فروخت میں بے عدیل، ہر ایک امور میں خوب چالاک اور قیامت بے باک ہے

ہر اک اپنے جوبن سے مغرور ہے
قیامت ہے آفت ہے بس دور ہے

علاوہ اس کے نہر جاری حوض صحن میں، کٹورا سا بھرا ہوا۔ مچھلیاں رنگ برنگ کی اس میں پھرتی ہیں۔ فوارے چھوٹتے ہیں ؎

پرستان کے مکانوں کا نمونا
خوش اسلوبی میں بلکہ اس سے دونا

آخر اپنے مکان میں آیا تو دو شخص ہندوستانی دیکھے جب کہ ان سے گفتگو ہوئی، تو معلوم ہوا کہ مولوی افضل علی بمبئی کے رہنے والے والیٔ ستارہ کی طرف سے وکیل ہو کر مع پانچ آدمی ہمراہی اپنے کے، سوا برس کے عرصے سے یہاں مقیم ہیں۔ اور علاوہ ان کے ایسونت راؤ مرہٹہ مع پندرہ سولہ ہندوستانی ہنود کے راجہ موصوف کی طرف سے آیا ہے۔ اس بات سے کمال خوشی حاصل ہوئی، اور معلوم ہوا کہ مولوی صاحب واسطے چندروز کے لندن سے باہر تشریف لے گئے ہیں، فقط

۵ — پنجم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۴ — چہارم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم سہ شنبہ

صبح کے وقت صاحب خان کو ایک صاحب کے ہمراہ واسطے لانے اسباب اور آدمیوں کے جہاز پر پہنچایا اور آپ کرایہ ایک ہفتے کا دے کر ہمراہ کپتان گرنڈے صاحب کے محلہ کارولین پلیس پارک روڈ، ریجنٹس پارک میں خانہ نمبر چودہ، استقامت کی۔ اور پیچ مقدمہ پہنچے لندن کے خطوط ڈاک میں شاہجہاں آباد کو روانہ کیے۔ اور رات کے وقت صاحب خاں گیندا لڑکے کو جہاز سے لے کر آیا اور لانا اسباب کا بہ سبب تکرار محصول کے ملتوی رہا۔ اور گیندا جو جہاز سے بیمار آیا تھا۔ اس کو دوا ہندوستانی جو ہمراہ تھی، کھلائی۔ فقط

۶ — ششم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۵ — پنجم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم چہار شنبہ

قریب چار گھڑی دن باقی رہے کے پیر بخش مع اسباب ہمراہ ایک صاحب علاقہ پرمٹ کے آیا۔ بعد رکھوانے اسباب کے کپتان گرنڈے صاحب کے ہمراہ سوار ہو کر واسطے ملاقات ایک صاحب کے گیا۔ پھر وہاں سے بعد غروب ہونے آفتاب کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۷ — ہفتم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۶ — ششم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم پنج شنبہ

---

[1] Oxford Street

جان پٹ سن صاحب کپتان جہاز ایڈن برگ کا واسطے ملاقات کے آیا۔ بعد رخصت ہونے صاحب موصوف کے کپتان گرنڈلے صاحب تشریف لائے پھر ان کے ہمراہ واسطے ملاقات ترولیسن[1] صاحب کے کہ جو سابق میں بیچ عہد رزیڈنسی کرل بروک صاحب کے شاہجہاں آباد میں سکرٹری تھے اور بالفعل بھی خزانہ بادشاہی کے سکرٹری ہیں، گیا۔ چونکہ صاحب مسطور بخدمت لارڈ ملبرن صاحب وزیراعظم کے تشریف لے گئے تھے، ملاقات نہ ہوئی۔ پھر وہاں کے بعد ملاقات چارلس نارسس صاحب کے، کہ آگے اس سے سکرتر اعظم گورنر بمبئی کے تھے، اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۸۔۔۔ ہشتم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔۔ مقام لندن
۷۔۔۔ ہفتم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔ یوم جمعہ

اول سوار ہو کر کپتان گرنڈلے صاحب سے بیچ محلہ نات بنک ریجنٹس پارک کے نمبر پینتیس، کہ جو مکان خاص ان کے رہنے کا ہے، جاکر ملاقات کی۔ پھر وہاں سے بعد ملاقات جان پٹ سن صاحب کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۹۔۔۔ نہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔۔ مقام لندن
۸۔۔۔ ہشتم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔ یوم شنبہ

قریب دس بجے کے محلہ نات ولا ریجنٹس پارک میں کرنیل ملر[2] صاحب سے جاکر ملاقات کی کہ جب کہ وہاں سے اپنے مکان میں آیا تو معلوم ہوا کہ مولوی افضل علی صاحب وکیل مہاراج ستارہ کے ملنے کو آئے تھے۔ فقط

۱۰۔۔۔ دہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔۔ مقام لندن
۹۔۔۔ نہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔ یوم یک شنبہ

قریب چار بجے کے اول بعض صاحبان دوست سے ملاقات کرکے واسطے دیکھنے زولوجیکل گارڈن کے کہ جانور خانہ سے مراد ہے، واقعہ ریجنٹس پارک کے گیا، اور باغ مذکور کی تیاری میں چار ہزار آدمی سے زیادہ شریک ہیں۔ ایسی شرکت کو کمپنی کہتے ہیں اور مکان مذکور میں جانے کے عوض فی اسم ایک شلنگ یعنی آٹھ آنے لیتے ہیں اور اگر کوئی شخص دوساورن کہ وہ تقریباً ساڑھے دس روپے کی اشرفی ہوتی ہے، سالیانہ اس کا مقرر کرے تو اس کو بدون دینے زر مقرری کے ہر وقت اختیار حاصل ہے اور دروازے بھی اس کے دو آہنی ہیں۔ ایک اس میں جانے کا اور دوسرا اس میں سے باہر آنے کا، اور صفت اس میں یہ ہے کہ جانے کی راہ سے کوئی آ نہیں سکتا اور آنے کے سے جانا معلوم۔ اور اس سے بھی نادر تر یہ ہے کہ اس کے حساب سے شام کو دریافت ہو جاتا ہے کہ آج اس میں اس قدر آدمی گئے اور پھول بھی اس میں بہ سبب موسم بہار کے جو کہ خصوصیت اس سرزمین سے رکھتے ہیں بے شمار۔ اگرچہ رنگ ڈھنگ میں تو وہ ایران و توران و ہندوستان وغیرہ کے پھولوں سے کم نہیں۔ لیکن سب بغیر بو کے۔ بلکہ جو گلاب وغیرہ کے قسم سے دیکھے ان میں بھی بو عشر عشیر سے کم اور میوے کے قسم سے بھی علیٰ ہذا القیاس۔ سب کیفیت بہ تاثیر زمین کی سمجھنا چاہیے۔ لیکن بہ نسبت اور میووں کے ناشپاتی اور اناناس اور رنگترہ اور آڑو اور آلو بخارہ کہ جس کو پلم کہتے ہیں، البتہ کیفیت سے خالی نہیں۔ لیکن نہ ہندوستان و کابل کے سے۔ سچ تو یوں ہے کہ ان میں اور اُن میں فقط نام کی شراکت ہے

---

[1] Trevelysol　　[2] Miller

www.taemeernews.com

اور ذات صفات میں اس سرے کا تفاوت ہے۔ اور اس قسم کا میوہ سپین وغیرہ کے ملک سے اکثر آتا ہے۔

اور مکان مذکور میں جانور اقسام کے نادر جمال بلکہ ہزاروں ایسے کہ جن کو اکثر انسانوں نے کمتر دیکھا ہے۔ غرض ہاتھی اور گینڈے، مکھی اور مچھروں کی چرند کیا پرند سب موجود ہیں۔ کوئی جزیرہ نہیں کہ جس کا جانور وہاں نہیں۔ چنانچہ بن مانس بھی اس میں کئی دیکھے اور کھانا کھاتے اور چائے پیتے سوائے اس کے اور بھی سب حرکت ان سے انسانوں ہی کی سی ہوتی دیکھی، اور صورت شکل اور چال ڈھال بھی علیٰ ہذا القیاس۔ فی الواقع مکان مذکور کیفیت سے خالی نہیں۔ دید کے قابل ہے۔ آخر بعد غروب ہونے آفتاب کے وہاں سے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۱۔۔۔ یازدہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری۔۔۔۔۔۔ مقام لندن

۱۰۔۔۔ دہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی۔۔۔۔۔۔ یوم شنبہ

قریب سات بجے کے کچھ کھانا خیریں ونمکین پکوا کر او پر مکان کپتان گرنڈے صاحب کے بھجوایا۔ پھر رات کے وقت آپ بھی شامل مجلس کا ہوا اور بہت سے صاحبوں سے ملاقات کر کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۲۔۔۔ دوازدہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری۔۔۔۔۔۔ مقام لندن

۱۱۔۔۔ یازدہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی۔۔۔۔۔۔ یوم سہ شنبہ

قریب دس بجے کے دن کو سوار ہو کر اور کپتان گرنڈے صاحب کو ہمراہ لے کر واسطے دیکھنے سواری ملکہ وکٹوریہ کے کہ واسطے بند کرنے عدالت پارلیمنٹ کے ہوس آف لارڈس کو سوار ہوئی تھی، گیا۔ اور سر راہ ایک مکان پر مع دو تین صاحبوں کے بیٹھا، اول تو بہت سے شہزادے اور ڈیوک اور مارکوئس اور ویکونٹ اور لارڈ چار چار گھوڑوں کی بگھیوں پر سوار ہو کر آئے۔ لیکن دستور سرخ پوشاک کا بجز ملازمان بادشاہی کے، کسی امرا کے واسطے نہیں ہے۔ بعد ازاں امرائے بادشاہی چار بگھیوں پر کہ جن میں چھ چھ گھوڑے اور ایلچی سلطان ترک و فرانس و سپین و پرشیا و آسٹریا وغیرہ بادشاہوں کے۔

آخر ملکہ بہ سواری اعرابہ طلائی کے کہ جس میں آٹھ گھوڑے سفید نادر جمالی بہ لباس مکمل تھے، نمود ہوئے۔ داہنے طرف ملکہ کی گاڑی میں پرنس البرٹ صاحب بہادر اور بائیں طرف کون ویکونٹ لارڈ ملبون صاحب وزیر اعظم بیٹھے تھے اور آگے آگے بلم بردار اور آسہ بردار۔ پوشاک ان کی ہندوستانی، قبائیں زری میں مغرق۔ علاوہ ان کے بیس بلم بردار قبائیں سرخ بانات کی سادی پہنے ہوئے۔ اعرابہ سے ملکہ کے بہت قریب زبانی موصوف صاحبوں کے دریافت ہوا کہ قدیم پوشاک جلو برداروں کی یہی ہے۔

اور جس وقت کہ سواری قریب ہوئی تو سب صاحب سر برہنہ کھڑے ہوئے اور بہ آواز بلند ہُرے ہُرے کہنے لگے۔ کہ وہ عبارت ہے تحسین و آفرین سے۔ لیکن راقم نے حسب آئین اپنے ملک کے تسلیمات کی۔ تب راقم کو جو ملکہ نے غریب الوطن دیکھا تو کمال متوجہ ہو کر از راہ مسافر پروری کے سلام بہت خوبی کے ساتھ لیا۔ اور رکاب میں جو قریب دو سوار کے تھے ہر ایک زرہ اور خود اور دستانی اور چہار آئینہ آہنی میں غرق اور گھوڑے مشکی رنگ کے نیٹ اسلوب دار اور چالاک رہوار۔

پھر وہاں سے کپتان گرنڈے صاحب کو ان کے مکان میں پہنچا کر اپنے مکان میں آیا۔

حقیقت اس عدالت پارلیمنٹ کی بنیاد کی یوں ہے کہ جب سنہ بارہ سو سولہ عیسوی میں بعد مرنے جان کے چھوٹے

www.taemeernews.com

ہنری کو کہ اس وقت میں عمر اس کی نو برس کی تھی، ویکپٹر و ناتھ کے بیٹیوں نے بڑی شان و شوکت سے گلوسٹر میں تخت پر بٹھایا۔ جب کہ وہ عالم شباب کو پہنچا تو سلیم الطبع اور رحم دل۔ سوائے اس کے اپنے وابستہ لوگوں کے حق میں ذی اخلاق اور بردبار نظر آیا۔ لیکن کہتے ہیں کہ دشمنوں کے حق میں رعب دار نہیں تھا۔ آخر ہنری نے بموجب ونچسٹر کے بشپ کے صلاح کے بہت سے نالایق اور اجنبی آدمیوں کو اپنی مصاحبت میں مقرر کیا۔ اور ہر ایک خدمت اور حکومت انھیں لوگوں کے سپرد کی تب ایسی حرکتوں سے آزردہ ہوکر امیروں نے فساد برپا کیا اور بادشاہ کو کہا کہ "اگر آپ تمام ان بداصل آدمیوں کو دریا سے نکال دوگے تو ہم آپ کو اور ان کو بادشاہت سے نکال ڈالیں گے۔" آخر اس قصے نے یہاں تک طول پکڑا کہ امیر لیسٹر نے شمشیر بادشاہ کے ہاتھ سے ہاتھ مروڑ کر چھین لی۔ القصہ بادشاہ نے امیروں سے کہا کہ آپ کو اپنا بادشاہ با قدرت بنا دیں اور اپنے غم و غصہ کو مٹا دیں۔ بادشاہ نے یہ بات منظور کی اور آکسفورڈ میں پارلیمنٹ یعنی جماعت مقرر کی تا اپنی سلطنت کے لیے ایک نیا قانون تجویز کریں۔ یہ پارلیمنٹ یعنی دیوانی جماعت کہلائی اور چوبیس امیر سلطنت کے قباحتیں درست کرنے کے لیے مقرر ہوئے اور وہی لیسٹر جو بڑے نامور جنرل کا بیٹا تھا ان کا میر مجلس ہوا۔ تمام امورات سلطنت کے جو قدیم کے تھے ان کی تجویز سے تبدیل ہوئے۔ اور بادشاہ کے سب مصاحبوں کو معزول کیا، اور یہ امیران کے مقام پر قایم ہوئے۔ جس مقام پر یہ مجلس جمع ہوتی ہے اس کے تین ہوس آف لارڈس کہتے ہیں۔ اب اس مجلس میں تخمیناً چار سو چونسٹھ امیر ہیں۔ بعد ازاں ملکی منصب داروں نے باہم متفق ہوکر مشورت کی کہ اب ہمارا ہی اعتبار و اقتدار اس سلطنت کے تمامی احکامات کا نشانہ ملامت ٹھہرا۔ اس وقت میں ایڈورڈ شہزادے کی عمر بائیس برس کی تھی۔ اس نے بموجب درخواست ملکی منصب داروں کے سوائے اپنے خاص امرا اور کتنے ایک پادریوں کے جو اس وقت میں رعایائے سلطنت نہ تھے ایک دوسری پارلیمنٹ مقرر کی اور حکم دیا کہ ہر ایک سرزمین سے دو دو منصب دار اور وکیل جو امورات سلطنت کے لایق ہوں، حاضر ہوں۔ یہ ہوس آف کامنس یعنی قوم انگلش کے مجمع عوام الناس کی پہلی بنیاد ہے جس میں بالفعل ملک (انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ و آئرلینڈ) کے تخمیناً چھ سو ساٹھ وکیل ہیں لیکن جس وقت کہ سنہ تیرہ سو ننانوے میں ہنری چہارم تخت پر انگلینڈ کے بیٹھا تو اس نے اس جماعت پارلیمنٹ کو بہ نسبت سابق کے زیادہ تر اختیار دیا اور امورات تحصیل و خزانہ بادشاہی کو بھی انھیں کے زیر حکم کیا فقط۔

۱۳ — سیزدہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۱۲ — دوازدہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم چہارشنبہ

صبح کے وقت کپتان گرنڈے صاحب تشریف لائے۔ پھر بعد تین بجے کے کوٹھی واقع محلہ کرن ہل کے کپتان گرنڈے صاحب کو ہمراہ لے کر واسطے ملاقات ایک صاحب کے گیا۔ آخر وہاں سے محلہ فنش رائے سکوئر میں نمبر ۹ سر چارلس بارنٹ صاحب سے ملاقات کرکے اپنے مکان میں آیا اور مسٹر کامن صاحب وغیرہ تین صاحب انتظار دیکھتے تھے، ان سے ملا اور بعد چائے خوری کے صاحبان موصوف رخصت ہوئے۔ فقط

۱۴ — چہاردہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۱۳ — اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم پنج شنبہ

قریب دس بجے کے دن کو کپتان گرنڈے صاحب مع دو میم کے تشریف لائے اور بہ دیر نشست کرکے رخصت ہوئے۔ فقط

www.taemeernews.com

۱۵۔۔۔ پانزدہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔ مقام لندن
۱۴۔۔۔ چہاردہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔ یوم جمعہ

سرچارلس فاربس بارنٹ صاحب بہادر تشریف لائے اور بہ دیر بیٹھ کر رخصت ہوئے اور شبانہ روز بارش رہی ۔ فقط

۱۶۔۔۔ شانزدہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔ مقام لندن
۱۵۔۔۔ پانزدہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔ یوم شنبہ

اول کرنیل ملر صاحب سے ملاقات کرکے واسطے دیکھنے مکان پالی تکنیک انسٹائی ٹیوشن کے گیا۔ یہ نام زبان یونانی میں ہے کہ جس ملک کو اہل فرنگ گریک، کہتے ہیں۔ اور کتاب انجیل اسی ملک کی زبان میں ہے۔ معنی اس کے سب علموں کا نشان ۔ فی الواقع کوئی علم اور صنعت کسی ملک کی نہیں کہ جس کی ترکیب اور بیان اس میں نہیں۔ مکان مذکور طرفہ سیرگاہ اور نادر تماشا گاہ ہے ۔ دید اس کی حیرانی بڑھاتی ہے۔ اور سیر مسرت بھلاتی ہے۔ تمام کاروبار وہاں کا قیاس بشری سے خارج اور احاطۂ عقل سے باہر دیکھا۔ چنانچہ جو لوگ کہ دریا میں موتی نکالنے کے لیے غوطہ لگاتے ہیں، اس کی ترکیب بھی اس میں ہے ۔ چنانچہ راقم بھی ایک شلنگ یعنی آٹھ آنے دے کر ایک گھنٹے ہمراہ چار آدمی کے بیٹھا اور پانی کے اندر گیا۔ غرض ایک ساعت پانی کے اندر رہا۔ اور کسی نوع کی تکلیف مطلق نہ ہوئی۔ سوائے اس کے روشنی بہ دستور رہی۔ آپس میں باتیں۔ غرض اگر کوئی شخص اس کے اندر پانی میں ایک مہینے کے عرصے تک رہے، کچھ خطرہ نہیں ۔ علاوہ اس کے ایک صنعت یہ ہے کہ اگر دو شخص سو میل کی تفاوت سے ہوں تو آپس میں باتیں کر سکتے ہیں ۔ غرض مصنوعات ہر قسم کی اس میں اس قدر ہیں کہ ان کے دیکھنے اور مطلع ہونے کو مدت چاہیے ۔ علاوہ ان صنعتوں کے آرایش بھی اس میں اس قدر ہے کہ جس کا کچھ حساب نہیں۔ چنانچہ ایک میز کہ طول و عرض میں گز سوا گز ہوگی، قیمت اس کی ستر ہزار روپیہ دریافت ہوئی۔ پھر اور اشیا ظروف و تصویر وغیرہ کا تو کیا حساب ہے ۔ اور اس مکان کے دیکھنے کے عوض میں فی اسم ایک شلنگ لیتے ہیں ۔ پھر وہاں سے بعد سیر قہوہ خانے کی، اپنے مکان میں آیا ۔ فقط

۱۷۔۔۔ ہفت دہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔ مقام لندن
۱۶۔۔۔ شانزدہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔ یوم یک شنبہ

شاہزادہ جہانگیر زمان جامع الدین محمد خلف ٹیپو سلطان تشریف لائے ۔ بعد رخصت شاہزادہ موصوف کے مسٹر بٹونی صاحب رہنے والے شہر روم کے کہ جو دارالسلطنت قیصر روم کا ہے، تشریف لائے اور ایک زبان جو لاٹن مشہور ہے، وہ قدیم اسی ملک کے آدمیوں کی تھی اور اب زبان دوسری ہے ۔ لیکن اب تک بھی اہل فرنگ میں رواج اس کا بہت ہے ۔ چنانچہ حکمائے انگریزی کی تحریر اسی زبان میں ہے ۔ سوائے اس کے جو صاحب کہ سرکار کمپنی انگریز بہادر کی طرف سے ملک کے کام پر ہندوستان کو جاتے ہیں، ان سے بھی اول امتحان اس زبان میں لیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اب اس طرح کا امتحان مسٹر اڈین صاحب بہادر لارڈ سپل گورنر جنرل بہادر کے لیتے ہیں ۔ سرکار کمپنی کی طرف سے کچھ سالیانہ ان کا مقرر ہے اور بعد رخصت ہونے صاحب مذکور کے چارلس گرانٹ صاحب سے ملاقات کرکے اپنے مکان میں آیا ۔ فقط

۱۸۔۔۔ ہشت دہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری ۔۔۔۔۔ مقام لندن
۱۷۔۔۔ ہفت دہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔ یوم دو شنبہ

بہ سبب بارش کے اتفاق جانے کا واسطے ملاقات کسی صاحب دوست کے نہ ہوا۔ فقط

۱۹ — نوزدہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن

۱۸ — ہشت دہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم سہ شنبہ

شاہزادہ جہانگیر زمان جامع الدین محمد واسطے ملنے کے آئے۔ بعد غروب ہونے آفتاب کے رخصت ہوئے۔ فقط

۲۰ — بست جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن

۱۹ — نوزدہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم چہار شنبہ

شدت تاریکی بخارات و بارش کے شبانہ روز رہی سا سی لیے اتفاق جانے کا بیچ کسی صاحب دوست کے نہیں ہوا۔ فقط

۲۱ — بست یکم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن

۲۰ — بست اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم پنج شنبہ

تمام دن بارش اور تاریکی بخارات کی بہ دستور رہی اور رات کو مع شہزادہ جہانگیر زمان جامع الدین محمد کے واسطے دیکھنے تصویر خانہ مومی کے محلہ بیکر سٹریٹ میں جو بازار مشہور ہے۔ گیا اس مقام پر بھی فی اسم ایک شلنگ لیتے ہیں اور کسی تصویر میں مطلق یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ یہ تصویر ہے۔ کھڑے کی ہو خواہ بیٹھے کی اور سوائے شکل بنانے کی صنعت کے یہ عجیب کام کیا ہے کہ ان کے پیٹ کے اندر بطور انگریزی گھڑی ایسے کل لگائے ہیں کہ ہر ایک اعضا اپنے اپنے موقع پر جنبش کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے روشنی مکان میں اس کثرت سے کہ اگر نگاہ آفتاب کی بھی اس پر پڑے تو چکا چوند آنے لگے۔ آخر بعد گیارہ بجے کے وہاں سے رخصت ہو کر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۲ — بست دوم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن

۲۱ — بست یکم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم جمعہ

رات کے وقت ہمراہ شاہزادہ جہانگیر زمان جامع الدین محمد کے واسطے دیکھنے تصویر خانہ موم کہ محلہ ونڈمل سٹریٹ — ہے مارکیٹ[^1] میں ہے، گیا۔ ہر چند کہ مکان مذکور بھی بہتر ہے لیکن نہ اس خوبی و کیفیت کے ساتھ۔ پھر وہاں سے سوار ہو کر شہزادہ موصوف اپنے مکان کو گیا اور راقم اپنے مکان کو۔ فقط

۲۳ — بست سوم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن

۲۲ — بست دویم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم شنبہ

اول چارلس نارسس صاحب سے ملاقات کر کے بعد ملاقات ہنری گرنڈے صاحب کے اپنے مکان میں آیا اور شبانہ روز بارش رہی۔ فقط

۲۴ — بست چہارم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن

۲۳ — بست سوم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم سہ شنبہ

---

[^1]: لے Hay Market

www.taemeernews.com

صبح کے وقت شہزادہ جہانگیر زمان جامع الدین محمد سے جاکر ملاقات کی۔ پھر وہاں سے بالاتفاق سوار ہوکر ہے پارک میں گئے۔ وہاں سے بعض صاحبان سے ملاقات کرکے اپنے مکان میں آیا، اور شبانہ روز بارش رہی۔ فقط

۲۵ — جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۲۴ — بست چہارم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم دو شنبہ

اول میر افضل علی صاحب وکیل مہاراجہ ستارہ کے سے ملاقات کرکے جنرل بریا صاحب سے جاکر ملاقات کی پھر بعد گیارہ بجے کے اپنے مکان میں آیا۔ قریب چار گھڑی رات گئے کہ کپتان گرنڈلے صاحب مع تین صاحب دوست کے تشریف لائے اور دو ٹکٹ دعوت کے دیے اور کہا کہ کل تم مع اپنے ایک آدمی ہمراہی کے شہر ٹوٹ ہمٹن[1] کو چلنا۔ وہاں اورنٹیل جہاز پر بڑا کھانا ہوگا۔ بہت سے صاحب جلیل القدر جمع ہوں گے۔ بعد تھوڑی دیر کے صاحب موصوف رخصت ہوئے۔ فقط

۲۶ — بست ششم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام شہر ٹوٹ ہمٹن

۲۵ — بست پنجم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم سہ شنبہ

قریب بارہ بجے کے مع مس گرنڈلے ہنری گرنڈلے صاحب وجاہت خان کے بگی میں سوار ہوکر اول اوپر مکان دفتر خانہ گرنڈلے صاحب کے گئے۔ مس گرنڈلے کو وہاں چھوڑ کر اور صاحب موصوف کو اپنے ہمراہ لے کر محلہ واکسال میں کہ جہاں اعرابہ دخانی شہر ٹوٹ ہمٹن کے کھڑے رہتے ہیں پہنچے۔ پھر جس وقت کہ تین بجے تو فی اسم ایک پونڈ یعنی دس روپیہ دے کر گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ ہنوز کہ چھ نہ بجے تھے کہ شہر ٹوٹ ہمٹن میں کہ لندن سے اٹھتر میل کی تفاوت سے ہے، پہنچے۔ اور یہ کارخانہ دخانی گاڑیوں کا ایک کمپنی یعنی گروہ نے جمع ہوکر تجویز کیا ہے، اور شہر لندن سے ٹوٹ ہمٹن تک راہ کی تیاری پر چھ ملین پونڈ یعنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ اور جب کہ وہاں پہنچے تو ایک جہان سرائے میں مقام تجویز کرکے شہر کی سیر کو گئے۔ فی الواقع قدیم شہر اور نہایت کلان ہے۔ ہر صنف کے اشخاص اس میں آباد۔ اشیا بھی ہر ملک و ہر قسم کی بیشتر موجود ہیں۔ خرید و فروخت کا بازار مدام گرم۔ لیکن سبب آبادی کا کثرت تجارت پیشوں کی۔ فقط

۲۷ — بست ہفتم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام شہر ٹوٹ ہمٹن

۲۶ — بست ششم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم چہار شنبہ

صبح کے وقت کھانا کھا کر ہمراہ کپتان گرنڈلے صاحب سیر شہر کی کرتے ہوئے اوپر جہاز دخانی کے کہ نام اس کا اورنٹیل تھا، گیا۔ جہاز مذکور بہت بڑا اور کشادہ بہ نسبت اور جہازوں کے صفائی اور خوبصورتی میں بھی زیادہ، اور ڈاک بھی ہندوستان کو اسی جہاز پر سے کراسکندریہ کو جاتی ہے، اور سر ہنری ولک[2] صاحب جو سابق اس سے ایران میں ایلچی تھے اور بالفعل ڈائرکٹر کمپنی ہندوستان اور عدالت پارلیمنٹ کے بھی ممبر ہیں اور سوائے ان کے اور بھی بہت سے صاحب جو جہاز میں تھے سب سے ملاقات کی۔

آخر قریب چار بجے کے جب میز پر انواع و اقسام کا کھانا اور طرح بطرح کا میوہ چن چکے تو سب صاحب واسطے کھانا

---

[1] Southampton   [2] Willeck

www.taemeernews.com

کھانے کے بیٹھے اور جس وقت کہ کھانے سے فراغت ہوئی تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر تعریف و توصیف ملکہ وکٹوریہ کی اور تمام صاحب گلاس شراب کا ہاتھ میں لے کر سر برہنہ کھڑے ہوئے اور چار مرتبہ "ھُرے ھُرے" کہہ کر وہ گلاس شراب کا نوش کیا۔ اور یہ عبارت ہے تحسین و آفرین سے۔ بعد ازاں ہر ایک شخص کھڑے ہو کر حاضرین مجلس اور بعضے امرائے ڈیوک ولنگٹن صاحب وغیرہ کی تعریف کرتا تھا۔ پھر اس کے جواب میں وہ شخص جس کی تعریف کی تھی کھڑا ہو کر اپنی انکساری اور دوسرے حضار مجلس کی صفت و ثنا بیان کرتا تھا۔ آخر ایک صاحب نے راقم کے حق میں بھی کچھ کلمۂ خیر کہا۔ تب بندے نے کھڑے ہو کر سب صاحبوں کو سلام کیا اور کپتان گرنڈلے صاحب نے اس کے جواب میں بھی کچھ کہا۔ پھر جس وقت کہ جہاز جزیرہ آئل آف ویٹ کے گرد پھر چکا تو سب صاحب دوسرے جہاز پر سوار ہو کر کنارے پر پہنچے۔ تب ہزاروں زن و مرد اور لڑکے راقم کے دیکھنے کو جمع ہوئے اور جس طرف کو جاؤں اسی طرف کو غول کے غول اور غٹ کے غٹ لوگوں کے جمع ہو جائیں۔ تب لاچار گی پر سوار ہو کر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۸ — بست ہشتم جمادی الثانی ۱۲۵۶ھ سنہ ہجری — مقام لندن
۲۷ — بست ہفتم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم پنج شنبہ

صبح کے وقت ہمراہ کپتان گرنڈلے صاحب وغیرہ چار صاحبوں کے کشتی میں سوار ہو کر اونیٹل جہاز کے صاحبوں سے جا کر ملاقات کی۔ پھر وہاں سے آ کر بعد تین بجے کے اعرابہ دخانی میں سوار ہوا اور لندن میں جس وقت پہنچا تو چھ بجنے میں چار منٹ یعنی چار پل باقی تھے۔ پھر وہاں سے بگی میں سوار ہو کر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۹ — بست نہم جمادی الثانی ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن
۲۸ — بست ہشتم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم جمعہ

اول محلہ یوسٹن سکوائر میں واسطے دیکھنے اعرابہ دخانی کے جو لندن سے شہر لیور پول کو جاتے ہیں گیا۔ حال ان کا ایسا دریافت ہوا کہ ان کو ایک کمپنی یعنی گروہ نے باہم متفق ہو کر بنوایا ہے اور وہ لندن سے لیور پول میں، کہ دو سو بیس میل کا باہم فاصلہ ہے ساڑھے پانچ ساعت میں پہنچتے ہیں اور اس میں جانے والوں سے فی اسم دو پونڈ اور پندرہ شلنگ یعنی ساڑھے ستائیس روپے لیتے ہیں اور ان گاڑیوں کے واسطے جو راہ بنایا ہے اس کی تیاری میں بارہ ملین پونڈ یعنی بارہ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے اور آمدنی اس کی ایک ہفتے میں تخمیناً چالیس ہزار پونڈ یعنی چار لاکھ۔ پھر وہاں سے متصل لندن کے ایک گاؤں میں جا کر ویبرو صاحب سے جا کر ملاقات کی اور صاحب موصوف دوست بہت ہے راقم کا۔ بعد ازاں وہاں سے سوار ہو کر بعد غروب ہونے آفتاب کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱ — یکم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن
۲۹ — بست نہم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم شنبہ

اول جنرل رابٹ سن صاحب اور کرنیل ہنری رابٹ صاحب بہادر جنرل موصوف سے جا کر ملاقات کی پھر وہاں سے بعد ملاقات کرنیل طر صاحب کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲ — دویم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن
۳۰ — اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم یک شنبہ

اول مع مسٹر ہنری اور کامن صاحب مترجم کے سر مکان پالی ٹکنک کی کر کے مسٹر کامن سے جا کر ملاقات کی، پھر وہاں سے بعد ملاقات جنرل رابٹ سن صاحب کے اپنے مکان میں آیا اور بارش شبانہ روز رہی۔ فقط

۳ — سویم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن
۳۱ — سی یکم اگست ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم دو شنبہ

www.taemeernews.com

گیند اڑکے کو واسطے دیکھنے مرغ خانے کے جو مکان زولوجکل میں ہے ہمراہ ولیم میتھو صاحب کے بھیجا اور بہ سبب ہونے بارش کے اتفاق جانے بیچ خدمت کسی صاحب دوست کے نہ ہوا۔ فقط

۴۔۔۔ چہارم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مقام لندن

۱۔۔۔ یکم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یوم سہ شنبہ

وقت شب کے مسٹر مارکھ سے ملاقات کرکے مولوی افضل علی صاحب وکیل مہاراج ستارا سے جاکر ملاقات کی پھر وہاں سے بعد بارہ بجے کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۵۔۔۔ پنجم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مقام لندن

۲۔۔۔ دوئم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یوم پنج شنبہ

اول کرنیل لر صاحب سے ملاقات کرکے کلید ریجنٹس پارک کے دروازے کی صاحب موصوف سے لے کر واسطے سیر کے گیا۔ مکان مذکور سمت بادشاہی ہے۔ اس کے اندر جانے کو سوائے ان لوگوں کے کہ جن کے مکان اس کے اطراف میں ہیں اور کلید بھی اس کے دروازوں ان کے پاس رہتے ہیں۔ غیر کے لیے حکم نہیں یا وہ شخص کہ جس کو اس کے دروازوں کی تالی بہم پہنچے۔ فی الواقع مکان مذکور عجائب سیر گاہ اور نادر تماشا گاہ ہے۔ دید اس کی رطوبت اجسام کی تازگی بڑھاتی ہے اور سد ھ مسرت بھلاتی ہے۔ صحن اس کا نہایت وسیع۔ عمارت اس کے اطراف میں، مرتبہ اسلوب دار در قع ہوا اس کی ہر فصل میں مثل سوائے ربیع میدان اس کا اقسام کے پھولوں سے مالا مال۔ زمین اس کی نہایت صاف۔ ہر طرف زن و مرد کا اژدہام حسن کے گزرنے کی ایک دھوم صبح و شام۔ سبزے پر اس کے زمرد زہر کھائے اور سرخی سے پھولوں کی مونگے کا جگر خون ہو جائے۔ سوائے اس کے درخت ہزاروں قسم کے۔ برابر برابر سٹرکیں شہری ہموار سراسر علاوہ ان خوبیوں کے دریا بھی درمیان سے اس کے جاری ہے۔ غرض بعد غروب ہونے آفتاب کے وہاں سے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۷۔۔۔ ہفتم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مقام لندن

۴۔۔۔ چہارستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یوم جمعہ

اول صاحبان دوست سے ملاقات کرکے واسطے دیکھنے مکان بنک آف انگلینڈ کے کہ متصل محلہ لیڈن ہال سٹریٹ کے ہے، گیا۔ فی الواقع ایک عمارت عظیم الشان قابل دید۔ لائق توصیف کے ہے، اور یہ مکان ہے ایک کمپنی یعنی گروہ سوداگروں کا ہر چند کہ کمپنی اور خزانہ ملک مذکور میں بہت ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ جمع کی کوئی کمپنی نہیں ہے، اور ملک انگلینڈ میں جو نوٹ کاغذ کا روپیہ کے عوض جاری ہے وہ بھی اسی مکان سے جاری ہے اور واسطے حفاظت اس کی کے رات کے وقت کچھ سپاہی بھی سرکاری متعین رہتے ہیں، اور دستور اس کا یوں ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ اس میں امانت رکھے تو سود اس کا ایک خرمہرہ نہیں دیتے۔ باوجود اس کے بھی، بہت لوگ اپنا روپیہ وہاں امانت رکھ دیتے ہیں۔ کیونکہ ملک مذکور میں حشمت اور دولت اس قدر ہے کہ بعضے شخصوں کے یہاں تو روپے کے رکھنے کے لیے جگہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے وہ لوگ اپنے روپے کا وہاں رکھ دینا ہی غنیمت جانتے ہیں۔ جمع اس کمپنی کی تمام و کمال اٹھائیس ملین اور ایک لاکھ اکتالیس ہزار پونڈ کہ جس کے اٹھائیس کروڑ اور چودہ لاکھ دس ہزار روپے ہوتے ہیں۔ اس میں سے چار کروڑ اور اکھتر لاکھ تیس ہزار روپے نقد اور باقی کے نوٹ، اور جس طرح

www.taemeernews.com

کہ اور کمپنیوں کے امورات تجارت کے سرانجام کو ڈائرکٹر اور چیرمین اور ڈپٹی چیرمین مقرر ہیں۔ اس میں سوائے ڈائرکٹروں کے ایک گورنر اور ایک نائب گورنر بھی رہتا ہے۔ پھر وہاں سے بعد سیر مکان ایڈیٹر گیلری کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۸ — ہشتم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری ——— مقام لندن

۵ — پنجم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ——— یوم شنبہ

بعد ملاقات صاحبان دوست کے واسطے دیکھنے اعراب ہائے دخانی کے کہ جو لندن سے شہر برسٹل کو کہ فاصلہ باہم ایک سو بیس میل کا رکھتے ہیں جاتے ہیں، گیا۔ اس راستے کے بنانے میں روپیہ اس کمپنی کا کہ جس کی وہ گاڑی ہے قریب چھپلین پونڈ یعنی چھ کروڑ کے صرف ہوا ہے اور اس راستے کو گریٹ وسٹرن کہتے ہیں۔ پھر وہاں سے بعد سیر ریجنٹ پارک کے اپنے مکان میں آیا اور پیر بخش جو بعارضہ تپ کے بیمار تھا بدن پر اس کے چیچک نمودار ہوئی۔ فقط

۹ — نہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری ——— مقام لندن

۶ — ششم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ——— یوم یک شنبہ

قریب سات بجے کے مولوی افضل علی صاحب نے جو دعوت کی تھی جاکر مکان پر ان کے کھانا کھایا۔ پھر بعد بارہ بجے کے وہاں سے رخصت ہوکر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۰ — یازدہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری ——— مقام لندن

۷ — ہفتم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ——— یوم دوشنبہ

قریب سات بجے کے مکان پر کپتان گرنڈے صاحب کہ صاحب موصوف اور بھی صاحبوں سے جو وہاں موجود تھے ملاقات کی۔ پھر وہاں سے بعد ملاقات چارلس نارسس صاحب کے اپنے مکان میں آیا۔

۱۱ — یازدہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری ——— مقام لندن

۸ — ششم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ——— یوم سہ شنبہ

رات کے وقت حسب الطلب کپتان گرنڈے صاحب سے جو مکان پر ان کے دوستوں کا کھانا اور محفل گانے اور بجانے کی تھی، گیا۔ صاحب موصوف و حاضران مجلس سے ملاقات کی اور بارہ بجے تک کیفیت وہاں کی دیکھی۔ آخر رخصت ہوکر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۲ — دوازدہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری ——— مقام لندن

۹ — نہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ——— یوم چہار شنبہ

پیر بخش جو بعارضہ چیچک کے بیمار تھا، صحت پائی اور صحت غسل کیا، اور مولوی افضل علی صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ پھر بعد غروب ہونے آفتاب کے رخصت ہوئے۔ فقط

۱۳ — رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری ——— مقام لندن

۱۰ — دہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ——— یوم پنج شنبہ

قریب دس بجے کے ہنی در ہوٹل یعنی مہمان سرا میں جاکر ایک چٹھی انگریزی جو شاہجہاں آباد سے آئی تھی کرنیل ولس ممبر صاحب نواسہ بیگم شمرو صاحب کے، کو دی۔ بعد ازاں صاحب موصوف سے رخصت ہوکر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

www.taemeernews.com

۱۴ــــ چہار دہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــــ مقام لندن

۱۱ــــ یازدہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــــ یوم جمعہ

اول جنرل صاحب اور کرنیل ملر صاحب سے جاکر ملاقات کی۔ پھر وہاں سے بعد سیر ریجنٹس پارک کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۵ــــ پانزدہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــــ مقام لندن

۱۲ــــ یازدہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــــ یوم شنبہ

اول کچھ کھانا پکوا کر واسطے بعضے صاحبان دوست کے بھجوایا۔ بعد ازاں مولوی افضل علی صاحب سے جاکر ملاقات کی۔ پھر وہاں سے بعد بارہ بجے کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۶ــــ شانزدہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــــ مقام لندن

۱۳ــــ سیزدہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــــ یوم یک شنبہ

اول کپتان گرنڈے صاحب وغیرہ صاحبوں سے ملاقات کرکے بعد سیر ہے پارک کی کہ وہ بھی رمنہ بادشاہی ہے اپنے مکان میں آیا۔ چنانچہ رمنہ مذکور میں ہر روز بہروں رہے سے تا بہ غروب ہونے آفتاب کے ایک دھوم اور تماشائیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ خصوصاً یک شنبہ کو تو اس قدر کیفیت اور زن و مرد کی کثرت رہتی ہے کہ زبان اس کے بیان سے عاجز و قاصر ہے۔ گویا حسن کا بازار لگا رہتا ہے اور چلنے والوں کو راہ بھی نہیں ملتا۔ ایک طرف دو رستہ خوانچہ والوں کا بازار لگا ہوا۔ رستہ زن و مرد کی کثرت سے جہاں تہاں بھرا ہوا سودا کا نوں میں انواع و اقسام کی جنس۔ رنگ برنگ کے پھول طرح بہ طرح کے میوے۔ بھانت بھانت کی مٹھائی جس وقت چاہو مہیا۔ جدھر تدھر دیدہ کرو ایک عالم نظر آئے۔ نیا لینے دینے والوں کا اژدہام، خرید و فروخت کی جا بجا دھوم دھام۔ غرض چپے چپے پر ایک نیا تماشا اور قدم قدم پر ایک اچنبھے کا رولہ رہتا ہے۔ غرض حقیقت وہاں کی کچھ کہی نہیں جاتی خلق کو باہم بات کرنے کی بھی سرت نہیں آتی۔ سکتے کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ بقول شخصے اگر عالم علوی بھی وہاں آتا تو ایک نظارے میں عجائبات سماوی کو بھول جاتا۔ پھر انسان تو کس شمار و قطار میں ہیں۔ فقط

۱۷ــــ ہفت دہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــــ مقام لندن

۱۴ــــ چہار دہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــــ یوم دوشنبہ

قریب آٹھ بجے کے واسطے دیکھنے مکان پالی ٹکنیک کے گیا۔ سوائے عجائبات مکان کے ایک تماشا دیکھا کہ ایک لڑکی نہایت شکل، فن موسیقی میں بے عدیل، عمر اس کی تخمیناً پانچ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ پھر باوجود اس خورد سالی کے اس نے راگ ایسی خوش الحانی سے گایا اور باجا بھی انگریزی اس خوبی سے بجایا کہ تیر تاثیر کا ہر ایک کے جگر میں ترازو ہو گیا۔ سامعین و ناظرین مقام حیرت میں آگئے۔ فی الواقع اگر یہ آواز جاں گداز حضرت داؤد علیہ السلام بھی سنتے تو بے اختیار وجد میں آجاتے۔ پھر وہاں سے بعد ملاقات صاحبان دوست کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱۸ــــ ہشت دہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــــ مقام لندن

۱۵ــــ پانزدہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی ـــــــ یوم سہ شنبہ

مولوی افضل علی صاحب و منشی کرم علی و شیخ قلندر بخش کی جو دعوت کی تھی، صاحبان موصوف نے رات کو آکر کھانا نوش کیا اور جس وقت کہ چائے خوری کر چکے تو بعد بارہ بجے کے اپنے مکان کو رخصت ہوئے۔ فقط

۱۹ــــ نوزدہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری ـــــــ مقام لندن

www.taemeernews.com

۱۶۔۔۔ شانزدہم ستمبر ۱۸۴۰ء سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔۔ یوم چہار شنبہ

رات کے وقت مولوی افضل علی صاحب تشریف لائے۔ پھر ہمراہ ان کے سیر بازار کی کرتے ہوئے سرجارلس فاربس بارنٹ صاحب سے جاکر ملاقات کی۔ آخر بعد بارہ بجے کے رخصت ہوکر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۰۔۔۔ بستم رجب ۱۲۵۶ء سنہ ھجری ۔۔۔۔۔۔۔ مقام لندن

۱۷۔۔۔ ہفت دہم ستمبر ۱۸۴۰ء سنہ عیسوی ۔۔۔۔۔۔۔ یوم پنج شنبہ

وقت رات کے ہمراہ ایک دوست کے، واسطے سیر دیکھنے کے مکان آپرا میں، کہ تماشا وہاں کا مشہور و معروف ہے گیا۔ مکان مذکور میں بہ عوض تماشا دیکھنے کے فی اسم ایک پونڈ یعنی دس روپے لیتے ہیں، اور بعضے مقام جو واسطے عوام الناس کے ہیں اس کی اجرت کچھ کمتر ہے۔ مکان مذکور کی جس قدر کہ تعریف و توصیف سنی تھی زیادہ تر اس سے دیکھا۔ فی الواقع ایک عمارت، عالی شان ہے۔ لندن میں بلکہ تمام ملک انگلینڈ میں ویسی عمارت خوش قطع اور وسیع اور شیشہ آلات سے آراستہ دوسری نہیں۔ ملکہ بھی اکثر اوقات وہاں رونق افروز ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک حجرہ خاص ملکہ کی ذات کے لیے مقرر ہے۔ اس کے عوض میں تخمیناً دوسو پونڈ یعنی دو ہزار روپے کا سالیانہ حضور ملکہ سے مرحمت ہوتا ہے۔ اور سوائے ملکہ کے اور بھی بعضے صاحب مقدوروں نے اسی طرح سے سالیانے مقرر کر رکھے ہیں، اور ان مقاموں میں بجز ان کے اور کوئی بیٹھنے نہیں پاتا یا جس کو وہ اجازت دیں۔ پھر بعد تھوڑے عرصے کے ان تماشا کرنے والوں نے ایسے ایسے کسب کمال دکھائے کہ جو کتابوں میں نہ دیکھے تھے اور کہانیوں میں بھی نہیں سنے تھے سو آنکھوں سے دیکھے۔ ہر چند کہ مردوں نے بھی کسب کرتب بہت سے کیے لیکن عورتیں ان کی بلا ئے بے درمانی دور از عقل ان کی فسوں سازی اور شعبدہ بازی کے کام دیکھنے میں آئے اور ان کی چالاکیاں بے باکیاں مطلق دھیان میں نہ آئیں۔ علاوہ اس کے سبھوں پر عالم شباب اور رنگ روپ بھی اس چمک دمک کے ساتھ کہ اگر حسن یوسفی بھی دیکھتا تو شرم سے چاہ میں ڈوب جاتا۔ تمام تماشائی ان کے گل رخسار کو بلبل وار تکتے تھے اور دیوانوں کے مانند آپس میں کچھ کچھ کہتے تھے اور وے پری زاد اپنے کام میں مشغول تھے۔ مطلقاً واصلاً کسی کی طرف رخ توجہ کا نہیں فرماتے تھے۔ جس وقت کہ یہ طلسمات اہل مجلس نے دیکھا ہر ایک گبر و مسلمان خود سے فراموش ہوگیا ؎

دیکھ کر ان کو کافر و دیں دار　　　کرتے آپس میں تھے یہی تکرار
ان کے منہ کے دیکھنے کو دیدۂ دل چاہیے　　　چشم ظاہر میں ہماری دید کر سکتی نہیں

واقعی حق تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے ان کے سراپا میں سراپا خوبیاں بھر دی تھیں ؎

بھنویں جب کہ غصے میں تھیں تانتی
جگر تیر مژگاں سے تھیں چھانتی

سوائے اس کے وے جیسی کہ حسن و ملاحت میں بے ہمتا تھیں ویسی ہی عقل و فراست میں یکتا۔ ہر ایک فن میں طاق، شہرۂ آفاق، رعنائی و زیبائی میں نہایت دل جو۔ خوبی و دل ربائی میں بہ غایت خوبرو۔ اگر فرہاد دیکھتا جان شیریں دیتا۔ لیلیٰ مجنوں ہو جاتی ؎

انساں کی ذات برزخ جامع ہے بے گماں　　　ظل خدا و صورت حق اس میں ہے عیاں

پھر جس وقت کہ صحبت ناچنے اور گانے بجانے کی گرم ہوئی تو بقول مصلح الدین شیخ سعدی شیرازی ؎

www.taemeernews.com

آواز خوشش از کام و دہانِ لبِ شیریں — گر نغمہ کند ور نہ کند دل بہ فریبد

غرض اس طرح کا سماں بندھا کہ اگر تان سین بھی ہوتا تو سبق تربیت کا بیچ دبستان شوق کے پڑھتا۔ ہرچند کہ اس جگہ تماشا اقسام کا ہوتا ہے۔ لیکن شہرت زیادہ تر اس کام میں ہے۔ آخر جب کہ بارہ بج چکے تو چار و ناچار سوار ہوا اور صاحب موصوف کے گھر پہنچایا اور آپ اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۱ — بست یکم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۱۸ — پانزدہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم جمعہ

اول کپتان گرنڈلے صاحب سے ملاقات کر کے بعد سیر ریجنٹس پارک کے اپنے مکان میں آیا اور کچھ کھانا پکوا کر بعضے صاحب دوست کے لیے بھجوایا۔ فقط

۲۲ — بست و دویم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۱۹ — نوزدہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم شنبہ

رات کے وقت جنرل رابرٹ سن صاحب سے جا کر ملاقات کی۔ پھر وہاں سے ہمراہ چارلس نارسس صاحب اور مس رابٹ سن سے واسطے دیکھنے تصویر خانہ مومی کے کہ مکان سے صاحب موصوف کے متصل ہے گیا۔ بعد ازاں ہمراہ چارلس نارسس صاحب کے سوار ہو کر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۳ — بست سویم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۲۰ — بستم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم یک شنبہ

قریب بارہ بجے دن کو ڈنکن فوربس[1] صاحب تشریف لائے۔ پھر ہمراہ صاحب موصوف کے اوپر مکان کپتان گرنڈلے صاحب کے گیا۔ چونکہ صاحب مذکور کسی دوست کے مکان پر گئے ہوئے تھے ملاقات نہ ہوئی۔ تب ڈنکن فاربس صاحب کو رخصت کر کے اپنے مکان میں آیا۔ اور وقت رات کے کپتان اسٹوڈ صاحب آئے۔ اور بعد چائے خوری کے رخصت ہوئے۔ فقط

۲۴ — بست چہارم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۲۱ — بست یکم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم دو شنبہ

رات کے وقت بٹونی صاحب وغیرہ تین صاحب ملنے کو آئے اور بعد چائے خوری کے رخصت ہوئے۔ فقط

۲۵ — بست پنجم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۲۲ — بست و دویم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم سہ شنبہ

قریب دس بجے کے کپتان اسٹوڈ صاحب سے جا کر ملاقات کی اور مسٹر بلیک برن صاحب اور مسٹر فارسس جو ملنے کو تشریف لائے۔ وقت رخصت کے مسٹر فارسس نے فرمایا کہ آج کریم خان کو چھ بجے ہمارے مکان پر پہنچنا ہے جس وقت کہ یہ بات سنی تو بموجب وعدہ کے مکان پر ان کے گیا اور جنرل رابٹ سن صاحب وغیرہ بہت سے صاحب اور جو وہاں موجود تھے سب سے ملاقات کی۔ آخر بعد بارہ بجے کے رخصت ہو کر اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۲۷ — بست ہفتم رجب ۱۲۵۶ سنہ ہجری — مقام لندن

۲۴ — بست چہارم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم پنج شنبہ

---

[1] Duncan Forbes

www.taemeernews.com

کپتان گرنڈے صاحب تشریف لائے اور ایک چٹھی انگریزی بنام جس میں کا زومو ملول صاحب بہادر سکریٹری اعظم محکم صاحبان آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹران کمپنی ہندوستان کے بہ مقدمہ روانہ کرنے مثل مقدمہ نواب حسن علی خان بہادر کے راقم کی طرف سے جو لکھ کر لائے تھے، عنایت کر کے رخصت ہوئے۔ فقط

۲۸ — بست ہشتم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۲۵ — بست پنجم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم جمعہ

بہ مقدمہ روانہ کرنے کاغذات نواب حسن علی خان بہادر کی غرضی بہ عبارت اردو صاحبان آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹران کمپنی ہندوستان کے نام لکھ کر مع چٹھی صاحب سکریٹری اعظم کے کپتان گرنڈے صاحب کے پاس بھیجے۔ فقط

۲۹ — بست نہم رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۲۶ — بست ششم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم شنبہ

اول سر چارلس فاربس بارنٹ صاحب سے جاکر ملاقات کی پھر وہاں سے بعد ملاقات چارلس گرانٹ صاحب کے اپنے مکان میں آیا اور رات کے وقت جان اسٹوڈ صاحب ملنے کو آئے، اور بعد چائے خوری کے رخصت ہوئے۔ فقط

۳۰ — سی ام رجب ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۲۷ — بست ہفتم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم یک شنبہ

صبح کے وقت کچھ کھانا واسطے بعضے صاحب کے بھجوایا۔ پھر رات کو برائے دریافت حال مولوی افضل علی صاحب کے جو بیمار تھے، گیا۔ بعد ازاں جان اسٹوڈ صاحب سے ملاقات کر کے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۱ — یکم شعبان ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۲۸ — بست ہشتم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم دوشنبہ

بہ سبب شدت بادوباراں کے اتفاق جانے کا بیچ خدمت کسی صاحب دوست کے نہ ہوا۔ رات کے وقت جو کپتان اسٹوڈ صاحب وغیرہ تین صاحب تشریف لائے تھے، بعد چائے خوری کے رخصت ہوئے۔ فقط

۲ — دوئم شعبان ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۲۹ — بست نہم ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم سہ شنبہ

اول صاحبان دوست سے ملاقات کرکے واسطے دریافت حال مولوی افضل علی صاحب کے، گیا۔ پھر وہاں سے بعد سیر ریجنٹس پارک سے اپنے مکان میں آیا۔ فقط

۳ — سوئم شعبان ۱۲۵۶ سنہ ھجری — مقام لندن
۳۰ — سی ام ستمبر ۱۸۴۰ سنہ عیسوی — یوم چہار شنبہ

خطوط ڈاک میں شاہجہاں آباد کو روانہ کیے اور بموجب حساب منجمان انگلینڈ کے آج کے دن سے موسم سردی کا شروع ہوا اور مسٹر کامن صاحب مع میم صاحبہ کے تشریف لائے۔ پھر بعد رخصت ہونے صاحب موصوف کے، واسطے دریافت کرنے حال مولوی افضل علی صاحب کے، گیا۔ تا آخر بعد بارہ بجے کے اپنے مکان میں آیا اور شبانہ روز بارش رہی۔ فقط

www.taemeernews.com

مظفر عباس

اردو کا پہلا سفرنامہ

سفر کا رویہ بنیادی طور پر زندگی کا رویہ ہے کہ زندگی حرکت اور عمل سے عبارت ہے اور سفر حرکت و عمل ہی کا علامتی روپ ہے۔ ہماری شاعری میں جا بجا اس بنیادی انسانی رویے کا اظہار رہا ہے۔ یہ اشعار محض چند مثالیں ہیں ؂

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
(میرؔ)

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
(غالبؔ)

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی، ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اُس میں، گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ
(ناصرؔ کاظمی)

منیرؔ اس شہر پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ
(منیرؔ نیازی)

شاعری کے ساتھ ساتھ ہماری نثر میں بھی سفر کے اس رویے نے اظہار پایا ہے اور اس حد تک مکمل اظہار پایا ہے کہ سفرنامہ ایک مستقل صنفِ ادب بن گیا ہے۔ سفرنامے ہماری تاریخ کا اہم باب ہیں۔ انسانی علوم و فنون اور تاریخ کے سرچشمے سفرناموں ہی سے پھوٹتے ہیں۔ انسان کی قدیم ترین تاریخ کے ابتدائی نقوش بھی سفرناموں میں ملتے ہیں۔ سیاحوں نے جہاں جغرافیائی سطح پر نئی دنیاؤں کا سراغ لگایا ہے، وہیں علوم و فنون کی سطح پر نئے امکانات تک رسائی بھی کی ہے ——

ڈارون کا مشہور مضمون "ڈائری آف دی وایج آف بیگل" اگرچہ بحری سفر کی روداد (یعنی سفرنامہ) ہے مگر ساتھ ہی ساتھ طبیعات، نیچرل سائنس اور اصولِ ارتقا کے موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب ہے۔ بحری سیاحوں، مارکوپولو اور ابنِ بطوطہ کے سفرنامے قدیم تاریخی و تہذیبی ماخذ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سفرناموں نے انسانی تاریخ کو ماضی میں بڑے قدیم زمانے تک وسعت دی ہے۔ خود برِ صغیر کی قدیم تاریخ کے ماخذ بھی سفرنامے ہی ہیں۔ چینی سیاحوں هیون سانگ اور فاهیون کے سفرنامے

www.taemeernews.com

اس سلسلے میں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں ۔۔۔۔

سفرنامہ بنیادی طور پر روداد سفر ہوتی ہے۔ لیکن یہ روداد سفر محض ان معنوں میں ہوتی ہے کہ اس کا بنیادی محرّک کوئی سفر ہوتا ہے، ورنہ اپنے وسیع تر مفہوم میں یہ کسی خاص خطّے کے باشندوں کی تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تاریخ ہوتی ہے۔ چونکہ سفرنامے مختلف خطّوں کی تاریخ مرتب کرتے ہیں لہٰذا یہ ایک نازک فن ہے اور سفرنامہ لکھتے ہوئے ادیب کو بڑے نازک اور کٹھن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے ۔۔۔۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور اردو میں سفرناموں کی روایات کا تجزیہ کرتے ہیں تاکہ اس پس منظر میں اردو کے پہلے سفرنامے "عجائباتِ فرنگ" کا تفصیلی مطالعہ کر سکیں ۔۔۔۔

اردو میں سفرنامے کی روایت کے ابتدائی نقوش سیّد احمد شہیدؒ کی "سوانح احمدی" میں ملتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ سوانح عمریوں کے ذیل میں آتی ہے۔ لیکن اس کے ایک حصّے میں سیّد احمدؒ کے سفرِ حج کے (جو انھوں نے ۱۸۲۱ء میں کیا تھا) مفصّل حالات ملتے ہیں۔ "سوانح احمدی" کے اس حصّے کو اردو میں سفرنامے کی روایت کی ابتدائی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے پیشتر ہندوستان میں لکھے جانے والے سفرنامے فارسی میں ہیں۔ اِن فارسی سفرناموں میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا "جذب القلوب" (۹۹۶ھ / ۱۵۸۹ء) شاہ ولی اللہ کا "فیوض الحرمین" (۱۱۴۳ھ) مولوی رفیع الدین مرادآبادی کا "حرمین" اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا "سراجِ منیر" خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام سفرنامے سفرِ حج کے بارے میں ہیں جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان میں سفرناموں کی روایت کا آغاز مذہب کے حوالے سے ہوا ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش (بقول خود اُن کے "کمّل پوش") کا سفرنامہ "عجائباتِ فرنگ" [۱] اُردو کا پہلا باقاعدہ اور مکمّل سفرنامہ ہے۔ یوسف خاں نے خود اسے "تاریخ یوسفی" کے نام سے موسوم کیا ہے ۔۔۔۔ لکھتے ہیں :۔

> چونکہ اس کتاب میں سب حال اپنا گزرا بیان تھا ۔۔۔ نام اس کا تاریخ یوسفی رکھا
> الاهتمام منّی والاتمام من اللہ تعالیٰ ۔۔۔۔ صفحہ ۳

یوسف خاں ایک وسیع المشرب، آزاد منش درویش ہے۔ اپنا مذہب "سلیمانی" بتاتا ہے۔ سفرنامے میں جا بجا اپنے مذہب کا اعلان کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مذہب ہے مگر دیگر مذاہب کو بھی بُرا نہیں سمجھتا ۔۔۔۔

یوسف خاں سلطنتِ اودھ میں نصیرالدین حیدر کی فوج میں جمعدار اور پھر صوبے دار کے عہدے پر فائز ہوا۔ لیکن سیاحت کے شوق نے یہاں ٹکنے نہ دیا۔ ۱۸۳۷ء میں ملک چھوڑ عازمِ سفرِ یورپ و مشرقِ وسطیٰ ہوا۔ اپنی روانگی کا حال سفرنامے میں یوں لکھتا ہے :۔

> " اک بارگی سن اٹھارہ سو چھتیس (۱۸۳۶ء) میں دل میرا طالب گار سیاحی جہانِ خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت مانگی۔ شاہِ گردوں بارگاہ نے بصد

---

[۱] اس کتاب کی ایک جلد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں زیر نمبر ۹۱۴۲۶۲ / ۶۷۵ ی موجود ہے۔

www.taemeernews.com

عنایت و انعام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجالایا اور راہیِ منزلِ مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارہ کلکتہ میں پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کی۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔"

(ص ۳-۴)

یوسف خاں نے ۳۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو سفر کا آغاز کیا اور ۲۵ جولائی ۱۸۳۸ء کو واپس کلکتہ پہنچا۔ اس طرح اس سفر نامے کا سلسلہ کم و بیش ایک سال کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک سال کے واقعات بڑے سائز کے ۲۶۹ صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ سفر نامہ پہلی بار ۱۸۴۷ء میں دہلی میں طبع ہوا۔ پھر ستمبر ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہ معلومات کتاب [1] کے دوسرے ایڈیشن کے سرورق پر اس طرح درج ہیں:

"یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں بمقام دہلی طبع ہوئی تھی اور چونکہ مصنف اس کا باشندہ لکھنؤ کا تھا اور مالک مطبع سے بھی اس کی ملاقات تھی تو یہ تحفہ یادگار باشندہ اس صوبے کا سمجھ کر حسب تحریک مسٹر جوزف جوہانس صاحب جو اخلاق و مروت میں بے عدیل اور فنِ فوٹوگرافک وغیرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں، ماہِ ستمبر ۱۸۷۳ء مطبع نول کشور میں بطبع مزین مطبوع ہوئی۔۔۔"

یوسف خاں فطری طور پر ایک آزاد منش، سیاحت کا رسیا شخص ہے۔ اس کی اس خواہش کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔ لیکن سیر و سیاحت کے دوران وہ محض خود لطف اندوز ہونا پسند نہیں کرتا بلکہ اس کا ریکارڈ یادداشتوں کی صورت میں محفوظ کر کے اہلِ وطن کو بھی اپنی مسرتوں میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس سفرنامے کے آخر میں اس کا یہ کہنا:

"اب بھی یوسف حلیم کمل پوش سلیمانی مذہب ارادہ سیر ملک سیہ پوشوں کا رکھتا ہے اور ایران و توران، استنبول اور روس و ماژندران وغیرہ کے جانے پر آمادہ ہے۔ بسبب لاچاری اور بہم نہ پہنچنے زادِ راہ کے یہاں پڑا ہے۔ امیر اور رئیس ہندوستان کے اپنے خیال کب رکھتے ہیں کہ خرچ راہ کا اور ایک محرر کامل ہمراہ میرے کر کے رخصت کریں۔ بندہ ملکوں میں پھرے اور بے کم و کاست حال ہر جا کا اپنی آنکھ سے دیکھ کر بیان کرے۔ اگر یاوریِ بخت سے کوئی متکفل خواہش میری کا ہوا فبہا نہیں تو فقیر تھوڑے دنوں میں راہی ہوگا۔ خدا مسبب الاسباب ہے کوئی سبب کرے گا یا جامۂ فقیری پہن کر سیر ملکوں کی کرے گا۔۔۔"

اس کی اس خواہش کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "عجائبات فرنگ" شعوری طور پر لکھا ہوا سفرنامہ ہے جس کے مصنف کی ہر ممکن کوشش ہے کہ جو چیزیں اس کی نظروں کے سامنے آئیں جن شہروں اور ملکوں کی اس نے سیاحت کی، جو تجربات و مشاہدات اس کو حاصل ہوئے ان کو جیتا جاگتا قاری کی نظروں کے سامنے پیش کر دے اور یوسف خاں

---

[1] "عجائبات فرنگ" مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۳ء (نسخہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

www.taemeernews.com

یقیناً اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ سفر کی ابتدا سے لے کر آخر تک بڑی جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ اُس کی یادداشت اور ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کہیں بھی تاریخ یا دن لکھنا نہیں بھولا۔ یہاں تک کہ جہاں جہاں قیام کیا، گلی، محلّے کا نام اور مکان کا نمبر تک لکھ دیا ہے۔ یوسف خاں کا یہ عمل اسے موجودہ دور کے سفرنامہ لکھنے والوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ لندن میں اپنے قیام کی تفصیلات یوں دی ہیں :-

> "لندن عجیب شہر گلستاں ہے۔ دانائی کی وہاں کان ہے۔ یہ تماشے دیکھ کر سرائے بل موت میں پھر آیا۔ راجر صاحب کو ساتھ لے کر مکان کرائے کا تلاش کیا۔ بہت جستجو سے محلّہ "سموہیس" میں لمبر (یعنی نمبر) تیسرا قریب "سینکرک کلیسا" کے ایک مکان سو روپے کرائے پر ٹھہرایا۔ ایک شخص کو شریک کر کے اُس میں رہا"۔ (ص ۱۸)

یہ سفرنامہ اس لحاظ سے بھی بڑا دلچسپ ہے کہ اس میں آج سے سوڈیڑھ سو سال قبل کے انگلستان کے شہروں اور دیہات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ بعض تصویریں تو ایسی ہیں کہ اس دور میں یقین کرنے میں تامل ہوگا۔ ذرا تصور کیجیے اُس انگلستان کا جس میں کوئلے کی مدد سے گاڑیاں چلتی ہوں گی۔ مگر یہ گاڑیاں بھی ایک ایسے شخص کے لیے اچنبھا ہیں جو ہندوستان جیسے پس ماندہ ملک سے گیا ہو۔ چنانچہ یوسف خاں بجا طور پر اسے "تماشا" قرار دیتے ہیں اور انھیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

> "وہاں آٹھ سات گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بڑی گاڑی سب سے آگے۔ اُس میں تین آدمی بیٹھے کوئلے سلگاتے، پھر ہر گاڑی کی زنجیر دوسری گاڑی میں لگی تھی۔ بڑی گاڑی تک زنجیر بندی یوں ہی تھی۔ جب سب آدمی اُن میں بیٹھ جاتے، بڑی گاڑی کے پیچ کو پھیرتے ___ فی الفور وہ تیر کی طرح دھوئیں کے زور سے رواں ہوتی۔ ہر ایک گاڑی زنجیر کے لگاؤ سے اُس کے ساتھ چل نکلتی۔ میں نے ایسا کبھی تماشا نہیں دیکھا۔ نہایت مشتاق تھا۔ گاڑی بان سے پوچھا کہاں جاؤ گے؟ اُس نے کہا آٹھ کوس پر۔ میں نے کہا مجھ کو بھی سوار کرو۔ اُس نے کہا بہتر۔ آخر میں اُس پر سوار ہوا۔ اُس نے گاڑی کا پیچ موڑا۔ فوراً گاڑی چلی۔ طبیعت بہلی۔ راہ میں ایک دفعہ سر نکال کر دیکھا۔ قریب تھا کہ تیزروی اُس کی سے پگڑی میری گرے۔ جلدی سے سر اندر کر لیا۔ پاؤ ساعت میں آٹھ کوس جا پہنچا۔ وہاں سے دھوئیں کی ناؤ (یعنی اسٹیمر) پر سوار ہو کر موضع "کریخ" میں سیر کو گیا"۔ ___ (ص ۱۸-۱۹)

ایک اور تماشے کا حال یوں لکھا ہے :-

> "دیکھا کہ ایک غبارہ ہے۔ اُس میں بہت سی ڈوریاں لگیں اور دو تین گوروں نے اپنے ہاتھ میں وہ ڈوریاں پکڑیں۔ اُس میں دھوئیں بھرنے کے لیے گیس جلایا۔ اس لیے کہ بغیر دھوئیں بھرنے کے غبارہ اُڑ نہ سکتا۔ نیچے اُس کے ایک ٹکڑا تانبے کا لگا ہوا۔ اُس پر ایک پلنگ چھوٹا سا بچھا ہوا۔ اُس میں بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ نیچے اُس کے ایک ناؤ مع سامان دریائی

www.taemeernews.com

کے لگی کہ شاید غبارہ اڑ کر دریا میں گرے۔ ناؤ کے سبب سے ڈوبنے نہ پاوے۔ چار آدمی اُس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص ہاتھ میں جھنڈی لیے۔ جب غبارہ دھویں سے بھرا۔ صاحب غبارہ نے گوروں کو حکم دیا کہ ڈوریوں کو چھوڑ دو۔ گوروں نے ڈوریوں کو چھوڑا۔ غبارہ بلند ہونے لگا۔ جب دو چار تیروں پر آیا، اُس شخص نے جھنڈی کو ہلایا۔ سب لوگوں نے بہت تعریف کی۔ ٹوپی سرسے اُتاری۔ آخر وہ ایسا بلند ہوا کہ انڈے سا دکھائی دیتا۔ پھر نہ ثابت ہوا کہ کہاں گرا۔ جس کا جی چاہے اُس کے مالک کو ایک سو تیس روپے دے اور غبارے میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرے۔۔۔۔

(ص ۳۰-۳۱)

یوسف خاں کا سفرنامہ جہاں انیسویں صدی کے انگلستان کی جیتی جاگتی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے وہیں طنز و مزاح کا اعلیٰ شاہکار بھی ہے۔ یوسف خاں نے اُن تمام واقعات کو بیان کیا ہے جو ایک پس ماندہ ملک کے اجنبی مسافر کو ایک ترقی یافتہ نئے ملک میں پیش آتے ہیں۔ موجودہ دور کا کوئی سفرنامہ بلا جھجک لکھنے والا ہوتا تو یقیناً ایسے واقعات کو گول کر جاتا جن سے اس کی کم علمی، نادانی یا تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ لیکن ایک اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے یوسف خاں نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے تو جو کچھ اس پر گزری صاف صاف بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ دیکھیے:۔

"باورچی خانے میں ایک چھوٹا حوض کہ اُس کے اوپر نل پیچ دار تھا۔ بندہ وہاں کے راہ و رسم سے محض ناآشنا تھا۔ باورچی خانے کو حمام سمجھ کر نہانے لگا اور پیچ نل کا کھول دیا۔ نوکر میرا بدن ملتا۔ تھوڑی دیر میں پانی کمروں میں بھر گیا۔ تعجب کرکے عورت صاحب خانہ مع پیش خدمت اپنی کے دوڑی آئی۔ مجھ کو نہاتے دیکھ، بہت ہنس کر چلی گئی۔ میرا نوکر اور میں بھی حیران ہوا کہ باعث ہنسی کا کیا ہے؟ شاید یہاں رسم نہانے کی نہیں ہے کہ نہاتے دیکھ کر ہنسیں۔ میں نے نہا دھو کر حاضری منگوائی۔ اُس وقت وہ عورت نوکر صاحب خانہ کی پھر آئی۔ فقیر نے اُس سے پرسش کی کہ مجھے نہاتے دیکھ کر تو اور تیری بی بی کیوں ہنسی؟ وہ پھر بہت ہنسی۔ میں نے ہٹ کی۔ تب اُس نے کہا۔ جہاں تم نہائے، باورچی خانہ ہے۔ نہ غسل خانہ۔ ہم کو تمھاری نادانی پر ہنسی آئی کہ تمھیں باورچی خانہ اور غسل خانے کی نہیں شناسائی۔ یہ سن کر میں شرمندہ ہوا۔۔۔۔ (ص ۲۰)

یوسف خاں متوازن نقطۂ نظر کا حامل شخص ہے۔ وہ بُرے اور بھلے میں نہ صرف تمیز کر سکتا ہے، بلکہ اُس کے برملا اظہار پر بھی قادر ہے۔ اس ضمن میں کسی قسم کا خوف یا جبر اُس کی راہ میں حائل نہیں۔ فرنگی دور کی تمام تر جبریت کے باوجود وہ انگریزوں کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کے اظہار میں قطعاً باک نہیں رکھتا۔ نتائج کی پرواکیے بغیر وہ بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار سفرنامے میں کرتا ہے۔ انگریزوں کی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُن انگریزوں کے رویے پر نکتہ چینی بھی کرتا ہے، جو ہندوستان میں آقا بن کر آئے تھے۔ لکھتا ہے:۔

"کیا خوب شہر لندن ہے۔ لوگ وہاں کے مسافروں پر ایسی عنایت کرتے ہیں کہ باپ بیٹوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ فقیر نے سفر بہت شہروں کے کیے مگر صاحب مروّت ایسے نہیں پائے۔ انگریز

www.taemeernews.com

جو ہندوستان میں آتے ہیں، مزاج بدل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اُن سے کچھ نسبت نہیں ــــــ ؏
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک　　　(ص ۳۱ - ۳۲)

یہی نہیں انگلستان کے لوگوں کی اخلاق باختگی پر بھی طنز کرتا ہے صنعتی انقلاب کی آمد سے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں انگلستان میں اقدار دم توڑ رہی تھیں اور اخلاقی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اس صورت حال کا اندازہ ان واقعات سے بخوبی ہوسکتا ہے جو یوسف خاں نے سفرنامے میں بیان کیے ہیں۔ اس طرح یہ سفرنامہ اُس دور کے انگلستان کی تہذیبی، معاشرتی، مجلسی اور سماجی زندگی کی مکمل روداد کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے ــــــ

یوسف خاں عاشقانہ مزاج کا حامل شخص ہے اُس کے اس مزاج کا اظہار سفرنامے کی ہر ہر سطر میں موجود ہے عاشقانہ طبیعت کے باوجود وہ اپنی پاک بازی کا بھی چرچا کرتا ہے اور حسین عورتوں سے اپنے میل جول کے تذکرے کے ساتھ ساتھ یہ جملہ بھی بڑھا دیتا ہے۔ مگر خالی اغراض نفسانی ــــــ عشق کے معاملے اور حسن پرستی کے دعوے کی تائید اس واقعے سے ہوجاتی ہے :-

"سب طرح سے مجھ کو گاڑی پر آسایش تھی مگر آدھی راہ میں ایذا پہنچی۔ اس لیے کہ کوچوان نے ایک عورت بدشکل کو میرے پاس بٹھلایا۔ پہاڑ سے موٹی تھی، صورت اُس کی سے نفرت ہوتی تھی۔ میں نے اپنے تئیں بہت بچایا تو بھی اُس کے موٹاپے سے صدمہ پہنچا۔ خدا نے خیر کی کہ وہ آدھی راہ سے اُتر گئی" ــــــ　(ص ۱۲)

ایک اور دلچسپ واقعہ یوں بیان کیا ہے :-

"پانی برسنے لگا، سارے کپڑے تر ہوگئے مگر گرتے پڑتے گھر چلے۔ راہ میں دو رنڈیاں، ایک خوبصورت، دوسری کریہہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اُس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی، تماشا دیکھتی، پیچھے دوڑی آئیں۔ ایک بار پاؤں پھسلا، دونوں لڑکیاں لڑکھڑا کر گر پڑیں۔ میں نے قریب جاکر زن جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا" ــــــ

حسن پرستی کے ساتھ ساتھ یوسف خاں عورتوں کا بڑا احترام کرتا ہے۔ وہ عورتوں کے بارے میں بڑے عمدہ خیالات رکھتا ہے۔ اُس کے خیالات ترقی پسندانہ ہیں۔ آج سے سَو سال پہلے آزادیٔ نسواں کی بات کرنا یوسف خاں کے اسی ترقی پسندانہ مزاج کا اظہار ہے۔ "عجائباتِ فرنگ" معلومات کا خزینہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی دلچسپ سفرنامہ ہے۔ اس کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ اس کا اسلوب بھی ہے۔ زبان انتہائی سادہ سلیس مگر پُر لطف ہے۔ آج سے سوا سو برس پہلے کے رواج کے مطابق عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ کہیں کہیں قافیہ پیمائی بھی کی ہے۔ لیکن عبارت کی چُستی کہیں بھی قاری کو بے مزہ نہیں کرتی۔ جابجا فارسی اور اُردو کے اشعار، تمثیلوں، ضرب الامثال اور محاوروں سے عبارت میں چاشنی اور رنگینی پیدا کی ہے۔ مجموعی طور پر اس اسلوب کو عام فہم اور خوش گوار کہا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں تو عبارت بہت لطف دے جاتی ہے۔ یہ ٹکڑا دیکھیے :-

"جب آدھی رات کا وقت ہوا۔ طوفان شدید آیا۔ سبھوں کا دل گھبرایا اور جہاز ڈگمگایا، مگر قدرتِ الٰہی سے زنجیر لنگر کی نہ ٹوٹی۔ روح کسی ذی حیات کے قفسِ بدن سے نہ ٹوٹی ــــــ ؏
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت"　(ص ۴۰)

یوسف خاں کمل پوش کا یہ سفرنامہ ہمارے اپنے دور کا سفرنامہ معلوم ہوتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ــــــ
(بہ شکریہ "قومی زبان" کراچی - ستمبر ۱۹۷۷ء)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

شیکسپیئر کے اردو ترجمے

(اٹھارویں صدی تک)

جس طرح شیکسپیئر کی عظمت مسلم ہے اسی طرح اُردو زبان کی بھی، جو دنیا کی تیسری بڑی اور زندہ زبان ہے۔ اُردو ایشیا کی بھی سب سے اہم زبان ہے اور کل تک ہندوستان کی بھی لنگوا فرینکا رہی ہے جس میں پرائمری سے پوسٹ ڈاکٹریٹ تک تعلیم ہوتی تھی اُردو ایک پھلنے پھولنے والی زبان ہے۔ اور اس وقت تک وہ سرسبز و شاداب رہے گی جب تک کہ اُس کے مبلغین انتہائی خلوص اور محققین انتہائی جذبۂ قربانی کے ساتھ اُس کی ترقی کے لیے کوشاں رہیں گے۔

ایسے ہی مخلص کام کرنے والوں میں اڈنبرا اسکاٹ لینڈ، کا ایک شخص جان گلکرائسٹ تھا جو جارج ہیرٹ ہاسپٹل سے طبی سند لینے کے بعد عام انگریزوں کی طرح قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان آیا۔ لیکن بمبئی پہنچ کر اُس کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ اُردو زبان کی شیرینی اور اس کی شاعری نے گلکرائسٹ کے دل کو موہ لیا اور اُس نے میڈیکل پریکٹس کی بجائے اردو زبان سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ چونکہ اُردو ہمیشہ سے بمبئی کے عوام کی زبان رہی ہے۔ اس لیے اُس نے بہت جلد بول چال کی زبان سیکھ لی لیکن جب اُس کی تبدیلی کلکتہ ہو گئی۔ جو اُس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا دارالخلافہ تھا تو اُس کو اپنے مستقبل پر کئی بار نظرِ ثانی کرنی پڑی اور آخر میں اُس نے یہ طے کر لیا کہ وہ طویل رخصت پر جائے گا۔ چنانچہ اُس نے سر جان میکفرسن سے جو وارن ہسٹنگز کی جگہ منصرم گورنر جنرل تھا اُردو زبان اور اُس کی صرف و نحو حاصل کرنے کے لیے طویل رخصت کی اجازت چاہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین میں جان گلکرائسٹ سب سے پہلا شخص تھا جس نے ایک عوامی زبان کی طرف اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے منظوری دے دی اور وہ کمربستہ ہو کر دہلی۔ لکھنؤ۔ بنارس۔ فیض آباد وغیرہ میں طویل قیام بغرضِ حصولِ زبانِ اُردو روانہ ہو گیا۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد بالآخر وہ اس قابل ہو گیا کہ شیکسپیئر جیسے عظیم المرتبت ڈرامانویس کے شہ پارے بھی اُردو میں منتقل کر سکے۔

خیالِ ناقص یہ ہے کہ جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۰ء اور ۱۷۹۳ء کے درمیان "شاہ ہنری ششم" اور "ہملٹ" کے ترجمے مکمل کر لیے ہوں گے۔ لیکن طباعتی دشواریوں کے باعث وہ انھیں ۱۷۹۶ء سے قبل شایع نہ کرا سکا اور وہ بھی انتخابات کی صورت میں۔ جان گلکرائسٹ نے اپنے یہ انتخابات "ہندوستانی زبان کے قواعد" میں شایع کیے ہیں اور وہ اپنے "دیباچہ" میں لکھتا ہے۔

" یہ امر طالب علم کو غالباً گراں نہ گزرے گا کہ اُس کی زبان کے کسی شہ پارے کا ترجمہ نمونتاً ہندوستانی زبان میں پیش کیا

www.taemeernews.com

جائے تاکہ اس کا بھی اندازہ ہو سکے کہ دونوں زبانوں کے محاورات اُن حسین خیالات کی ادائیگی میں کس حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن کو لافانی شیکسپیر نے کارڈینل وولزے اور شاہزادے ہیملٹ کی زبان سے عالمِ خیال میں ادا کرائے تھے۔ میں نے ان دونوں مکالمات کا بول چال کی مہذب (ہندوستانی) زبان میں زیادہ سے زیادہ لغوی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ سلاست کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کا وہ اندازِ بیان بھی قائم رہے جو ایسے مسایل کے بیان میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ مشکل الفاظ جہاں تک ہو سکے استعمال نہ کروں جن کا استعمال فہمت زیادہ منشی گری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس ترجمے کے گھٹیاپن اور اس کی بے نمکی سے ناظرین کو اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ترجمے میں اصل کی روح اور اُس کے حسن کو برقرار رکھنا کس درجہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ راز بھی آشکارا ہو جائے گا کہ ہندوستانی زبان میں صد درجہ لطافت و صلاحیت کے باوجود ترجموں میں کیوں بے لطفی محسوس ہوتی ہے۔"

اب یہاں شیکسپیر کے ترجموں کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں" شاہ ہنری ششم" کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"خوش! اے عمدگی! لے اب تو ایک مدت خوش رہیو"

"یہی انسان کی حالت ہے۔ جیوں درخت آج ملایم پاتوں کے سے سرسبز ہوا (اور) گُل مراد کے سُرخ غنچوں سے شگفتہ (ہوا) (اور) رنگ بہ رنگ ترقی کی، پھولوں پہ آیا (اور) تیسرے دن ایسا ایک جاڑا آتا ہے۔ ہائے کیسا سخت جاڑا! کہ جس وقت اوس (اس) نادان بے چارہ انسان نے یقین جانا کہ اب میری بزرگی کا پھل پکتا ہے، تب وہ (سخت جاڑا) سُکھاتا ہے۔ اوس کو جڑ تک (اور) وہ گرتا ہے میری طرح۔ میں نے دریائے شان میں کئی ایک موسم گرما کے جیسے چھوٹے شوخ لڑکے، جو گھڑوں پہ تیرتے ہیں اپنی تھاہ (تھاہ) کی حد سے بہوت (بہت) پرے آزمایا۔ آخر میرے نیچے پھولا ہوا بلند غرور کا گھڑا مجھ دار (منجدھار) میں پھوٹا (اور) مجھ ضعیف، پیر مرد۔ خدمت رسیدہ کو خونخوار دھارے کی موج پہ، کہ وہ نت مجھے ڈبوئے رکھے گی، چھوڑا ہے۔"

"ناچیز جاہ و جلال اِس جہان کے! اب میرے تئیں نفرت ہے تم سے، کیونکہ میں (نے) اپنا دل منور پایا ہے، ہے۔ ہے وہ کیسا کم بخت غریب آدمی ہے جو آسرا رکھتا ہے بادشاہوں کے توجہات پر، جو جس شیریں تبسم اور خوش مد نظر سلاطینوں کی ہم یہ خواہش تاکتے ہیں۔ اُن دونوں اور اپنی ذلت کے عرصے میں زیادہ جان کندن اور تشویش ہے۔ عورتوں کے دل اور لڑائی کے میدان سے (زیادہ) غرض جب وہ بیکس اپنے درجے سے گرتا ہے تو ابلیس کی طرح گرتا (رہتا ہے) اور پھر ہرگز اُٹھنے (اُٹھنے) کا نہیں۔"

"ہملٹ" کا ترجمہ پیش ہے:

"جینا، خواہ نہ جینا؟ سوال یہی ہے کہ بہتر ہے دل میں برداشت کرنا قہر آلود قسمت کی فلاخن و تیرباران کو یا سن لکھ (رسم لکھ) دست بہ شمشیر ہونا دریائے مصیبتوں کے دوست بہ شمشیر ہونا دریائے مصائب کے مقابلے میں اور تمام کرنا اون کو (ان کو) مرنا کیا؟ سونا ہے کچھ اور نہیں۔ یہ کہنا ایک نیند سے ہم مل میٹ (؟)"

کرتے رہیں) دردِ دل اور ہزار صدمات فلکی جن کا متحمل ہر ایک متنفس ہے۔ یہ مراد ایک ہے جس کو یہ آرزو چاہا چاہیے۔

مرنا! درست۔ سونا ہے، شاید سپنا۔ دیکھنا فی الواقعہ سدِّراہ یہی ہے کہ جب ہم نے اس کشمکش دنیاوی سے نجات پائی۔ تب اس موت کی سرزمین میں کیسے خواب نظر آویں گے۔ یہی تشویش ہم کو خوف و رجا میں رکھتی ہے۔ امتیاز یہی ہے جو اذیت کی انتہاں تک (یہاں تک) عمر دراز کرتی ہے۔ والا کون سہتا زمانے کی کوٹک (؟) واہانت ظالم کے ظلم، مغرور کی حقارت، جگر سوزی، عشقِ خام کی، قیدی عدالت کی، غرور عہدے، بادشاہی کا اور لات بیزار بتندلوں کی، جو صابر قدر انگیزتا ہے۔ ہرگاہ وہ آپ اپنی مخلصی کر سکتا ہے۔ خالی ایک چھوری (چھری) سے۔ کون بوجھ اٹھاتا، دُکھ بھرنے اور لہو پانی کرنے کے لیے بیچ مکدّرِ زندگی کے جو (تاکہ) بعدِ مرگ کسی چیز کی دہشت نہ ہوتی وہ ملک اَن دیکھا جس کی منزل سے کوئی مسافر پھرتا نہیں۔ یہی اختیار انسان کو گھبراتا ہے (اور) ہم کو سہاتا ہے۔ دے (وہ) خرابیاں جو موجود ہیں پہلے اس کے کہ بھاگیں اُدروں کی طرف کہ وہ نامعلوم ہیں یوں ہی غیرت ہم کو بزدلا بناتی ہے اور اسی طرح اصل رنگ استقلال کا پھیکا ہو جاتا ہے۔ فکر کے زیرِ عکس سے۔"

غرض یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ سنہ ۱۷۹۰ء سے پہلے شیکسپیر سے روشناس ہو چکا تھا کیونکہ انگلستان کی سفری ناٹک منڈلیاں جو بمبئی سے براہ راست یا مدراس قیام کرتی ہوئی کلکتہ پہنچتی تھیں اپنے دورانِ قیام ہند میں اس قدر اردو الفاظ سیکھ لیتی تھیں کہ بلا جھجک اور روانی کے وہ اپنے ڈراموں میں اُردو الفاظ استعمال کر سکتی تھیں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "اردو تھیٹر" جلد اول ص۲۰۶ تا ص۲۱۷ میں ایک نغماتی ڈرامہ "سفرِ بنگال" کا ترجمہ پیش کیا ہے جس میں مندرجہ ذیل الفاظ موتیوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً خدمت گار۔ مشعلچی۔ حرامزادہ۔ سلام علی بجرا۔ چھتری۔ ٹپالی۔ حقہ۔ پنکھا۔ دربان۔ سرکار۔ برآمدہ۔ لال شربت۔ چھکڑی۔ جھوٹ۔ پینے کا پانی۔ بہادر۔ چوب دار۔ صاحب لوگ آتا ہے خبردار ہو جاؤ۔ جب ایک ہی انگریزی ڈرامہ میں اس قدر اُردو کے الفاظ شامل ہوں تو انگریزی کا اُردو پر اور اُردو کا انگریزی پر کس قدر اثر پڑا ہوگا۔ یہ ڈراما سنہ ۱۷۹۶ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے اور لندن سے سنہ ۱۸۰۲ء میں شایع ہوا تھا۔

اسلامی تاریخ پر
پروفیسر سید نواب علی کی مشہور مستند کتابیں

سیرت رسول اللہ
صفحات: ۴۶۰ ——— قیمت: ۲۷ روپے

تاریخ صحف سماوی
صفحات: ۳۵۲ ——— قیمت: ۱۲ روپے

مکتبۂ افکار، رابسن روڈ۔ کراچی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ڈاکٹر جان گلکرسٹ

(سنہ ۱۷۸۳ء – سنہ ۱۸۴۱ء)

www.taemeernews.com

سر ولیم جونس
(سنہ ۱۷۴۶ء - سنہ ۱۷۹۴ء)

سر چارلس مٹکاف
(۱۷۸۵ء - ۱۸۴۶ء)

سر چارلس ولکنس
(۱۷۴۹ء - ۱۸۳۶ء)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

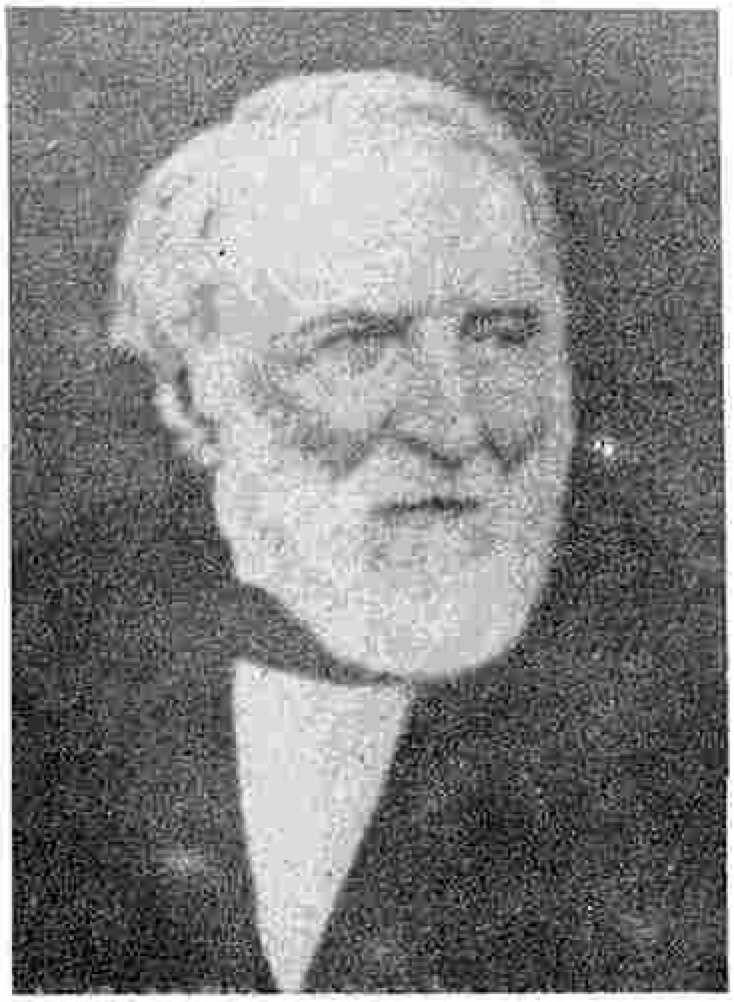

گارساں دتاسی

گیریرسن

لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی عمارت

www.taemeernews.com

رالف رسل

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز

www.taemeernews.com

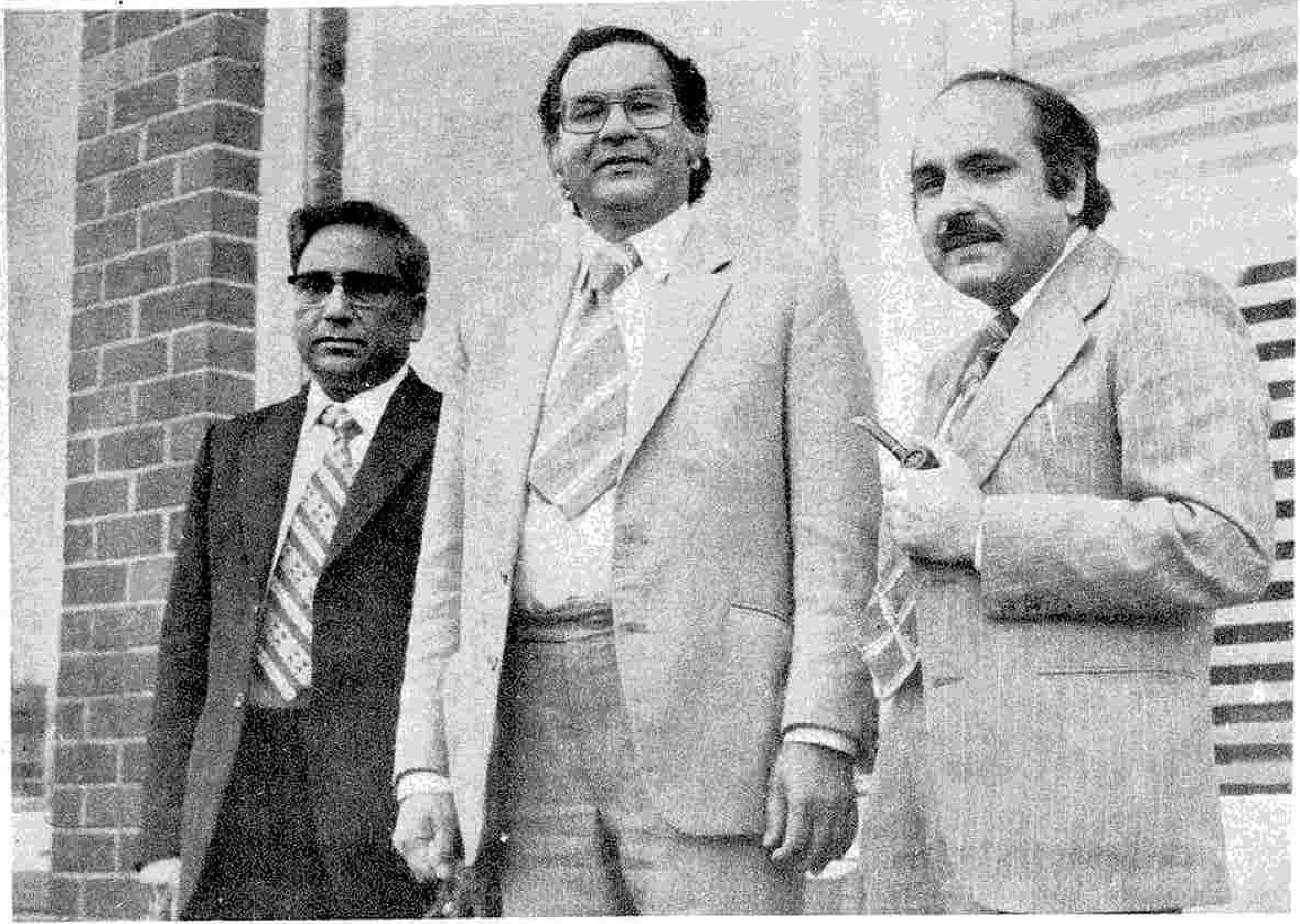

غلام قادر آزاد، مقصود الٰہی شیخ، منیر احمد

حلقۂ ارباب ذوق - لندن کے زیر اہتمام کرشن چندر کی یاد میں منعقدہ اجلاس کے شرکاء

(دائیں سے) بخش لائلپوری - مجیب ایمان - سلطان الحسن - جامی ردولوی - سکندر محمد خاں تلچ - عبدالحمید شرار - سحاب قزلباش
عاقل ہوشیارپوری - ابن انشا (صدر جلسہ) ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز - گلشن کھنہ - سوہن راہی - اطہر راز

فوٹو: ۱۲ر مارچ ۱۹۷۶ء - کانوے ہال لندن

www.taemeernews.com

ن م۔ راشد، شیلا راشد (شملہ ۱۹۷۵ء)

ابن انشا

نسیم شاہجہانپوری

www.taemeernews.com

چاند کرن

محسنہ جیلانی

پروین مرزا

فیروزہ جعفر فضا

www.taemeernews.com

محمود ہاشمی

سلیم قریشی

سلطان محمود

ڈاکٹر سعید اختر درّانی

www.taemeernews.com

ڈاکٹر خالد حسن قادری

شش صغیر ادیب

قیصر تمکین

اکبر حیدرآبادی

بخش لائلپوری

سوہن راہی

جی اے بلبل

عقیل دانش

حسن اجمل مسرت

www.taemeernews.com

مانچسٹر میں فیض احمد فیضؔ کی صدارت میں ایک یادگار مشاعرہ
موج فرازی اپنا کلام سنا رہے ہیں

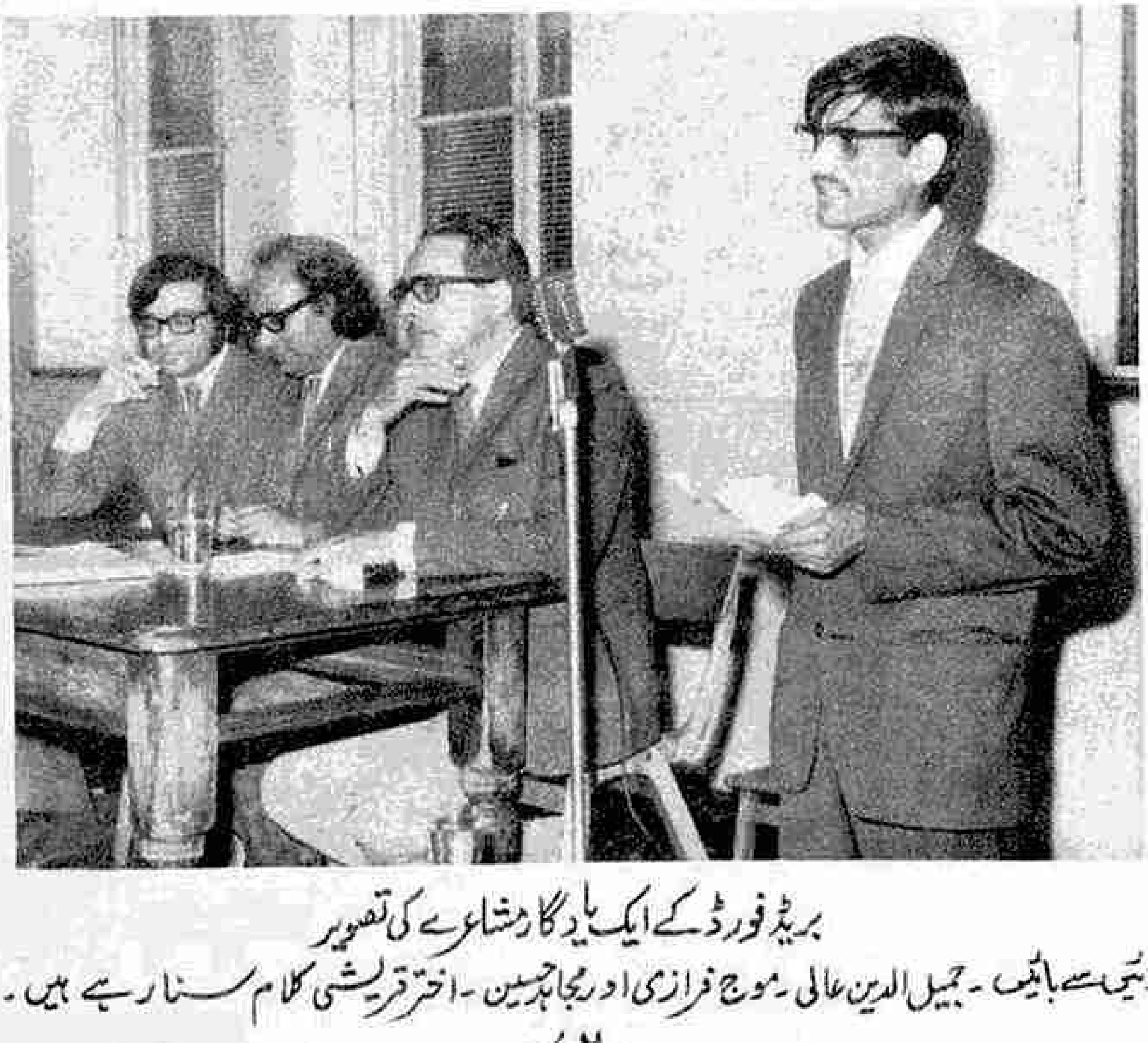

بریڈ فورڈ کے ایک یادگار مشاعرے کی تصویر
دائیں سے بائیں ۔ جمیل الدین عالی ۔ موج فرازی اور مجاہد حسین ۔ اختر قریشی کلام سنا رہے ہیں ۔

www.taemeernews.com

افسر صدیقی

عبدالقادر سہروردی

ڈاکٹر عبادت بریلوی

شبیر کاظمی

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

شریف کنجاہی

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی

فارغ بخاری

کامل القادری

ساقی فاروقی

باقر انجم

حبیب حیدرآبادی

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

ضمیر نیازی

محمد احمد سبزواری

عتیق احمد

محمد علی صدیقی

ڈاکٹر معین الدین عقیل

www.taemeernews.com

ہاشم رضا

مختار زمن

شفقت رضوی

عابد ودود

ریاض صدیقی

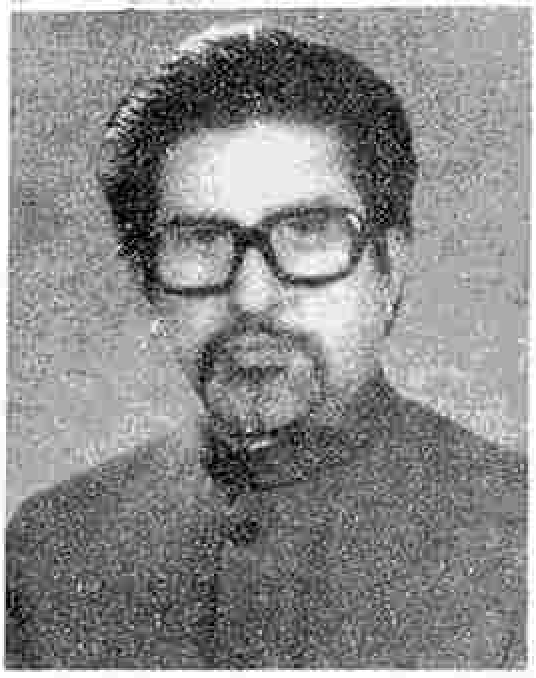

آذر زوبی

ڈاکٹر ڈیوڈ کے اعزاز میں اطہر راز کے استقبالیے کے شرکاء

(دائیں سے) ۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری ۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز ۔ معین الدین شاہ ڈاکٹر مجیب ایمان ۔ اطہر راز ۔ سحاب قزلباش ۔ پروفیسر اسد الرحمن ۔ سوہن راہی ۔ اطہر لکھنوی ۔ عاقل ہوشیار پوری عبدالحمید شرار ۔ مسٹر ونود ۔ ڈاکٹر فاخر حسین

www.taemeernews.com

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اطلاع

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

ہمارے پیش رو ـــــ چند قدیم ادبی رسائل

نور بصیرت

فن تاریخ

No. XXV. AUGUST. 1870.

DISCOVERIES OF SCIENCE.

مظہر العلوم

OR

THINGS WORTH READING & REMEMBERING.

A MONTHLY MAGAZINE:

R. F. SAUNDERS, C. S.,

SHAHJEHANPORE

1870.

اتالیق پنجاب

بابت ماہ اگست ۱۸۶۹ء

سرکاری مطبع میں چھپا

www.taemeernews.com

برطانیہ میں اردو ایڈیشن

ضمیر نیازی

ریاض صدیقی

ڈاکٹر معین الدین عقیل

عتیق احمد

انگریزوں کے قایم کردہ ادارے

www.taemeernews.com

ضمیر نیازی

فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی تاسیس سے ایک سو تیئیس (۱۲۳) سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب بست وکشاد کی معاملہ فہم اور دور رس نگاہوں نے "انڈوستان" زبان کی اہمیت اور ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس ملک میں ان کے قدم اسی صورت میں جم سکتے ہیں جب وہ یہاں کی زبان میں مہارت حاصل کریں۔ ابھی اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں بند بھی نہیں ہوئی تھیں کہ کمپنی کی مجلس انتظامیہ نے ۲۲ دسمبر ۱۶۷۷ء کے اپنے ایک مراسلے میں قلعہ سینٹ جارج (مدراس) کو لکھا: [1]

"اس کا اعلان کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے جو ملازمین فارسی سیکھیں گے ان کو دس پونڈ اور جو انڈوستان زبان سیکھیں گے ان کو بیس[۳] پونڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔ نیز یہ کہ اس زبان کی تعلیم دینے والے کسی مناسب آدمی کا تقرر کیا جائے۔"

یہی انعام واکرام پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) کے بعد ایک مستقل الاؤنس کی صورت اختیار کر گیا۔ کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کے قیام تک اپنے سول اور فوجی ملازمین کو ایک معینہ مدت تک تیس[۳] روپے ماہوار کا وظیفہ منشی الاؤنس کے نام سے دینا شروع کیا تاکہ وہ منشی رکھ کر باضابطہ ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ [2]

فورٹ[3] ولیم کالج کے قیام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص۳۹ محمد عتیق صدیقی۔ علی گڑھ ۱۹۶۰ء

[2] ایضاً ص ۵۱

[3] فورٹ ولیم: ۱۶۹۰ء میں اورنگ زیب کی فوجوں کے ہاتھوں شکست فاش کے بعد انگریزوں کو ایک صلح نامہ کے ذریعہ کلکتہ میں ایک قطعۂ اراضی مرحمت کیا گیا۔ دس سال بعد یعنی ۱۷۰۰ء میں انگریزوں نے اپنے تجارتی مفادات کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ نما بستی بنائی جسے فورٹ ولیم کا نام دیا گیا۔ اس کی دوبارہ تعمیر جنگ پلاسی کے بعد ۱۷۵۷ء اور ۱۷۷۳ء کے درمیان عمل میں آئی۔ اس قلعہ کی سیاسی اہمیت اس بات سے عیاں ہے کہ کلکتہ آنے جانے والا کوئی بھی برطانوی جہاز اسے سلامی دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ ۱۷ مئی ۱۷۹۹ء کے کلکتہ گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

www.taemeernews.com

" صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اُردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنید کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں "[1] باغ و بہار کی تالیف کے بعد میر امن نے جب گنج خوبی لکھی تو اس کے ابتدائیہ میں واشگاف لفظوں میں یہ بھی لکھ دیا:۔

" صاحبان عالی شان، جو ارکانِ سلطنت کے ہیں ان کے حق میں معاملات ملکی کے سمجھنے بوجھنے کے لیے یہ غور فرمایا کہ جلد خبردار اور واقف کار ہو کر کاروائی عدالت اور تحصیل کی کریں لہٰذا ہنا مدرسے (فورٹ ولیم کالج) کی ڈالی "[2]

اس مقصد کے علاوہ ایک مخصوص معیار بھی پیشِ نظر تھا:

" اس قصے (باغ و بہار) کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام۔ آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے "[3]

کالج کے ایک اور منشی میر بہادر علی حسینی نے نثر بے نظیر " خاص و عام کی بول چال کے مطابق طرز سہل واسطے صاحبانِ نو آموز کے لکھی "[4]

کپتان جان ولیم صاحب بہادر نے یہی ہدایت مولوی اکرام علی کو دی:۔

" رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبانِ اُردو میں ترجمہ کرے لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں "[5] تاکہ آسان و سلیس زبان کے رواج سے عربی اور فارسی کا اثر بتدریج کم ہو جائے اور یہی ہوا۔ اس مخصوص معیار کو اپنانے کی وجہ وہ سیاسی مقاصد تھے جس کا اہلِ نظر کو بخوبی احساس تھا چاہے وہ کالج کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ سے آگے) ٹیپو سلطان کی شہادت اور محاصرۂ سرنگا پٹم کی خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی درج ہے۔ " اس کامیابی کی خوشی میں گورنر جنرل نے فورٹ ولیم سے توپیں سر کیے جانے کا حکم جاری کیا تھا " ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اور اس کے بعد بعض اہم سیاسی قیدی یہاں رکھے گئے تھے، جن میں واجد علی شاہ بھی شامل تھے۔ جو چھبیس[26] ماہ تک اس قلعہ میں نظر بند رہے۔

History of Freedom Movement, Vol. I page 640
By R. C. Mujumdar, Calcutta, 1963

چیمبرس انسائیکلو پیڈیا جلد دوم ص۶۲۵، گذشتہ لکھنؤ ص۱۰۹، ص۱۲۰ عبدالحلیم شرر تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں
اردو ڈرامہ و اسٹیج ص۱۰۲ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ طبع اول لکھنؤ ۱۹۵۷ء

1. باغ و بہار۔ مقدمہ ص۳ تالیف و ترتیب ممتاز حسین۔ کراچی ۱۹۵۸ء
2. گنج خوبی، سبب تالیف ص۳ بمبئی ۱۸۴۶ء
3. باغ و بہار۔ مقدمہ ص۴ تالیف و ترتیب ممتاز حسین۔ کراچی ۱۹۵۸ء
4. نثر بے نظیر۔ دیباچہ ص۱۱ کلکتہ ۱۸۰۳ء
5. اخوان الصفا ابتدائیہ ص۶۲، مرتبہ ڈاکٹر اعجاز نقوی۔ لاہور ۱۹۶۶ء

www.taemeernews.com

اندر ہوں یا باہر۔ اس درس گاہ کے خاتمے کو ابھی ربع صدی بھی نہیں بیتی تھی کہ محمد حسین آزاد نے لکھا:

"ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کا دل بہلا رہا تھا، اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اُس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا۔ کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرنی ہے اُس کی زبان سیکھی جائے۔" [1]

میر امن نے صاحبانِ ذی شان کے شوق کے ساتھ ساتھ یہ کہہ کر "ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں" ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حل و عقد کے سیاسی عزائم کی بھی نقاب کشائی کر دی، جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ نووارد قوم کے افراد اہلِ ہند کے مزاج و عادات، رسوم و رواج اور عقاید و خیالات سے آگاہ ہو کر ملکی معاملات بخوبی انجام دے سکیں۔ تاکہ نظم و نسق میں یا مقدمات کے فیصلے کے وقت کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھیں جو اگرچہ انگریزی قانون کے مطابق ہو۔ لیکن رعایا کے مسلمہ عقاید کے برخلاف بھی نہ ہو۔" [2]

یوسف الف۔ اسمتھ نے باغ و بہار کے انگریزی ترجمہ کے دیباچے میں یہاں تک لکھ دیا:

"ہندوستان پر ہماری گرفت اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے فوجی اور سول ملازمین ہندوستان کی زبان میں مہارت نہ پیدا کر لیں۔ کیونکہ یہ زبان راس کماری سے ہردوار اور لاہور سے چٹاگانگ تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔" [3]

دوسری جانب لسانی اختلاف کی بنا بھی رکھ دی گئی اور علاقائی ادب کی تربیت و پرداخت کی آڑ میں کالج کے نصاب میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی [4] (اردو + ہندی) بنگلہ [5] تلنگی، پنجابی [6] مرہٹی اور تامل زبانیں شامل کر لی

---

[1] آب حیات ص ۲۵ لاہور ۱۹۵۷ء

[2] آرایش محفل۔ انتقاد ص ۴۸ سید عابد علی عابد لاہور ۱۹۶۳ء

[3] باغ و بہار کا قدیم انگریزی ترجمہ از عابد رضا بیدار مشمولہ نوائے ادب ص ۳۹ بمبئی بابت جولائی ۱۹۶۰ء

[4] گارساں دتاسی لکھتا ہے: "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو اور ہندوستانی ایک ہی نام ہے، موخرالذکر نام یورپینوں کا دیا ہوا ہے۔" مقالات گارساں دتاسی جلد دوم ص ۷ دہلی ۱۹۴۳ء

[5] بنگلہ زبان کے ارتقا پر بحث کرتے ہوئے آر۔ سی۔ مجمدار لکھتے ہیں: "انیسویں صدی سے قبل بنگالی زبان میں نثری ادب کا کوئی وجود نہیں تھا۔ بنگالی نثر کی ابتدا ۱۸۰۰ء میں اس وقت ہوئی جب کہ انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ اس کالج میں ولیم کیری کی سرکردگی میں بنگالی شعبہ بھی قایم کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۱ء تا ۱۸۰۷ء میں بنگالی نثر کی متعدد کتابیں تالیف کی گئیں۔ کیری خود بھی کئی کتابوں کا مصنف و مؤلف ہے۔ ان میں بنگالی زبان کی قواعد اور بنگالی انگریزی لغت بھی شامل ہے۔"

History of Freedom Movement, Vol. I page 304-5

[6] لالہ کاشی راج کھتری لاہوری پنجابی شعبے میں منشی مقرر کیے گئے۔ پنجابی زبان کی پہلی قواعد کالج کے (باقی اگلے صفحہ پر)

www.taemeernews.com

گیئی۔ ہندوستانی زبان کے پس پردہ ایک نئی زبان بنائی گئی جسے ہندی کا نام عطا کیا گیا بقول عبداللہ یوسف علی [۱] "شری للولعل نے ٹھیٹھ ہندی میں جو نثر لکھی اس نے ایک مصنوعی زبان کی بنیاد ڈالی ..... جو اس زبان سے جو عام طور پر بولی جاتی تھی بالکل علاحدہ معلوم ہوتی تھی"۔

اس نئی زبان کا نام "کھری ہندی" [۲] تجویز کیا گیا جس میں عربی اور فارسی کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ میرامن اور آزاد نے اشارۃً اور ان کے بعد آنے والوں نے کھل کر فورٹ ولیم کالج کے سیاسی اغراض و مقاصد پر اظہار خیال کیا ہے۔ انیسویں صدی کے ایک ذی علم بزرگ راجہ شیوپرشاد، ستارۂ ہند، لکھتے ہیں: [۳]

"اس انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جان گل کرسٹ صاحب نے میرامن ..... اور للولعل جی کو حکم دیا کہ نثر کی کتابیں اس ملک کی زبان میں ایسی تصنیف کریں جن کو پڑھ کر صاحب لوگ اس ملک والوں کی بولی سمجھ لیویں۔ دونوں مصنف بے شک حیران ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ اُن کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ دونوں نے کتاب لکھی لیکن دونوں کو ایک نئی زبان بنانی پڑی۔ للولعل نے تو پریم ساگر میں سے بالکل فارسی لفظ خارج کیے۔ یہاں تک کہ اپنے مربی ڈاکٹر گل کرسٹ کے لیے بھی "صاحب" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ افسوس للولعل جی یہ بھول گئے کہ خود ان کے نام کا آدھا یعنی 'لعل' لفظ فارسی ہے۔ میرامن نے گو بعض مقام میں "نداں" اور "ٹک" وغیرہ ایسے ہندی لفظ لکھے ہیں کہ جواب استعمال میں نہیں آتے تاہم باغ و بہار کی ابتدا میں ایک لفظ ایسا فارسی مرکب کا لکھا ہے کہ جس سے شاید صاحب لوگوں کو تمام عمر کام نہ پڑے۔ یعنی دلق پوشش"۔

کالج کے مصنفین اور مؤلفین کو بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ انھوں نے جس طرز تحریر کو اپنایا ہے وہ اُن کے ذاتی اور مروجہ ادبی اسلوب کے موافق نہیں۔ میر بہادر علی حسینی نے اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر نثر بے نظیر دوم مرتبہ لکھی، دوسری بار کے سبب [۴] تالیف میں لکھتے ہیں:

"پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل واسطے صاحبانِ نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستانِ شیریں کو، کہ فی الحقیقت قصۂ شیریں ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مطبع سے ۱۸۰۷ء میں طبع ہوئی۔ "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" ص۹۶ پروفیسر جاوید نہال، "فورٹ ولیم کالج" سید سبط حسن، مشمولہ سہ ماہی اردو کراچی ص۱۰۰ بابت جنوری ۱۹۲۶ء

اس صرف نحو کے مؤلف پادری ولیم کیری تھے تفصیل کے لیے دیکھیے۔ ولیم کیری۔ ایک مایہ ناز مسیحی مشنری و مصلح کی سرگزشت ص۲۱۳ از ایس۔ ایم بسنگھ۔ طبع دوم لاہور ۱۹۶۰ء

[۱] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص۱۳۱ کراچی ۱۹۶۷ء

[۲] ہندی ادب ص۹۵۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کراچی ۱۹۷۲ء

[۳] منقول از رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص۶۰-۵۹ از ڈاکٹر نیر مسعود۔ لکھنؤ ۱۹۶۷ء

[۴] نثر بے نظیر دیباچہ ص۱

www.taemeernews.com

شیریں تر ہے۔ اس روتیہ سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان دان و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے۔ اور اس ہیچ مداں کی ایک یادگاری دنیا میں رہے"[1]

بیسویں صدی میں سید محمد[1]، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ[2] اور دیگر مورخین ادب اُردو نے اسی بات کا اعادہ کیا ہے۔ اس طرح اردو اور ہندی دو متوازی خطوط پر دانستہ طور پر پروان چڑھائی گئیں، جن میں ایک کا رسم الخط نو ناسخ تھا اور دوسری کا دیوناگری طے پایا۔ اس تفریق نے آگے چل کر ایک مستقل نزاع[3] کی صورت اختیار کرلی۔ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ہندستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر یہ محسوس کرلیا تھا کہ فورٹ ولیم کالج میں ہندی اور اردو کا اختلاف ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کھڑا کیا جارہا ہے۔ دتاسی نے واضح طور پر اس کی نشان دہی کرنے کے ساتھ اسے ایک "بھاری غلطی" قرار دیا تھا۔ دتاسی لکھتا ہے:[4]

> "ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ حکمتِ عملی رہی تھی کہ اردو کو ہندی سے علٰحدہ تصور کیا جائے ۔۔۔۔۔ اس باب پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے خواہ مخواہ کی جو ایک خلیج اردو اور ہندی کے درمیان پیدا کردی ہے وہ غیر ضروری ہے۔ یہ دراصل بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں تصور کیا جائے"

کالج کا قیام

ایسٹ انڈیا کمپنی کا صد سالہ دور (۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء) جہاں ایک طرف لوٹ کھسوٹ، ظلم و تشدد، سازش و دھوکہ دہی اور عیاری و مکاری کی داستانوں سے پُر ہے وہیں لزدار قوم کے چند افراد نے برصغیر کی مختلف زبانوں اور اُن کے ادب کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

اس کا اعتراف اس سرزمین کے ہر ذی علم[5] نے کیا ہے۔" وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل سے لے کر لارڈ ویلزلی

---

[1] اربابِ نثر اردو ص ۱۱ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳۷ء

[2] تاریخ ادب اردو ۔ حصہ نثر ص ۲ لاہور ۱۹۶۷ء مع مقدمہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

[3] کالج کے سیاسی مقاصد کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے:-

(الف) انیسویں صدی کے اہم اردو ادارے از خواجہ تہور حسین مشمولہ ادب لطیف لاہور (اردو نمبر) ص ۲۸-۲۶ دسمبر ۱۹۵۵ء

(ب) سید عابد علی عابد ۔ آرائش محفل انتقاد ص ۶۲-۴۲ لاہور۔ ۱۹۷۳ء

(ج) مرحوم فورٹ ولیم کالج از جمیل نقوی (مقالات نمبر) ص ۱۰۲۵ تا ۱۰۳۱ مشرب۔ کراچی بابت ۱۹۵۷ء

(د) گل کرسٹ اور اس کا عہد از عتیق صدیقی۔

[4] مقالات ص ۵۴۶، ص ۶۳۳

[5] (الف) سیر المصنفین ص ۵۴ محمد یحیٰی تنہا طبع دوم لاہور ۱۹۴۸ء

(ب) داستان تاریخ اردو ص ۸۳ حامد حسن قادری۔ طبع سوم کراچی ۱۹۶۶ء

(ج) باغ و بہار کی اہمیت از پروفیسر حمید احمد خاں مشمولہ باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ص ۲۴۷ مرتبہ سلیم اختر لاہور ۱۹۶۸ء

(د) اردو کی نثری داستانیں ص ۱۱۲ از ڈاکٹر گیان چند طبع دوم ۱۹۶۹ء کراچی

www.taemeernews.com

تک ہر ایک انگریز حاکم اپنے اپنے عہد میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو دیسی زبانیں سکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام کرتا رہا۔۔۔ اس خصوص میں پہلی منظم کوشش وارن ہیسٹنگز کی ہے۔ اس نے کلکتہ ...... میں ایک مدرسہ قایم کیا ..... اس میں زیادہ تر فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی ..... اس کالج کا دائرہ عمل نہایت محدود تھا اور کمپنی کی ضرورت کے لیے بالکل ناکافی ہے[1] " چنانچہ ولیزلی نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اس کام کی بنیاد ڈالی۔

گورنر جنرل مارکوئس رچرڈ ولیزلی کا دور حکومت یوں تو صرف سات سال [2] (۱۷۹۷ء تا ۱۸۰۵ء) رہا لیکن اس قلیل مدت میں اس کی دوربیں نگاہوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ مغلیہ سلطنت اور دیگر چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کا سورج غروب ہونے والا ہے۔ چنانچہ اُس نے وقت کے تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر جنوری ۱۷۹۹ء میں جان گل کرسٹ کے تعاون سے ایک مدرسہ Oriental Seminary کے نام سے کلکتہ میں قایم کیا۔ بظاہر یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا۔ لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک سرکاری درس گاہ کی تھی۔ جس کی مدت حیات صرف ڈیڑھ سال تھی۔ اس مدرسہ کی غرض و غایت کے بارے میں ایک یادداشت بتاریخ ۱۴ر ستمبر ۱۷۹۸ء ملتی ہے جس کی عبارت یہ ہے:[3]

> " بنگال سول سروس میں بھرتی ہو کر جو نوجوان (ہندوستان) آتے ہیں ان کو منشی رکھ کر ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیے عموماً اور فارسی سیکھنے کے لیے خصوصاً تیس روپے ماہوار کا بھتہ دیا جاتا ہے۔ لیکن منشی شاذونادر ہی انگریزی زبان سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے نو وارد رائٹرز (سول ملازم) کو پہلے ہندوستانی بول چال کی زبان سیکھنی ہوتی ہے، تاکہ وہ منشی سے بات چیت کر سکے۔ اس طریق تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منشی کی خدمات سے رائٹر بہت کم یا بالکل مستفید نہیں ہوتے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے .... مسٹر گل کرسٹ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ وہ نووارد رائٹروں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینے کے لیے روزانہ درس دیا کریں .... مسٹر گل کرسٹ فارسی کی ابتدائی تعلیم دینے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں "

اس مدرسہ کے قیام کے ساتھ ہی ولیزلی نے کمپنی کے ملازمین کو اعلیٰ پیمانے پر تعلیم دلانے کا ایک جامع منصوبہ بنا کر کمپنی کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کیا تاکہ ایک کالج کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ ابھی کمپنی کے عہدہ دار اس پر بحث و مباحثہ ہی میں مصروف تھے کہ گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء/ مطابق ۱۷ر صفر ۱۲۱۵ھ کو کالج کا افتتاح کر دیا۔ اور اسی تاریخ کو کالج کا مسودۂ آئین و ضوابط منظور ہوا۔ لیکن اس دستاویز پر جو عبارت درج کی

---

[1] ارباب نثر اردو ص ۱۴

[2] رچرڈ ولیزلی (ولادت ۱۷۶۰ء وفات ۱۸۴۲ء) A History of India, page 102-4, 208 By Percival Spear.

[3] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۴۱

www.taemeernews.com

گئی وہ خاصی معنی خیز ہے: [1]

"ہز لارڈ شپ (ولیزلی) کے حکم سے اس (دستاویز) پر ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی، جو میسور کے دارالسلطنت سرنگا پٹم میں برطانوی افواج کی شاندار اور فیصلہ کن فتح کی پہلی سال گرہ کی تاریخ ہے۔"[2]

کالج کے آئین وضوابط کے دیباچہ میں یہ عبارت درج ہے:

"خدائے قدوس کے فضل وکرم سے ہندوستان میں برطانیہ عظمیٰ کے سیاسی وفوجی اقتدار کو جو مسلسل کامیابی وکامرانی اور جنگوں میں جو پیہم فتح ونصرت نصیب ہوئی ہے اور..... ہندوستان و دکن کے وسیع علاقے ..... ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حکومت آ گئے ہیں اور حالات کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط سلطنت قایم ہو گئی ہے، جو متعدد آباد اور زرخیز صوبوں پر مشتمل ہے۔ جہاں مختلف قومیں آباد ہیں، جن کے مذہب، جن کی زبان، نیز جن کے عادات واطوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان سب پر الگ الگ مختلف آئین وضوابط، اور مختلف رسوم کے مطابق اب تک حکومت کی جاتی رہی ہے۔ برطانوی قوم کے مقدس فرض، اُن کے حقیقی مفاد، اُن کی عزت اور اُن کی حکمت عملی کا اب یہ تقاضا ہے کہ ہندوستان کی برطانوی سلطنت کے حدود میں عمدہ عمل داری کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں۔"

ان مناسب اقدام کی وضاحت دستورالعمل[3] میں اس طرح کی گئی:

"گورنر جنرل کونسل ایسے آئین وضوابط کی تشکیل کرے کہ ہندوستان میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمین کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی کے لیے مقامی زبانیں سکھائی جائیں۔ اور ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے۔ انھیں ہندوستان کی رسومات اور رواج سے بھی مکمل واقفیت ہونی چاہیے تاکہ جن علاقوں میں وہ تعینات کیے جائیں ان کا انتظام بخوبی کر سکیں۔ اور مقامی باشندوں سے میل جول پیدا کرنے میں انھیں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ چنانچہ برٹش انڈیا کے عمدہ نظم ونسق کی خاطر رچرڈ مارکوئس ولیزلی نے مندرجہ ذیل ضوابط مرتب کیے:۔

"(الف) آنریبل کمپنی بہادر کے جونیر سول سرونٹس کی تعلیم وتربیت کے لیے فورٹ ولیم میں ایک کالج کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے۔ اس کالج میں ادب، سائنس، فقہ اور ان دیگر مضامین کے شعبے کھولے جاتے ہیں، جن کا جاننا سول سرونٹس کے لیے نہایت ضروری ہے اور جنھیں سیکھے بغیر برٹش انڈیا پر عمدگی سے حکومت نہیں کی جا سکتی ہے۔

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۷

[2] ایضاً ص ۱۳۷

[3] ولیزلی کے مراسلات ص ۴۲۶ مرتبہ سٹڈنی اوون بحوالہ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۵۲-۵۳ از پروفیسر جاوید نہال۔ مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۶۷ء

www.taemeernews.com

"(ب) کالج کی اپنی ایک مناسب اور وسیع عمارت تعمیر کی جائے۔ جس میں ہر مضمون کے لیے الگ شعبہ ہو اور کالج کا اپنا کتب خانہ ہو۔

(ج) گورنر جنرل کالج کے مربی اور سرپرست ہوں گے۔

(د) سپریم کونسل کے اراکین دیوانی، فوجداری عدالتوں اور نظامت کے جج کالج کے گورنر (منتظم) ہوں گے۔

(ہ) کالج فنڈ کا انتظام گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا۔ کالج کا سربراہ پرووسٹ (Provost) ہوگا جو چرچ آف انگلینڈ کا پادری ہوگا۔[1]

ساتھ ہی ویلزلی نے ایک طویل یادداشت (مورخہ ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء) لندن روانہ کی جس میں کالج کے قیام کی غرض و غایت اور اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ہندوستان آنے والے ہر ملازم کو کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی کسی عہدے کے لیے موزوں سمجھا جائے۔ کالج کے اخراجات کے لیے اس نے بنگال اور میسور کی مالگزاری پر کالج ٹیکس لگانے کی اجازت بھی طلب کرلی۔[2]

کالج کے ضوابط و قوانین کی رو سے تمام نو وارد سول ملازمین کے لیے کالج میں تین سال تک تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ جہاں طلبہ کے لیے طعام و قیام کا انتظام کالج کے ذمہ تھا۔ ہر سال ۲ فروری کو کالج میں تقسیم اسناد کا جشن منایا جاتا تھا جس میں کامیاب طلبہ کو سندیں، تمغے اور نقد انعامات دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد عام جلسے میں طلبہ کے درمیان اردو، ہندی، فارسی اور بنگالی زبانوں میں مباحثے ہوتے۔ ۱۸۰۴ء میں ایک مباحثہ کے دوران ہنگامہ ہوگیا اور گل کرسٹ کالج سے استعفیٰ دے کر اپنے وطن روانہ ہوگئے۔ (تفصیل آگے آئے گی)

۲۹ ستمبر ۱۸۰۰ء کے کلکتہ گزٹ کے ایک غیر معمولی شمارے میں کالج کے مختلف شعبوں کے پروفیسروں کے تقرر کے اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری ڈیوڈ براؤن کو کالج کا پہلا پرووسٹ مقرر کیا گیا، جو کلکتہ بائبل سوسائٹی کے بانی تھے۔ جب کہ جان گل کرسٹ ہندوستانی شعبے کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد اس شعبے کے لیے منشیوں کا تقرر عمل میں آیا۔ مرزا علی لطف کے بیان کے بموجب میر تقی میر بھی کالج میں رسائی کے خواہش مند تھے۔ علی لطف لکھتے ہیں:[3]

> "جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کو زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو پیشی میر (میر تقی) کی ہوئی، لیکن علتِ پیری سے یہ بے چارے مجہول کے محمول ہوئے، اور نوجوانان نو مشق مرتی گری سے توتِ بدنی کے مقبول ہوئے زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے! کثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا خالی ہے۔"

---

[1] لارڈ ویلزلی کے مراسلات، خطوط اور یادداشت مرتبہ مانٹگمری مارٹن جلد دوم ص ۲۵۴-۵۵ لندن ۱۸۳۶ء بحوالہ "فورٹ ولیم کالج" از سید سبط حسن مشمولہ سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۷۶ء

[2] ایضاً ص ۳۵۶

[3] گلشن ہند ص ۲۰۹ بہ تصحیح مولوی عبدالحق۔ لاہور ۱۹۰۶ء

www.taemeernews.com

میر کا بڑھاپا ان کی تقرری میں مانع رہا، لیکن ٹھیک گیارہ سال بعد اسی کالج کے مطبع 'ہندوستانی پریس' سے کلیاتِ میر کا اولین ایڈیشن — "حسب الارشاد کپتان ٹیلر صاحب مدرس ہندی و امداد تامس روبک صاحب . . . . بہ تصحیح مرزا کاظم علی جوان اور مرزا جان طپش و مولوی محمد اسلم و تارنی چرن متر و منشی غلام اکبر ۱۸۱۱ء میں مطابق ۱۲۲۶ھ ہندوستانی چھاپہ خانے میں چھاپا گیا۔" [1]

بی ۔ این ۔ بنرجی[2] کالج میں ہندوستانی منشیوں کی تعداد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں فارسی کے بیس[20]، ہندوستانی کے بارہ[12]، بنگالی کے چھ[6] اور عربی کے چار[4] منشی مقرر کیے گئے ۔ لیکن ہندوستانی زبان کی مقبولیت کے پیشِ نظر جلد ہی منشیوں کی تعداد بڑھا کر پچیس کر دی گئی ۔ گل کرسٹ کے چار سالہ عہد میں کم از کم بیالیس[42] مصنفین، مترجمین اور منشی مختلف اوقات میں کالج کے ہندوستانی شعبے سے وابستہ رہے ۔ منشیوں کی ایک اور قسم بھی تھی ۔ جنھیں سندی منشی کہا جاتا تھا ۔ انھیں باضابطہ امتحان پاس کرنا ہوتا تھا ۔ جو کامیاب ہو جاتے انھیں سند دی جاتی تاکہ وہ طلبہ کو پرائیویٹ طور پر ٹیوشن دے سکیں ۔ یہ نہ تو کالج کے ملازم ہوتے تھے اور نہ انھیں کالج کی جانب سے تنخواہ دی جاتی تھی بلکہ ان کی تنخواہ کا بار طلبہ کو اٹھانا پڑتا تھا ۔

گل کرسٹ کے حالات و تصانیف

فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے سربراہ جان بارتھوک گل کرسٹ ۱۷۵۹ء میں بمقام ایڈنبرا (صدر مقام اسکاٹ لینڈ) پیدا ہوئے[3] ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مشہور طبی درس گاہ جارج ہیریٹ ہسپتال میں داخلہ لیا ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کوئی طبی سند حاصل کی یا نہیں ۔ عتیق صدیقی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات کی چھان بین کے بعد یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ان میں کہیں بھی ان کے نام کے ساتھ لفظ "ڈاکٹر" درج نہیں ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ان کی وہ تمام تصانیف جو ۱۸۰۵ء تک ہندوستان میں طبع ہوئیں ان میں بھی کسی کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" درج نہیں ۔ "ڈاکٹر" کی اعزازی سند انھیں ہندوستان سے مراجعت کے بعد ایڈنبرا یونیورسٹی نے ان کی علمی خدمات کے صلے میں عطا کی ۔

حصولِ علم کے بعد گل کرسٹ نے ویسٹ انڈیز کی راہ لی ۔ چند سال وہاں قسمت آزمائی کے بعد انھوں نے ہندوستان کا

---

[1] قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :۔ "میر کی وفات شعبان ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور کلیات ۱۲۲۶ھ میں چھپ کر شایع ہوا ۔ عجب نہیں اگر میر کے دورانِ حیات ہی اس کا انطباع شروع ہو گیا ہو . . . . ۱۲۲۶ھ کے بعد کلیاتِ میر کا کوئی ایڈیشن شایع ہوا ہے تو تجارتی اغراض سے ، ہندوستان اور پاکستان کے کسی ادبی ادارے کو اس طرف توجہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی ۔ یہ جس قدر شرمناک ہے ، اسی قدر قابلِ ستایش ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل و عقد کو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال قبل کلیات کی اشاعت کا خیال آیا ۔" "کلیاتِ میر کی اولین اشاعت" مشمولہ دلی کالج میگزین (میر نمبر) ص ۹۱-۳۸۱ دہلی ۱۹۶۲ء

[2] Dawn of New India, page 102 کلکتہ ۱۹۲۷ء

[3] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۳

www.taemeernews.com

رُخ کیا۔ یہاں پہنچ کر انھیں جس چیز نے اپنی طرف متوجہ کیا ۔ وہ یہاں کی زبان کی وسعت و ہمہ گیری تھی ۔ اپنی لغت و قواعد کے ضمیمہ میں گل کرسٹ لکھتے ہیں : [1]

"۱۷۸۲ء میں بمبئی میں وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام، خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو اس وقت تک نہ تو میرے لیے ہی خوش گوار ہو سکتا ہے ، اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے ، جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کر لوں ...... چنانچہ .... میں جم کر بیٹھ گیا ...... خوش قسمتی سے اپنے دوست کپتان جان ریڈ رہے ہے ..... سودا کا کلیات مجھے مل گیا ۔ ہندوستانی میں اس وقت (۱۷۹۶ء) تک جو مہارت میں نے حاصل کی ہے ، اس کے لیے کلیاتِ سودا اور اسی کریم النفس انسان (ریڈ رہے) ... کا میں بے حد ممنون ہوں " [2]

اس کے بعد گل کرسٹ ایسا جم کر بیٹھا کہ صرف دو سال کی قلیل مدت میں اس نے " مروجہ زبان میں اتنی دست گاہ " اور استعداد پیدا کر لی کہ اس زبان کے طالب علم سے وہ مؤلف ، مصنف اور آخر میں معلم کی صف میں جا پہنچا ۔ یہ سلسلہ کم و بیش بائیس ۲۲ سال تک ہندوستان میں جاری رہا ۔ کالج کی دستاویزات کے مطابق ۲۴ر فروری ۱۸۰۴ء میں گل کرسٹ نے اپنی "ناگہانی اور شدید علالت " کا عذر پیش کر کے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جو دوسرے ہی دن منظور کر لیا گیا ۔ عتیق صدیقی نے اپنی گراں قدر کتاب " گل کرسٹ اور اس کا عہد " میں استعفیٰ کی یہی وجہ [3] درج کی ہے ۔ جسے بعد کی تحقیقات کی روشنی میں خود انھوں نے اسے کالعدم قرار دیا ہے ۔ اپنے ایک مضمون " گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔ ایک گم شدہ کڑی [4] " سے معلوم ہوتا ہے ۔ تقسیم اسناد کے سالانہ جلسہ [5] کے بعد تقریری مقابلے کے لیے گل کرسٹ نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جس سے کلکتے کے مسلمانوں میں ہل چل پیدا ہو گئی اور انھوں نے گورنر جنرل کو ایک یادداشت پیش کی جس میں حکومت کو یاد دلایا گیا تھا کہ "کمپنی بہادر کی حکومت نے ہندوستانیوں سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی ۔ "

"لارڈ ویلزلی نے مجوزہ موضوع کو جس کی وہ خود بھی رسمی منظوری دے چکا تھا ، مسترد کر دیا ..... گل کرسٹ کو یہ بات اس قدر ناگوار گزری کہ طیش میں آ کر اس نے استعفیٰ دے دیا اور اپنے وطن اڈنبرا چلا گیا ۔

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۹۶

[2] ایضاً ص ۱۸۵

[3] اردو نامہ ۔ کراچی شمارہ ۱۷ ص ۵۷ تا ۶۶ بابت اکتوبر ۱۹۶۳ء [4] " یہ مجلس مباحثہ گورنر جنرل کے محل کے اس کمرے میں منعقد ہوئی جہاں شہنشاہِ ہند کے نمائندے کے سامنے ملک کے خراج گزار راجہ اور نواب اظہارِ عقیدت کے لیے جمع ہوتے تھے ..... اس مباحثہ میں گورنر جنرل ویلزلی .... عدالتِ عالیہ کے چیف جسٹس ، تمام ججوں اور اعلیٰ فوجی اور سول حکام کے علاوہ بغداد کے سفیر سلیمان آغا بھی شریک تھے " ۔ ولیم کیری ۔ ایک مایۂ ناز مسیحی مشنری و مصلح کی سرگذشت ص ۲۰۰ از ایس ایم ۔ سنگھ طبع دوم لاہور ۱۹۷۰ء

www.taemeernews.com

۱۸۱۶ء میں کمپنی نے اپنے ملازمین کو اردو سکھانے کے لیے اورنیٹل انسٹی ٹیوٹ نامی ایک ادارہ قایم کیا اور گل کرسٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہاں ایک بار پھر کمپنی کی بنیا شاہی آڑے آئی اور ۱۸۲۵ء میں یہ ادارہ ختم کر دیا گیا۔ لیکن گل کرسٹ اسے ذاتی طور پر ایک سال تک جاری رکھنے کے بعد اڈنبرا چلے گئے۔ اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی چنانچہ علاج و تبدیلئ آب و ہوا کی غرض سے پیرس پہنچے، جہاں ۹ رجنوری ۱۸۴۱ء کو بعمر بیاسی سال انتقال کیا۔[۱][۲]

ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد پروفیسر جیمس مویٹ عارضی طور پر ہندوستانی شعبے کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ ان کے بعد کے جن سربراہوں کے نام معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں:[۳]

جے۔ ایچ۔ ہارنگٹن۔ جوزف ٹیلر۔ ٹامس روبک۔ ابراہم لاکٹ۔

گل کرسٹ کی تصانیف | ڈاکٹر گل کرسٹ کی تالیفات و تصنیفات کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت[۴] (دو جلدیں)

A Dictionary, English and Hindoostanee

طبع اول کلکتہ ۱۷۸۶ء۔ ۱۷۹۰ء، طبع دوم اڈنبرا ۱۸۱۰ء، طبع سوم لندن ۱۸۲۵ء، طبع چہارم لندن ۱۸۵۰ء

۱؎ ارباب نثر اردو ص ۲۳، داستان تاریخ اردو ص ۹۵، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ص ۱۲۰ از سلیم اختر رسالہ گل کرسٹ مقدمہ ص ۲۲-۲۳ از خلیل الرحمٰن داؤدی۔ لاہور ۱۹۶۲ء

۲؎ ڈاکٹر گل کرسٹ کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ نے جنرل پپ سے شادی کر لی۔ اس خاتون نے ۱۸۶۵ء میں اپنی وفات کے وقت اپنے وطن اسکاٹ لینڈ کی مشہور اڈنبرا یونیورسٹی کے نام ساڑھے سات ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی چھوڑی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اس رقم سے تین وظیفے قایم کیے جائیں اور یہ وظیفے ایسے تین ہندوستانی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دیے جائیں جو صوبجات بنگال، مدراس اور بمبئی کے باشندے ہوں اور یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ ان تینوں صوبوں میں جتنے مشہور کالج ہیں ان کے طلبہ میں سے تین بہترین طلبہ کو مقابلے کے ذریعے سے منتخب کر کے یہ وظیفے دیئے جائیں۔" گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو ص ۱۶-۱۷ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ طبع دوم حیدرآباد دکن ۱۹۳۱ء

۳؎ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۲۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۵۵۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ لاہور ۱۹۶۵ء

۴؎ "ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کتاب میں کہیں ہندوستانیوں کو وحشی اور سفاک ظاہر کیا ہے، کہیں ان کی ابلہ فریبیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور کہیں اردو پر مہمل اعتراض کر کے اُسے تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔"

ان خیالات کا اظہار غلام عباس نے اپنے ایک مضمون بعنوان "ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری" میں کیا ہے۔ سہ ماہی اردو نامہ کراچی ص ۳۹ تا ۴۳ بابت شمارہ ۴، اپریل جون ۱۹۶۱ء

www.taemeernews.com

(۲) ہندوستانی زبان کے قواعد

A Grammar of the Hindoostanee Language

طبع اول کلکتہ ۱۷۹۶ء ، طبع دوم کلکتہ ۱۸۰۹ء

(۳) ضمیمہ (لغت و قواعد)　　The Appendix

طبع اول کلکتہ ۱۷۹۸ء

(۴) مشرقی زبان داں　　The Oriental Linguist

طبع اول کلکتہ ۱۷۹۸ء ، طبع دوم کلکتہ ۱۸۰۲ء

(۵) ہندوستانی زبان پر مختصر مقدمہ　　The Anti-jargonist

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۰ء

(۶) نو ایجاد یعنی نقشہ افعال فارسی　　A New Theory and Prospects

مع مصدرات آں و مترادف ہندوستانی　　of Persian Verbs

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۱ء ، طبع دوم کلکتہ ۱۸۰۳ء

(۷) ہندی کی آسان مشقیں　　Hindee Exercises

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۱ء

(۸) معلم ہندوستانی　　The Strangers – East India Guide

to the Hindoostanee, or Grand

Popular Language of India

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۲ء ، طبع دوم لندن ۱۸۰۸ء ، طبع سوم لندن ۱۸۲۰ء

(۹) بیاض ہندی[1] (دو جلدیں)　　The Hindee Manual or Casket of India

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۲ء

(۱۰) عملی خاکے　　Practical Outlines or A Sketch of Hindoostani

Orthoapy in the Roman Characters

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۲ء

(۱۱) ہندی الفاظ کی قرأت　　The Hindee Roman Orthoapical Ultimatum

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۴ء

---

[1] بیاض ہندی - ہندوستانی منشیوں کی اس وقت کی زیر طبع کتابوں کے طویل اقتباسات اس میں درج ہیں" اس کتاب کو ہندوستانی ادب کا پہلا انتخاب کہنا غلط نہ ہوگا" ۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۰

www.taemeernews.com

(۱۲) اتالیق ہندی — The Hindee Moral Perceptor

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۳ء، طبع دوم ۱۸۲۱ء

(۱۳) ہندی عربی آئینہ — Hindi Arabic Mirror

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۳ء

(۱۴) مکالمات انگریزی و ہندوستانی — English-Hindee Dialogue

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۴ء، اس کے علاوہ لندن اور اڈنبرا سے بھی ایک ایک ایڈیشن طبع ہو چکا ہے۔

(۱۵) مشرقی قصے — The Oriental Fabulist

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۳ء، طبع دوم اڈنبرا ۱۸۰۹ء

(۱۶) ہندی داستان گو — The Hindee Story Teller

طبع اول کلکتہ ۱۸۰۳ء، طبع دوم کلکتہ ۱۸۰۶ء

ہندوستانی منشیوں کی تالیفات و تراجم

گل کرسٹ نے کالج کے چار سالہ قیام کے دوران خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں۔ جن کی تعداد ترسٹھ[1] ہے۔ ان مصنفین مؤلفین اور مترجمین میں ہندوستانی شعبے کے منشی اور غیر ملازم دونوں شامل ہیں۔ مولوی حفیظ الدین (خرد افروز) اور مولوی نور علی بن نذر علی (بہار عشق) کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج کی جانب سے کتابوں کی ضرورت سے متعلق اشتہارات بھی شایع کیے جاتے تھے۔

مولوی حفیظ الدین، خرد افروز کے دیباچے[2] میں لکھتے ہیں:-

"فدوی نے حکم اشتہار سن کر عیار دانش کو کہ فی الحقیقت جواہر بے بہا ہے اور اب تک جواہر خانۂ فارسی میں مقفل تھی کلید کوشش سے کھول کر زبان ریختہ میں آب و تاب دے کے اردوئے معلیٰ میں جلوہ گر کی"[3]

مذکورہ عبارت خرد افروز اس کے اس قلمی نسخے میں درج ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے کتب خانے میں محفوظ ہے جب کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ عبارت "بحکم جان گل کرسٹ" صاحب میں تبدیل کر دی گئی ہے۔

مولوی نور علی، 'بہار عشق' کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:-[4]

"اکثر اشخاص کونسل اشتہار کے بموجب کتب فارسی زبان ریختے میں ترجمہ کرتے ہیں ..... اور سرخ روئی حاصل کرتے ہیں، اگر تم بھی کسی کتاب کا ترجمہ کر کے کونسل میں نذر گزرا دو تو ..... اس خاکسار نے نل دمن فیضی کا مطلب

۱۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۵
۲۔ منقول از انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۰۸
۳۔ خرد افروز دیباچۂ مصنف ص ۵۰۲ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
۴۔ منقول از انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۹۰

(بہ عنوان بہارِ عشق) لکھا۔۔۔۔۔"

مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے منظور شدہ کتابوں پر نقد انعام بھی دیا جاتا تھا۔ کالج کے ملازمین کو کم اور غیر ملازمین کو زیادہ۔ گل کرسٹ کی علاحدگی کے بعد مزید سولہ سال یعنی ۱۸۲۶ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح مختلف موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ سو[1] کتابیں تالیف و تصنیف ہوئیں۔ جنھیں چار شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(الف) داستانیں (ب) اخلاقیات (ج) تاریخ و سیر (د) مذہبیات۔ چند نامور مصنفین کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

میر بہادر علی حسینی (میر منشی[2]) نثر بے نظیر، اخلاقِ ہندی، تاریخ آسام، قواعدِ زبان اردو، مشہور بہ نقلیات رسالۂ گل کرسٹ[3] (دو جلدیں) نقلیات لقمانی (بہ اشتراک) ترجمہ کلام پاک[4] (بہ اشتراک)

میر شیر علی افسوس باغِ اردو (ترجمہ گلستان) آرائشِ محفل (سبحان رائے بٹالوی کی کتاب خلاصۃ التواریخ کا اردو ترجمہ) اس کے علاوہ چار کتابوں کی تصحیح بھی کی۔

میر امن باغ و بہار، گنج خوبی۔

سید حیدر بخش حیدری قصۂ مہر و ماہ، لیلیٰ مجنوں، توتا کہانی، آرائشِ محفل، ہفت پیکر، تاریخ نادری، گل مغفرت، گلزارِ دانش، گلدستۂ حیدری، تذکرہ گلشنِ ہند[5] دیوانِ حیدری۔

۱۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۷۔

۲۔ میر بہادر علی حسینی کالج کے پہلے میر منشی تھے۔ دوسرے شیر علی افسوس اور تیسرے تارنی چرن متر تھے۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۹۔

۳۔ "ڈاکٹر نیر اقبال اور جناب داؤدی (خلیل الرحمٰن) دونوں نے رسالہ گل کرسٹ کو مولوی کریم الدین (مؤلف طبقات الشعرائے ہند) کے حوالے سے میر بہادر علی حسینی کی تصنیف کہا ہے لیکن راقم السطور کے نزدیک مولوی کریم الدین کی شہادت کافی نہیں ہے۔ ان کے تذکرے میں واقعات کے بیان میں بڑی سے بڑی غلطی بھی ملتی ہے۔۔ تا وقتیکہ کوئی اور معتبر شہادت اس بارے میں نہ مل جائے۔ اس کتاب کو میر بہادر علی حسینی کی تصانیف میں شمار کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔" قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالۂ گل کرسٹ ص ۱۹-۲۰-۲۱ از ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ علی گڑھ ۱۹۷۳ء۔

۴۔ یہ ترجمہ مولوی امانت اللہ، میر بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان، مولوی فضل اللہ اور حافظ غوث کے اشتراک سے ۲ رمضان المبارک ۱۲۱۹ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۸۰۴ء کو مکمل ہوا۔ اس کے ابھی چھپن[56] صفحات ہی طبع ہوئے تھے کہ طباعت کا مزید کام روک دیا گیا۔ اس کے دو مخطوطات کا پتہ چل سکا ہے: (الف) مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ۔ "اس مخطوطہ کا کچھ حصہ کاظم علی جوان اور کچھ حصہ دوسرے مولویوں کا لکھا ہوا ہے۔" انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۹۸-۹۹۔ (ب) مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ تفصیل کے لیے دیکھیے کتب خانہ سالار جنگ مرحوم کی اردو کتابوں کی فہرست ص ۳۸ از مولوی نصیر الدین ہاشمی۔ حیدر آباد دکن ۱۹۵۷ء، نیز ماہنامہ برہان۔ دہلی ص ۷ بابت مارچ ۱۹۵۹ء۔

۵۔ انیسویں صدی کے ابتدائی بارہ[12] سالوں میں تین اردو تذکرے معرضِ وجود میں آئے۔ جن میں حیدری کا گلشنِ ہند اردو زبان میں تذکرہ نگاری کی اولین مثال ہے۔ مرزا علی لطف (گلشنِ ہند) اور بینی نرائن دیوان جہاں کالج کے (باقی اگلے صفحہ پر)

www.taemeernews.com

مرزا علی لطف　کلیاتِ لطف "تذکرہ گلشنِ ہند"۔
مظہر علی خاں ولا　مادھونل اور کام کندلا، ترجمۂ کریما۔ ہفت گلشن، اتالیق ہند، بیتال پچیسی، تاریخ شیر شاہی، جہانگیر نامہ۔
مرزا جان طپش　کلیاتِ طپش، شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان، بہار دانش، یوسف زلیخا۔
مرزا کاظم علی جواں　شکنتلا، بارہ ماسہ، تاریخ فرشتہ۔
شیخ حفیظ الدین　خرد افروز
خلیل علی خاں اشک　قصہ امیر حمزہ، واقعات اکبر، قصہ گلزار چین، رسالہ کائنات
مولوی اکرام علی　اخوان الصفا۔
نہال چند لاہوری　مذہب عشق۔
بینی نرائن جہاں　چار گلشن، دیوان جہاں (تذکرہ)، تنبیہ الغافلین
مرزا محمد فطرت　عہد نامہ جدید (انجیل)
محی الدین فیض　چشمۂ فیض
سید حمید الدین بہاری　خوان الوان

ہندوستانی پریس　گل کرسٹ نے کالج کے قیام کے فوراً بعد چھاپے خانے کے قیام کی ضرورت محسوس کی، جو اعلیٰ پیمانے پر طباعت کا کام انجام دے سکے۔ چنانچہ ۲۳ جنوری ۱۸۰۱ء کو اس نے کالج کونسل کے سکریٹری سے اس سلسلے میں مراسلت کرکے یہ تجویز منظور کروائی اور ہندوستانی پریس کے نام سے اس نے کالج کے احاطے میں یہ مطبع قایم کیا۔

عتیق صدیقی اپنی ایک اور گراں قدر کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" میں لکھتے ہیں: [۲]

> "کلکتہ کے انگریزی اخباروں کے ان چھاپہ خانوں کو اگر ہم نظر انداز کر دیں، جہاں فارسی رسم الخط کے ٹائپ موجود تھے، تو فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قایم ہوا، اس کا نام ہندوستانی پریس تھا۔"

شیر علی افسوس کی باغ اردو کو گل کرسٹ نے ۱۸۰۲ء میں اسی پریس سے شایع کیا اور بقول عتیق صدیقی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ملازمین تھے جب کہ مرزا علی لطف نے (جو کالج کے ملازم نہیں تھے) ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما پر گلزار ابراہیم کا ترجمہ گلشنِ ہند کے نام سے کیا۔

[۱] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۱

[۲] ہندوستانی اخبار نویسی ص ۴۳ دہلی ۱۹۵۷ء

www.taemeernews.com

" یہی اردو کی پہلی[1] مطبوعہ کتاب ہے "۔

اختر شہنشاہی کے مؤلف اختر الدولہ سید محمد اشرف[2] سیتا پوری کے حوالے سے قاضی محمد الیاس[3] سیتاپوری اوران کے حوالے سے ناظم سیتاپوری[4] اور ڈاکٹر احراز نقوی[5] سیتاپوری نے کالج کے ایک منشی مولوی اکرام علی سیتاپوری کو اس مطبع کا مالک قرار دیا ہے۔ عتیق صدیقی ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ چھاپہ خانہ گل کرسٹ نے ۱۸۰۲ء میں قایم کیا اور وہی اس کے مالک تھے۔ وطن واپسی کے وقت گل کرسٹ نے یہ چھاپہ خانہ اور اپنی تمام نا مکمل کتابیں ڈاکٹر ہنٹر، مسٹر میک ڈوگل اور میکن ٹوشن فل ٹن اینڈ کمپنی کی مشترکہ نگرانی میں دے دیا تھا۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

" ہندوستانی اخبار نویسی میں اس خیال (ملکیت) کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ...... فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قایم ہوا ..... اب میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مولوی اکرام نے نہیں بلکہ گل کرسٹ نے یہ چھاپہ خانہ قایم کیا تھا "۔

یہ چھاپہ خانہ گل کرسٹ نے ضرور قایم کیا تھا۔ لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا۔ جس کا ثبوت گل کرسٹ کا ۱۶ جنوری ۱۸۰۴ء کا وہ مراسلہ ہے جسے عتیق صدیقی نے اپنی اسی کتاب (گل کرسٹ ص ۱۵۱) میں درج کیا ہے، جس میں اُس نے لکھا تھا :-

" مسٹر فرانسس گلیڈون نے ٹائپ اور طباعت کا دوسرا سامان جو کالج کونسل کو دیا ہے، غالباً اس سے بہتر سامان اس وقت دستیاب نہیں ہو سکتا۔ متمنی ہوں کہ کالج کونسل کے سامنے آپ میری اس خواہش کا اظہار کر دیں کہ ہندوستانی زبان کی جو کتابیں میں عنقریب چھاپنے والا ہوں، ان کی طباعت کے سلسلے میں اس سامان کو اپنی تحویل میں لے کر اپنے شعبے کے کام میں لانا چاہتا ہوں۔ عندالطلب اس کو بہ تمام و کمال واپس کرنے کا میں وعدہ کرتا ہوں ۔۔ میری تحویل کے دوران میں اس میں سے کچھ اگر ضایع ہوا تو میں اس کو پورا کروں گا ۔۔ "

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۳۔ اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب " مختصر اصول سیجی " ہے جس کے مؤلف جرمن مستشرق بنجمن شولٹس ہیں۔ یہ کتاب پانچ اردو سے ۵۹ سال قبل ۱۷۴۳ء میں ھالے (جرمنی) سے شایع ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب از رسم شاہ مشمولہ اردو نامہ۔ کراچی ص ۵ تا ۱۶ بابت اپریل جون ۱۹۷۰ء۔

[2] اختر شہنشاہی بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۱

[3] ماہنامہ الناظر لکھنؤ بابت نومبر ۱۹۱۳ء بحوالہ اخوان الصفا مقدمہ ص ۲۰ از ڈاکٹر احراز نقوی لاہور ۱۹۶۲ء

[4] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۶ تا ۱۶۹

[5] اخوان الصفا مقدمہ ص ۲۰

www.taemeernews.com

اس مراسلے سے صاف ظاہر ہے کہ گل کرسٹ اس مطبع کا مالک [1] نہیں تھا۔ اس کی علٰحدگی اور کالج کے خاتمے کے بعد بھی یہ پریس جاری رہا جس سے وقتاً فوقتاً کتابیں شایع ہوتی رہیں، جو آج بھی برصغیر اور انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ کالج کے خاتمے کے بعد، قیاس غالب ہے کہ یہ چھاپہ خانہ حکومتِ ہند کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ جس کا ثبوت مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کا وہ ایڈیشن ہے جو ہندوستانی پریس سے ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں طبع [2] ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کو

"گورنمنٹ ہند، صیغۂ ہوم ڈپارٹمنٹ کے حکم سے باہتمام میجر ڈبلیو ناسولیس صاحب بہادر، سکریٹری، بورڈ آف اگزامینرز، کالج پریس (ہندوستانی پریس) میں چھاپا، صاحبانِ عالی شان کی ڈگری کے امتحان کے لیے۔"

مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں یہ مطبع نہ تو گل کرسٹ اور نہ مولوی اکرام علی سیتاپوری کی ملکیت ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ یہ چھاپہ خانہ کالج کی ملکیت تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے مہتمم بدلتے رہتے تھے جن کے نام کتابوں کے سرورق پر شایع ہوا کرتے تھے۔ ان کو مہتمم Keeper of the Press کہتے ہیں جو ضروری نہیں کہ مطبع کا مالک ہی ہو۔

کتب خانہ فورٹ ولیم کالج کی تاریخ کتب خانے کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ کیونکہ یہ کتب خانہ انڈیا آفس لائبریری کا وہ "نقشِ اول [3]" ہے جس کی تدوین جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد شروع ہو گئی تھی اور کمپنی کے آدمی صرف کلکتہ ہی نہیں بلکہ دہلی، حیدرآباد، لکھنؤ، مرشدآباد وغیرہ میں قلمی کتابیں اور نوادرات تلاش کرتے تھے۔ سرنگا پٹم کی تسخیر اور ٹیپو سلطان کی شہادت (۱۷۹۹ء) کے بعد اس کا کتب خانہ [4] جو نوادرات علمی سے معمور تھا انگریزوں کی تحویل میں آ گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس کی نصف کتابیں کالج کے کتب خانے میں منتقل کر دی گئیں۔ اور بقیہ کتب آکسفورڈ، کیمبرج اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کو بخش دی گئیں۔

---

[1] پروفیسر جاوید نہال نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کو اس کا مالک قرار دیا ہے۔ ۱۸۱۱ء میں جب ہنٹر جاوا چلا گیا تو ڈاکٹر ولسن اس کے مالک ہوئے۔ بعد میں ٹامس روبک بھی ان کے شریک کار ہو گئے۔ ۱۸۲۸ء کے بعد یہ چھاپہ خانہ ایک "دوسرے شخص" کے ہاتھ چلا گیا۔ بنگال کا اردو ادب ص ۱۳۰۔ پروفیسر نہال نے جتنے نام گنوائے ہیں وہ سب اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام چھاپہ خانہ کی مختلف مطبوعات پر ملتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرات یکے بعد دیگرے پریس کے مالک رہے ہیں! اگر اس استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو مولوی اکرام علی کے علاوہ کالج کے درجنوں منشیوں کو بھی اس کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں بہت سوں کے نام نگراں یا مہتمم کی حیثیت سے کتابوں کے سرورق پر درج ہیں۔

[2] بحوالہ فسانۂ عجائب ص ۴۵ مرتبہ اطہر پرویز۔ الہ آباد ۱۹۶۹ء

[3] انڈیا آفس لائبریری کے قیام کا منصوبہ ۱۷۹۸ء میں بنایا گیا اور ۱۸۰۱ء میں اُسے عملی جامہ پہنایا گیا۔ دیکھیے "انڈیا آفس لائبریری" (پس منظر) روزنامہ امروز۔ بابت ۱۶ دسمبر ۱۹۷۳ء۔

[4] اس کتب خانہ سے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے: "کتب خانہ ٹیپو سلطان" از حکیم محمود احمد برکاتی، مشمولہ سہ ماہی الزبیر بہاولپور۔ ص ۶۲ تا ۷۷ شمارہ ۱۱ ۱۹۶۷ء

www.taemeernews.com

ابتدا میں طلبہ کو کتابیں گھر لے جانے کی اجازت تھی، نگران کی بے پروائی سے جب نادر و نایاب مخطوطات اور مطبوعات ضایع ہونے لگے تو ۱۸۰۸ء میں کتابیں باہر لے جانے پر پابندی عاید کردی گئی۔ کالج کی دوسری دہائی تک اس کتب خانے میں ہندوستانی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی کے مخطوطات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ بقول بی۔ این۔ بنرجی[1] کتابوں کی کل تعداد ۲۱۱۶۷ تھی اس میں مطبوعہ مغربی کتابیں ۵۲۲۴، مطبوعہ مشرقی کتابیں ۱۱۷۱۸ اور مخطوطات کی تعداد ۴۲۲۵ تھی۔

کتب خانہ کے پہلے[2] مہتمم منشی غلام حیدر کا تقرر ۱۸۱۰ء میں ہوا، دوسرے منشی موہن پرشاد اور تیسرے مہتمم مولوی اکرام علی تھے۔

کالج کے خاتمہ سے پہلے ۱۸۳۶ء میں پہلے تمام مخطوطات اور اس کے بعد تمام مطبوعات انڈیا آفس لائبریری منتقل کردی گئیں۔ اس طرح یہ عظیم الشان، نادر و نایاب مشرقی ورثہ مغرب کی تحویل میں پہنچ گیا۔

کالج کا خاتمہ

لارڈ ویلزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس انتظامیہ کی منظوری کے بغیر کالج کے قیام کا ایک شاندار خاکہ تیار کیا تاکہ آگے چل کر اسے یونیورسٹی[3] کا درجہ دیا جا سکے۔ لیکن ابھی اس کے قیام کو صرف چودہ مہینے ہی گزرے تھے کہ کمپنی کی بنیا شاہی نے ۲۷ جنوری ۱۸۰۲ء کو یہ فیصلہ کیا کہ کالج فوراً بند کر کے اورنٹیل سیمینری دوبارہ بحال[4] کی جائے۔ کمپنی کے ارباب بست و کشاد اسے ایک سفید ہاتھی تصور کر کے کالج کے وجود کو مد فضول سمجھتے تھے۔ لیکن ویلزلی نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور ایک طویل یادداشت انگلستان روانہ کی جس میں اس نے یہ دھمکی دی تھی۔

"میرا یہ قطعی اور مصمم ارادہ ہے کہ اگر مجلس نظمائے کالج توڑنے کا فیصلہ کرہی لیا تو انگلستان لوٹتے ہی پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ قانون کے ذریعہ کالج کی تجدید کی جائے۔"

یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے ایک اور مراسلے میں ایسی بات لکھ دی جس کے نتیجہ میں اسے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ لکھتا ہے:[5]

"اس معاملے میں کورٹ آف ڈایرکٹرس کے حکم کی اگر تعمیل کی جاتی، تو اس وقت جو فتنے برپا ہوتے وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ کالج کو قایم رہنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جاتے گی۔"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲ ستمبر[6] ۱۸۰۳ء کو مجلس نظمائے "تاحکم ثانی" کالج کو جاری رکھنے کی منظوری دی۔

---

[1] Dawn of New India page 107

[2] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۴۴

[3] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۸

[4] ویلزلی کے مراسلات ص ۶۳۰ بحوالہ سہ ماہی اردو کراچی ص ۱۰۳ بابت جنوری ۱۹۶۶ء

[5] ایضاً

[6] ایضاً

www.taemeernews.com

لیکن ساتھ ہی کچھ ایسی پابندیاں بھی عاید کردیں کہ ۱۸۰۵ء میں لارڈ ویلزلی کے انگلستان چلے جانے کے بعد ان کے جانشینوں میں کوئی ایسا بااثر شخص نہیں تھا جو کمپنی کے ارباب حل وعقد کے فیصلوں کا مقابلہ کرسکتا۔

ویلزلی کے لندن پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ۱۲ر مئی ۱۸۰۶ء کو انگلستان میں ہیلی بری کالج قایم کیا گیا۔ اس درس گاہ کے اغراض ومقاصد بھی وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کے تھے۔ جس کی براہ راست زد کلکتہ کالج پر پڑتی اور جنوری ۱۸۰۷ء میں کالج کے اخراجات کم کردیے گئے۔ پروفیسر اور نائب پروفیسر کے عہدے ختم کردیے گئے۔ تین سال کے تعلیمی کورس کی جگہ ایک سال کا نصاب رائج کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں بیشتر منشیوں اور پنڈتوں کو برطرف کردیا گیا۔

لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء) کے عہد میں کالج کے مصارف میں مزید کمی کردی گئی ۱۸۳۱ء کے بعد چوبیس سال تک یہ کالج نزاع کے عالم میں رہا۔ آخرکار جنوری ۱۸۵۴ء میں فورٹ ولیم کالج کو بورڈ آف اگزامنرز میں ضم کردیا گیا اور نصف صدی (۵۴ سال) بعد کالج کا خاتمہ ہوگیا [۱]

ادبی خدمات

انسانی تاریخ بھی ایک عجوبۂ روزگار ہے، جس میں ہم بسا اوقات بہت سی متضاد صورتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ انھیں متناقضات کا نام دیتے ہیں۔ جنھیں ہم آسانی کے ساتھ سرسری بیانات سے رد نہیں کرسکتے۔ اسی طرح یہ کہہ دینا کہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد یہ تھا کہ "صاحبان ذی شان" آسان اور عام فہم زبان سیکھ کر "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے بدنام زمانہ نظریہ پر بخوبی عمل پیرا ہوسکیں تو یہ تاریخی اور ادبی بددیانتی ہوگی۔

فورٹ ولیم کالج کی تالیفات میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شعوری طور پر ایسی زبان استعمال کی گئی جو روایتی عبارت آرائی، تصنعات اور تکلفات سے پاک تھی۔ یہاں بیان کی سادگی اور اسلوب کے براہِ راست انداز پر زور دیا گیا۔ روایتی طوالت کو ترک کرکے ایجاز واختصار کو اپنایا گیا۔ اس اجتہاد نے اردو نثر کو ایسی دل آویزی، قوت اور توانائی عطا کی جو اردو ادب میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، جس کی کوکھ سے سرسید تحریک نے جنم لیا اور جس نے بقول [۲] مولوی عبدالحق:

> "زبان (اردو) کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا، سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جدید علوم وفنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے۔ . . . (سرسید نے بھی گل کرسٹ کی طرح) خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں . . . ."

سرسید احمد خاں نے جس سادہ اسلوب اور بقول علی سردار جعفری "جمہوری ادب" [۳] کی بنیاد رکھی وہ بلاشبہ اہم ہے لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان کی نثر فورٹ ولیم کالج کے سادہ اسلوب کا نقش ثانی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کے ہندوستانی منشیوں نے ایسی نثر کی بنا ڈالی جس کی پرکاری اور دل آویزی نے اردو ادب میں ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی اور اردو کو برصغیر پاک وہند کی عمومی زبان کا درجہ دے کر اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اسی تاریخ ساز کارنامے کے سبب اردو ادب کی کوئی تاریخ فورٹ ولیم کالج کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

۱۔ Dawn of New India page ,124

۲۔ سرسید احمد خاں (حالات وافکار) ص ۴۳ طبع اول کراچی۔

۳۔ ترقی پسند ادب ص ۹۵ جلد اول بمبئی ۱۹۵۱ء

www.taemeernews.com

ریاض صدیقی

دہلی کالج

سمندر پار سے برصغیر پاک و ہند آنے والے انگریز عہدے داروں اور عالموں نے مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے ذریعہ جدید علوم اور سائنسی موضوعات کی تعلیم کے لیے دہلی میں جدید طرز کا ایک علمی ادارہ اس وقت قایم کیا جب ہمارے مشرقی علما اور مقامی علمی ادارے پھلنے پھولنے والی قوتوں سے محروم ہو کر رہ گئے تھے۔ باشندگان ہندوستان کی جہالت اور علمی و فکری زبوں حالی کا عکس لارڈ منٹو کی تحریر مورخہ ۶ مارچ ۱۸۱۱ء سے مترشح ہے۔

"باشندگانِ ہند کی علمی و ادبی زندگی میں تیزی سے زوال آ رہا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ہی کم نہیں ہو رہی ہے بلکہ ان کے علم کا دائرہ بھی تنگ ہو رہا ہے۔ مذہبی عقائد کی تعلیم کے علاوہ کسی اور شاخ کی تعلیم سرے سے مفقود ہے۔"[1]

دہلی اسکول جو بعد میں کالج بنا ایسے نئے ادارے کا قیام ان انگریز تاجروں کی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا جو اس پورے خطے کے حکمران بننے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ صدیوں سے چلنے والے معاشی، سیاسی اور تہذیبی نظام کی خستہ حالی اور اس سے پیدا ہونے والے انحطاط سے انگریز عہدے داروں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دہلی میں تعلیمی ادارے کے قیام سے پہلے ہی شمال مغربی ہندوستان کا وسیع و عریض علاقہ انگریزوں کے تسلط میں آ چکا تھا۔ چنانچہ اس علاقے میں تعلیمی تحریک کو فروغ دینے میں کوئی رکاوٹ حایل نہیں تھی۔ دہلی کالج اپنے مقاصد اور دائرہ عمل کے اعتبار سے تاریخ کا پہلا منظم اور مکمل علمی ادارہ تھا چنانچہ کلکتہ مدرسہ ۱۷۸۱ء، بنارس مدرسہ ۱۷۹۱ء اور فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء اپنی اولیت کے باوجود دہلی کالج پر تفوق نہیں پا سکتے کیونکہ ان اداروں کے مقاصد اور اختیارات محدود تھے۔ دہلی کالج برصغیر میں جدید طرز کا مکمل کالج تھا جس نے ایک جانب علم و ادب اور تخلیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا تو دوسری جانب مقامی باشندوں کو جدید علوم اور سائنس کی اس تعلیم سے روشناس کرایا جس سے وہ قطعی ناواقف تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس اہم ادارے کے بارے میں لکھا ہے:

"دراصل دہلی کالج اس اعتبار سے ہمیشہ قابل ذکر سمجھا جائے گا کہ اس نے قدیم و جدید کی آمیزش سے تعلیم کا ایک نیا تجربہ کیا جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ اس نے ذہنوں میں بدلتی ہوئی قدروں کا احساس

---

[1] ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۲۵ عتیق احمد

www.taemeernews.com

پیدا کر دیا اور انھیں زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا [۲]

برصغیر کی تاریخ کا یہ پہلا ادارہ ہے جس نے مقامی باشندوں کے ذہنوں پر اپنے اثرات قایم کیے۔ "ٹوائی لائٹ آف مغل" کے مصنف اسپیر صفحہ ۱۴۴ پر لکھتے ہیں:

"There was more contact of thought than of persons. The medium for this was Delhi College in its oriental even more than its English Department."

زیرِ نظر علمی ادارے کا قیام کوئی اتفاقی یا اچانک واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے نقوش ہمیں اٹھارویں صدی میں اس وقت نظر آرہے تھے جب وارن ہیسٹنگز نے تعلیم کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تھی۔ دہلی کالج انگریزوں کی ادبی، لسانی اور تعلیمی پالیسیوں کے تضادات کا حاصل تھا چنانچہ اس ادارے کی مقصدیت اور اس کے اثرات کا تعین اسی پالیسی کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے ——

تاریخ میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی مشرق نوازیوں کا ذکر ہوا ہے۔ ہیسٹنگز کو ایسے زمانے میں یہاں بھیجا گیا جب بنگال اور بہار کی دیوانیوں پر انگریزوں کو تسلط حاصل ہو گیا تھا اور شاہ عالم نے اس علاقے میں انگریزوں کی سیاسی قوت کو تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ انگلستان کی حکومت نے اس اہم سیاسی تغیر کے مابعد اثرات کے مدنظر برصغیر میں مقیم انگریز تاجروں اور ان کی تنظیم ایسٹ انڈیا کمپنی پر ہیسٹنگز کے ذریعہ اپنی گرفت کی۔ ہیسٹنگز نے یہاں آنے کے بعد مقامی حالات کا جائزہ لیا۔ اس کی دانشمندی کا اندازہ ان پالیسیوں سے ہوتا ہے جو فوری طور پر سامنے آئیں۔ ہیسٹنگز کی مشرق نوازی اسی پالیسی کا جزو تھی چنانچہ اس نے انگریزی زبان اور عیسائیت کی تعلیم کے خیال کی مخالفت کی اور مشن اسکولوں میں انگریزی زبان اور عیسائیت کی تعلیم کا طریقۂ کار ختم کر دیا۔ اس نے مشن اسکولوں کو مہیا کی جانے والی مالی امداد بھی روک دی۔ ہیسٹنگز مشرقی علوم اور اردو فارسی زبانوں کی تعلیم کو فروغ دینے کا حامی تھا لیکن اُن دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے بعض حلقوں میں اس نقطۂ نظر کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی کہ برصغیر کے مقامی باشندوں کو ہر قسم کی تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے ایک بااثر رکن کا یہ استدلال تھا کہ مقامی باشندوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے معنی برصغیر میں انگریزوں کے تسلط کو اسی طرح کھو دینا ہوگا جیسے امریکہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ انگریز مورخ جان مارشل نے اپنے مراسلہ مورخہ ۵ ارجون ۱۸۵۳ء میں اس حوالے کو نقل کیا ہے:

On the occasion one of the Directors stated that we have just lost America from our folly in having allowed the establishment of schools and colleges. [۳]

ہیسٹنگز نے اس استدلال اور اس قسم کے نقطہ نظر کو مسترد کرتے ہوئے اپنی پالیسی کی وضاحت ان لفظوں میں کی۔

"حکومت برصغیر کے مقامی باشندوں کو مزید جاہل رکھنے کے حق میں نہیں ہے" [۴]

ہیسٹنگز اپنی مجموعی کوششوں کے باوجود خود اپنے ہم وطنوں کی سخت مخالفت کے جال میں پھنس گیا۔ بعض انگریز عہدیدار

---

[۲] محمد حسین آزاد ص ۸۴ ڈاکٹر اسلم فرخی۔

[۳] History of English Education in India P. 2—Syed Mahmood مطبوعہ ۱۸۹۵ء کلکتہ۔

[۴] ایضاً ص ۱۸۔

www.taemeernews.com

اور برصغیر میں مقیم پادریوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رکھی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ کا انتہاپسند گروہ بھی اس احتجاج میں پیش پیش تھا اور گورنر جنرل کونسل کے بعض اراکین بھی ہیسٹنگز کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان حالات کے باوجود اس نے کلکتہ اور بنارس میں مدرسے قایم کیے۔ یہ ادارے پوری طرح بارآور تو نہ ہو سکے لیکن ایک ایسے تعلیمی ادارے کے وجود کی نشان دہی ضرور کر رہے تھے جو بعد میں دہلی کالج کے نام سے قایم ہوا۔

اسی زمانے میں ہیسٹنگز کے مخالف چارلس گرانٹ نے پارلیمنٹ کو برصغیر کے تعلیمی معاملات میں براہِ راست مداخلت کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ مقامی باشندوں کی تعلیم کا حامی تھا لیکن وہ مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کی تعلیم کو ختم کر کے انگریزی زبان اور یورپین سائنس کی تعلیم کے فروغ کو ضروری سمجھتا تھا۔ ۱۸۱۳ء میں گرانٹ نے پارلیمنٹ سے کچھ تعلیمی تجاویز منظور کرالیں۔ ان تجاویز میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ برصغیر کے مقامی دانشوروں کی تعلیم کا انتظام کرے اور اس مقصد کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم بھی مہیا کرے[۵]۔ ۱۸۱۳ء کی تجاویز محدود تعلیم کے نظریے کی نشان دہی کرتی ہیں۔ برصغیر کے بعض مورخوں نے اسی نظریے کے لیے (Downward infiltration Theory) کی اصطلاح استعمال کی تھی[۶]۔ دہلی کالج کے قیام سے قبل کے عرصے میں انگریزوں نے اسی نظریے کی بنیاد پر مختلف علاقوں میں تعلیمی ادارے قایم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ نے ان امکانات کے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ ۱۸۱۳ء کی تجاویز ہی نے بنگال کے ہندو مصلح راجہ رام موہن رائے کو دہلی کالج جیسا ایک ادارہ قایم کرنے پر مائل کیا۔ راجہ رام موہن رائے[۷] مقامی حالات اور بعض تاریخی کمزوریوں کی بنا پر مقامی لوگوں کو انگریزی زبان اور یورپین سائنس کی تعلیم دینے کا ہم نوا بن گیا۔ مجموعی کوششوں کے باوجود انگریز حکام راجہ رام کی تحریک کو نظرانداز کرتے رہے۔ چنانچہ اس نے گورنر جنرل کو ۱۸۲۳ء[۸] میں ایک یادداشت پیش کی اور لکھا کہ قدیم قسم کی مشرقی تعلیم کو جاری رکھنا ملک میں تاریکی اور جہالت کو برقرار رکھنے کے مترادف ہوگا۔ گورنر جنرل نے اس یادداشت کے باوجود ایک مقامی کو تعلیمی ادارہ قایم کرنے کی اجازت نہیں دی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ انگریز انتظامیہ تعلیمی ادارے قایم کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ گورنمنٹ کلکتہ میں تعلیمی مرکز قایم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ اب اس کی نظر میں دہلی شہر پر تھیں جو صدیوں سے مشرقی علوم، سیاسی اقتدار اور تہذیبی مشاغل کا مرکز تھا۔ ۱۸۱۳ء کی تجویز میں جس قسم کے باشعور مقامی علما[۹] Learned Natives کی نشان دہی کی گئی تھی ان کا ارتکاز بھی دہلی میں تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انگریزوں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ برصغیر پر مکمل تسلط کی گھڑیاں قریب آگئی ہیں چنانچہ ضروری تھا کہ دہلی کو اہمیت دی جائے اور اس شہر میں بسنے والے علما و امرا کو ذہنی طور پر نئے مستقبل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ کیونکہ یہی وہ طبقہ تھا جو عوام پر اثرانداز ہونے کی

---

[۵] ایضاً ص ۱۳

[۶] Compulsory Education in India P. 6 & 135 D. M. Desai مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۳ء

[۷] ہندوستانی اخبار نویسی ص ۱۳۵ عتیق احمد [۸] ایضاً۔

[۹] The culture and enlightment always procolate from upper class 9 to the lower class" refer P. 13 Compulsory Education in India. by Desai.

www.taemeernews.com

صلاحیت بھی رکھتا تھا اور مستقبل کے سیاسی اور انتظامی معاملات میں انگریزوں کے لیے ممد و معاون بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے مراسلے مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا تھا۔

"In the meatime we wish you to be fully assured, that the judical offices to which natives are at present eligible should be properly filled, but of our earnest wish and hope to see them qualified for situations of higher importance and trust." 10

۱۸۲۳ء کے اوائل میں گورنر جنرل کونسل نے برصغیر میں تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے ایک بااختیار مرکزی تنظیم "جنرل کمیٹی برائے تعلیم" کے نام سے تشکیل دی۔ اس کمیٹی کے تحت بڑے شہروں میں مقامی کمیٹیاں بنا دی گئیں۔ دہلی کی "مقامی کمیٹی" کا قیام بھی ۱۸۲۳ء کا واقعہ ہے۔ کلکتہ کالج کے ایک انگریز استاد کپتان ٹیلر کو جو مشرقی علوم اور اردو زبان پر گہری نظر بھی رکھتے تھے اس کمیٹی کا سیکریٹری نامزد کر دیا گیا۔ اسی سال گورنر جنرل کونسل کی طرف سے "جنرل کمیٹی برائے تعلیم" نے سب سے پہلے دہلی کی مقامی کمیٹی سے شہر اور اس سے ملحقہ علاقوں میں ادارے قائم کرنے کے لیے تجاویز طلب کریں۔ مقامی کمیٹی نے اپنے جواب میں مشرقی علوم اور اردو زبان و ادب کی تاریخی اہمیت و افادیت کی نشان دہی کرتے ہوئے دہلی اور آگرے میں تعلیمی ادارے قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ اخراجات کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کمیٹی نے کمپنی کی ایک لاکھ سالانہ گرانٹ کے استعمال کی تجویز بھی قلم بند کی ہے[11]

"جنرل کمیٹی" مقامی تنظیم کے جواب سے مطمئن تھی لیکن مشرقی علوم اور اردو زبان و ادب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار مقامی کمیٹی نے کیا تھا۔ جنرل کمیٹی اس سے اتفاق نہ کر سکی اور ۱۸۲۴ء میں مقامی کمیٹی کو لکھا کہ دہلی اور آگرہ میں کالج بلا تاخیر قایم کیے جا سکتے ہیں[12] بشرطیکہ مشرقی علوم و ادب کے ساتھ ساتھ یورپین علوم اور سائنس کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا جائے۔ مقامی کمیٹی کے انگریز عہدے داروں نے جنرل کمیٹی کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو زبان و ادب اور مشرقی علوم کی تعلیم کو انگریزی زبان کی تعلیم پر فوقیت دی اور یورپین علوم و سائنس کی تعلیم کے لیے بھی اردو زبان کو بحیثیت ذریعہ منتخب کیا۔ اس مشرق نوازی کا پتہ مقامی کمیٹی کی ایک عبارت سے چلتا ہے۔

> "آپ کی کمیٹی کے ارکان اس ملک کے گذشتہ عہد کے عروج اور شان و شوکت کو یاد کریں گے جب کہ دہلی اس عظیم الشان سلطنت کا دارالخلافہ تھی جو علوم و فنون کی سرپرستی اور مہرپروروں کے لیے چار دانگ عالم میں مشہور تھی۔"[13]

دہلی کے تاریخ ساز تعلیمی ادارے کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سالانہ تعلیمی گرانٹ سے اس ادارے کو مبلغ پانچ سو روپے ابتدائی اخراجات کے لیے فراہم کیے گئے۔ اردو کی ادبی تاریخوں میں اس ادارے کے لیے کالج کا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ درحقیقت یہ ادارہ دہلی اسکول تھا جس کو ترقی دے کر ۱۸۴۱ء میں کالج بنایا گیا تھا[14] مقامی کمیٹی کے سکریٹری ٹیلر اسکول

---

[10] ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ ص ۳۳ سید محمود۔ [11] مرحوم دہلی کالج۔ ص ۱۳ مولوی عبدالحق
[12] ایضاً　[13] ایضاً　[14] ماسٹر رام چندر ص ۸۱۔ سیدہ جعفر

کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ ٹیلر[۱۵] اردو زبان سے اچھی طرح واقف تھے انھیں اردو زبان وادب اور برصغیر کے ایرانی ہندی کلچر سے بڑی گہرا لگاؤ تھا چنانچہ قلعہ معلیٰ میں بھی انھیں رسوخ حاصل تھے۔ مولوی محمد باقر ان کے قریبی دوستوں میں تھے اور ۱۸۲۹ء سے ۱۸۳۷ء تک وہ دہلی کالج میں بحیثیت مدرس کام کرتے رہے۔ ٹیلر کی مشہور انگریزی ہندوستانی لغت جو ۱۸۰۸ء میں مکمل ہوئی تھی ۱۸۱۷ء میں شایع ہوچکی تھی۔ دہلی اسکول نے مدرسۂ غازی الدین کی پرشکوہ تاریخی عمارت میں اپنی زندگی کا سفر شروع کیا۔ مدرسہ غازی الدین کبھی مشرقی علوم کی تعلیم وتربیت کا گہوارہ تھا لیکن اورنگ زیب کا عہد ختم ہوتے ہی جب سیاسی اور تہذیبی اقدار کے بکھراؤ کا عمل شروع ہوا تو یہ ادارہ بھی بتدریج ویران ہوگیا۔ دہلی اسکول کے قیام کے وقت مولوی عبداللہ اس مدرسہ میں کل نو لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے اور اکثر اسی عمارت میں شاہی مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی اسکول کے لیے کسی انگریز کی وسیع وعریض عمارت کا سودا بیس ہزار روپیہ میں کیا گیا لیکن کسی وجہ سے یہ عمارت نہ مل سکی۔ اسی سال دہلی اسکول کو ریذیڈنسی کی حسین عمارت[۱۶] حوالے کردی گئی۔ ۱۸۴۳ء میں دہلی اسکول کو شاہی کتب خانے کی عمارت میں منتقل کردیا گیا اور کالج کی جماعتیں ریذیڈنسی کی عمارت میں رکھی گئیں ۱۸۵۲ء تک مقامی کمیٹی دہلی کالج کو کنٹرول کرتی رہی اور شمال مغربی علاقوں کے گورنر براہِ راست اس کے نگراں رہے لیکن ۱۸۵۴ء میں جب تعلیم کے لیے ایک خودمختار دفتر قایم ہوگیا تو دہلی کالج بھی نظامت تعلیمات کی تحویل میں چلا گیا۔ اس زمانے میں کپتان فلر ناظم تعلیمات تھے

مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ بادشاہ اودھ کے وزیر فضل علی خاں نے دہلی کے ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف کو ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم کا عطیہ دیا تھا۔ اس عطیہ کے اعتراف میں فضل علی خاں کو انتظامی کمیٹی کا اعزازی رکن بنادیا گیا تھا۔ یہ رکنیت بعد میں اُن کے داماد سید حامد علی خاں کو منتقل کردی گئی تھی۔ منظور حسین موسوی نے اس واقعہ کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لیکن وہ لکھتے ہیں کہ زیر بحث رقم ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کردی تھی[۱۷] ملا واحدی جو دہلی عربک اسکول کے فارغ التحصیل بھی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ زیر حوالہ رقم دہلی اینگلو عربک اسکول کو دی گئی تھی۔ ملا واحدی نے اینگلو عربک اسکول اور دہلی اسکول کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ دہلی اسکول علحدہ ادارہ تھا[۱۸]

دہلی کالج کے انگریز بانیان مشرقی علوم اور اردو زبان کی تعلیم کے ہم نواؤں میں تھے۔ چنانچہ ان صاحبان علم نے جدید علوم اور سائنس کی تعلیم کے لیے انگریزی زبان کی جگہ اردو زبان کو ذریعہ تدریس قرار دے کر وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو اس زمانے کے ماحول کو دیکھتے ہوئے جرأت مندانہ قدم کہا جائے گا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

> " یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ ایک صدی پہلے اس کا خیال آنا اور اس پر عمل کرنا غیر معمولی ہمت کا کام تھا " [۱۹]

دہلی کالج کے انگریز بانیان اور اساتذہ کی مشرق نوازی اور اردو دوستی کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگلستان کے نمایندہ عہدے دا

---

[۱۶] (Twilight of Mughals) ص ۱۹۳ - اسپیر مطبوعہ ۱۹۵۱ء لندن

[۱۷] جریدۂ معارف اسلامیہ لاہور ۱۹۳۸ء ص ۷۰ [۱۸] دہلی کالج میگزین مطبوعہ ۱۹۵۹ء ص ۸

[۱۹] مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۹

www.taemeernews.com

بہت دیر تک گوارا نہ کر سکے چنانچہ ۱۸۲۵ء میں مٹکاف نے جو ''The native narrative of the mutiny of Delhi'' کا مصنف بھی تھا مقامی کمیٹی کو مشورہ دیا کہ اسکول میں انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم کا ایک شعبہ قایم کیا جائے۔ مولوی عبدالحق نے مٹکاف کے حوالے سے شعبۂ انگریزی کے قیام کا سال ۱۸۲۵ء متعین کر دیا ہے لیکن یہ تعین غلط ہے۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ کے مصنف سید محمود کے جائزے مطبوعہ ۱۸۹۵ء سے ثابت ہوتا ہے کہ دہلی اسکول کے انگریز متعلقین تقریباً ایک سال تک مٹکاف کے مشوروں کو نظر انداز کرتے رہے۔ ۱۸۲۹ء میں جب ارباب اختیار کا دباؤ بہت زیادہ ہو گیا تو اسکول میں ایک انگریزی شعبہ قایم کیا گیا۔ اس اضافے سے مشرقی طلبہ اور مقامی اہل علم طبقہ میں کچھ ہیجان بھی پیدا ہوا کیونکہ عام ذہنوں میں عرصہ سے یہ خدشہ گھر کیے ہوئے تھا کہ انگریز مقامی باشندوں کو انگریزی تعلیم کے ذریعہ عیسائی بنا لیتے ہیں۔ جنرل کمیٹی برائے تعلیم کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو کمیٹی نے فوراً اردو زبان کے ذریعہ سائنس کی تعلیم جاری رکھنے کی ہدایات روانہ کیں اور اپنے ۱۸۳۱ء والے مراسلے میں سابقہ تعلیمی طریقہ کار کو برقرار رکھنے کی اجازت دے دی۔

''The Committee therefore continued to encourage the acquirement of native literature of both Mohammadans and Hindoos'' ۲۰

انگریزی زبان و علوم کو فروغ دینے کی ابتدائی کوششیں بارآور نہ ہوئیں۔ ۱۸۳۲ء میں فارسی کو ختم کر کے اردو کو سرکاری زبان بنا دینے سے انگریزی زبان کے فروغ کے امکانات محدود ہو گئے لیکن اسی زمانے میں انگلستان سے لارڈ میکالے گورنر جنرل کونسل کا رکن بن کر دہلی آیا۔ وہ ضدی۔ متعصب۔ عجلت پسند اور کوتاہ نظر قسم کا انگریز تھا۔ برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس نے انگریزی زبان۔ علوم اور سائنس کی تعلیم کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا اور گورنر جنرل ولیم بنٹینک کو مجبور کر دیا کہ وہ تعلیمی پالیسی میں ترمیم کریں۔ گورنر جنرل نے میکالے کی سفارشات پر ۱۸۳۵ء میں ایک حکم کے ذریعہ تمام تعلیمی اداروں کو یوروپین لٹریچر اور سائنس کی تعلیم کے لیے انگریزی زبان کے استعمال کی ہدایات جاری کر دیں۔ بنٹینک نے مشرقی علوم کو مہیا کیے جانے والے تمام وظائف بھی بند کر دیے اور تعلیمی اداروں کو حکم دیا کہ تمام سرکاری رقم صرف انگریزی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت پر صرف کی جائے۔ میکالے کی انتہا پسندی اور قوم پرستی کا اندازہ اس کے بعض تبصروں سے ہوتا ہے:

"انگریزی تعلیم کا مقصد ہندوستانیوں کا ایسا طبقہ پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر و مذاق اور دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" ۲۱

یورپ کے ایک کتب خانے کی الماری ہند و عرب کے تمام کتب خانوں سے زیادہ قیمتی ہے ۲۲

میکالے کا رویہ اور گورنر جنرل کی ہدایات بھی دہلی کالج کے اساتذہ اور انگریز عہدے داروں کو متاثر نہ کر سکیں۔ اردو زبان کے ذریعہ سائنس اور جدید علوم کی تعلیم کو بدستور جاری رکھا گیا البتہ مشرقی شعبے کے طلبہ کو دیے جانے والے تمام وظائف بند کر دیے گئے۔

---

۲۰ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ ص ۴۷ سید محمود۔
۲۱ ایضاً ص ۷۶ ۲۲ ایضاً ص ۷۶

www.taemeernews.com

میکالے کو نہ تو مقامی حالات کا اندازہ تھا اور نہ اس حقیقت کا علم کہ بعض انگریز عہدے دار اور علما خود اردو زبان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے با اثر طبقے نے میکالے کے خلاف سخت احتجاج کیا دوسری جانب دہلی کالج کے انگریز اساتذہ اور بعض انگریز عہدے دار بھی میکالے کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ گورنر جنرل کونسل کے رکن پرنسپ بھی اس اختلاف میں شریک تھا۔ گورنر جنرل کونسل میں تعلیمی کمیٹی کا صدر شیکسپیر تو اس معاملے میں اتنا جذباتی ہو گیا کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر انتظامیہ سے علحدہ ہو گیا۔ گورنر جنرل آکلینڈ[۲۳الف] نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ لیا اور حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر ۱۸۳۵ء کی میکالے تجاویز میں ترمیم و تنسیخ کے بعد ۲۴ر نومبر ۱۸۳۹ء میں ایک حکم نامے کے ذریعے مشرقی طرز کی تعلیم کو جاری رکھنے کی اجازت دیدی اور مشرقی علوم کے شعبوں میں تعلیم پانے والوں کے لیے محدود پیمانے پر وظائف کی فراہمی کا اقرار بھی کر لیا۔ سید محمود مرحوم نے ان ترامیم کو مفاہمتی قدم قرار دیا ہے۔

"Lord Aucland came forward as a mediator in the matter, and recorded a munite which was designed to effect something like a compromise between the parties." [۲۳]

۱۸۴۴ء میں ٹیلر کی جگہ بتروس نے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔ اسی سال دہلی اسکول کو ترقی دے کر مکمل کالج بنا دیا گیا تھا۔ بتروس اردو زبان و ادب اور مشرقی علوم کے ہم نواؤں میں تھا۔ ٹیلر کے زمانے میں اردو زبان و ادب کی تعلیم کے علاوہ اردو زبان کے ذریعہ جدید علوم اور سائنس کی تعلیم کا جو کامیاب اور امید افزا تجربہ ہوا تھا بتروس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۲ء کے عرصے میں دہلی کالج کی کارکردگی۔ اردو زبان کے ذریعہ سائنس کی تعلیم سے پیدا ہونے والے اثرات اور مشرقی طلبہ کی ذہانت کا ذکر انگریزوں نے بڑے شاندار لفظوں میں کیا ہے۔ ذیل کے خود تشریحی اقتباسات ان اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

> "مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی حریف سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ حال ہی میں کالج کا معائنہ چند فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا۔ ان سب کا بیان ہے کہ اس شعبے میں قطعی طور پر بڑی ترقی پائی جاتی ہے۔ عربی اور فارسی جماعتوں کے علاوہ سائنس اردو کے ذریعے کامل طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ طلبا ایسے ہوشیار ہو گئے تھے کہ وہ ریاضی۔ نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ میں شعبۂ انگریزی کو نیچا دکھانے لگے تھے۔" [۲۴]

> "ایک مدت سے دہلی کالج کی خصوصیت چلی آ رہی ہے کہ وہاں اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ مناسب ہے کہ اسے (اس طریقہ کار کو) آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھلنے پھولنے دیا جائے۔" [۲۵]

> "جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے۔ طلبہ کی استعداد ایسی عمدہ اور جوابات ایسے کامل تھے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مشکل تھی۔" [۲۶]

۲۳الف: برائن ہاسن جو مدت تک نیپال میں اسسٹنٹ کمشنر رہا لارڈ میکالے کے نظریات کا سخت مخالف تھا۔

۲۳: ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ ص ۷۶۔۷۷ سید محمود

۲۴: مرحوم دہلی کالج ص ۱۷۹۔۱۸۰۔ مولوی عبدالحق ۲۵: ایضاً ص ۳۵ ۲۶: ایضاً

www.taemeernews.com

بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کے ذریعے جدید علوم اور سائنس کی تعلیم اہلِ مشرق کے لیے ایک دلچسپ اور نیا مشغلہ بن گئی تھی۔ طلبہ اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے تجربے کر کے متعلقین کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ مقامی طلبہ نئی دریافتوں سے اس درجہ مطمئن تھے کہ قدیم یونانی عہد کے افکار کا بھی مذاق اڑاتے تھے۔ طلبہ نے گھر گھر اس حقیقت کی تشہیر کی کہ زمین کائنات کا ایک متحرک سیارہ ہے[۲۷]

بتروس نے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۵ء کے عرصہ میں اردو زبان و ادب اور مشرقی علوم کی ترویج و اشاعت کا اہم فریضہ انجام دیا۔ بتروس کی علمی خدمات کے بارے میں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے رامائن اور مہابھارت کے سنسکرت متون کا اردو ترجمہ[۲۸] کیا تھا۔ اردو زبان میں جدید علوم اور سائنسی موضوعات پر کتابیں شایع کرنے کا منصوبہ بتروس کے اہم کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ بتروس ہی کے دور میں دہلی کالج کی تنظیم نو ہوئی اور شمالی خطے کے گورنر ٹامسن نے کالج آکر فارسی اساتذہ کی تقرری کے لیے انٹرویو لیے۔ مومن خاں مومن اور صہبائی کے علاوہ مرزا غالب بھی انٹرویو کے لیے آئے تھے۔ سید قدرت نقوی[۲۹] کے مطابق ۱۸۴۲ء کے اس انٹرویو میں مرزا کا انتخاب کر لیا گیا تھا لیکن ٹامسن نے چونکہ مرزا کا استقبال نہیں کیا تھا اس لیے مرزا نے یہ منصب قبول نہیں کیا۔ مستند حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا انٹرویو میں شریک نہیں ہوئے تھے البتہ وہ ۱۸۴۲ء کے انٹرویو میں شرکت کی غرض سے کالج آئے ضرور تھے۔ بتروس اردو زبان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ اردو زبان کے ذریعہ سائنس کی تعلیم کے مثبت نتائج سے وہ پوری طرح مطمئن تھے۔ بتروس کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ سائنس اور جدید علوم کی تعلیم سے مشرقی ذہنوں میں نئی روشنی پیدا ہو رہی تھی۔ ۱۸۴۵ء میں کالج چھوڑتے ہوئے بتروس نے اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "اردو زبان کے ذریعہ تعلیم پانے والے مغربی زبان کے ذریعہ تعلیم پانے والوں سے کسی طرح بھی کم تر نہیں ہیں۔ ایک اور حقیقت جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ کہ مشرقی ذہن رکھنے والوں میں حقیقت بینی۔ روشن خیالی۔ اور تعقل پسندی کا شعور پیدا ہوا ہے اور دیسی شرفا و امرا میں جو بدگمانی جدید تعلیم کی طرف سے تھی اس میں بہت کچھ کمی ہوئی ہے۔ جب موجودہ نسل کے اساتذہ رخصت ہو جائیں گے۔ اور ان کے جانشین وہ ہوں گے جنھوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے تو روشن خیالی میں اور زیادہ ترقی ہو جائے گی۔"[۳۰]

۱۸۴۵ء میں بتروس کے بعد دہلی کالج کو ڈاکٹر اشپرنگر جیسے مشرق نواز عالم اور محقق کی خدمات حاصل ہوئیں۔ ادارے کی علمی و ادبی تاریخ نے ایک نئی کروٹ لی۔ اشپرنگر فارسی اور عربی زبان اور ادب پر پہلے ہی سے عبور رکھتا تھا۔ برصغیر آنے کے بعد اس نے سارا وقت اردو زبان و ادب اور ادبی تاریخ کے مطالعہ میں صرف کیا۔ وہ دہلی کالج کا سب سے کم عمر پرنسپل تھا۔ ۱۸۴۵ء میں اس کی عمر صرف تیئیس سال تھی۔ ۱۸۴۷ء تک بحیثیت پرنسپل کام کرنے کے بعد اسے دو سال کے لیے لکھنؤ جانا پڑا جہاں[۳۰ الف]

۲۷؎ (Twilight of Mughals) ص ۲۰۰ اسپیر ۲۸؎ مرحوم دہلی کالج ص ۷ مولوی عبدالحق

۲۹؎ قومی زبان دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۴۳ ۳۰؎ مرحوم دہلی کالج ص ۴۵

۳۰ الف؎ "یادگار شعرا" اور "شاہان اودھ کے کتب خانے" کے مصنفین کا بیان ہے کہ وہ ۱۸۴۷ء تک پرنسپل رہے اور ۶ دسمبر ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ چلے گئے۔

www.taemeernews.com

وہ اکسٹرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران ڈاکٹر اشپرنگر نے شاہان اودھ کے کتب خانوں کا تحقیقی مطالعہ کیا اور ان کتب خانوں میں موجود مخطوطات، یادداشتوں اور کتابوں کی ایک مکمل اور جامع فہرست مکمل کی۔ دہلی کالج کے نوجوان طالب علم علی اکبر پانی پتی جو اشپرنگر کے ساتھ تھے اس مشکل منصوبے میں ان کی معاونت کر رہے تھے۔ اس جائزے کے دوران کم و بیش دس ہزار کتابیں اشپرنگر کی نظر سے گذریں۔ اشپرنگر نے اپنے اس تحقیقی منصوبے کے نتائج چار جلدوں میں مرتب کیے تھے لیکن ان میں سے صرف ایک جلد جو ۶۴۵ صفحات پر مشتمل تھی ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی۔ گلستان سعدی مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر ۱۸۵۱ء میں کلکتہ سے شایع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اشپرنگر کی دوسری تصانیف میں انگریزی ہندوستانی گرامر مطبوعہ دہلی ۱۸۴۵ء ــــ مروج الذہب کا ایک جزو جس کی ترتیب میں مولوی مملوک علی بھی شریک تھے مطبوعہ ۱۸۴۲ء اور سیرت رسولؐ کے نام ملتے ہیں۔ دہلی کالج کی نصابی ضروریات کی تکمیل کے لیے اس نے تاریخ یمنی کو بھی ایڈٹ کیا تھا۔ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست میں اشپرنگر نے اردو شعرا کے تذکروں اور اردو شاعروں کی فہرست بھی نقل کی تھی جو کہ شایع نہیں ہو سکی۔ اس جزو کو بعد میں ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد نے ۱۹۴۲ء میں یادگار شعرا کے نام سے شایع کیا ہے۔ یادگار شعرا کے مرتب نے اشپرنگر کی اس فہرست میں ۱۵۱۹ شاعروں کی نشان دہی کی ہے لیکن اصل مطبوعہ نسخے میں اسی مرتب نے کل ۱۵۰۲ شاعروں کا ذکر نقل کیا ہے۔ اشپرنگر نے حوالوں کے لیے "حرف" بطور علامت استعمال کیے ہیں۔ شعرا کی ترتیب انگریزی حروف تہجی کے تحت کی گئی ہے۔

اشپرنگر لکھنؤ میں دو سال رہ کر دہلی کالج واپس آگئے تھے۔ دہلی کالج میں رہتے ہوئے اس نے سائنسی موضوعات پر اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت کے منصوبے کو مکمل کیا۔ اس کا ایک اور تاریخی کارنامہ دہلی کالج کے لیے پریس کی فراہمی کا تھا چنانچہ اس نے ایک پریس خرید لیا[۳۱] اور یہی پریس مطبع العلوم کے نام سے کالج کی تمام تصانیف شایع کرتا تھا بعد میں مولوی محمد باقر نے اسی پریس کو خرید لیا تھا اشپرنگر نے ہر اعتبار سے دہلی کالج کو یورپین کالجوں کے معیار تک پہنچانے کی کوشش کی چنانچہ انھوں نے اس ادارے سے ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کر کے علمی و ادبی صحافت کی بنیاد استوار کی۔

اشپرنگر کی شخصیت دہلی کالج کی سب سے باوقار شخصیت تھی اس نے اردو زبان و ادب، برصغیر کے مشرقی ذہنوں اور اردو ذریعہ تعلیم جیسے موضوعات پر وقتاً فوقتاً جو کچھ قلم بند کیا ہے اس سے اشپرنگر کی علم پروری اور مشرق دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تعلیمی معاملات پر بھی اس کی نظر کچھ کم گہری نہیں تھی جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے۔

> " فارسی جماعتوں کی تعلیم ناقص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحبان پر تکلف یعنی مقفیٰ مسجع تحریر کے دل دادہ ہیں اور متاخرین کے کلام کو پسند کرتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنے شاگردوں سے فارسی اور عربی ترجمہ کراتے ہیں وہ اس قدر لفظی ہوتا ہے کہ طالب علم اصل مفہوم سے ناآشنا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولویوں اور ان کے شاگردوں کا طرز تحریر بھدا اور زبان بے مزہ اور غلط ہوتی ہے"[۳۲]

بیتروس کی مانند اشپرنگر بھی مشرقی صاحبان دانش سے متاثر تھا چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:

---

[۳۱] ہندوستانی اخبار نویسی ص ۳۲۱ عتیق صدیقی

[۳۲] مرحوم دہلی کالج ص ۴۹ - ۵۰ مولوی عبدالحق

www.taemeernews.com

"ایک صدی سے کم عرصے میں اہل ایشیا مغربی تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوں گے۔ وہ ایسی کتابیں تصنیف کریں گے جن سے نہ صرف انھیں بلکہ اہلِ یورپ کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اہلِ مشرق ذہانت میں یورپین لوگوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں بلکہ ان سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ وہ مستقبل میں انسانیت کی ترقی کے پیش رو بن جائیں گے۔" [۳۳]

۱۸۵۰ء میں اشپرنگر یورپ واپس چلے گئے اور کارگل نے کام شروع کیا۔ ۱۸۵۵ء میں کارگل کے بعد قسمت ایک بار پھر ٹیلر کو لے آئی۔ اب ٹیلر کی شخصیت قدرے متنازعہ بن چکی تھی یہ محض اتفاق تھا کہ مولوی محمد باقر، رام چندر اور چمن لال ٹیلر کے قریبی دوستوں میں تھے۔۔ رام چندر چمن لال اور مولوی کریم الدین کے بھائی نے اپنی مرضی سے عیسائی مذہب قبول کیا تھا لیکن ٹیلر سے تعلقات کے سبب عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اس معاملے کا محرک ٹیلر ہے۔ ۱۸۵۲ء میں اسی وجہ سے ٹیلر کے خلاف احتجاج بھی ہو چکا تھا [۳۴]۔ ۱۸۵۷ء تک ٹیلر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ٹیلر بھی مجاہدوں کے ہاتھ آ گئے مولوی محمد باقر نے انھیں بچانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور بالآخر مجاہدوں نے ٹیلر کا کام تمام کر دیا۔ عبدالقادر کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی کے عوام میں ان کے خلاف پائی جانے والی غلط فہمیاں کم نہیں ہوئی تھیں۔ عبدالقادر نے سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہوئے ٹیلر کے لیے سخت متعصب بہت مال دار، نہایت کنجوس جیسے الفاظ لکھے ہیں ان کا خیال تھا کہ ٹیلر لوگوں کو اغوا کر کے زبردستی عیسائی بنا لیتا تھا۔ اس غلط بیانی کا سبب مولوی محمد حسین آزاد کی ایک عبارت بھی ہو سکتی ہے۔

"سنا ہے ٹیلر صاحب میگزین میں بند تھے اس دن کچھ آب و دانہ باقی تھا دوسرے دن قریب دوپہر تھا کہ تھانے کے علاقے میں مارے گئے۔" [۳۵]

اس عبارت کے ساتھ آگے چل کر آزاد نے اپنی پچھلے دار زبان میں ایک انگریز کا ذکر کرتے ہوئے اس کو متعصب لکھا ہے۔ ہر دو عبارت کچھ اس طرح مربوط ہیں کہ پڑھنے والا ابہام کی بنا پر غلط فہمی کا شکار رہ سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کے حوالوں سے ٹیلر کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحب علم، شریف النفس اور شفیق استاد تھا۔ وہ مشرقی طلبہ میں مقبول تھا اور طلبہ اس سے محبت کرتے تھے۔ دہلی کالج ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بالکل تباہ ہو گیا۔ اس سال یہاں ۳۴۵ طلبہ زیرِ تعلیم تھے اور مقامی اساتذہ کے علاوہ بیس انگریز اساتذہ کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کالج ختم ہو گیا تھا [۳۶] لیکن یہ کالج ۱۸۶۴ء میں دوبارہ کھول دیا گیا تھا۔ البتہ اس کا الحاق پنجاب کے احاطۂ تعلیم سے کر دیا گیا تھا اور سالانہ امتحانات کلکتہ یونیورسٹی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۲ء میں کالج کا نام بدل کر دہلی انسٹیٹیوٹ کر دیا گیا تھا اور یہ چاندنی چوک کے قریب کسی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔

---

[۳۳] مقالات گارساں دتاسی جلد اول ص ۳۵۸ [۳۴] رام چندر ص ۱۲ سیدہ جعفر مطبوعہ دہلی ۱۹۶۱ء

[۳۵] دہلی اردو اخبار جلد ۱۹ شمارہ ۲

[۳۶] اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ ص ۶۱ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

www.taemeernews.com

ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی

سائنس کے مختلف موضوعات، علوم جدیدہ اور مشرقی علوم پر اردو زبان میں اعلیٰ پائے کی کتابوں کی اشاعت دہلی کالج کا قابل ذکر کارنامہ تھا۔ اس سے پہلے اردو زبان میں جدید علوم اور سائنسی موضوعات پر چند ہی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ دہلی اسکول میں جدید علوم اور سائنس کی تعلیم کا فروغ اس قسم کی کتابوں کا متقاضی تھا۔ یہاں کے انگریز اساتذہ کتابوں کے فقدان سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ فوراً کلکتہ بک سوسائٹی کے طرز پر ایک اسکول بک سوسائٹی قایم کرکے کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ ۱۸۳۷ء میں لیتھو کے مشینی پریس کے قیام نے اشاعتی منصوبے میں مزید آسانیاں پیدا کر دیں۔ سوسائٹی نے مختصر سے وقفے میں جدید علوم اور سائنسی موضوعات پر اردو میں کتابیں شایع کرکے طلبہ کو فراہم کر دیں۔ اسکول بک سوسائٹی نے اسی زمانے میں کلکتہ بک سوسائٹی سے انگریزی کتابیں حاصل کیں اور ان کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر دیا[۳۷]

۱۸۴۱ء میں کالج کے قیام کے بعد اردو کتابوں کی ضرورت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بتروس نے اشاعتی منصوبے میں پھیلاؤ پیدا کرنے کی خاطر ایک کمیٹی بنا دی۔ ریان۔ پرنسپ۔ ملٹ اور سدرلینڈ اس کمیٹی کے اراکین تھے۔ کمیٹی ڈاکٹر ایسٹ کی ایک ریڈر اور بنگالی انسائیکلوپیڈیا کے ترجمے کے علاوہ کوئی نمایاں کام نہیں کر سکی۔ بتروس نے اردو کتب کی رفتار اشاعت اور ترجمے کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ۱۸۴۳ء میں ایک مکمل شعبہ قایم کر دیا۔ اس شعبہ کا نام ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی[۳۸ الف] رکھا گیا۔ مٹکاف۔ ریونشا۔ کونٹن اور گرانٹ سوسائٹی کی مجلس عمل سے منسلک تھے مجلس کے سکریٹری پرنسپل بتروس تھے۔ ۱۸۴۵ء میں اشپرنگر سوسائٹی کے روح رواں بن گئے۔ اشپرنگر نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی طرح بعض مقامی علما کو تصنیف و تالیف کے مشاغل کی ترغیب دی۔ سوسائٹی میں بیس مترجم کام کرتے تھے جو عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے علاوہ طبعیات۔ معاشیات۔ تاریخ، فلسفہ اور قانون جیسے موضوعات پر لکھی گئی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرتے تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل تک کی مدت میں سوسائٹی نے کل ایک سو اٹھائیس کتابیں شایع کی تھیں ان کتابوں میں مشرقی اور اساتذہ کی لکھی ہوئی کتنی ہی ایسی کتابیں تھیں جنھیں درس و تدریس کے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ سر سید کی سائنٹفک[۳۸] سوسائٹی نے ہٹن کی انٹگرل کالکوس اور ڈفرنشیل کالکوس جیسی کتابوں کو دوبارہ شایع کیا جو پہلے ورناکیولر سوسائٹی کے زیر اہتمام شایع ہو چکی تھیں۔ ورناکیولر سوسائٹی کے وجود اور اشپرنگر کی توجہ سے تصنیف و تالیف کا ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ دہلی شہر اور اطراف کے اہم شہروں میں کتنے ہی مقامی باشندے کتابیں لکھ کر شایع کرواتے رہے گویا یوں کہیے کہ دہلی کالج اور انگریز علما نے تصنیف و تالیف کی ایسی

---

[۳۷] (Twilight of Mughals) اسپیر ص ۱۹۹

[۳۸ الف] داستان تاریخ اردو کے مصنف حامد حسین قادری کے مطابق سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قایم ہوئی۔ مولوی عبدالحق قیام کا سال ۱۸۴۱ء لکھتے ہیں۔ رام چندر کے تقرر سوسائٹی سے ان کے تعلق کی تفصیلات اور سیدہ جعفر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ سوسائٹی ۱۸۴۳ء میں قایم ہوئی تھی۔

[۳۸] ادب لطیف اردو نمبر لاہور ۱۹۵۵ء ص ۲۹۔

اجتماعی تحریک پیدا کردی جو پہلے نہ تھی۔ اس زمانے میں دہلی اور آگرہ جیسے مراکز سے لاتعداد کتابیں شایع ہوئیں ان میں "کھیت کرم" کالی رائے مطبوعہ ۱۸۴۶ء "گنگا نہر" سداسکھ لال ۱۸۵۴ء۔ "چائے کی کتاب" کلب حسین ۱۸۵۰ء "مراۃ العلوم" ہری داس لال ۱۸۴۷ء "اصول قواعد" ۱۸۵۰ء اجودھیا پرشاد "معدنیات" جواہر لال ۱۸۵۰ء "مقاصد العلوم" سید محمد میر ۱۸۴۱ء۔ "قانون" ستیل پرشاد ۱۸۴۸ء "علم و حکمت" چارلس ننک ۱۸۴۳ء۔ "بحر الحکمۃ" پارکن ۱۸۴۷ء "بخار کی کل" ایشوری لال ۱۸۵۵ء۔ "جغرافیہ" غلام علی ۱۸۵۱ء۔ "جغرافیہ ہند" سیوا روپ نارائن ۱۸۴۸ء "نجوم" ۱۸۴۱ء پنڈت ہیرالال اور مولوی عبدالرزاق کی کتابیں "تاریخ پنجاب" دیبی پرشاد "تاریخ آگرہ" سدید الدین۔ "پنجاب میں ایک سال" امام الدین "انساب القادری" "قدردری"۔ "حقایق الموجودات" "تبسی دھر" چھیندر دیپک اور تاریخ ہائے روم و یونان کے نام ملتے ہیں [39] سید محمود لکھتے ہیں کہ صرف ۱۸۳۴-۳۵ء میں دہلی اور کلکتہ کے تعلیمی مراکز سے کل سات ہزار چار سو پچپن اردو کتابیں شایع ہوئی تھیں [40] یہ تعداد اتنی زیادہ تھی کہ کچھ عرصہ کے لیے کتابوں کی طباعت معطل ہو کر رہ گئی جیسا کہ انڈین سول سروس کے انگریز عہدے دار ٹرے ویے لان کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے۔

"Indeed books in native languages are such a complete drug in market that the School Book Society has for sometime past ceased to print them." [41]

ٹرے ویے لان نے تصنیف و تالیف کے اس سلسلے کو ایک جگہ جنون (Oriental menia) لکھا ہے [42]

ادبی صحافت

دہلی کالج ہمارے یہاں اردو میں علمی و ادبی صحافت کے سنگ میل کی حیثیت سے بھی یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے یوروپین طرز پر یہاں سے ایک ادبی اور علمی رسالہ قران السعدین ۱۸۴۵ء میں جاری کیا۔ اس رسالے کی صورت کے بارے میں خود اشپرنگر کا اقتباس کافی ہے۔

"۱۸۴۵ء میں میں نے دہلی میں پینی میگزین کے طرز پر ایک باتصویر رسالے کی بنیاد ڈالی اس کا نام قران السعدین تھا گویا مشرق اور مغرب مشتری اور زہرہ تھے جن کا قران اس رسالے میں ہوا تھا" [43]

قران السعدین [44] دہلی کالج کے پریس مطبع العلوم میں چھپتا تھا۔ قران السعدین کو دہلی کالج کا گزٹ بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے صفحات پر کالج سے متعلق خبریں اور رپورٹیں باقاعدگی سے شایع ہوتی تھیں۔ رام چندر نے جو کالج کے سب سے مقبول اور نہایت

---

[39] ادب لطیف اردو نمبر لاہور ۱۹۵۵ء ص ۳۹

[40] ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ ص ۵۲ سید محمود [41] ایضاً [42] ایضاً

[43] دہلی کالج میگزین دہلی ۱۹۵۵ء ص ۱۳۷ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

[44] ہندوستانی اخبارات ص ۳۲۱ عتیق صدیقی

www.taemeernews.com

قابل اساتذہ میں تھے ۱۸۴۵ء میں رسالہ محب ہند جاری کیا۔ رام چندر نے ۱۸۴۷ء میں ایک اور رسالہ فوائدالناظرین بھی جاری کیا۔ ان رسالوں میں علوم و ادبیات کے علاوہ جدید علوم اور سائنسی موضوعات پر مضامین شایع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے گارساں دتاسی کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے رام چندر کے تین رسالوں محب وطن، خیر خواہ ہند اور فوائدالناظرین کا ذکر کیا ہے۔ خیر خواہ ہند اور محب ہند ایک ہی سالے کے دو نام[۴۵] تھے۔ رام چندر نے پہلے ایک رسالہ خیر خواہ ہند جاری کیا تھا۔ لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ اسی نام کا اخبار مرزاپور سے شایع ہو رہا ہے تو انھوں نے نام بدل کر محب ہند کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر رام چندر نے فوائدالناظرین جلد دوئم اکتوبر ۱۸۴۷ء کے ایک اشتہار میں کیا تھا

دہلی کالج کے چند نامور مقامی دانشور

دہلی کالج برصغیر کی تاریخ کا پہلا مینارۂ علم تھا جس کی چھاؤں میں ایسے مقامی ذہنوں کی پرورش ہوئی جو نشاۃ الثانیہ کے علمبردار کی حیثیت سے تاریخ پر چھا گئے۔ برصغیر کی مسلمان قومیت کا مستقبل سنوارنے میں ان ذہنوں کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی محمد باقر دہلی کالج کے اولین طالب علموں میں تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ روز تک وہ کالج کے تدریسی عملے سے وابستہ بھی رہے۔ دہلی کالج کے علمی ماحول اور انگریز اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ فن صحافت کی قلمرو میں داخل ہوئے اور دہلی شہر سے ایک اخبار بنام دہلی اردو اخبار ۱۸۳۶ء میں جاری کیا۔ مولوی محمد باقر نے ٹیلر کے مشورے پر محمد حسین آزاد کو ۱۸۴۵ء میں کالج میں داخل کر دیا۔ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۹ء کے تقریری مقابلوں میں آزاد نے امتیازی حیثیت حاصل کر کے انعامات بھی حاصل کیے۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آزاد دہلی اردو اخبار سے وابستہ ہو گئے۔ اردو کے سب سے پہلے تمثیل نگار ڈپٹی نذیر احمد دہلی کالج کے ذہین طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی بعض ابتدائی تصانیف دہلی کالج ورناکیولر سوسائٹی کی تحریک کا نتیجہ ہیں۔

ولیم ایڈورڈ کی کتاب کا اردو ترجمہ مصائب غدر، ترجمہ تعزیرات ہند ۱۸۶۰ء، انکم ٹیکس ایکٹ کا ترجمہ ۱۸۵۹ء اور ضابطہ فوجداری ۱۸۶۱ء نذیر احمد کی ابتدائی چند تصانیف میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ ۱۸۴۴ء میں کالج سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے کالج کی نصابی ضروریات کے لیے تاریخ و جغرافیہ کی ایسی کتابیں مرتب کیں جو دہلی کالج کے علاوہ دوسرے مدرسوں میں بھی مستعمل تھیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی ایک سو انتیس تصانیف کے نام ملتے ہیں۔ حالی نے مولوی ذکاء اللہ کی قوت تحریر اور متضاد قسم کے موضوعات سے ان کی دلچسپی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے انھیں ایسے بنیے سے تشبیہ دی ہے جس کی دوکان پر ہر قسم کا مال ہر وقت دستیاب ہوتا ہے۔ ورناکیولر سوسائٹی کے لیے مولوی صاحب نے علم ریاضی پر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ انگریز کمیشن نے سلسلۃ العلوم کے اس سلسلے کو بہت پسند کیا۔ ۱۸۵۶ء میں انھوں نے گارساں دتاسی کے رسالہ تذکرات کا اردو ترجمہ کیا جو مطبع مظہر العجائب سے شایع ہوا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ اعلیٰ پائے کے انشا پرداز بھی تھے۔ تاریخ ہندوستان کے مصنف کی حیثیت سے بھی ان کا نام زندہ رہے گا۔

رام چندر دہلی اسکول کے نہایت ذہین طالب علموں میں تھے۔ وہ[۴۶] ۱۸۴۱ء میں کالج سے وابستہ ہوئے۔ ۲۸ فروری[۴۷]

---

[۴۵] فوائدالناظرین جلد دوئم اکتوبر ۱۸۴۷ء

[۴۶] ماسٹر رام چندر ص ۵۴ مصنفہ سیدہ جعفر مطبوعہ دہلی [۴۷] ایضاً

۱۸۴۴ء کو انھیں پچاس روپے ماہانہ پر بحیثیت سائنس ٹیچر دہلی اسکول میں ملازم رکھ لیا گیا جہاں وہ ۱۸۵۸ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ دہلی کالج ورناکیولر سوسائٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے زیر اہتمام سائنسی علوم اور ریاضی و ہیئت کی متعدد انگریزی تصانیف کے اردو تراجم رام چندر ہی کی کاوش کا نتیجہ تھے اور یہ سارے تراجم بہ اعتبارات اس درجہ مکمل اور مستند ثابت ہوئے کہ عرصہ دراز تک دہلی اور اس سے ملحقہ علاقوں میں بصورت نصاب مستعمل رہے۔ رام چندر کی پہلی ہی کتاب ـ ـ ـ میکزیما اور مینما ڈاکٹر اشپرنگر کو بہت بھائی چنانچہ انھوں نے کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر مارگن کو روانہ کیا۔ مارگن نے لندن سے اس کتاب کا ایک اور ایڈیشن شایع کروایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی اس کتاب کو دوبارہ چھپوایا۔ ان کی درسی کتابوں کی فہرست میں ہیں "جز ویات الجبرا" مطبوعہ ۱۸۴۷ء "علم طبعیات" "اصول علم ہیئت" "برج اینڈ کیوب کے طرز پر لکھا گیا الجبرا" ہٹن اور بجیر کے طرز پر لکھی گئی کتاب "مثلث و ہندسہ" کے نام ملتے ہیں[۵۰]
ان تصانیف کے علاوہ "تذکرۃ الکاملین" ۱۸۴۹ء[۵۱] میں دہلی سے شایع ہوئی اور اس درجہ مقبول ہوئی کہ یکے بعد دیگرے اس کے کئی ایڈیشن دہلی سے شایع ہوئے۔ اس تصنیف میں روم اور یونان کے شاعروں اور مفکروں کے حالات اور دیگر تفصیلات کا ذکر ہوا ہے۔ "عجائبات روزگار" دہلی سے ۱۸۴۷ء میں شایع ہوئی اس کے دو ایڈیشن دہلی سے شایع ہوئے۔ ماسٹر رام چندر کی سوانح نویس سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ اردو کے کسی تذکرہ نویس نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے[۵۲] رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں اس کتاب کا نام نقل کیا ہے۔ رام چندر کی ایک اور کتاب "بہوت ننگ" ۱۸۵۱ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں فرسودہ عقاید اور توہمات کے خلاف اظہار رائے ہوا ہے۔ ان کی ایک اور اہم کتاب "اعجاز القرآن" ہے۔ رام چندر کے دونوں اردو رسالے جدید علمی و ادبی اور معاشرتی شعور کے ترجمان تھے۔ ان رسالوں میں معاشرتی اصلاح اور سائنسی و علمی عنوانات پر گراں قدر مضامین چھپتے تھے ـــ

دہلی کالج کے پروردہ ذہنوں میں مولوی کریم الدین اور مولوی مملوک علی کو اہم مرتبہ حاصل رہے گا۔ مولوی کریم الدین کو تصنیف و تالیف کی دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا ڈاکٹر اشپرنگر کے سر ہے۔ کریم الدین ۱۸۳۹ء میں کالج سے وابستہ ہوئے۔ اشپرنگر نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو بھانپ لیا چنانچہ ورناکیولر سوسائٹی میں کتابوں کے تراجم کی ذمہ داری انھیں سونپی۔ مولوی کریم الدین نے اشپرنگر کی فرمایش پر گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کا ترجمہ ۱۸۴۸ء[۵۳] میں کیا "گلدستہ نازنیں" کے نام سے انھوں نے اردو شاعروں کا تذکرہ بھی مرتب کیا لیکن یہ تذکرہ درحقیقت صہبائی کے تذکرے اور انتخاب کی ہو بہو نقل ہے۔ مولوی صاحب کی تصانیف میں "تعلیم النساء" "گلستان ہند" "حکایات عجیبہ" "نقلیات ہندی" "عجالۃ العلا" (عروض بہ زبان اردو) ۱۸۴۷ء "رسالہ فرائض" ۱۸۴۷ء "روض الاجرم" (ریاضی، ہندسہ، ہیئت اور جغرافیہ) "فوائد الدہر" "ترجمہ کتب ڈاکٹری" ۱۸۴۷ء "تاریخ آگرہ" "تسہیل القواعد اور کریم اللغات" کے نام بھی ملتے ہیں۔ "تذکرہ شعرائے عرب" اور ترجمہ ابوالفدا بھی ڈاکٹر اشپرنگر کی فرمایش پر مرتب ہوئی تھیں ـــ

---

[۵۰] ماسٹر رام چندر ص ۱۳ تا ۴۲ مصنفہ سیدہ جعفر [۵۱] ایضاً ص ۹۴ [۵۲] ایضاً
[۵۳] اس تذکرے میں ۱۹۷۴ء کے شاعروں کا ذکر ہوا ہے اس تذکرے کے آخر میں اردو شاعری کے ارتقا پر ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اردو شعرا کے تذکرے ص ۲۶۱ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔

www.taemeernews.com

دہلی کالج کا اختتام

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہلی کالج نے دوسرے مرحلے کا آغاز ۱۸۶۴ء سے کیا۔ اس مرحلے میں کالج ترقی کے منتہا پر پہنچ چکا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں یہاں گریجویشن کی جماعتیں بھی شروع کر دی گئی تھیں ۱۸۷۱ء میں ایم۔ اے کلاسوں کا آغاز ہوا اور کالج تقریباً یونیورسٹی کی سطح پر آ گیا۔ دہلی کالج کو اگر یونیورسٹی بنا دیا جاتا تو یقیناً یہ ادارہ پہلی اردو یونیورسٹی کہا جاتا۔ بد قسمتی سے اپنے عروج کی اس منزل پر یہ مکمل علمی ادارہ برٹش سرکار کی سیاسی مصلحتوں کا لقمہ بن گیا۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے تعلیمی ترقی کے لیے دہلی کے بجائے پنجاب کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قایم کی گئی اور لاہور گورنمنٹ کالج کے عملہ اور ساز و سامان کو پنجاب یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اسی زمانے میں علی گڑھ اسکول کو ترقی دے کر اینگلو اورینٹل محمڈن کالج بنایا گیا اور اس ادارے کا افتتاح گورنر جنرل نے ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو کیا[۵۴] اودھ کے علاقوں کے لیے علی گڑھ کالج کے قیام سے اس علاقے میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا تھا۔ بریلی اور آگرہ میں پہلے ہی سے کالج کام کر رہے تھے اور یہ دونوں کالج براہ راست دہلی کالج کے کنٹرول میں تھے پنجاب یونیورسٹی کے قیام سے گورنمنٹ کالج لاہور کو جو نقصان برداشت کرنا پڑا تھا اس تکمیل کے لیے برٹش سرکار نے دہلی کالج جیسے تاریخی ادارے کو ۱۸۷۷ء میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور دہلی کالج کے تمام ساز و سامان کو بمع اساتذہ لاہور منتقل کر دیا۔

دہلی کالج کے اثرات و نتائج

دہلی کالج کو اولیت۔ وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے نئے علوم و شعور کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں اس علمی ادارے کو علی گڑھ۔ یہاں کی ورنا کیولر سوسائٹی کو سائنٹفک سوسائٹی اور یہاں سے شایع ہونے والے اخبار و رسائل کو انسٹیٹیوٹ اور تہذیب الاخلاق پر تقدم حاصل رہے گا۔ اردو میں عام فہم۔ سادہ اور بامعنی نثر نگاری۔ علم و ادب کے جدید شعور کے فروغ اور مضمون نویسی و انشا پردازی کے آغاز و ارتقا کا مرکز اول بھی یہی ادارہ تھا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی اور درمیانی عرصے میں اسی ادارے نے رام چندر جیسی بھاری بھرکم شخصیت پیدا کی جو کسی طرح بھی سر سید سے کم تر نہیں تھی۔ دہلی کالج نے ہمارے مشرقی علما کی ذہنی تربیت میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا اندازہ ڈپٹی نذیر احمد کے اس جملے سے کیا جا سکتا ہے۔

"اگر میں کالج میں نہ پڑھتا تو مولوی ہوتا تنگ خیال۔ متعصب۔ اکل کھرا۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ"[۵۶]

دہلی کالج ہی وہ گہوارہ آگہی تھا جس نے سر سید تحریک کے لیے ڈپٹی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی ذکاء اللہ جیسے کردار پیدا کیے۔ حالی کو دہلی کالج سے براہ راست تعلق نہ سہی لیکن ایک بلا واسطہ نسبت ضرور تھی چنانچہ حالی ذہنی طور پر اس کالج کے اثرات کو قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انجم اعظمی نے جامع لفظوں میں دہلی کالج کی افادیت اور اس کے نتائج کا ذکر کیا ہے۔

---

[۵۴] ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ ص ۷۸ سید محمود [۵۵] ایضاً ص ۷۹
[۵۶] محمد حسین آزاد ص ۸۳ ڈاکٹر اسلم فرخی

www.taemeernews.com

"یہاں وہ ہستیاں جمع ہو گئی تھیں جن کی علمی و ادبی خدمات سے برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل سنورنے والا تھا یہاں مشرق و مغرب کی طاقتوں ۔ دریافتوں اور علمی نکتہ سنجیوں کو آمیز کیا گیا تھا تاکہ طلبہ دونوں کا مجموعی شعور لے کر فارغ التحصیل ہوں" ۵۷

این ۔ جی ۔ گورئیکر لکھتے ہیں:

"Delhi College produced many eminent scholars who were the finest product of Urdu renaissance " ۵۸

انگریزوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے رائج ہی نہیں کیا بلکہ زبان میں اتنی وسعت پیدا کی کہ وہ جدید علوم اور سائنس کی فنی اور لفظی اصطلاحات و عبارات کے اظہار پر قادر ہو گئی۔ انگریزوں کی یہ مشرق نوازی اس سیاسی حکمت عملی کا ایک جزو تھی جس کی بدولت تاج انگلستان کو پورے برصغیر پر سیاسی گرفت قایم کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ اگر ہیسٹنگز اور دہلی کالج کے علما مشرق نوازی کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہوتے تو برصغیر جیسی وسیع و عریض اور مختلف قومیتوں والی سرزمین پر سمندر پار سے آنے والے چند ہزار انگریز عہدے دار نوے سال تک حکومت نہ کر سکتے ۔ دہلی کالج کے انگریز بابوں نے (Learned natives) کو زیور علم و آگہی سے آراستہ کر کے جدید سائنسی شعور اور روشن خیالی کے فروغ کی راہیں کھول دیں ۔ دہلی کالج نے مقامی عالموں اور با اثر باشندوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نئی فکری سمت کی طرف موڑ دیا ۔ دہلی کالج کے نتائج کا تجزیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ میکالے اور کالج کے مشرق نواز انگریزوں کا اختلاف مقاصد کا نہیں بلکہ طریقہ کار کا اختلاف تھا ۔ میکالے جس منزل تک طاقت ۔ تسلط اور تحکم کی مدد سے پہنچنا چاہتا تھا ۔ دہلی کالج کے انگریزوں نے وہی منزل خلوص و حکمت اور باہمی تعاون سے حاصل کی ۔

دہلی کالج کے انگریز استادوں نے اپنے طرز عمل اور طریقہ تدریس سے مقامی دانشوروں اور با اثر لوگوں میں غیر فرقہ وارانہ (Secular) ذہنیت کو فروغ دینے کی بھی کوشش کی گویا اس ادارے نے ہند آریائی اور اسلامی تہذیب کے امتزاج کی اس رو کو تقویت دی جو مغلوں کے زمانے سے پروان چڑھ رہی تھی ۔ فورٹ ولیم کالج کے انگریز استادوں نے ہندی اردو قضیے کو ابھار کر دو بڑی اقوام میں نفاق پیدا کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا ۔ دہلی کالج نے اس کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی تاہم نفاق کا زہر اپنا کام کر چکا تھا اور دہلی کالج کی علمی تحریک اس زہر کا تریاق نہ بن سکا ۔

---

۵۷ ؎ افکار کراچی شمارہ اگست ۲۳ ماہ ۱۹۷۶ء ص ۲۹

۵۸ ؎ (Glimpses of Urdu Lit.) ص ۱۲۵ این جی گورئیکر

کتابیات

۱۔ نصاب محمود ۔ مرتبہ ۔ ۔ ۔ ۔ محمود حسین خاں

۲۔ آب حیات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا محمد حسین آزاد

۳۔ مقالات گارساں دتاسی ۔ مطبوعہ ۔ ۔ ۔ ۔ انجمن ترقی اردو کراچی

۴۔ اردو شعرا کے تذکرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۵۔ تاریخ ادبیات مسلمانان ہندوپاکستان ۔ مطبوعہ ۔ لاہور جلد ۸

۶۔ محمد حسین آزاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد اسلم فرخی

۷۔ مرحوم دہلی کالج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مطبوعہ ۔ انجمن ترقی اردو کراچی

۸۔ تاریخ تعلیم ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالرؤف ۔ مطبوعہ ۔ فیروز سنز کراچی

۹۔ تعلیم کی کہانی ۔ ۔ ۔ ۔ شبیر احمد ۔ ۔ مطبوعہ ۔ کفایت اکاڈمی

۱۰۔ رام چندر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیدہ جعفر ۔ مطبوعہ ۔ دہلی

۱۱۔ ہندوستانی اخبارات ۔ ۔ عتیق صدیقی ۔ مطبوعہ ۔ دہلی

۱۲۔ یادگار شعرا ۔ ۔ ۔ ۔ طفیل احمد ۔ مطبوعہ ۔ ہندوستانی اکیڈمی دہلی

۱۳۔ تاریخ ادب اردو ۔ ۔ ۔ ۔ رام بابو سکسینہ ۔ مطبوعہ ۔ تاج کمپنی لاہور

۱۴۔ داستان تاریخ اردو ۔ ۔ ۔ حامد حسن قادری ۔ مطبوعہ ۔ اردو اکیڈمی کراچی

۱۵۔ شاہان اودھ کے کتب خانے ۔ محمد اکرام چغتائی مطبوعہ ۔ انجمن ترقی اردو کراچی

Oxford Advance History of India by R. C. Mujumdar London 1960

Glimpses of Urdu Literature by N. G. Gorekar Delhi India

History of English Education by Syed Mahmood Calcutta India 1895

Compulsory Education in India by D. M. Desai Bombay

Twilight of Mughals by Percival Spear London 1951

History of Freedom Movement Vol (II) Karachi 1961

قدیم دہلی کالج نمبر ۱۹۵۵ء ۔ دہلی کالج میگزین ۱۹۵۷ء ۔ ادب لطیف اردو نمبر لاہور ۱۹۵۵ء ۔ جمیدۂ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور ۱۹۳۸ء ۔ برگ گل اردو نمبر مطبوعہ ۱۹۶۰ء کراچی ۔ نقوش آپ بیتی نمبر ۔ قومی زبان دسمبر ۱۹۶۹ء ۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر معین الدین عقیل

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

(ہندیات Indology)

اغراض و اسباب

انگریزوں کا ہندوستان میں اقتدار جو ابتدا میں برائے نام تھا، اٹھارویں صدی کے نصف آخر کے ابتدائی سالوں میں بنگال کی فتح سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آتے آتے اس نے اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اختیار کرلی۔ ابتداءً ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ طور طریقوں اور تجارتی اداروں کے بارے میں نقطۂ نظر کے بارے میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ کمپنی نے تجارت کے اس فرق کو بزور ختم کرنے کی کوشش کی جسے ایک صدی تک اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے اقتدار اور استحکام کے ساتھ جبر و تشدد کا ایک لامحدود سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں زیادہ سے زیادہ سامان کم سے کم معاوضہ پر حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ رہی۔ یوں انگلستان کی آمدنی میں بھی آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سرمایہ جو کمپنی نے تجارت سے پیدا کیا تھا، انگلستان میں صنعتی انقلاب کا سبب بنا۔ اس سلسلے میں یوروپی مبصرین متفق ہیں کہ انگلستان کو صنعتی اقتدار صرف اس وجہ سے حاصل ہوا کہ بنگال اور کرناٹک کے خزانے اسے استعمال کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ورنہ اس سے قبل انگلستان کی صنعت روبہ زوال تھی۔ ہندوستان کی دولت کا انگلستان میں جانا اور اس کا ایک صنعتی ملک بن جانا کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ ان دونوں میں علت و معلول کا رشتہ ہے[1]۔ صنعتی انقلاب کا یہ ایک نمایاں نتیجہ نکلا کہ انگلستان کے باشندے زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے لگے اور ان میں ہندوستان سے روابط بڑھانے کا شوق پیدا ہوا۔ نوآبادیات اور مقبوضات کی حکمت عملی اور ان کے طریقۂ کار میں نمایاں تبدیلیاں لائی گئیں۔ خود کمپنی نے اپنے انداز اور طریقوں میں تبدیلی اختیار کی۔ اس تبدیلی کے واضح نقوش وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کے دور میں نظر آتے ہیں۔ ان کے عہد میں نظم و نسق کی از سر نو تنظیم ہوئی۔ ہندوستان کی نفسیات کے مطالعہ کو ضروری سمجھا گیا۔ ان مقاصد کے لیے یہاں کی تاریخ، تہذیب، زبان اور یہاں کے علوم سے واقفیت ناگزیر تھی۔

لیکن ان اسباب کے ساتھ ساتھ فی الحقیقت اس کا ایک محرک عیسائیت کی تبلیغ کا جذبہ تھا۔ اس میں اولاً

---

[1] برک ص ۲۵۹ - ۲۶۰ ؛ نہرو ص ۲۵۳ - ۲۵۵

www.taemeernews.com

ہسپانوی عیسائی پیش پیش تھے جو اسلامی حکومتوں کو اندلس سے ختم کر دینے کے بعد افریقہ کے شمالی کناروں پر موروں اور بربروں پر اپنا جوش انتقام دکھانا چاہتے تھے۔ ان افریقی مہمات نے سب سے پہلے یورپ کو افریقہ کے وحشی قبائل سے آشنا کیا تھا۔ اس سے انھیں تبلیغی کوششوں کے لیے ایک نیا میدان حاصل ہو گیا اور انھوں نے بڑھتے بڑھتے بحر ہند کی حکمرانی عربوں سے چھین لی۔[۲] اٹھارویں صدی کے نصف تک یورپ کے عیسائی اسلام کے مقابلے پر خاصے آمادہ تھے۔[۳] جیسوٹ فرقہ، جو مشنریوں کا ایک نہایت منظم اور فعال گروہ تھا، زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندوستان بھیجا گیا۔ جیسس سوسائٹی (Jesus Society) کا بانی اگناتیوس لویولا (Ignatius Loyola) مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ ہسپانوی ہونے کے سبب اسے مسلمانوں میں تبلیغ کرنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔[۴] تبلیغ، تعلیم اور اشاعت کے لیے ان زبانوں کا جاننا ضروری سمجھا گیا جو مخاطب قوموں کی زبانیں تھیں۔ پھر ہندوستان میں ایک اہم عنصر تجارت بھی تھا۔ اس سارے دور میں جب کہ یورپی اقوام نے ہندوستان سے تجارت جاری رکھی، ہندوستانی زبانوں، یہاں کی معاشرت اور تاریخ کی طرف ضرورتاً اور مصلحتاً توجہ کی گئی۔ چنانچہ اس ضمن میں مستشرق پیش پیش رہے۔ انھوں نے ہندوستان یا ہندوستان سے باہر رہ کر ہندوستانی زبانوں، یہاں کے ادب، مذہب اور معاشرت و تاریخ کا بڑی غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ یہ کوششیں زیادہ تر انفرادی سطح پر ہوتی رہیں لیکن 'ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کا قیام ہندیات کے مطالعہ کی تاریخ میں ایک نمایاں، مؤثر اور مفید اقدام تھا۔ دراصل ہندیات کے مطالعہ کی ابتدا اس سوسائٹی کے قیام ہی سے وابستہ ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کا بانی سر ولیم جونز 'بابائے ہندیات' ہے۔ اس سوسائٹی کے قیام سے نہ صرف استعماری طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل ہوئی بلکہ اس کے قیام سے علمی دنیا میں چند ایک مثبت انقلابات بھی رونما ہوئے جن سے ایک طرف تو ہندوستان متاثر ہوا اور دوسرے، اس سے بڑھ کر خود یورپ میں مشرقی علوم کی تحصیل اور ایشیائی اقوام کی تہذیب و تاریخ کے مطالعہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

ہندوستان کے عہد جدید کا مطالعہ دراصل ہندوستان میں برطانوی حکمت عملیوں اور کارکردگیوں کا مطالعہ ہے۔ ان دنوں بعض مورخین نے ہندوستان میں برطانوی حکمت عملیوں کا مطالعہ یورپ کی علمی تحریکوں کے رشتہ سے بھی کیا ہے۔[۵] آج بھی برطانوی مورخین کے نزدیک عہد جدید میں ہندوستان کی تاریخ دراصل 'برطانوی ہند کی تاریخ' ہے۔ برطانیہ کی انتظامی حکمت عملیوں اور تصورات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ہندیات کے ارتقائی تاریخ کا جائزہ بھی ناگزیر ہے۔ عام طور پر یہ حقیقت پیش نظر نہیں رہی ہے کہ اٹھارویں صدی میں مشرقی علوم کے مطالعہ کے پس پشت سیاسی مقاصد کارفرما رہے ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستانی معاملات و مسائل پر قلم اٹھانے والوں نے ہمیشہ مستشرقین کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے اور اپنی حکمت عملیوں کو تشکیل دیا ہے۔

۲۔ ٹائن بی ص ۲۷۹، ونیز چیمبرلین ص ۱۵

۳۔ مارشل ص ۱

۴۔ مکرجی ص ۹

۵۔ مثال کے طور پر اسٹوکس ص X-XI اور بلہا چٹ، جا بجا۔

www.taemeernews.com

ان تمام مستشرقین میں، جنھوں نے ہندیات کا مطالعہ کیا، سر ولیم جونز کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ وہ اٹھارویں صدی کی برطانوی حکمت عملیوں اور ہندیات کے مطالعہ کی تاریخ میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے مطالعہ کے لیے ایک منظم کوشش، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کو قیام سے کی۔ ہندوستانی تہذیب، زبان اور مذہب و سیاست پر اس کی تحریروں نے یورپ کے ایک خاص پڑھے لکھے طبقہ کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ انھیں اس موضوع پر مزید تحقیقات کی ترغیب دی۔ جونز کو سیاست سے بڑا شغف تھا۔ جب وہ انگلستان میں رہا،[۶] امریکہ کی جنگ آزادی کا مؤید اور پارلیمانی اصلاح کا حامی رہا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے لیے قانون اور حکومت کا ایک واضح نظریہ پیش کیا۔ عام طور پر وہ ارباب اقتدار سے قریب اور ان کے مشوروں میں شامل رہا۔ اسے ہندوستان کے عہد جدید کی تاریخ میں محض اس وجہ سے اہمیت حاصل نہیں کہ وہ ایک عالم بے بدل تھا، انتیس[۲۹] زبانوں سے واقف تھا اور اس نے ہندیات کے ضمن میں بڑی اہم تحقیقات پیش کی تھیں، بلکہ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی تحریروں اور مساعی کے سبب ہندوؤں نے اپنے آپ کو پہچانا اور ہندو قومیت کے عناصر کو ان سے تقویت پہنچی۔ اس کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ دراصل دو ملکوں کی تاریخ ہے۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے قومی تشخص کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

سر ولیم جونز ویلز میں ۲۸ ستمبر ۱۷۴۶ء کو پیدا ہوا۔ دس سال تک ہیرو (Harrow) میں تعلیم پاتا رہا پھر آکسفورڈ سے ۱۷۶۴ء میں فارغ ہوئے۔[۷] اس وقت تک وہ عبرانی، یونانی، لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، عربی، فارسی زبانیں سیکھ چکا تھا۔ ان کے علاوہ وہ جرمن، پرتگیزی، ترکی، چینی وغیرہ کل انتیس[۲۹] زبانیں جانتا تھا۔ اپنی چوبیس سال کی عمر میں اس نے فارسی سے فرانسیسی میں نادر شاہ کی سوانح پر مشتمل ایک کتاب 'تاریخ نادری' کا ترجمہ کیا، جو محمد مہدی خاں کی تصنیف تھی۔ اس کے ایک سال بعد حافظ کی سولہ غزلوں کا ترجمہ اور انگریزی میں فارسی زبان کی ایک قواعد لکھ چکا تھا — حافظ کی غزلوں کا ترجمہ پہلے 'قواعد' میں شامل تھا لیکن بعد میں علٰحدہ کرکے اصل غزلوں کے ساتھ شایع کیا۔[۸] ۱۷۷۱ء سے ۱۷۸۳ء کا عرصہ اس کے لیے تحریر و تصنیف کے اعتبار سے اور ادبی حلقوں میں شہرت کے لحاظ سے خاصا مفید رہا۔ اس مدت میں اس نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا، جن میں سے کم از کم نو کتابیں مشرقی علوم سے متعلق تھیں۔[۹] اس عرصہ میں وہ ایک مستشرق کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ اپنی علمی قابلیت سے قطع نظر وہ ایک ممتاز قانون داں بھی سمجھا جاتا

۶۔ انگلستان میں اس کی سیاسی زندگی کے احوال کے لیے: کینن، بالخصوص ص ۶۰ — ۷۸ وغیرہ، — مکرجی ص ۴۹ — ۶۲

۷۔ تفصیلات کے لیے کینن ص ۱ — ۱۳؛ مکرجی ص ۱۷ — ۲۰؛ آربری 'Oriental Essays' " ص ۴۸ — ۵۱، جدید مطالعہ پر مبنی ہیں۔

۸۔ کینن ص ۳۰۔

۹۔ مکرجی ص ۳۵۔

www.taemeernews.com

تھا۔ چنانچہ اس کی اس خصوصیت کے پیش نظر ۱۷۸۲ء میں اسے ہندوستان میں عدالت کی منصفی کی پیش کش کی گئی[10] تو اس نے اس پیش کش کو آمدنی اور حیثیت میں اضافہ کے خیال سے قبول کر لیا۔ ۱۲ راپریل ۱۷۸۳ء کو وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہوا[11]

سفر کے دوران اس نے ذہنی طور پر ایک منصوبہ تشکیل دیا کہ اسے ہندوستان میں رہ کر کیا کرنا ہے۔ اس کے منصوبہ میں درج ذیل امور پر تحقیقات کرنا شامل تھا[12]

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین
(۲) عہد قدیم کی تاریخ
(۳) رسم خط کی تصاویر اور نقلیں
(۴) الفاظ کے استعمال کی روایات
(۵) ہندوستان کا جغرافیہ اور معاصر سیاسیات
(۶) بنگال پر حکومت کرنے کے بہتر طریقے
(۷) ایشیائی اقوام کا علم ریاضی، الجبرا اور مخلوط علوم
(۸) ہندوستان کا علم طب، کیمیا، جراحی اور علم الابدان
(۹) ہندوستان کی معدنی پیداوار
(۱۰) ایشیا کی شاعری، خطابت اور اخلاقیات
(۱۱) مشرقی اقوام کی موسیقی
(۱۲) چین کی غنائی نظمیں
(۱۳) تبت اور کشمیر کے بارے میں مزید معلومات
(۱۴) ہندوستان کی تجارت، صنعت اور زراعت
(۱۵) مغلیہ دستور حکومت
(۱۶) مرہٹہ دستور حکومت

ان سولہ امور کو تین حصوں تاریخ، سائنس اور فنون میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان امور کے مطالعہ کے سلسلے میں وہ خیال کرتا تھا کہ وہ مخطوطات جمع کر کے ان کے جائزے میں مقامی افراد سے مدد لے گا۔ اس وقت تک اس نے کسی سوسائٹی کے قیام کی بابت نہیں سوچا تھا۔

---

[10] مکرجی ص ۴۳، ۴۷
[11] ایضاً ص ۴۳
[12] مشمولہ ایضاً ص ۴۷، ونیز کینن ص ۱۱۳

www.taemeernews.com

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا قیام

جونز ۲۵ ستمبر ۱۷۸۳ء کو کلکتہ پہنچا[13] اس وقت کلکتہ میں اسے نوجوان افسروں کا ایک ایسا گروہ مل گیا جو ہندیات کے مطالعہ کا بڑا شائق تھا۔ اس گروہ کے بعض افراد بڑے نامور بھی ہوئے۔ ان میں چارلس ولکنس ـ ـ ـ ـ (Charles.Wilkins) نیتھنیل ہالہیڈ (Nathaniel Halhed) جان شور (Jnon Shore) فرانسس گلیڈون (Frances Gladwin) جان کرناک (Jhon Carnac) جوناتھن ڈنکن (Jonathan Duncan) اور ولیم چیمبرس (William Chambers) وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر نے سوسائٹی کے قیام اور اس کے جرنل کی ترتیب و تحریر میں جونز کی معاونت کی۔ بعض نے ہندیات کے ضمن میں انفرادی کام بھی کیے۔ ان کی ضروری مصروفیات کچھ اور تھیں۔ کتابوں اور مخطوطات کی بھی کمی تھی اور اس وقت تک ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے مطالعہ اور تحقیقات کو یورپ کے پڑھے لکھے طبقہ کے سامنے پیش کر سکتے۔

اب تک کسی مستشرق نے ہندوستانیوں کی زندگی اور معاشرت کے مطالعہ کی منظم کوشش نہیں کی تھی — اس کام کی ابتدا جونز نے آ کر کی۔ اس کی شہرت و ناموری اس کی آمد سے قبل ہندوستان پہنچ چکی تھی[14] اس عرصہ میں بنگال میں صرف ایک فرد ایسا تھا جس نے ہندیات کے مطالعہ کی کوششوں کو سراہا اور سرپرستی کی۔ یہ وارن ہیسٹنگز تھا جو ۱۷۷۲ء سے بنگال کا گورنر تھا۔ ہندیات کے مطالعہ کا کوئی جائزہ اس کے تذکرے کے بغیر نہیں لیا جا سکتا۔ وہ اپنی ابتدائی عمر ہی میں ہندوستان آگیا تھا۔ اور یہاں کے طویل المدت قیام نے اسے اس ملک کی روایتوں اور رسوم و رواج سے خوب واقف کرا دیا تھا۔ اس نے یہاں فارسی اور عربی زبانیں سیکھ لی تھیں[15] اور اپنے شوق کی بنیاد پر ہندوستانی مصوروں کے بہت سے شاہکاروں اور مخطوطات کو جمع کیا تھا۔ مقامی لوگوں سے وہ ان ہی کی زبانوں میں بات چیت کر لیتا تھا[16] وہ اپنے ان خطوط میں، جو وہ اپنی بیوی کو تحریر کرتا تھا، گیتا کے اقوال نقل کیا کرتا۔ خود جونز نے گیتا کے مطالعہ کا شوق ہیسٹنگز کی صحبت میں حاصل کیا تھا[17] ۱۷۷۴ء میں جونز کی 'فارسی قواعد' اس کی نظر سے گزر چکی تھی۔ جونز نے، جب وہ لندن ہی میں تھا، یہ کتاب اسے ۳۰ مارچ ۱۷۷۴ء کو بھیجی تھی[18] چنانچہ یہ امر ہیسٹنگز کے لیے فطری تھا کہ وہ ہندیات کے مطالعہ کی کوششوں کی سرپرستی کرتا۔ اس نے متعدد پیش رو مستشرقین کی حوصلہ افزائی' اور' سپریم کونسل' میں ان کی حمایت کی[19] ولکنس نے اس کی حوصلہ افزائی

---

[13] مکرجی ص ۷۶

[14] ایضاً ص ۷۸

[15] میکالے ص ۴۸۲

[16] ایضاً ص ۴۸۳

[17] مکرجی ص ۸۹

[18] آربری، Oriental Essays ص ۵۱

[19] مکرجی ص ۸۹

www.taemeernews.com

کے جواب میں اپنی پہلی کتاب کا انتساب اس کے نام کیا۔ شور اور ہالہیڈ نے بھی اس کے لیے اپنی تحریروں اور خطوں میں تشکر کا اظہار کیا۔[20]

ہیسٹنگز کی ان حوصلہ افزائیوں کے پس پشت ایک اہم مقصد بھی تھا۔ اس نے ۱۷۷۲ء میں یہ حکمت عملی وضع کی تھی کہ ہندوستانیوں پر ان ہی کے قوانین کے تحت حکومت کی جانی چاہیے۔ چنانچہ اس نے چند برہمن پنڈتوں کو منو قوانین کا ایک مسودہ فارسی زبان میں مرتب کرنے کے لیے کہا۔[21] ہندوستان پر کامیاب حکومت کرنے کے لیے یہ اس کے ذہن کی سچائی تھی۔ اب یہ موقع قریب آرہا تھا کہ ایک 'برائے نام حکومت' دم توڑ دے اور محض برطانوی راج قایم ہو۔ اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہاں انگریزی طریق حکومت یا دستور ہی نافذ ہو۔ اس نے ۱۷۸۱ء میں 'کلکتہ مدرسہ' محض اس لیے قایم کیا تاکہ ہندوستانیوں کے سخت ردعمل اور تعصب کو نرم کرسکے جو برطانوی اقتدار میں آئے دن اضافے سے مضطرب ہورہے تھے[21]۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی اقتدار ہندوستانیوں کے اشتراک عمل سے پروان چڑھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کے مزاج، رسم ورواج، قوانین اور ادب کا مزید مطالعہ کیا جائے۔ ہالہیڈ اور جونز کے ترجمہ کردہ 'منو قوانین' اس کے منصوبے کا ایک حصہ تھے[22]۔

بعد کے حکمران ہندیات کے مطالعہ سے بے بہرہ رہے۔ گو کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے بارے میں معلومات رکھنی چاہئیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی ہیسٹنگز کی طرح ہندیات کے مطالعہ کا سرپرست اور خود شایق نہیں رہا۔ ویسے کارنوالس ایشیاٹک سوسائٹی کے زیادہ تر سالانہ جلسوں میں شریک ہوتا تھا، پھر لارڈ ہارڈنگ اور مارکوئیس ہارڈنگ بھی اس کے صدر اور عہد برطانیہ کے تمام گورنر جنرل بظاہر اس کے سرپرست رہے۔

۱۷۸۳ء کے آخر تک جونز کا یہ خیال راسخ ہوچکا تھا کہ مشرقی علوم کا باقاعدہ مطالعہ کسی فرد واحد کے ذریعہ ممکن نہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۷۸۴ء میں اس نے ایک مراسلہ جاری کیا جس میں اس نے مشرقی علوم کے مطالعہ کے لیے کلکتہ میں ایک 'سوسائٹی' کے قیام کا منصوبہ پیش کیا۔ یہ مراسلہ ان تمام افراد کے نام تھا جو اس کے خیال میں ہندیات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ تیئس افراد نے اس مراسلہ کا اثبات میں جواب دیا۔ اور وہ سب ۱۵ر جنوری ۱۷۸۴ء کو کلکتہ سپریم کورٹ کے 'جیوری روم' میں جمع ہوئے۔ جہاں چیف جسٹس سر رابرٹ چیمبرس نے نشست کی صدارت کی اور جونز نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ خطبۂ استقبالیہ میں جونز نے ایشیا کی تاریخ، تہذیب، ادب، فنون اور سائنس کے مطالعہ کے لیے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس کے خیال میں 'ایشیا نے علوم کی پرورش کی ہے اور مفید ولطیف فنون تخلیق کیے ہیں۔ ہم آسانی سے اپنے فاضل اوقات میں ایشیا کے قوانین، مذہب، طریق حکومت کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ یہ اس ملک پر حکومت کرنے کے لیے معاون اور ضروری ہے'[23]۔

۲۰ے آربری 'Oriental Essays' ص ۵۱

۲۱ے لائرڈ ص ۶۰

۲۲ے مکرجی ص ۷۹ ۔ ۸۰؛ جونز کے ترجمہ کے لیے کینین ص ۱۸۷ وغیرہ

۲۳ے مکرجی ص ۸۱

www.taemeernews.com

اس پہلے اجلاس میں جونز نے یہ قرارداد پیش کی کہ سوسائٹی کے اراکین کے لیے شرائط اور قوانین سخت نہیں ہوں گے۔ ہر ہفتے اس کے اجلاس ہوں گے۔ چونکہ اس کے لیے کسی علٰحدہ جگہ کا انتظام نہیں ہو سکا تھا، اس لیے یہ اجلاس اسی جگہ 'جیوری روم' میں ہوتے رہیں گے۔ اس کی نشستوں میں طبعزاد مقالے پڑھے جائیں گے اور ان پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ تراجم پڑھنے کی اجازت بھی ہوگی، لیکن صرف وہ تراجم جو کسی ہندوستانی مصنف کی تحریروں پر مبنی ہوں۔ اور ہر سال کے اختتام پر یہ مقالات علمی دنیا کے لیے مدون کیے جائیں گے [۲۴]۔

پہلی نشست میں، شریک افراد نے جونز کی پیش کردہ قرارداد سے پوری طرح اتفاق کیا۔ اس 'سوسائٹی' کو خود انھوں نے "ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" کے نام سے موسوم کیا [۲۵]۔

یہ سوسائٹی کلی طور پر مستشرقین کے لیے مختص رکھی گئی۔ اس میں کسی پڑھے لکھے مقامی فرد کی گنجایش نہیں تھی۔ جونز نے اس امر کو دوسروں پر چھوڑ دیا تھا۔ ۱۸۲۹ء تک اس میں کسی ہندوستانی کو رکن کی حیثیت سے جگہ نہیں دی گئی۔ لیکن کچھ ہندوستانیوں کے مقالات کو اس کے 'جرنل' میں شامل اشاعت کیا جاتا تھا۔ جونز نے اس سوسائٹی کو انگلستان کی 'رائل سوسائٹی' کے طرز پر چلانا چاہا تھا۔ جس طرح رائل سوسائٹی کا سرپرست شہنشاہ کو بنایا جاتا تھا۔ جونز نے اس سوسائٹی کے لیے تجویز کیا کہ گورنر جنرل کو اس کا سرپرست ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۲۲ر جنوری کو دو مراسلے، ایک گورنر جنرل کو اور دوسرا سپریم کونسل کو بھیجے گئے۔ پہلے مراسلے میں وارن ہیسٹنگز کو سوسائٹی کا صدر بننے کی دعوت دی گئی اور دوسرے میں کونسل سے سرپرست بننے کی گزارش کی گئی جو منظور ہو گئی۔ لیکن ہیسٹنگز نے انکار کرتے ہوئے خود جونز کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا [۲۶] جس کے مطابق ۵ر فروری کو جونز نے صدارت کا عہدہ قبول کر لیا۔ اور اپنے انتقال تک وہی اس سوسائٹی کا صدر رہا۔

دس سال کی یہ مدت، اس وقت کی عام صورت حال میں، صدارت کے لیے بڑی کٹھن اور دشوار گزار تھی۔ کیونکہ سوسائٹی کے اراکین تقریباً سب ہی ذمہ دار افسران تھے جو اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہتے تھے اور یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ کبھی کبھی کلکتہ سے دور کسی مقام پر مامور کیے جاتے۔ چنانچہ اس سوسائٹی کی رکنیت ۱۷۸۴ء میں تیس افراد سے شروع ہوئی تھی اور ۱۷۹۴ء میں ایک سو دس تک پہنچ سکی۔ اور اس کی نشستوں میں حاضرین کی تعداد پچاس سے کبھی تجاوز نہ کر سکی۔ کبھی کبھی تو محض سات یا آٹھ افراد ہی اس کی نشستوں میں حاضر ہوتے۔ قیام کے پہلے مہینہ میں سوسائٹی کی نشست، جیسا کہ پہلی نشست میں طے ہوا تھا، ہر ہفتے ہوتی رہی لیکن جلد ہی یہ باقاعدگی ختم ہو گئی اور عام طور پر اس کی نشستیں پندرہ روزہ یا پھر طویل طویل مدت کے بعد منعقد ہونے لگیں۔ ان پہلے دس سالوں میں اس کی نشستیں تعداد میں نوّے سے کچھ ہی زیادہ ہوئی ہوں گی [۲۷]۔ اس کے سالانہ اجلاس میں زیادہ سے زیادہ تیس اراکین حاضر ہوتے۔ گورنر جنرل، سپریم کونسل کے اراکین،

۲۴؎ مکرجی ص ۸۲

۲۵؎ ایضاً ص ۸۳

۲۶؎ ایضاً ص ۸۳ - ۸۴ ؛ کینن ص ۱۱۸

۲۷؎ مکرجی ص ۸۴ - ۸۵

www.taemeernews.com

کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار اور سپریم کورٹ کے جج شریک ہوتے تھے۔ اس اجلاس میں جونز اپنا سالانہ خطبہ پیش کرتا تھا۔

حکومت سوسائٹی کی کارکردگیوں کو بار آور بنانے کے لیے اس بات پر بھی آمادہ تھی کہ وہ سوسائٹی کو ملک کے ضروری حالات سے باخبر کرتی رہے۔ ۸ر اپریل ۱۷۸۴ء کو گورنر جنرل نے تبت کے بارے میں سموئیل ٹرنر کی تحریریں سوسائٹی کی نشست میں پڑھنے کے لیے بھیجی تھیں [۲۸] میکفرسن (J. B. Macpherson) نے جو ہیسٹنگز کے جانے کے بعد بنگال کا گورنر بنا تھا، سوسائٹی کو چند سرکاری معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے سوسائٹی سے 'کلکتہ مدرسہ' کے لیے اسلامی قوانین و روایات سے واقف ایک شخص کو منتخب کرکے بھیجنے کے لیے کہا تھا، جو مدرسہ اور طلبہ کی کیفیت سے سوسائٹی کو بھی مطلع کرتا رہے۔ ولیم چیمبرس کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا [۲۹] ساتھ ہی کمپنی نے ۱۷۸۸ء میں اپنا پریس سوسائٹی کو جرنل شایع کرنے کے لیے دے دیا تھا۔ سوسائٹی کے ابتدائی دور میں اس کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی۔ اس کی نشستیں سپریم کورٹ کے 'جیوری روم' میں ہوتی رہیں۔ لیکن ۱۸۰۵ء میں سوسائٹی کی عمارت کے لیے حکومت نے ایک مناسب جگہ سوسائٹی کو بلا قیمت دے دی۔ سوسائٹی کے اراکین نے اپنے نجی چندے سے اس کی عمارت تعمیر کرائی۔ آج بھی کلکتہ میں موجودہ پارک اسٹریٹ پر سوسائٹی کا دفتر اور اس کا قیمتی اور نادر کتب خانہ موجود ہے۔

سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ مخطوطات اور ہندو اور مسلمان عالموں سے بھی معلومات جمع کی جائیں۔ اس کے لیے بعض خاص مقامات جیسے بنارس وغیرہ کا دورہ بھی ضروری تھا۔ یہ سب کام جونز کے ذمہ کردیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ سوسائٹی کا ایک سکریٹری بھی تھا جو اپنے گھر میں سوسائٹی کے مخطوطات اور کتابوں کی جمع و ترتیب کا کام کرتا تھا۔ سوسائٹی کے لیے گوکہ ولکنس، چیمپین اور چیمبرس وغیرہ بھی مقالات لکھتے تھے، لیکن اس ضمن میں ۱۷۸۷ء تک زیادہ تر تحریری کاوشیں جونز ہی کی تھیں۔ اور سوسائٹی کی جانب سے خط و کتابت بھی عام طور پر وہی کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو اراکین کلکتہ سے باہر ہوتے، وہ ان کے مقالات کو اصلاح کے بعد سوسائٹی کے اجلاس میں پڑھ کر سناتے [۳۰]

جونز کی شخصیت اور اس کی مساعی کے سبب سوسائٹی کی شہرت بہت جلد یورپ میں عام ہوگئی۔ اور جب ۱۷۸۷ء میں سوسائٹی کے تحت اس کا پہلا تحریری کام "کام دیو کے اقوال" کا سنسکرت سے فارسی میں اور فارسی سے انگریزی میں ترجمہ منظر عام پر آیا تو اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ جونز کے انتقال، ۲۷ر اپریل ۱۷۹۴ء تک سوسائٹی نے خاصا اہم اور معیاری کام کرلیا تھا۔ وہ سب کچھ جو اس نے اس وقت تک کیا، یورپ کی علمی دنیا کے لیے ایک محرک ثابت ہوا۔

سوسائٹی کا جرنل

یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک مجلہ بھی، جو محض ہندیات کے لیے مخصوص ہو، زیادہ فائدہ مند اور مؤثر ثابت ہوگا۔ چنانچہ

---

[۲۸] مکرجی ص ۸۵

[۲۹] ایضاً

[۳۰] ایضاً

www.taemeernews.com

۱۷۸۵ء میں 'Asiatick Miscellany' کا اجرا ہوا۔ اس کی ادارت فرانسس گلیڈون کے سپرد ہوئی جو تصنیف و تالیف اور صحافت کا تجربہ رکھتا تھا[۳۱] اس کے مندرجات میں بنیادی طور پر مشرقی ادبیات کے تراجم، قدیم تحریروں کے اقتباسات، مشرقی موضوعات پر منظومات اور چند طبعزاد مقالات شامل ہوتے تھے۔ اس کا نام جونز کے افتتاحیہ خطبہ سے لیا گیا تھا۔ لیکن یہ مجلہ جونز کے خوابوں کی تعبیر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا مجلہ چاہتا تھا جو صرف طبعزاد مقالات کا مجموعہ ہو۔ چنانچہ اس کی اشاعت کے لیے اس نے ۲ جولائی ۱۷۸۴ء کو ایک تجویز پیش کی جو ایک طویل مدت کے بعد جنوری ۱۷۸۹ء میں روبہ عمل آئی اور 'Asiatic Researches' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس کا معیار اس وقت کے اچھے سے اچھے 'جرنل' کے برابر تھا۔ اس میں متعدد طبعزاد مقالات شامل تھے۔ اور ان کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا تھا کہ یہ مضامین سب ہی کی پسند کے مطابق ہوں۔ ان مقالات میں ہندوؤں کے مذاہب اور زبانیں، ہندوستانی ادب، رسم و رواج تبت کا ایک سفر، پٹنہ میں سکھوں کا ایک کالج جیسے مقالات شامل تھے۔ یہ پہلا 'یوروپی جرنل' تھا جس میں کم از کم چار ہندوستانی عالموں گوردھن کول، پنڈت رام لوچن، رادھا کانت شرمن اور علی ابراہیم خاں کے مضامین شامل تھے۔ ان میں اول الذکر کے بارے میں معلومات عام نہیں ہیں۔ رام لوچن جونز کو سنسکرت پڑھایا کرتا تھا۔ رادھا کانت پنڈت تھا۔ ہیسٹنگز اور جان شور کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ علی ابراہیم اس وقت بنارس میں مقیم تھا۔ وہیں اس کی جونز سے ملاقات ہوئی تھی[۳۳] بنارس سے واپسی کے بعد جونز اور اس کے مابین خط و کتابت ہوتی تھی۔ وہ ایک عالم اور منتظم تھا جو ۱۷۸۲ء میں بنارس میں بطور منصف عدالت تعینات کیا گیا تھا۔ ہندوستانی شاعروں پر اس نے ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ - - - 'Asiatic Researches' میں اس کا مقالہ بعنوان 'Trial by Ordeal' شامل ہوا تھا۔

یورپ میں اس مجلہ کو بہت زیادہ سراہا گیا اور جلد ہی یہ فروخت ہو گیا۔ چنانچہ اس کا ایک دوسرا ایڈیشن لندن سے شایع ہوا۔ پھر اس کا یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا[۳۴] ۱۷۸۷ء سے اپنی وفات تک اس کے مقالات میں زیادہ تر مقالات جونز ہی کے تحریر کردہ تھے۔ ان مقالات کے لیے معلومات وہ عام طور پر مخطوطات اور ہندو اور مسلمان عالموں سے گفتگو کر کے حاصل کرتا تھا۔ اس مجلہ کی ہر اشاعت بجائے خود ایک جلد کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن رقوم کی کمیابی کے سبب یہ مستقل شایع نہ ہو سکا۔ چنانچہ جونز نے ایک ناشر کو اس کی اشاعت پر آمادہ کیا جو اس شرط پر رسالہ شایع کرنے لگا کہ اس کی ہر جلد سوسائٹی کا ہر رکن بیس روپے میں خریدے گا[۳۵] ۱۷۹۷ء تک اس کی کل پانچ جلدیں شایع

۳۱؎ مکرجی ص ۸۷
۳۲؎ ایضاً ص ۸۹
۳۳؎ ایضاً۔
۳۴؎ ایضاً ص ۸۸-۸۹
۳۵؎ کوپ ص ۲۸

www.taemeernews.com

ہوئیں اور ۱۸۳۹ء تک اس کی من جملہ ۲۰ جلدیں شایع ہوئیں [۳۶] اسی دوران ۱۸۳۲ء میں اس سوسائٹی کے تحت ایک اور جرنل 'The Journal of Asiatic Society Calcutta' کا اجرا ہوا۔ اس عرصہ میں 'Asiatick Researches' بھی نکلتا رہا لیکن بالآخر ۱۸۳۹ء میں یہ جرنل میں ضم ہوگیا۔ اسی طرح کلکتہ سے نکلنے والا ایک اور رسالہ ۔ ۔ ۔ ۔ 'Indian Review and Journal of Foreign Studies' بھی ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں شامل کردیا گیا۔ اس کا اجرا ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا۔ لیکن اس کی ۱۸۴۷ء تک صرف آٹھ جلدیں شایع ہوئی تھیں [۳۷]

جونز کے انتقال کے بعد سوسائٹی کو کوئی اور اس جیسا عالم بے بدل نصیب نہیں ہوا۔ لیکن سوسائٹی نے اپنا وہ کام جاری رکھا جس کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ گوکہ اس کی نشستوں اور جلسوں کے انعقاد میں تواتر اور باضابطگی برقرار نہ رہی لیکن اس نے اشاعتی میدان میں خاصا اہم تاریخی، ادبی اور مذہبی ادب فراہم کیا۔ بعد کی تاریخ میں اس کے نمایاں کارناموں میں قدیم اور اہم مخطوطات کی تلاش و جستجو اور اس سے بڑھ کر ان کی جمع و ترتیب رہا۔ بے شمار مخطوطات اگر اس کے تحت مدون ہوکر شایع نہ ہوتے تو آج ہندوستان کے قدیم ادب اور اس کی تاریخ کے متعدد پہلو تاریکی میں رہتے۔ پھر اس کو ایسے افراد بھی میسر آگئے جو اپنی کدوکاوش اور دقت نظر سے مخطوطات پر کام کرتے رہے۔ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ایک بڑے پیمانے پر دوسری جنگ عظیم کے دوران تک جاری رہا۔ لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ حسب روایت برقرار نہ رہ سکا۔ اس کا جرنل بھی قریب قریب اس وقت تک نکلتا رہا۔ انگریزی عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی رسالہ ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، زبان اور ادب کے موضوعات پر اس سے زیادہ تحقیقی، بلندپایہ اور پرازمعلومات نہیں تھا۔

جونز کا کام ہندیات پر

جونز عام طور پر بابائے ہندیات کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ ایک عام فرد کے لیے وہ اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے ہند یوروپی زبانوں کی اصل کو ایک قرار دیا، شکنتلا کا ترجمہ کیا اور سنسکرت ادب کو یورپ میں متعارف کرایا۔ جونز کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات حاصل کرے کہ کسی اور غیر ملکی نے اتنی حاصل نہ کی ہوں [۳۸] جب وہ ہندوستان آیا تھا تو کسی حد تک اسے ہندومت اور سنسکرت کی بابت علم تھا لیکن اسے سنسکرت سے واقفیت نہیں تھی۔ ولکنس کے زور دینے پر اس نے سنسکرت سیکھنا شروع کیا [۳۹] ستمبر ۱۷۸۵ء تک وہ ہندومت کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ مئی ۱۷۸۶ء تک اس نے سنسکرت سے ترجمہ کی کوشش شروع کردی تھی اور ستمبر ۱۷۸۶ء میں اس نے اپنے آپ کو سنسکرت میں پختہ قرار دے دیا تھا [۴۰]

---

[۳۶] عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۸۱، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں اس کی تمام جلدیں محفوظ ہیں۔

[۳۷] عتیق صدیقی ص ۸۱

[۳۸] آربری 'Oriental Essays' ص ۶۶

[۳۹] کینن ص ۱۱۹

[۴۰] آربری 'Oriental Essays' ص ۶۵، مارشل ص ۱۴

www.taemeernews.com

قیام کلکتہ کے چند ہی مہینوں بعد جونز اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سنسکرت لاطینی اور یونانی زبانوں میں بڑی مماثلت ہے۔ زبانوں کی مماثلت سے جونز نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان زبانوں کے بولنے والے بھی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں[41] ہندیات سے متعلق جونز کی تحریریں اس کے غیر معمولی ذہن کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے اہم تراجم میں سے ایک 'منو کے قوانین' کا ترجمہ ہے اور دوسرا کالیداس کا شکنتلا۔ زبان، تاریخ اور مذہب سے قطع نظر اس نے ادب اور موسیقی پر قلم اٹھایا اور ہندو فلسفہ کے مکاتیب کا تجزیہ کیا۔ 'Asiatic Researches' میں اس کے مقالات اور شکنتلا کا ترجمہ بہت جلد یورپ کی دوسری زبانوں میں منتقل ہو گئے۔ اس نے 'فارسی زبان کی قواعد' لکھی جو کم از کم شیراز کی 'ادبی بولی' کو، جو اٹھارویں صدی سے فارسی مخطوطات میں نظر آتی ہے، سمجھانے میں معاون تھی[42] یہ بنیادی طور پر انگریزوں کے استفادے کے لیے تھی۔ جب وہ ہندوستان آیا تو سنسکرت سیکھنے کا اس کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔ وہ اسے ولکنس کا حق سمجھتا تھا[43] یکم مارچ ۱۷۸۵ء تک اسے بنارس سے ایک 'دھرم شاستر' کا مخطوطہ مل گیا تھا۔ جونز نے اس کے مطالعہ کا ارادہ کر لیا تھا چنانچہ اس نے ولکنس کو لکھا کہ وہ اس کے بہتر مسودہ کا انتظام کر دے[44] پھر اس کو 'منو کے قوانین' کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اس کے سیکھنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت تک اس نے ہندوؤں پر قلم اٹھانے کے لیے بھگوت پران، یوگ وشسٹ، اور سنگیت درپن کے توسط سے بہت کچھ مواد جمع کر لیا تھا[45] ۲ فروری ۱۷۸۵ء کو، جب کہ اسے سنسکرت سیکھتے ہوئے بمشکل چار مہینے ہوئے تھے، اس نے ہندوؤں پر اپنا ایک مقالہ تیار کر لیا[46] ہندوؤں کے علاوہ اس کے پیش نظر مسلمانوں کے قوانین کا ترجمہ کرنا بھی تھا[47] مسلمانوں کے قوانین کے سلسلے میں 'مسلمانوں کے قوانین وراثت' اور 'السراجیہ' کے تراجم اسی تعلق سے اس کی کوششیں ہیں[48] 'ایشیائی علم ہجا' پر اس کا مضمون سنسکرت کے مطالعہ میں ایک اہم اضافہ تھا[49]

---

[41] تفصیلات کے لیے لائرڈ ص ۱۵، و نیز کینن ص ۱۴۰ - ۱۴۱ ؛
اس ضمن میں اُس کی اصل تحریر کی حالیہ اشاعت : مارشل، تصنیف مذکور میں ہے۔ بالخصوص، ص ۲۵۲ - ۲۵۳

[42] مکرجی ص ۹۴

[43] ایضاً۔

[44] ایضاً۔

[45] ایضاً ص ۹۵

[46] اس کی حالیہ اشاعت: مارشل ص ۲۴۶ - ۲۶۱ میں ہے۔

[47] کینن ص ۱۱۳۔

[48] ایضاً ص ۱۴۹

[49] 'Asiatic Orthography' مشمولہ 'Asiatic Researches' جلد اول ص ۱ - ۵۶ بحوالہ مکرجی ص ۹۹ —

www.taemeernews.com

ہندوؤں پر مطالعہ کرتے ہوئے اس نے پہلے پہل فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ جیسے محسن فانی کی 'دبستان المذاہب'، دارا شکوہ کا ترجمہ 'اپنشد' اور دھرم شاستر کے فارسی تراجم اس کے مطالعہ میں رہ چکے تھے۔ بعد میں اس نے ہندوستانی کتابیں ان کی اصل زبانوں میں پنڈتوں کی مدد سے پڑھیں۔ ہندومت کی دو باتوں نے اسے کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ ایک تو ہندومت کا تصور خدا، جس میں ثنویت نہیں تھی اور انسانی روح کا تصور، جس کو کہ شنکر نے 'ویدانت' کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا تھا۔ اور دوسرے 'تناسخ ارواح'۔ جونز کا خیال تھا کہ ایک لحاظ سے ہندومت عیسائیت پر برتری رکھتا ہے۔ اسے عیسائیت کے 'طریق سزا' اور 'اذیت کے دوام' پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں اسے ہندومت کا تصور تناسخ ارواح، زیادہ عقلی معلوم ہوتا تھا[۵۰]

ہندوؤں کی تاریخ کے تعین میں جونز نے زیادہ تر بھگوت گیتا کے فارسی ترجمہ پر انحصار کیا تھا۔ جان شور نے اسے 'پران ارتھ پرکاشں' بھی فراہم کردی تھی[۵۱] جسے ہیسٹنگز کے لیے پنڈت رادھا کانت نے تحریر کیا تھا۔

اس میں رادھا کانت نے غیر ملکی افراد کے لیے مذہب اور تاریخ کے ضمن میں 'پرانوں' کا نقطہ نظر بیان کیا تھا۔

رادھا کانت سے جونز کی ملاقات ۱۷۸۵ء میں ہوئی تھی۔ اس سے وہ طویل ملاقاتیں کیا کرتا تھا۔ اور پھر ایک کشمیری برہمن گوردھن کول اور پنڈت رام لوچن، جو جونز کا استاد بھی تھا، ہندوستانی تاریخ کی ترتیب میں جونز کے مددگار رہے تھے[۵۲]، اور جون ۱۷۹۰ء کو اس نے سوسائٹی کے اجلاس میں ایک مقالہ بعنوان 'ہندوستانی تاریخ پر ایک ضمنی مضمون' پڑھا۔ اسے اپنے ایک دوست سیموئیل ڈیوس (Samuel Davis) سے 'سوریا سدھانت' کی ایک نقل ملی تھی جسے اس نے اپنے استاد کی مدد سے پڑھ ڈالا تھا۔ ہندو اساطیر کے مطالعہ میں یہ اس کے لیے بڑی ممد رہی تھی۔ جونز نے ہندوؤں کی تاریخ کے تعین میں اس سے بھرپور استفادہ کیا۔

کرشنگر کے دوران قیام میں وہ زیادہ تر وقت برہمنوں سے ہندو اساطیر، فلسفہ و ادب پر گفتگو کرتا رہتا۔ یہیں اس نے نباتات کا بغور مشاہدہ بھی کیا اور ان کی نوع کے اعتبار سے اقسام بندی بھی کی۔ لیکن یہ اس کا کوئی مستقل کام نہیں تھا۔ کرشنگر میں تو اس کی دلچسپی زیادہ تر ان ہندوؤں کے ساتھ وقت گزارنے میں ہوتی تھی، جو اسے 'غیر ملکی فوج کا ہندو' کہا کرتے تھے[۵۳]۔ یہیں اس نے کرشنگر کے بچوں کے لیے سنسکرت کی نظمیں ترتیب دیں۔

نثر میں سنسکرت سے 'گیتا گووندا' یا جے دیو کے گیتوں کے ترجمہ نے اسے ہندو ادب سے قریب تر کر دیا تھا[۵۴]۔

شکنتلا کے بارے میں اس کو پہلے پہل ۱۷۸۵ء میں علم ہوا تھا۔ یورپ میں 'ہندوستانی ناٹک' کے بارے میں وہ شش و پنج

---

[۵۰] مکرجی ص ۱۱۸ - ۱۱۹

[۵۱] ایضاً ص ۱۰۲

[۵۲] ایضاً

[۵۳] کینن ص ۱۶۳

[۵۴] ایضاً ص ۱۷۰

www.taemeernews.com

تھا - اور یہ بھی کہ یہ گیتوں بھری ہندو تمدن و تاریخ' ہوتے ہیں - کلکتہ میں رادھا کانت نے ناٹک کی تعریف کرتے ہوئے اسے انگریزوں کے ان ڈراموں سے مماثل کیا تھا جو ان دنوں سرد موسم کے دوران کلکتہ میں کیے جاتے تھے - چنانچہ اس نے بہتر سے بہتر ناٹک دکھانے کی فرمایش کی - جس پر اسے شکنتلا دکھایا گیا - وہ اس سے بڑا متاثر ہوا - اس نے شکنتلا کا ترجمہ کرنا چاہا اور اس میں کامیاب ہو گیا - اگلے سال ۱۷ راگست کو اس نے اپنا ترجمہ پہلے لاطینی میں اور پھر انگریزی میں مکمل کیا - ۱۷۸۹ء میں اس کا پہلا انگریزی ترجمہ شایع ہوا [55] اور ایک سال بعد لندن سے دوبارہ شایع کیا گیا [56]

اسی دوران اسے ہاتفی کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ایک نادر مخطوطہ دستیاب ہوا چنانچہ اس نے اس کے ترجمہ کا بھی ارادہ کر لیا - فارسی سے کسی متن کے ترجمہ کی یہ اس کی پہلی کوشش تھی - ترجمہ کے علاوہ اس نے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا جس میں ہاتفی کے اسلوب اور فن سے بحث کی [57] یہ ترجمہ کلکتہ سے ۱۷۸۸ء میں شایع ہوا -

جونز نے اپنی تحریروں اور تحقیقات سے بحیثیت مجموعی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان ریاضی، الجبرا اور منطق میں برتری رکھتا تھا [58] اس کے خیال میں یہ بھی ممکن تھا کہ ارسطو نے منطق کا اپنا نظام 'برہمنی قیاس' سے اخذ کیا ہو - اس نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ زیادہ تر ہندوستانی اور یوروپی اقوام ایک ہی اصل رکھتے ہیں - ان کی زبانیں بھی ایک ہی زبان سے مشتق ہیں - ہندو اور یونانی دونوں مشترک خداؤں کو مختلف ناموں سے پوجتے ہیں - قدیم ہندوستانی اور یونانی علم الافلاک بھی ایک ہی تھا - لیکن ــــ مجموعی طور پر ہندوستانیوں نے ہندوستان میں آمد کے بعد انسانی تہذیب کی زیادہ خدمت کی ہے - اس نے ایک نئی شہادت بھی فراہم کی کہ شطرنج کا کھیل ہندوستان ہی میں ایجاد ہوا ہے [59] بجا طور پر ہندو علم القواعد، اعشاری پیمائش اور شطرنج کی ایجاد پر فخر کر سکتے ہیں - اپنے آخری کارنامے ایشیاٹک سوسائٹی کے توسط سے اس نے دعویٰ کیا کہ نیوٹن کا سارا نظریہ اور اس کے فلسفہ کا ایک حصہ ویدوں اور حتیٰ کہ صوفیوں کے علوم میں موجود ہے -

جہاں تک ہندیات کے مطالعہ کے ضمن میں جونز کی اہمیت اور انفرادیت کا تعلق ہے، اس کا صحیح اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں - لیکن اس کی بیشتر مساعی ایسی ہیں جن پر اس کے ہی دور میں، چند اور افراد نے بھی کوششیں کی تھیں - ہندیات کے مطالعہ میں اس کا اصل اور حقیقی کارنامہ فی الحقیقت ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام ہے، جس نے ہندوستان کو علمی دنیا سے متعارف کرایا - اس میں ہندوستانیوں کی مدد بھی، بالخصوص ۱۸۲۹ء سے شامل رہی ہے - جب سے کہ انھیں اس میں شمولیت کی اجازت ملی تھی - اس نے اور اس کی قایم کردہ سوسائٹی نے ہندوستانی تاریخ کے مطالعہ

---

[55] مکرجی ص ۱۱۵

[56] آربری، Oriental Essays ص ۶۹

[57] کنین ص ۱۵۰

[58] ہندوستان سے متعلق اس کی تحریروں کی ایک مفصل فہرست کے لیے مکرجی ص ۱۸۲-۱۸۳

[59] ایضاً ص ۱۱۷؛ تفصیلات کے لیے کنین ص ۱۷۰-۱۷۱ -

www.taemeernews.com

کے لیے ایک بہتر ذریعہ فراہم کیا۔ پھر اس کے "شکنتلا" اور "گیتا گووند" کے تراجم نے ہندوستانی ادب کو عالمی ادب کے برابر لا کھڑا کیا۔

جونز سے قبل ہندیات کے مطالعہ کی روایات

عام طور پر ہندیات کے مطالعہ کے ضمن میں "ایشیاٹک سوسائٹی" کو اولیت اور جونز کو بابائے ہندیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس امر کو کلی طور پر درست نہیں ماننا چاہیے۔ جہاں تک ہند یوروپی زبانوں کی اصل کے تصور کا تعلق ہے، جونز اس کے اظہار میں پہلا شخص نہیں ہے۔ تھامس اسٹیونس، ایک جیسوٹ جو ۱۵۸۳ء میں ہندوستان آیا تھا، اور فلیپو سیسیٹی (Fillipo Sesseti) ایک اطالوی تاجر جو گوا میں ۱۵۸۵ء میں پہنچا تھا، انفرادی طور پر سنسکرت اور یورپ کی قدیم زبانوں کے مابین نسبتوں کو بیان کر چکے تھے[۶۰]۔ اسی طرح پانڈیچری کا ایک جیسوٹ کوئرڈو جونز کی آمد سے تقریباً بیس سال قبل یہی مشاہدہ کر چکا تھا۔ ۱۷۶۷ء میں اس نے سنسکرت اور یورپ کی قدیم زبانوں کے مابین رشتوں کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ اور افعال کی ایک طویل فہرست مرتب کی تھی۔ اسی فہرست کو انکتیل دوپروں نے ۱۸۰۸ء میں شایع کیا تھا[۶۱]۔ قریب قریب اسی عہد میں ایک ولندیزی عالم مارکیوس زیوریوس بوکسورن نے بھی ہند یوروپی زبانوں کی اصل کو مشترک قرار دیا تھا۔ اس کی تحقیقات شایع نہیں ہوئیں۔ لیکن اس کے دوست جارج ہورن کے توسط سے اس کے تصورات سترھویں صدی کے نصف آخر ہی میں یورپ میں مشہور ہو چکے تھے[۶۲]۔ خود جونز کے عہد میں، کیتھرائن دوم کی سرپرستی میں پی۔ ایس۔ پلاس نے ۱۷۸۶ء-۱۷۸۷ء میں یورپ اور ایشیا کی دو سو زبانوں کا جائزہ لیا تھا[۶۳]۔

جونز نے "شکنتلا" اور "گیتا گووند" کا جو ترجمہ کیا تھا۔ وہ یقیناً بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن ایسی ہی کچھ اور کوششیں پہلے بھی ہو چکی تھیں۔ سترھویں صدی میں ابراہام راجر نے بھرتری ہری کے اشعار کا ترجمہ کیا تھا جو فی الحقیقت کسی بھی یوروپی زبان میں پہلا ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ولندیزی زبان میں ۱۶۵۱ء میں منظر عام پر آیا تھا جس کا ۱۶۷۰ء میں فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہوا۔ لیکن اس کے مترجم کی بابت کچھ علم نہیں ہے۔ اس کے بعد کبیر کے مطالعہ کی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک اطالوی سیاح پیڈرے مارکو (Padre Marco) نے کبیر کے "ست نام" جسے عرف عام میں "گیان ساگر" بھی کہتے ہیں، "ملینھی" اور ان کے علاوہ رامائن کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ۱۷۵۸ء میں ہندوستان آیا تھا اور نیپال، تبت کی سیاحت کر کے ایک طویل عرصہ تک پٹنہ میں قیام کرنے کے بعد ۱۷۷۵ء میں واپس روم گیا تھا۔ اس نے یہاں سنسکرت کا مطالعہ کیا تھا نیز مقامی زبانیں بھی سیکھی تھیں[۶۴]۔ اس کے چند ہی سال بعد چارلس ولکنس ۱۷۸۵ء میں بھگوت گیتا کا اور ۱۷۸۷ء میں

---

[۶۰] مکرجی ص ۹۵

[۶۱] ایضاً ص ۹۶، ۱۲۸

[۶۲] ایضاً ص ۹۲

[۶۳] مکرجی ص ۹۳

[۶۴] وادے دیلی ص ۵-۷؛ جونز کے عہد میں ایک اور نامور مستشرق ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے بھی کبیر کے بارے میں اپنی تصنیف A Grammar of Hindoostanee، (مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۶ء) میں کلمات تحسین تحریر کیے ہیں، بحوالہ ایضاً ص ۷

www.taemeernews.com

'ہتوپدیشں'، کا ترجمہ کر چکا تھا۔ لیکن یہ ترجمے یورپ کو ہندوستان کے مذہب اور تصورات سے واقف کرانے کے لیے کیے گئے تھے۔ ان کی ادبی خصوصیات کی وجہ سے نہیں۔ جونز نے شکنتلا کا ترجمہ کیا تو اس دعوے کے ساتھ کہ کالیداس شیکسپیر سے کسی طرح کم نہیں۔ دونوں بحیثیت ڈرامہ نگار اور شاعر یکساں درجہ رکھتے ہیں [۶۵]

ہندوستان میں ہندیات کا مطالعہ ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام سے قبل انفرادی طور پر جاری تھا۔ لیکن اگر تبلیغی مشنریوں کو، جو ایک طویل تر عرصے سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ہندوستان آرہے تھے، ایک جماعت یا ایک مستقل منصوبہ کا حامل گروہ سمجھا جائے تو یہ کوششیں گروہی یا جماعتی بنیادوں پر بھی کامیابی کے ساتھ ہوتی رہیں۔ جیسوٹ فرقے نے اس ضمن میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ اُن کی ان کوششوں کے پس پشت اُن کے اپنے فائدے زیادہ تھے۔ ہندوستان میں یہ فرقہ بہت منضبط اور فعال رہا۔ اس کے تحت یہاں زیادہ تر نہایت ذہین اور لائق افراد بھیجے گئے۔ خصوصاً فرانسس زیویر کی ۱۵۴۲ء میں ہندوستان آمد سے ان کا نہایت جوش اور ولولہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان مشنریوں کا ایک طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنے نگراں یا سرپرستوں کو اپنی کارکردگی کی روداد یں خطوط کی صورت میں ارسال کرتے تھے۔ یہ خطوط صرف مشنری کاموں کی روداد نہیں ہوتے تھے بلکہ ہندوستانیوں کی سماجی حالت اور تہذیبی روایات کے بیان پر بھی مشتمل ہوتے تھے [۶۶] اس کی ایک مثال جین فراں سوا پونس کے جائزے کی ہے جو اس نے ۱۷۴۰ء میں اپنے وطن بھیجا تھا [۶۷] پونس سنسکرت سے واقف نہیں تھا لیکن وہ 'وید' اور ان کے موضوعات سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے ہندوستانی ادب پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔

مشنریوں نے اپنی تبلیغی کوششوں کے ابتدائی مرحلہ پر ہی مقامی زبانوں سے واقفیت کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ تھامس اسٹیونس، جو ایک نامور جیسوٹ عالم تھا، مرہٹی اور سنسکرت سیکھ چکا تھا۔ ڈی نوبیلی (De Nobili) سنسکرت اور تامل میں مہارت رکھتا تھا۔ روتھ (Roth) کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس نے سنسکرت کی ایک قواعد لکھی تھی، جو کبھی شایع نہ ہوئی۔ یہ افراد زبانیں تو سیکھتے تھے لیکن ان میں سے بہت کم نے تحریری کاوشیں کی ہیں۔ اسی اثنا میں مدراس کے کچھ مشنریوں نے سنسکرت کے کچھ مخطوطات جمع کر کے ۱۷۳۳ء سے اپنے اپنے ملکوں میں بھیجنے شروع کیے تھے۔ بلکہ سترھویں صدی کے اختتام تک یورپی کتب خانوں میں ہندو مخطوطات کا ایک معتد بہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر ۱۶۹۸ء میں رامائن کے سنسکرت مخطوطات اور اس کے تیلگو اور ملیالم زبانوں میں تراجم پر مبنی مخطوطات بھی رائل سوسائٹی لندن میں نمائش کے لیے رکھے گئے تھے [۶۸] اسی نمائش میں گیتا کا ایک ترجمہ بھی تھا جو سولھویں صدی میں ہوا تھا [۶۹]

۶۵۔ کینن ص ۱۴۹

۶۶۔ مارشل ص ۱۸

۶۷۔ ایضاً

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ ایضاً

www.taemeernews.com

جیسوٹ فرقے کے مشنریوں کی طرح فرانسیسی تاجروں کے خطوط بھی ہندوستان کے متعلق معلومات سے پُر ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں فرانسس برنیر نے بہت زیادہ معلومات فراہم کی تھیں۔ یہ ایک فرانسیسی طبیب تھا۔ وہ ۱۶۵۶ء میں ہندوستان آیا تھا اور تیرہ سال تک یہاں رہا۔ اس دوران اس نے ہندوستان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برہمن پنڈتوں اور مغل امرا سے بہت زیادہ معلومات اکٹھا کیں۔ فرانس کے ایک نامور مستشرق ابراہام انکیتل دوپیرون نے ۱۷۷۱ء میں اوستا کے مطالعہ کے ضمن میں اپنی کتاب میں ہندوستان کے موضوع پر بھی بہت کچھ باتیں تحریر کیں[۴۰]۔ دوپیرون نے ۱۷۵۵ء-۱۷۶۱ء میں ہندوستان کے سفر کے دوران سنسکرت کی کچھ لغات بھی جمع کی تھیں[۴۱]۔ پیرے سونرے نے اپنے سفرنامے میں ہندومت کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا، جو ۱۷۸۲ء میں شایع ہوا۔ گلینشر نے ہندوستانی علم الافلاک پر بھرپور معلومات کا حاصل ایک مقالہ تحریر کیا[۴۲]۔

جونز کے معاصر مستشرقین

جونز کے معاصر بیشتر انگریز مستشرقین کی کاوشوں نے بھی یورپ کو ہندیات سے خاصہ متعارف کرایا۔ ان میں جان ہالول، الیگزنڈر ڈو، چارلس ولکنس، نیتھنیل ہالہیڈ اور وارن ہیسٹنگز خاصے نامور اور ممتاز ہیں۔

ہالول ڈبلن میں ۱۷۱۱ء کو پیدا ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں طبیب کی حیثیت سے ملازم تھا اور بنگال میں تعینات ہوا۔ لیکن ترقی کرتے کرتے ایک مختصر مدت کے لیے ۱۷۶۰ء میں بنگال کا گورنر بھی مقرر ہوا[۴۳]۔ نمایاں شخصی خوبیوں کا حامل کہا جاتا ہے۔ ذہانت، قابلیت اور شایستگی اس میں مجتمع سمجھی جاتی تھیں۔ سنسکرت سے واقف نہیں تھا۔ لیکن کچھ دوسری مقامی زبانیں جانتا تھا۔ ہندوستانی اور بنگالی روانی سے بولتا تھا۔ کسی حد تک عربی بھی جانتا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں ہندومت سے متعلق اس کی تحقیقات کا پہلا حصہ شایع ہوا[۴۴]۔ ۱۷۶۶ء میں دوسرا حصہ اور ۱۷۷۱ء میں تیسرا حصہ بھی تحریر کر کے طبع کیا۔ اس کی ایک اور کتاب جو ۱۷۶۷ء میں شایع ہوئی تھی، اسی موضوع پر تھی۔ ہالول کی تحریروں کا جرمنی زبان میں ۱۷۶۷ء میں اور فرانسیسی میں ۱۷۶۸ء میں ترجمہ بھی ہوا[۴۵]۔

الیگزنڈر ڈو ۱۷۳۵ء میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۶۰ء میں کمپنی کی بنگال آرمی میں ملازم ہوا۔ اپنی وفات ۱۷۷۹ء کے وقت وہ کرنل کے عہدہ پر تھا[۴۶]۔ ڈرامہ نگاری سے اسے خاص شغف تھا۔ مورخ بھی تھا۔ تین

---

[۴۰] مارشل ص ۴

[۴۱] ایضاً ص ۱۸

[۴۲] ایضاً ص ۴

[۴۳] بکلینڈ ص ۲۰۶-۲۰۶

[۴۴] مارشل ص ۶

[۴۵] ایضاً ص ۷-۸

[۴۶] بکلینڈ ص ۱۲۲

جلدوں میں 'ہندوستان کی تاریخ' مرتب کی، جس کی تیسری جلد ۱۷۷۲ء میں شایع ہوئی۔ فارسی زبان سے خوب واقف تھا۔ دو فارسی زبان کی کتابوں کے تراجم بھی اس سے منسوب ہیں[77] اس کی تاریخ ہندوستان میں ہندومت کا ایک مفصل مطالعہ شامل تھا۔ اس کے ایک حصہ کا فرانسیسی میں ۱۷۶۹ء میں ترجمہ کیا گیا۔

فرانسیسی مفکر والٹیئر ہالول اور ڈو کا معاصر تھا۔ اسے بھی ہندیات سے شغف رہا۔ اسے یہ دلچسپی ۱۷۶۰ء سے تھی جب اس نے ہندو کتبات سے متعلق ایک مخطوطہ کا مطالعہ کیا[78] والٹیئر نے ۱۷۶۷ء میں ہالول کی تحریروں کا فرانسیسی ترجمہ بھی پڑھا اور اس کے مطالعہ سے ڈو کی کتاب کا فرانسیسی ترجمہ بھی گزر چکا تھا۔ ان کے علاوہ ۱۷۶۳ء میں وہ ہندوستان کی برطانوی حکومت سے متعلق لیوک اسکریفن کے تاثرات کا مطالعہ بھی کر چکا تھا[79]

نیتھینل ہالہیڈ ۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۷۱ء میں کمپنی کی ملازمت اختیار کرکے ہندوستان آیا۔ ابتدائی عمر ہی میں اس نے وسیع مطالعہ کر ڈالا تھا۔ 'منو کے قوانین' کا کیا ہوا اس کا ترجمہ ۱۷۷۶ء میں شایع ہوا۔ اور 'بنگالی زبان کی قواعد' ۱۷۷۸ء میں منظر عام پر آئی[80] وہ وارن ہیسٹنگز کے ساتھ ۱۷۸۵ء میں واپس چلا گیا۔ وہ ایک لائق ماہر لسانیات تھا جسے زبانوں کے ارتقا سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے فارسی پر عبور حاصل کیا تھا۔ متعدد مقالات فارسی کے تراجم پر مشتمل تحریر کیے اس نے بنگالی اور سنسکرت کے مشترک عناصر کی بھی نشان دہی کی۔ وہ سنسکرت سے بھی خوب واقف تھا اور اس کے پاس سنسکرت کے مخطوطات کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی جمع ہو گیا تھا۔ جونز سے قبل ہی اس نے یہ خیال پیش کر دیا تھا کہ سنسکرت میں فارسی اور عربی بلکہ لاطینی اور یونانی زبانوں کے الفاظ مشترک ہیں۔ اس نے یہ تصور ۱۷۷۹ء میں اپنے ایک مسودہ میں بیان کیا تھا[81]

چارلس ولکنس، جسے سنسکرت کے مطالعہ کا بانی کہا جاتا ہے[82] ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر میں کمپنی کا ملازم ہو کر بنگال آیا تھا۔ یہاں اسے ہالہیڈ کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ ہالہیڈ ہی نے ۱۷۷۸ء میں اسے سنسکرت سیکھنے کی ترغیب دی[83] وہ پہلا انگریز تھا جس نے سنسکرت میں مہارت حاصل کی۔ اس نے ۱۷۷۹ء میں اس کی ایک قواعد بھی مرتب کروائی[84] مشرقی علوم سے اس حد تک دلچسپی لینے لگا تھا کہ مقامی زبانوں پر مشتمل ادب کی اشاعت کے لیے

---

[77] مارشل ص ۷

[78] ایضاً ص ۸

[79] ایضاً

[80] بکلینڈ ص ۱۸۵

[81] مارشل ص ۱۰

[82] آربری، British Contribution ص ۱۴؛ اسے سنسکرت میں مہارت رکھنے کی بنیاد پر آکسفورڈ سے ۱۸۰۵ء میں ڈی۔سی۔ایل کی ڈگری اور ۱۸۳۳ء میں 'سر' کا خطاب دیا گیا تھا۔ کوپ ص ۲۶

[83] مارشل ص ۱۰

[84] بکلینڈ ص ۵۱۴

ایک مطبع قایم کیا، جس میں فارسی اور بنگالی زبانوں کے ٹائپ کو بھی رواج دیا۔ یہ ٹائپ خود اس کے ایجاد کردہ تھے۔ اس نے ۱۷۸۶ء میں، جب کہ وہ انگلستان واپس جا چکا تھا، ناگری ٹائپ بھی ڈھالا[85] اس کی تحریری کاوشوں میں ایک مہابھارت کا ترجمہ بھی تھا۔ اس کام کی خاطر بنارس جانے کے لیے اسے وارن ہیسٹنگز نے بالخصوص دفتری کاموں سے چھٹی دی تھی۔ اور جب ۱۷۸۴ء میں وارن ہیسٹنگز نے بنارس کا دورہ کیا تو اس نے ولکنس کو بھگوت گیتا علحدہ کر کے شایع کرنے کے لیے کہا اس کے دوسرے سال یہ ترجمہ انگلستان سے شایع ہوا۔ ہیسٹنگز نے ولکنس کو 'منو کے قوانین' کے ترجمہ پر بھی مامور کیا تھا۔ اسی نے 'منو کے قوانین' پنڈتوں کے ذریعہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرائے تھے۔ اس فارسی ترجمہ سے انگریزی ترجمہ کا کام ولکنس نے شروع کیا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اس نے باقی کام جونز کے سپرد کیا۔ جونز نے اسے ۱۷۹۴ء میں مکمل کیا۔ اور اسی سال یہ شایع ہوا[86] ۱۷۸۷ء میں ولکنس نے 'ہتوپدیش' کا بھی ترجمہ کر کے شایع کیا، جو 'پنچ تنتر' کا ایک حصہ ہے۔ 'پنچ تنتر' یورپ میں فارسی کے توسط سے پہلے ہی سے مشہور تھا[87] ۱۷۸۷ء ہی میں گیتا کا ایک فرانسیسی ترجمہ بھی ہوا۔

سنسکرت کے ماہرین میں ولکنس کے ساتھ ساتھ کولبروک کا نام بھی آتا ہے۔ اس ضمن میں اس کا مرتبہ محض اسی حد تک نہیں بلکہ وہ اپنی علمیت، دست گاہ اور اپنے مضامین کے لحاظ سے جونز کے بعد شمار کیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے جونز کے انتقال کے بعد اس کی جگہ اسی کو منتخب کیا گیا تھا[88]

ہیسٹنگز کے اور جونز کے دور میں فارسی سے تراجم کی بھی بڑی سرپرستی ہوئی۔ ہیسٹنگز کے سکریٹری ولیم ڈیوی نے، جو فارسی پر عبور رکھتا تھا، ۱۷۸۳ء میں تیمور پر ایک فارسی کتاب کا ترجمہ کیا[89] فرانسس گلیڈون نے 'آئین اکبری' کا ترجمہ کیا جو ۱۷۸۳-۱۷۸۶ء میں شایع ہوا۔ یہ بھی ہیسٹنگز کی سرپرستی میں ہوا تھا[90] آئین اکبری کے علاوہ اس نے ۱۷۸۰ء میں سعدی کے پند نامہ کا بھی ترجمہ کیا[91] عبدالکریم کا شمیری 'بیان واقع' یا 'احوال نادر شاہ' کا ترجمہ بھی اسی سے منسوب ہے۔ جوناتھن اسکاٹ نے 'تاریخ ارادت خاں' کا فارسی سے ترجمہ کیا جو ۱۷۸۶ء میں شایع ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے 'تاریخ فرشتہ' کے اس حصہ کا بھی ترجمہ کیا جو دکن سے متعلق تھا[92] رابرٹ اورم نے 'ہندوستان میں انگریزوں کی

---

[85] عبداللہ یوسف علی ص ۴۷

[86] آربری 'Oriental Essays' ص ۴۹؛ کینن نے اسے پھر بھی نامکمل ہی قرار دیا ہے۔ ص ۱۸۷

[87] مارشل ص ۱۲

[88] کوپ ص ۲۸

[89] آربری نے اس کے نام میں سہو کیا ہے اور اسے 'جے وہائٹ' تحریر کیا ہے۔ 'British Contribution..' ص ۱۶

[90] آربری 'British Orientalists'، ص ۱۸

[91] ایضًا 'British Contribution..' ص ۱۶

[92] آربری 'British Orientalists' ص ۱۶

www.taemeernews.com

فوجی مہموں کی تاریخ' لکھی جو لندن سے ۱۷۶۳-۱۷۷۸ء میں شایع ہوئی[93] فرینکلن نے ۱۷۹۸ء میں شاہ عالم ثانی کے عہد کی تاریخ لکھی۔ اورنگ زیب کے ابتدائی آٹھ سالوں کی تاریخ ایچ ولسی مارٹ نے تحریر کی جو کلکتہ سے ۱۷۸۵ء میں شایع ہوئی[94]

ایشیاٹک سوسائٹی کے اثرات

جونز اور اس کے معاصرین کی تحقیقات کے نتیجہ میں یورپ کی علمی دنیا نے ہندوستان کی طرف خاص توجہ دی۔ ۱۷۶۰ء سے ہندوستان کے بارے میں بالخصوص کتابیں تصنیف ہونے لگیں۔ لیکن ان کتابوں کے عام قاری ان کتابوں میں 'ہندوستان کی دریافت' کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی حد تک احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں[95] ہندومت پر مستشرقین کی آرا کو ردعمل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ ردعمل کلیسا کی جانب سے تھا[96] یہ رویہ صرف انگلستان یا یورپ ہی میں رونما نہیں ہوا بلکہ ۱۸۰۷ء میں ہندوستان کے پادریوں نے اپنے ملکوں کے کلیساؤں کو ہندومت کی برائیاں اور اس کی تردید میں لکھ کر بھیجنا شروع کر دیا تھا[97] چارلس گرانٹ ہندوستان میں اس ردعمل اور رویے کی بہترین مثال ہے[98] اس ردعمل کا فطری تقاضہ تھا کہ انگریز اب ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ زیادہ باضابطگی اور جوش و خروش سے کریں۔ چارلس گرانٹ کو، جو اس وقت کمپنی کی کل تجارت کا نگران اور مشنری خیالات کا حامل تھا، اسے عیسائیت کے بالجبر نفاذ سے ہندوستانی 'معاشرے کی 'اصلاح' کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس لئے اپنے عزائم اور تجاویز دو مفصل مضامین میں پیش کیے[99] بیس سال ہندوستان میں رہ کر وہ ۱۷۹۰ء میں واپس چلا گیا۔ اب وہ اس حیثیت کا مالک تھا کہ اس کے زیر اثر ۱۷۹۳ء میں کمپنی کا ترمیم شدہ مسودہ قانون منظور ہوا[100] جو اس کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ اس قانون کے تحت مشنریوں کو بکثرت ہندوستان بھیجا گیا[101] ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج بنارس کا قیام اس حکمت عملی کا ایک توسیعی منصوبہ تھا تاکہ مشنری یہاں آکر یہاں کی زبانوں اور مذہب و تہذیب سے واقفیت

---

[93] آر بری "British Orientalists" ص ۱۸

[94] ایضاً "British Contribution" ص ۱۲

[95] مارشل ص ۲؛ کچھ ایسا ہی تجزیہ رینکورٹ نے بھی کیا ہے ــ ص ۲۶۵

[96] مارشل ص ۴۱

[97] ایضاً ص ۴۲

[98] تفصیلات کے لیے، ایضاً ص ۴۲ - ۴۳

[99] لائرڈ ص ۴۰

[100] امبری ص ۱۲، ۱۵۲

[101] فلپس ص ۱۵۹؛ لائرڈ، مقدمہ ص ۳-۵-۶، قریبی عہد کے جائزے کے لیے، ایضاً "Missionaries" ص ۳۶-۴۲ وغیرہ

www.taemeernews.com

حاصل کریں۔ مشنریوں نے، جو حکومت پر اپنا واضح اثر بھی رکھتے تھے، حکومت کو مجبور کیا کہ اس کے قایم کردہ اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی اور مغربی علوم بھی نصاب میں رکھے جائیں تاکہ مقامی باشندے ان کی بات آسانی سے سمجھ سکیں [۱۰۲]۔ وارن ہیسٹنگز کی جانب سے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ کا قیام اس کی دوراندیشی کا ثبوت ہے۔ لیکن ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام حکومت پر مشنری اثرات اور ان کے تبلیغی و سیاسی عزائم کا اظہار کرتا ہے [۱۰۳]۔

اس سے قطع نظر سوسائٹی کے قیام اور اس کی تحقیقات کے خاصے مثبت نتائج بھی سامنے آئے۔ یورپ کے کئی علما نے سوسائٹی میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر رابرٹ واٹسن، پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے تجویز پیش کی کہ کیمبرج یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا ایک ادارہ قایم ہونا چاہیے [۱۰۴]۔ یہ سوسائٹی کی کارکردگی کا فوری نتیجہ تھا۔ بعد میں برطانیہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، اسی سوسائٹی کے زیر اثر ۱۸۲۳ء میں قایم ہوئی۔ خود ہندوستان میں ایشیاٹک سوسائٹی کی طرح بمبئی اور مدراس میں بھی اسی قسم کی سوسائٹیاں قایم کی گیئں [۱۰۵]۔ یورپ کے جن علما کو ہندیات سے دلچسپی تھی اور وہ یورپ ہی میں مقیم تھے — سوسائٹی کے ارکان سے ہندیات کے متعلق استفسار کرنے لگے [۱۰۶]۔

سوسائٹی کے تحت تقابلی لسانیات کے جائزوں سے سائینٹفک دور کا آغاز ہوا۔ اٹھارویں صدی کے آخر سے یہ علم قدیم اور وسطی لسانیات کے دور سے نکل کر جدید دور میں قدم رکھتا ہے۔ اس ارتقا کے پس پشت دو عوامل تھے۔ مغربی اقوام نے اپنے

---

[۱۰۲] ایضاً ص ۶۰

[۱۰۳] ایضاً ص ۵۷، ۱۷؛ اس کے قیام میں اولین سرکاری مشنری ولیم کیری کی مصلحتوں اور کوششوں کے لیے ایضاً ؛ اور اس میں مشنریوں کو تدریس کے لیے بھیجے جانے کا تذکرہ ایضاً، مقدمہ ص ۴ - ۵ میں ہے۔ مقامی زبانوں، بالخصوص اردو، ہندی، فارسی، بنگالی زبانوں کے مطالعہ اور تدریس کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد فورٹ ولیم کالج میں بھیجے گئے تھے۔ لیکن اس کے اساتذہ میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی خدمات، اس کالج کے مقاصد کے تحت دوسروں سے بڑھ کر ہیں اس کالج سے وابستگی سے قبل تک وہ ہندوستانی زبانوں سے متعلق متعدد چیزیں تحریر کر چکا تھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی یا اس سے وابستہ افراد کے علاوہ اس دور میں صرف یہی ایک فرد نہیں تھا جس نے ہندوستانی زبانوں پر تحریری کام کیا۔ ایسے افراد کی فہرست نہایت طویل ہے، جنھوں نے زیادہ تر ہندوستان ہی میں رہ کر یہاں کی زبانوں کی قواعد لکھیں، لغات تیار کیں، زبانوں کے ارتقا کا جائزہ لیا یا مغربی زبانوں سے مقامی زبانوں میں تراجم کیے۔ یہاں زیر نظر صفحات میں بخوف طوالت اس جائزے سے احتراز کیا گیا ہے۔ اس قسم کا جائزہ اردو میں متعدد فاضل مصنفین کی تصانیف کا موضوع رہا ہے۔ چنانچہ ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے جیسے مولوی عبدالحق "قواعد اردو" (اورنگ زیب آباد، تاریخ ندارد) محمد عتیق صدیقی "گلکرسٹ اور اس کا عہد" (علی گڑھ، ۱۹۶۰ء) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "جامع القواعد" (لاہور، ۱۹۷۱ء) خلیل الرحمٰن داؤدی "قواعد زبان اردو" مقدمہ (لاہور ۱۹۶۲ء) ڈاکٹر آغا افتخار حسین "یورپ میں تحقیقی مطالعے" (لاہور ۱۹۶۷ء) "یورپ میں اردو" (لاہور ۱۹۶۸ء)

[۱۰۴] مکرجی ص ۸۶ — [۱۰۵] عبداللہ یوسف علی ص ۸۰ — [۱۰۶] مکرجی ص ۸۷

www.taemeernews.com

علوم کے دائرے کو وسیع کیا اور اب وہ زیادہ زبانوں کا علم رکھتے تھے۔ اور دوسرے انھوں نے خود تجربات سے زبان کے مطالعہ کے زیادہ سائنٹیفک طریقے وضع کیے۔ افکار اور خیالات میں بھی یورپ خصوصاً فرانس اور جرمنی ہندوستان سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ گوئٹے شکنتلا کے ذریعہ کالیداس کے افکار سے متاثر ہوا۔ "فاؤسٹ" اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے دوسرے حصہ کا آخری کورس ہندوستانی فکر کو پیش کرتا ہے۔ گوئٹے کے علاوہ شکنتلا کے ترجمے سے متاثر ہونے والوں کی فہرست میں اور بھی بڑے بڑے نام لیے جاتے ہیں: فریڈرک شلیگل، ہیوگو، لامرٹائن، ڈی مائسٹر، ہرڈر، کینیٹ، لا ہینائک، بیچلیٹ وغیرہ[۵۱] ایک عام علمی دنیا پر بھی اس کا یہ نمایاں اثر ہوا کہ اس کے قیام سے علمی تحقیق کی دنیا میں تخصیص (Specialization) کے دور کی ابتدا ہوئی۔

---

[۵۱] مارشل ص ۱۷؛ فکری اثرات کا ایک تفصیلی جائزہ رینکورٹ ص ۲۵۸ – ۲۶۹ میں ہے۔ لیکن یہ زیر نظر دور سے بعد کے اثرات پر مشتمل ہے۔

فہرست اسناد محولہ

آربری، اے۔ جے "British Contribution to Persian Studies" (لندن، ۱۹۴۲ء)

"British Orientalists" (لندن، ۱۹۴۳ء)

"Oriental Essays" (لندن، ۱۹۶۰ء)

اسٹوکس، ای۔ "The English Ulititarians and India" (آکسفورڈ، ۱۹۶۳ء)

امبری، اے۔ ٹی "Chrales Grant and British Rule in India" (لندن، ۱۹۶۲ء)

برک، آدم "The Law of Civilization and Decay" (لندن، تاریخ ندارد)

بکلینڈ، سی۔ ای "Dictionary of Indian Biography" (لاہور، ۱۹۶۵ء)

بلہاچٹ، کے "Social Policy and Social Change in Western India" (لندن، ۱۹۵۷ء)

ٹائن بی، آرنلڈ جے۔ "A Study of History" ترجمہ "مطالعہ تاریخ" تلخیص جلد دوم۔ ڈی۔ سی۔ سمرویل مترجم غلام رسول مہر (لاہور، ۱۹۶۳ء)

چیمبرلین، ایم۔ ای "Britain and India" (لندن، ۱۹۷۴ء)

رینکورٹ، ڈی اموری " The Soul of India " (لندن، ۱۹۶۱ء)

عبداللہ یوسف علی، علامہ۔ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" (کراچی، ۱۹۶۷ء)

عتیق صدیقی، محمد۔ "ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں" (دہلی، ۱۹۵۷ء)

فلپس، سی۔ ایچ "The East India Company" (مانچسٹر، ۱۹۶۱ء)

کوپ، ڈیوڈ "British Crietalism and the Bengal Renaissance" (کیلیفورنیا، ۱۹۶۹ء)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر معین الدین عقیل — برطانیہ میں اُردو ایڈیشن — ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

کینن، گارلینڈ "Oriental Jones" (لندن، سنہ ۱۹۶۴ء)

لائرڈ، ایم۔ اے "Missionaries and Education in Bengal-1793-1837" (آکسفورڈ، سنہ ۱۹۷۲ء)

مقدمہ و مرتبہ "Bishop Heber in Northern India" (کیمبرج، سنہ ۱۹۷۱ء)

مارشل، پی۔ جے "The British Discovery of Hinduism" (کیمبرج، سنہ ۱۹۷۰ء)

مکرجی، ایس۔ این "Sir William Jones - A Study in Eighteenth Century British attitudes to India" (کیمبرج، سنہ ۱۹۶۸ء)

میکالے، لارڈ۔ "Critical and Historical Essays" جلد دوم۔ (لندن، سنہ ۱۸۹۲ء)

نہرو، جواہر لال The Discovery of India (کلکتہ، سنہ ۱۹۴۶ء)

وادے ویلی Kabir - (Vaudeville, ch) (آکسفورڈ، سنہ ۱۹۷۴ء)

پاکستان میں جدید ترقی پسند تنقید کے نقیب اور صاحب دانش منفرد نقاد

محمد علی صدیقی کی کتابیں

۱۔ توازن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) صفحات ۲۷۲ قیمت ۲۰ روپے

۲۔ کروچے کی سرگذشت (کروچے کی خود نوشت کا ترجمہ) صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲ روپے

اور نئے مضامین پر مشتمل ایک اور تخلیق

"نشانات"

(زیر طبع)

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ عصر نو

۴۲ ہمایوں کالونی وحید آباد کراچی ۱۸

www.taemeernews.com

عتیق احمد

برطانوی عہد کی اردو انجمنیں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے جو گرہ انگریزوں اور ہندوستان کی آبادی کے درمیان پڑی تھی وہ پورے نوّے سالہ دورِ حکومت میں کسی نہ کسی شکل میں پڑی ہی رہی۔ یوں تو پورے ملک میں انگریزوں کے ہندوستان پر غاصبانہ قبضے کے خلاف غم و غصے کی فضا عام تھی اور اس احساس میں بلا تخصیص مذہب پوری آبادی یکساں طور پر شریک تھی لیکن ان پیچیدہ اور کشیدہ تعلقات میں مسلمان آبادی اور "نئے حکمرانوں" (یعنی انگریز) کی کیفیت کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔ دوسرے لوگوں کے برعکس مسلمان آبادی کو بڑا غم تو حکومت کا چھن جانا تھا۔ دوسری طرف نئے حکمرانوں نے بھی مسلمانوں ہی کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ کر زیادہ ہی جارحانہ رویّہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان دو بڑی وجوہ کے علاوہ کچھ اور اہم عناصر بھی کارفرما تھے جو ان کے درمیان تعلقات کو ہموار نہ ہونے دیتے تھے۔ ایک وہ اقتصادی پس ماندگی تھی جو صدیوں سے عوام پر مسلط تھی، مگر اب حکومت کے چھن جانے سے چونکہ مستقبل تاریک نظر آتا تھا اس لیے صدیوں کی اقتصادی مار، زمانۂ حال کا دیا ہوا تازہ زخم لگتا تھا۔ اور اس سب پر مستزاد "اپنی تہذیب"، "اپنے تمدن" اور "اپنے علمی و ادبی سرمایہ" کے مٹ جانے کا غم اور ساتھ ہی اُس زبان کی ثانوی حیثیت اختیار کرنے کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا جو ان کی برتری کا سمبل تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہی سے انگریزوں نے یہاں کی مسلم آبادی کو اپنے خطرناک حریف کی حیثیت دے دی تھی۔ ہر آن اور ہر لمحہ اک نیا ستم ان کے لیے ایجاد ہوتا تھا۔ صرف ایک ہی مثال مرزا غالب کے خط بنام علاء الدین احمد خان کا یہ ٹکڑا اس پوری کیفیت کی عکاسی کے لیے کافی ہے جو اُن دنوں اہالیانِ دہلی پر طاری تھی۔ وہ لکھتے ہیں: "میرٹھ میں مصطفےٰ خان، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خان، بلّی ماران میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد، مردود و مطرود۔ محروم و مغموم۔ تم آتے ہو چلے آؤ۔ ۔۔۔ خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سُن جاؤ"۔ ان ہی دنوں کے ایک اور خط میں پھر لکھتے ہیں۔

"حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑھ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف پھاؤڑا چل رہا ہے"۔ یہاں "دہلی" استعارہ ہے پورے ہندوستان کی اُکھاڑ پچھاڑ کا۔ اور "گلی کوچے" اُس تہذیب و تمدن کا استعارہ ہے جس پر انگریزی رسوم و رواج کا پھاؤڑا چل رہا تھا۔ اور اس آسیب زدہ ماحول میں اُس آبادی کو اپنی جبروت اور قہرمانیوں کا

حریف بنایا جا رہا تھا جو پہلے ہی بے بسی، بیچارگی اور شکست و ریخت کے احساسات کا شکار تھی۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں "مفتوح" اور "فاتح" کے درمیان بد اعتمادی اور شکوک و شبہات کے علاوہ اور کیا جنم لے سکتا تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دو تین برسوں تک یہ کیفیت رہی کہ نہ انگریز مسلمانوں پر اعتماد کرتا تھا اور نہ عام مسلمان ان کی شکلیں دیکھنا گوارا کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اب جب کہ ہندوستان پر انگریزوں کا غلبہ اور تسلط ایک ٹھوس حقیقت بن چکا تھا اور مستقبل قریب میں کسی ایسے معجزے کی توقع بھی نہیں تھی کہ یہ بساط اُلٹ جائے گی، تو حالات کا رُخ بھانپنے والوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو جانا لازمی تھا کہ کسی نہ کسی طرح ماحول کی تلخی کو کم کیا جائے اور کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھنا سیکھیں اور ان کے درمیان مغائرت اور تناتنی کی یہ فضا ختم ہو۔ دوسری طرف یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی اکثریت والی ہندو آبادی نے کچھ دنوں تو انگریزوں سے نفرت اور اُن کی مخالفت میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ لیکن پھر یہ زور اُن کی صفوں میں ٹوٹنے لگا۔ وجہ صرف اور محض یہ نہیں تھی کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ نہ دے کر خود انگریزوں سے مالی یا دوسری مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ بڑی وجہ یہ تھی کہ راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۳۳ء) کی روشن خیالی کی تحریک اور اُن کے قایم کردہ بنارس کالج (۱۷۹۱ء) نے پہلے ہی انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان رابطے کی ایسی راہ ہموار کر دی تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں افہام و تفہیم اور اعتماد کی فضا ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان جلد ہی قایم ہو گئی۔

بہر حال جب آہستہ آہستہ ابتدائی برسوں کی جبر و سزا کی گرد بیٹھی تو خود ان "غیر ملکی" حکمرانوں کی صفوں میں بھی سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کے اندر بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں سے بالخصوص اور عام رعایا سے بالعموم محاذ آرائی کی فضا خود اُن کے اپنے حق میں بھی نہیں ہے۔ شاید اب یہ اطمینان بھی انھیں ہو گیا تھا کہ اُن کا "خاص الخاص حریف" (مسلمان) نہ تعداد میں اُن کا مدمقابل تھا اور نہ اسباب نبرد آزمائی میں اُن کے جوڑ کا حریف۔ چنانچہ یہ جلد ہی محسوس کر لیا گیا کہ اس آبادی کو "رام کرنے" کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اہلِ مغرب اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ اہلِ مشرق کی دُکھتی رگ اُن کی تہذیبی ثقافتی اور علمی انا کی تسکین ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ آبادی اپنی سیاسی شکست کی وجہ سے باقی آبادی سے بھی اپنے آپ کو الگ تھلگ اور کچھ کٹا کٹا سا محسوس کر رہی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں سے ایسے نازک وقت میں کاٹ دینے کے عمل میں اُس متشدد مذہبی گروہ کا بڑا ہاتھ تھا جس نے جنگِ آزادی میں شکست خوردگی کے احساس کو زائل کرنے کی خاطر مذہبی شدت پسندی کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ماضی کی شان دار مسلم تاریخ اور اسلام کے قرن اول کے مجاہدوں کے کارناموں کی تشہیر سے شکست خوردہ قوم کے اندر حوصلہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ حضرات بھول گئے کہ جس ملک کی ستر پچھتر فی صد آبادی فاقہ کشی میں مبتلا ہو، اوپر سے نئے حکمران اُن پر ظلم و ستم کے شکنجے بھی کس رہے ہوں، وہاں جذبات بھڑکا کر محاذ آرائی پر آمادہ کر دینا کوئی بڑا کارنامہ نہیں البتہ ہوش اور تعمیر کی راہ پر لگا کر گرداب سے نکالنا اصل بات ہوتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان بھی تو ان ہی مطالبات اور خطوط پر ممکن ہوا جن کی اولین گونج ۱۸۵۷ء کے فوری بعد کے ماحول میں زبانِ بے زبانی سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ راہ جدید علوم کا حصول اور اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی راہ تھی۔

جس روشن خیال اور سائنسی ذہن رکھنے والے نابغۂ روزگار نے اس حکمت عملی کو سب سے پہلے سمجھا، اس کی تشریح اور تبلیغ میں دن رات ایک کر دیے، قوم کے کم نظر اور بے بصیرت "دوستوں" نے اُس کو کفر کے فتوؤں، جوتوں کے ہار اور ملامتوں سے نوازا۔

www.taemeernews.com

ان بزرگ کی بس اتنی خطا تھی کہ وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان (دوسرے مذاہب کے افراد کی طرح) مفاہمت کی وہ راہ نکالنا چاہتے تھے جس پر چل کر یہ لُٹی پِٹی قوم بھی وقت کے ساتھ ساتھ علمی اور اقتصادی میدانوں میں قدم جمائے تاکہ آنے والے دور میں وہ سیاسی جنگ ہمت اور قابلیت کے ساتھ لڑ سکے جو اس ملک کی آزادی کے لیے کسی نہ کسی دن لڑنی ہی تھی۔ سید احمد خان کے ملامت بازوں نے اُس دور میں اس طرزِ فکر کو "انگریز نوازی" سے تعبیر کیا' اور ان ملامت بازوں کی نسلیں آج بھی وہی ڈیڑھ سو برس پُرانی لکیروں کو پیٹ رہی ہیں رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" آج بھی دستیاب ہے۔ مفیدِ مطلب تشریح اور تعبیر کی بات اس دستاویز پر ظلم کے مترادف ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی تاریخ کے تناظر میں اس کو پڑھ کر سمجھنے والے اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں کہ انگریزوں کے منتقمانہ جذبات پر پانی کا پہلا چھینٹا یہی رسالہ تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ہوش مند افراد نے اس رسالے پر بحث و تمحیص کے دوران میں اس کے متن کے ایک ایک لفظ کی چھان پھٹک کی تھی اور وہ بھی مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مخاصمانہ فضا اور جذبات اور عاقبت نااندیش انگریز افسروں کے طرزِ عمل کا نوٹس لیے بغیر نہ رہ سکے۔

بے مصرف قوم پرستی کے جذباتی اُبال کے زیرِ اثر یہ فتوے لگانا کہ انگریزوں نے فلاں فلاں اشخاص کو اپنی مطلب برآری کی خاطر اعلیٰ عہدوں کی رشوت دے کر قوم سے غداری پر مامور کیا تھا' تاریخ کے عمل کو ایک خود غرضانہ تشریح اور تعبیر کا پابند کرنا ہے۔ برِصغیر میں مسلمان تاریخ سے کیا ہمیں اس قسم کی مثالیں نہیں ملتیں؟ دنیا کی ایسی کس فاتح قوم کی مثال دی جا سکتی ہے جس نے کسی ملک کو فتح کیا ہو' اور پھر اپنی تہذیب' اپنی ثقافت' اپنے مذہب اور مسلک سے دست بردار ہو کر اپنی زبان' تہذیب' ثقافت اور مذہب کو تج کر مفتوحہ ملک کے انہی عناصر اور عوامل کو اپنا لیا ہو؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تو ایک ایسا طرزِ عمل ہے جسے ہر فاتح اپنا حق سمجھتا ہے۔ اگر ہماری اپنی تاریخ کے حوالے سے انگریزوں کا یہ طرزِ عمل غلط اور ظالمانہ تھا تو پھر اسپین پر عرب اثرات اور خود ہندوستان پر مغل اثرات کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ بات اگر "مثبت" نتائج ہی کی کرنا ہو تو کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ انگریزوں کی طرزِ تعلیم نے وہ آزادیِ فکر و خیال بھی تو ہماری اُن نسلوں کو دی تھی جنھوں نے انگریز حکومت کی مخالفت اور جن کے جذبۂ مقاومت نے بالآخر اکثریتی مسلم آبادی کے علاقوں کو اُن کے تسلط سے آزاد کرا لیا۔ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ بعد میں خود انگریز حکمرانوں نے اس کا اعتراف کیا کہ آزادیِ فکر و عمل کا وہ ہتھیار جو انھوں نے اپنی کارروائیوں کے دفاع کے لیے ہندو' مسلم آبادی کو دیا تھا وہ اُن ہی کے خلاف اٹھایا گیا اور اس کا وار کامیاب بھی ثابت ہوا۔

بہرحال یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اپنے تسلط کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی آبادی کو رام کرنے اور اُن کو "وفادار رعایا" میں ڈھالنے کے لیے جہاں اور بہت سے اقدامات کیے' وہیں ۱۸۵۷ء کے بعد دس سال کے اندر اندر پورے ہندوستان میں سیکڑوں کی تعداد میں مذہبی' اصلاحی' تعلیمی اور ادبی انجمنوں کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ دوسری بڑی حقیقت یہ ہے کہ ان تمام اداروں اور انجمنوں کی تقریباً ۹۰ فی صد تعداد مسلمان اکثریت اور اردو بولنے والے علاقوں میں تھی۔ اس بات سے ہمیں حکومت اور مسلمان آبادی کے درمیان "پبلک ریلیشنگ" کرنے والے عوامل اور عناصر کی ضرورت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

'پبلک ریلیشنگ' بڑا نازک کام ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے کہ اگر ذرا سی چوک ہو جائے تو کیا دھرا آناً فاناً میں ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ برطانوی عمّالِ حکومت اس پہلو سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ خود کھلے بندوں ان اصلاحی اور ادبی انجمنوں کے قیام میں سامنے آ کر پوری اسکیم کو مشکوک نہیں بنا سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مرکزی اور صوبائی مشنری کے اُن افسروں کو اس کام سے

www.taemeernews.com

بالکل الگ تھلگ رکھا جو پالیسی بنانے کی بنا پر ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے کی نظر میں پہلے ہی شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لہٰذا یہ کام بڑے اور اہم شہروں، مثلاً لاہور۔ دہلی۔ کلکتہ۔ لکھنؤ۔ بنارس علی گڑھ۔ بریلی۔ پٹنہ۔ گیا۔ احمد آباد۔ الٰہ آباد وغیرہ کے کمشنروں اور اسسٹنٹ کمشنروں کو سونپا گیا جنھوں نے علم و ادب یا اصلاحِ معاشرہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات تک اپنے نہایت معتمد "منشیوں" یا معتبر شہریوں کے ذریعے اس اسکیم کی داغ بیل کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔ چونکہ ایسی انجمنوں کو بالراست سرکاری "سرپرستی" میں بھی رہنا تھا، تاکہ "مطلوبہ نتائج" حاصل ہو سکیں۔ اس لیے دو چار بہت بڑے یا اہم شہروں یعنی لاہور، دہلی، لکھنؤ، مرادآباد، الٰہ آباد میں تو ان انجمنوں کی سرپرستی انگریز افسران ہی کے ہاتھ میں رہی۔ البتہ جہاں یہ ممکن نہیں تھا وہاں کسی اعتبار والے مقامی رئیس یا کسی ہندوستانی ضلع افسر کے سپرد کردی گئی۔ ان انجمنوں کے جو حالات تھوڑے بہت دستیاب ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز مُربّی اپنے دائرۂ اختیار کی انجمن کی کسی نشست سے کبھی غیر حاضر نہیں رہتا تھا۔ خود بھی بعض موضوعات پر مضامین پڑھتا تھا اور دوسروں کی لکھی ہوئی تحریروں پر رائے زنی کرتا اور حسبِ منشا آیندہ کا پروگرام بھی طے کرتا تھا۔ ان انگریز افسران کو علم و ادب اور شعر و شاعری کی ان انجمنوں پر اتنا اختیار ہوتا تھا کہ اُن کی اجازت ہی سے لوگ ان انجمنوں کے رُکن بن سکتے تھے، یا حسبِ منشا کسی کی بھی رُکنیت معطل یا ختم کر دیتے تھے۔ کسی کو بھی انجمن کے عہدوں (مثلاً سیکریٹری ایڈیٹر یا خازن) سے برخاست یا معطل بھی کر سکتے تھے۔ انجمنِ پنجاب (لاہور) کے تذکرے میں یہ بات ڈاکٹر محمد باقر نے لکھی ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد اس انجمن کے ماہوار رسالے کے ابتدائی ایڈیٹر تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ڈاک کی بے قاعدگی پر ایک مراسلہ چھاپ دیا تھا۔ اس پر نہ صرف اُن کی جواب طلبی ہوئی، بلکہ ایڈیٹرشپ سے علحدگی بھی اختیار کرنا پڑی۔ گویا انتظامی طور پر ان انجمنوں کا ڈھانچہ ڈھکے چھپے طور پر سرکاری دفتروں جیسا ہی تھا۔ ان تمام پابندیوں اور قباحتوں کے باوجود یہ سلسلہ عوام میں اتنا مقبول اور انگریزوں کے نقطۂ نظر سے اتنا بھرپور اور کامیاب رہا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ برسوں کے اندر اندر پورے ملک میں شعر و ادب اور اصلاحِ معاشرہ کی انجمنوں کا جال بچھ گیا ــــ

مجلسِ مباحثہ، بنارس ۱۸۶۱ء گارساں دتاسی نے اس انجمن پر خاصی تفصیل سے لکھا ہے، مگر اُس کے نزدیک اس انجمن کی حیثیت محض ایک اصلاحِ معاشرہ کی انجمن کی رہی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی ہندوستان میں قایم ہونے والی یہ سب سے پہلی علمی انجمن بھی تھی۔ اس انجمن کو مہاراجہ بنارس اور مہاراجہ وزیانگرم کی سرپرستی حاصل تھی۔ دراصل مہاراجہ بنارس اس کے محرکِ اعلیٰ تھے۔ اس انجمن میں ممبرشپ کی کوئی قید نہیں تھی۔ چنانچہ ہندو، مسلمان اور انگریز اس کے ارکان میں شامل تھے۔ یہ مجلس اپنی ہفتہ وار نشستیں منعقد کرتی تھی۔ کوئی خاص پابندی نہ تھی کہ مضامین لکھ کر ہی پڑھے جائیں۔ چنانچہ مختلف مسائل پر جہاں لکھ کر مضامین پڑھے جاتے تھے وہیں زبانی تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ تقریر یا مقالے کے بعد اس پر کھُل کر تنقید اور بحث مباحثہ ہوتا تھا۔ یہ چونکہ ہندوستان کی سب سے پہلی انجمن تھی اس لیے اس کی تشکیل بھی بیرونِ ممالک کے علمی اور ادبی اداروں کی طرز پر ہوئی تھی۔ چنانچہ گارساں دتاسی کے مطابق " یہ مجلس، انسٹی ٹیوٹ آف فرانس کی طرح پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی تعلیم، عمرانی ترقی۔ فلسفہ و ادب، علوم و فنون اور قانون " کے شعبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ملک کی "اعلیٰ ترین" شخصیتوں اور انگریزوں کی خصوصی توجہ کی بنا پر یہ انجمن بڑی مستعدی کے ساتھ کام کرتی تھی۔ اس انجمن نے خواتین کی تعلیم کے لیے کئی مدرسے بھی قایم کیے تھے۔ اس انجمن کے پانچ شعبوں میں سے

www.taemeernews.com

تین یعنی عمرانی ترقی، فلسفہ اور علوم و فنون تو چونکہ بالراست عوام سے متعلق نہیں تھے اس لیے ان شعبوں میں جو کام ہوتا رہا وہ اپنی جگہ، البتہ اس انجمن کی ہندوستان گیر شہرت اس کی تعلیمی، ادبی اور اصلاحی کارکردگی کی بنا پر تھی۔ سرسید احمد خان بھی اس انجمن کی کارکردگی بالخصوص اس کے اصلاحی اور علمی کام کی بنا پر اس کو بڑی دلچسپی اور وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب اس کے بعد انجمن کلکتہ کا قیام عمل میں آیا تو وہ انجمن بنارس کی کارکردگی سے متاثر ہونے کی بنا پر انجمن کلکتہ میں علمی دلچسپی لینے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اہلِ بنارس نے اس انجمن کی پذیرائی کھلے دل سے نہ کی ہوتی تو برطانوی ہند میں اس قسم کے اداروں کے قیام میں شاید دو چار برس کی اور تاخیر ہو جاتی۔ اس انجمن کے قیام کا اثر یہ ہوا کہ اگلے ہی برس یعنی ۱۸۶۲ء میں کلکتہ اور شاہجہان پور میں ایسی انجمنیں قایم ہو گئیں۔

انجمن کلکتہ ۱۸۶۲ء

مجلسِ مباحثہ بنارس کے بعد کلکتہ اور شاہجہان پور کی انجمنوں کا قیام ایک ہی سال میں عمل میں آیا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۳ء کے خطبے میں لکھا ہے۔ "حال ہی میں کلکتہ میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ شام کے وقت علمی اور ادبی مجالس منعقد کرے تاکہ ہندوستانی اور یورپین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط بڑھا سکیں۔ اس میں دونوں کا نفع مد نظر ہے۔ ہندوستانی یورپین لوگوں کے میل جول سے بہت سی ایسی باتیں سیکھ سکتے ہیں جن سے وہ مطلق بے خبر ہیں۔ یورپین لوگ اگر ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول بڑھائیں تو اس سے انھیں ان کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور ہندوستانی زبان و ادب میں ذوق پیدا ہوگا۔"

گارساں دتاسی کی اس تحریر سے جہاں اس قسم کی دوسری انجمنوں کے قیام کا مقصد (یعنی یورپین اور ہندوستانیوں کا میل جول اور آپس میں افہام و تفہیم) کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستانی زبان و ادب" کی برصغیر میں یہ پہلی انجمن تھی۔ دتاسی نے اس انجمن کے اصل محرک یعنی پسِ پردہ شخصیت کا نام اس خطبے میں نہیں بتایا ہے اور عین ممکن ہے کہ اُس وقت کے ماحول میں اس نام کو کھل کر سامنے نہ لانے میں مصلحت سمجھی گئی ہو تاکہ غلط فہمی نہ پھیلے۔ لیکن اگلے برس (۱۸۶۵ء) کے خطبے میں بالواسطہ طور پر اس کی نشان دہی ہو گئی۔ "اس انجمن کی سرپرستی بنگال کے لیفٹننٹ گورنر نے قبول فرمائی ہے"۔ ایک اور "ہمدردِ خاص" کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ "سر چارلس ٹریویلین اس انجمن کے خاص ہمدرد تھے۔ جب موصوف کلکتہ سے واپس ولایت جارہے تھے تو اس انجمن کے ارکان کی طرف سے ایک الوداعی ایڈریس پیش کیا گیا" اور ان کی روانگی کو "ایک اعلیٰ معاون" کی کمی سے تعبیر کیا گیا۔

کلکتہ کی یہ ادبی انجمن چونکہ اپنی نوعیت کی پہلی انجمن تھی اس لیے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں دتاسی نے اس کی کارکردگی پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس انجمن میں بقول دتاسی سرسید احمد خان نے خاص دلچسپی لی۔ دی تاسی کا بیان ہے کہ "موصوف (یعنی سید احمد خان) کے جوش اور خلوص کی بدولت انجمن ترقی کر رہی ہے۔ اس کام میں مولوی عبداللطیف اور بعض دوسرے انگریز ان کی مدد کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس انجمن کی بدولت ان مسلمانوں کو جو تاجِ برطانیہ کے سائے میں زندگی بسر کر رہے ہیں یہ ممکن ہوگا کہ وہ اس عظیم الشان تعلیمی تحریک میں شرکت کر سکیں گے جو اس وقت بنگال میں اپنے اثرات دکھا رہی ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ قومی ادبیات کو فروغ دیا جائے۔ انجمن نے چھ ہزار کے انعامات اُن (لوگوں) کے لیے مقرر کیے ہیں جو اُردو میں مندرجۂ ذیل موضوعات پر مضامین لکھیں گے:-

www.taemeernews.com

(۱) حیاتِ اورنگ زیب (۲) ہندی مسلمان (۳) انجمن اور اس کے کل پرزے ۔ (۴) مطبع کی تاریخ اور تمدن پر اس کے اثرات ۔

" ۶ / اگست (۱۸۶۵ء) کو اس انجمن کا ایک جلسہ علی گڑھ میں ہوا۔ اس جلسے میں یہ طے پایا کہ انجمن کی اپنی ایک عمارت ہونی چاہیے اور کتب خانہ کے لیے کتابیں فراہم کرنی چاہئیں " اس کے بعد سے دی تاسی کے آیندہ خطبات میں اس انجمن کی کارکردگی سے متعلق اطلاعات خال خال ملتی ہیں اور ۱۸۶۶ء کے بعد کے خطبات میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ یا تو یہ انجمن آگے چل کر جلد ہی ختم ہو گئی ۔ یا پھر اس کا مستقر علی گڑھ منتقل ہو گیا اور وہاں جاکر یہ علی گڑھ کی ادبی انجمن کا نام پا گئی ۔

بہرحال کلکتہ کی ادبی انجمن کے قیام کے بعد یہ راستہ دوسرے شہروں کے لیے بھی کھل گیا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء ہی کے خطبے میں دی تاسی نے مدراس میں ایک اور انجمن کے قیام کی اطلاع دی۔ مگر اس انجمن پر چونکہ تفصیل سے آگے بھی نہیں لکھا گیا اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ اردو بولنے اور لکھنے والوں کی انجمن تھی یا ہندی یا کسی اور زبان کی۔ ویسے بھی اس انجمن کا مقصد محض کلکتہ والی انجمن کی تقلید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ خالص ادبی نہیں تھی۔ بہرحال دتاسی لکھتے ہیں " ہندوؤں نے بھی اپنی ایک انجمن مدراس میں قایم کی ہے۔ اس انجمن کے ارکان پر مسیحی اثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ اس انجمن کا نام "ستھیا وید سماجم" ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کو مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی ترقی کی جانب توجہ دلائی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے عام جلسوں میں تقریریں کرائی جائیں۔ مباحثے منعقد ہوں اور مذہبی مسائل پر رسالے شایع کیے جائیں " اگرچہ اس دور میں اصلاحی اور معاشرتی انجمنوں اور خالص ادبی اداروں میں واضح حدبندی نہیں تھی اور ادبی انجمنوں میں اصلاح معاشرے کا کام اور اصلاحی انجمنوں میں شعر و ادب کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا مگر خالص ادبی نقطۂ نظر سے چونکہ اس انجمن کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی اس لیے اس پر قیاس آرائی بے محل ہوگی ۔

انجمن اصلاح شاہجہان پور ۱۸۶۲ء

کلکتہ کی ادبی انجمن کے ساتھ ہی اس انجمن کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے ۱۸۶۳ء کے خطبے میں لکھا ہے " شاہجہان پور میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں " ابتداً یہ انجمن خالص اصلاحی مقاصد کے تحت سامنے آئی تھی ۔ بالخصوص پردہ نشین خواتین کی اصلاح کے لیے تاکہ انھیں ایسی رسوم کو ترک کرنے پر آمادہ کیا جا سکے جو محض توہم پرستی کی بنا پر وقت اور دولت کے زیاں کا سبب تھیں۔ اس کام کو بالخصوص قاضی سرفراز علی صاحب کے سپرد کیا گیا تھا، گویا وہ اس کے پہلے سکریٹری تھے۔ اس انجمن نے اپنی مستعدانہ کارکردگی کی بنا پر بہت جلد اپنا ایک مؤثر دائرہ کار متعین کر لیا چنانچہ بقول دی تاسی " اس انجمن کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے علی گڑھ، لاہور، اٹاوہ، بنارس، بدایوں، مرادآباد اور الٰہ آباد میں انجمنیں قایم ہوئیں " اس اعتبار سے شمالی ہند میں قایم ہونے والی اس قسم کی انجمنوں میں انجمن شاہجہان پور کو اوّلیت اور قدامت کا مرتبہ حاصل ہے ۔

رفتہ رفتہ اس انجمن نے اصلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی کام کا بھی آغاز کیا۔ دی تاسی نے ۱۸۶۹ء میں یعنی اس کے قیام کے ۶ سال بعد اس انجمن کی علمی اور ادبی خدمات کا بڑے اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ ایک اقتباس تو اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ ایک جگہ وہ پھر لکھتا ہے " اس (انجمن) کے پیشِ نظر علمی اور ادبی کام ہے۔ ارکان کی مستقل مزاجی کی بدولت یہ انجمن ترقی کر رہی ہے۔ اس وقت جلال آباد اور دوسری تحصیلوں میں اس کی پانچ شاخیں موجود ہیں " (ان پانچ انجمنوں کا کہیں دوسری جگہ بھی تذکرہ نہیں ملتا)

www.taemeernews.com

انجمن نے اپنا ایک ماہوار رسالہ "رفاہِ خلائق" بھی جاری کیا تھا جس میں انجمن کی کارکردگی اور علمی اصلاحی کام کی تفاصیل درج کی جاتی تھیں جن کی ایک جھلک ملاحظہ ہو"... یہ انجمن چودھریوں یعنی طبقہ وار تنظیموں کے اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ تعلقات رکھتی ہے۔ اور متعلقہ مسائل ان کے گوش گذار کرتی رہتی ہے، اور انھیں اپنا ہم خیال بناکر ضروری اصلاحات رائج کراتی ہے... انجمن زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ حتیٰ کہ اُردو شاعری کی بھی جس میں اس کی دانست میں نیم عشق و محبت اور نیم تصوف والے خیالات حد سے زیادہ ہیں۔ انجمن کے نزدیک ہندی زبان کی ترقی ضروری ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ سے زیادہ رائج کیے جائیں۔" (دتاسی خطبہ ۱۸۶۹ء)

انجمن آگرہ — ۱۸۶۲ء

اس انجمن کا تذکرہ گارساں دتاسی کے یہاں بھی ملتا ہے مگر برائے نام "ایسی ہی ایک انجمن آگرے میں بھی بنی ہے" اس کا پورا نام بھی نہیں دیا ہے۔ اس انجمن کا اصلی نام "انجمنِ حق آگرہ" تھا۔ سالِ قیام کے اعتبار سے یہ انجمن بھی "اولین" میں سے ہے۔

اس انجمن کے کرتا دھرتا پنڈت نبی دھر تھے۔ یہ وہی نبی دھر ہیں جو آگرے میں غالب کے ہم سبق تھے، بے حد چہیتے دوست بھی اور اُن کے سب سے قریبی پڑوسی بھی "نبی دھر آگرے کے نارمل اسکول میں مدرس تھے۔ آپ چھوٹے بڑے پچاس رسالوں کے مصنف تھے" (مولانا امداد صابری) پنڈت جی ایک پندرہ روزہ اخبار "آبِ حیات" بھی نکالتے تھے جس میں اُردو اور ہندی زبانوں کے مضامین ہر اشاعت میں شایع ہوتے تھے۔ یہی اخبار "انجمنِ حق" کا آرگن بھی تھا۔ اس انجمن کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ عوام الناس میں مذہبی اور معاشرتی اصلاح کرے۔ اس انجمن کا طریقۂ کار بھی مباحثہ اور تحریری مضامین پر بحث و تنقید تھا۔ یہ مضامین "آبِ حیات" کے علاوہ اخبار حیدری و اخبار حسینی (آگرہ) پندرہ روزہ "خیر خواہِ خلق" ۔ سکندرہ (آگرہ) اور ہفتہ وار اردو دہلی گزٹ۔ (آگرہ) میں بھی نقل کیے جاتے تھے۔ اس آخری الذکر اخبار کے مالک (کوئی عیسائی یا انگریز) ولیم ڈیگو صاحب تھے اور انجمن میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

انجمن پنجاب — ۱۸۶۴ء

اس انجمن کا اصلی اور پورا نام "انجمنِ اشاعتِ مطالبِ مفیدہ۔ پنجاب" تھا لیکن بعد کو سہولت کی خاطر صرف "انجمن پنجاب"[1] رہ گیا اور اب اسی نام سے معروف ہے۔ اس انجمن کی داغ بیل گورنمنٹ کالج لاہور کے اُس زمانے کے پرنسپل ڈاکٹر لائیٹنر کے ہاتھوں پڑی۔ لاہور کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور گورنر پنجاب کے پرسنل سکریٹری پنڈت من پھول اس کے سکریٹری اور منتظم چنے گئے تھے اور کپتان فلر اس انجمن کے سرپرست تھے۔ اس انجمن کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے تمام عہدے دار سرکاری افسران تھے۔ مثلاً لائیٹنر اس کے صدر، منشی ہرسکھ رائے (مدیر اخبار "کوہ نور" لاہور) اس کے سکریٹری شعبۂ فارسی، بابو نوین چندر، سکریٹری شعبۂ انگریزی تھے۔ پنڈت من پھول کی حیثیت ایک طرح سے جنرل سکریٹری اور منتظم اعلیٰ کی تھی۔ شعبۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائیڈ بھی بعد کو اس انجمن کے مربی خاص بن گئے تھے۔
انجمن نے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار "انجمن پنجاب" بھی ۱۸۶۵ء میں جاری کیا تھا۔ اس اخبار کے نگران اور سکریٹری سید

---

[1] ڈاکٹر صفیہ بانو نے "انجمن پنجاب — تاریخ اور خدمات" پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شایع ہو چکا ہے۔ (صبا)

www.taemeernews.com

قمرالدین آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ادارت کے فرائض پیرزادہ محمد حسین (اُردو سیکشن) اور ایچ۔ آئی۔ میکلوڈ فیلو پنجاب یونیورسٹی (انگریزی سیکشن) کے سپرد تھی۔ انگریز حکام کے نزدیک اس انجمن کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس کی میٹنگوں میں صوبے کے لفٹیننٹ گورنر سے لے کر کمشنر، اکسٹرا کمشنر اور بڑے بڑے انگریز افسران شرکت کرتے رہتے تھے۔ یہ افسران عملی طور پر بھی اس انجمن کی ہر ممکنہ اعانت میں بڑے سرگرم تھے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے نہ صرف اپنی اپنی جیب سے زرِ نقد دیتے تھے بلکہ لائبریری کے لیے کتابیں بھی فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ بہت تھوڑے ہی دنوں میں اس انجمن کا کتب خانہ بڑے پیمانے پر قایم ہوگیا۔ دی تاسی کی اطلاع کے مطابق ۱۸۷۵ء ہی میں اس کتب خانے میں ایک ہزار چار سو تیس (۱۴۳۰) کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس لائبریری میں انگریزی، فارسی اور اُردو کے ۲۶ اخبارات آتے تھے۔

انجمن نے اپنے کام کا آغاز اصلاحِ معاشرہ اور تعلیم پھیلانے کے کاموں سے کیا۔ عملی میدان میں اس انجمن کے پلیٹ فارم سے غلط اور نقصان دہ رسوم و رواج کو ختم کرنے کی تدبیریں کی گئیں۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں امدادی ادارے اور اسکولوں کا قیام سرفہرست تھا۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف حکومت کو باقاعدہ لائحہ عمل پیش کیا گیا بلکہ مدرسوں اور اسکولوں کے قیام کے لیے چندہ بھی اکٹھا کرکے فراہم کیا گیا۔ تمام ملکی زبانوں یعنی اُردو، ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے نصاب بھی تیار کیے گئے اور انجمن نے امتحانات کے انتظامات کی ذمہ داری کو بھی اپنے دائرۂ کار میں شامل کیا۔ سماجی برائیوں، فضول اور بے جا اصراف کے ذیل میں آنے والے رسوم و رواج کو ترک کرانے کے لیے نہ صرف انجمن میں بحث اور مباحثے ہوتے تھے بلکہ عملی اقدامات کی تجاویز بھی مرتب کی گئیں اور اُن کی تشہیر بھی کی گئی۔

اس انجمن کے پلیٹ فارم سے باقاعدہ ادبی کام کا آغاز ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ طریقۂ کار یہ تھا کہ دوسرے علمی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کے علاوہ ادب اور شاعری اور اُردو زبان کی تاریخ پر لیکچروں کے انتظام کے ساتھ ساتھ مضامین پڑھوا کر اُن پر تنقید و تبصرے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس طریقۂ کار کی بدولت پرانے ادب کو سمجھنے اور نئے طرز کے ادب و شعر کی تخلیق کی راہیں ہموار ہونا شروع ہوئیں۔ ان لیکچرز میں سب سے زیادہ حصہ مولانا محمد حسین آزاد کا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ہونے لگا کہ ادبی نشستوں میں غزل کی جگہ کسی موضوع پر نظم بھی پڑھی جانے لگی۔ اس کا آغاز بھی مولانا محمد حسین آزاد ہی نے کیا تھا۔

علامہ دتاتریہ کیفی نے اپنے مضمون شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم میں لکھا ہے "اس نئی شاعری کے لیے مولانا آزاد نے ملک کو پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ انجمن کے اکثر جلسوں میں وہ اُردو ادب اور نظم کی اکثر شقوں پر مبصرانہ اور نقادانہ لکچر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انجمن کے جلسے میں جو ماہِ اگست ۱۸۶۷ء میں منعقد ہوا تھا آپ نے ایک بسیط مضمون "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" پر پڑھا۔

۱۸۷۴ء کا سال اس انجمن کا اہم ترین اور ملک کی ادبی اور شعری فضا کو بدلنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال اپریل میں انجمن کی ایک نشست میں یہ بات طے پائی کہ جلد ہی انجمن کے تحت ایک مجلسِ مناظمہ منعقد کرائی جائے۔ اس نشست کی صدارت چیف کورٹ کے جج مسٹر جسٹس بولنوئے کی تھی اور اعلیٰ انگریز عہدے داران کے علاوہ نواب عبدالمجید خاں اور فقیر سید قمرالدین بھی شریک تھے۔ اس نشست میں بھی مولانا آزاد نے "ایک زبردست تقریر" صنفِ نظم اور جدید ادبی رجحانات پر کی تھی۔ اپریل ۱۸۷۴ء کی قرارداد کے بموجب ۳۰ رجون ۱۸۷۴ء کو "نئی شاعری کا بنیادی مناظمہ" تھا۔ "اس مناظمے کے لیے موضوع زمستان

www.taemeernews.com

مقرر تھا۔ جن شعرا نے نظمیں پڑھی تھیں وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

" (۱) شاہ الزحسین ہما (۲) مولوی مرزا اشرف بیگ خان، رئیس دہلی (۳) منشی الٰہی بخش رفیق (۴) حضرت آزاد۔
(۵) مولوی محمد مقرب علی رئیس جگراؤں (۶) مولوی امتو جان ولی دہلوی شاگردِ غالب (۷) مولوی قادر بخش (۸) مولوی عطاء اللہ
(۹) مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری "

انجمن پنجاب کے اس مناظمے کی کامیابی کی گونج پورے ہندوستان میں سنی گئی۔ علامہ کیفی نے لارنس گزٹ کے حوالے سے بتایا ہے کہ اس تقلید میں میرٹھ میں انجمنِ مناظمہ قایم ہوئی لیکن تپ لرزہ کی وبا پھوٹ پڑنے کے سبب صرف دو ہی جلسے ہو سکے تھے۔ ایک مناظمہ میں سید محمد مرتضیٰ نے (جو بیان اور یزدانی تخلص کرتے تھے) "امید" کے موضوع پر ایک نظم پڑھی تھی۔ اسی طرح دہلی سوسائٹی کی نشست میں غالب کے شاگرد مولوی سیف الحق ادیب دہلوی نے "برسات" کے موضوع پر ایک نظم پڑھی تھی۔

مختصراً یہ کہ انجمن پنجاب کی ڈالی ہوئی طرزِ مناظمہ نے تھوڑے ہی عرصے میں پورے ملک کے طول و عرض میں ادب و شاعری کے میدان میں انقلاب آفریں فضا قایم کر دی ۔

دہلی لٹریری سوسائٹی ۱۸۶۴ء

۱۸۶۴ء میں مسٹر گولڈ اسٹریم لاہور سے دہلی کی عدالتِ خفیفہ میں جج کی حیثیت سے تبادلہ ہو کر گئے۔ مسٹر گولڈ اسٹریم انجمن پنجاب کے رکن تھے اور یہاں کی کارکردگی اور اس کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء کے وسط میں انھوں نے اس سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس انجمن کے مقاصد بھی لاہور کی انجمن کی طرح یہی قرار پائے کہ ہندوستانیوں کی عام فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی ترقی کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ ان دنوں دہلی سے ایک سرکاری اخبار نکلتا تھا جس کا نام ہی "سرکاری اخبار" تھا۔ اس کی یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں "دہلی لٹریری سوسائٹی" کی کامیابی اور اس میں دہلی کے "بیشتر امرا" کی "خاص دلچسپی" کی خبریں بھی چھپی تھیں اور بطور اداریہ اس کے ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ " راجاؤں، مہاراجوں، امراء اور سرکاری اعلیٰ عہدے داروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل میں حتی الوسع کوشاں ہوں تاکہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے چہرہ پر کی نقابِ جہل ہٹائی جا سکے اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ علم کی روشنی سے منور ہو سکیں "

دہلی لٹریری سوسائٹی کے اولین سکریٹری ماسٹر پیارے لال آشوب تھے، لیکن وہ صرف چند ہی ماہ اس عہدے پر رہے اس لیے کہ انھیں پٹیالہ میں ناظم کے عہدے پر متعین کر دیا گیا۔ بعد کو اس جگہ پر منشی تارا چند کا تقرر کیا گیا۔ منشی تارا چند کی سکریٹری شپ نے اس انجمن کو بہت جلد اعلیٰ درجے کی لٹریری سوسائٹی کا درجہ عطا کر دیا۔ اس انجمن کا ایک ماہوار رسالہ بھی جلد ہی جاری ہو گیا جس میں انجمن کی روداد اور اس میں پڑھے گئے مقالات کا خلاصہ اور بعض اہم مکمل مضامین شایع ہوتے تھے۔

انجمن پنجاب نے جب موضوع مقرر کر کے مناظمے شروع کیے تو دہلی لٹریری سوسائٹی نے بھی اس طرزِ عمل کو اپنایا۔ چنانچہ اس انجمن نے بھی ایک مناظمہ منعقد کرایا۔ موضوع "برسات" تھا۔ بقولِ مولانا امداد صابری اور علامہ دتاتریہ کیفی اس مناظمہ میں غالب کے ایک شاگرد سیف الحق ادیب دہلوی نے بھی نظم پڑھی تھی۔ ادیب دہلوی خود بھی دہلی سوسائٹی کے ممبر تھے۔

دہلی سوسائٹی نے اپنا ایک رسالہ بھی نکالا تھا جس کا پہلا پرچہ ۱۸۶۶ء میں شایع ہوا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب کے بعد منشی تارا چند۔ اُن کے بعد منشی ذکا اللہ دہلوی سوسائٹی کے

www.taemeernews.com

سکریٹری اور "رسالہ دہلی سوسائٹی" کے ایڈیٹر بنے۔ رسالے میں انجمن کی رودادیں اور ایسے منتخب مضامین شایع ہوتے تھے جو انجمن کی میٹنگوں میں پڑھے جاتے تھے۔ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ انجمن انجمن پنجاب کے ہم پلہ سمجھی جاتی تھی۔ اس سوسائٹی کی میٹنگوں میں شرکت کرنے، مضامین پڑھنے اور شعر و شاعری میں حصہ لینے والوں میں مرزا غالبؔ، مولانا الطاف حسین حالی، ماسٹر رام چندر، منشی ذکا اللہ، حکیم غلام رضا خاں صاحب دہلوی، مولوی سیف الحق ادیب دہلوی (شاگرد غالب) مولوی اُلفت حسین صاحب مدرس مدرسہ عربی دہلی، میر قاسم علی آنریری مجسٹریٹ دہلی، منشی سدا سکھ، پادری کرونٹ، کرنل ینگ کمشنر دہلی وغیرہ جیسی اہم ہستیاں شامل تھیں۔

۱۸۶۵ء کے دوران ہی لاہور کی دیسی اکادمی (انجمن اشاعت علوم) معرض وجود میں آئی۔ اس کے بانی میجر فلر، ناظم تعلیمات صوبۂ پنجاب تھے۔ یہ صاحب "انجمن پنجاب" کے مؤسسین میں بھی شامل تھے۔ مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ "انجمن پنجاب" اپنے وسیع دائرہ کار کے سبب شاید میجر صاحب کی توقعات پر پوری نہیں اُتر رہی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے ایک اور انجمن کی داغ بیل ڈالنا ضروری سمجھی۔ اس انجمن کی کارکردگی کے بارے میں دتاسی نے لکھا ہے "میجر فلر، ناظم تعلیمات پنجاب نے انجمن کی توجہ خاص کر ہندوستانی ادب کی تخلیق و توسیع کی طرف مبذول کرائی ہے۔ موصوف اس کو ہندوستان کے لیے اس زمانے کی سب سے بڑی ضرورت تصور کرتے ہیں۔" دی تاسی کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انجمن پنجاب کے محرکین میں میجر فلر ہی سب سے زیادہ اہمیت ادب کو دیتے تھے۔ چنانچہ اس خالص ادبی انجمن کی ضرورت انھیں محسوس ہوئی۔

"ہندوستانی ادب" کی ترقی کے بھی ایک خاص معنی میجر صاحب کے ذہن میں تھے۔ یعنی یہ کہ وہ بالکل انگریزی طرز پر ہندوستانی ادب کی تخلیق اور ترقی چاہتے تھے۔ گارساں دتاسی نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے لکھا تھا "مجھے اس انجمن کے رسالے کا تیسرا نمبر موصول ہوا ہے۔ جس میں ۱۸۶۵ء کے آخری مہینوں کی کارروائیاں درج ہیں — یہ بات قابل افسوس ہوگی اگر ہندوستانی ادب کو یورپی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ یورپین اثر کو ہندوستانی اس سلیقے کے ساتھ قبول کریں گے کہ اس کے مخصوص خط و خال قایم رہیں جو لطف سے خالی نہیں۔" اس انجمن کے دوسرے عہدے داروں اور انجمن کے جاری کردہ رسالے کے نام کا تذکرہ سوائے دتاسی کے اور کہیں نہیں ملا۔ اپنے طرز کارکردگی کی بنا پر یہ انجمن مزید تحقیق کے لائق ہے۔

روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی ۱۸۶۵ء

اسی سال (یعنی ۱۸۶۵ء میں) ایک اور اہم انجمن "روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی" بھی معرض وجود میں آئی۔ صدر مقام اس کا بریلی میں رکھا گیا۔ بقول دتاسی "اسی قسم (یعنی ادبی اور علمی) کی ایک انجمن روہیل کھنڈ کے علاقے کے لیے بریلی میں قایم ہوئی ہے۔ میرٹھ کے "اخبار عالم" میں اسی انجمن کے حالات چھپتے رہتے ہیں۔ اس انجمن کا اصلی مقصد بھی علوم جدیدہ کو ہندوستانیوں میں رواج دینا اور عام دلچسپی کی کتابیں شایع کرنا ہے۔" "روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی" کے متعلق پروفیسر ایوب قادری نے نواب نیاز احمد خان ہوش کی "تاریخ روہیل کھنڈ" سے حوالہ دیا ہے۔ "بہ ماہ مئی ۱۸۶۵ء حسب منشا کمشنر و ڈائرکٹر شمالی و مغربی کے محکمہ لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بہ اہتمام بابو کالی چرن و لچھمی نرائن بریلی میں جاری ہوا۔" کلکٹر بریلی جان انگلش اس کے پس پردہ محرک تھے۔ اُنھیں نے اپنے زیر انتظام اس انجمن کا ایک کتب خانہ بھی قایم کیا۔ بعد میں اس انجمن کا اپنا پریس بھی قایم ہو گیا تھا۔

اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ انجمن سب سے زیادہ فعال رہی حالانکہ یہ ہندوستان کے دور افتادہ علاقے میں واقع تھی اس کے ماہانہ جلسے پابندی سے ہوتے تھے۔

www.taemeernews.com

اس انجمن کی شروع ہی سے کوشش رہی کہ لوگوں میں علمی اور ادبی مذاق کی آبیاری کی جائے، چنانچہ اس کے پروگرام میں بہت زور اس امر پر رہا کہ جدید علوم کی کتابیں زیادہ سے زیادہ مقامی لوگوں ہی سے لکھوائی جائیں۔ علاوہ ازیں انجمن نے مغربی علوم و فنون کی کتابیں بھی اُردو (ہندوستانی) میں ترجمہ کرائیں۔ تخلیق ہو یا ترجمہ، انجمن دونوں صورتوں میں کام کرنے والے کو معقول معاوضہ ادا کرتی تھی۔ انجمن خود ہی ان کتابوں کی اشاعت و طباعت کا انتظام بھی کرتی تھی۔ ہوش کی "تاریخ روہیل کھنڈ" انجمن نے اپنے ہی مطبع میں ۱۸۶۶ء میں چھاپی تھی۔ اسی طرح سے "تاریخ بدایوں" مصنفہ رائے بختاور سنگھ (سب جج بدایوں) بھی اسی سوسائٹی نے ۱۸۶۸ء میں شایع کی تھی۔

بریلی کی اس انجمن کے قیام سے پورے علاقہ روہیل کھنڈ میں بڑے دوررس اثرات پڑے۔ نہ صرف یہ کہ علمی اور ادبی فضا میں گہما گہمی پیدا ہوئی بلکہ تعلیمی میدان میں بھی تیزی سے ترقی ہونے لگی پھر اسی سوسائٹی کی کارکردگی سے متاثر ہو کر "روہیل کھنڈ کے دوسرے مقامات شاہجہاں پور، مراد آباد۔ بدایوں اور آنولہ میں بھی علمی اور اصلاحی سوسائٹیاں قایم ہونے لگیں" مثلاً شاہجہاں پور لٹریری انسٹی ٹیوٹ۔ انجمن مراد آباد۔ انجمن علمی بدایوں۔ اور انجمن آنولہ (ضلع بریلی) جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ابتداً یہ سب سوسائٹیاں اصلاحی اقدامات کے لیے قایم ہوئی تھیں۔ لیکن بعد کو سب ہی نے علمی اور ادبی مشاغل کو بھی اپنے دائرہ کار میں حسب تقاضہ ماحول شامل کر لیا۔ ان میں سے دو ایک سوسائٹیوں کا قدرے تفصیلی حال بعد کو بیان کیا جائے گا کیونکہ سب ہی ۱۸۶۸ء میں قایم ہوئی تھیں ——

۱۸۶۶ء میں۔ دہلی سوسائٹی کے ساتھ ہی انجمن سیالکوٹ اور انجمن حصار بھی قایم ہوئی تھیں —— لیکن ان کی تفصیلات اب کہیں دستیاب نہیں۔ ان علاقوں میں چونکہ پریس کا رواج اس دور میں نہیں تھا اس لیے کوئی اخبار بھی یہاں سے نہیں نکلتا تھا۔ البتہ مولانا امداد صابری کی "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم میں یکم اپریل ۱۸۶۳ء سے پہلے ہفتہ وار اخبار "رفاہِ عام" کی اطلاع ملتی ہے۔ اس سال یہاں پہلا مطبع "رفاہِ عام" بھی قایم ہوا تھا۔ یہ بہرحال بہت بعد کی بات ہے اور اس سبب سے اس انجمن کی کارکردگی کا ذکر دتاسی بھی نہیں کر سکا۔ حصار کی انجمن کا معاملہ بھی ان ہی وجوہ کی بنا پر منظرِ عام پر نہیں آ سکا ——

انجمن عرب سرائے ۱۸۶۶ء

اسی سال کی ایک بہت اہم سوسائٹی "انجمن عرب سرائے" ہے۔ عرب سرائے آج کل دہلی کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اُسی کے متصل ایک اور قصبہ شیخ سرائے بھی ہے۔ جن دنوں دہلی صوبۂ پنجاب میں شامل تھا یہ دونوں دہلی کے ایسے دور اُفتادہ محلّے تھے جیسے آج کل پُرانی (دراصل کراچی کے محلّے شمالی ناظم آباد، منصورہ، لیاقت آباد وغیرہ ہیں) جب دہلی کو پنجاب سے علٰحدہ کر کے صوبے کی حیثیت دی گئی تو رفتہ رفتہ یہ پُرانے محلّے علٰحدہ مقامات قرار دیے گئے۔ بہرحال دہلی سوسائٹی کے تتبع اور تقلید میں عرب سرائے میں بھی ویسی ہی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ گارساں دتاسی لکھتا ہے۔ "یہ چھوٹے مقام ہی کی سہی، اور چھوٹی ہی سہی، لیکن دوسری بہت سی مشہور تر انجمنوں سے کسی طرح کم اہم نہیں، بلکہ برابر کی حریف ہے"۔ (خطبہ ۱۸۶۶ء)

دہلی سوسائٹی کی طرح یہ انجمن بھی اپنا ایک ماہوار رسالہ نکالتی تھی۔ یہ رسالہ دہلی سوسائٹی کے رسالے کے مقابلے میں زیادہ پابندی اور باقاعدگی سے نکلتا تھا۔ انجمن کے سیکریٹری اور انجمن کے رسالہ کے ایڈیٹر لالہ فقیر چند تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے شرفائے دہلی میں ہوتا تھا اور صاحبانِ علم و ادب کے حلقوں میں لالہ فقیر چند قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کی

www.taemeernews.com

ادارت میں نکلنے والا یہ رسالہ "اپنی آزادیٔ رائے اور ملک کی بہی خواہی کے لیے" خاص شہرت رکھتا تھا۔

انجمن عرب سرائے نے کئی ایک علمی اور ادبی کتابوں کا ترجمہ بھی شایع کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ انجمن شروع ہی سے ادب میں نئے خیالات اور علم کی نئی سمتوں کی تلاش کو اہمیت دیتی تھی۔ چنانچہ اس کے ماہوار رسالے میں "اردو شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون لالہ فقیر چند نے لکھا تھا، جس میں اُس وقت تک کی جانے والی روایتی شاعری پر تنقید کی تھی۔ اس طرح سے ہندوستان میں فارسی کی تقلید میں مروج پیچیدہ عبارت، خطوط میں لمبے لمبے القاب و آداب اور مدحیہ جملوں کے انبار، انگریزی الفاظ کے غیر ضروری استعمال اور نو ساختہ الفاظ کے استعمال کے خلاف بھی علاحدہ علاحدہ مضامین لکھے۔ ان ہی اسباب کی بنا پر دتاسی نے اس انجمن کی اہمیت اور افادیت پر اب تک کی قایم ہونے والی بڑی بڑی انجمنوں سے زیادہ توجہ سے لکھا ہے۔

۱۸۶۸ء میں ان علمی اور ادبی انجمنوں کے قیام کی رفتار بہت تیز رہی چنانچہ اس سال انجمن تہذیب لکھنؤ، انجمن مرادآباد، انجمن تہذیب الہ آباد، انجمن تہذیب کان پور، علی گڑھ انجمن، انجمن علمی بدایوں، اٹاوہ انجمن وغیرہ قایم ہوئیں۔ ان انجمنوں میں سے بیشتر کا حال تفصیلی طور پر اب دستیاب نہیں ہے اور نہ ان کے قدیم ترین اور ہم عصر ماخذ یعنی خطبات و مقالات دتاسی سے ان کی کارکردگی اور اشاعتی پروگراموں کا احوال ملتا ہے۔ ان میں سے بعض انجمنیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ مثلاً:۔

انجمن تہذیب لکھنؤ ۱۸۶۸ء

اس انجمن کا ادبی آرگن "مرقع تہذیب، لکھنؤ" تھا۔ یہ اخبار ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اس اخبار کے مطابق انجمن ۹ فروری ۱۸۶۹ء کو قایم ہوئی تھی۔ اس انجمن کے بانی اور پہلے سیکرٹری منشی شیو نرائن بہار تھے۔ اس انجمن کے قواعد و ضوابط انجمن دہلی کے قواعد و ضوابط کے طرز پر جناب بہار ہی نے منضبط کیے تھے۔

منشی شیو نرائن بہار نے اس انجمن کے قیام اور اس کو چلانے میں بڑے خلوص سے جاں فشانی کی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کے دور میں انجمن اور اس کے آرگن "مرقع تہذیب لکھنؤ" نے بڑی ترقی کی۔ خاصی طویل علالت کے بعد منشی صاحب کا انتقال ۱۹ اپریل ۱۸۷۲ء کو ہوا۔ ان کے بعد لچھمی نرائن کو سیکرٹری بنایا گیا۔ لیکن یہ شاید عارضی انتظام تھا اس لیے "مرقع تہذیب" کی ایک اشاعت میں خبر چھپی تھی کہ "۱۵ اپریل ۱۸۷۲ء کی میٹنگ میں لچھمی نرائن صاحب نے سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ان کی جگہ مولوی حسن علی سیکرٹری، اور منشی چراغ علی جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ صدر انجمن منشی درگا پرشاد ہوئے۔"

"انجمن تہذیب" کا ادبی آرگن شایع ہونے سے پہلے اس کی روداد یں ایک کتابچے کی شکل میں شایع کی جاتی تھیں۔ لیکن اس سے انجمن کی کارکردگی عوام اور سرکاری حلقوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ اس لیے اس حکمتِ عملی کو بدل کر مرقع تہذیب لکھنؤ کو پندرہ روزہ جاری کیا گیا۔ اس اعلان کا ایک دلچسپ اقتباس یہ ہے۔

> "از آنجا کہ جلسۂ تہذیب لکھنؤ (بعض حضرات نے اس انجمن کا نام بھی جلسۂ تہذیب لکھا ہے) کی ہر ایک کمیٹی کی کارروائی ماہواری رسالے میں مندرج ہو کر دوسرے مہینے کی پندرھویں کو شایع ہوتی تھی اور رسالے کی ضخامت اور نام کی حیثیت سے اکثر کرکے لوگوں کو اس کے پڑھنے کی جانب توجہ کم رہی اور حکام کو بھی انتخاب گورنمنٹ رپورٹ کے ذریعے سے اس کی مفید رایوں سے خبر نہ ملتی تھی۔ لہٰذا اب تجویز ہوا ہے کہ ایک اخبار بنام مرقع تہذیب لکھنؤ ہر مہینے کی دو پہلی اور پانزدہم کو شایع ہوا کرے۔"

www.taemeernews.com

انجمن تہذیب لکھنؤ کے دائرۂ کار اور کارکردگی کا احوال بھی سنیے۔ یہ احوال "مرقع تہذیب" کے حوالے سے ہے کہ اس میں خبریں کم شایع کی جاتی تھیں۔ انجمن کی روداد کے علاوہ کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے تھے اور اصلاحی، تعلیمی اور تاریخی مضامین مثلاً شرافت اور رذالت کی تعریف، نئی قسم کی بدمعاشی، کیا تہذیب اسی کو کہتے ہیں، ہندکا بیان، خواب دیکھنے کا بیان، شایع ہوتے تھے۔

۱۸۶۸ء سے لے کر ۱۸۷۶ء تک کے آٹھ، نو برس کے اندر پورے ہندوستان کے تقریباً ہر شہر اور قصبے میں اس قسم کی انجمنیں معرضِ وجود میں آتی چلی گئیں۔ لیکن اب ان انجمنوں کا قیام بہت زیادہ بالراست انگریز حاکموں کے کھلے یا چھپے اشاروں کا رہینِ منت نہیں تھا بلکہ علم و ادب میں مسابقت اور ایک دوسرے سے بڑھ کر بازی لے جانے والی بات ہوگئی تھی۔ ان انجمنوں کے قیام کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ پہلے قایم ہونے والی اور نامور انجمنوں کے کرتا دھرتاؤں کا ضلع اور صوبے کے بڑے بڑے انگریز افسروں سے "تعلقِ خاص" قایم ہوتا نظر آتا تھا، لہٰذا اپنے اپنے علاقے کے چھوٹے موٹے مسائل حل کرانے اور ضلعے کے افسر تک رسائی کی خاطر بھی پڑھے لکھے لوگ ایسی انجمنوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑھ چڑھ کر پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ان چھوٹی قصباتی سطح کی انجمنوں کو زیادہ سرپرستی حاصل نہ ہو سکی اس لیے ان میں سے بہت سی انجمنیں نہ زیادہ مشہور ہوئیں اور نہ ان کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا۔ بس نام "ریکارڈ" ہونے والی بات رہی۔ سرکاری سرپرستی نہ ہونے ہی کا سبب تھا کہ ان میں سے بہت کم یعنی ایک آدھ ہی اپنا کوئی ماہنامہ یا پندرہ روزہ اخبار نکال سکی اور اگر جوں توں کر کے نکالا بھی تو ایک آدھ شمارہ نکل کر بند ہوگیا۔ مثلاً انجمن مناظرہ میرٹھ، لدھیانہ انجمن، انجمنِ پشاور، انجمن سیالکوٹ، ادبی انجمن جالندھر اور انجمنِ ادبی بنوں وغیرہ کا کچھ یہی حال ہے۔ اس دوران میں معرضِ وجود میں آنے والی انجمنوں کی مختصر سی فہرست یہ ہے:۔

(۱) بہار کی علمی ادبی انجمن۔ نظر پور (۲) ادبی انجمن گیا (۳) علمی ادبی انجمن صاحب گنج (۴) ادبی انجمن مغل سرائے (۵) مرزا پور کی علمی سوسائٹی (۶) انجمن رفاہِ عام حاجی پور (۷) دی اردو لٹریچر پرموٹنگ سوسائٹی، بمبئی (کام سارا اردو زبان میں ہوتا تھا) (۸) انجمن مفید عام لدھیانہ (۹) مجلسِ اصلاحِ معاشرت کانپور (۱۰) ادبی انجمن حیدرگڑھ (۱۱) ادبی انجمن پشاور (۱۲) ادبی انجمن قصور (۱۳) انجمن فیضِ عام گوجرانوالہ (نسبتاً زیادہ معروف ہے) (۱۴) سوشل کلب (انجمنِ تہذیب) دہلی۔ (۱۵) انجمنِ آگرہ (۱۶) انجمنِ ہوشیار پور (۱۷) انجمنِ کپورتھلہ (۱۸) انجمنِ ٹبالہ (یا انجمنِ پٹیالہ) (۱۹) انجمنِ جبل پور (۲۰) انجمنِ نینی تال (۲۱) انجمنِ علمی آنولہ۔ (۲۲) علی گڑھ ادبی انجمن (۲۳) انجمن اجمیر (۲۴) انجمنِ بنوں (سر سکندر حیات خاں کے والد سردار محمد حیات خاں اس کے بانی تھے) (۲۵) انجمنِ جالندھر (۲۶) ادبی انجمن سیالکوٹ۔ ان کے علاوہ بھی نہ جانے کتنی اور ایسی انجمنیں ہوں گی جو وسائل نہ ہونے کی بنا پر اپنے قیام اور وجود کی اطلاع بڑی انجمنوں کے رسائل اور اخباروں تک نہ پہنچا سکی ہوں گی۔ اور آج بھی اہلِ تحقیق کی نظرِ کرم کی منتظر ہیں۔

برطانوی دور کی ان انجمنوں کے اس سرسری خاکے کے اختتام پر ان کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی دو ایک صفحات میں پیش کردہ معروضات کے علاوہ ان انجمنوں کے قیام کی اطلاعات کو محفوظ کر دینے والی شخصیت (گارساں دتاسی) کی زبانی اُس عمومی تبصرے کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جس کا اظہار انھوں نے اپنے خطبہ ۱۸۶۹ء میں کیا تھا وہ لکھتے ہیں:۔

"ان انجمنوں کے قیام سے اہلِ ہند کا یورپ کے ساتھ رابطہ قایم ہو رہا ہے۔ اس ربط و تماس کی بدولت ہندوستان میں جو نیا تمدن قایم ہو رہا ہے اسے یہ انجمنیں محسوس کرنے لگی ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جس قدر جماعات

www.taemeernews.com

مدرسے اور کالج قایم ہیں وہ سب کے سب مغربی اصول پر ہیں۔ آہستہ آہستہ اہل ہندان کے عادی ہونے جارہے ہیں جس طرح انھوں نے قدیم علوم کی تحصیل میں کمال پیدا کیا تھا اب وہ "مغربی اثرسے جسے وہ بآسانی قبول کررہے ہیں" جدید تعلیم میں بھی پیدا کرنے لگیں گے۔ خود بنارس میں بعض اہل ہند لاطینی زبان سیکھ رہے ہیں۔" (خطبہ ۱۸۶۹ء ص ۳۰۲ خطبات دتاسی۔ جلد دوم)

ان چند سطروں میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے مغل ہندوستان کی اکھڑی اکھڑی سانسوں کو خط کشیدہ الفاظ ("مغربی اثر سے جسے وہ بہ آسانی قبول کررہے ہیں") میں صاف سنا جا سکتا ہے اور "میحائے دوران" جس نسخے سے اس کا علاج کررہے تھے اس کے اجزا بھی واضح ہیں۔ دتاسی نے یہ زمانہ خود دیکھا تھا، اُس کے پل پل کی اُسے خبر تھی۔ اُس کی "عینی شہادت" پر مزید حاشیہ آرائی اس شہادت کو مجروح کرنا ہے۔

حوالہ جات

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں اور رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (۱) خطباتِ گارساں دتاسی (حصہ اول و دوم) (۲) خطباتِ دتاسی (۳) تاریخ صحافتِ اردو۔ (جلد اوّل و دوم) مولانا امداد صابری۔ (۴) منشورات۔ دتاسی ترجمہ کیفی (۵) سرسید احمد خاں (ایک سیاسی مطالعہ): محمد عتیق صدیقی (۶) مفتی صدرالدین آزردہ — کبیر احمد جائسی (۷) مجلہ نیشنل کالج کراچی (علمی ادبی اور تعلیمی ادارے) (۸) برطانوی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ عبداللہ یوسف علی (۹) جائزہ زبانِ اردو۔ مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۷ء (۱۰) مولوی نذیر احمد۔ احوال و آثار۔

فکر انگیز دستاویزی اشاعتیں

اسلامیات

سیرت رسول اللہ	پروفیسر نواب علی	۲۴/-
تاریخ صحف سماوی	"	۱۲/-
معارج الدین	"	۱۰/-

ادب — شخصیت — فن

مجاز ایک آہنگ	مرتبہ صہبا لکھنوی	۳۵/-
جوبلی نمبر	"	۵۰/-
جوش نمبر	"	۴۰/-
حفیظ نمبر	"	۴۰/-

فیض نمبر	مرتبہ صہبا لکھنوی	۴۰/-
ندیم نمبر	"	۴۰/-
امیر خسرو ایڈیشن	"	۱۵/-
رومی پر خاص ایڈیشن	"	۱۲/-
نذر اقبال	"	۱۲/-
غالب نمبر	"	۲۰/-
کرشن چندر ایڈیشن	"	۱۲/-
مصطفیٰ زیدی ایڈیشن	"	۱۲/-
حمید احمد خاں ایڈیشن	"	۱۰/-

مکتبۂ افکار — رابسن روڈ — کراچی — فون ۲۱۴۰۷۹

www.taemeernews.com

برطانیہ میں اردو ایڈیشن

پروفیسر ایس کے حسینی

عبدالقادر سروری

سیّد شبیر علی کاظمی

لسانیات

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

پروفیسر ایس۔ کے۔ حسینی

اردو لغت نویسی اور اہلِ انگلستان

اردو لغت نویسی کی ابتدا دیسی روایات کے زیرِ اثر منظوم لغت سے ہوتی ہے۔ دوسرے دور میں جو لغت نثر میں لکھے گئے اُن پر فارسی لغت نویسی کا اثر نمایاں ہے۔ اردو لغت نویسی کے ارتقا کے تیسرے دور کا سلسلہ اردو لغت نویسی سے اہلِ یورپ کی دلچسپی کا مرہونِ منت ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اردو لغت نویسی سے اہلِ یورپ کی دلچسپیوں کے نتائج پر نظر ڈالیں یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود اہلِ یورپ کی فن لغت نویسی کے مختلف مدارج ارتقا کے متعلق چند بنیادی باتیں جان لیں۔ یورپ اور خاص کر انگلستان میں یہ تحریک یونان قدیم سے دور متوسط کے روم اور اس کے بعد اطالیہ سے ہوتے ہوئے انگلستان داخل ہوتی ہے۔ انگریزی میں لغت کے لیے جو لفظ ڈکشنری میں مستعمل ہے اس کا ماخذ اطالوی لفظ "Dictionorious" ہے جس کے معنی الفاظ کے مجموعے کے ہیں۔ یونانی زبان میں لغت کے لیے لفظ Lexicon ملتا ہے۔ انگریزی میں آج بھی عام لغت کے لیے Dictionary اور قدیم زبانوں کے لغت کے لیے Lexicon استعمال ہوتا ہے۔ آج کل فن لغت نویسی کے لیے جو لفظ Lexicography مستعمل ہے اسی لفظ Lexicon سے مشتق ہے۔

انگریزی میں لغت نویسی کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے۔ جس طرح ایران میں عربی سیکھنے کے لیے اور بعد میں ہندوستان میں فارسی سیکھنے کے لیے لغت نویسی کا رواج ہوا اسی طرح انگلستان میں لاطینی سیکھنے کے لیے لغت کی تدوین شروع ہوئی۔ ۱۲۲۵ء میں پہلی مرتبہ جان گارلینڈ نے لاطینی الفاظ اور اُن کے معنی بچوں کو حفظ کروانے کے لیے لغت کی شکل میں مدون کیے۔ جس میں الفاظ کی ترتیب موضوع کے لحاظ سے کی گئی تھی۔ پندرھویں صدی سے لغت میں انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے جانے لگے۔ مگر یہ لغت بھی لاطینی سیکھنے کے لیے ترتیب دیے گئے۔ اس قسم کا پہلا لغت Promplorium Parvalorium ہے جو انگریزی۔ لاطینی کا پہلا لغت ہے جس کی تدوین ۱۴۴۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور ۱۵۵۲ء میں انگریزی زبان کا پہلا لغت (A Budarium Anglico Latinum Pro Tyrunculis) رچرڈ ہوم لائٹ نے ترتیب دیا۔ ۱۵۷۳ء میں جان میرٹ نے اپنا لغت "Beehive" ترتیب دیا جس میں انگریزی الفاظ کے معنی انگریزی میں دیے گئے تھے اور ساتھ ساتھ فرانسیسی اور لاطینی مترادفات بھی مہیا کیے گئے تھے۔ Robert Crowdy نے پہلی مرتبہ یہ کوشش کی کہ زبان کے سارے لفظی سرمائے کو لغت میں جگہ دی جائے۔ اس کے لغت میں تقریباً ۲۵۰۰ الفاظ شامل ہیں۔ فن لغت نویسی

www.taemeernews.com

میں زبان کے پورے لفظی سرمایہ کو سمیٹ لینے کی یہ پہلی اور دانستہ کوشش ہے۔

اٹھارویں صدی میں یہ فن انگلستان میں کافی ترقی کر جاتا ہے۔ اور ۱۷۳۰ء میں بیلی نے ایک لغت ـــــ Dictionorium Brittanicum ترتیب دیا جس میں الفاظ کے معنی اور اُن کی وضاحت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے ماخذ سے بھی بحث کی اس لیے انگریزی فن لغت نویسی کے ارتقا کی یہ بہت اہم کڑی ہے۔

انگریزی فن لغت کے ارتقا کے اس پس منظر میں جانسن نے جب اپنے شہرۂ آفاق لغت کی تدوین کا بیڑا اٹھایا تو اُس وقت انگلستان میں فن لغت نویسی کے تعلق سے یہ نظریہ کارفرما تھا کہ لغت میں صرف مہذب طبقے میں مستعمل الفاظ شامل ہوں اور خالص انگریزی الفاظ کو لغت میں جگہ دی جائے۔ اس طرح دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ کو لغت میں جگہ دینے سے احتراز کیا گیا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جانسن نے جب ۱۷۵۵ء میں اپنا لغت ترتیب دیا تو اس کے خیالات مندرجہ نظریہ سے بالکل مختلف تھے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ زندہ زبان کا ارتقا جاری رہتا ہے اور اس ارتقا کے دوران زبان دوسری زبانوں سے استفادہ کرتی رہتی ہے۔ اس لیے زبان کو دوسری زبانوں کے الفاظ سے ملوث ہونے سے بچانا یا خالص زبان بنانے کے لیے لغت کی تدوین ایک لایعنی سی بات ہے۔ نیز لغت میں تمام مروجہ الفاظ شامل ہونے چاہئیں۔ جانسن کا یہ نظریہ جو حقیقت پر مبنی تھا سارے یورپ پر اثر انداز ہوا۔

سولھویں صدی کے اوائل میں انگریز جو تجارت کی غرض سے ہندوستان وارد ہوئے تو دیس میں افراتفری کے عام اور قومی انحطاط کے دور میں یہاں کے حکمراں بن بیٹھے۔ حکومت کرنے کے لیے انھیں کسی ایسی دیسی بولی کے سیکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی، جو سارے دیس میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جا سکے، جو دیش کی نمائندہ بولی ہو۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اُردو یا ہندوستانی کا انتخاب کیا اور اسی زبان کو سیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں انھیں اس زبان کے ایسے لغت مدوّن کرنے کی ضرورت ہوئی، جو انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں ہوں، اور جب ان انگریزوں نے اردو انگریزی لغت ترتیب دیئے تو ان کے پیش نظر وہ انگریزی لغت تھے جو فنی نقطۂ نظر سے ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اس طرح ان اہل یورپ کے انگریزی اردو یا اردو انگریزی لغتوں کے توسط سے یورپی فن لغت نویسی کے نظریات اردو لغت نویسی پر اثر انداز ہوئے۔

کسی زبان کے سیکھنے کے لیے صرف لغت ہی کی نہیں بلکہ صرف و نحو جاننے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ان ضروریات کے پیش نظر جارج ہیڈلے (George Hadley) نے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب ۱۷۷۲ء میں تالیف کی۔ جس میں ہندوستانی لغت بھی شامل ہے۔ یہ انگریزی اردو لغت نویسی کا پہلا خاکہ ہے۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کے بعد جے فرگوسن (J. Fergusson) نے ایک لغت ترتیب دی۔ جس میں صرف و نحو کے لیے بھی ایک حصہ مختص کیا۔ ان دونوں کتابوں کو باقاعدہ لغت تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ باقاعدہ لغت نویسی کی طرف ایک قدم ضرور تھا۔ اس نیو پر اردو کے ایک انگریز محسن جان گل کرسٹ نے اچھی خاصی عمارت کھڑی کر دی۔ گل کرسٹ نے کئی انگریزی ہندوستانی لغت مرتب کیے جیسے ڈکشنری انگلش ہندوستانی ۱۷۸۶ء میں اور اورینٹل لنگوسٹ Oriental Linguist ۱۷۹۸ء میں اور انٹی جارگنسٹ Antijargonist ۱۸۰۰ء میں جسے مقدمۂ ہندوستانی کہتے ہیں۔ اس میں زبان کے ابتدائی اصولوں سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں انگریزی ہندوستانی لغت بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور

www.taemeernews.com

لغت East India Guide to the Hindustani or the Grand Popular and Military Language of all India, Improperly called Moor of Moorish. بھی ہے

گل کرسٹ کی لغت "ڈکشنری انگریزی - ہندوستانی ایک ضخیم لغت جس میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو میں دیئے گئے ہیں۔ اردو میں رسم الخط استعمال کیا گیا ہے۔ اس لغت کو ڈاکٹر روبک اور گل کرسٹ نے لندن سے رومن رسم الخط میں بھی ۱۸۱۰ء میں شایع کیا۔ آج اس لغت کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی، اس لیے کہ یہ غلطیوں کا پلندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر محض فنی اصول جو اس لغت میں ہمیں ملتے ہیں ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ الفاظ کے جو معنی دیے گئے ہیں ان کا نمونہ ملاحظہ ہو:

Alteration ـ تبدیلی، فرق، تفاوت، تبدل، انقلاب

New ـ نیا، نوین، نو، تازہ، جدید، نو رسیدہ، نو پیدا، حادث

Chariot ـ گاڑی، گھڑ بیل، رتھ

Agent ـ گماشتہ، پیش کار، نائب، وکیل

مندرجہ بالا مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف کس طرح الفاظ کے معنی لکھتے وقت ہر قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس لغت میں یہ صراحت بھی نہیں ملتی کہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح کس طبقے کی بولی سے تعلق رکھتا ہے، اگرچہ ہم اس چھان بین کی توقع کسی پردیسی سے نہیں رکھ سکتے۔ پھر بھی لغت کی ان کوتاہیوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ اس لغت میں جو انگریزی اردو لغت ہے اردو الفاظ کے ماخذ وغیرہ بھی نہیں لکھے جا سکے۔ اس بات کا اعتراف خود مصنف نے لغت کے دیباچہ میں کیا ہے۔ بہرکیف یہ لغت اردو انگریزی یا انگریزی اردو لغت کی تالیف کے سلسلے میں نوج کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتا ہے اور آگے چل کر اس سے بہتر لغتوں کی تالیف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

گل کرسٹ کے بعد اس میدان میں ڈاکٹر ہارس (Dr. Hariss) نے قدم رکھا اور ۱۷۹۰ء میں ایک لغت Dictionary of the Hindi Language تالیف کی اور مدراس سے شایع کی۔ اس لغت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جنوبی ہند میں بولی جانے والی اردو یا دکنی الفاظ کا بھی اچھا ذخیرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر ہارس کا یہ کارنامہ گل کرسٹ کے کارنامے سے بہتر ہے مگر یہ لغت بہت ہی کمیاب ہے۔ ہارس کے بعد ڈاکٹر جوزف ٹیلر نے فورٹ ولیم کالج کے مقامی عالموں کی مدد سے ایک لغت A Dictionary Hindustani and English تالیف کی جسے بعد میں ڈبلیو ہنٹر نے ۱۸۰۸ء میں شایع کیا۔ اس لغت میں اردو الفاظ کے معنی انگریزی میں دیے گئے ہیں۔ اس لغت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شایع ہونے کے چند ہی سال بعد کمیاب ہو گیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور لغت تالیف ہوئے جیسے ایم، ٹی، آدم نے ایک لغت The Dictionary in Hindi and English تالیف کی اور ٹی طامس نے بھی اس قسم کا لغت ترتیب دیا۔

ان کچھ کم اہم کارناموں کے بعد جان شیکسپیئر نے ۱۸۱۷ء میں اپنا لغت Dictionary Hindustani and ڈکشنری ہندوستانی اینڈ انگلش پیش کیا جس میں اردو الفاظ کے معنی انگریزی میں دیے گئے ہیں۔ یہ لغت دراصل

www.taemeernews.com

جوزف ٹیلر کے لغت کی ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ مبسوط اور جامع لغت ہے اس لیے اس کے تین چار ایڈیشن نکلے۔ یہ لغت اکثر پچھلے لغتوں سے بہتر ہے۔ لفظ کے معنی لکھنے میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں پچھلے لغتوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ مگر اس استفادے کے نتیجے میں چند غلطیاں بھی اس کو ورثے میں ملی ہیں۔ لغت نویسوں نے جس لفظ کا ماخذ غلط بتایا ہے وہاں شیکسپیئر نے بھی اُسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور بعض جگہ وہ الفاظ کے معنی لکھتے وقت بھی بھٹک گیا ہے جیسے وہ لفظ "آپا" کو ہندی لفظ بتاتا ہے جو درحقیقت ترکی لفظ ہے۔

سنہ ۱۸۱۱ء میں روبک نے بحری اصلاحات کا ایک لغت ترتیب دیا جس میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو میں ملتے ہیں اور سنہ ۱۸۳۳ء میں ڈاکٹر روزاریو (Dr. Rozaris) نے رومن رسم الخط میں Dictionary English, Bengali, Hindustani تالیف کی۔

ان چند غیر اہم لغتوں کے بعد ڈنکن فوربس نے بڑی محنت اور تحقیق و جستجو کے ساتھ Dictionary Hindustani and English دو جلدوں میں پیش کیا۔ اس میں اردو الفاظ کے معنی انگریزی میں دیے گئے ہیں۔ اس لغت میں عمی بول چال اور گنوار بولی کے الفاظ بھی شامل ہیں جو یقیناً ایک صحت مند اقدام تھا مگر الفاظ کے معیار سے ناواقفیت کی بنا پر لفظ کے تعلق سے یہ صراحت نہیں ملتی کہ یہ لفظ معیاری زبان کا ہے یا نہیں وغیرہ۔ اس لغت میں بھی دکنی الفاظ کا کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ فوربس ہندوستانی کو بازاری زبان سمجھتا ہے۔ اس کا یہ لغت پچھلے لغتوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس نے شیکسپیئر کی طرح الفاظ کے متعلق یہ صراحت بھی کردی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس معاملے میں اس کے ہاں وہ ساری غلطیاں بھی مل جاتی ہیں جو اس کے لغت سے پیشتر لغتوں میں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے الفاظ کی گرامر کے لحاظ سے نوع وغیرہ کی بھی وضاحت کی کوشش کی ہے۔ اس کے لغت میں تصریح مل جاتی ہے کہ لفظ اسم ہے یا فعل ہے، یا حرف، اگر اسم ہے تو مذکر ہے یا مونث، واحد ہے یا جمع اسی طرح فعل، حرف، صفت وغیرہ کے متعلق دوسری ضروری معلومات بھی مہیا کی گئی ہیں۔ اس نے لفظ کے معنی لکھتے وقت ادیبوں اور شاعروں کے اشعار یا جملوں سے سند پیش نہیں کی ہے۔ اس لغت میں الفاظ کا کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ دراصل اس نے اپنے پیش روؤں کے لغتوں سے الفاظ لیے ہیں اور اُن میں اضافہ کیا ہے۔ اس لغت میں اتنی زیادہ خامیاں نہیں ملتیں جتنی کہ اس سے پہلے کے لغتوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس لغت کے کئی ایڈیشن نکلے۔

ڈنکن فوربس کے اس اہم کارنامے کے تقریباً ربع صدی بعد فیلن نے New Hindustani English Dictionary نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری سنہ ۱۸۷۹ء میں ترتیب دیا۔ فیلن کا یہ لغت تاریخ اردو لغت میں کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے اور اپنی مختلف خوبیوں کی وجہ سے ایک بلند پایہ لغت سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو لغت نویسی پر اس کے بڑے اچھے اثرات بھی مرتب ہوئے اور لغت میں الفاظ کا سرمایہ بھی زیادہ ہے اور الفاظ مختلف طبقات سے لیے گئے ہیں۔ اور عجیب بات ہے کہ اس میں عورتوں کی بول چال کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ الفاظ کے معنی لکھتے وقت فیلن بہت ہوشیاری سے کام لیتا ہے۔ اس لیے الفاظ کے معنی بہت حد تک درست قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے:۔

ابا — Abba (n) (m) ابو (z) اَب - بابا (Old p.)[1] Bap (Z+H)
Papa – Father– Baba – Bapu – Bava (H)

---

[1] (n) = اسم (m) = مذکر (z) = ژند (Old p) = فارسی قدیم (h) ہندی

www.taemeernews.com

آبرو — آب brightness + رو — face — عزت، کردار، موقف

آبرو جگ میں تو جان جائے پشم ہے
آبرو دنیا میں یارو موتی کی سی آب ہے　　　نظیر

Support یہی ہمارے گھر کی آبرو ہے، آبرو اتارنا، آبرو بگاڑنا یا بگاڑ لینا۔ آبرو خاک میں ملانا، آبرو پیدا کرنا، آبرو پانا، آبرو دینا، آبرو رکھنا۔ آبرو کا لاگو ہونا، آبرو کے پیچھے پڑنا، آبرو میں بٹا لگنا۔ آبرو میں فرق آنا۔ اس طرح وہ لفظ کے ماخذ لفظ کے مرکبات لفظ سے متعلق محاورات وغیرہ قلم بند کرتا ہے۔ لفظ کے استعمال کے متعلق بھی اشعار اور جملوں سے سند پیش کرتا ہے اور لفظ کی گرامر بھی اس لغت میں ملتی ہے۔

ایک اور اہم اور قابل قدر اردو انگریزی لغت پلیٹس (Platts) کا ہے جو ۱۸۸۴ء کی تالیف ہے۔ پلیٹس نے شیکسپیر کے لغت سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں فیلن کے لغت کی اکثر خوبیاں بھی مل جاتی ہیں۔ فیلن کی طرح وہ الفاظ کے انتخاب، معانی کے مختلف پہلو اور گرامر پر توجہ دیتا ہے۔ اس لغت کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اردو الفاظ، فارسی، ناگری اور رومن رسم الخط میں ملتے ہیں۔ اس لغت میں بھی دکنی الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ ملتا ہے۔ اس لیے یہ آج بھی مفید اور کار آمد لغت سمجھا جا سکتا ہے۔

انگریزی اردو یا اردو انگریزی لغت لکھنے کا شوق اس قدر پھیل گیا تھا کہ متذکرہ بالا اہم لغتوں کے علاوہ اور کئی چھوٹے بڑے لغت لکھے گئے۔ مثلاً ہنری گرانٹ نے ۱۸۵۰ء میں اپنا لغت ترتیب دیا J. P. Hazelgrove نے ۱۸۶۵ء میں، لاگ نے ۱۸۷۷ء میں ریورنڈ کریون ۱۸۹۰ء میں تھابرن نے ۱۸۹۱ء اور راکنگ نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی اردو لغت ترتیب دیے۔ ان کے علاوہ بھی دیسی لغت نویسوں نے اس جانب قدم اٹھایا جیسے ۱۸۴۳ء میں دوسابھائی سہراب جی نے ایک لغت تالیف کیا جس میں بول چال اور محاورے وغیرہ انگریزی سے گجراتی اور اردو میں لکھے۔ اس لغت میں جو اردو زبان استعمال ہوئی ہے اس پر گجراتی زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے بعد درگا پرشاد نے ۱۸۷۵ء میں انگریزی اردو لغت تالیف کیا۔ اور مولوی عبدالودود نے ۱۸۷۹ء میں اس قسم کے لغت لکھے۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی ڈاکٹر عبدالحق کا English Urdu Dictionary ہے جو اپنے تمام پیشتر لغتوں سے زیادہ مفید اور مستند ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر سے اہل یورپ کی اردو لغت نویسی سے دلچسپی کے نتیجے میں جو لغت لکھے گئے ان کا سلسلہ انیسویں صدی میں بھی جاری رہا۔ ان لغت نویسوں کا مقصد انگریزوں کو اردو سیکھنے میں مدد دینا تھا، اس لیے یہ سب لغت ذواللسانین لغت ہیں جن میں بعض اردو انگریزی اور بعض انگریزی اردو لغت ہیں۔ لغت نویسی کے اس سلسلے کے اثر سے اردو فن لغت نویسی میں انگریزی فن لغت نویسی کے نظریات اور اصول داخل ہونے لگے۔ انگریزی فن لغت نویسی اس وقت تک جیسا کہ بالائی صفحات میں بتایا گیا ہے ترقی کے بہت سے مدارج طے کر چکا تھا اس لیے اردو فن لغت نویسی کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔ چنانچہ امیر اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ خود صاحب فرہنگ آصفیہ نے ڈاکٹر فیلن کے ساتھ لغت نویسی کے سلسلے میں کئی سال تک کام بھی کیا۔

الفاظ کے انتخاب کی حد تک ان انگریز لغت نویسوں کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔ ہر لغت نویس نے پچھلے لغت نویسوں سے

www.taemeernews.com

ذخیرۂ الفاظ نقل کیا ہے اور اپنے طور پر بول چال کے کچھ الفاظ اضافہ کر دیے ہیں۔ ان لغت نویسوں نے بعض مشہور اور ادبی کتابوں سے بھی الفاظ لیے ہیں جیسے قانون اسلام، انوار سہیلی، پریم ساگر، اخلاق ہندی، خرد افروز، گل بکاؤلی، آرائش محفل، اخوان الصفا، سنگھاسن بتیسی اور نظیر کی شاعری وغیرہ مگر عام طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لغت نویس ادبی زبان سے زیادہ عام بول چال کی زبان پر زور دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ادبی زبان سے زیادہ عوامی زبان سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے ان لغتوں میں مختلف علاقائی بولیوں کے الفاظ بھی جگہ پانے لگے۔ اس طرح یہ تحریک آگے چل کر اردو لغت نویسی میں روایت کا روپ دھارتی ہے۔ آج بھی علاقائی بولیوں کی حد تک ان لغتوں میں کئی الفاظ مل جاتے ہیں جو اردو کے دوسرے لغتوں میں کہیں نہیں ملتے۔ بہرکیف یہ ایک صحت مند روایت تھی مگر اس معاملے میں ہمارے لغت نویسوں کو بھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ان لغتوں میں اردو ادب کے الفاظ کے ذخیرے سے بہت کم الفاظ لیے گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ لغت نویس اردو ادب سے زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لغت نو وارد انگریزوں کی کام چلاؤ قسم کی زبان کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے ان لغت نویسوں نے ادبی زبان کے لفظی سرمائے کو اپنے لغتوں میں بہت کم جگہ دی۔ یقیناً فنی نقطۂ نظر سے یہ ان لغتوں کی خامی ہے۔

اردو لغت نویسی میں لفظ کے ماخذ کا کھوج لگانے کی روایت خان آرزو کے لغت نوادر الالفاظ سے شروع ہوتی ہے مگر بعد کے لغت نویسوں نے اس طرف بالکل کم توجہ دی۔ اس مردہ روایت میں ان انگریزی لغت نویسوں کے لغتوں کی وجہ سے پھر سے جان پڑ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان لغت نویسوں کا الفاظ کی گرامر کے لحاظ سے وضاحت پر توجہ دینا بھی اردو لغت نویسی کے فن کے لیے بہت مفید ہے۔

غرض اردو لغت نویسی کے ارتقا کی تاریخ میں جو لہر یورپ اور خاص کر انگلستان سے انگریزوں کے ساتھ ہندوستان آئی ہے اس سے اردو فن لغت نویسی کی قابل لحاظ راہ نمائی ہوئی۔

پاکستان کا واحد ادبی ماہنامہ

افکار

گزشتہ ۳۶ سال سے مسلسل شایع ہو رہا ہے۔ جس کے خاص اور عام شمارے یونیورسٹیوں، کالجوں اور ہائی اسکولوں میں حوالے کا کام دیتے ہیں۔ جو صاحبان علم کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ہر ماہ غیر مطبوعہ اور منفرد تخلیقات پیش کرتا ہے اور جس کا پاکستان اور بیرونی ملکوں میں ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔
گھر کے ہر فرد کے لیے۔ ایک معیاری ماہنامہ
نئے سالانہ ممبر — خاص اشاعتیں رعایتی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں۔

www.taemeernews.com

عبدالقادر سروری

انگریزی میں اردو الفاظ

الفاظ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ متحجر تاریخ ہوتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ زندہ تاریخ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک اچھی مثال انگریزی زبان ہے۔ جس میں سیکڑوں لفظ غیر زبانوں کے داخل ہوگئے ہیں اور ان غیر زبانوں کے الفاظ میں شاید سب سے زیادہ لفظ تعداد میں اردو ہی کے ہوں گے۔ یہ ذخیل لفظ اپنی زبان سے ایک تاریخ دہراتے ہیں۔ ان سے سب سے پہلے تو اس زمانے کا تعین ہوتا ہے، جس زمانے میں انگریزی زبان بولنے والوں کا تعلق اردو زبان بولنے والوں سے ہوا۔ دوسری بات ان سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اردو کے ان ذخیل لفظوں نے، اس مخصوص تصور کی وجہ سے جس کے وہ حامل ہیں اپنے لیے انگریزی زبان میں جگہ نکال لی ہے، اور اب وہ اس کا جزو ہوگئے ہیں۔ ان سب سے زیادہ اہم ایک تیسری بات ہے، جس سے زبانوں کے باہمی تعلقات کے اصول پر روشنی پڑتی ہے۔ زندہ زبانیں ہر نئے تصور کے لیے لازمی طور پر لفظ گھڑ نہیں لیتیں۔ بلکہ وہ تصور جس زبان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اُس کو لفظ سمیت لے لیتی ہیں۔ اس میں دراصل لفظ لینے والی زبان کے بولنے والوں کے اس زندہ شعور کا بڑا حصہ ہوتا ہے کہ لفظ کا ترجمہ اصل نہیں ہو سکتا۔

انگریزی زبان کی قدیم اور جدید علوم میں ہمہ گیری کے باوجود اس کے بولنے والوں کا حقیقت پسند شعور، نئے تصورات کے ساتھ ساتھ ان کے حامل لفظوں کو لے لینے سے کبھی نہیں ہچکچایا۔ انگریزی کی ہمہ گیری اور قوت کا شاید یہ ایک بڑا سبب ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس سے زبان کی کوتاہی ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے خلاف اس سے زبان کے بولنے والوں کے عملی اور صحت بخش شعور کا پتہ چلتا ہے۔ بعض زبانوں کے بڑھنے اور ترقی کرنے میں یہی راز مضمر ہے۔ جو زبانیں اپنے ہی سرمائے سے تعلیے تعمیر کرنا چاہتی ہیں، وہ سکڑاؤ کی حکمت عملی پر کاربند سمجھی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زبانوں کو صرف اپنے ہی ماخذ زبانوں سے مدد لینی چاہیے، ایک حد تک یہ خیال ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اس میں غلو اختیار کیا جائے تو زبانیں متحجر جسدوں کا مسان بن کر رہ جاتی ہیں۔ ایک مردہ لفظ کو جلانے کی کوشش کے مقابلے میں جو ایک ناممکن کوشش ہے اور دریا کو اپنے منبع کی طرف لوٹانے کے مترادف ہے۔ ایک زندہ لفظ کو لے لینا ہمیشہ اچھا ہے۔ اس سے زبان اپنے عوامی ربط کو ابھارتی اور نکھارتی ہے اور عوامی ربط زبان کے لیے جاں بخش ہوتا ہے۔

انگریزی زبان کی صورت میں اگر اس کے بولنے والے عوام علما "اپنے ماخذ کی طرف لوٹو" کے اصول پر عمل کرتے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس زبان کی حالت آج کیا ہوتی۔ یقین ہے کہ وہ ایک بہت ہی بوجھل زبان بن کر رہ جاتی، اور بجائے موجودہ تخلیلی

www.taemeernews.com

Analytic شکل کے شاید لاطینی یا یونانی کی طرح کا مرکبی اور تعریفی Synthetic روپ اختیار کرلیتی۔ اس سے زبان کی سہل روی اور پھیلاؤ پر کتنا مضر اثر پڑتا، اس کا اندازہ کرنا آسان ہے۔ پرانے زمانے کے علما کے لیے تو یہ بات اتنی مشکل نہیں تھی کہ وہ مرکبی اور تعریفی زبانوں کی صرف و نحو کی ساری صورتوں کو رٹنے بیٹھیں لیکن موجودہ زمانے کے عالم اور اس سے بڑھ کر عام آدمی کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ اس میں اتنا صبر کہ وہ ان اوگھٹ گھاٹیوں میں پڑ کر بھی زبان پر عبور حاصل کرنے کے درپے ہو۔

انگریزی زبان کے اجزائے ترکیبی پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زبان کو بنانے میں بے شمار عناصر کا حصہ ہے۔ اسی میں اردو یا ہندوستانی کا بھی اپنے ربط کے مواقع اور ربط کے مطابق کافی حصہ موجود ہے۔

انگریزوں کا ربط ہندوستان سے سولھویں صدی کے آغاز میں ہوا اور اس آغاز کے ساتھ ہی اردو کے لفظ انگریزی میں داخل ہونے لگے اور یہ کتابوں کے راستے سے نہیں بلکہ عوام کی بول چال کی راہ سے جن کی اصل میں وہ زبان تھی۔ انگریزوں کا تعلق ہندوستان سے تقریباً تین ساڑھے تین سو برس رہا۔ اس عرصے میں انگریزی زبان ساری ہند آریائی زبانوں سے ربط میں آئی۔ لیکن یہ واقعہ بہت ہی معنی خیز ہے کہ سب سے زیادہ لفظ اس میں اردو زبان سے آئے۔ اس حقیقت کا ثبوت لندن یونیورسٹی کی انگریزی کی لکچرار ڈاکٹر میری سارجنٹ سن کے ذیل کے بیان سے ملتا ہے۔ اپنی تصنیف "انگریزی میں اجنبی الفاظ کی تاریخ" میں وہ لکھتی ہیں:

> "انگریزی میں ہندوستان کے لفظوں کی سب سے بڑی جو تعداد آئی، وہ ہندوستانی سے آئی۔ جو قدیم سنسکرت سے ارتقا پائی ہوئی زبان ہے (اور اس طرح ایک ہند جرمانی بولی ہے) لیکن اس کی لفظیات میں عربی اور فارسی کے لفظوں کی قابلِ لحاظ آمیزش ہے۔"

انگریزی میں اردو الفاظ کی درآمد کا سلسلہ سولھویں صدی سے شروع ہوا۔ جب انگریز تاجروں نے سمندری راستے سے ہندوستان سے براہِ راست ربط پیدا کرلیا۔ جیمس لنکاسٹر کا جہاز، پہلا انگریزی جہاز تھا، جو تجارتی سفر پر راس گڈ ہوپ کے راستے سے مشرق کو روانہ ہوا۔ ڈاکٹر میری سارجنٹ سن نے ۱۶۰۰ء سے پہلے کے حسب ذیل لفظ گنائے ہیں۔ لاک (لاکھ) ۱۵۲۳ء میں ایڈن کی مصنفہ "نیو انڈیز پر رسالہ" میں آیا ہے۔ راج ۱۵۵۵ء میں ایڈن کے "دی کیڈس" میں آتا ہے۔ مانڈ (اردو من وزن ہے) ۱۵۸۲ء ہکلیوت کے "سفرنامے" میں۔ بنیان (بنیا۔ ہندی تاجر) ۱۵۹۹ء میں مذکورہ بالا کتاب میں۔ اس لفظ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ عربی اور پرتگالی سے ہوتا ہوا انگریزی میں آیا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان میں پھیلنے لگا۔ اور سیاح اس ملک میں آنے جانے لگے، تو ہندوستانی لفظوں کی خاصی تعداد انگریزی زبان میں داخل ہونے لگی۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ اب انگریزی زبان کا جزو بن گئے ہیں، جیسے، چنٹز، (چھینٹ) لشور (ٹسر) ڈنکاریز...... کڈگری (کھچڑی) کاٹ Cot، (کھاٹ) بنگلو (بنگلہ) وغیرہ۔

انگریزی میں اردو لفظوں کی درآمد کے تین دور ہیں۔ سب سے پہلا دور انگریزوں کے ہندوستان سے ابتدائی واقفیت کا ہے، جس میں انگریز سیاح وغیرہ یہاں کے خاص درختوں، جانوروں یا پارچہ سے متعلق لفظ اپنی زبان میں لینے لگے۔ یہ دور سولھویں صدی کے آغاز سے لے کر سترھویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔

سترھویں صدی کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیار کردہ فرائض کی وجہ سے انگریزوں کا عمل دخل ہندوستان کی سیاست اور زندگی میں زیادہ ہونے لگا، اور اس تعلق سے بہت سے لفظ اردو کے انگریزی زبان میں داخل ہوگئے۔

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جب انگریزوں کا سابقہ ہندوستان میں دوسری یورپی اقوام جیسے ولندیزیوں اور

www.taemeernews.com

فرانسیسیوں سے پڑا، اور حصول اقتدار کے لیے ان میں رسہ کشی ہونے لگی تو لفظوں کے سفر کی رفتار مدھم پڑ گئی۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے وسط سے جب انگریزوں نے ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کو ہندوستان سے عملاً بے دخل کر دیا اور خود سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تو ایک نیا دور ہند سے انگریزی تعلقات کا شروع ہوا۔

ذیل میں ان اردو لفظوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے جو عام طور پر انگریزی زبان میں داخل ہو گئے ہیں اور مستعمل ہیں۔

افراد اور القاب

'نے باب' (نواب - عربی 'نوب' سے جس کے معنی ہیں۔ نوبت یا باری باری سے آنا) یہ لفظ پہلے پہل ۱۶۱۲ء میں کوٹ کے سفرنامے" میں ملتا ہے، جیسے "ارل، نواب کہلاتا ہے"۔

گرو (استاد۔ پیر طریقت)

مُلّا۔ (اسلامی علوم کا حامل اور ان پر عامل) پُرچاز ہزیل گریمبیج ۱۶۱۳ء

منشی (عربی میں انشا پرداز انگریزی میں زبانوں کا معلم یا ترجمان) ۱۶۲۳ء

وکیل۔ (وکالت کا پیشہ انجام دینے والا یا وکیل سلطنت) ۱۶۲۳ء

مولوی (مولوی۔ معلم) ۱۶۲۵ء

رعیت (کسان) ۱۶۲۵ء

صاحب (عربی میں دوست، ساتھی، اردو میں عزت کا لقب) ۱۶۲۶ء

خان ساماں (فارسی۔ گھر کے امور کا منتظم) ۱۶۴۵ء

سئیس (اردو سائیس) ۱۶۵۳ء

مہاودت (اردو، مہاوت) ۱۶۶۲ء

پنڈت۔ (ہندو یا ہندوستانی عالم) ۱۶۷۲ء

مہاراجہ (اکونٹ آف ایسٹ انڈیا اینڈ پرشیا) از فریر ۱۶۷۳ء

رانی۔ " " "

(ب) لباس، پارچہ وغیرہ

چنٹز۔ صیغہ جمع "چنٹ" کا جو اردو میں چھینٹ ہے اور سنسکرت سے اردو اور ہندی میں آیا، جو "چتر" بہ معنی بیل بوٹے اور رنگا رنگی سے مشتق ہے۔ پے ٹن کے سفرنامے ۱۶۱۴ء پے پی Pepys کی مشہور ڈائری کا اقتباس ہے۔

"میری بیوی نے اپنے نئے کتاب خانے کے لیے ایک چنٹز خریدا جو چھپا ہوا ہندوستانی کیلی کو ہے"۔

چڈر (اردو، چادر) پے ٹن کا سفرنامہ

ٹسور۔ (اردو۔ ٹسرا) ۱۶۱۹ء

دھوتی۔ ۱۶۲۲ء

پگڑی۔ ۱۶۶۵ء

www.taemeernews.com

ڈونگری ۔(ڈونگری) پرچا کا سفرنامہ

(ج) حیوانات اور نباتات

دتورا (اردو، دھتورا) ۱۶۶۲ سنہ ء

بملو۔ (ایک قسم مچھلی کی، جو غریب لوگوں کی غذا ہے۔ اس کا ذکر فریر نے ۱۶۷۳ سنہ ء میں اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ اردو میں بمل مچھلی، سوکھی مچھلی کی ایک خاص قسم کی مچھلی کے لیے بولا جاتا ہے)

تلی پوٹ (تل پت، تاڑ کی ایک خاص قسم) ۱۶۸۱ سنہ ء

منگوس۔ (اردو منگوس، نیولا) ۱۶۹۸ سنہ ء

سانبر (ہرن کی ایک قسم، اردو۔ سانبر، سانبھر) ۱۶۹۸ سنہ ء

کھانے پینے کی چیزیں

کدگری (اردو کھچڑی) ۱۶۲۵ سنہ ء

پنچ (یا پانچ اجزا سے مرکب۔ اردو، پنچ، پانچ، جیسے پنچ محلہ وغیرہ) ۱۶۳۲ سنہ ء

پانی۔

گھریلو چیزیں اور سواریاں

مشک (مشک، پانی کی) ۱۶۱۰ سنہ ء پرچا ر ہر پل گریمیج)

ڈولی (اردو، ڈولی، ایک سواری) ۱۶۲۵ سنہ ء پرچاز

کاٹ Cot (اردو، کھاٹ، پلنگ کی ایک قسم) جو بعد میں ہوا بازی میں استعمال ہوتا رہا۔ انگریزی میں پالنا یا پنگورا کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

بنگلو۔ (اردو، بنگلا، جو دراصل ابتدا میں "بنگالی" کے معنوں میں بنگال سے صفت بنائی گئی تھی۔ جس کے معنی "بنگال کا" کے ہوتے تھے۔ ۱۶۹۶ سنہ ء

ٹمٹم۔ (ایک سواری) ۱۶۹۳ سنہ ء

ہکیری (اردو، چھکڑا۔ بیل گاڑی) ۱۶۹۸ سنہ ء

(د) اعداد۔ سکے اور ناپ

کرور (اردو۔ کروڑ) پرچاز۔ ۱۶۰۹ سنہ ء

رُپی۔ (اردو، روپیہ) واشنگٹن، سفرنامہ۔ ۱۶۱۳ سنہ ء

لاک (اردو، لاکھ) پرچاز۔ ۱۶۱۳ سنہ ء

پائیس (اردو۔ پائی) ۱۶۱۵ سنہ ء

سیر (اردو، سیر، وزن) ۱۶۱۸ سنہ ء

کوری (اردو، کوڑی) ۱۶۶۲ سنہ ء

www.taemeernews.com

(۵) ثقافت اور دفتر وغیرہ

دربار (اردو، دربار) پرچاز ۱۶۰۹ء

چوکی (اردو، چوکی، پہرہ) پرچاز ۱۶۰۸ء۔ انیسویں صدی میں اس کے معنی جیل کے بھی ہونے لگے۔

کچھیری (اردو، کچہری، عدالت یا دفتر) پرچاز ۱۶۱۱ء

چاپ (Chop، سرکاری مہر یا اسٹامپ، جیسے The King Sent his Chop اردو "چھاپ" ٹھپہ یا نشان اب اس کا استعمال چین میں بہت ہوتا ہے، جس کے معنی برانڈ، یا ٹریڈ مارک کے ہوتے ہیں ۱۶۱۴ء

متفرق

گھاٹ (پہاڑی، گزرگاہ، اردو، گھاٹ) آر، جون سن۔ کنگ ڈم اور کامن دلیتھ ۱۶۰۳ء

شکار (شکار کا بندوبست، اردو، شکار، کا بندوبست یا صید) پرچاز ۱۶۲۵ء

شکاری (اردو، شکاری، بمعنی صیاد) ۱۶۲۷ء

میدان (اردو، پکا، بمعنی پختہ یا پورے وزن کا، جیسے پکا دس من وغیرہ۔ نیز آج کل تعمیرات میں عمارت کے لیے بھی مستعمل ہے) ۱۶۹۸ء

اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستانی کے لفظوں کی انگریزی میں درآمد کا سلسلہ کچھ ماند سا پڑ گیا تھا۔ لیکن ۱۷۵۰ء کے بعد کے ہندوستان سے انگریزوں کے تعلقات میں ایک نئی ہلچل برپا ہوئی یہ فرانسیسیوں سے انگریزوں کی مسابقت اور مقابلہ بازی تھی، جس کا انجام انگریزوں کی کامیابی پر ہوا۔ ۱۷۵۷ء کے بعد سے ہندوستانی لفظوں کے انگریزی میں داخل ہونے کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پہلے دور کی طرح کئی لفظ ایسے آئے جو اشخاص اور عہدوں سے متعلق ہیں۔ کچھ عہدے فوجی بھی ہیں۔ لیکن بہت کم لفظ ایسے ہیں جو لباس وغیرہ سے متعلق ہیں۔ جانوروں اور پودوں کے کئی نام بھی اس دوسرے دور میں انگریزی میں گھس گئے۔ بحیثیت مجموعی اس دور میں جو لفظ انگریزی میں داخل ہوئے ان کی تعداد پہلے دور سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ ذیل میں ایسے لفظوں کی فہرست دی جاتی ہے۔

اشخاص، عہدے وغیرہ

نواب۔ اگلے دور میں یہ لفظ "نباب" کی شکل میں داخل ہوا تھا۔ لیکن بعد کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی معلومات میں زیادہ صحت اور قطعیت پیدا ہوتی گئی، جس کی بنا پر پرانا لفظ دوبارہ زیادہ صحیح تلفظ کے ساتھ لیا گیا۔ یہ لفظ ۱۷۵۸ء میں انگریزی زبان میں داخل ہوا۔

رسالدار۔ (اردو، رسالہ دار) ۱۷۵۸ء

جمیدار (اردو جمعدار) ۱۷۶۳ء

نظام۔ (دکن کے حکمراں کا خطاب، اور معمولی مفہوم میں، ترتیب اور انتظام) ۱۷۶۸ء

وَلّا (اردو، اسم فاعل کی علامت 'والا' جیسے آنکھ والا) ۱۷۷۶ء

سوکار۔ (اردو، ساہوکار) ۱۷۸۵ء

بابو۔ ۱۷۸۲ء

www.taemeernews.com

کپڑے وغیرہ

گنی۔ (اردو، گونی، تھیلا) ۱۷۱۱ء۔ اکونٹ آف ٹریڈ وتھ انڈیا از لاکیر۔
جاکونٹ (اردو، جگناتھی) ۱۷۶۹ء
ساری (ساڑی یا ساری) ۱۷۸۵ء

جانور اور پرند

ارگلا (ہندوستانی ہرگلا) ۱۷۵۴ء
سینا۔ ۱۷۶۹ء
مونال (مہنال؟) ۱۷۶۹ء
نکنا۔ (اردو، مکھنا، ہاتھی) ۱۷۸۰ء
چیتہ (اردو، چیتا) ۱۷۸۰ء

پودے وغیرہ

سن۔ (اردو۔ سن، پٹ سن) ۱۷۷۴ء
ٹٹی۔ (اردو، ٹٹی، بھوکی بنی ہوئی) ۱۷۹۲ء

کچھ استعمال کی چیزیں

آنہ۔ (اردو، آنہ، روپیہ کا سولھواں حصہ) ۱۷۲۷ء
ہودہ (اردو، ہودہ، ہاتھی پر باندھنے کا) ۱۷۷۴ء
بنیگل (اردو، ہنگڑی) ۱۷۸۷ء
بدری۔ (اردو، بدری دکن کے ضلع بیدر کی دھات کی کاریگری کا کام) ۱۷۹۷ء

ملک کے انتظامی حصے

مفصل (اردو، عربی، مفصل بمعنی کھلا ہوا۔ لیکن انگریزی میں شہر کے اطراف کے حصوں کے لیے) ۱۷۸۱ء
تالک، (اردو، عربی، تعلقہ) ۱۷۹۹ء

عمارت وغیرہ

داک (داکھ) ۱۷۲۷ء
گرّی۔ (اردو۔ گڑھی، قلعہ) ۱۷۸۲ء

متفرق

نلہ۔ (اردو، نالہ) ۱۷۷۶ء
جنگل۔ (اردو، جنگل) ۱۷۷۶ء
بخشش۔ (اردو، بخشش، لیکن انگریزی میں بہ معنی انعام) ۱۷۵۵ء
شامپو (اردو، چپو، چپی، بمعنی پیر وغیرہ کو آہستہ آہستہ دبانا) ۱۷۶۲ء

www.taemeernews.com

ناچ (اردو، ناچ) ۱۷۹۶ء

انیسویں صدی میں مستعار ہندوستانی لفظوں کی تعداد انگریزی میں بہت بڑھ گئی۔ اس کے کئی سبب تھے۔ اس زمانے میں انگریزی کے اکثر افسانوں کا موضوع ہندوستان اور ہندوستانی زندگی رہی۔ اس کے علاوہ سفرناموں اور یادداشتوں کے سلسلے میں بھی ہندوستان کی کئی چیزیں لکھی اور شایع کی گئیں۔ اس طرح پارچے کی چند قسموں، جانوروں اور پودوں اور ہندوستانی زندگی سے متعلق دوسری کئی چیزوں کے نام انگریزی میں داخل ہوئے۔ جیسے کیاشمیر۔ چٹنی۔ جم خانہ، ڈنگھی، لوٹ، نین سُک، پولو۔ پٹی۔ پیجامہ وغیرہ۔ تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

پیشے یا دھندے

سوار۔ ۱۸۰۲ء

ڈکائٹ۔ (اردو، ڈکیت) ۱۸۱۰ء

ٹھگ۔ (اردو، ٹھگ، دھوکا باز، چور) ۱۸۱۰ء

منصف۔ (اردو، عربی منصف، عدالت کا ایک عہدہ) ۱۸۱۲ء

چپراسی۔ (اردو، چپراسی) ۱۸۲۸ء

دھوبی، (اڈبلیو، ہرک، رسل کی کتاب (ڈائری ان انڈیا) ۱۸۶۰ء

چیلا۔ (ہندوستانی، چیلا) از سنٹ کی کتاب "ایوزک بدھیزم" ۱۸۸۳ء

پارچہ، لباس وغیرہ

پٹی۔ (اردو، پٹی، فوریا زخم پر باندھنے کی پٹی) ۱۸۰۰ء

نین سُک (اردو، نین سُکھ، نین = آنکھ + سکھ = آرام) ۱۸۰۴ء

کیاشمیر (اردو، کشمیر، ملک کا نام اور اون کا کپڑا) ۱۸۲۲ء

ٹوپی۔ (اردو، ٹاٹ) ۱۸۴۰ء

بندہ (اردو، بندہ) ۱۸۸۰ء

دھری (ہندوستانی، دری) ۱۸۸۰ء

پیجامہ (اردو، پائجامہ) ۱۸۸۶ء

جانوروں کے نام

گیزل (اردو، غزال) ۱۸۰۰ء

گور۔ (جانور) ۱۸۰۶ء

گوئیل۔ (اردو، گھڑیال) ۱۸۲۵ء

دھولے۔ (ہندوستانی جنگلی کتا) ۱۸۲۷ء

پانڈا (ہندوستانی۔ ہمالیہ کا ایک چھوٹا سا ریچھ جو بلی جیسا ہوتا ہے) ۱۸۳۵ء

مگر (اردو۔ مگر۔ مگر مچھ) ۱۸۴۷ء

ماہیر (ایک قسم کی مچھلی) ۱۸۵۴ء

مرکھور۔ (یہ لفظ پشتو سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی بکرا ہیں) ۱۸۶۷ء

کرائٹ (ایک مسالہ) ۱۸۷۳ء

پودے وغیرہ

سیستو۔ (ہندوستانی۔ سیسو۔ مشرقی ہندوستان کا ایک درخت) ۱۸۱۰ء

تون۔ (ہندوستانی۔ تن۔ ایک پیڑ) ۱۸۱۰ء

من جیٹ (ہندوستانی، جیٹھ) ۱۸۱۳ء

مدار (ہندوستانی۔ مدار۔ ایک پھول) ۱۸۱۹ء

دیودار۔ (ہندوستانی 'دیو دار' دیو+ دار، جس کے معنی ہیں مقدس پیڑ کے) ۱۸۴۲ء

گھریلو اشیاء

لوٹا (ہ) (اردو۔ لوٹا) ۱۸۱۹ء

چارپائی۔ ۱۸۴۵ء

ٹانگا۔ (اردو۔ تانگا) ۱۸۸۰ء

غذا وغیرہ

چپاتی (اردو، چپاتی) ۱۸۱۰ء

چٹنی۔ ۱۸۱۳ء (فوربس کی کتاب "اورنٹیل میموائرز")

فوجی ساز و سامان وغیرہ

تانا (اردو، تھانہ) ۱۸۰۳ء

کوکری۔ ککری، ایک تلوار) ۱۸۱۱ء

جنگل (ہندوستانی جنجل، ایک آتش بازی) ۱۸۱۸ء

تلوار۔ (اردو) ۱۸۳۴ء

متفرق

پچیسی (ایک کھیل) ۱۸۰۰ء

ضلع۔ (ملک کا ایک انتظامی حصہ) ۱۸۰۰ء

ڈھنگی (ہندوستانی) ۱۸۱۰ء

لوٹ۔ ۱۸۲۹ء

پائی (آنے کا بارھواں حصہ) ۱۸۵۹ء

جم خانہ (اردو، گیند خانہ۔ کھیل کا میدان) ۱۸۶۱ء

پگ ۔ (ہندوستانی نقش پا) ۱۸۶۵ء
تماشا ۔ (اردو تماشہ) ۱۸۶۲ء
پولو ۔ (ایک کھیل) ۱۸۶۲ء

اس میں شک نہیں کہ ان فہرستوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی ایک خاصی تعداد موجود ہے ۔ پھر بھی خالص فارسی لفظ جو اردو میں عام طور پر مستعمل ہیں ۔ وہ اردو کے توسط سے انگریزی میں پہنچے ہیں ۔ انگریزی کا فارسی سے براہِ راست تعلق نہیں رہا ۔ بلکہ جتنے لفظ انگریزی نے فارسی سے مستعار لیے وہ زیادہ تر علمی تعلق کی بنا پر آئے ہیں ۔ اس کے برخلاف اردو سے انگریزوں کا تعلق ایک زندہ اور بول چال کی اور روزمرہ زندگی کی زبان کی حیثیت سے کافی عرصے تک رہا ۔

ابتدائی دور میں کچھ فارسی لفظ یونانی اور لاطینی کے توسط سے بھی پہنچے تھے ۔ جیسے لیوپرڈ (فارسی پرد) ٹائیگر (قدیم فارسی تگرس) پیراڈائز (فارسی فردوس) ان کے علاوہ کچھ لفظ دوسری یورپی زبانوں، جیسے فرانسیسی وغیرہ کے توسط سے بھی انگریزی میں پہنچے ہیں ۔ کیونکہ فرانسیسی زبان کا تعلق فارسی سے ویسا ہی تھا جیسا کہ انگریزی کا اردو سے ۔ ایسے لفظوں میں شطرنج کی اصطلاحیں جیسے "روک" فارسی "رُخ" سے "چک" اور "چک میٹ" فارسی عربی اصطلاح "شاہ مات" (شاہ مرگیا) سے بنی ہے ۔ خود "چس" کا لفظ "شاہ" سے بنا ہوا سمجھا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ "آزور" (لاجورد) "سالامانڈر" (سمندر) "تفیٹہ" (تافتہ) "بوراکس" (بورہ) "آرسے نیک" (زرنیکا) "مسک" (مشک) "ممی" (مومیائی) "بلس" (ہیرے کی ایک قسم) (بدخشاں) "بی زور" (پادزہر، بادزہر، زہرباد وغیرہ، جس کے معنے دافع زہر کے ہیں) "اسپیناخ" (اسفاناخ) "جاسمن" (یاسمین) "جولپ" (ایک خوش ذائقہ مشروب، فارسی "گلاب") "گبور" (گبر) "جیاکال" (شغال) "تباشیر" (طباشیر) "کمر بند" "کاروان" "کارواں سرائے" "پلاؤ" "دینار" "کاربوائے" (قرابہ) "بلبل" "سیمرغ" وغیرہ جیسے لفظ بھی ہیں ۔

لیکن ذیل کے لفظ جو انگریزی میں بے تکلف استعمال ہوتے ہیں وہ ہندوستان میں اور اردو زبان سے لیے گئے ہیں ۔

فوجی سلسلے کے لفظوں میں "سیپائے" اور "سپاہی" دونوں روپ میں انگریزی میں ملتے ہیں ۔ اس کے علاوہ لشکر اور لشکر کے جوڑے مستعمل ہیں ۔ جن میں سے دونوں مختلف زمانوں میں لیے گئے ہیں اور معنوں میں بھی اختلاف ہے ۔ فوجی عہدے "حوالدار" "صوبہ دار" "جمعدار" وغیرہ ۔ انتظامی عہدوں اور حکومت کے سلسلے کے لفظوں میں "شاہ" "وزیر" "پیشوا" "دیوان" (بمعنی وزیر یہی لفظ کرہ ملاقات کے فرش بچھے ہوئے تخت کے معنوں میں ترکی سے لیا ہوا لفظ ہے) عام سماجی طبقوں سے تعلق رکھنے والے لفظوں میں "درویش" "مرزا" "خدمت گار" "پیشوا" وغیرہ کے لفظ ہیں ۔ پارچہ اور لباس سے تعلق رکھنے والے لفظوں میں "کم کاب" (کمخواب) "سیر شکر" (شیر شکر، ایک پارچہ) "شال" "پاپوش" کے الفاظ ہندوستان سے تعلق کے بعد، اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اردو ہی سے آئے ہیں ۔ "عطر" ۔ نارجیل (ناریل) "کس کس" (خشخاش) اور "کوہ نور" کے بارے میں میری سارجنٹ سن کا خیال ہے کہ وہ راست فارسی سے انگریزی میں آئے ہیں ۔ تاہم ان میں سے "عطر" اور "کوہ نور" کے بارے میں بھی زیادہ امکان اس کا ہے کہ یہ لفظ اردو کے توسط سے انگریزی میں پہنچے ۔

افکار ــــ تعلیم یافتہ اور باشعور گھرانوں کا پسندیدہ ماہنامہ

www.taemeernews.com

سید شبیر علی کاظمی

اردو زبان کے انگریزی پر اثرات

ایک زبان کا دوسری زبان پر براہ راست اس وقت اثر پڑتا ہے جب وہ آپس میں کسی حیثیت سے ملتی ہیں۔ ملنے کی دو حیثیتیں بہت اہم ہیں۔ اول کاروباری واسطہ اور دوم حاکمیت اور محکومیت کا رشتہ۔ ایک اور واسطہ تلاش علم بھی ہے جس کی خاطر زبانوں کے تراجم ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت آمدورفت کے تیز رفتار ذرائع اور سیر و تفریح کے رجحان نے زبانوں کو ایک دوسرے کے کافی قریب کر دیا ہے۔

اردو انگریزی بنیادی طور پر انڈو یورپین گروہ کی زبانوں سے متاثر ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کلاسیکی زبانوں کی ساخته و پرداخته ورناکولر ہیں۔ مگر ان دونوں زبانوں میں سامی گروہ کی زبان عربی کا رسوخ بھی خاصا پرانا ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ اشتراک دونوں میں اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے آیندہ لین دین کا راستہ ہموار ہوا ہے۔ عربی اور سنسکرت میں ایک بیّن فرق ہے۔ عربی زندہ اور سنسکرت مردہ زبان ہے۔ موت کے بعد رقابت مروّت میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ گزشتہ صدی کی لسانیاتی تحقیق میں سیاسی اور مذہبی مصلحت کے ساتھ اس مروت کا بھی اظہار کیا گیا ہے جرمنیک روٹ کی تھیوری ان خیالات کی پشت پناہ ہے۔

اردو اور انگریزی دونوں ورناکولر ہیں۔ ان میں دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ اور دونوں کے قواعد بھی مربوط و منضبط نہیں۔ انگریزی میں یونانی، لاطینی اور سنسکرت کے اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اردو میں سنسکرت، فارسی اور عربی کے اثرات عام ہیں۔ انگریزی زبان میں عربی عنصر کو اتنا منظر عام پر نہیں لایا گیا جتنا کہ اس کا حق ہے۔ انگریزی میں صدہا الفاظ عربی نسل کے موجود ہیں۔ ہم ان میں صرف چند وہ الفاظ ذیل کی فہرست میں پیش کرتے ہیں جو اردو انگریزی دونوں میں عام طور پر مستعمل ہیں اور پہلی نظر میں ایک مادہ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اردو اور انگریزی زبان کا یہ اہم اشتراک ہے۔

سنسکرت کے تت سم اور تدبھوا الفاظ کی بھی ایسی ہی فہرست تیار ہو سکتی تھی مگر طوالت کی خاطر یہاں حذف کی جاتی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جرمنیک روٹ محض مادوں کی خاطر زیر بحث آتے ہیں، وہ کبھی اپنی نجی حیثیت میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔

اردو اور انگریزی میں عربی الفاظ کا اشتراک بہت قدیم ہے۔ اس اشتراک کی تاریخی حیثیت کا تعین اور اس کا مفصل

بیان ہیں اپنے موضوع سے دور ہٹا دے گا۔ اس لیے ذیل میں ایسے الفاظ کی صرف فہرست پیش کرنا کافی ہے جو عام طور پر مشترک تصور کیے جاتے ہیں ——

اردو اور انگریزی میں عربی مشترک الفاظ کی فہرست

انٹیق	عتیق	بیل	بلا	کپ	کوب
اِنفیوز	نفوذ	ہیوگل	بوق	کلائم	اقلیم
ابزرد	البصر			کیمل	جمل
ارتھ	ارض	ڈاؤن	دون	کینڈل	قندیل
اِلّ	علیل	ڈل	ضَل		
ایبل	قابل	ڈیفائی	دفاع	گیس	قیاس
ایبیوز	عبث	جائنٹ	جنّات		
ایڈریس	اُدرس	جرُم	جرُم	لیڈ	ولید
ایجیلیٹی	عجلت			لیڈی	ولیدہ
ایز	عیش	رجل	رجل		
ایلی فینٹ	الفیل			مرثی	رثا
انڈیا	عندیہ	سیفرن	زعفران	مرچ	مرج
ایون	امن	شیپ	شبیہ		
		شیرف	شریف	فلیس	فلس
بائی	بیع			ہارس	فرس
بارک	ورق	کال	قال		
بس	بوس	کافن	کفن	وِہم	وہم

عربی الفاظ کے بعد فارسی الفاظ انڈو آریائی نسل کے واسطے سے مشترک ہیں۔ فارسی زبان کی تشکیل جس نہج پر ہوئی ہے وہ اہلِ علم پر روشن ہے مگر فارسی زبان نے اردو کو زیادہ اور انگریزی کو کم متاثر کیا ہے۔ مغلیہ دور میں پاک و ہند کی دفتری زبان فارسی تھی اور تجارتی و سفارتی تعلقات کی بنا پر باہمی لین دین ہوا۔ ایسے الفاظ کی مختصر فہرست بھی دی جاتی ہے جن کو تاریخ وار خالص اردو الفاظ کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ فارسی الفاظ کے ساتھ کچھ ترکی الفاظ بھی انگریزی میں داخل ہو گئے۔ مثلاً چق، اردو اور اردو وغیرہ ——

اردو یا ہندوستانی کے الفاظ عہد الیزبیتھ کے اختتام پر انگریزی میں داخل ہونے شروع ہو گئے تھے اور تجارتی اجناس کے ساتھ یہ بھی انگلستان کے گوداموں میں داخل ہو کر رفتہ رفتہ انگریزی زبان و ادب کا جزو بن گئے۔ ابتداً یہ ناخواندہ مہمان تھے مگر

www.taemeernews.com

سید شبیر علی کاظمی

سو سال کی مدت میں اپنا لیے گئے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں پاک و ہند میں انگریز افسروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے ضرورت کے تحت اردو الفاظ سیکھے جو ان کی زندگی میں رچ بس گئے اور ان کی واپسی پر انگلستان میں زبان زد ہوئے اور اس طرح جزو زبان ہو گئے۔ ایسے الفاظ کی تعداد کافی ہے۔ ادھر انگریز سیاحوں، مشنریوں کی تصانیف میں بھی انھیں جگہ مل گئی۔ ہیسٹنگ کے مشہور زمانہ مقدمے میں بھی اردو کے الفاظ استعمال ہوئے۔ انگریزی اخباروں کے توسل سے بھی اردو الفاظ داخل زبان ہوئے۔ انگلستان کے اخباری رپورٹروں نے بھی اردو الفاظ کا ضرورتاً استعمال کیا۔ یہ تمام الفاظ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں آج بھی ملتے ہیں۔ ابتداءً تجارتی الفاظ، مثلاً چھینٹ، ململ، کیلیکو وغیرہ پہنچے۔ پھر تاڑی، چرٹ، لوٹ۔ نواب۔ تپائی۔ سپاہی کوڑی وغیرہ سے انگریز کان مانوس ہوئے۔ اسی طرح جٹا۔ پکا۔ چوری۔ بابو اور رہادت داخل ہو کر جزو زبان بن گئے۔

انگریز تاجروں کی آمد سے قبل پرتگالی تاجر اور مشنری پاک و ہند میں اپنا اپنا کاروبار کرتے تھے اور ہندوستان کے ساحلوں پر پرتگالی آمیز اردو ورناکیولر وجود میں آ گئی تھی۔ اس ورناکیولر اردو کا آغاز سنہ ۱۵۰۰ء سے ہوتا ہے۔ انگریز جب یہاں پہنچے تو ان کا تجارتی اور مشنری میدان میں پرتگالیوں سے مقابلہ ہوا۔ اس پرتگالی آمیز اردو کے بھی بہت سے الفاظ انگریزی میں داخل ہو گئے مثلاً پادری، مستری، الماری، آیا، کوبرا، پھفرٹ، کوپرا وغیرہ۔ اُس وقت انگریز تاجر تھے اور نسبتاً زیادہ ضرورت مند۔ اس لیے انھوں نے پاک و ہند کی ورناکیولر اردو سے اپنے کام کے الفاظ اپنا لیے۔ بعد میں وہ الفاظ ان کی زبان کا جزو لاینفک بن گئے۔ مگر جب انگریز راج کا آغاز ہوا تو الٹی گنگا بہنے لگی۔ پھر بھی انگریزوں کے ہوٹلوں اور میسوں میں ایسی انگریزی سنی جاتی رہی جس میں اردو الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ مندرجہ ذیل جملہ اس امر کا بین ثبوت ہے۔

The old *Bukhshi* is an awful *Bahadur*

but he keeps a first rate *bobachee*

اینگلو انڈین انگریزی اور اردو دونوں اپنی نوعیت میں دو مختلف زبانیں ہیں۔ کرنل یول نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ہابسن جابسن (حسن حسین) میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اینگلو انڈین زبان نے معیاری انگریزی کو بھی متاثر کیا ہے۔ بعض تشبیہات اور تلمیحات اس میں اسی ذریعے سے پہنچی ہیں۔ بعض مصادر بھی اردو مصادر سے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً ٹو لنگاؤ، ٹو پکڑاؤ، ٹو سمجھاؤ، ٹو دمکاؤ وغیرہ۔ یہ اگرچہ ادبی زبان نہیں۔ مگر بول چال میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔

انگریزی میں اردو کے توسل سے بعض چینی الفاظ بھی اضافہ ہوئے۔ مثلاً لوکاٹ اور لیچی جو چینی زبان سے آئے تھے۔ اردو سے انگریزی میں داخل ہوئے۔ ادھر انگریزی نے اردو کے ماحول میں جو چند الفاظ بنائے ہیں وہ بھی اردو ہی کی دین ہیں۔ مثلاً ٹفن، فرلو، پِشں پاش اور گارڈن ہاؤس وغیرہ۔

علمی سطح پر بھی کبھار اردو الفاظ انگریزی میں داخل ہوئے۔ علم نباتات سے متعلق چند الفاظ سنہ ۱۸۰۰ء میں مستند تسلیم کر لیے گئے۔ ادھر جہازرانی کی چند اصطلاحات جو اردو ورناکیولر کی تھیں انگریزی میں رائج ہو گئیں مثلاً ٹنڈل، ہاراکاٹی اور کرانی وغیرہ۔

زبانوں کا باہمی لین دین اور الفاظ کی آمیزش کس طرح ہوتی رہتی ہے یہ ایک نہایت دلچسپ اور وسیع موضوع ہے۔ انگریزی زبان اپنی قوت انجذاب کے لیے مشہور ہے۔ اردو زبان میں بھی یہ خوبی موجود ہے۔ چنانچہ جب انگریز بحیثیت تاجر ہندوستان آئے تو انھوں نے اردو کے بے شمار الفاظ کو انگریزی میں داخل کر دیا۔ لیکن جب وہ حکمراں بنے تو انھوں نے اردو کے الفاظ لینا چھوڑ دیا اور

www.taemeernews.com

انگریزی کے الفاظ اردو میں شامل کر دیے اور یوں دونوں زبانوں میں ربط و تعلق قایم رہا۔ اس مختصر سے مضمون میں ہمیں اردو زبان کے اثرات کو انگریزی زبان پر ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس لیے بالواسطہ اور بلاواسطہ اشتراک اور دونوں قسم کے اثرات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وضاحت کے لیے ایسے الفاظ کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے جو اردو زبان سے انگریزی میں پہنچے ہیں اور ان الفاظ کے سامنے تاریخ بھی درج کر دی ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جب لفظ انگریزی زبان میں داخل ہوا۔ اس ضمن میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ انگریزی زبان و ادب میں اردو الفاظ کا استعمال دیکھنے کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں مطالعہ کی جا سکتی ہیں جو اردو داں انگریزی ادیبوں کی تصانیف کے علاوہ ہیں۔ ورنہ بعض انگریزی کتابوں میں جو پاک و ہند کے مصنفین کی تصانیف ہیں۔ بہت سے اردو الفاظ مل سکتے ہیں جو مستند ہیں اور آکسفورڈ انگلش لغت میں درج ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

(۱) وینٹی فیر — مصنفہ ڈبلو۔ ایم۔ تھیکرے

(۲) ماؤغلی ٹیلس — مصنفہ رڈیارڈ کپلنگ

(۳) مین ایڈرس آف کمایوں — مصنفہ ولیم کاربیٹ

اردو زبان کی اہمیت سے انگریز نے کبھی انکار نہیں کیا اور اسے حسب ضرورت اپنے تجارتی، انتظامی اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے حتیٰ کہ جنگی مقاصد کے حصول میں بھی اردو زبان بیرون پاک و ہند (جنگ کوریا میں) انگریزوں کی معاون رہی ہے۔ اس لیے انگریزی زبان کو اپنے مزاج اور رواج کے مطابق اردو الفاظ کو اختیار کرنے میں گریز نہیں ہوا۔ جہاں تک اردو ادب کے انگریزی ادب پر اثرات کا تعلق ہے ہم ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری میں غالب کے کلام کے اثرات کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔

انگریزوں کی اکثریت نے اردو کو ضرورتاً حاصل کیا تھا مگر بعض نے شوقیہ اپنایا تھا۔ ہندوستان میں ان کی اردو صلاحیت کا امتحان مختلف درجات کے ذریعہ ہوتا تھا جو لور، ہائر، پروفیشنی کہلاتے تھے۔ انگلستان میں انیسویں صدی میں اردو تعلیم کی مشہور درس گاہیں مندرجہ ذیل تھیں :۔

(۱) یونی ورسٹی کالج لندن
(۲) ہیل بری کالج لندن
(۳) چیلٹنہم کالج
(۴) آکسفورڈ یونی ورسٹی کالج
(۵) کیمبرج یونی ورسٹی کالج
(۶) کنگز کالج — لندن
(۷) جیتھم کالج وغیرہ

ان اداروں کے ماحول میں اردو زبان رچی بسی تھی اور وہاں کی انگریزی کے لیے قطعاً غیر نہ تھی۔

مثال کے طور پر آیندہ صفحات میں کچھ مشترک الفاظ کی فہرست دی جاتی ہے جو یقیناً مکمل نہیں، بلکہ مشتے از خروارے کے مصداق ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق اردو انگریزی میں دو ہزار سے زاید مشترک الفاظ موجود ہیں جو اردو کے واسطے سے انگریزی میں پہنچے ہیں۔

سولھویں صدی عیسوی

آنا ———— ۱۶۰۰ء
کری ———— ۱۵۹۸ء
یا سمین ———— ۱۶۰۰ء
کوتوال ———— ۱۵۸۲ء
دیوان ———— ۱۵۸۶ء

www.taemeernews.com

من ———— سنہ ۱۵۸۴ء

سلطان ———— سنہ ۱۵۵۵ء

سلطانہ ———— سنہ ۱۵۸۵ء

مغل ———— سنہ ۱۵۸۸ء

موذن ———— سنہ ۱۰۸۵ء

سترھویں صدی عیسوی

شربت ———— سنہ ۱۶۱۳ء

بنگلہ ———— سنہ ۱۶۷۶ء

پکا ———— سنہ ۱۶۹۸ء

پالکی ———— سنہ ۱۶۷۸ء

شکار ———— سنہ ۱۶۱۳ء

چھینٹ ———— سنہ ۱۶۱۴ء

صاحب ———— سنہ ۱۶۲۷ء

بیگم ———— سنہ ۱۶۳۴ء

ململ ———— سنہ ۱۶۱۹ء

پگڑی ———— سنہ ۱۶۶۰ء

کباب ———— سنہ ۱۶۹۸ء

پلاؤ ———— سنہ ۱۶۱۳ء

حوالدار ———— سنہ ۱۶۹۸ء

منشی ———— سنہ ۱۶۲۲ء

مُلّا ———— سنہ ۱۶۱۳ء

مولوی ———— سنہ ۱۶۲۵ء

مدرسہ ———— سنہ ۱۶۳۰ء

محل ———— سنہ ۱۶۲۵ء

مہاراج ———— سنہ ۱۶۹۸ء

مہاوت ———— سنہ ۱۶۶۲ء

میدان ———— سنہ ۱۶۲۵ء

خانساماں ———— سنہ ۱۶۴۳ء

قاضی ———— سنہ ۱۶۲۵ء

اٹھارھویں صدی عیسوی

قبلہ ———— سنہ ۱۷۰۴ء

کحل ———— سنہ ۱۷۹۹ء

شیعت ———— سنہ ۱۷۲۸ء

خالصہ ———— سنہ ۱۷۷۶ء

صوفہ ———— سنہ ۱۷۰۲ء

گڑھی ———— سنہ ۱۷۸۴ء

جمعدار ———— سنہ ۱۷۶۳ء

پاجامہ ———— سنہ ۱۸۰۰ء

جامہ ———— سنہ ۱۷۷۶ء

جنگل ———— سنہ ۱۷۷۶ء

جنگلی ———— سنہ ۱۸۰۰ء

پردہ ———— سنہ ۱۸۰۰ء

موپلہ ———— سنہ ۱۷۸۷ء

ستی ———— سنہ ۱۷۹۰ء

مفصل ———— سنہ ۱۷۸۱ء

خطبہ ———— سنہ ۱۸۰۰ء

انیسویں صدی عیسوی

آل (جڑ) ———— سنہ ۱۸۷۵ء

بندوق ———— سنہ ۱۸۸۶ء

مفتی ———— سنہ ۱۸۷۵ء

برقع ———— سنہ ۱۸۲۳ء

چٹنی ———— سنہ ۱۸۱۳ء

میم صاحب ———— سنہ ۱۸۵۷ء

کوہ نور ———— سنہ ۱۸۴۹ء

شکاری ———— سنہ ۱۸۲۷ء

تانگہ ———— سنہ ۱۸۷۴ء

www.taemeernews.com

جامدانی ——— سنہ ۱۸۵۸ء

ٹوپی ——— سنہ ۱۸۲۶ء

کشمیرا ——— سنہ ۱۸۳۰ء

بدمعاش ——— سنہ ۱۸۴۳ء

سلطنت ——— سنہ ۱۸۶۹ء

گگڑی ——— سنہ ۱۸۱۱ء

منصف ——— سنہ ۱۸۱۲ء

مدرسہ ——— سنہ ۱۸۶۳ء

مہاتما ——— سنہ ۱۸۸۴ء

کرمسا ——— سنہ ۱۸۲۸ء

خس ——— سنہ ۱۸۱۰ء

کھڈ ——— سنہ ۱۸۳۷ء

خاکی ——— سنہ ۱۸۵۷ء

الماری ——— سنہ ۱۸۷۸ء

دیگر الفاظ

آیا

پستہ

گھوڑا

گھوڑا گاڑی

میز

کوتل

گرد

حلوہ

جام

جودھپوری

دری

کافر

قیصر

صوبیدار

رسالدار

ہنک

خان

خلیفہ

چپاتی

ایکڑ

بھنگ وغیرہم۔

ممتاز شاعر ——— **نقاش کاظمی**

کا پہلا شعری مجموعہ

چاندنی اور سمندر

دوسرا مجموعۂ کلام

رُخِ سیلاب

(زیر طبع)

www.taemeernews.com

عبدالماجد دریاآبادی

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

افسر صدیقی

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

شفقت رضوی

محمد علی صدّیقی

ڈاکٹر شمیم حنفی

تحقیق
تنقید

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

عبدالماجد دریابادی

اردو کے چند انگریز شاعر

جانِ عالم ترے انداز نے مارا مجھ کو
بے ترے اب تو نہیں زیست گوارا مجھ کو
زلفیں جھک جھک کے یہ کہتی ہیں کسی کو پھانسوں
ابرواس شوخ کے کرتے ہیں اشارا مجھ کو

مطلع کیسا ہے اور شعر کس درجہ کا ہے، ان سوالات کو تو تہہ کر رکھیے۔ پہلے یہ پوچھیے، کہ کلام ہے کس کا ؟ ــــ ہوگا لکھنوی رنگ کے کسی ادنیٰ درجہ کے شاعر کا۔ جی نہیں، کلام ایک "صاحب بہادر" کا ہے۔ خاص الخاص یوریپن کا! اور یوروپین بھی کون؟ آئی۔سی۔ایس! صوبہ کے ایک کلکٹر اور بعد کو ہو جانے والے کمشنر، ڈاکٹر ولیم ہوئی کا! اور کمشنر بھی آج سے پچھتر سال قبل کے جب ہندوستان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا "صاحب" بھی رعایا کی نظر میں "لاٹ صاحب" ہی تھا! حیرت عجب در عجب! تو کیا "صاحب" نے بھی کبھی ہم غریبوں کی زبان میں کچھ شعر کہے ہیں؟ جی ہاں کہے ہیں اور اسی رنگ و طرز کے کہے ہیں۔ ایک آدھ اور سنیے :

کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں
کسی کی بات سے ہرگز کچھ انتشار نہیں
مرے سینے تو محبت کٹھن ہے مشکل ہے
مجھے ملے وہ سمندر جو بے کنار نہیں

یہ دو شعر مسٹر آر۔پی۔ڈیوہرسٹ کے ہیں۔ ان ڈیوہرسٹ صاحب کو جاننے والے ابھی بہت سے اس صوبے میں زندہ سلامت ہوں گے۔ آناؤ رائے بریلی وغیرہ میں کلکٹر اور گونڈہ و بہرائچ میں سشن جج تھے۔ اور اسے کوئی بہت زمانہ نہیں ہوا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں تو پنشن پر گئے ہیں، اور جا کر آکسفورڈ میں اردو زبان کے استاد بن گئے۔ مبلغ علم کچھ یوں ہی سا تھا۔ زعم و پندار کے مرض میں البتہ مبتلا تھے۔ دو چھپے ہوئے شعراد پر درج ہوئے ایک غزل اور بھی کہی ہے۔ اس کے اشعار اس سے زیادہ بے تکے، لغو، مہمل! بعض مصرعوں کا وزن تک درست نہیں۔ آکسفورڈ کے اردو طلبہ خدا معلوم کیا کہہ کر اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔

خیر یہ تو کلکٹری، کمشنری، ججی والے لوگ تھے۔ فن کی خامیاں ان میں جتنی بھی ملیں، کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ ایک صاحب خاص علم و زبان کے ماہر پروفیسر ایڈورڈ پامر ہوئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ عربی کے منتہی عالم تھے اور خود کیمبرج میں عربی زبان ہی کے

www.taemeernews.com

استاد تھے۔ قرآن مجید کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا ہے، اردو کی طرف بھی توجہ فرمائی اور اپنے زمانے کے مشہور اردو روزنامہ "اودھ اخبار" (لکھنؤ) میں مضمون نگاری کی۔ ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔ ایک ہلکی سی جھلک ان کے اردو کلام کی ملاحظہ ہو ــــــ

جاں لب پہ آن پہنچی دل دار گھر نہ آیا
ہم جا چکے جہاں سے پر وہ ادھر نہ آیا

تب تک نہ باز آیا رونے سے دل ہمارا
آنسو کے ساتھ جب تک خونِ جگر نہ آیا

بیتابیوں سے عاشق لاکھوں مرے گلی میں
لیکن وہ حور پیشہ بیرونِ در نہ آیا

اس چشمِ خوں فشاں سے کس دم لہو نہ برسا
سیلاب خون ہمدم کب تا کمر نہ آیا

پامر سا اک نصارا تھا بے گناہ مارا
اے بت خدا کا تجھ کو ذرہ بھی ڈر نہ آیا

فغاں اس درپہ تک تو اے دلِ رنجور مت کیجو
بتوں کے شہر میں عاشق مجھے مشہور مت کیجو

قسم ہے تجھ کو اپنے دین و ایمان کی اے محرم[1]
ہماری ان کی صحبت کا کبھی مذکور مت کیجو

ہزاروں آئینے تو توڑ نا پتھر سے اے ظالم
پر اک سنگِ جفا سے شیشۂ دل چور مت کیجو

متروک لفظوں اور ترکیبوں سے، اور پہلی غزل کے غلط در غلط مقطع سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو یہ نمونہ کلام کا کچھ ایسا برا نہیں، خاص کر یہ آخری شعر (ہزاروں آئینے والا) تو خاص ہندوستانی سانچے میں ڈھلا ڈھلا یا معلوم ہو رہا ہے[2]

بعض "صاحب" لوگوں نے ہندوستان کو اپنا وطن ہی بنا لیا تھا۔ یہیں کی بول چال، یہیں کا دھندا سندھا، یہیں کا پہننا اوڑھنا، یہیں کا مرنا جینا۔ انہوں نے جو شعر کہے ہیں۔ اور بعض ان میں کے غزل در غزل کہہ کر انگلی میں لہو لگا کر شہیدوں میں جا شامل ہو جانے والے نہیں، بلکہ مستقل باقاعدہ صاحب دیوان و کلیات شاعر ہوئے ہیں۔ اور بعض کے دیوان بھی ایک ایک سے زاید ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھیے، تو سر اسر نظر آئے کہ سامنے مصحفی یا امیر، ناسخ یا آتش، داغ، یا امیر کے کسی شاگرد رشید کی بیاض کھلی ہوئی ہے۔ اور کسی نے تو یہ کمال کیا ہے کہ تلمیحیں بھی سر بسر مسلمان شعرا کے ہاں سے لے لی ہیں۔ وہی حمد، وہی نعت، وہی منقبت، وہی مناجاتیں غرض شاعر کا مذہب جو کچھ بھی ہو شاعری تو ہو بہو مسلمانوں ہی کی تہذیب و معاشرت (کلچر) کی کلمہ گو!

دس بیس شعر اس رنگ کے ملاحظہ میں لے آئیے۔ اناج کے ڈھیر سے آخر بانگی ہی کے کچھ دانوں سے اندازہ کل کا کر لیا جاتا ہے

مرا دیواں ہے مشرق آفتاب حمد یزداں کا
طلوع صبح معنی ہے ہر اک مصراع دیواں کا

غیر سے فیصلہ طلب ہے وہ
ہم سے کوئی معاملہ نہ ہوا

دل کو بس خاک میں ملا دیتا
ہائے افسوس دو سرا نہ ہوا

حسرتیں کیسی ہیں اے دل
حیف بندہ ہوا خدا نہ ہوا

---

[1] شاعر نے غالباً یوں کہا ہوگا "قسم ہے تجھ کو اپنے دین و ایمان کی، تو اے محرم" کاتب سے "تو" چھوٹ گیا۔

[2] شاعر کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگلوں کی پیروی کرتا ہے بس یہ متروک لفظوں اور ترکیبوں کا قضیہ اٹھایا ہے۔

www.taemeernews.com

پہچان لیں گے ہم تو تمھیں چال ڈھال سے　　ناحق ہی تم نے شکل چھپائی نقاب میں
روئے سپید کو وہ کریں گے سیاہ پھر　　لو آج شیخ بیٹھے ہیں قصد خضاب میں
پارہ کریں سب اپنے گنہ کے تمسکات　　ہووے گا حشر ختم مرے ہی حساب میں

یہ سلیمان شکوہ گارڈنر، فنا " تھے۔ اب ذرا مضطر الہ آبادی کی بھی کچھ سُن لیجیے اور یہ پہلے ہی سے سُن رکھیے کہ نام نامی۔ جیمس ڈیوڈروز ہے۔ یہ " مضطر " صرف شاعری ہی کی دنیا میں ہیں ؎

بستے ہیں اس میں غم و درد و الم　　دل کی بستی بھی عظیم آباد ہے
فرق ہے، مضطر، امیر و داغ میں　　ایک شاعر ہے تو اک استاد ہے

ایک غزل میں مسلسل ایک ہی مصرعہ پر جیں مصرعے لگاتے چلے ہیں ؎

دل کو تسکین مگر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
مرنے جینے کی اے شب فرقت　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
زاہد و کیا دھرا ہے کعبے میں　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
تیری سی مہ لقا حسینوں میں　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

یہ تو چار ہی شعر نقل ہوئے اصل دیوان میں گیارہ سے کم نہیں ہیں۔ صاحب لوگوں کی کوئی بزم میم صاحب کے وجود سے خالی نہیں ہوتی۔ پھر بزم سخن میں یہ کیوں نہ ہوتیں۔ ایک مس صاحبہ کی جھلک اسی دریچہ سے دیکھتے چلیے! اصل نام اسیلن کرسچانہ گارڈنر ہے۔ شاعری کی دنیا میں " رقیہ بیگم " کے برقع میں تشریف لاتی ہیں اور شاید اسی برقع کی لاج ہے یا کیا کہ کلام میں رندی و شوخی کی جگہ بڑی متانت و ثقاہت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی صوفی صاحب معرفت سے " دست بیع " ہو چکی ہیں ؎

خودی نے مجھ پہ کیا ہے ستم، خدا کی قسم　　جو بے خودی ہے تو پھر کس کا غم خدا کی قسم
یہ غیب غیب ہے کہتے ہیں لوگ جس کو شہود　　شہود ہی ہے عدم کا عدم خدا کی قسم
جو ہونے کا ہے نہ ہونا، وہی تو ہے عقبیٰ　　نہ ہونے کا ہے نہ ہونا عدم خدا کی قسم
مزے جو دل نے دکھائے وہ دل ہی جانتا ہے　　نہیں ہے دل یہ مگر جام جم خدا کی قسم

انگریزی کی " ہسٹری آف اردو لٹریچر " اور اس کے اردو ترجمہ " تاریخ ادب اردو " سے آج پڑھے لکھوں میں کون ناواقف ہے؟ اسی کے زندہ دل۔ جواں قلم مصنف رائے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب (ڈاکٹر آف لٹریچر بھی تھے) پر ایک نئی ترنگ سوار ہوئی۔ اردو میں جتنے فرنگیوں نے کبھی اور کہیں کچھ کہا سنا تھا، ان سب کا کلام جمع کرنے بیٹھے اور خدا جانے کہاں کہاں سے ریزے اور دانے چن چن کر ایک پورا خرمن اور انبار لگا دیا۔ جوئندہ یابندہ اسی کو کہتے ہیں۔ کہنے کو کلکٹر تھے۔ لیکن دھن کے پکے اور شوق کے سچے۔ دفتری مسلوں اور کچہری کی فائلوں کے ہجوم میں شاعری کے " دیوان خانوں " کی بھی لیتے رہے۔ کیا جانے کتنے کلیات اور تذکرے کتنی بیاضیں اور رائٹ بکیں چھان ڈالیں، اور انجام کار ایک لمبی چوڑی موٹی تازی کتاب صدہا صفحوں کی ضخامت کی تیار کر دی۔ کوئی سوا تین سو صفحے تو انگریزی ہی اصل کتاب کے ہیں، اور کوئی ساڑھے چار سو سے اوپر منتخب کلام کے مجموعہ کے! ــــ اور آپ کے سامنے جو حقیر سا گلدستہ کلیوں اور پھولوں کا بعض خوشبودار اور بعض صرف خوش رنگ پھولوں کا پیش ہوا، وہ سب اسی چمن سے تیار کیا ہوا ہے۔

www.taemeernews.com

یہ تو نہیں کہ ڈاکٹر رام بابو اس میدان کے سب سے ہی پہلے شہسوار ہیں۔ نہیں، اور لوگ بھی کچھ نہ کچھ اپنی بساط کے لایق اس موضوع پر لکھ ہی چکے ہیں۔ لیکن اتنی داد تحقیق دینا انھیں کا کام تھا۔ دوسرے آئے اور ایک سرسری، تفریحی نظر کرتے چلے گئے۔ اتنی گہرائیوں میں اترنا اور اتنی شرح وبسط اور جامعیت کے ساتھ سارے موضوع کو اپنی گرفت میں لے آنا یہ بس انھیں کا حصہ تھا۔

تذکرہ محض فرنگیوں (بہ صیغہ مذکور) تک محدود نہیں۔ لپیٹ میں فرنگنیں (بہ صیغہ مؤنث) بھی آ گئی ہیں اور خود لفظ فرنگی کا اطلاق بہت ہی وسیع ہے۔ آرمینیا، برطانیہ اور دوسرے خاص یورپی ملکوں کے شاعر تو خیر اس میں شامل ہی ہیں، باقی ہندوستان میں پلے اور بڑھے ہیں یا ہندوستانیوں سے میل کھاتے ہوئے بیسیوں شاعر، جرمنی، فرانس، برطانیہ، اٹلی، پرتگال وغیرہ کے بھی ہوئے ہیں۔ ان سب کو اس حلقہ میں جگہ مل گئی ہے — کتاب اصلاً اردو شاعروں پر ہے۔ لیکن اردو فارسی میں بیگانگی کیسی، چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سکسینہ صاحب بھی اس رشتے کو بھولے نہیں ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کی بھی پیوندکاری کرتے چلے گئے ہیں۔ اس حسن صنعت کے ساتھ کہ طبیعت پر بار نہیں پڑتا کچھ تنوع کی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

مصنف صاحب نرے ناقل یا جامع نہیں کہ پڑھا تو بہت سا ہو اور سوچا کچھ بھی نہ ہو۔ وہ آنکھ کے ساتھ دماغ بھی رکھتے تھے۔ کلام کو چن لینے اور جمع کر دینے ہی کا سلیقہ نہیں رکھتے، موقع محل دیکھ جچی تلی رائے بھی پیش کرتے جاتے ہیں۔ انگریزی خواں اور انگریزی نویس ہندوستانیوں کی زبان جس جس طرح بگڑی گئی، اور "بابو انگلش" پر جو تمسخر کے قہقہے حقارت کے ٹھٹھے لگائے گئے، ان کی گونج شاید آج بھی "اسٹیشن کلب" کے در و دیوار سے آ رہی ہے۔ مصنف اس سے بے خبر نہیں۔ ان کا احساس بھی مردہ نہیں۔ لیکن وہ مشرقی شرافت سے کام لینا بھی خوب جانتے ہیں۔ اینٹ کا جواب اینٹ سے نہیں دیتے، اور پتھر کے مقابلہ میں پتھر نہیں مارتے۔ "صاحب" کی زبان و محاورے کی نشست، الفاظ کی فاش اور مضحکہ خیز غلطیاں دیکھتے ہیں، اور زیر لب مسکرا کر ہلکا سا اشارہ کر کے گذر جاتے ہیں۔ لیکن اتنا بھی بس کہیں کہیں ہے ورنہ عام طور پر تو وہ ان کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی ہی کرتے جاتے ہیں۔ شاعری اور شاعروں کی کتاب میں داد بھی شاعرانہ مبالغہ کی حد تک پہنچا دی جائے۔ تو یہ عین آداب مشاعرے کی پابندی ہوئی!

پاکستان کا واحد ادبی ماہنامہ

افکار

جو گزشتہ ۳۶ سال سے مسلسل شایع ہو رہا ہے — جس کے خاص اور عام شمارے یونیورسٹیوں، کالجوں اور ہائی اسکولوں میں حوالہ کا کام دیتے ہیں — جو صاحبان علم کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ہر ماہ غیر مطبوعہ اور منفرد تخلیقات پیش کرتا ہے، جس کا پاکستان اور بیرونی ملکوں میں ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے —

— گھر کے ہر فرد کے لیے — ایک معیاری ماہنامہ —

نئے سالانہ ممبر — خاص اشاعتیں رعایتی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں —

www.taemeernews.com

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بنگال کے انگریز مصنّفین اردو

ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں انگریزوں نے اُردو زبان و ادب سے خاص دلچسپی لی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اردو اس عہد میں تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی اور انگریزی زبان ہندوستان میں ارتقا کی ابتدائی منزل میں تھی۔ عدالت اور دفاتر میں فارسی یا اردو زبان رائج تھی۔ امیر اور رئیس فارسی کے بعد اردو زبان کی قدر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اُردو تعلیم کا انتظام کیا اور سول سروس کے لیے انگریز اس ہندوستانی زبان کو سیکھنا ضروری سمجھتے رہے، حالانکہ اردو کا یہ سنہرا دور دیرپا ثابت نہ ہوا اور انگریزی زبان دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گئی اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں انگریزوں کو اپنا کام چلانے کے قابل انگریزی جاننے والے ہندوستانی ملنے لگے اور انگریزی نے رفتہ رفتہ اردو کو ہٹا کر اپنی جگہ بنالی۔ لیکن کم و بیش ایک صدی کے عرصے میں اُردو ادب میں کئی یوروپین شعرا اور ادباء کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اُردو زبان میں وہ چاشنی، مٹھاس اور قوت تھی اور ہے کہ وہ سات سمندر سے آئے ہوئے پردیسیوں کے دلوں میں بھی اپنی جگہ بنا سکی۔ اس مضمون میں چند ایسے انگریزوں اور اُن کی تصنیفات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق سرزمین بنگالہ سے رہا ہے۔ ان میں سے آپ چند ایسے اصحاب کا نام اور ان کے کارنامے پائیں گے جن کا اردو ادب میں کہیں اور ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

پیٹر برٹن :

اردو کی خدمت جن انگریزوں نے کی ہے ان میں پیٹر برٹن شخصیت اور خدمات کے لحاظ سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر پیٹر برٹن کا نام مجھے سب سے پہلے بنگلہ زبان کے اولین ہفتہ وار اخبار 'سماچار درپن' میں ملا ہے جو سیرام پور سے شایع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے ۱۰ اگست ۱۸۲۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر موصوف کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ آپ ایک لائق ڈاکٹر تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اکتوبر ۱۸۲۴ء میں دیسی طالب علموں کو دیسی زبانوں میں طبّی تعلیم دینے کے لیے کلکتہ میڈیکل کالج کا ایک شعبہ بنام نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ قایم کیا تھا۔ اس شعبے میں انگریزی کی بجائے اردو اور ہندی میں میڈیکل تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کے قیام کے بعد ڈاکٹر پیٹر برٹن اس شعبے کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ آپ انگریزی کے علاوہ سنسکرت، عربی، فارسی، لاطینی، بنگلہ، اُردو اور ہندی سے بخوبی واقف تھے۔ آپ نے کالج کے طلبہ کے لیے اُردو میں بہت سی طبّی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے ذیل کی اُردو کتابیں اور تقریباً اسی قدر ہندی کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ اُن کی یہ تصانیف ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیتھو پریس سے چھپ کر شایع ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کی کتابوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ علم تشریح : اس کے صفحات ۱۲ ہیں۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔ علم تشریح کی تشریح کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

www.taemeernews.com

"جاننا علم تشریح کا مانند گھڑی کی بناوٹ کے جاننے کے ہے۔ یعنی جب تک ہر ایک پرزہ کہ جس سے گھڑی بنی ہوئی ہے، جداجدا نہ ہووے اور نہ آزمایا جاوے، تب تک کسی کو معلوم نہ ہووے کہ گھڑی آپ سے چلتی ہے۔ چنانچہ جب تک طالب علم طبابت دریافت نہ کرے کہ آدمی کا جسم کس طور پر بنا ہوا ہے اور ہر ایک شے کہ جس سے سارا بدن بنا ہوا ہے علٰحدہ اور ٹھیک چیرچاڑ یعنی امتحان نہ کرے تب تلک اس طالب علم کو کچھ ظاہر نہ ہوگا کہ آدمی کی جان اور تمام بدن کی حرکت اور مرض کس طور سے ہوتا ہے۔"

اس کتاب پر سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

۲۔ رسالہ بیان ویکسی نیشن: یعنی گوتھن سیتلا کا بیان۔ اس رسالے کے صفحات صرف ۱۷ ہیں۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

۳۔ بیان تپ نوبت کا: اس کتابچے کے صفحات ۱۷ ہیں۔ تپ کو مختلف زبانوں میں کیا کہتے ہیں مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

"انٹرمیٹنٹ فیور یعنی فی النوبۃ کو فارسی میں تپ نوبت، ہندی میں باری کی تپ۔ اور سنسکرت میں اکانتر کہلاتی ہے۔ ہندوستان میں بیشتر ہوا کرتی ہے۔"

اس کتاب پر بھی سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

۴۔ رسالہ ہیضے کا بیان: اس کتابچے میں ۱۸۱۷ء میں صوبۂ بنگالہ اور بہار میں جو ہیضہ پھیلا تھا، اس کا مختصر ذکر کرنے کے بعد مسٹر پیٹر برٹن نے ہیضے کے علاج کے سلسلے میں لکھا ہے۔ اس کے صفحات ۲۳ ہیں۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

۵۔ بات (کذا) کے مرض کی ماہیت اور علامات اور اقسام اور معالجات: اس کتاب کے صفحات ۱۳ ہیں۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

۶۔ بیان ہائیڈروسیل کا: یہ کتابچہ باتصویر ہے اور تصاویر کے علاوہ دیگر صفحات ۵۳ ہیں۔ اس کتاب کا ہندی ایڈیشن بھی میری نظروں سے گزرا ہے۔ کسی ایڈیشن پر سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

۷۔ بیان موتیا بند کا: تصاویر کے علاوہ ۱۳ صفحات ہیں۔ سنہ طباعت معلوم نہیں۔

۸۔ بیان سانپ کے بکھ کا: یہ کتاب بھی باتصویر ہے۔ صفحات ۲۷ ہیں۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

۹۔ پیٹ کے اندر کی چیزوں کا بیان: صفحات صرف ۱۰ ہیں۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

۱۰۔ تشریح آنکھ کی: اس کتابچے کے ۳۰ صفحات ہیں۔

۱۱۔ چھاتی کے اندر کی چیزوں کا بیان: اس کے صفحات ۱۵ ہیں۔

۱۲۔ تشریح ہڈیوں کی: یہ کتاب ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ لندن فارماکوپیا: یہ اسی نام کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جسے پیٹر برٹن نے دیسی میڈیکل طلبہ کے لیے گورنمنٹ لیتھو پریس کلکتہ سے جنوری ۱۸۲۳ء میں چھاپ کر شایع کیا۔ صفحات ۲۵۷ ہیں۔

۱۴۔ تشریح گردوں کی: اس کے صفحات ۲۲ ہیں۔ سنہ طباعت ۱۸۲۵ء ہے۔

۱۵۔ تشریح پینس یعنی قضیب کی: ۱۸۲۵ء میں چھپی ہے۔ صفحات ۲۲ ہیں۔

۱۶۔ بیان اُن زہروں کا جو نباتات سے علاقہ رکھتے ہیں: اس کتاب کے صفحات ۱۷۶ ہیں۔ جولائی ۱۸۲۶ء میں چھپی ہے۔

۱۷۔ بیان ٹاکسیکالجی یعنی بیان زہروں کا: یہ کتاب اپریل ۱۸۲۷ء میں چھپی ہے۔ زہروں کا علم کیوں ضروری ہے، اس کے سلسلے میں پیٹر برٹن نے لکھا ہے:

"جو معدنی زہر کہ انگریزی طبیبوں کی دواؤں میں اکثر کام آتے ہیں اور ایک دوسرے کے دھوکے سے کھانے میں آجاتا ہے اور ان کے اندازے سے زیادہ کھانے سے بہت اذیت ہوتی ہے، بلکہ کبھی آدمی ہلاک ہو جاتا ہے، ان زہروں کا بیان اس رسالے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ ہندوستان کے ویدوں کو معلوم ہو کہ ان ہر ایک چیزوں کے کھانے سے کیا کیا واردات ہوتی ہیں اور آدمیوں کی جان بچانے کے واسطے کیا کیا علاج کیے جاتے ہیں۔ جن زہروں کا بیان اس رسالے میں ہوا ہے اُن زہروں کے سوائے اور بھی بہت معدنی زہر ہیں کہ انگریزی طبیبوں کے دواؤں کے کام آتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے کھانے میں اس قدر جوکھم نہیں ہے جو اس رسالے کے زہروں میں ہے، اس لیے رسالے میں لکھا ہے کہ یہ علم طب کے مدرسے کے طالب علموں کے سیکھنے کے واسطے تصنیف کیا گیا ہے۔ اُن زہروں کا احوال نہیں لکھا گیا ہے تاکہ رسالہ بڑھ نہ جاوے۔"

۱۸۔ رسالہ بیان میں ہڈیوں کے اکھڑنے کا: یہ کتابچہ ۱۸۲۶ء میں چھپا ہے۔

۱۹۔ بیان ماہیت اور تاثیر ہوا کا: یہ ۱۸۲۹ء میں چھپی ہے۔

۲۰۔ بیان اُذن یعنی کان کا: یہ تصنیف بھی ۱۸۲۹ء کی ہے۔

۲۱۔ بیان ماہیت ڈوبنے اور پھانسی ہونے کی: یہ ۱۸۲۳ء کی تصنیف ہے اور اس کے صفحات ۳۲ ہیں۔

اُردو زبان میں علم طب سے متعلق اتنی کتابیں لکھ کر مسٹر پیٹر برٹن نے اُردو کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ان کی تصانیف کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ اُردو میں شایع ہونے والی ابتدائی تصانیف ہیں۔ آپ نے اردو میں بیشتر انگریزی طبی اصطلاحات کا ترجمہ کیا یا نئے الفاظ وضع کیے اور اس طرح اُردو زبان کے الفاظ کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

ڈیروزیو:

ڈیروزیو کا پورا نام لوئس ویویان ڈیروزیو تھا۔ لیکن آپ صرف مختصر نام ڈیروزیو سے جانے جاتے ہیں۔ ۱۸۰۹ء میں آپ کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تھے تو فرانسیسی لیکن انگریزی کے اچھے شاعر تھے۔ کچھ عرصہ تک آپ ہندو کالج کے پروفیسر رہے ہیں۔ آپ نے بنگال کے نوجوان طلبہ میں نئی روشنی کی روح پھونکی اور انھیں آزاد خیال بنانے کے سلسلے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ افسوس کہ عہد جوانی یعنی صرف ۲۲ سال کی عمر پاکر ۲۶ دسمبر ۱۸۳۱ء میں آپ انتقال کر گئے۔ ڈیروزیو پروفیسر ہونے کے علاوہ اچھے شاعر اور آزاد خیال صحافی بھی تھے اور "ایسٹ انڈیا" نامی ایک انگریزی جریدہ نکالا کرتے تھے۔ آپ کی صرف ایک اردو تصنیف کا پتا چلا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُردو زبان سے آگاہ تھے اور شاید یہی ان کی اُردو دانی کا واحد ثبوت ہے۔ یہ ہے "انگریزی بنگلہ اور ہندوستانی لغت" جو کہ ۱۸۳۵ء میں یعنی آپ کی موت کے بعد رومن حروف میں چھپی ہے۔ اس کے صفحات ۵۰۰ ہیں۔

www.taemeernews.com

اور ایک اشتہار جو کہ ہفت روزہ 'سماچار درپن' مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۳۵ء میں ہے کے مطابق اس کی قیمت چھ روپے آٹھ آنے تھی۔

کپتان ٹیلر:

کپتان ٹیلر کا اصل نام جوزف ٹیلر تھا۔ لیکن چونکہ آپ کپتان تھے اس لیے کپتان ٹیلر کے نام سے مشہور ہوئے۔ جن انگریزوں نے اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور کپتان روبک کے بعد آپ ہی کا نام آتا ہے۔ آپ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر تھے۔ آپ کی ایک تصنیف اُردو انگریزی لغت کے کئی کئی ایڈیشن چھپے ہیں۔ یہ تصنیف ۱۸۰۸ء کی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں جو ہندوستانی پریس میں ڈبلیو ہنٹر ایم۔ ڈی کی نگرانی میں چھپے۔ اس کا مختصر ایڈیشن ولیم کارمیکل اسمتھ نے ۱۸۲۰ء میں بھی چھاپ کر شایع کیا۔ کپتان ٹیلر کا ذکر ہم ہر اس تصنیف میں پاتے ہیں جس میں فورٹ ولیم کالج کے دور کا ذکر شامل ہے۔

کپتان تھامس روبک:

روبک ۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۹ء فورٹ ولیم کالج کے نائب سیکریٹری تھے۔ آپ کی سوانح حیات (بزبان انگریزی) آپ کے ایک دوست ہوائس ہائمن ولسن نے لکھی ہے۔ تھامس روبک بمقام لن لتھ گروشائر ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں آپ انگلستان سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے اور ہندوستان ہی میں آپ نے اُردو سیکھی۔ اس کے بعد ویلور (مدراس) میں قایم مقام ٹاؤن میجر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے ۱۸۰۶ء میں وطن لوٹ گئے، جہاں تین سال تک آپ کا قیام رہا۔ اس دوران میں انگلستان میں آپ کی ملاقات ڈاکٹر گل کرسٹ سے ہوئی اور آپ نے اُردو تصانیف کے کام میں ان کی مدد کی۔ ۱۸۰۹ء میں پھر روبک ہندوستان لوٹ آئے اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ آپ کا انتقال ۸ دسمبر ۱۸۱۹ء میں کلکتہ میں ہوا۔ آپ کی قبر کلکتہ کے پارک اسٹریٹ کے عیسائی قبرستان میں موجود ہے جس پر سنہ ولادت ۱۷۸۴ء درج ہے، حالانکہ آپ کی سوانح حیات کے مصنف کے مطابق آپ ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ لیکن میرے خیال میں قبر پر جو سنہ درج ہے وہی درست ہے۔

تھامس روبک کے دور میں فورٹ ولیم کالج سے اُردو کی بہت سی کتابیں نکلی ہیں اور تقریباً ان تمام مصنفین نے روبک کی علم دوستی کا خوب ذکر کیا ہے۔ خود روبک نے بھی اُردو میں تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے۔ آپ کی حسب ذیل کتابوں کے سلسلے میں معلومات ملی ہیں۔

۱۔ **لغت جہازرانی:** شاید اردو زبان میں جہازرانی کے الفاظ کی تشریح و معنی بتانے والی یہی واحد لغت ہے۔ جہازرانی کے الفاظ اصطلاحوں کے علاوہ اس لغت میں میدانِ جنگ اور بارکس میں استعمال ہونے والے اُردو الفاظ اور محاورات کی تشریح بھی بزبان انگریزی کی گئی ہے۔ یہ اہم لغت ہندوستانی پریس سے ۱۸۱۱ء میں چھپ کر شایع ہوئی۔ دو سال کے بعد اس کا ایک اور ایڈیشن لندن میں بھی چھاپا گیا۔

۲۔ **قواعد ہندی:** قواعد اُردو کی یہ کتاب اسکول کے نصاب میں شامل رہی ہے اور پہلی بار ۱۸۱۸ء میں ۲۰۰۰ کی تعداد میں کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے اسے چھاپ کر شایع کیا۔

۳۔ **امثال فارسی و اُردو:** اس کتاب کو ڈبلیو ہنٹر نے شروع کیا تھا لیکن اسے کپتان روبک نے مکمل کیا اور ۱۸۲۴ء میں یہ

کتاب مطبع ہندوستانی کلکتہ سے چھپ کر شایع ہوئی۔

جی۔ایس رانکنگ :

پورا نام جارج سپرس ایلگزنڈر رانکنگ تھا۔ ۷؍جنوری ۱۸۵۲ء کو ہسٹنگس سسکس میں پیدا ہوئے تھے۔ ۴؍نومبر ۱۸۷۵ء کو بمبئی اور ۱۶؍نومبر ۱۸۷۵ء کو کلکتہ میں، ۳ نیٹو انفنٹری فوج کے میڈیکل افسر مقرر ہوئے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں اردو سیکھنے لگے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں بوجہ خرابی صحت انگلستان چلے گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے آپ نے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد پھر ہندوستان لوٹ آئے۔ ہندوستان آنے کے بعد آپ نے عربی، فارسی، ہندی اور اُردو کے امتحانات پاس کیے اور طلائی تمغے حاصل کیے۔ جنوری ۱۸۵۲ء میں بورڈ آف اگزامینرس، فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازم ہوئے اور عرصہ ۲۳ سال تک ملازمت کے بعد ۱۹۰۵ء میں رخصت لے کر ولایت چلے گئے۔ وہاں آکسفورڈ یونیورسٹی میں فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے تھے، لیکن ۱۹۳۳ء میں پھر ہندوستان لوٹ آئے اور کلکتہ یونیورسٹی میں تاریخ، فارسی ادب اور ایرانی فلاسفی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔

آپ کی حسب ذیل تصانیف کا پتا لگ سکا ہے :

۱۔ ہدایت الحکمۃ : تھاکر اینڈ اسپنک کمپنی تاجر کتب کلکتہ نے مورخہ ۲۷؍مئی ۱۸۷۸ء کو یہ کتاب بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے چھاپ کر شایع کی تھی۔ اس ایڈیشن کے صفحات ۱۶۱ اور تعداد اشاعت ۵۰۰ ہے۔ یہ کتاب دیسی میڈیکل افسران کے لیے لکھی گئی۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔ لیکن مصنف کی ایک اور کتاب "اُردو پروز" یعنی نثر اردو کے آخر میں تھاکر اینڈ اسپنک کمپنی کی مطبوعات کی ایک فہرست چھپی ہوئی ہے جس کے مطابق 'ہدایت الحکمۃ' کی قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔

۲۔ تعلیم زبان اُردو۔ اس کتاب کو مذکورہ تاجر کتب نے کلکتہ سنٹرل پریس سے چھاپ کر مورخہ ۲؍جون ۱۸۸۹ء کو شایع کیا۔ اس کتاب کے صفحات ۱۳۰ ہیں، تعداد اشاعت ۱۳۰۰ اور قیمت ۵ روپے ہے۔

۳۔ آسان اُردو پاکٹ بک : اس کتاب کو بھی مذکورہ تاجر نے ۱۲؍جون ۱۸۹۵ء کو شایع کیا۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔ صفحات ۲۵۶ ہیں۔ یہ تیسرا ایڈیشن ہے جس کی تعداد اشاعت ۱۰۰۰ ہے۔ پہلا اور دوسرا ایڈیشن کب شایع ہوا اس کا علم نہیں ہو سکا۔

اردو پروز کمپوزیشن : اس کتاب کی تالیف میں مولوی محمد یوسف جعفری صاحب نے مصنف کی مدد کی جس کا ذکر پیش لفظ میں کیا گیا ہے۔ پیش لفظ کی تاریخ نومبر ۱۸۹۵ء ہے، لیکن کتاب کو تھاکر اینڈ اسپنک کمپنی کلکتہ نے ۱۸۹۶ء میں شایع کیا ہے۔

جیمس کارکورن :

جیمس کارکورن کی دو کتابوں کے بارے میں علم حاصل ہو سکا ہے۔ ان میں سے اول 'جوہر اخلاق' ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۴۳ء میں شایع ہوا، لیکن میری نظر سے کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہی گزرا ہے۔ جو کالج پریس، ویلیسلی اسکوائر، کلکتہ سے چھپ کر یکم دسمبر ۱۸۴۵ء کو شایع ہوا۔ اس میں اُردو کے صفحات ۴۴ ہیں۔ مولوی شاہ اُلفت حسین نے اس کتاب پر

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

نظرِ ثانی کی جس کی وجہ سے مترجم کارکورن نے مولوی صاحب کا نام بھی سرورق پر درج کر دیا ہے۔

کارکورن صاحب کی دوسری تصنیف جس کی وجہ سے انھوں نے شہرت پائی "تاریخ چین" ہے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ۱۸۵۲ء میں کلکتے میں چھپی۔ جلد اول کی قیمت ۸ روپے اور دوسرے حصے کی قیمت بارہ روپے درج ہے۔ یہ کتاب بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ میں چھپی اور تھاکر اسپنک اینڈ کمپنی نے اسے شایع کیا۔ کارکورن کی زبان نہایت آسان و عام فہم ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں "جواہر اخلاق" کی پہلی حکایت پیش کی جاتی ہے۔

"ایک روز کسی مرغ نے کسی گھورے پر چگنے میں ایک جواہر بیش قیمت دیکھا۔ افسوس سے ایک آہ سرد بھر کر کہنے لگا کہ جوہری کے یہاں اس کی بڑی قدر ہوتی۔ لیکن میرے نزدیک ایک دانہ اناج کا اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔

حاصل

جسے گندم و جو سے ہو دے سرور
نہیں کچھ اسے لعل و گوہر ضرور
جو روٹی کا ٹکڑا ملے بھوک میں
تو معلوم ہو زر سے بہتر ہیں"

کارکورن صدر عدالت صوبجات بنگالہ، بہار و اڑیسہ کے اردو مترجم تھے۔ اس عہدے پر آنے سے قبل آپ صدر عدالت فورٹ ولیم کلکتہ کے اُردو مترجم تھے۔ جن دنوں "تاریخ چین" کی دوسری جلد زیرِ طبع تھی ان دنوں ہی کلکتہ فورٹ ولیم کی عدالت سے آپ کا تبادلہ صدر دیوانی اور نظامت عدالت نارتھ ویسٹ پراونس میں ہوا، یعنی ۱۸۵۱-۵۲ء میں جس کی وجہ سے حصہ دوم کی طباعت میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اس حصۂ دوم کے صفحات ۷۱۶ ہیں۔

ڈبلیو ہنٹر:

ڈبلیو ہنٹر یعنی ڈاکٹر ولیم ہنٹر ۱۷۵۵ء میں بمقام منٹروسی (اسکاٹ لینڈ) پیدا ہوئے۔ ۱۷۸۱ء میں بحیثیت ایک میڈیکل افسر آپ ہندوستان آئے۔ آپ دوبار ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) کے سیکریٹری منتخب ہوئے: یعنی مئی ۱۷۹۸ء تا مارچ ۱۸۰۲ء اور اپریل ۱۸۰۶ء تا اپریل ۱۸۱۱ء۔ ۱۸۰۱ء میں آپ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ہندوستانی اگزامینر ہوئے اور ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی زبان کے نائب پروفیسر۔ اس عہدے پر ۱۸۱۱ء تک رہے اور ملازمت کے بعد جاوا چلے گئے، جہاں بمقام بٹاوی آپ نے ۵۷ سال کی عمر پاکر انتقال فرمایا۔

ڈاکٹر ہنٹر کی اُردو انگریزی لغت اپنے دور کی مشہور لغت رہی ہے جو ۱۸۰۸ء میں چھپی۔ اس کے علاوہ آپ نے دیگر چند اردو تصانیف میں بھی ہاتھ بٹایا ہے۔ مثلاً انجیل کا ترجمہ جو مرزا محمد فطرت نے "عہد جدید" کے نام سے کیا، اس پر آپ نے نظرِ ثانی کی اور ۱۸۰۵ء میں اسے پریس کلکتہ سے چھاپ کر شایع کیا:

ڈاکٹر جان گل کرسٹ:

ڈاکٹر گل کرسٹ اُردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی خدمات کے سلسلے میں کئی اہلِ قلم حضرات

www.taemeernews.com

نے طویل مضامین اور کتابیں لکھی ہیں، لہٰذا میں یہاں ڈاکٹر موصوف کا نہایت ہی مختصر ذکر کرتا ہوں۔ آپ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ، اور ولادت ۱۷۵۹ء بمقام اڈنبرا اسکاٹ لینڈ ہوئی۔ ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک طبی عہدہ دار کی حیثیت سے بمبئی چلے گئے۔ آپ کی اردو نوازی اور اُردو دوستی کا اصل مقصد یورپی صاحب کو ہندوستان کی یہ مقبول زبان سکھانا تھا اور اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے کتابیں تالیف کیں۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قایم ہونے پر آپ شعبۂ ہندوستانی کے صدر ہوئے اور ۱۸۰۴ء میں خرابیٔ صحت کی وجہ سے وطن لوٹ گئے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ حسب ذیل کتابوں کے مصنف یا مرتب ہیں:

۱۔ہندوستانی انگریزی لغت ۲۔ قواعد زبان اُردو ۳۔ اورینٹل فیبولسٹ۔ ۴۔ اردو زبان کا مختصر مقدمہ ۵۔ ضمیمہ انگریزی ہندوستانی لغت، ۶۔ ہندی کی آسان مشقیں ۷۔ فارسی افعال کا جدید نظریہ ۸۔ اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو ۹۔ عملی خاکے ۱۰۔ نقلیات ہندی ۱۱۔ بیاض ہندی ۱۲۔ ہندی عربی آئینہ۔

اُن کی تمام تصانیف میں 'اردو رسالہ' ..... جسے رسالہ گل کرسٹ ہی کہا جاتا ہے نہایت مقبول ہوا۔

لوئیس ڈ کاسٹا:

لوئیس ڈ کاسٹا کی مشہور تصنیف 'لب التواریخ' ہے۔ یہ ضخیم کتاب تین جلدوں میں ہے اور اس کے کئی ایڈیشن چھپے ہیں۔ میری نظر سے جو ایڈیشن گزرا وہ نواں ایڈیشن ہے جو ۱۸۲۹ء میں چرچ مشن پریس، ۱۹ سٹریٹ کلکتہ میں چھپا ہے۔ اس کتاب کے اردو ترجمے کے لیے لوئیس ڈ کاسٹا کی ہندوستانی عالموں نے مدد کی تھی جن میں حکیم مولوی عبدالمجید کا نام سرفہرست ہے۔ ان اصحاب کا نام مصنف نے سرورق پر بھی دیا ہے۔ نیز دیباچے میں مؤلف نے مولوی عبدالمجید کا بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وہ مدد نہ کرتے تو شاید اس خوبی سے کام انجام کو نہ پہنچتا۔ دیباچے کی تاریخ ۵ راکتوبر ۱۸۲۹ء اور مقام کلکتہ ہے۔ مؤلف لوئیس ڈ کاسٹا صوبجات بنگالہ، بہار اور اُڑیسہ کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ جلد اوّل کے صفحات ۲۸۲ ہیں۔ جلد دوم کی تاریخ مرزا احمد بیگ خاں بہ تخلص طپاں نے کہی جو حسب ذیل ہے:

طپاں تاریخ سال عیسوی میں
جو لینا تم کو ہو 'لب التواریخ'
مناسب ہے کہ یہ مصرع پڑھو تم
ہوئی اتمام کو 'لب التواریخ'
۱۸۲۹ء

جلد دوم بھی مذکورہ پریس سے ۱۸۲۹ء میں چھپ کر شایع ہوئی، اس کے صفحات ۳۲۸ ہیں۔ جلد سوم ۱۸۲۳ء میں شایع ہوئی، اور اس کے صفحات ۴۷۳ ہیں ڈ کاسٹا اُردو کے شاعر تھے۔

اُن کی ایک غزل درج ذیل ہے:

کل ہم تمھارے کوچے میں آئے، چلے گئے
بہتے ہے ہزار اشک بہائے چلے گئے

www.taemeernews.com

بیکوں دل سے شاد ہو ویں نہ ہم دوستو سنو
وہ جاتے جاتے ہم کو بلائے چلے گئے
کچھ رنج وغم کا حال نہ پوچھو کہ کیا ہوا
اُلفت کو ہم تو یار نبھائے چلے گئے
وہ باغبانِ حُسن جو آئے تو کل اِدھر
تخم وداد دل میں جمائے چلے گئے
ہم ہی فقط ہیں دل جو گنواتے ہیں ورنہ سب
آکر جہاں میں کچھ تو کمائے چلے گئے
کل اس پری کی بزم میں سب مل کے برملا
تیری غزل فطرت کا سنا گائے چلے گئے

ایچ - مارٹن:

شاید آپ کا تعلق سی رام پور مشن سے تھا۔ چونکہ مرزا محمد فطرت نے ۱۸۱۷ء میں انجیل کا جو ترجمہ کیا وہ آپ کی نگرانی میں چھپا ہے۔ اس انجیل کا عنوان "انجیل یعنی وثیقہ جدید حضرت عیسیٰ علیہ السلام" ہے اور اس کے صفحات ۹۳۸ ہیں۔ آپ کی ایک اور تصنیف کا نام 'دعائے عام کی کتاب' ہے۔ اس میں ایسے گیت (دعائیں) درج ہیں جو چرچ میں گائے جاتے تھے۔ اس کتاب کے صفحات ۱۷۰ ہیں اور ۱۸۱۴ء میں چھپی ہے۔ اس کے بعد بھی اس کے کئی ایڈیشن چھپے ہیں۔

پادری فاندر:

آپ "میزان الحق" نامی ایک کتاب کے مصنف ہیں جو اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ پادری صاحب نے کلکتہ ٹراکٹ سوسائٹی کے لیے آرفن اسکول پریس مرزا پور کلکتہ سے ۱۸۴۳ء میں اسے چھپ کر شایع کیا۔ اصل فارسی تصنیف ۱۸۲۳ء کی ہے اور اردو ترجمہ ۱۸۴۱ء میں ہوا تھا اور طباعت ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔ پادری صاحب نے اس تصنیف میں مسلمانوں کو عیسائی مذہب کی روشنی میں چند نصیحتیں کی ہیں۔ کتاب میری نظر سے گزری ہے جو ان اشعار کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

غرض جو میری نصیحت تھی سو کیا میں نے
خدا کو سونپ کے تجھ کو میں کوچ کرتا ہوں
گر اس کو شوق سے تو نے سُنا، سنا نہ سُنا
ہے قاصد کا فقط کام صرف پہنچانا (کذا)

ایس سلاٹر صاحب:

ایس سلاٹر صاحب بپٹسٹ کالج کلکتہ کے پروفیسر تھے۔ آپ کی دو کتابوں کا مجھے علم ہوا ہے جن میں سے ایک 'صرف ونحو اُردو' میری نظر سے گزر چکی ہے۔ یہ نصاب میں شامل تھی اور بپٹسٹ کالج کلکتہ میں ۱۸۴۹ء میں چھپی۔ اس کے صفحات ۶۴ ہیں اور کتاب پر فورٹ ولیم کالج کی مہر بھی ہے۔ آپ کی دوسری تصنیف کا نام سرچشمۂ محبت ہے جو ۱۸۶۰ء میں

www.taemeernews.com

چھپی ہے۔ یہ کتاب عیسائی مذہب کے سلسلے میں ایک تبلیغی تصنیف ہے۔ اس کے صفحات ۱۰۰ ہیں۔

کپتان ایچ۔ جی ہمنٹ:

آپ کی ایک تصنیف کا نام 'فارسی اردو خط و کتابت' ہے جو ۱۸۴۳ء میں کلکتے سے چھپ کر شایع ہوئی۔ اس تصنیف کو مکمل کرنے کے سلسلے میں منشی نعمت خاں نے مسٹر ھنٹ کی مدد کی تھی۔

مسٹر ہنری۔ فنک:

آپ کی ایک کتاب کا نام 'دولت ہند، یعنی بیان حکمت، زراعت وفنون باغیچہ و ترکیب پرورش گاؤ میش وغیرہ' ہے۔ یہ کتاب ۱۸۴۶ء میں بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ میں چھپی ہے۔ مصنف کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

ولیم لاکر:

'تحریر اقلیدس' نامی آپ کی تصنیف ہے جسے آپ نے ڈاکٹر اشپرنگر، پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی فرمایش پر ۱۸۵۲ء میں لکھا تھا۔ یہ کتاب ایشیاٹک لیتھو پریس کلکتہ میں چھاپی گئی۔ اس کے صفحات ۲۳۴ ہیں، قیمت ۲ روپے آٹھ آنے ہے۔

ڈبلیو۔ سی۔ ہولنگ:

آپ نے 'ترجمہ ریختہ گیت' کے نام سے مختلف اُردو شعرا کے کلام میں سے چند غزلیات کا انتخاب اور ترجمہ کر کے انھیں شایع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے اور اس کے صفحات ۸۰ ہیں۔ ایک صفحے پر اردو غزل اور سامنے کے صفحے پر اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔

ایچ انڈوس:

آپ 'اردو انگلش لغت' کے مرتب ہیں یہ لغت ۱۸۶۹ء میں بپٹسٹ مشن پریس میں چھاپی گئی اور کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے اسے ۱۴ر اپریل ۱۸۶۹ء کو شایع کیا۔ یہ اس لغت کا ساتواں ایڈیشن ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کب چھپا، معلوم نہیں ہو سکا۔ اس ساتویں ایڈیشن کی تعداد اشاعت دو ہزار اور قیمت فی جلد دو روپے تھی۔

ڈاکٹر ایف ہچن سن:

آپ ایک 'میڈیکل لغت' کے مصنف ہیں۔ یہ لغت ۴ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو کلکتہ سنٹرل پریس کمپنی سے چھپ کر شایع ہوئی ہے۔ تعداد اشاعت ۵۰۰، قیمت فی جلد دو روپے۔

ٹی۔ ایف۔ اسٹل ویل:

آپ 'رایفل سیکھنا' نامی ایک کتاب کے مترجم ہیں جو دیسی فوجیوں کے لیے تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۶ء اور دوسرا ۱۸۷۷ء میں چھپا۔ دوسرے ایڈیشن کے صفحات ۸۸ ہیں۔

ولیم ایٹس ڈی۔ ڈی:

ایٹس کی شہرت کی وجہ ان کی سنسکرت زبان کی گرامر ہے۔ لیکن ولیم ایٹس سنسکرت، ورنیکلر کے علاوہ اردو کتابوں کے بھی مصنف تھے۔ اُن کی اردو تصانیف کا مقصد یوروپین حضرات کو یہ مقبول زبان سکھانا تھا۔ ولیم ایٹس ۲۵ر دسمبر ۱۷۹۲ء کو اپنے وطن لوبھارگ میں پیدا ہوئے۔ عیسائی مشن والوں کی ٹولی میں شامل ہو کر وہ ہندوستان آئے۔ ان کا جہاز ۲ر اپریل ۱۸۱۵ء کو

www.taemeernews.com

مدراس کی بندرگاہ میں پہنچا اور ۱۶ اپریل کو وہ کلکتہ پہنچے۔ مسٹر اٹیس نے ہندوستان میں سنسکرت، بنگلہ، اُردو اور ہندی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، کیونکہ ان زبانوں کو جانے بغیر وہ یہاں عیسائی مشن کا کام بخوبی انجام نہیں دے سکتے تھے۔ راجا رام موہن رائے سے اُن کے گہرے تعلقات تھے اور انھیں توی امید تھی کہ رام موہن رائے عیسائی ہو جائیں گے۔ جب اُنھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تب وہ رام موہن رائے کے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ مسٹر اٹیس کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کے شعبۂ بنگلہ و سنسکرت کے سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ آپ کی اردو تصانیف حسب ذیل ہیں :

۱۔ **انٹروڈکشن ٹو ہندوستانی** : اس تصنیف کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں اردو گرامر، دوسرے میں الفاظ اور تیسرے میں چند اسباق ہیں۔ یہ کتاب رومن حروف میں چھپی ہے۔ مصنف نے دیباچے میں مقصد تصنیف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب ان یوروپین حضرات کے لیے ہے جو ہندوستان میں ہیں اور جن کے لیے اردو زبان سیکھنا ضروری ہے۔ کتاب کے صفحات ۲۲۶ ہیں اور ۱۸۲۷ء میں بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ نے اسے چھاپ کر شایع کیا ہے۔

۲۔ **ہندوستانی انگریزی لغت** : مصنف پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ اُس نے اس لغت میں سنسکرت آمیز یا ہندی الفاظ کو شامل نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ بات نہ تو درست ہے اور نہ ہی ممکن ہے کیونکہ اردو ہندوستانی زبان ہے جس میں بے شمار الفاظ سنسکرت سے آئے ہیں یا ہندوستان کی دیگر پراکرت زبانوں سے۔ ہاں، مصنف چونکہ سنسکرت سے واقف تھے اس لیے انھوں نے اس بات کی کامیاب کوشش کی کہ ٹھیٹھ سنسکرت الفاظ سے ان کی لغت پاک رہے۔ دیباچے کی تاریخ جنوری ۱۸۴۷ء ہے اور ۱۸۴۷ء ہی میں یہ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے چھپ کر شایع ہوئی۔ اس کے صفحات ۵۸۴ ہیں۔

۳۔ **نقلیات دل کش** : انگریزی کتاب دی پلیزنگ انسٹرکٹر (The pleasing instructor) کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اسکول کے بچوں کے لیے تھی۔ صفحات ۲۴ ہیں اور کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے ۱۸۳۵ء میں اسے شایع کیا۔ اس کے اور بھی کئی ایڈیشن نکلے ہیں، مثلاً ۱۸۴۵ء کا ایڈیشن۔ ۱۸۴۵ء میں جب آپ وطن جا رہے تھے تب جہاز ہی میں ۳ر جولائی ۱۸۴۵ء کو ۵۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

مندرجہ بالا انگریز مصنفین کے علاوہ سرزمین بنگال میں اور بھی ایسے حضرات رہے ہیں جنھوں نے اردو میں تالیف و تصنیف کا کام انجام دیا ہے، لیکن ان کی سوانح حیات اور تصانیف کے سلسلے میں آج ہم آگاہ نہیں ہیں۔ بہر حال جن کے سلسلے میں جان سکا، ان کا مختصر طور پر میں نے یہاں ذکر کیا ہے تاکہ حالات قلم بند رہیں اور تحقیق و تلاش کرنے والوں کے لیے یہ معلومات مفید ثابت ہوں۔ ●—

ادب کے جدید دور کا نقیب
منتخب اور غیر مطبوعہ تحریروں کا انتخاب

ادوار

مجلس مشاورت
آسی خان پوری ● صفدر صدیق رضی

ناشر
ادارۂ مطبوعات ادوار۔ مینا بازار۔ خانپور

www.taemeernews.com

ڈاکٹر عبادت بریلوی

انگلستان، اردو اور تعلیم و تحقیق

انگلستان میں اردو زبان و ادب سے دلچسپی لینے کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انگریز برصغیر ہند و پاکستان میں تاجروں کی حیثیت سے آئے اور پھر یہاں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے رفتہ رفتہ اپنی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ انھوں نے یہاں ایک منصوبے کے تحت اپنی سیاسی طاقت کو مضبوط کیا اور اس سلسلے میں معاشرتی، تہذیبی اور ادبی و لسانی سطح پر بہت سے ایسے کام کیے جو بالواسطہ طور پر ہماری معاشرت، تہذیب اور زبان و ادب کے لیے مفید ثابت ہوئے۔ انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ جب تک اس برعظیم کی مقبول ترین زبان اردو سے ان کا رابطہ قایم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ یہاں سیاسی طاقت حاصل نہیں کر سکتے اور خاطر خواہ طور پر حکومت کو چلانے میں انھیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

اسی خیال کے تحت انگریزوں نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا، اور اس کو بڑے پیمانے پر چلانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اس کالج میں سب سے پہلے اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے آئے۔ صرف چند سال انھوں نے یہاں قیام کیا لیکن اس مختصر سی مدت میں انھوں نے اردو کی تدریس اور ترویج و اشاعت کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ یہ کالج انگریز ملازمین حکومت کو اردو زبان کی تعلیم دینے کے لیے قایم کیا گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کو اپنی کوششوں سے ایک ایسا ادارہ بنا دیا جو اردو زبان اور ادب کی تحقیق، ترویج اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس زمانے میں اردو کے اہم زبان دانوں اور ادیبوں کو بلا کر جمع کیا اور ان سے آسان اور سادہ نثر میں ایسی کتابیں لکھوائیں جو اردو نثر کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ میر امن کی 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی'، حیدری کی 'آرائش محفل' اور 'طوطا کہانی' اور 'مختصر کہانیاں'، میر شیر علی افسوس کی 'باغ اردو' اور 'آرائش محفل'، بینی نرائن جہاں کی 'چار گلشن'، مظہر علی خان ولا کی 'ہفت گلشن' اور 'مادھونل کام کندلا'، اور خلیل علی اشک کی 'گلزار چین'، اور 'رسالہ کائنات'، اسی کالج میں لکھی گئیں۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر گل کرسٹ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اردو میں اس قسم کی کتابوں کا رواج ہوا جو سادہ اور آسان نثر میں خاص طور پر لکھوائی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اردو کا اردو زبان اور اس کی نثر میں ایک خاص مقام ہے اور انھوں نے خاص طور پر نثر اردو کی ترویج میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ اور ان کے رفقاء کو اردو زبان و ادب سے اتنی دلچسپی نہ ہوتی تو نہ یہ مصنفین فورٹ ولیم کالج میں جمع ہوتے اور نہ ان کتابوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوتا، جو اب اردو نثر کی روایت کا ایک بہت ہی اہم حصہ ہے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر جان گل کرسٹ نہ صرف اردو زبان کے ایک بڑے پرستار تھے، بلکہ ایک بڑے عالم بھی تھے۔ انھوں نے جو تصانیف چھوڑی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زبان پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ اس کے مسائل کو سمجھتے تھے اور اس کے لسانی پہلوؤں کا گہرا شعور ان کے ہاں موجود تھا۔ لغت اور قواعد پر جو کام انھوں نے کیا ہے وہ اردو زبان کو سمجھنے کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہے خصوصًا ایسے لوگوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج میں زیادہ عرصے نہ رہ سکے، لیکن اس تھوڑے عرصے میں انھوں نے اردو زبان اور ادب کے لیے بڑا اہم کام کیا۔ انھوں نے خود اس زبان کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی اور کئی کتابیں تالیف کرکے اس زبان کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بعض اہم لکھنے والوں کو فورٹ ولیم کالج میں جمع کیا، جن کی تصانیف سے اس کالج میں اردو زبان وادب پر کام کرنے کا ایک ماحول پیدا ہوا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد جو انگریز اس کام پر مامور کیے گئے انھوں نے بھی اپنی اپنی جگہ اس کام کو آگے بڑھایا جس کا آغاز ڈاکٹر گل کرسٹ نے کیا تھا لیکن وہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی سطح تک نہ پہنچ سکے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد جن لوگوں نے فورٹ ولیم کالج میں اردو کا کام کیا یا دوسرے مصنفین سے کروایا ان میں ڈاکٹر ہنٹر، ٹامس رئبکیس وغیرہ کے نام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج سے سبک دوش ہونے کے بعد لندن واپس چلے گئے لیکن اردو زبان وادب سے دلچسپی کی جو شمعیں ان کے دل میں فروزاں ہو چکی تھیں وہ مرتے دم تک روشن رہیں۔ چنانچہ اسی شوق اور دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے لندن میں اردو زبان کی تدریس کے لیے ایک کالج قایم کیا۔ یہ کالج لیسٹر اسکوائر میں تھا اور اس میں وہ انگریز اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے جن کو ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان آنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اس کالج کی رپورٹیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے رہتے تھے۔ یہ رپورٹیں محدود تعداد میں چھاپی جاتی تھیں۔ ان کا صرف ایک نسخہ اس وقت اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کو اردو زبان اور ادب سے گہری دلچسپی تھی اور انھوں نے اس دلچسپی کی وجہ سے اردو زبان کی تدریس اور تحقیق کا ایک ماحول لندن میں پیدا کر دیا تھا۔ اس زمانے میں گل کرسٹ نے اردو زبان کی بعض کتابیں بھی شایع کیں اور ایسے لوگوں کو بھی تیار کیا جو اردو کی تدریس اور تحقیق میں آگے چل کر کارہائے نمایاں انجام دے سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ گل کرسٹ کسی حد تک خود غرض آدمی تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اور ایسا کام بڑے پیمانے پر کرے جس کا مقصد ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض لوگوں سے ان کے اختلافات اسی وجہ سے پیدا ہوئے کہ وہ اردو زبان اور ادب کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً اس زمانے میں ایک صاحب ولیم کارمائیکل اسمتھ تھے۔ انھیں بھی اردو زبان اور ادب سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس زمانے میں کئی کتابیں مرتب کرکے شایع کی تھیں۔ ان میں للوجی لال کی کتاب "لطائف ہندی" خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اسمتھ نے اس کو دوبارہ نہایت اہتمام سے مرتب کرکے لندن سے شایع کیا اور ان کا ارادہ اردو اور انگریزی کی ایک ڈکشنری مرتب کرنے کا بھی تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ڈکشنری مرتب کرنے کا کام سوائے ان کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس زمانے میں جو خط و کتابت ڈاکٹر گل کرسٹ اور ولیم کارمائیکل اسمتھ کے درمیان اس موضوع پر ہوئی ہے وہ بڑی دلچسپ ہے۔ اس کو گل کرسٹ نے لندن سے خود "اورنٹیل گرین بیگ" کے نام سے شایع کر دیا تھا۔ ہاف کراؤن میں یہ کتاب ملتی تھی۔ اب اس کا صرف ایک نسخہ اسکول آف

www.taemeernews.com

اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لندن میں اردو زبان اور ادب سے دلچسپی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا اور لوگ اس زبان کے معاملات و مسائل سے بحث و مباحثے کی حد تک دلچسپی لے رہے تھے۔ ساتھ ہی گل کرسٹ کی وجہ سے اردو کی تحقیق اور تدریس کی فضا بھی پیدا ہو گئی تھی ـــــ

یہ فضا اس کے بعد بھی باقی رہی اور اگرچہ لیسٹر اسکوائر میں گل کرسٹ کا قایم کیا ہوا کالج بند ہو گیا لیکن بعض ایسے ادارے کھل گئے جو اردو کی تعلیم و تدریس میں پیش پیش تھے۔ اس میں ہلیبری کالج کا نام خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج میں بھی باقاعدہ اردو کی تعلیم ہوتی تھی اور ڈاکٹر ڈنکن فوربس اس کالج میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر تھے۔ اردو کی تدریس کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ ڈاکٹر فوربس اپنی باغ و بہار کے انگریزی ترجمے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ لندن کے علاوہ بیسویں صدی میں انگلستان کی بعض دوسری یونیورسٹیوں میں بھی اردو کا تھوڑا بہت کام ہوتا رہا۔ مثلاً اڈنبرا میں ایک زمانے تک اردو کی تدریس کا انتظام رہا۔ اسی طرح آکسفورڈ اور کیمبرج میں بعض لوگ اردو سے دلچسپی لیتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ لندن میں جو فضا اردو کی تدریس اور تحقیق کی قایم ہوئی تھی انگلستان کی دوسری یونیورسٹیاں اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

وقت کے ساتھ لندن اردو زبان کی تدریس و تحقیق کا ایک اہم مرکز بن گیا اور جب اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کا قیام عمل میں آیا تو وہاں اردو کی تدریس و تحقیق دونوں کا صحیح ماحول پیدا ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس اسکول میں اردو زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قایم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی پنجاب سے واپس جا کر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کے ریڈر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کی نگرانی میں جن لوگوں نے تحقیق کا کام کیا ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھے اور انھیں لندن یونیورسٹی سے ڈگریاں ملیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ بی اے آنرز کی تعلیم کا سلسلہ بھی باقاعدگی کے ساتھ جاری ہوا اور بہت سے طالب علموں نے اس جماعت میں داخل ہو کر اردو زبان اور ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ اُنھیں بی۔ اے آنرز کی ڈگریاں ملیں۔ تحقیق و تدریس کی یہ فضا ڈاکٹر گراہم بیلی کے انتقال کے بعد بھی جاری رہی اور اب تک قایم ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہارلے، مسٹر رالف رسل، ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور جناب عزیز احمد نے بڑا کام کیا۔ یہ سب اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں شعبۂ اردو کے ساتھ منسلک رہے اور تحقیق اور تدریس میں انھوں نے نمایاں دلچسپی لی۔

۱۹۵۸ء کے بعد لندن میں اردو زبان اور ادب سے دلچسپی اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ اس سے قبل جو دلچسپی تھی وہ افراد تک محدود تھی اور افراد نے اس میں کسی نہ کسی مقصد کے پیش نظر دلچسپی لی لیکن جب پاکستان میں ۱۹۵۸ء کے بعد ایک نئی حکومت بنی اور اس حکومت نے بہت تھوڑے عرصے میں یہ اعلان کر دیا کہ مغربی پاکستان کی قومی زبان اردو ہے تو انگلستان میں اردو زبان سے دلچسپی کی نوعیت بدل گئی۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ اردو زبان ایک آزاد قوم کی زبان ہے اور ایک آزاد قوم کی زبان کی حیثیت سے اس کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ارباب اختیار نے اردو کو نمایاں حیثیت دی۔ اس کا باقاعدہ شعبہ قایم کیا۔ پاکستان سے پاکستانی اساتذہ اردو پڑھانے کے لیے اسکول میں بلائے گئے۔ اسی طرح اردو کی تدریس مضبوط بنیادوں پر قایم ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اردو زبان اور ادب کی تحقیق کا ماحول بھی پیدا ہوا۔

گزشتہ چند سال سے صورت حال یہ ہے کہ شعبۂ اردو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کا شعبۂ ثقافت ہند و پاکستان

www.taemeernews.com

کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس میں ۱۹۶۳ء میں اردو کی ایک ریڈر شپ قایم ہوئی اور رالف رسل جو اس سے قبل اردو کے لیکچرار تھے، اس جگہ پر اردو کے ریڈر مقرر کیے گئے۔ آج کل بھی اسکول کے شعبۂ اردو کے نگراں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک استاد پاکستان سے اردو زبان اور ادب کی تدریس کے لیے پاکستانی سفارت خانے اور وزارت تعلیم حکومت پاکستان کی معرفت اسکول کے اس شعبے میں تدریسی کام کے لیے بلایا جاتا ہے۔ راقم الحروف اس شعبے میں چار سال تک کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ شعبے میں خاصی توسیع ہوئی اور دو انگریز لیکچرر مقرر کیے گئے جو آج کل کام کر رہے ہیں۔ ان میں ایک تو مسٹر شیکل ہیں جن کو اسکول نے خاص طور پر اردو زبان سیکھنے کی غرض سے اورنٹیل کالج لاہور میں بھیجا تھا۔ دوسرے مسٹر متھوز ہیں جو پہلے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے شعبۂ لسانیات میں تھے۔ ان کو اب اردو کے استاد کی حیثیت سے شعبۂ اردو میں مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بھی کئی بار اردو زبان و ادب کے مطالعے کے سلسلے میں پاکستان آچکے ہیں۔

یہ اساتذہ بی۔ اے آنرز کی جماعتوں کو پڑھاتے ہیں اور تحقیق کے کام میں بھی مدد کرتے ہیں۔ اسکول کے ڈائرکٹر پروفیسر فلپس کو اردو زبان اور ثقافت پاکستان سے گہری دلچسپی ہے۔ وہ ایک ماہ کے لیے پاکستان بھی آچکے ہیں اور انھوں نے پاکستانی ثقافت کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ پاکستان کے صدر مملکت اور مختلف وزرا سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور انھوں نے پاکستانی ثقافت اور اردو کے بارے میں مشورے کیے ہیں۔ ان کے علاوہ شعبۂ ہند و پاک کے سابق صدر پروفیسر برو کو بھی اردو زبان اور پاکستانی ثقافت سے دلچسپی ہے۔ اب وہ کیمبرج میں سنسکرت کے پروفیسر ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں پروفیسر رائٹ صدر شعبہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر رائٹ لندن یونیورسٹی میں سنسکرت زبان کے پروفیسر ہیں اور انھیں برصغیر ہند و پاکستان کی زبانوں میں بڑی دلچسپی ہے۔ ان تینوں کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ لندن یونیورسٹی میں اس وقت اردو کی پروفیسر شپ قایم ہو چکی ہے اور جلد ہی اس پر ایک پروفیسر کا تقرر ہونے والا ہے۔ اسی طرح، جہاں تک تدریسی عملے کا تعلق ہے، شعبۂ اردو میں گزشتہ دس سال کے اندر خاصی توسیع ہو گئی ہے۔

اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے شعبۂ اردو میں اس وقت جو کام ہو رہا ہے اس میں ایک تو بی۔ اے آنرز (لندن یونیورسٹی کی فرسٹ ڈگری) کی تدریس ہو رہی ہے۔ اس جماعت میں طالب علموں کی تعداد خاصی ہوتی ہے۔ اس میں داخل ہونے والے طلبہ و طالبات چار سال تک اردو اور ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگ برٹش کونسل اور کامن ویلتھ آفس وغیرہ سے بھی اردو زبان سیکھنے کے لیے اس شعبے میں آتے ہیں اور چند ماہ میں اردو سیکھ کر چلے جاتے ہیں۔

تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کا کام بھی اسکول کے شعبۂ اردو میں اس وقت جاری ہے اور کئی ریسرچ اسکالرز گزشتہ چند سال سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریوں کے لیے اردو زبان اور ادب کے مختلف موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ایک خاتون فیروز جبین نے "سرشار" کے موضوع پر اپنا مقالہ مکمل کیا اور انھیں بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ آج کل جو اسکالر اپنا کام مکمل کر چکے ہیں ان میں خالد حسن قادری اور شمس الدین صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خالد حسن نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مولانا حسرت موہانی پر اپنا مقالہ مکمل کر لیا۔ اور انھیں ڈگری مل گئی ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے "سودا" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام کیا ہے اور انھیں بھی ڈگری مل گئی ہے۔ ڈاکٹر معزالدین احمد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد تھے۔ وہ تین سال اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن میں رہے اور انھوں نے اردو لسانیات کے موضوع پر کام کر کے ایم۔ فل کی ڈگری حاصل کی۔

www.taemeernews.com

اس تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ لندن اسکول کے شعبۂ اردو نے تدریسی مواد بھی تیار کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ رالف رسل اردو کا نصاب مختلف رفقا کی مدد سے مرتب کر رہے ہیں۔ یہ نصاب تیار ہو چکا ہے اور جلد ہی شایع ہونے والا ہے۔ اس سے غیر ملکی طالب علموں کو اردو زبان کے سیکھنے میں بڑی آسانی ہو گی کیونکہ اسے نئی بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہے اور اس کام میں ایسے اساتذہ اور لکھنے والوں سے بھی مدد لی گئی ہے جو اردو زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان میں جہاں تک اردو کی تعلیم کا تعلق ہے مرکزی حیثیت اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز ہی کو حاصل ہے۔ تمام انگلستان سے طلبہ وطالبات یہاں اردو زبان پڑھنے کے لیے آتے ہیں لیکن انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی گزشتہ دس سال کے اندر اردو کی تدریس اور تحقیق کا انتظام ہو گیا ہے۔ مثلاً آکسفورڈ میں اگرچہ اردو کا شعبہ باقاعدہ نہیں ہے لیکن سینٹ انیتھونی کالج میں پاکستانی ثقافت کا ایک شعبہ قایم کیا گیا ہے اور آج کل اس کالج میں زیتون عمر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ ان کا موضوع "شبلی" ہے۔ ڈرہم یونیورسٹی میں بھی اردو میں تحقیق کا کام ہو رہا ہے ——— جان ہے وڈ اگرچہ عربی کے اُستاد اور اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں لیکن انھیں اردو سے بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ ایم۔ اے کی سطح پر جدید اردو شاعری کے موضوع پر انھوں نے ایک اہم مقالہ تیار کروایا ہے۔

غرض انگلستان میں گزشتہ دس سال کے اندر اردو زبان اور ادب کا اچھا خاصا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ نہ صرف جگہ جگہ اردو زبان کے بولنے اور سمجھنے والے مل جاتے ہیں بلکہ انگریزوں میں اس زبان کے پڑھنے اور اس کے ادب سے دلچسپی لینے کا شوق بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی میں تدریس وتحقیق کے کام سے دلچسپی بھی لی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں اب تک اچھا خاصا کام ہو چکا ہے۔ رالف رسل اس کام میں پیش پیش ہیں۔

یہ صورت حال صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ پاکستان کی حکومت نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا ہے۔ اور گزشتہ دس سال میں اس کی ترویج واشاعت کے لیے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کوشش جاری ہے۔

محشر بدایونی کی تصانیف

- شہر نوا (پہلا شعری مجموعہ ۱۹۶۲ء دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۱ء) (آدم جی انعام یافتہ)
- غزل دریا (شعری مجموعہ) ۱۹۷۸ء
- گردش کوزہ (شعری مجموعہ) ۱۹۸۱ء
- شاعر نامہ۔ (بچوں کے لیے)
- سائنس نامہ (" ")
- بین باجے (" ")

افسر صدیقی

چند اکابرِ اردو برطانیہ میں

(جنھوں نے انیسویں صدی میں انگلستان کا سفر کیا)

ہندوستان کی مغلیہ حکومت سے برطانیہ کا پہلا رابطہ ۱۶۱۵ء (۱۰۲۴ھ) میں ہوا جب جیمس اول کا سفیر سر طامس رو بندر سورت سے ہوتا ہوا اجمیر پہنچا جہاں شاہی لشکر کا قیام تھا اس نے اپنے بادشاہ کی جانب سے بھیجے ہوئے تحایف شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیے اور یہی رابطہ آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قایم کرنے کا وسیلہ بنا۔ اٹھارویں صدی میں کمپنی نے اپنے پاؤں پھیلائے اور ہندوستان کے مشرقی حصے پر اپنی حکومت قایم کرلی اور انیسویں صدی کا نصف اول ختم ہونے تک سارے ہندوستان پر انگریزی حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا۔ لیکن ابھی اس کی بنیادیں استوار نہ ہونے پائی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی نے اُسے ہلا کر رکھ دیا جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی حکومت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر براہِ راست والیانِ انگلستان کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس کے بعد اعلیٰ عہدوں پر برطانوی باشندوں کے مقرر ہوکر آنے اور ہندوستانیوں کے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے انگلستان جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گارساں دی تاسی نے اپنے ۲۶ فروری ۱۸۶۸ء کے خط میں لکھا ہے:

"کچھ عرصے سے سیاحت یورپ کے لیے ہندوستانیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے ہر جہاز پر آپ کو انگلستان جانے والے ہندوستانی نظر آئیں گے۔ بعض سیر و تفریح کی خاطر، بعض علم طب و قانون کی تحصیل کی غرض سے اور بعض اس لیے آتے ہیں کہ انگلستان کے نظم و نسق مدارس کا مطالعہ کریں خود انگلستان میں اردو زبان کا چرچا دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اس لیے کہ اس زبان کی اہمیت کا احساس لوگوں کو ہوتا جاتا ہے۔ آکسفورڈ میں اردو کی مسند قایم ہوگئی ہے اور جی جیمبرس کا اس جگہ تقرر ہوا ہے اور کیمبرج میں بھی اس کی اسامی قایم ہوگئی ہے۔"

(خطبات اول صفحہ ۲۸)

یہی زمانہ تھا جب حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں سول سروس کے لیے ہندوستانی (اردو) زبان جاننا لازمی قرار دیا اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اب اہل زبان کے اپنے مقاصد کے لیے برطانیہ جانے والوں کے ساتھ اُردو

www.taemeernews.com

دان انگریزوں کے شامل ہو جانے کے بعد تاریخ زبان اردو کا ایک ایسا باب شروع ہوتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دیسی لوگوں کے ولایت جانے کے مقاصد مختلف تھے۔ ان میں ایک گروہ اُن اصحاب کا تھا جو ۱۸۵۷ء کے واقعے کے پس و پیش اپنی ریاستوں یا جاگیروں کے ضبط ہو جانے کے بعد ان کی واگزاری و واپسی کے لیے لندن پہنچے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو صرف سیر و سیاحت کے لیے لندن گئے اور واپس آنے کے بعد اپنے سفرنامے مرتب کیے تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جنھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وہاں جانے اور برسوں قیام کرنے کی ضرورت ہوئی۔ چوتھا گروہ ان اصحاب غرض کا تھا جنھیں بلند معاشرت اختیار کرنے کی ہوس پوری کرنے اور زیادہ سے زیادہ تحصیل زر کی تحریص انگلستان لے گئی ——

اہلِ برطانیہ کی اُردو خدمات کے سلسلے میں تو خواہ انھوں نے برطانیہ میں رہتے ہوئے تصنیف و تالیف اور تنقید و تحقیق کا فرض انجام دیا ہو یا ہندوستان کے مستقل اور عارضی قیام میں اس زبان کی توسیع و ترقی کا باعث ہوئے ہوں۔ بعض کتابیں لکھی گئی ہیں اور مطبوعہ موجود ہیں۔ لیکن یہاں سے برطانیہ جانے والے اکابر ادب اور نمایندگان اردو کے بارے میں کوئی اجتماعی معلومات دستیاب نہیں ہوئیں خود یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ جس کی تکمیل کے لیے وقت اور مطالعہ دونوں چیزوں کی ضرورت ہے جو سردست ممکن نہیں اس لیے چند نمایاں حضرات کے حالات پیش کرنے کی کوشش کروں گا ——

نواب اقبال الدولہ لکھنوی

شمس الدولہ نواب احمد علی خاں کے لڑکے اور نواب سعادت علی خاں والیِ اودھ کے پوتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کا چوتھا دربار ۱۲ بجے ہوتا تھا۔ نواب نصیر الدولہ بہادر ضروری عرض داشتوں کو ایک بند لفافے میں میز پر رکھ کر چلے جاتے تھے۔ نواب شمس الدولہ بہادر لفافہ کھول کر سرکار میں پیش کرتے تھے اور تا اختتام ملاحظہ موجود رہتے تھے۔ اسی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ نواب سعادت علی خاں کے بعد حکومت انھیں ملے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ مایوس اور بددل ہو کر بنارس اور اس کے بعد کلکتے چلے گئے اور وہاں مستعفی ہو کر انتقال کیا۔ اقبال الدولہ کے پاس چھ سات لاکھ روپیہ تھا جو بڑی کفایت شعاری کے ساتھ جمع کیا تھا۔ ایک امید موہوم کے ساتھ انھوں نے لندن جانے کا پروگرام بنایا تاکہ اودھ کی ریاست پر اپنا حق ثابت کریں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بہت کچھ خرچ کرنے کے بعد خرانس ہوتے ہوئے مکۂ معظمہ اور اس کے بعد بغداد پہنچے اور یہیں ختم ہو گئے۔ دی تاسی نے لکھا ہے :-

> "یہ شمس الدولہ کے بیٹے اور غازی الدین حیدر کے بھائی ہیں جنھوں نے فارسی لغت "ہفت قلزم" لکھی تھی۔ ان کے دوسرے بھائی محمد علی والیِ اودھ ہیں۔ یہ تینوں اودھ کے پہلے والی سعادت علی خاں کے بیٹے ہیں۔ اقبال الدولہ کو اودھ کے ربرخاست شدہ تخت کے ولی عہد سے مخاطب کیا جاتا تھا) اقبال الدولہ نے اپنی نوجوانی میں ۱۸۳۲ء میں بمقام کلکتہ ایک کتاب فارسی و انگریزی میں شایع کی تھی جس کا نام اقبال فرنگ تھا اس میں ان کی اپنی تصویر بھی ہے ——

خطبات دی تاسی جلد دوم ص ۶۷

www.taemeernews.com

راجارام موہن رائے

بنگالی برہمنوں کے ایک معزز خاندان سے تھے اُس کے باپ کا نام رانا کانت رائے تھا ۱۷۷۲ء میں ہگلی کے قریب پیدا ہوئے بنگالی اور فارسی کی تعلیم مکمل کر کے عربی زبان سیکھنے کے لیے پٹنے گئے اس کے بعد قرآن پاک کا مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو بُت پرستی سے نفرت ہو گئی اور اس کے بعد ہندوؤں کو بُت پرستی سے خدا پرستی کی جانب لانے کے لیے ۱۸۲۸ء میں ایک جماعت بنائی جس کا نام برہمو سماج رکھا تھا۔ دس بارہ سال یہ تحریک ذرا سست روی کے ساتھ رہی اس کے بعد دیوبندر ناتھ ٹیگور نے اس میں تازہ روح پھونکی۔ راجارام موہن شاہ دہلی کی جانب سے سفیر بن کر لندن گئے تھے۔ تاریخ طلسم ہند میں طوطارام شایاں نے لکھا ہے:۔

"مرزا افضل بیگ خاں نے بابورام موہن رائے بنگالی کی جانب سے شاہ عالم کو عرضی بھجوائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ارباب کونسل (برطانیہ) سے کوئی اندیشہ نقصان کا نہیں۔ اگر مجھے سفارت پر مامور کیا گیا تو میں اپنا سر بیچ کر جانب ولایت جاؤں گا۔" حضرت ظل سبحانی نے دو ہزار روپیہ مشاہرے پر لندن روانہ کر دیا۔ لندن میں اس سفیر شاہی کی مناسب عزت و توقیر کی گئی اور انتظام سلطنت کے بارے میں تسلی آمیز رویئے کا اظہار کیا گیا۔ یہی وقت تھا کہ مسٹر فریزر ریذیڈنٹ کے طور پر آئے اور شاہ عالم سے نئے عہدنامے کے بارے میں درخواست اور اس سلسلے میں پچیس ہزار روپیہ ماہانہ پیش کش دینے کا اظہار کیا۔ شاہ عالم نے ابھی رضامندی ظاہر نہیں کی تھی کہ بابورام موہن رائے کے انتقال کی خبر ملی۔" (ص ۱۹۲)

لیکن قاموس المشاہیر جلد اول ص ۲۵۴ میں یہ بیان اس طرح ہے:۔

"نومبر ۱۸۳۰ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے اپنا سفیر مقرر کر کے اور راجہ کا خطاب دے کر ولایت کو بھیجا وہاں بادشاہ انگلستان کی حضوری حاصل ہوئی۔ پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کے متعلق اصلاحی تجاویز پیش کرنے کا موقع دیا گیا جس سے ان کی پولٹیکل واقفیت کا پتا چلتا ہے۔"

طلسم ہند میں یہ بھی لکھا ہے کہ رام موہن رائے نے قیام لندن کے زمانے میں ایک ولایتی عورت سے بواسطۂ عشق و محبت عقد کر لیا تھا۔

اور اسی بارے میں کتاب "راجارام موہن رائے" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کے خطاب اور بادشاہ دہلی کی طرف سے ان کی وکالت کو قبول کرنے میں عذر کیا مگر نہایت ممتاز شخص کی سی عزت رام موہن رائے کی کی گئی۔"

اس فاضل شخص نے ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء کو جمعہ کے روز رات کے ڈھائی بجے برسٹل میں وفات پائی اور اس کا تابوت وہاں کے ایک پُر فضا قبرستان میں دفن کیا گیا۔

میر محمد حسین لندنی

لکھنؤ کے ارباب علم و ہنر میں شامل اور سیر و سیاحت کے شوقین تھے۔ وطن سے نکل کر ولایت فرنگ پہنچے اور وہاں سکونت

www.taemeernews.com

اختیار کرلی اسی بنا پر لندنی مشہور ہو گئے۔ عام طور پر فارسی لکھتے تھے مگر اردو میں بھی بند نہیں تھے۔ دو رباعیاں اور دو شعر ان کے دستیاب ہوئے جنھیں یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

نے کار بجوہر د نہ مقصد عرض است　　از ہستیٔ ما صنعتِ صانع غرض است
زنہار، فریب زندگانی مخورید　　لذت الم است تندرستی مرض است

گر بادہ حرام آمد و تریاک حلال　　زنہار فریب آں مخور، چشم بمال
در زندگی و مرگ چہ فرق ست ببیں　　ے تریاق ست و آں دگر سم بہ مآل

موج مے می افگند زنجیر در پائے جنوں　　عطسہ می پیچد بمغز عقل از بوئے شراب

با من ستارہ بد شد و آں ماہ پارہ ہم　　از بخت شکوہ نیست مرا و ز ستارہ ہم

خلیل

مرزا محمد خلیل ہگلی کے قریب جیجیرہ نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئے۔ ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلکتے میں بہ تلاش ملازمت آئے یہاں عمدۃ التجار حاجی محمد کربلائی نے ہونہار نوجوان سمجھ کر انھیں اپنی فرزندی میں لے لیا اور تجارت کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے ان کو لکھنؤ بھیج دیا۔ لکھنؤ کے شعر و شاعری کے ماحول سے متاثر ہو کر شعر گوئی کی دھن لگ گئی اور مرزا محمد حسن قتیل کی نگاہِ کرم اور فیض اصلاح نے مزاج ہی بدل دیا۔ آخر پدر مجازی کی وفات کے بعد تجارت کو خیرباد کہا اور ایک انگریز کی ہمراہی میں لندن چلے گئے اور وہیں بقیہ زندگی گزار کر فوت ہو گئے ان کا اردو کلام دستیاب نہ ہو سکا فارسی کی ایک رباعی اور دو شعر دستیاب ہوئے وہ آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ؎

صندل نہ کند درد سرم را سودے　　بوئے ندہد برآتشِ من عودے
تا چند خلیل از عظمت اے عہد شکن　　جاری کنند از دیدۂ پُر نم رودے

خلیل را کہ تو کشتی چہ جرم دیدی ازو　　کہ ریختی نبریں خونِ بے گناہے را

اشکم از دیدۂ تر متصل آید بیروں　　گیرم از ہجر تو چنداں کہ دل آید بیروں
(روز روشن ص ۲۳۵)

سید احمد

ہندوستان کے مشہور ادیب تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندوستان سے انگلستان چلے گئے تھے وہاں لندن یونیورسٹی کالج میں ایف فال کونر کی جگہ کئی سال اردو پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے اور جب ۱۸۶۰ء میں کیمبرج میں اردو

www.taemeernews.com

پروفیسری قایم ہونے کا فیصلہ ہوا تو انھوں نے وہاں اپنے تقرر کے لیے کوشش کی۔ لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کی جگہ میجر اسٹیفن کا تقرر ہو گیا۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی نے اپنے ۱۱ر فروری ۱۸۶۱ء کے خطبے میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ابھی تک لندن میں ہیں ——

مرزا ابوطالب خاں

یورپ (لندن) کی سیر کرنے والے ایک صاحب ہیں۔ جن کو بعض وجوہ سے پہلا مسافر لندن کہا جا سکتا ہے۔ یہ مرزا محمد بیگ خاں کے لڑکے تھے جنھیں دی تاسی نے لندنی لکھا ہے، ان کا انتقال ۳ر ذی الحجہ ۱۱۸۲ھ کو ہوا تو لائق بیٹے نے باپ کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ لکھا ؎

محمد ابن شفیع آں خجستہ والدِ من　　　　کہ بود ذی شرف از فضل و علم و عقل و ادب
شناخت چوں بہ بہشتِ بریں از یں عالم　　　　زتاب فرقتش اُفتاد جانِ ما در تب
چو داشت با ہمہ کس روئے راستے او زاُو　　　　بدونِ مہر رُخش روز عالمے شدہ شب
دقوعِ ایں غمِ عظمیٰ بہ ما دلِ افگاراں　　　　چو بود از سنہ ہجرت رسولِ عرب
ہزار و یک صد و ہشتاد و دو، سیوم از حج　　　　چناں نوشت بہ الہام سالِ رنج و تعب
نمودہ طوفِ بہشتِ بریں دوم تاریخ　　　　زروئے حزم و یقیں آمد از دلم سوئے لب

۱۱۶۴　　　　۸ + ۱۰ = ۱۸ = ۱۱۸۲

(مفتاح التواریخ صفحہ ۳۴۹)

ترکی النسل مرزا ابوطالب خاں کی ولادت ۱۷۵۲ء / ۱۱۶۵ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۷۷۵ء میں نواب مختار الدولہ وزیر آصف الدولہ کی طرف سے اٹاوہ اور دوسرے اضلاع دوآبہ کے عامل مقرر ہوئے انھوں نے ۱۷۹۵ء / ۱۲۰۳ھ میں کپتان ڈیوڈ رچرڈسن کی ہمراہی میں انگلستان کا سفر کیا اور جب وہاں سے ۱۸۰۳ء / ۱۲۰۸ھ میں واپس آئے تو اپنا سفرنامہ "آثر طالبی فی بلاد افرنجی" کے نام سے شایع کیا۔ یہ سفرنامہ رام پور اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف خلاصۃ الافکار بھی ہے۔ اس تصنیف پر قاضی عبدالودود صاحب کا ایک مضمون غالباً رسالہ نوائے ادب بمبئی کی کسی اشاعت میں نکلا تھا۔

مرزا ابوطالب خاں نے مرزا یوسف باقر نام کا ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑ کر ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ میں وفات پائی۔
(قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۴۹)

مرزا یوسف باقر غالباً لندن کے سفر میں ان کے ساتھ تھے وہاں کے آٹھ سال کے قیام میں وہ مغربی طرز معاشرت سے اچھے خاصے متاثر ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۷ء / ۱۲۴۳ھ میں اپنے آبائی مذہب سے روگردانی اختیار کر کے مسیحی ہو گئے ——

میر حسن علی لندنی

یہ الماس علی خاں کے ملازم و پیش نماز میر حاجی شاہ کے لڑکے تھے۔ لکھنؤ میں بہت پریشاں حال رہے تو لندن کا رُخ کیا۔ بارہ سال کے قریب وہاں مقیم رہے۔ انگریزوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ایک ولایتی عورت کو اپنی بیوی بنا کر لے آئے تھے اُس زمانے میں کسی کا لندن جانا اور وہاں سے واپس آنا تعجب کی بات تھی۔ ان کی بیوی بادشاہ بیگم کے محل میں آتی جاتی تھیں اُ

www.taemeernews.com

بہت کچھ پائی تھیں ۔ ان کا عقد لندن میں ایک گرجا میں ہوا تھا اور اس بی بی کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ میر صاحب مجرد ہیں ۔ جب وہ لکھنؤ میں آئی تو کئی مہینے کے بعد پتا چلا کہ ان کی بیوی بھی ہے ۔ آخر برداشتہ خاطر ہوکر ریذیڈنٹ کی بیوی کے ساتھ ولایت چلی گئی اور وہاں ایک اسکول میں ملازمت کرلی ۔ اس خاتون کی ایک تصنیف "احوال رسمیات وکوائف لکھنؤ" دو جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

میر حسن علی کو تاحینِ حیات سو روپے پنشن ملتی رہی ۔ کئی مرتبہ داروغہ ریذیڈنٹ بنائے گئے ۔ آخر جنت مکان (نواب آصف الدولہ) کے عہد میں سفیر شاہی ہوئے ۔ شوال ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں انتقال کر گئے ۔ یہ ۱۲۰۲ھ سے قبل لندن سے واپس آ چکے تھے اور جب واجد علی شاہ اختر انتزاع سلطنت کے بعد لکھنؤ سے کان پور کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ان کے ساتھ کان پور تک گئے تھے ، مگر ضعف پیری کی وجہ سے آگے نہ جا سکے تھے۔

(قیصر التواریخ جلد اول ص ۲۳۱)

نواب رئیس مرشد آباد

کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ

"۱۲۷۲ھ سے قبل نواب مرشد آباد اپنی دادرسی اور ریاست کی بازیابی کے لیے لندن جا چکے تھے اور وہاں جب انھیں ناکامی کا سامنا ہوا تو ہندوستان واپس آنے کی ہمت نہ کر سکے ۔ ہر چند ان کی والدۂ محترمہ نے طلبی نامے ان کے نام روانہ کیے لیکن وہ آنے پر تیار نہیں ہوئے اور یہ توفیق بھی انھیں نہیں ہو سکی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت ہی سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل کر سکتے ۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۸۲)

جنابہ عالیہ والدہ واجد علی شاہ

۷ فروری ۱۸۵۶ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ کی سلطنت پر قبضہ کیا ۔ واجد علی شاہ کلکتے روانہ ہوئے ۔ وہ خود حق طلبی کے لیے ولایت جانے کا ارادہ کر رہے تھے ۔ لیکن لکھنؤ سے کلکتے تک کے سفر نے ان کو اس قدر مضمحل کر دیا کہ اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا اور طے ہوا کہ جنابہ عالیہ (والدہ واجد علی شاہ) جنرل حشمت جنگ اور ولی عہد بہادر لندن جائیں اور ملکہ وکٹوریہ کے سامنے اپنا حال زار عرض کریں ۔ ممکن ہے کہ وہ سلطنت اودھ پر برطانوی قبضے کی تنسیخ پر آمادہ ہو جائیں ۔ ۱۴ شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸ جنوری ۱۸۵۶ء کو رات کے ۱۲ بجے لندن روانگی کا بندوبست کیا گیا ۔ اس قافلے میں زن و مرد مل کر ایک سو دس آدمی تھے جن میں مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی سفیر شاہی بھی تھے ۔ دس لاکھ روپیہ زادِ راہ و خرچ قیام ولایت کے لیے دیا گیا اور بیش بہا تحفہ تحائف کے ساتھ اس قافلے کو روانہ کیا گیا ۔ اس قافلے کے ایک رکن شوکت الدولہ نواب محمد خاں اور ان کا خدمت گار مصاحب روانگی سے قبل ہی وبائی ہیضے میں لقمۂ اجل ہو گئے ۔ یہ قافلہ ۱۸ ذی الحجہ مطابق ۱۷ اگست ۱۸۵۶ء کو جنوبی لندن کے شہر ساؤتھمپٹن بندرگاہ پر اترا ۔ یہاں متعدد امرائے ہندوستان ملے ، جن میں میر جعفر علی خاں رئیس سورت ، مرزا علی اکبر خاں رئیس ارکاٹ اور ان کے منشی حیدر جنگ مدراسی ۔ حافظ صدر الاسلام مدراسی ، مولوی غلام خاں وکیل ناگ پور اور سید ابراہیم ناگپوری قابل ذکر ہیں اور جو کئی برس سے اپنی دادخواہی کے سلسلے میں یہاں ٹھہرے تھے ۔ قافلہ شاہی کا استقبال کیا ۔ وہاں چند دن قیام کرنے کے بعد لندن چلے گئے اور ابھی ملکہ وکٹوریہ کے جناب میں اپنا استغاثہ پیش کرنے کا موقع بھی نہ پایا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا

www.taemeernews.com

ہنگامہ ہو گیا جس میں واجد علی شاہ کے خاندان نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ اس طرح واپسی سلطنت کی امید کا خاتمہ ہو گیا اور قافلہ شاہی کے سامنے واپس آنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ اسی واپسی کے دوران ۲۲ رجمادی الآخر ۱۲۷۴ھ کو جناب عالیہ نے اور ۱۷ رجب کو اسی سال سکندر حشمت بہادر نیز راحت آرا بیگم صغر سن دختر مرزا ولی عہد بہادر نے انتقال کیا۔ صاحب افضل التواریخ کی یہ رائے ہے :۔

"دیکھیے قدرتِ خدا۔ کہاں لکھنؤ کی ولادت اور کہاں فرانس کی ممات۔ یہ سامانِ ظاہر صرف اس واسطے پیش آیا کہ خاک اجسامِ مغفورین خاک فرانس میں مل جائے۔"

سید عبداللہ

ہندوستان سے برطانیہ جانے والے لوگوں میں ان کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ گارساں دی تاسی نے اپنے خطبات اور مقالات میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔

سید عبداللہ کے والد کا نام سید محمد خان بہادر تھا جو ۱۸۱۵ء سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے۔ ۱۸۱۸ء میں دکن میں اسسٹنٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر مقرر کیے گئے۔ ۱۸۲۵ء میں وہاں سے اسی عہدے پر جبل پور چلے گئے اور یہاں انھوں نے اپنے فرزند سید عبداللہ کو ۱۸۳۹ء میں جبل پور کالج میں داخل کرایا جو کلیتاً انگریزی حکومت کے زیر انتظام تھا۔ سید عبداللہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے اس کالج میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء میں سید محمد نے انگریزوں کے ساتھ بڑی ہمدردی کا برتاؤ کیا اور ان کے ساتھ پوری وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس کے صلے میں انھیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور گراں قدر پنشن عنایت کی گئی۔ لیکن وہ اس سے کچھ زیادہ استفادہ نہ کر سکے اور ۲۰ نومبر ۱۸۶۸ء کو لکھنؤ میں دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ سید عبداللہ منشی غلام حسین جائسی کے نواسے تھے جو رکٹس صاحب کے زمانے میں الکزینڈر صاحب تاجر کلکتہ کی سفارش کی بنا پر ریذیڈنسی میں میر منشی بنائے گئے تھے اور کچھ دن کے بعد اپنے وطن جا کر اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ جب کرنل لائٹ صاحب نے کسی خاص امر کی تحقیقات کے سلسلے میں انھیں لکھنؤ طلب کیا تو اظہار واقعہ سے بچنے اور عزت و آبرو بچانے کی غرض سے تمنچہ مار کر مر گئے اور پردہ دری سے بچ گئے۔ سید عبداللہ پہلے محافظ دفتر سفارت کلکتہ تھے۔ بعد میں کسی طریق سے ایک انگریز کے ساتھ لندن پہنچ گئے۔ وہاں کے رئیس ازراہِ جوہر شناسی عزت کے ساتھ پیش آئے۔ مناسب صورتِ معاش بھی نکل آئی۔ چند روز کے بعد ایک ولایتی عورت سے جو کسی پادری کی بہن اور ایک افسر فوج کی بیٹی تھی۔ بعد ایجاب مذہب مسیحی شادی ہوئی کیونکہ عقد شرعی مذہبِ عیسائی اختیار کیے بغیر نہیں ہو سکتا تھا ——　　　(تاریخ اودھ جلد دوم ص۱۸۵)

دی تاسی لکھتے ہیں :۔

" سید عبداللہ نے جو بیوہ ملکہ اور شاہزادگان اودھ کے ساتھیوں میں سے ہے جب اس کو (۱۸۵۸ء میں) جنرل ہنری[1] لارنس کے مرنے کی خبر ملی جو اس شورش میں لقمۂ اجل ہوئے تو اس

---

[1] ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں یہ صوبۂ پنجاب میں تعینات تھا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ اچھا ربط و ضبط رکھتا تھا اور اردو کا اچھا جاننے والا تھا۔ ایسے وقت میں کہ دوست دشمن کی پہچان مشکل تھی یہ بھی کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

www.taemeernews.com

نے ایک اردو مثنوی لکھ کر شایع کی ۔ عبداللہ ایک زمانے میں پنجاب کے کسی انگریزی دفتر میں مترجم رہ چکے تھے اور رلارنس سے خاص طور سے واقف تھے۔ اس نے اپنی اس نظم کا انگریزی ترجمہ منظوم بھی خود کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس روانی کے ساتھ انگریزی زبان لکھنے پر قادر ہے "

اس کے بعد دی تاسی نے اصل نظم کا ترجمہ شایع کیا ہے جس کے آخر میں وہ کہتا ہے :۔

"اس نظم کے آخری شعر سے اس سورما (لارنس) کی تاریخ وفات سنہ عیسوی و ہجری دونوں میں نکلتی ہے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ شریف و نجیب سرہندی لارنس مرگ' اس کا نام نامی اس کی یادگار رہے ۔ اس شعر کے پہلے مصرع کے حروف کے اعداد جوڑیں تو ۱۸۵۷ء نکلتا ہے اور دوسرے مصرع سے ۱۲۷۴ھ " (خطبات دی تاسی حصہ اول ص۲۲۵)

سید عبداللہ کے بارے میں دی تاسی کا بیان ہے :۔

"اس نامور ہندوستانی نے لندن میں ربع صدی گزارنے کے بعد جہاں انھوں نے ایک انگریز (رومن) کیتھولک خاتون سے شادی کی ہے اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا ہے ۔ ان کے دوستوں کو اس کا افسوس ہے کہ انگلستان ایک ایسے قابل ایشیائی کی موجودگی سے محروم ہو جائے گا جو اسلامی مشرقی ادب اور انگریزی زبان و ادب کا یکساں ماہر ہے اور جس کی انگریزی تحریر حیرت انگیز طور پر شستہ ہوتی ہے ۔ وہ یونیورسٹی کالج میں ہندوستانی کے پروفیسر تھے اور سیکڑوں شاگردوں نے اُن سے فیض پایا جن میں ان کے بہترین شاگرد ایڈورڈ ایچ پامر ہیں[1] یہ (پامر) کیمبرج میں عربی کے پروفیسر ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ عربی بڑی روانی سے لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ فارسی اور اردو سے بھی کما حقہٗ واقف ہیں ۔

سید عبداللہ صرف پروفیسر کی حیثیت سے ہی ممتاز نہیں بلکہ اپنے مفید اُردو اور ہندی نشریات کی وجہ سے بھی مشہور ہیں "

دی تاسی نے لکھا ہے کہ :۔

"اخبار پنجابی مورخہ ۵ رجولائی ۱۸۶۷ء میں سید عبداللہ کے بارے میں تعریف سے پُر ایک مضمون چھپا ہے ۔ یہ مضمون اس تفصیلی خط کے ترجمے کا ضمیمہ ہے جو پنجاب کے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک مشہور افسر اور قابل طبیب نے لکھا ہے "

مقالات ص۹

---

[1] ایڈورڈ ایچ پامر سید عبداللہ کے بہترین شاگردوں میں تھے ۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد کیمبرج میں عربی کے پروفیسر بنے وہ نہ صرف عربی بولنے لکھنے اور تعلیم دینے میں کامل تھے بلکہ ہندوستانی اور فارسی میں بھی اتنے ہی ماہر تھے ۔ (مقالات دوم ص۹)

www.taemeernews.com

سید عبداللہ نہایت دلچسپ اور پُر مذاق آدمی تھے۔ ان کی بدولت مسلمان نوجوانوں کو لندن میں ایک رہنما مل جاتا تھا جو اُن کو انگریزی کی اعلیٰ سوسائٹی میں ملنے جُلنے کے آداب سے واقف کرا سکتا تھا۔

سید عبداللہ اردو زبان کے بہت اچھے ادیب تھے۔ ان کا قول تھا کہ "ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہندوستانی (اردو) ہی بہ اعتبار اپنی نزاکت اور خوبی کے دیگر دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

ایک موقع پر حکومت برطانیہ نے تجویز کیا کہ ناموں کو مستقلاً رومن کے بدلے انگریزی میں لکھا جائے۔ عام طور پر اس پر عمل کیا گیا۔ لیکن سید عبداللہ نے اپنے نام کی صورت خطی میں کوئی تبدیلی نہیں کی بدستور سابق لکھتے رہے۔

لندن میں جو ہندوستانی مسلمان اردو ادیب قیام پذیر تھے ان میں سید عبداللہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ لندن کے اخبار اور نیٹل مرکلر نے جب ہندوستانی کی اہمیت کو محسوس کر کے اس زبان میں اپنے اشتہارات چھاپنا شروع کیے تو یہ کام انھیں کے سپرد تھا۔ سید عبداللہ نے اردو کی ترویج واشاعت کے لیے جو کوششیں کیں ان کی تھوڑی سی جھلک اُس خط سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ کے نام لکھا تھا اور جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ حکومت ہند آئندہ سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں ہندوستان کی بعض مروجہ اور زندہ زبانوں کو لازمی قرار دے جن کو سنسکرت اور عربی کے مقابلے میں زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ سید عبداللہ نے ایک یادداشت نواب واجد علی شاہ کی خدمت میں ارسال کی تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ استرداد مملکت شاہی کے بارے میں یقین ہے کہ ملکۂ معظمہ انصاف سے کام لیں گی اور گورنر جنرل کو ضروری شرائط روانہ کریں گی جن کا تسلیم کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہوگا۔ اس تحریر کی بنا پر واجد علی شاہ نے "اصلاح الدولہ" کے خطاب کی مہر تیار کرائی جسے مفتاح الدولہ نے ڈاک میں لکھنؤ سے روانہ کر دیا لیکن یہ اُمید صحیح ثابت نہ ہوسکی۔

۱۸۷۵ء میں جب پرنس آف ویلز ہندوستان کی سیر کو آئے تھے تو ان سے ملنے والوں میں سید عبداللہ بھی شامل تھے جو اُن کے پُرانے شناسا تھے اور اس وقت سے جانتے تھے جب سید صاحب ان کی والدہ ملکہ وکٹوریہ سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے شاہی محل آیا کرتے تھے۔ اب وہ لندن سے ہندوستان واپس آچکے تھے اور صوبہ بہار میں انسپکٹر آف اسکولز کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ اس عہدے پر کب تک برقرار رہے اور کب وفات پائی اُن باتوں کا علم نہ ہوسکا۔

نواب میر جعفر علی خاں رئیس سورت

سہسوان ضلع بدایوں کے ایک بزرگ سید سرفراز علی خاں نام کے تھے۔ وہ بڑودے میں رہتے تھے اور وہاں کے اسلحہ دار سردار کی حیثیت کے مالک اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے معتمدین میں تھے۔ بڑودے کے ایک نواب خاندان میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کی عالی شان حویلی اب تک موجود ہے جسے میر صاحب کا باڑہ کہا جاتا ہے۔ میر سرفراز علی کے دو لڑکے تھے ایک کا اکبر علی خاں اور دوسرے کا نام میر جعفر علی خاں تھا اور دونوں کی شادی افضل الدین سورتی کی دو لڑکیوں سے ہوئی تھی۔ میر ابراہیم علی وفا بڑودوی میر اکبر علی خاں کے لڑکے کا نام تھا۔

میر سرفراز علی خاں کے انتقال کے بعد سلحداری کا منصب میر اکبر علی خاں کو ملا اور وہ بروڈے ہی میں رہے لیکن

www.taemeernews.com

میر جعفر علی خاں اپنی سسرال میں سورت میں رہ گئے۔ ۱۸۴۳ء میں نواب فضل الدین خاں کے انتقال کے بعد کمپنی نے میر جعفر علی خاں کو ان کا جانشین تو مان لیا لیکن وظیفے کی رقم نصف کر دی۔ میر جعفر علی خاں نے ولایت جا کر اپنا قضیہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کیا۔ اس سفر میں منشی لطف اللہ فریدی ان کے ترجمان اور حکیم بدر الدین ان کے طبیب کی حیثیت سے ان کے ساتھ گئے تھے۔ آخر ۱۸۵۵ء میں کمپنی نے ان کا وظیفہ دوبارہ ایک لاکھ کر دیا۔

نواب میر جعفر علی خاں نے ۱۲ راگست ۱۸۶۲ء کو سورت محل میں وفات پائی۔

نواب صاحب انگریزوں اور ہندوستانیوں میں یکساں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بڑے نیک مزاج اور فیاض شخص تھے۔ انھوں نے یورپ کے دو سفر کیے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۴۴ء میں انگلستان گئے۔ دوسری مرتبہ ۱۸۵۳ء میں، دوسری مرتبہ کے سفر میں وہ پیرس بھی گئے تھے۔ ان کے مستقل رفیق لطف اللہ اپنی خود نوشت سوانح عمری کے اعتبار سے مشہور ہیں جس کو یورپ میں شہرت حاصل ہے۔

میر اولاد علی اودھی

سید اولاد علی اس قافلے کے ایک رکن تھے جو مادر ملکہ اودھ کے ساتھ یورپ آیا تھا۔ موصوف واپسی کے وقت پیرس میں انتقال کر گئیں تو یہ ڈبلن چلے گئے اور وہاں کی جامعہ میں اردو، فارسی اور عربی کی پروفیسری پر فائز ہوئے۔ یہ خدمت انھیں ان زبانوں کی اعلیٰ قابلیت کے باعث ملی تھی۔ دی تاسی کا بیان ہے:-

> "ان زبانوں کی مغلق مشکل ترین عبارتیں بھی وہ بڑی آسانی کے ساتھ سمجھا سکتے تھے۔ خود دیسی لوگوں میں ان کے علم و فضل کی ایسی دھاک تھی کہ وہ انھیں فخر ہندوستان قرار دیتے تھے ان کا ایک مضمون ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ۲۹ رجنوری ۱۸۶۷ء کے اودھ اخبار میں شایع ہوا تھا"
>
> (خطبات جلد دوم ص۱۶۵)

واجد علی شاہ نے انتزاع سلطنت اودھ کے بعد کلکتے پہنچ کر جب ایک سفارت ولایت بھیجنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے موزوں سفیر کا انتخاب لازم ہوا۔ اس سلسلے میں مسٹر پیٹرسن، سید حسین شیروانی متمنی سفارت ہوئے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر میں میر اولاد علی جو لکھنؤ کے مشہور جعل ساز سمجھے جاتے تھے۔ دستور معظم سے دو ہزار روپے زاد راہ لے کر اکرام الدولہ کے ساتھ تعارف کی بنا پر نواب خاص محل کی خدمت میں پہنچے۔ (قیصر التواریخ جلد دوم ص۱۲۹)

لیکن واجد علی شاہ ان کے سابقہ کرتوتوں سے باخبر تھے۔ اس لیے سفارت کا اعزاز حاصل کرنے سے معذور رہے۔ البتہ جب قافلہ شاہی لندن روانہ ہو چکا تو اس کے پندرہ دن بعد ایک اور قافلے کو لندن بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ یہ قافلہ جرأت علی خاں، باقر علی بھائی ناخدائے جہاز شیخ علی انجدا اور ہرمزجی پارسی تھے۔ میر اولاد علی بھی اسی قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔ انھوں نے لوگوں کے اشتباہ کو دور کرنے اور بدگمانی سے بچنے کے لیے اپنا لقب فرزند علی خاں مشہور کر دیا تھا اور منت سماجت کر کے اہل قافلہ کو آمادہ کر لیا تھا کہ ان کا اصلی نام ظاہر نہ کریں۔ اس طرح وہ نواب منور الدین کی نگاہوں سے بچ گئے۔ جن کو واجد علی شاہ نے مسافرانِ لندن کی جانچ پڑتال کے لیے جہاز پر بھیجا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ میر اولاد علی اپنی مخصوص عادتوں کے باوجود مذہبی جذبات سے خالی نہ تھے جس کی تصدیق ان کے اس واقعہ

www.taemeernews.com

سے ہوتی ہے :-

۱۸۷۵ء میں ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر باسورتھ اسمتھ ہے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "محمد اور اسلام" ہے۔ یہ کتاب دینِ حنیف کی تائید میں تھی اور کئی مرتبہ یورپ میں چھپی تھی۔ میر اولاد علی نے چاہا کہ اس انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ اودھ اخبار لکھنؤ میں شایع ہو اس کے بعدہٗ بہ کتابی صورت میں شایع کیا جائے اور اس غرض سے ایک خط اودھ اخبار کے مالک کو لکھا جسے موصوف نے "مسلمانوں کو مژدہ" کے عنوان سے شایع کیا اور مضمون شروع کرنے سے قبل اپنی طرف سے ایک اداریتی نوٹ بھی شایع کیا۔ یہ خط ۱۱ر نومبر ۱۸۷۵ء کے ایڈیشن میں ان الفاظ میں شایع ہوا :-

> ہندو دھرم سے آپ کا اُنس ایک فطری چیز ہے لیکن آپ نے عربی، فارسی اور اردو میں کتابیں چھاپ کر اسلامی علوم کی بڑی خدمت کی ہے اور انگریزی کتابوں کے ترجمے چھاپ کر ساری دنیا کو فائدہ پہنچایا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو شامل کرکے جن کی خاطر آپ نے قرآن شریف اور حدیثوں کی کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ امر آپ کے کردار کی شرافت کی دلیل ہے اس لیے مجھے توقع ہے کہ مسٹر اسمتھ کی ایک قابلِ قدر کتاب کے بعض حصے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں ان کی آپ اپنے اخبار میں اشاعت فرمائیں گے۔ اصل میں میرا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کے اقتباسات کا ترجمہ کروں اور آپ سے درخواست ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کے اجزا شایع کرتے رہیں۔ جب ترجمہ ختم ہو جائے گا تو مصنف کی اجازت حاصل کرکے میں اسے کتابی صورت میں چھاپنے کا انتظام کروں گا۔ چونکہ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ہی دیس میں بستے ہیں اور ان میں بھائیوں کا سا میل جول ہے۔ جب کوئی غیر ان کے مذہب پر کسی مادی مفاد کے لیے نہیں بلکہ غیر جانب داری کے ساتھ محض صداقت کی خاطر کچھ لکھتا ہے تو دونوں اُسے توجہ سے پڑھتے ہیں۔ "محمد اور اسلام" کے نام سے لندن اور امریکہ میں جو کتاب شایع ہوئی تھی اور اب لندن میں مکرر چھپی ہے اس کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ انگلستان ہی نہیں سارے یورپ و امریکہ کے اخباروں نے اس کی تعریف کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرٹھ کا اخبار عالم، پنجابی اور دہلی رام پور حیدر آباد وغیرہ کے دوسرے اسلامی اخبار میرے ترجمے کو نقل کریں گے اور شاید بعض عیسائی جرائد بھی اس کی اشاعت سے دریغ نہ کریں۔ بالآخر اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ انتخاب مدراس۔ بمبئی۔ بنگال تینوں پریسیڈنسیوں میں پھیلیں۔ مسٹر اسمتھ نے اپنی کتاب کو چار حصوں یا بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ تمہید، سیرت محمد، اسلام، اسلام اور عیسائیت۔ انگریزی کے تمام چھوٹے بڑے اخباروں میں چاہے روزنامے ہوں یا ہفت روزہ، مصنف کی قابلیت، معلومات، انصاف اور صاف گوئی نیز کتاب کی عمدگی کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مسلمان بھائیوں اور ملک کے نیک نیت عیسائی اخباروں بلکہ خود سر ولیم میور جیسے لوگوں کو اس کتاب کے مفید حصوں سے آشنا کرانے کا ارادہ کیا ہے تاکہ وہ بھی جانیں کہ ان کے ایک ہم وطن کے خیالات مسلمانوں کے بارے میں کیا ہیں۔ خاص کر اس لیے بھی کہ اس مصنف نے جگہ جگہ سر ولیم کے دلائل کا جواب بھی دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تیرہ سالی

www.taemeernews.com

بعد ایک ایسا عیسائی مصنف پیدا ہوا جس نے دین محمدی سے متعلق حق گوئی سے کام لیا ہے ورنہ اب تک اس کے خلاف کیا زہر نہیں اگلا گیا۔

میر اولاد علی اُردو زبان کے سچے ہمدرد اور اس قسم کے ہم وطنوں کے خلاف تھے جو بے ضرورت اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے تھے۔

انگریزی الفاظ کے بارے میں میر اولاد علی کی رائے یہ تھی :۔

ہندوستانی اخباروں کا انداز تحریر خالص ملکی ہونا چاہیے۔ انگریزی ہندی کا مخلوط نہیں۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار سے ہماری زبان کی باڑہ ماری جائے گی۔ یوں بھی انگریزی کے روز افزوں استعمال سے دیسی زبان کی اہمیت گھٹ چکی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سابق میں یورپ کے علمی یا درباری یا سفارتی حلقوں میں فرانسیسی زبان کے چلن نے قومی زبانوں کو ترقی حاصل نہ کرنے دی تھی۔ اب جاکر اس کا احساس ہوا ہے اور یوروپین زبانوں نے فرانسیسی کے تسلط سے آزادی حاصل کی ہے اس طرح توقع کرنی چاہیے کہ ایک دن ہندوستانی خواب خرگوش سے بیدار ہوں گے اور تاریکیوں میں اپنی زبان کو ڈھونڈنے جائیں گے اور شاید اُس وقت یہ کوشش بے سود ہوگی۔ یہ تو فطری امر ہے کہ انگریز اپنی زبان کو ہندوستان میں ملک کی عام زبان کے طور پر رائج کرنے کی کوشش کرے گا لیکن سید احمد خاں اور چند مدیرانِ جرائد کو جنھیں انگریزوں کی اس خواہش سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ایسی کیا پڑی ہے کہ بے سوچے سمجھے اس تحریک میں انگریزوں کا ہاتھ بٹائیں۔ اصل میں تو اہلِ ہند کو قدیم عرب کی تقلید کرنی چاہیے جنھوں نے اپنی زبان میں یونانی کتابوں کو منتقل کیا اور صرف وہ یونانی الفاظ اپنائے جن کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ محال تھا۔ ہمیں کبھی یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے کہ آج کل کی طرح انگریزی الفاظ تو لے لیں اور ان کے ہم معنی اُردو الفاظ کو تج دیں۔ آخر عیسیٰ کی جگہ جیس، موسیٰ کی جگہ موزز، داؤد کی جگہ ڈیوڈ اور محمد کی جگہ ماہومیٹ لکھنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ کسی احمق نے تو الہ آباد کے بدلے اللہ آباد لکھنا شروع کر دیا تھا جس کے باعث اس شہر کا نام ہی بدل گیا اور ایک اور بیوقوف نے سراج الدولہ کو سورج الدولہ لکھ مارا اور انگریزی میں یہ "املا" چل پڑا ہے۔ انگریزی الفاظ کا رواج علوم و فنون کی اصطلاحات کے معاملے میں تو شاید قابل معذوری ہو۔ وہاں بھی عربی و سنسکرت میں بہت سے ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو مروّجہ زبان میں نہیں ہیں۔ علاوہ بریں ہم اصطلاحات کے لیے مرکب فارسی یا سنسکرت الفاظ وضع کر سکتے ہیں اور یہ انگریزی کے استعمال سے یقیناً بہتر ہوگا۔ انگریزی نے بھی تو یونانی ولاطینی کی اصطلاحات مستعار لی ہیں۔ پھر ایسی زبان کے آگے ہاتھ کیوں پھیلایا جائے جو خود دوسری زبانوں کی محتاج ہو۔ مثل مشہور ہے کہ بھکاری کے پاس بھیک نہیں مانگی جاتی۔ جہاں تک ناموں کا تعلق ہے ان میں بھی تبدیلی واجب نہیں۔ انگریزوں کی طرح دلی کو ڈلہی یا اودھ کو آؤڈ کہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر ولایتی الفاظ کے استعمال سے انگریزی زبان

www.taemeernews.com

کی ترویج مقصود ہے تو اس اینچ پینچ سے کیا حاصل۔ سیدھے سیدھے انگریزی تعلیم دیجیے۔
اگر مراد یہ ہے کہ لوگ علوم سے واقف ہوں تو علوم کی تعلیم کیوں نہ براہِ راست اصلی زبان میں دی
جائے۔کسی ہندوستانی سے پوچھ دیکھیے کہ وہ "کریسپانڈنیس" (Correspondence)
کے معنی زیادہ سمجھتا ہے یا خط وکتابت کے۔ آرٹیکل۔۔ (Article) کو اچھا سمجھتا ہے یا
مضمون کو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جدید علوم سیکھنے کے لیے ہم اپنی زبان کو بھول جائیں؟ انگریزی لفظ
کیمسٹری Chemistry کیمیا سے نکلا ہے تو ہم اس عام فہم لفظ کو چھوڑ کر غیر مانوس انگریزی
لفظ کو کیوں چلن دیں۔ میری بات مانو اور اپنی زبان کو محفوظ رکھو۔

میرا دلاد علی لندن کی سفارت ناکام ہونے کے بعد وہیں جنرل صاحب کی ایک ملازمت سے آشنائی کر کے کلکتے آئے اور دستور المعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے لیے پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا گیا مگر راضی نہ ہوئے اور ہمیشہ یہ شکایت کرتے رہے کہ جو لوگ کلکتے ہی میں رہتے ہیں انھیں دو سو روپے ملتے ہیں اور مجھے کہ سفارت لندن سے واپس آیا ہوں، صرف پچاس روپے میں رکھا گیا ہے البتہ حضور عالم کی بیگم صاحبہ کبھی کبھی کفالت کرتی رہتی تھیں۔ پھر بھی لکھنؤ کے مقابلے میں تکلیف سے گزر ہوتی تھی۔ شاید وہیں انتقال کیا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم ص۳۰۴)

میرا دلاد علی شاعر بھی تھے اور اولیٰ تخلص کرتے تھے۔ مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

بتاں ہر چند بہلاتے ہیں میرے دل کو پر اولیٰ
ادا کس طرح مجھ کو اُس پری رخسار کی بھولے

(ص ۵۸)

صہبا لکھنوی کی مشہور تحقیقی کتاب

اقبال اور بھوپال

(داؤد ادبی انعام یافتہ)

جو کئی سال سے نایاب تھی ۔ اب اُس کا دوسرا ایڈیشن قیمتی اضافوں، دیباچہ طبع ثانی اور نادر و نایاب خطوط اور تصاویر کے ساتھ اقبال اکیڈمی پاکستان عنقریب شائع کر رہی ہے۔

ایجنٹ اور خواہشمند حضرات اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ — میکلوڈ روڈ — لاہور

www.taemeernews.com

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

برطانیہ میں اردو

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک نو آبادی طاقت کی حیثیت سے برطانیہ کو اردو سے سب سے زیادہ تعلق رہا۔ لیکن اردو زبان کی تعلیم کے لیے باقاعدہ علمی ادارہ قایم کرنے کی ضرورت اہلِ برطانیہ کو نسبتاً بہت دیر میں محسوس ہوئی۔ چنانچہ فرانس میں اردو زبان کی تعلیم ۱۸۲۸ء میں شروع ہو چکی تھی۔ لیکن برطانیہ کا مشہور اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز ۱۹۱۷ء میں قایم ہوا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اردو زبان کی جو خدمت اہلِ برطانیہ نے کی، اور تدریس و تحقیق کے جو وسائل آج برطانیہ میں ہیں اُن کا مقابلہ کسی یورپی ملک سے نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس ادارے کو اہلِ برطانیہ کی اردو نوازی میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے سب سے پہلے میں اس کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کروں گا۔

یہ ادارہ لندن یونیورسٹی سے ملحق ہے اور اس کے شعبوں اور مضامین کی کیفیت مختصراً حسب ذیل ہے:-

(۱) شعبۂ ہندوستان۔ پاکستان اور سیلون۔ اس شعبے میں برصغیر کی بیشتر زبانوں بہ شمول اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ و تمدن۔ آثارِ قدیمہ۔ فنِ تاریخ۔ ہندوستانی فلسفہ و مذہب اور دیگر لسانی اور ثقافتی موضوعات سے متعلق درس دیے جاتے ہیں۔

(۲) شعبۂ جنوب مشرقی ایشیا اور جزائر۔ اس شعبے میں اس خطے سے متعلق عمومی تعلیمات۔ آرٹ۔ آثارِ قدیمہ، برمی اور انڈونیشیا کی زبانوں۔ فجی اور سامی زبانوں، اور تھائی لینڈ اور ویت نام کی زبانوں اور علم الانسان کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۳) شعبۂ مشرقی ایشیا۔ اس شعبے میں چین اور جاپان کی زبانوں کے علاوہ تبت۔ کوریا۔ اور منگولیا کی زبانوں کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔

(۴) شعبۂ مشرقِ قریب و مشرقِ وسطیٰ۔ اس شعبے میں عربی اور فارسی زبان و ادب۔ جدید و قدیم۔ تاریخ و تمدن کے علاوہ آرمینی اور جارجیا کی تاریخ و تمدن کے بارے میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

(۵) شعبۂ افریقہ میں افریقی زبانوں سے متعلق تعلیم و تحقیق کی سہولتیں موجود ہیں۔

(۶) شعبۂ صوتیات و لسانیات۔ اس شعبے میں سینتیس مشرقی زبانوں کی صوتیات کے علاوہ عمومی لسانیات میں تدریس و تحقیق کا انتظام کیا گیا ہے۔

(۷) شعبۂ تاریخ۔ اس شعبے میں جنوبی ایشیا۔ مشرقِ قریب۔ مشرقِ وسطیٰ۔ مشرقِ بعید۔ جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ

www.taemeernews.com

کی قدیم و جدید تاریخ کی تعلیم و تحقیق کا انتظام کیا گیا ہے۔

(۸) شعبۂ قانون۔ اس شعبے میں اسلامی اور ہندو قانون۔ ہند و پاکستان کے دستوری قانون اور افریقی قانون پر سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔

(۹) شعبۂ علم الانسان و عمرانیات۔ اس شعبے میں افریقہ اور ایشیا سے متعلق علم الانسان اور علم الاقوام کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

(۱۰) شعبۂ معاشیات و سیاسیات۔ اس شعبے میں ایشیائی ممالک کے سیاسی اور معاشی مسائل پر تحقیق کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

لندن یونیورسٹی کے اس مشہور ادارے کے ڈائرکٹر مسٹر فلپس سے میری ملاقات ۱۹۶۲ء میں لندن میں ہوئی تھی۔ انھوں نے نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے طلبہ کی تحقیق کا معیار زیادہ بلند نہیں۔ طلبہ توقع کرتے ہیں کہ انھیں زیادہ سے زیادہ لیکچر دیے جائیں یا ہدایات دی جائیں۔ خود جستجو کر کے تحقیق اور تجزیے کی عادت اور صلاحیت بیشتر طالب علموں میں نہیں ملتی ۔

اردو کی تعلیم کے لیے یوں تو اس ادارے میں ابتدائی سطح سے لے کر ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ لیکن زیادہ اہمیت بی۔اے آنرز کورس کو حاصل ہے۔ اس کورس کے موضوعات نہایت وسیع اور جامع ہیں اور برطانوی طالب علموں کے علاوہ دیگر ممالک کے طلبہ بھی اس کورس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کورس کا امتحان مندرجہ ذیل پرچوں میں لیا جاتا ہے۔

(۱) اردو سے انگریزی میں ترجمہ۔ ترجمہ کے علاوہ متقدمین اور ان کی تصنیفات سے متعلق سوال کیے جاتے ہیں۔

(۲) اس پرچے میں متاخرین کی تصنیفات کے متن کے تراجم کرائے جاتے ہیں اور مصنفین کے بارے میں سوال کیے جاتے ہیں ۔

(۳) ایسے متن کے تراجم جن کا تعین نصاب میں نہیں کیا جاتا ۔

(۴) انگریزی متون کا اردو ترجمہ اور مضمون نگاری وغیرہ ۔

(۵) تاریخ ادب اردو ۔

(۶) تاریخ برصغیر ہند و پاکستان ۔

(۷-۸) ہندوستان اور پاکستان کی تہذیبی زندگی زبان۔ تاریخ۔ ادب۔ سیاسیات۔ مذہب۔ فنونِ لطیفہ۔ وغیرہ سے متعلق موضوعات میں سے کوئی دو موضوعات کا انتخاب ۔

بی۔اے۔ آنرز کورس چار سال کا ہے۔ اس کورس کو کامیابی کے ساتھ ختم کرنے سے طالب علم اردو زبان و ادب اور اس سے متعلق تہذیب و تمدن پر اچھی دسترس حاصل کر لیتا ہے۔

ادارے میں ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیق کا معقول انتظام ہے۔ اور کئی پاکستانی اور غیر پاکستانی طلبہ گراں قدر مقالے پیش کر کے ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ لندن میں ڈاکٹریٹ کرنے میں چند فوائد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ اردو زبان اور برصغیر کی تاریخ و تمدن کے بارے میں جس قسم کا مواد برٹش میوزیم وغیرہ کی لائبریریوں میں موجود ہے وہ (افسوس کہ) برصغیر

www.taemeernews.com

کے کتب خانوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ دوسرے یہ کہ لندن اور یورپ کی دیگر بڑی یونیورسٹیوں میں جدید اصول تحقیق پر مشرقی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ آج علم و فن کی روشنی سے مغرب مشرق کے مقابلے میں زیادہ منور ہے۔ اس لیے جس قسم کی علمی فضا مغربی اداروں میں میسر آتی ہے۔ مشرق کے بیشتر علمی ادارے اس فضا سے محروم ہیں۔ یہ تلخ حقیقتیں ہیں لیکن ان کا اعتراف کر لینا ضروری ہے۔ تحقیق کا موضوع چاہے کتنا محدود ہو یا اس کی نوعیت چاہے کتنی ہی ''مشرقی'' کیوں نہ ہو مغرب میں بیٹھ کر تحقیق کرتے وقت ایک نیا عالمی پس منظر پیش نظر رہتا ہے اور اس پس منظر میں ایک محدود اور مخصوص موضوع وسیع تر معنویت اختیار کر لیتا ہے' اور یہ ایک نہایت گراں قدر فیضان ہے جو (افسوس کہ) ہمیں مشرق میں شاذ ہی ملتا ہے۔

مشرقی علم و فن کسی مغربی اہل بصیرت کے ہاتھوں میں پہنچ کر کیا شکل اختیار کر سکتے ہیں اور مرد مشرق میناۓ مغرب میں کیا رنگ روپ اختیار کر سکتی ہے۔ اس کی ایک دل آویز مثال پروفیسر رالف رسل ہیں جو عرصے سے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں شعبۂ اردو کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ رسل صاحب خوش مزاج اور بذلہ سنج بھی ہیں اور ایک اعلیٰ درجے کے اسکالر بھی۔ اردو ادب پر اُن کی نظر وسیع بھی ہے اور عمیق بھی۔ وہ بعض اوقات دوران گفتگو میں اردو زبان و ادب کے ماضی۔ حال اور مستقبل کے بارے میں ایسے نکات کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن پر عموماً ہم مشرقیوں کی نظر نہیں جاتی۔ شاید اس لیے کہ ہم ان مسائل کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور بعض اوقات کسی شے کو بہت قریب سے دیکھنے سے اس کا صحیح محل و مقام نظر نہیں آتا۔ رسل صاحب کی تصنیفات اردو ادب اور اس سے متعلق تہذیب و تمدن کے مطالعے میں اہم اضافے ہیں۔ مثلاً انھوں نے غالب کی سوانح ان کے خطوط سے مرتب کی ہے۔ گویا یہ غالب کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو بعض اعتبار سے دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح حیات سے زیادہ اثر انگیز اور بعض مقامات پر زیادہ درد انگیز ہے' اور پھر یہ کتاب جس خوبصورت انگریزی میں لکھی گئی ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کو انگریزی ادب میں بھی ممتاز حیثیت حاصل ہوگی۔

برطانیہ میں اردو زبان و ادب کا مرکز تو یہی ادارہ ہے لیکن اس کے قایم ہونے سے بہت پہلے بھی خصوصاً فوجی اور سول ملازمین کی اردو تعلیم کے لیے انتظامات کیے گئے تھے۔ مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو اردو پڑھانے کے لیے ۱۸۰۶ء میں لندن سے بیس میل دور ہیلی بری کالج قایم ہوا جس میں اردو زبان کے علاوہ دیگر مشرقی زبانوں، مثلاً فارسی، سنسکرت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ کالج ۱۸۵۷ء میں بند کر دیا گیا تھا۔

برطانیہ میں متعدد افراد نے اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ فہرست خاصی طویل ہوگی اور اس میں بعض غیر معمولی شخصیتوں کے نام آتے ہیں۔ ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے ایک کرنل سر ہنری یول ہیں جن کی کتاب ''ہابسن۔ جابسن'' اردو زبان سے متعلق ہی نہیں بلکہ دنیاۓ لسانیات میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اردو۔ ہندی یا ہندوستانی زبان کے الفاظ کی ایک نہایت مبسوط فرہنگ ہے جس میں ان الفاظ کی نوعیت اور اشتقاق بیان کیا گیا ہے جو اردو زبان سے مغربی زبانوں میں یا مغربی زبانوں سے اردو زبان میں داخل ہو گئے ہیں ۸۰۰ صفحات کی اس فرہنگ میں فاضل مصنف نے نہ صرف ان الفاظ کا اشتقاق بیان کیا ہے بلکہ سند کے طور پر مغربی اور مشرقی زبانوں

www.taemeernews.com

کی تحریروں کے حوالے دیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحقیق کے لیے متعدد زبانوں مثلاً انگریزی۔ فرانسیسی۔ پرتگیزی۔ ولندیزی۔ یونانی۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت وغیرہ کی کوئی دو ہزار سال کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کتاب پر پاک و ہند کے دانشوروں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی [۱]۔ کرنل ہنری یول کے علاوہ چند برطانوی شخصیتیں جو اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہیں گی حسب ذیل ہیں

ولیم ہنٹر۔ جنھوں نے مرزا محمد فطرت کے ترجمہ عہد نامۂ جدید کا اصل یونانی زبان سے مقابلہ کیا اور متن پر نظر ثانی کر کے ۱۸۱۹ء میں کلکتہ سے شایع کیا۔ ایونگ نے یونانی اردو لغت لکھی۔ ناتھ براٹس نے ۱۸۴۷ء میں ہندوستانی انگریزی ڈکشنری اور گراہم بیلی نے اردو زبان کی مختصر تاریخ لکھی۔ بلوک مین نے انگریزی اردو ڈکشنری مرتب کی جو ۱۸۷۷ء میں شایع ہوئی۔ ولیم براٹس نے ہندی۔ ہندوستانی ادب کے اقتباسات شایع کیے۔ جان پلیٹس نے اردو کی ڈکشنری اور گرامر لکھی۔ ٹامس روبک نے لغت کے علاوہ اردو گرامر اور قواعد صرف و نحو وغیرہ کے بارے میں اہم تصنیفات پیش کیں۔ ایس ڈروسو نے اصطلاحات مالگزاری وغیرہ کے بارے میں ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۵ء میں کتاب شایع کی۔

جی این رینکنگ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے تھے اور اردو سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اشپرنگر عربی۔ فارسی۔ اردو مخطوطات کی مفصل فہرستیں مرتب کرنے کے سلسلے میں بہت مشہور ہیں۔ جان شیکسپیر اردو زبان کے پروفیسر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈنکن فاربس مشرقی علوم کے پروفیسر اور مشہور لغت نویس اور مترجم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ کرنل فلٹ نے دیگر موضوعات کے علاوہ اردو زبان کے محاورات وغیرہ پر بھی لکھا ہے۔ فرگوسن اور فالن مشہور لغت نویس ہیں۔ کمپسن نے اردو محاورات کے علاوہ نذیر احمد کی توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ سر جارج گریرسن نے ہندوستان کی زبانوں کا مفصل جائزہ ۹ جلدوں میں شایع کیا ہے۔ جان گلکرسٹ اردو زبان کے اسکالر اور پروفیسر ہیں جن کی شخصیت فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے اس قدر معروف ہے کہ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ولیم ہنٹر مشہور لغت نویس ہیں جنھوں نے اردو ضرب الامثال کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ محض چند نام ہیں۔ میں نے اُن متعدد اسکالروں کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے مذکورہ بالا ڈکشنریوں کے علاوہ کئی اور ڈکشنریاں اور اردو زبان سیکھنے کے لیے کتابیں لکھیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے اردو زبان کی خدمت اس لیے کی کہ وہ حاکم تھے اور حکومت چلانے کے لیے زبان سیکھنا چاہتے تھے۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے۔ اگر یہ مکمل طور پر صحیح ہوتی تو آج برطانیہ میں اردو سے دلچسپی کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بعض اعتبار سے آج اردو زبان و ادب اور اس سے متعلق تہذیب و تمدن پر جو توجہ دی جا رہی ہے اور جس معیار کا علمی کام کیا جا رہا ہے۔ وہ اس سے قبل نوآبادیاتی دور میں نہیں ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب انگریزی قوم کی علمی اور تہذیبی روایات کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

---

[۱] اس کتاب کے ایک مختصر جائزے کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب "یورپ میں اردو" مرکزی اردو بورڈ ۳۶ گلبرگ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ برطانیہ میں اُردو سے متعلق تفصیلی جائزہ بھی اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

برطانوی حکومت اور اردو دشمنی

(برصغیر پاک و ہند کے حوالے سے)

انگریزوں کی اردو دوستی پر پچھلے دو سو سال میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، مقالات کی شکل میں بھی اور مستقبل کتابوں کی صورت میں بھی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام (سنہ ۱۸۰۰ء) سے لے کر قیام پاکستان بلکہ افکار کے "برطانیہ میں اردو" نمبر تک انگریزوں کی اردو خدمات کو برابر کسی نہ کسی طور پر سراہا گیا ہے اور تاریخ ادبیات کے سلسلے کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں اُن کی خدمات کا ذکر نہ ملتا ہو۔ یہ ذکر بھی بعض مقالوں اور کتابوں میں ایسی تفصیل و تمہید کے ساتھ آیا ہے کہ بادی النظر میں، پاک و ہند میں اردو زبان کے سب سے بڑے محسن انگریز ہی قرار پاتے ہیں اور ذرا دیر کے لیے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اردو نے اپنی ترقی کے سارے مرحلے، انگریزوں کے لطفِ خاص کے سہارے طے کیے ہیں۔ اوروں کی طرح مجھے بھی اس کا اعتراف ہے اور اس اعتراف کا ذکر بھی میری بعض تحریروں میں آچکا ہے کہ انگریزوں نے اُردو کے سلسلے میں بہت کچھ کیا ہے۔ اردو قواعد اور لغت نویسی کی طرف سب سے پہلے اُنہی نے توجہ کی ہے، تذکرہ نویسی، ادبی تاریخ نگاری اور شعر گوئی میں بھی اُن کا حصہ ہے۔ ترجمے کی روایت بھی اُن کی توجہ سے پروان چڑھی ہے۔ بعض تعلیمی اداروں میں اُردو کی تدریس کا کام بھی انھیں کے زیرِ انتظام شروع ہوا اور تالیف و تصنیف کے کام سے بھی انھوں نے پوری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس دلچسپی کے نتیجے میں صرف یہی نہیں کہ انھوں نے اردو سے متعلق، انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھا ہے بلکہ بعض نے مشرقی زبانوں کے ساتھ اُردو پر پوری دسترس حاصل کر کے براہ راست اُردو میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن آج، اُردو کے کسی باشعور ادیب سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ انگریزوں نے اُردو کے سلسلے میں جو کچھ کیا ہے اُس کی نوعیت، ہاتھی کے دانت سے زیادہ نہ تھی یعنی اُن کا ظاہری عمل اُردو کے موافق اور عمل کی حقیقی غایت، یا خفیہ سیاسی حکمت عملی اُردو کے مخالف تھی۔ یہ خفیہ حکمت عملی، جس کا اصل مقصود فارسی اور اُردو کو نقصان پہنچا کر، مسلمانوں کے ثقافتی ورثے پر ضرب کاری لگانا تھا، نئی نہ تھی۔ اس کا آغاز پاک و ہند میں مسلمانوں کے سیاسی زوال اور انگریزوں کے آثار اقتدار کے فوراً بعد ہوگیا تھا اور پھر اس کا سلسلہ جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے اندازہ ہوگا۔ قیام پاکستان تک برابر قائم رہا۔

اُردو نتیجہ ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد و قیام کا اور اس آمد و قیام کی تاریخ نئی نہیں خاصی پُرانی ہے۔ پروفیسر آرنالڈ کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی میں چند مسلمان تاجر عراق سے آئے اور جنوبی ہند کے ساحلوں پر آباد ہوگئے۔ اس لیے اسلام کا

www.taemeernews.com

اثر بھی ان ساحلوں پر پہنچتا رہا۔ باہر سے مسلمانوں کی کثرتِ آمد و رفت سے ساحلی شہروں کی آبادی خلط ملط ہو گئی اور اکثر لوگ آدھے ہندو، آدھے عرب اور آدھے ایرانی ہو گئے۔ مسلمان تاجروں اور ہندو راجاؤں کے تعلقات بڑھتے گئے[1]۔ ڈاکٹر تارا چند کا بیان ہے کہ اس وقت ساحلوں پر مسلمانوں کی آبادی تقریباً چار ہزار تھی اور وہاں کے ہندو راجاؤں کی نظر میں محترم تھی[2]۔ ۷۱۲ء میں جب محمد بن قاسم کے ذریعے برصغیر میں مسلمانوں کی فتوحات و حاکمیت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا تو، مسلمان حکمرانوں کے حسنِ سلوک نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور بھی قریب کر دیا۔ ہندو، جوق در جوق، دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ اس طرح ہندو عوام کو برہمنی راج اور اس کی مذہبی سخت گیری سے نجات ملتی تھی[3]۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں نے سب کو یکساں سماجی حقوق دیے اور اپنے آبائی وطنوں کو خیرباد کہہ کر، برصغیر ہی کو اپنا وطن بنا لیا، یہیں شادی بیاہ کرنا اور مرجانا پسند کیا۔ یہیں کمایا یہیں لگایا اور یہیں کی طرز ماند و بود کو قبول کر لیا۔ انگریزوں کی طرح، برصغیر کی دولت، نہ تو انھوں نے ایران و توران بھیجی اور نہ انگلستان۔ جو کچھ بچایا وہ یہیں کی ترقی پر صرف کیا۔ اس کے ساتھ، عوام اور رعیت کی دل جوئی کی خاطر انھوں نے بعض ایسے تمدنی شعائر اختیار کر لیے جو اُن کے عقایدِ مذہبی کے خلاف تھے۔ مسلمانوں کی اس کشادہ قلبی اور رواداری کا اعتراف، غیر مسلم مورخین نے بھی کیا ہے[4]۔ یہ مسلمانوں کی فراخ دلی اور حسنِ سلوک ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ حکمرانی میں ایک بھی ایسا اہم واقعہ نہیں ملتا جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر عقاید کے اختلاف نے کوئی خراب اثر ڈالا ہے۔ یا ثقافتی و مذہبی بعد کے سبب وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئے ہیں۔ بقول رام گوپال، برصغیر میں انگریزوں کے آغازِ اقتدار سے قبل تک، ہندوؤں کو مسلمانوں سے کوئی شکایت نہ تھی، وہ نہایت خوش گوار ماحول میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے رسوم و آداب کے لیے دل میں جگہ رکھتے تھے اور عقاید و اطوار کے امتیاز کی بنا پر باہم اختلاف کی اجازت نہ دیتے تھے (انڈین مسلمس ص۱) لیکن اورنگ زیب عالمگیر کی

---

[1] دعوت اسلام ص۲۱۴ (پریچنگ آف اسلام کا اُردو ترجمہ) از محمد عنایت اللہ دہلوی مطبوعہ مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۶۴ء

[2] تمدن ہند پر اسلامی اثرات ص۷۶ (انفلوئنس آف اسلام ان انڈین کلچر کا اردو ترجمہ) از محمد مسعود احمد مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء

[3] انڈین مسلمز ص۱ از رام گوپال مطبوعہ ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی ۱۹۰۹ء

[4] تفصیل کے لیے دیکھیے

(ا) انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر از ڈاکٹر تارا چند

ب۔ انڈیا تھرو دی ایجز از پروفیسر جے ۔ ان۔ سرکار

ج۔ کنٹری بیوشن آف اسلام ٹو انڈین کلچر از ان۔ سی۔ مہتا

د۔ ٹرولرس ان دی مغل امپائر از ڈاکٹر برنیر

س۔ دی پریچنگ آف اسلام از پروفیسر تھامس آرنالڈ

ک۔ دی ریلیجس پالیسی آف دی مغل از سری رام شرما

www.taemeernews.com

وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد جوں جوں مسلمان سیاسی طور پر کمزور ہوتے گئے اور انگریزوں کا اقتدار بروئے کار آنے لگا، انگریزوں کے اشارے پر ہندوؤں کے رویے میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان یہ مغائرت اور دوری، دراصل برطانوی حکمرانوں کی اس سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا جو انھوں نے تقسیم کرو اور حکومت کرو کے اصول کو سامنے رکھ کر اپنایا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کی خارجہ حکمت عملی کے ایک ذمہ دار رکن سر جان مینرڈ (Sir John Mynrad) کا قول ہے کہ "برطانوی اقتدار نہ تو قایم ہو سکتا تھا اور نہ آج ہی برقرار رہ سکتا ہے اگر وہ انتشاری میلان جس کا مظہر، ہندو مسلم مخالفت ہے۔ یہاں نہ پایا جاتا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مسلم عوام کی رقابت کی ابتدا، برطانوی دور حکومت سے ہوئی ہے"[۱] لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انگریزوں نے جو تفرقہ پیدا کیا، اس سے ہندوؤں کو نہیں سارا نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ وجہ یہ تھی کہ اس تفرقے کی بنیاد ہی مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو مجتمع کرنے، اقتصادی طور پر اُن کو طاقتور بنانے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں حوصلہ افزا مراعات دینے پر قایم تھی، اس کا بھی خاص سبب تھا۔ انگریزوں کو اپنے سیاسی تسلط اور استحکام کے سلسلے میں جتنا خوف مسلمانوں کی طرف سے تھا ہندوؤں سے نہیں تھا۔ انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ عہد اکبری (۱۵۵۹ تا ۱۶۰۵) کے آخری دور میں برصغیر میں قدم رکھا تھا۔ مغلوں کے اقتدار اور دبدبے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، مسلمانوں کی شجاعت وجاں بازی سے بھی اُن کا براہ راست ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ پلاسی، بکسر، میسور کی جنگوں اور دوسری مجاہدانہ تحریکوں سے قطع نظر، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی اُن کا اصل معرکہ مسلمانوں ہی کے ساتھ ہوا تھا، ان مزاحمتوں نے انھیں پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کو پوری طرح قابو نہ کر لیا جائے، برصغیر پر اطمینان کے ساتھ حکومت کرنا مشکل ہے، چنانچہ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بہانے اپنا سارا غصہ مسلمانوں ہی پر اُتارا۔ ملازمت، تجارت، تعلیم، صنعت وحرفت اور معاش کے سارے دروازے اُن پر ایک ایک کر کے بند کر دیے گئے۔ برصغیر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے براہ راست تاج برطانیہ کا راج قایم ہو گیا۔ اب حکومت کی نئی حکمت عملی، جن اصولوں کے تحت مرتب کی گئی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے صرف دو بیان دیکھیے۔ لارڈ النبرا نے لکھا:

"میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھ نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہمارے مخالف ہے اس لیے ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرف دار بنائیں"[۲]

برطانوی فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے ڈیوک آف ولنگٹن کو ایک خط میں لکھا:

"مجھے یقین ہے کہ جو لوگ (مسلمان) ہماری نگرانی میں رہ رہے ہیں وہ ہمارے بہی خواہ نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندو، ہماری کامیابیوں پر بہت خوش ہیں۔ جب ہمیں مسلمانوں کی دشمنی یا جن کی افرادی طاقت، آبادی کے دسویں حصے کے برابر ہے، یقین ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کے اُس $\frac{9}{10}$ حصے کی جو ہمارا خیر خواہ اور وفادار ہے، ہم دل کھول کر کیوں مدد نہ کریں"[۳]

۱؎ بحوالہ حالی کا سیاسی شعور ص۲۸ از ڈاکٹر معین احسن جذبی مطبوعہ آئینۂ ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۲؎ ہندو مسلم کلچرل آکارڈ ص۷۵ از سید محمود بحوالہ حالی کا سیاسی شعور

۳؎ بحوالہ مسلم انڈیا ص۲۹ از محمد نعمان مطبوعہ کتابستان الہ آباد ۱۹۴۲ء

www.taemeernews.com

انگریزوں کی مسلمان دشمن حکمت عملی، پوری انیسویں صدی میں جاری و ساری رہی۔ ولیم ہنٹر W. W. Hunter نے اپنی کتاب مرقومہ ۱۸۷۱ء میں لکھا ہے کہ

"مسلمانانِ ہندوستان، اب بھی اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں، کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ رہے اور اُن تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو، بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے، اپنے لیے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں"[1]

چنانچہ ہمیشہ اور ہر موقع پر، انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور بعض نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ، عزم و شجاعت اور ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے، مسلمان، ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ہندو، اُن کے سامنے نسبتاً طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں، علاوہ ازیں، مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے[2] اس کے باوجود عدم توجہ اور ظلم کا نشانہ، مسلمانوں ہی کو بنایا گیا۔ تقریر و تحریر کے ذریعے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف، طرح طرح سے بھڑکایا گیا اور مسلمانوں کے عہدِ حکومت کو ہندوؤں کے حق میں عذاب ظاہر کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ لیکن انگریزوں نے سارا غصہ مسلمانوں پر اُتارا۔ انھیں بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرا کر ہر طرح کچلنے کی کوشش کی گئی اور بقول رام گوپال، صرف اس لیے کہ "ہندوستان پر دوبارہ قبضہ ہو جانے کا جو خطرہ تھا مسلمانوں کی طرف سے تھا وہ سکھوں یا مرہٹوں سے نہ تھا"[3] ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بہانے مسلمانوں کو کس کس قسم کی سفاکیوں اور ستم رانیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کی تفصیل خطوط غالب، تاریخ عروج سلطنتِ انگلشیہ از مولانا ذکاءاللہ قیصر التواریخ از کمال الدین، داستانِ غدر از ظہیر دہلوی، کمپنی کی حکومت از باری، سن اٹھارہ سو ستاون از سندر لال اور ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از خلیق احمد نظامی اور بعض دوسری کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں پر جو تباہی، انگریزوں کے ہاتھوں آئی، وہ ایسے خوفناک اور بے رحمانہ رویوں کا نتیجہ تھی کہ غیروں کو بھی اُن کی حالتِ زار پر رونا آگیا۔ یہاں تک کہ تھپر پسیج گئے۔ ڈبلوڈبلو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مصنفہ ۱۸۷۱ء اگرچہ سراسر مسلمانوں سے بغض و عناد پر مبنی ہے اور مسلمانوں کے خلاف، اس میں جتنا زہر اگلا گیا ہے شاید ہی کسی اور جگہ نظر آئے لیکن اس میں بھی مسلمانوں کی تباہی کا باب، مطالعہ کے لائق ہے، ہنٹر کا بیان ہے کہ

"مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمۂ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس سے مسلمان گھرانے بالکل تباہ ہو گئے، ان کی عظمت تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی حالات و واقعات پر زور دینا واجب ہے۔ لیکن یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے ہیں یا ہائی کورٹ میں جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ اب

---

[1] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ترجمہ صادق حسین ص ۱۹ مطبوعہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ۱۹۵۵ء
[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۵۲ از طفیل احمد منگلوری مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۸ء
[3] انڈین مسلمز ص ۲۶ بمبئی ۱۹۵۹ء

www.taemeernews.com

مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک اور سات کا ہے۔ ہندوؤں اور یورپین کا تناسب ایک اور دو کا۔ مسلمانوں اور یوروپین کا تناسب ایک اور چودہ کا۔ تمام نظامِ حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی، ایک اور تیس کا رہ گیا ہے۔ پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہے۔ سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید نہیں رکھتے کہ قلمی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔ سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ بنگال میں دو ہندو جج ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی سے طبی سند حاصل کرنے والوں میں چار ڈاکٹر تھے۔ تین ہندو، ایک انگریز، لیکن مسلمان سرے سے ندارد[1]۔

کلکتہ کے ایک اخبار "دوربین" نے ۱۴ر جولائی ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

"آہستہ آہستہ، مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی چھینی جا رہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے لیکن ایسا وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے دفتر میں چند اسامیاں خالی ہوئی تھیں۔ اس کے افسر نے سرکاری گزٹ میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی"[2]۔

ان حالات و واقعات کے پس منظر میں ڈاکٹر امبیدکر نے انگریزی حکومت کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ

"تمام انتظامی اور قانونی تبدیلیاں جو حکومت کی طرف سے عمل میں لائی گئیں وہ مسلمانوں پر مسلسل ضربیں تھیں"[3]۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان ضربوں کی اساس، انگریزوں کی اس لسانی حکمتِ عملی پر قایم تھی جس کا مقصد، مسلمانوں کے ثقافتی ورثے اور وسائل، یعنی فارسی اور اردو کو ختم کر کے، اُن کے مقابلے میں "ہندو" کے نام سے ایک نئی قوم اور ہندی و سنسکرت کے نام سے نئے ثقافتی وسائل کو جنم دینا تھا۔ اس کام کے لیے ۱۷۸۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے نام سے ایک انجمن قایم کی گئی۔ شہنشاہ انگلستان اور گورنر جنرل ہند وارن ہسٹنگز اس کے مربی و سرپرست مقرر ہوئے اس کے دوسرے ارکان میں بھی حکومت کے خطاب یافتہ اور وظیفہ خوار تھے۔ اس انجمن کے سربراہ سر ولیم جونس Sir William Jones اور بعد کو اُن کے جانشینوں نے ہندوستان کی آریہ قوم کو دنیا کی مہذب ترین قوم ثابت کر کے قدیم ایرانیوں سے اُن کا رشتہ قایم کیا اور سنسکرت کو دنیا کی ساری زبانوں سے قدیم تر ثابت کر کے اُسے ام الالسنہ کا رتبہ دے دیا۔ مقصود یہ تھا کہ سنسکرت کے احیاء کے ذریعے، فارسی کے مقابلے میں، ہندوؤں کو ایک عظیم و قدیم زبان کا وارث ثابت کر کے اُن میں ہندو قومیت کی ایک تحریک کو بروئے کار لایا جائے جو ہندوؤں کو مسلمانوں کا مدِ مقابل بنا دے۔ انگریزوں کی یہ چال، ہندوؤں کی خواہش کے عین مطابق تھی اس لیے کامیاب ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں برصغیر پاک و ہند کی بہت بڑی غیر مسلم آبادی، جو اس سے پہلے مختلف عقیدوں، اور ذاتوں میں بٹی ہوئی تھی، "ہندو قوم" کے نام سے منظرِ عام پر آ گئی۔ ورنہ اس سے پہلے "ہندو" صرف ایک جغرافیائی اصطلاح

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۴۶ تا ص ۲۵۲

[2] بحوالہ انڈین مسلمز ص ۲۷ از رام گوپال اور ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۲

[3] پاکستان یا پارٹیشن آف انڈیا ص ۳۰ مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۶ء

www.taemeernews.com

تھی اور زمانہ قدیم میں اس سے مراد وہ خطۂ زمین تھا جو سات دریاؤں یعنی ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم، سندھ اور سرسوتی سے سیراب ہوتا تھا۔ ان سات دریاؤں کی رعایت سے اس خطے کا نام، شروع میں "سپتہ سندھو" تھا۔ سنسکرت میں سپتہ کے معنی ہیں سات اور سندھو کے معنی ہیں زمین، علاقہ یا دیش۔ قدیم ایرانیوں نے سپتہ سندھو کو "ہفتہ ہندو" کرلیا، کیونکہ سنسکرت کا سین، اُن کے یہاں عام طور پر ہائے ہوز میں بدل جاتا تھا۔ چنانچہ بہت سے قدیم سنسکرت الفاظ، مثلاً شانتی، واسا، سوما، اسوراد غیرہ قدیم ایرانی میں علی الترتیب، ہانتی، واہا، ہوما اور اہورا کی شکل میں ملتے ہیں۔ یہی "سپتہ سندھو" کے ساتھ ہوا۔ پہلے یہ "ہفتہ ہندو" ہوا پھر مختصر ہوکر "ہندو" رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایرانیوں کے نزدیک "ہندو" کسی مذہب یا قوم کا نہیں بلکہ ایک جغرافیائی حدبندی کا نام تھا اور اس کی حدود کے اندر بسنے والے سبھی لوگوں کو "ہندو" کہتے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا ہے کہ قدیم ایرانیوں کے یہاں "ہند" کا لفظ دراصل "سندھ" ہے اور اس سے مراد قدیم تاریخ میں وہ علاقہ ہے جسے آج پاکستان کہتے ہیں[1] شریف الدین پیرزادہ بھی ڈاکٹر قریشی کے ہم خیال ہیں اُن کے مطابق "لفظ سندھ کا صوتی تغیر لفظ "ہند" کے استعمال کا باعث بنا۔ سندھ، سنسکرت کے لفظ "سیاند" سے اخذ کیا گیا ہے۔ "سیاند" سے سندھ اور ہند کے نام نکالے گئے ہیں۔ علم اللسان کی رو سے "ہندوستان" دراصل، دریائے سندھ کی سرزمین ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ہند اور سندھ کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کے درمیان امتیاز اور تفریق رفتہ رفتہ اور ایک عرصے کے بعد ہوئی"[2]

لغات میں لفظ "ہندو" کے معنی، ڈاکو، چور، غلام اور سیاہ رنگ کے بھی ملتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کے اس فقرے "دو ہندو از کمین گاہ جست کردہ برما ہجوم آوردہ" میں "ہندو" کے معنی ڈاکو اور چور ہیں۔ فارسی اردو کی ساری مستند لغات میں لفظ "ہندو" کے یہ معنی موجود ہیں سیاہ رنگ کے معنوں میں حافظ شیرازی کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

قوم یا مذہب کے معنے میں "ہندو" کا لفظ کسی قدیم کتاب میں نہیں ملتا۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان ہے کہ "ہمارے قدیم ادب میں "ہندو" کا لفظ کہیں بھی نہیں آیا۔ دریائے سندھ کا پرانا نام سندھ ہے اور یہ لفظ اسی سے نکلا ہے۔ اسی لفظ سندھو سے آگے چل کر "ہندو" اور ہندوستان' انڈوس اور انڈیا کے الفاظ بنے۔ ہندو کے لفظ کو ایک خاص مذہب کے لیے استعمال کرنے کا رواج بہت بعد کو ہوا"[3]

یہاں "بہت بعد" کے الفاظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پنڈت جی کا مطلب کسی قدیم صدی سے ہے۔ اُن کی مراد یہ ہے کہ انگریزی سلطنت کے استحکام سے پہلے تک "ہندو" کا لفظ مذہب یا قوم کے معنے میں نظر نہیں آتا اور یہی درست ہے۔ ایڈورڈ

---

[1] دی اسٹرگل فار پاکستان ص ۱۶۲ مطبوعہ شعبۂ تصنیف و تالیف و تراجم جامعہ کراچی ۱۹۷۵ء۔
[2] پاکستان منزل بہ منزل ص ۶ مطبوعہ گلڈ انجمن کتاب گھر کراچی ۱۹۶۵ء
[3] تلاش ہند جلد اول (ڈسکوری آف انڈیا کا اردو ترجمہ) ص ۲۳ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۴۶ء

www.taemeernews.com

بالفور نے انیسویں صدی کے وسط میں لکھا ہے کہ

Hindo is entirely a Europian conventional terms and does not represent a nation, a race or a religion. [1]

اس طرح کے اور کئی ایسے حوالے ممتاز ہندو مورخین کے یہاں سے دیے جا سکتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "ہندو" کا لفظ، قوم اور مذہب کے معنے میں انگریزوں کی ایجاد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مختلف عقیدے اور قومیت کے لوگوں کو ایک مذہب اور ایک قوم کے نام پر مجتمع کر کے، مسلمانوں کے مقابلے میں ایک نئی قوم کو ابھارا جائے۔

جب "ہندو" کا لفظ خاص مذہب اور قوم کے معنی میں ایجاد کر لیا گیا اور اہل ہند کو ہندو قومیت کی سوجھی تو اس نئی قوم کے لیے نئی زبان کی ضرورت بھی محسوس کی گئی اس لیے کہ بقول مولوی عبدالحق "قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے" [2] چنانچہ یہی ہوا ۔ ۱۸۰۰ء میں جیسے ہی کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قایم ہوا، اردو کے مقابلے میں "ہندی" زبان کی داغ بیل بھی ڈال دی گئی۔ اب یہ بات عام طور سے معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج، اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے نہیں بلکہ خالص سیاسی اغراض سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نوجوان افسروں کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے قایم کیا گیا تھا۔ اردو کو اس سے جو فائدہ پہنچا وہ کسی منصوبے کا حصہ نہیں بلکہ ضمنی تھا۔ لیکن اس ضمنی فائدے سے جو نقصان اردو کو پہنچا وہ بڑے دور رس نتایج کا حامل اور غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ یہاں، دیسی زبانوں کی ترقی کے بہانے، ڈاکٹر گلکرائسٹ نے للولال جی سے پریم ساگر کے نام سے ایک کتاب مرتب کرائی، اور اسے ناگری رسم الخط میں چھاپ کر "ہندی زبان" کے نام سے اس کا پرچار کیا۔ انگریزوں کی طرف سے اس کتاب کا پر جوش استقبال کیا گیا۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں چھپا تھا بعد ازاں اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ ۱۸۴۲ء اور ۱۸۶۷ء میں اس کے انگریزی تراجم بھی شایع ہوئے۔ [3] پھر یہ ہوا کہ وہی اردو، جو فارسی رسم الخط میں ہندوستانی یا ریختہ بھی کہلاتی تھی، دیوناگری رسم الخط میں منتقل ہو کر، ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے ایسی ہندی کہی جانے لگی جس کا اردو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایف۔ اے کے نے صحیح لکھا ہے کہ "للولال جی، اُن کے رفقا اور فورٹ ولیم کالج کے کرتا دھرتا دراصل ہندی زبان کے موجد ہیں ورنہ اس سے پہلے نہ تو ہندی نام کی کوئی زبان تھی اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کا کوئی نمونہ موجود تھا۔" [4] مولانا حامد حسن کی تحقیق ہے کہ "للولال جی کی پریم ساگر موجودہ ہندی لٹریچر کا سنگ بنیاد ہے اس سے پہلے ہندی میں کوئی نثری کتاب نظر نہیں آتی" [5]

اس سے انکار نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور انگریزی اقتدار کے استحکام سے قبل بھی دو ہمارے ہاں "ہندی"

---

[1] ان سائیکلو پیڈیا آف انڈیا جلد دوم ص ۵۶ مطبوعہ ۱۸۵۸ء
[2] خطبات عبدالحق ص ۲۴۵ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۲ء
[3] ارباب نثر اردو ص ۲۶۶ از سید محمد ایم۔ اے مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۰ء
[4] ہسٹری آف ہندی لٹریچر ص ۵۵ مطبوعہ میسور ۱۹۲۰ء
[5] داستان تاریخ اردو ص ۱۲۱ مطبوعہ آگرہ ۱۹۵۷ء طبع دوم

www.taemeernews.com

کا لفظ موجود تھا، لیکن للولال جی نے جس نوع کی ہندی کی بنیاد ڈالی اس سے اس کا تعلق نہ تھا۔ پریم ساگر کی اشاعت سے قبل "ہندی" کا لفظ ایک خاص علاقۂ ہند یا سندھ یا پھر زبان کے خاص گروہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان دو معنوں کے سوا ہندی کا لفظ کسی مخصوص زبان کے معنی میں نظر نہیں آتا۔ خاص زبان کے معنی میں یہ لفظ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سامنے آیا۔ ڈاکٹر تارا چند کا بیان ہے کہ

"جدید ہندی اس وقت تک نامعلوم تھی کیونکہ اس کا کوئی لٹریچر موجود نہ تھا۔ ادبی مقاصد کے لیے اس کا استعمال فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ کالج کے پروفیسروں نے للولال جی اور دوسرے اساتذہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ تصنیف و تالیف کا کام اسی زبان میں کریں جس میں اردو کے مصنفین کرتے ہیں لیکن عربی و فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں۔ اس طرح ایک نئے اسلوب نے جنم لیا اور ہندوؤں نے اسے اپنی خاص ضرورتوں کے عین مطابق خیال کیا۔ عیسائی تبلیغی جماعتوں نے اس میں انجیل کا ترجمہ کرکے اور بھی اہمیت بڑھا دی"۔ [1]

یہی خیال ماہر لسانیات گریرسن کا ہے۔ اُس کے الفاظ اس طرح کے ہیں۔

"بدقسمتی سے اس زمانے میں انگریزوں کا طاقتور رسوخ، سنسکرت والوں کی طرف تھا۔ یہ سنسکرت آمیز ہندی بالعموم عیسائی مبلغین استعمال کرتے تھے اور انجیل کے ترجمے بھی اسی میں شایع کیے جاتے تھے [2]

موجودہ ہندی کے بارے میں دوسرے مورخین و محققین کی بھی یہی رائے ہے اور اس میں ہندو، مسلمان اور انگریز سبھی شامل ہیں اور اس قسم کی رائے رکھنے کا سلسلہ بھی نیا نہیں بلکہ ایک مدت سے چلا آرہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے ایک انگریز مورخ آر۔ ڈبلو۔ فریزر نے لکھا ہے کہ

High Hindi is purely a book language evolved under the influence of the English who induced native writers to compose works for general use in a form of Hindustani, in which all the words of Arabic and Persian origin, were omitted, Sanskrit Words being employed in its place [3]

بعض نے موجودہ ہندی کی قدامت ثابت کرنے کے لیے اس کا رشتہ برج بھاشا سے جوڑا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ برج بھاشا، جیسا کہ خود للولال جی کی کتاب سے ظاہر ہے، مروجہ ہندی سے الگ زبان تھی۔ اس کا دائرہ صرف شاعری تک محدود تھا اور یہ شاعری بھی جس کی تاریخ میں سورداس۔ کبیرداس۔ ملک محمد جائسی، تلسی داس اور عبدالرحیم خان خاناں کے نام ملتے ہیں مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں پروان چڑھی تھی۔ بقول ڈاکٹر تارا چند، ہندی کی ایجاد کا سہرا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے سر ہے جہاں ڈاکٹر گلکرائسٹ کے حکم سے ناگری رسم الخط میں، اردو کا ایک ایسا اسلوب ہندی کے نام سے سامنے لایا گیا جس میں انستہ،

1؎ دی پرابلم آف ہندوستانی ص ۳۲-۳۳ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۴ء

2؎ لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم حصہ اول کلکتہ ۱۹۱۶ء

3؎ اے۔ لٹریری ہسٹری آف انڈیا ص ۲۷۵ مطبوعہ لندن ۱۸۹۳ء

www.taemeernews.com

سنسکرت کے الفاظ داخل اور فارسی و عربی کے الفاظ خارج کیے گئے ہیں۔ یہ خیال بھی سرے سے بے بنیاد ہے کہ موجودہ ہندی کوئی قدیم زبان ہے۔ ڈاکٹر تارا چند نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

Some recent Hindi Writers have protested against the account of the origin of Modern Hindi, but so far as I cen see, their protests do not seem to hold much water. It appears to me that a dispassionate study of the origin and growth of modern Hindi can lead only one conclusion namely that the language is only 135 years oid perhaps not even that [1]

پنڈت کشن پرشاد کول کا بیان ہے کہ "اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل ہندی کی بنیاد اس طرح ڈلوائی کہ للو لال جی سے ایک کتاب "پریم ساگر" کے نام سے ایسی ہندی زبان میں لکھوائی جس کا تعلق اردو ہی سے تھا نہ برج بھاشا سے۔" [2]

اس طرح کی اور بہت سی شہادتیں جمع کی جا سکتی ہیں جن سے صاف اندازہ ہوگا کہ موجودہ ہندی، کوئی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ اس کو جنم دینے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام، انگریزوں کی اعانت سے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع ہوا اور بعد ازاں یہ کام، انگریزوں کی لسانی و تعلیمی پالیسی کے ساتھ ساتھ جس کا مقصد واضح طور پر سیاسی تھا، آگے بڑھتا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں جب فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور ۱۸۳۹ء میں جب صدر عدالت دیوانی اور نظامت میں بھی اسے سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی تو انگریزی حکومت کا یہ اقدام، بظاہر اردو کے حق میں تھا، لیکن اس تبدیلی سے انگریزوں کی نظر بڑے دور رس نتائج پر تھی اور یہ نتائج سراسر حکومت کے مفاد میں تھے۔

مسلمانوں کے عہد تک پورے برصغیر کی ثقافتی و تہذیبی اور سرکاری و عدالتی زبان فارسی تھی۔ فارسی کو ایک ایسے رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل تھی جس کے ذریعے مسلمان اپنے اندر ملی وحدت کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھ سکتے تھے اور اپنے بعض مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتے تھے۔ لیکن فارسی کو ختم کر کے انگریزوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس قدیم و مضبوط رشتے کو کاٹ دیا جس میں برصغیر کے سارے مسلمان، خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقے اور صوبے سے ہو۔ بندھے ہوئے تھے۔ فارسی کو ختم اور اردو کو رائج کرنے سے انگریزوں کو دُہرا فائدہ پہنچا۔ ایک تو یہ کہ انھیں مسلمانوں کی ثقافتی و سماجی شیرازہ بندی کو کمزور کرنے میں آسانی ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ عوام سے رابطہ قایم کرنے اور اس طرح اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کا انھیں موقع مل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو رائج کرنے کے سلسلے میں جو احکامات صادر کیے گئے تھے ان میں ایسی دفعات بھی شامل تھیں جن کی آڑ لے کر انگریز اپنے مقبوضہ علاقوں میں کسی بھی دیسی زبان کو رائج کر سکتے تھے چنانچہ آگے چل کر انگریزوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور مختلف صوبوں میں مختلف زبانوں کو فروغ دے کر مسلمانوں کے اس

---

[1] دی پرابلم آف ہندوستانی ص ۵۸ الہ آباد ۱۹۴۴ء

[2] ادبی و قومی تذکرے ص ۱۴ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۱ء

www.taemeernews.com

ثقافتی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی جو فارسی کے سبب قایم تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کام اُردو کو سرکاری زبان بنانے کے ساتھ ساتھ شروع کر دیا گیا تھا اس لیے کہ ۱۸۳۳ء میں جو تعلیمی کمیٹی، لارڈ میکالے کی سربراہی میں قایم کی گئی تھی اس نے ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم قرار دینے کے ساتھ ہی انگریزی تعلیم کی غرض و غایت بھی ان الفاظ میں واضح کر دی تھی کہ ـــــــ

"ہمارا مقصد، بہر طور ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا ہے جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان جس پر ہم حکمران ہیں ترجمان بن جائے، ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل و رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات، خیالات، اخلاق اور فکر کے لحاظ سے انگریز ہو۔" [۱]

لیکن پروفیسر حمید احمد خاں نے انگریزوں کی اس تعلیمی و لسانی حکمت عملی کو ۱۸۳۵ء سے بھی پرانی بتایا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ـــــــ

"یہ خیال کہ اہل پاکستان و ہند اپنے قدیم علوم سے قطع نظر کر کے بس صرف یورپی علوم پڑھیں اور ذریعہ تعلیم انگریزی ہو، اس کا پہلا تحریری سراغ ۱۸۲۴ء کے ایک سرکاری مراسلے میں ملتا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں میکالے کی مشہور سرکاری قرارداد نے اس نئی تجویز کو قطعی صورت دے دی۔" [۲]

بعد ازاں جیسے جیسے، برصغیر پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو گئی، انگریزی کے ساتھ ساتھ، ہندی کا بھی رواج قایم ہوتا گیا اور اردو بے یار و مددگار ہو کر رہ گئی۔ انگریزوں نے صرف اس خیال سے کہ اُردو بحیثیت مجموعی مسلم تہذیب کی نمایندگی کرتی ہے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں معاون ہے، اُس کے مقابلے میں ہندی کو آگے بڑھایا، اور ہندوؤں سے اس کے خلاف آواز بلند کروائی جو کام فورٹ ولیم کالج میں شروع کیا گیا تھا ۱۸۵۷ء کے بعد اُس کی تکمیل کا جتن کیا گیا۔ کبھی اُردو کے رسم الخط کو ناقص بتلا کر اس میں اصلاح و ترمیم کی تجویزیں پیش کی گئیں اور کبھی اُسے ناگری میں لکھنے کا مطالبہ کیا گیا۔ چونکہ زبان کے سلسلے میں انگریزوں کی حکمتِ عملی اُس ہندو قومیت کے احیا، میں معاون تھی جس کی بنا راجہ رام موہن رائے نے انیسویں صدی کے اوائل ہی میں ڈال دی تھی، اس لیے ہندوؤں کو اردو کے خلاف نعرہ لگانے اور حکومت کی مدد سے اس کے مقابلے میں ہندی اور ناگری کی باقاعدہ تحریک چلانے میں دیر نہ لگی۔

اردو کے خلاف ابتدائی مرکز، بنارس میں قایم ہوا، پھر اس مرکز کی شاخیں مختلف علاقوں اور صوبوں میں قایم کی گئیں، تھوڑے ہی دنوں میں جگہ جگہ اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کے ادارے وجود میں آ گئے۔ یہ کام اگرچہ بہت پہلے سے جاری تھا لیکن جب بنارس کے ہندوؤں نے اجتماعی حیثیت سے قومی مسئلے کے طور پر، اردو کی مخالفت میں تحریر و تقریر کا سلسلہ شروع کیا تو سر سید احمد خاں جیسے ہندو مسلم اتحاد کے مبلّغ اور اُن کی معرفت بعض دوسرے مسلمانوں کو بھی اس جارحیت کے خلاف آواز بلند کرنی پڑی۔ لیکن اُردو کے خلاف تحریک کی پشت پناہی چونکہ حکومت کر رہی تھی اس لیے مسلمانوں کے

۱۔ بیسک ڈوکومنٹس Basic Documents از کرسٹائن ڈوبن لندن ۱۹۷۰ء

۲۔ تعلیم و تہذیب ص ۷۷ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء

www.taemeernews.com

احتجاج کی کوئی پروا نہ کی گئی، ظاہر ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو اس سے غیر معمولی نقصان پہنچا چنانچہ ۱۸۶۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان چالیس برسوں میں اردو ہندی کا جھگڑا، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان شدت سے زیر بحث رہا، چونکہ یہ بحث، ہندوؤں کی ہٹ دھرمی، اور انگریزوں کی اردو دشمنی کے سبب علمی و لسانی دائروں سے آگے بڑھ کر سیاسی رنگ اختیار کر گئی تھی اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر اس نے گہرا اثر ڈالا۔ دونوں کے سوچنے کا انداز ایسا بدلا کہ اُن کی سیاسی منزلیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئیں۔ سر سید احمد خاں جیسے صلح جو بھی ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ اس سلسلے میں مولانا حالی نے سر سید کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ـــــ

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے ـــــ

سر سید کہتے تھے یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ اُن (سر سید) کا بیان ہے کہ اُنھیں دنوں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر اُنھوں نے کہا آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے ہمیشہ ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد، ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔ اُنھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اس پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔[1]

۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خاں، پونے دو برس کے لیے انگلستان چلے گئے، اُن کے جانے سے مسلمانوں خصوصاً اردو کے حامیوں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ ہندوؤں نے اس زمانے میں بڑے طوفان برپا کیے۔ مولانا الطاف حسین کا بیان ہے کہ "بنارس میں بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر، اردو کے خلاف ایک مجلس قایم ہوئی، رفتہ رفتہ اس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قایم ہو گئیں، ایک صدر مجلس الہ آباد میں قایم کی گئی جس کے ماتحت مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں قایم ہوئیں۔[2]

گارساں دتاسی نے دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں اردو کے خلاف تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ـــــ

"برطانوی حکومت، اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے اور چونکہ ہندوستان کی آبادی کی اکثریت انھیں پر مشتمل ہے اس لیے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے۔ صوبہ جات شمالی و مغربی، اودھ اور پنجاب میں دفاتر اور عدالتوں میں، ہندی رائج کرنے سے جو سیاسی فوائد حاصل

---

۱ حیات جاوید ص ۱۶۳ آئینۂ ادب لاہور ۱۹۶۶ء

۲ " ص ۱۶۴ " " " "

www.taemeernews.com

ہوں گے۔ اُن کے متعلق انڈین ڈیلی نیوز کے ایک مقالے میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے"۔[1]

سرسید احمد خاں بھی اُردو کے خلاف حکومت کی پالیسی اور ہندوؤں کی شورش سے بدظن ہوئے۔ انھوں نے نواب محسن الملک کو ۱۸۶۸ء میں لکھا ـــــــ

"ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھے کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اُردو و خط فارسی جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائینٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو، ہندی ہو۔ ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو بقصد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اُردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علٰحدہ اور مسلمان علٰحدہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے"۔[2]

سرسید کا خیال صحیح تھا، لیکن چونکہ ہندوؤں کی تحریک دراصل انگریز افسروں کے اشارے پر تھی اس لیے کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سرسید کی کوششیں اور مسلمانوں کا احتجاج بے نتیجہ ثابت ہوا۔ ابھی ہندی اردو کے مسئلے پر بحث و مباحثہ جاری ہی تھا کہ بنگال کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جی کمبل G. Camble نومبر ۱۸۷۱ء میں، ایک تعلیمی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے مظفر پور (بہار) گئے۔ جلسے میں تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر فیلن اور کمبل نے انگریزی میں تقریریں کیں اور جلسے کے سکریٹری مولوی امداد علی نے اردو زبان میں، کمبل صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سپاس ناموں میں کچھ نہ کچھ پر تکلف انداز اختیار کرنا پڑتا ہے، مولوی امداد علی نے یہی کیا لیکن مسٹر کمبل چونکہ پہلے ہی سے اُردو کے خلاف بھرے بیٹھے تھے اس لیے سپاس نامے کی زبان پسند نہ آئی، چنانچہ انھوں نے اردو کے خلاف بڑی زہر آلود تقریر کی اور کہا "یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی"۔[3] چند روز بعد ۴ر دسمبر ۱۸۷۱ء کو مسٹر کمبل نے اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے خارج کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب حکم نامہ جاری کر دیا۔ اس حکم نامے کے چند ٹکڑے بطور نمونہ دیکھیے ــ ــ

"اردو، یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ کتابوں میں اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان اہلِ دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو روکنے کی پوری کوشش کروں گا۔ جسے اردو کہتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کی اس کی تعلیم دی جائے"۔ ـــــ

میں ناظمِ تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کراتا ہوں کہ ـــــ

(۱) اُردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی متروک ہو چکی ہے۔

---

[1] خطبات گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۱۸۳ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۴ء

[2] سرسید احمد خاں کے خطوط ص ۵۹ مرتبہ وحید الدین سلیم مطبوعہ حالی پریس پانی پت ۱۹۰۱ء

[3] حیات جاوید ص ۱۶۴

www.taemeernews.com

(۲) ناظمِ تعلیمات اور مہتممانِ تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی۔

(۳) اس قسم کی کتابیں جو نصاب میں شامل کی جائیں اُن کی فہرست مجھے بھیجی جائے۔

(۴) میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں اُن کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر ہوتی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ بھی اس بارے میں ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔[1]

مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ کمبل ایک تو پہلے ہی مسلمانوں اور اُردو کا دشمن تھا دوسرے یہ کہ اس وقت بہار میں ڈاکٹر فیلن بحیثیت مہتمم مدارس اور انتھونی میکڈانل بحیثیت کلکٹر موجود تھے۔ یہ دونوں اردو کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ انھوں نے لفٹنٹ گورنر کمبل صاحب کے کان بھرے اور انھوں نے ۴ر دسمبر ۱۸۷۱ء کو سرکاری دفتروں سے اُردو کو خارج کردینے کی ہدایت جاری کردی۔ اس ہدایت نامے میں اُردو کے بارے میں جس قسم کی بے بنیاد اور مسلمانوں کے سلسلے میں دل آزار باتیں کہی گئی ہیں اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسٹر کمبل کو اردو اور مسلمانوں سے کتنی نفرت تھی۔ وہ کھلم کھلا ہندی اور ہندوؤں کی طرف داری کر رہے تھے اور حاکم ہونے کے زعم میں مسلمانوں کی زبان و ثقافت پر ضرب کاری لگارہے تھے۔[2]

بنگال، بہار اور سی پی میں اُردو کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے کے بعد اُردو دشمن، انگریزی حکمتِ عملی نے یوپی اور پنجاب کا رُخ کیا اور ہندوؤں سے اردو کے خلاف بھرپور تحریک چلوائی گئی۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۷۱ء کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اردو اور ہندی کا لسانی بحث مباحثے کا سلسلہ بدستور جاری ہے، صوبہ شمال و مغرب کے رجعت پسند ہندوؤں کے دستخط سے حکومت کے روبرو ایک معروضہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں، بجائے عربی رسم الخط کے جس میں اُردو لکھی جاتی ہے دیوناگری رسم خط میں ہونی چاہیے جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے[3] اس قسم کی متعدد درخواستیں اُردو کے خلاف، حکومت کو بھجوائی گئیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حکومت نے ہندوؤں سے درپردہ طلب کیں اور اُردو کو صوبہ شمالی و مغربی یعنی یوپی اور پنجاب سے بھی خارج کردینے کا منصوبہ بنایا۔ پے درپے، اردو کے خلاف، اخبارات و رسائل میں مضامین چھپوائے گئے، اور ہندی کے لیے راہ ہموار کی گئی، اُردو کے ہمدردوں نے بھی دفاعی اقدامات کیے، سرسید احمد خاں نے ۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں اردو کی حمایت میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اُردو ڈیفنس سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قایم کی، سید جعفر علی رئیس و تعلقہ دار الہ آباد، اس انجمن کے صدر اور سرسید احمد خاں سکریٹری منتخب ہوئے۔ ہر ضلع میں اس انجمن کی ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں[4] ۱۲ر دسمبر ۱۸۷۳ء کے علی گڑھ اخبار میں اردو ڈیفنس سوسائٹی کے جلسہ منعقدہ الہ آباد کی پوری روئیداد شایع ہوئی ہے اور گارساں دتاسی نے بھی اپنے ایک مقالے میں اس پر تبصرہ کیا ہے[5] لیکن اُردو ڈیفنس

---

[1] مقالاتِ گارساں دتاسی حصہ اوّل ص ۱۷۶ تا ص ۱۸۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۳ء

[2] سرسید احمد خاں ص ۶۱ تا ص ۶۴ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۱ء

[3] مقالاتِ گارساں دتاسی حصہ اول ص ۱۰۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۳ء

[4] دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس ص ۲۶ از سی۔ اے۔ بیلی مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۷۵ء

[5] دیکھیے مقالاتِ گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۴ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۳ء

www.taemeernews.com

سوسائٹی کی کوششیں اردو کے خلاف، انگریزوں اور ہندوؤں کے اٹھائے ہوئے متحدہ طوفان کو نہ روک سکیں ۔ البتہ مسلمانوں کی مزاحمت کے سبب یہ ہوا کہ اُردو کے خلاف جاری کردہ سرکاری احکامات کو عملی جامہ پہنانے میں دیر لگی ۔ جارج کمیبل نے دوسرے صوبوں میں دفتروں سے اُردو کو خارج کرنے کے لیے جو ہدایت نامہ جاری کیا تھا وہ بھی ۱۸۸۱ء سے پہلے عملاً نافذ نہ ہوسکا ۔ یو۔پی میں بھی حکومت فوری طور پر اُردو کی حیثیت کو متاثر نہ کرسکی اور وہاں اسے اپنے مقصد میں کامیابی کوئی بیس سال بعد ہوئی ۔ لیکن پنجاب میں اردو کے خلاف سازش بُری طرح ناکام ہوئی ۔ اس ناکامی کے دو نمایاں سبب تھے، ایک یہ کہ پنجاب میں اتفاق سے ڈاکٹر لائٹنر جیسے بعض صاحب اثر اور انصاف پسند یورپین افسر محکمہ تعلیم و تدریس میں موجود تھے جن کے پیش نظر ہندوستان کی سیاست نہیں بلکہ فی الواقع علمی و ادبی خدمت تھی ۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اُن کا یقین تھا کہ برصغیر کی لینگوا فرانکا صرف اُردو ہے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں مشرقی زبانوں خصوصاً عربی و فارسی سے بھی گہری دلچسپی تھی اور وہ ان زبانوں کو زندہ رکھنا نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی پوری تہذیبی و سماجی زندگی کے لیے ضروری خیال کرتے تھے ۔ اردو کے خلاف تحریک کی ناکامی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اہل پنجاب، دوسرے علاقے کے لوگوں کی بہ نسبت، مشرقی زبانوں خصوصاً اُردو کے دفاع میں زیادہ سرگرم اور پرجوش تھے ۔ ہر چند کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں آریہ سماجی ہندوؤں نے لاہور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا اور پنجاب کے اضلاع میں جگہ جگہ اُن کی شاخیں قایم تھیں ۔ لیکن اہلِ پنجاب نے اپنے صوبے کے مسلمانوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑنے دیا ۔ انھوں نے زبان و ثقافت اور مذہب و سیاست کے باب میں ہندوؤں کی بد دیانتی اور حکومت کی چال کو پوری طرح بھانپ لیا اور اپنے تحفظ و دفاع میں ہر جگہ ہندو سبھاؤں کے متوازی اپنی الگ انجمنیں قایم کرلی تھیں [1]۔

اب اُردو کے خلاف، سارا زور یو پی میں صرف کیا گیا اور انگریزوں کی مسلسل شہ پر اب ہندوؤں کی سرگرمیاں، صرف ہندی کو آگے بڑھانے یا اُردو کو نقصان پہنچانے تک محدود نہ رہیں بلکہ انھوں نے متعدد ایسی مذہبی و سماجی تحریکوں کو جنم دیا جن کا مقصد، واضح طور پر، ہندو کلچر کا احیاء، ہندی کی ترویج، اُردو کی مخالفت اور ہندوؤں کو ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے اُبھار کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر مسلط کرنا تھا ۔ ان تحریکوں میں قدیم ترین، راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج (۱۸۲۸ء) تھی ۔ اسی کے زیر اثر بمبئی میں پرارتھنا سبھا قایم کی گئی ۔ ۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنا ڈالی ۔ دیانند سرسوتی نے سنسکرت آمیز ہندی میں ”ستیارتھ پرکاش“ نامی ایک کتاب بھی لکھی [2] اس میں صرف یہ نہیں کہ ہندومت کی اہمیت و بزرگی بیان کی گئی بلکہ دیگر مذاہب خصوصاً اسلام پر رکیک حملے بھی کیے گئے ۔ ۱۸۸۲ء میں دیانند سرسوتی نے ”گئو رکھشا سبھا“ کے نام سے ایک اور انجمن بنا ڈالی ۔ اسی سال یعنی ۱۸۸۲ء ہی میں ایک بنگالی ہندو بنکم چندرا چٹرجی نے ایک ناول ”آنند مٹھ“ (مسرت کی خانقاہ) کے نام سے لکھا جس میں مسلمانوں اور ہندوستان میں اُن کے عہد حکومت کے خلاف جی کھول کر زہر اُگلا گیا ہندوؤں کا قومی ترانہ ”بندے ماترم“ اسی ناول کا حصہ ہے ۔ ان تحریکوں کے ساتھ انگریزوں کے منشا سے اور ایک ریٹائرڈ انگریز آئی سی ایس افسر مسٹر ہیوم Hume کی تجویز پر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوؤں کی ایک ملک گیر سیاسی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ”ہندی اردو تنازعہ ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں باب ششم از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۷۷ء

[2] اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائرنمنٹ ص۲۵۹ آکسفورڈ ۱۹۶۴ء

www.taemeernews.com

جماعت بھی منظر عام پر آ گئی۔ کانگریس نے کس طرح جنم لیا۔ اس کا حال خود کانگریس کے ممتاز لیڈر ڈپا بھی سیتا رمیا نے اس طور پر بیان کر دیا ہے۔

"مسٹر ہیوم برطانوی عہدے دار تھے۔ اُن کو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ کہیں یکایک شورش پھیل جائے پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے، اس پر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام قایم ہونا چاہیے جس سے برطانوی حکومت ان سازشوں سے محفوظ رہ سکے۔"[1]

کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۰ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ اس میں نشتر ہندو اور صرف ایک مسلمان نے شرکت کی۔ ہیوم کے علاوہ اس میں اور کئی ممتاز انگریز جو برطانوی پارلیمنٹ کے رکن یا ہندوستان میں افسر اعلیٰ رہ چکے تھے، شریک ہوئے۔ کئی سال تک کانگریس کے سالانہ جلسوں کی صدارت یہی انگریز کرتے رہے۔ جب کوئی ممتاز انگریز انگلستان سے آتا تھا تو اس کو شاندار استقبالیہ دیا جاتا تھا اور بعض انگریز محسنوں مثلاً لارڈ رپن کی سال گرہ منائی جاتی تھی اور مبارک باد کی تجویز منظور کی جاتی تھی۔[2]

کانگریس کی تحریک جیسا کہ خود ڈپا بھی سیتا رمیا نے اس کا اعتراف کیا ہے آریہ سماج، برہمو سماج اور رام کرشنا مشن وغیرہ کے طرز کی ایک ایسی تحریک تھی جس کا مقصد، حکومت کی مدد سے ہندومت اور ہندو قومیت کا احیا تھا۔ اس کے رہنما دل میں دہی لوگ تھے جو ہندو قومیت کی جارحانہ تحریکوں کے ذریعے، مسلمانوں پر سیاسی اور ثقافتی غلبہ قایم کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف جارحیت کی ایک مثال مشہور کانگریسی لیڈر بال گنگادھر تلک کی وہ تحریک تھی جو ۱۸۹۳ء میں نمودار ہوئی۔ گنگادھر تلک صرف ہندوؤں کو ہندوستان کا باشندہ اور مسلمانوں کو بدیسی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور جنگی جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے ہر سال ہندو دیوتا گنیش کی پوجا کا میلہ لگانا شروع کیا۔ یہ میلہ جو گنپتی میلہ کہلاتا تھا دس دن جاری رہتا تھا اس میں اس قدر اشتعال انگیز تقریروں، ڈراموں اور نعرہ بازیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ ہندو مشتعل ہو کر مسلمانوں پر حملے شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس میلے کے سبب مختلف شہروں میں بلاسے ہوئے، مسلمانوں کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا گیا اور مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔[3] یہی نہیں تلک نے ایک اور تحریک شروع کی اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے شیواجی کو ہندوؤں کا ہیرو قرار دے کر اس کے مزار کی مرمت کرائی اور شیواجی نے مسلمانوں کے خلاف بدعہدی اور فریب دہی کے جو کام کیے تھے انھیں اس کے مثالی کارناموں سے تعبیر کیا۔ انھوں نے انسداد گاؤکشی کے لیے بھی ایک سوسائٹی قایم کی اور ذبیحۂ گاؤ کے خلاف تحریک چلائی۔ اپنے پروگراموں کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے دو اخبار بھی نکالے۔ ایک کیسری Kesari کے نام سے مرہٹی زبان میں دوسرا انگریزی میں دی مراہٹہ The Maratha کے نام سے[4] دونوں

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس جلد اوّل صـ۸ مدراس ۱۹۳۵ء

[2] " " " " صـ۹

[3] مسلمانوں کا روشن مستقبل صـ۲۷ از طفیل احمد منگلوری مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۸ء

[4] اے ہسٹری آف دی انڈیا نیشنلسٹ مومنٹ از دی، لووٹ لندن ۱۹۶۸ء

www.taemeernews.com

ہیں مذہبی تعصبات پر مبنی اشتعال انگیز مضامین شایع کیے جاتے تھے۔

جس سال تلک نے گنپتی میلہ کی بنا ڈالی اسی سال کانگریس کے ایک اور مشہور رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ نے بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا قایم کی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد ناگری کی حمایت اور اردو کی مخالفت اور ہندو قومیت کو فروغ دینا تھا[1] حقیقی غایت یہ تھی کہ جلد سے جلد برصغیر پہ ہندوؤں کا سیاسی تسلط قایم کرکے، مسلمانوں کی ثقافتی اور ملی انفرادیت کو ختم کرکے ان کو واحد ہندو قومیت میں ضم کر دیا جائے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے چوکنا ہو گئے۔ سرسید نے اور اُن کے رفقا کی طرف سے کانگریس کی مخالفت کی گئی اور علی گڑھ تحریک کے ذریعے جگہ جگہ اسلامیہ کالج اور اسکول قایم ہوئے جن میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی ۱۸۹۵ء میں اردو کے جانی دشمن اور مسلمانوں کے مخالف 'انتھونی میکڈانل'، صوبہ شمالی و مغربی اودھ کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ اب کیا تھا ہندوؤں کی دلی مراد بر آئی۔ انھوں نے میکڈانل سے مل کر اردو کے خلاف ایسا زبردست دھماکا کیا جس نے نہ صرف یوپی بلکہ پورے برصغیر کے سارے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ میکڈانل کے آتے ہی ہندوؤں کی طرف سے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں پھر آواز اٹھائی گئی اور مارچ ۱۸۹۸ء میں ایک طویل محضر نامہ، لفٹنٹ گورنر کو اس غرض سے پیش کیا گیا کہ عدالت اور سرکاری دفتروں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بجائے ہندی اور ناگری رسم الخط کو رائج کیا جائے[2] سرسید احمد خاں اگرچہ بستر مرگ پر تھے پھر بھی انھوں نے ایک طویل مقالے کی صورت میں اُن اعتراضات کا جواب دیا جو ہندوؤں کے محضرنامے میں اردو کے خلاف اٹھائے گئے تھے۔ یہ مقالہ اُن کی وفات سے صرف نو دن پہلے ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شایع ہوا علاوہ ازیں الہ آباد میں جو اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کی تھی، اُسے بھی سرسید احمد خاں نے کچھ مفید مشورے دیے۔ سرسید کے علاوہ بھی ہندوؤں کی عرض داشت کے جواب میں مسلمانوں نے کئی عرضیاں بھیجیں، مقالے چھپوائے، احتجاجی جلسے کیے اور ہندی و ناگری کے رواج سے پیدا ہونے والی قباحتوں کی طرف، ارباب اقتدار کی توجہ مبذول کرائی لیکن حکومت اور میکڈانل پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ہندوؤں کے مطالبے کو تسلیم کر لیا اور ہندی اور ناگری کو یوپی کی عدالتوں میں بھی باریابی حاصل ہو گئی[3]

میکڈانل کے اس فیصلے کے خلاف، مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ محمد امین زبیری کے الفاظ میں سبب یہ تھا کہ ـــــ

"مسلمانوں کے لیے من حیث القوم یہ ریزولیوشن (میکڈانل کا حکم نامہ) سخت مضر تھا، تعلیم اور وسیع و ترقی پذیر لٹریچر، عدالتی و تجارتی اور تمدنی کاروبار، ہندو مسلم اتحاد، غرض سب ہی اس کی زد میں تھے"[4]

---

1. سپراٹیزم امنگ انڈین مسلمز ص ۲۶ از فرانسس رابنسن کیمبرج ۱۹۷۴ء
2. حیات جاوید ص ۱۶۵   3. حیات جاوید ص ۱۷۲
4. حیات محسن ص ۱۵۳ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۴ء

www.taemeernews.com

مجبوراً سر سید احمد خاں کے بعد اُن کے رفقا اور دوسرے مسلمان سینہ سپر ہو کر میدان میں آ گئے۔ نواب محسن الملک نے پہلے اپنی کوٹھی پر ایک مختصر سا جلسہ کیا۔ اس پر میکڈانل صاحب نے محسن الملک اور علی گڑھ تحریک کے دوسرے رہنماؤں سے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود محسن الملک نے ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء میں بمقام لکھنؤ ایک بڑا احتجاجی جلسہ منعقد کرایا، صدرِ جلسہ کی حیثیت سے حکومت کے رویّے کے خلاف نہایت پرجوش تقریر کی اور شہر بہ شہر جلوس و احتجاج کے لیے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کر دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک وفد کی شکل میں لفٹننٹ گورنر سے ملنے اور اپنے موقف کی وضاحت کرنے کی اجازت بھی چاہی لیکن میکڈانل نے ملاقات کا وقت دینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری بھی تھے اور اس کالج کے مسلمان ٹرسٹیوں میں سبھی میکڈانل کے خلاف احتجاج میں شریک تھے اس لیے حکومت کی طرف سے یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر محسن الملک نے اردو تحریک کو آگے بڑھایا تو کالج کی سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ میکڈانل نے اُن کے نام کے ساتھ "محسن الملک" لکھنا بھی چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہ خطاب انھیں ۱۸۸۷ء میں گورنر جنرل کی طرف سے ملا تھا اور سرکاری مراسلت میں اُن کے نام کے ساتھ برابر استعمال ہوتا تھا اور میکڈانل کو اسے محذوف کرنے کا اختیار نہ تھا[1]۔ اگرچہ میکڈانل کا یہ طرزِ عمل محسن الملک کے لیے ذاتی طور پر حد درجہ توہین آمیز تھا اور میکڈانل کے ہر اقدام سے مسلمانوں سے اُن کی خفگی بھی ظاہر تھی، پھر بھی محسن الملک اردو کے دفاع کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور دوسرے مسلمان بھی اُن کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ لیکن حکومت کی متعصبانہ حکمت عملی اور اردو دشمنی کے سبب، اُردو تحریک کا کوئی بہت مفید نتیجہ تو نہ نکلا، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ناگری کے ساتھ اردو رسم الخط بھی عدالتوں اور دفتروں میں برقرار رہا۔ نیز برطانوی حکومت اور ہندوؤں کی متحدہ سازش کا راز مسلمانوں پر کچھ اس طرح فاش ہوا کہ مفاہمت کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی منزلیں ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہر سطح پر اپنا دفاع آپ کرنے کا تہیہ کیا اور اُن کی سیاسی و ثقافتی سرگرمیاں پہلے کے مقابلے میں تیز تر ہو گئیں۔

میکڈانل کی سختیوں کے سبب اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن تو قایم نہ رہ سکی لیکن ۱۹۰۳ء میں اس سے وسیع تر ادارہ انجمن ترقی اردو کے نام سے قایم ہو گیا۔ مسلمانوں نے یہ بھی ضروری خیال کیا کہ حکومت کے مظالم اور ہندوؤں کے جارحانہ عزائم سے بچنے کے لیے ایک علٰحدہ سیاسی تنظیم قایم کی جائے جو ملکی و ملّی مسائل میں اُن کی نمایندہ و ترجمان ہو۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے نام سے انھوں نے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ پھر سب نے دیکھا کہ قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں انھوں نے پاکستان کے نام سے اپنے سارے حقوق کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا اور اس سے برطانوی حکومت اور ہندو کانگریس کو جو صدمہ پہنچا وہ اب کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ——

▲●●

---

[1] ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان از شیخ محمد اکرام ص ۸۶ لاہور ۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

شفقت رضوی

مستشرقین کی اردو خدمات

جب ایک عام ذہن انگریزوں کی بولی جانے والی اردو کا تصور کرتا ہے تو ایک ایسی گوراشاہی زبان کا نقشہ ابھرتا ہے جس کا تلفظ اور قواعد کے اعتبار سے اصل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور لہجہ ایسا کہ پہاڑ سے لڑکھڑانے والے پتھروں کی آواز کی طرح سماعت پر گراں گذرے۔ یہ دراصل ان افسروں کی زبان اور لہجہ تھا جو غیر معمولی احساس برتری کا شکار تھے۔ لیکن بنظر تحقیق دیکھا جائے تو صورتِ حال قطعی مختلف نظر آتی ہے اور ایسے انگریزوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے جو اردو کو اہلِ زبان کی طرح بولتے اور لکھتے رہے۔ ان میں وہ مقررین بھی شامل ہیں جنھوں نے بے شمار سرکاری تقاریب اور غیر سرکاری اجتماعات میں اپنی زبان دانی اور فصاحت مقالی کے جوہر دکھلائے ہیں۔ سر جان لارنس وائسرائے ہند، سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر صوبہ جات شمال و مغرب سرحد۔ بی گرانٹ لفٹنٹ گورنر بنگال۔ سر ہنری منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب، کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب، پیرسن ڈائرکٹر تعلیمات علاقہ راولپنڈی، ایم کیمپس ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ جات شمال و مغرب کی شستہ، نکھری اردو تقریریں آج بھی محفوظ سرمایہ ہیں۔

اردو کی مقبولیت تجارتی اور سیاسی مقاصد کی بنا پر شروع ہوئی لیکن ایک جامع اور مکمل زبان کی حیثیت سے اس نے اپنا لوہا منوا لیا اور جن لوگوں نے برصغیر سے ذرا سا بھی تعلق پیدا کیا وہ اس سے بیگانہ نہ رہ سکے۔ تاریخ میں ایسے درجنوں اداروں اور معلمین کا ذکر ملتا ہے جو اردو کی تدریس سے متعلق ہونے کی وجہ سے مقبول اور ممتاز رہے۔ اردو کی عالمگیریت کے لیے ان اداروں نے جو کام انجام دیے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

۱

اورنٹیل سمینیری (قیام ۱۷۹۹ء معلم ڈاکٹر جان گلکرائسٹ) فورٹ ولیم کالج (قیام ۱۸۰۰ء معلمین ڈاکٹر جان گلکرائسٹ، کیپٹن ٹیلر، ڈاکٹر ہنٹر، جان لیڈن)

ہیلی بری کالج (قیام ۱۸۰۵ء معلمین جوناتھن اسکاٹ، جان شکسپیر اور مونیر ولیمز)

اڈسکومپ کالج (قیام ۱۸۰۹ء۔ ۱۸۳۲ء تک جان شکسپیر نے اردو پڑھائی، ان کے بعد چرڈ ہائن، باؤلسن، کاٹن ماتھر اور کرنل رولینڈس اردو کے معلمین رہے)

اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ (بنا کردہ جان شکسپیر اور آرنٹ۔ ان دونوں نے اردو پڑھانے کے فرائض انجام دیے)

www.taemeernews.com

چینہم کا انڈین ڈپو (۱۸۶۱-۱۸۶۰ء میں راجر اردو پڑھاتے تھے)
رائل ملٹری کالج ماربور (۱۸۰۵ء میں جان شکسپیر کا تقرر ہوا تھا)
فوجی اکیڈمی کوودیچ (معلم ماتھر)
جامعہ کیمبرج (ابتدا ۱۸۶۰ء معلمین اسٹیفن، جیمبرس پامر)
جامعہ لندن (معلم کو نزانیف فال قبل ۱۸۶۰ء کنگز کالج لندن (معلم ہال)
سنڈہرسٹ کالج (معلم ڈودمسن)
اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز (معلمین گراہم بیلی۔ رالف رسل ڈیوڈ میتھوز)

ان کالجوں سے متعلقہ اساتذہ نے تدریسی فرائض ہی انجام نہیں دیے بلکہ کار اجرائی کے لیے مفید اور کارآمد درسی کتب ترجمہ، تالیف یا تصنیف کیے۔ ان میں فورٹ ولیم کالج ادبی کتب کے لیے اور دہلی کالج علمی کتب کے لیے مشہور رہا ان سے اہل ادب اس قدر واقف ہیں کہ ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ صرف اردو تدریس کی غرض سے جن انگریز مستشرقین نے کتابیں لکھی ہیں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۲)

ایٹس Yates

۱۷۹۲ء میں انگلستان میں پیدا ہوا اس کا تعلق برطانیہ کے عیسائی مشنری سے تھا اس تبلیغی کام کے سلسلے میں ۱۸۱۵ء میں برصغیر آیا اور طویل عرصہ بنگال میں گذارا یہاں قیام کے دوران سنسکرت، بنگالی ہندی اور اردو زبانیں لکھیں اس نے Pleasing Instructor کا اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۸۳۰ء میں کلکتہ سے چھپ کر اسکول بک سوسائٹی کی جانب سے شایع ہوا۔ اس نوعیت کی دوسری کتاب "ہندوستانی ریڈر" ہے۔ اس نے "مقدمہ ہندوستانی (۱۸۲۰ء) بھی لکھا ہے۔ لیکن اول الذکر دونوں کتابوں کی نوعیت درسی اور نصابی ہے۔

سینڈ فرآرنٹ۔ اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے گلکرائسٹ سے اردو زبان پڑھی تھی مشہور مستشرق ڈنکن فاربس سے قریبی تعلقات تھے۔ آرنٹ اور فاربس نے باہمی اشتراک سے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ لندن کی بنا ڈالی تھی جس کی تقلید میں گارساں دی تاسی کو خیال ہوا تھا کہ جان شکسپیر کے تعاون سے پیرس میں بھی ایسی ہی درس گاہ قایم کی جائے۔ آرنٹ نے اہل یورپ کو اردو سکھانے کے لیے آسان طریقہ پر تعارفی اسباق تحریر کیے اور کتابی صورت میں شایع کیا جس کا نام تھا۔

"جدید آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے"

اس میں عبارت فارسی اور رومن حروف میں ہے ضمیمہ کے طور پر لغت اور مشقی سوالات شامل ہیں۔ انداز تحریر کے اعتبار سے اس کی نوعیت درسی کتاب کی ہے۔ ۱۸۳۱ء میں لندن سے شایع ہوئی۔

ولیم ٹیٹ نے ۱۸۲۷ء میں "مقدمہ زبان ہندوستان" کلکتہ سے شایع کیا ٹیٹ کی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں قواعد دوسرے میں اردو انگریزی لغت اور تیسرے میں زبان دانی کے اسباق ہیں۔ تیسرا حصہ نصابی نوعیت کا ہے۔

کیپٹن ایچ ۔ بی ۔ ہنٹ نے خطوط نویسی پر ایک کتاب "فارسی اردو خط و کتابت" ۱۸۴۳ء میں کلکتہ سے شایع کی
مونیر ولیمز جو ہیلی بری کالج میں اردو کے پروفیسر تھے آسان طریقہ سے ہندوستانی سیکھنے کے موضوع پر کتاب لکھی،
جس کا نام An easy introduction to the study of Hindustani in which the English alphabets is adopted to the expression of Hindustani with full syntax تھا۔

ہالرائیڈ ۔ یہ پنجاب میں ناظم تعلیمات تھے اور مولانا محمد حسین آزاد نے پہلے پیرسن کی ماتحتی میں پھر ہالرائیڈ کے ساتھ کام کیا تھا۔ پیرسن نے آزاد کی مدد سے ایک جدید انداز کی تاریخ ہند مدارس کے لیے تیار کی تھی لیکن اب اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ آزاد کی مرتبہ اردو کی ریڈروں نے ملک گیر شہرت پائی۔ یہ کام ہالرائیڈ کی نگرانی میں انجام پایا اور جب وہ شایع ہوئیں تو ان پر آزاد کے بجائے ہالرائیڈ کا نام تھا۔ ان کتب پر عبارت تھی۔

Edited by Colonel W P. M Holroyd D. P. I. Punjab with the aid of Native Scholars.

اٹوڈوس پریچرڈ (۱۸۲۶ء — ۱۸۷۵ء) کو بھی برصغیر کے تعلیمی مسائل اور انگریزوں کو اردو پڑھانے کے معاملے سے خصوصی دلچسپی تھی اس زمانے میں نیس متھ Nasmith کی کتاب بے حد مقبول تھی جو انگریزوں کو فرانسیسی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ پریچرڈ نے نیس متھ کے اصولوں پر اردو پڑھانے کے طریقے وضع کیے اور ایک کتاب لکھی۔

The English Language on Nasmith practical system adopted to Oordoo.

اس کی تکمیل دو مسلم طلبہ سید جعفر حسین اور مرزا خداداد بیگ کے تعاون سے ہوئی اور ۱۸۷۳ء میں شایع کی گئی۔

جی ۔ این ۔ رینکنگ جو ۱۸۵۲ء میں انگلستان میں پیدا ہوئے ۱۸۷۵ء یا اس سے قبل برصغیر آئے اور ۱۸۶۹ء تک یہاں قیام کیا بعد میں آکسفورڈ میں اردو کے اور پھر کلکتہ یونیورسٹی میں تاریخ و ادب فارسی اور ایرانی فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ ان کی متعدد کتابیں اردو زبان سکھانے کے طریقوں سے متعلق ہیں ۔ مثلاً

تعلیم اردو زبان ۔ مطبوعہ کلکتہ سنٹرل پریس ۱۸۰۹ء شایع کردہ تھاکر اینڈ اسپنک کمپنی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء
آسان اردو پاکٹ بک
شایع کردہ تھاکر اینڈ اسپنک کمپنی۔

آخر میں لفٹننٹ کرنل ڈی ۔ سی ۔ فلوٹ کا ذکر بھی ضروری ہے جو کلکتہ کے امتحانات کے بورڈ کے سکریٹری اور کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بھی رہ چکے ہیں ۔ ان کی تصانیف یہ ہیں ۔

Hindustani Stepping Stones

Hindustani Stumbling Block

Hindustani Mannual

گلکرسٹ کی تصانیف سے تو سب واقف ہیں ۔ اس خصوص میں ان کی یہ چند کتب پیش کی جاسکتی ہیں ۔
ہندوستانی کے پہلے اور دوسرے امتحان کے لیے آسان مشقیں مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۱ء
بیاضِ ہندی جلد اول ۱۸۰۲ء جلد دوم ۱۸۰۳ء

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

علمی خاکے رومن رسم الخط میں مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

مکالمات انگریزی و ہندوستانی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

(۳)

اردو کے متذکرہ تدریسی اداروں کے علاوہ انیسویں صدی میں ایسے ادارے بھی تھے جہاں انگریز معلمین اردو میں سائنس کی تعلیم دیا کرتے۔ ان میں مدرسہ طبیبہ حیدرآباد دکن۔ دی نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کلکتہ، تھامسن انجینرنگ کالج رڑکی اور مدرسہ انجمن پنجاب لائق ذکر ہیں۔

مدرسہ طبابت حیدرآباد دکن کا قیام ۱۸۴۶ء میں عمل میں آیا جہاں مغربی طرز کے طب کی تعلیم دی جاتی۔ قیام مدرسہ سے ۱۸۵۵ء تک اس کے سربراہ ڈاکٹر میکملین رہے جو اردو زیادہ بہتر طور پر نہیں جانتے تھے اس لیے مترجے ان کے مترجم کے فرائض انجام دیا کرتے۔ میکملین نے طب انگریزی پر چند کتابیں بھی لکھی تھیں جن کا اردو ترجمہ مترجے نے ہی کیا ہے۔

ڈاکٹر میکملن کے بعد ڈاکٹر اسمتھ نے اس عہدے کو سنبھالا انھوں نے صرف ۶ ماہ میں اردو سیکھی اور اسی زبان میں لکچر دیا کرتے۔ اس علم سے متعلق ایک رسالہ بھی ۱۸۵۶ء میں جاری کیا جس کا نام "رسالۂ طب" تھا۔ ۱۸۵۸ء تک اس اردو رسالے کے جاری رہنے کی اطلاع ملتی ہے۔ یہاں بعد میں ڈاکٹر میکنزی نے تدریس کے فرائض انجام دیے۔

دی نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کے بارے میں محمد عتیق نے "ہندوستانی اخبار نویسی" میں اخبار "جام جہاں نما" اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے بنگال کے ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" (مورخہ ۶ راگست ۱۸۲۵ء) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ ۱۸۲۴ء میں قایم کیا گیا تھا جہاں دیسی طالب علموں کو دیسی زبان میں طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس وقت تک انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہ کا معالجہ اطبا یونانی کے ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن انگریز چاہتے تھے کہ اپنا طرز علاج متعارف کروائیں۔ اسی غرض سے یہ انسٹی ٹیوشن قایم ہوا اخبار جام جہاں نما نے طریقۂ تعلیم کے بارے میں لکھا ہے کہ

"اکثری از ڈاکٹران انگلش مامور شدہ اند و وضع تعلیم این است کہ صاحبان ڈاکٹر تشخیص و تجویز امراض بہ زبان ملک ذہن نشین آنہا می سازند۔"

ڈاکٹر پیرسن اور ڈاکٹر برٹیین دونوں کا تعلق اسی ادارے سے رہا ہے اور وہ انسٹی ٹیوشن کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدوں پر یکے بعد دیگرے فائز رہے ہیں۔ تھامسن انجینرنگ کالج ۱۸۴۷ء میں رڑکی کے مقام پر قایم ہوا جو عام طور پر رڑکی انجینرنگ کالج کہلاتا ہے۔ کرنل اے۔ ایم۔ برنڈر تھ اس کے پرنسپل اور میجر ایف فائربریس اسسٹنٹ پرنسپل تھے۔ یہاں بھی ذریعہ تعلیم اردو تھا اور تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے اس مضمون سے متعلق کتب کالج کی طرف سے شایع کی گئیں اس غرض کے لیے کالج سے متعلق ایک چھاپہ خانہ بھی قایم کیا گیا۔ اس دور میں کالج سے جو کتب شایع ہوئیں ان میں (۱) استعمال جر ثقیل۔ (۲) بیان لاگارتم (۳) رسالہ درباب پیمائش (۴) رسالہ درباب فن نجاری (۵) قواعد حساب متعلقہ انجینرنگ (۶) رسالہ پلوں کے بیان میں (۷) مجموعہ سامان عمارات شامل ہیں۔

انجمن پنجاب کا قیام مشہور مستشرق ڈاکٹر ولیم لائٹنر کی مساعی کا نتیجہ تھا اسی کے تحت ایک مدرسہ بھی جاری کیا تھا جب مئی ۱۸۶۷ء میں وہاں کالج کی کلاسیں شروع ہوئیں تو سٹینر طبیعات پڑھانے لگے وہ ہفتہ میں دو بار اردو میں درس

www.taemeernews.com

دیا کرتے تھے۔

انیسویں صدی میں ایک زبردست تحریک کا آغاز ہوا تھا کہ سائنس کی کتابیں اردو میں لکھی جائیں یا یورپین کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ کئی اداروں نے اس سلسلہ میں گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن اس تحریک کے آغاز سے قبل ہی انفرادی کوششوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہاں ہم ان چند مستشرقین کا ذکر کریں گے جن کی کتابیں علمی موضوعات پر انیسویں صدی کے دوران شایع ہوئیں۔

پیرسن

اس خصوص میں سرفہرست نام پیرسن کا آتا ہے جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے۔ اس امر کا اظہار انھوں نے اپنی ایک تصنیف میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۸۲۵ء میں کلکتہ کے ایک مردنے دن کو ہڑتال کھائی تھی۔ آدھی رات کے قریب اس کی حالت بہت تباہ ہو گئی اس وقت لوگ اس کو چاندنی چوک کے ہاسپٹل یعنی دارالشفا میں علاج کے واسطے لائے چونکہ ہاسپٹل ہمارے سپرد تھا اس واسطے ہم اس کے پاس گئے۔" (معدنی زہر ص ۳۷)

پیرسن کی کتاب "معدنی زہر" Treatise on Meneral Poisions

سائنس کے موضوع پر لکھی ہوئی اردو میں پہلی کتاب ہے جو گورنمنٹ لیتھوگرافک پریس میں چھپ کر ۱۵ جولائی ۱۸۲۶ء کو شایع ہوئی۔ اس میں زہر کی ان اقسام سے بحث کی گئی ہے جو مختلف دھاتوں مثلاً آرسنک (سنکھیا) زنک (جست) انٹی مونی (سنگ سرمہ) کا پر (تانبا) لیڈ (سیسہ) سے تیار کیے جاتے ہیں۔ طرز تحریر کا نمونہ تو آپ نے ملاحظہ کر لیا۔ اس تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف وسیع المطالعہ تھا۔ جہاں اس نے انگریزی لفظ استعمال کیا ہے وہاں حسب ضرورت سنسکرت، عربی اور فارسی کے مترادفات بھی دے دیے ہیں۔ سنکھیا کے بارے میں لکھتا ہے۔

"آرسنک انگریزی لفظ ہے اور معنے اس کے زہر چوہے کا ہے اس چیز کو عربی زبان میں سم الفار بولتے ہیں۔ اس کے معنے بھی زہر چوہے کا ہے۔ لیکن سم الفار صرف اس چیز کی صفت ہے اور سنسکرت میں سنکھیا اور شیلا بولتے ہیں۔ فارسی زبان میں زرنیخ بولتے ہیں۔ شاید کہ زرنیخ لفظ آرسنک سے نکالی گئی ہے مگر تلفظ کا فرق ہے۔"

انگریزی الفاظ اسماء، اعلام، آلات اور اصطلاحات کے لیے عام فہم اردو مترادفات بھی درج ہیں، جیسے ورید Vein اعصاب Nerves پچکاری Injection گندھک Sulpher پارہ Mercury

اکثر الفاظ کا املا مروجہ املا سے مختلف اور کسی قدر تلفظ کے مطابق ہے۔ جیسے تامبہ (تانبہ) مہہ (منہ) چھٹھا (چھٹا) دھوکا (دھوکا) اس میں کافی متروک الفاظ بھی ہیں۔ بھیتر (اندر) ان نے (اس نے) ناقوتی (کمزوری) موا (مرا) اور نئی تراکیب بھی مثلاً اکڑاہٹ، چمکاہٹ وغیرہ۔ گئی کی جگہ گیئں اور دینا چاہیے کی جگہ دیا چاہیے استعمال ہوئے ہیں۔ ڈ کو ذ۔ ٹ کو ٹ لکھا گیا ہے جو اس دور کی اکثر کتابوں میں اسی طرح ملتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں ایک کتاب "بیاں سانپ کے بکھ کا" Essay on the Venom of serpents محفوظ ہے اس کتاب پر مصنف یا مترجم کا نام درج نہیں۔ لیکن کتابت اور طباعت بالکل وہی ہے جو پیرسن کی "معدنی زہر" کی ہے اس میں گیارہ تصویریں بھی ہیں جن کے نیچے انگریزی میں یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

www.taemeernews.com

Pearson-Govt. Lith. Press اس سے ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ پیرسن کی تصنیف ہے اور گورنمنٹ لیتھوگرافک پریس میں چھپی ہے۔ معدنی زہر ۱۸۲۶ء کی مطبوعہ ہے اور "بیان سانپ کے بکھ کا" ۱۸۳۱ء کی۔ قریب الزمانہ ہونے کی وجہ سے ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے ان دونوں کا رسم الخط اور اعراب کے اشارے بھی یکساں ہیں۔

مصنف ایک جگہ ذکر کرتا ہے کہ ۱۸۱۸ء میں وہ چھوٹا ناگپور میں تھا۔

اس میں سانپ کے زہر پر جن یوروپین محققین نے کام کیا ہے ان کے حوالے بھی ہیں اور ڈاکٹر کے ذاتی تجربات بھی۔ یہ اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

پی - بریٹین

اسی دور کے مصنف بریٹین بھی ہیں ان کا تعلق نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن سے تھا اخبار جام جہاں نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"ڈاکٹر بریٹین صاحب از عرصہ یک سال با نہام این مدرسہ مقرر اند۔ قبل ازیں تشریف آوری بریٹین صاحب از انگلستان ہیچ یک کتاب این فن از عبارت انگیزی بزبانِ این ملک ترجمہ نشدہ بود۔ صاحب موصوف راچنان ذہن رسا حاصل است کہ در عرصہ یک سال از زبان انگریزی بزبان این ملک ترجمہ کردہ در مطبع خانہ سرکار کمپنی طبع گردانیدہ اند"

اخبار "جام جہاں نما" نے بریٹین کے متعدد تراجم کا ذکر کیا ہے۔ اس کی توثیق سماچار درپن سے بھی ہوتی ہے۔ سماچار درپن نے ان کتابوں کو ان سے منسوب کیا ہے۔

۱- علم تشریح
۲- رسالہ بیان دکیسی نیشن
۳- بیان تپ لوہت کا
۴- رسالہ ہیضے کا بیان
۵- بات کے مرض کی ماہیت
۶- بیان ہائیڈروسیل کا
۷- بیان موتیا بند کا۔
۸- بیان سانپ کے بکھ کا
۹- پیٹ کے اندر کی چیزوں کا بیان
۱۰- تشریح آنکھ کی
۱۱- چھاتی کے اندر کی چیزوں کا بیان
۱۲- تشریح ہڈیوں کی
۱۳- لندن فارموکوپیا
۱۴- تشریح ہڈیوں کی
۱۵- تشریح پینیس یعنے قضیب کی
۱۶- بیان ان زہروں کا جو نباتات سے علاقہ رکھتے ہیں۔
۱۷- رسالہ بیان میں ہڈیوں کے اکھڑنے کا
۱۸- بیان کان کا
۱۹- بیان ماہیت اور تاثیر ہوا۔
۲۰- بیان ڈوبنے اور پھانسی ہونے کا۔

متذکرہ کتب و رسائل میں ایک رسالہ بعنوان "بیان ماہیت اور تاثیر ہوا" ہے اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے جو گورنمنٹ لیتھوگرافک پریس کلکتہ میں ۱۸۲۹ء کا چھپا ہوا ہے۔ یہ ۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ زبان آسان ہے۔ لیکن املا کا انداز پیرسن کی کتابوں جیسا ہے۔ اس ایک رسالے کے علاوہ باقی کتب کا

www.taemeernews.com

حال نہیں ملتا۔

ہچینسن

غالباً ہچینسن بھی ایک ڈاکٹر تھا جو برصغیر کے مختلف علاقوں میں رہا اور یہاں "تپ اور اسہال" کی بیماریاں عام دیکھ کر ان کے بارے میں ایک کتاب "تپ اور اسہال کے علاج کا رسالہ" لکھا جو ۵ راگست ۱۸۳۱ء کو لیتھو گرافک پریس کلکتہ میں چھپا۔ صرف ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے یہ رسالہ ان تجربات کا حاصل ہے جو سرکاری پلٹنوں اور قیدخانوں کے دواخانوں میں اس مرض کے علاج کے سلسلہ میں اسے ہوئے تھے ابتدائی ۵ صفحات سبب تالیف کے بارے میں ہیں۔ پہلا سرورق انگریزی میں اور دوسرا اردو میں ہے۔ عبارت کا اندازہ ان جملوں سے کیا جاسکتا ہے۔

"ہم کو خوب معلوم ہے کہ پیٹ چلنے کی چند اقسام ہیں پر افسوس ہے کہ ہم لوگ اس ملک میں علامتوں سے خوب تشخیص کر نہیں سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ہندوستانی زبان سے بڑے واقف کار ہوں تو بھی یہ زبان غیر ملاؤس ہے اور ہر صوبے میں یہ زبان بدلا کرتی ہے اور جس ڈول سے ہندوستانی مریض بیماری کو ظاہر کرتے ہیں وہ بھی بعضے وجوہ سے ٹھیک ٹھیک نہیں ہے"

باوجود اس کے کہ حکیم مولوی عبدالحمید نے اس کی نظر ثانی کی ہے جملوں کی ترکیب بتلا رہی ہے کہ یہ کسی مستشرق کے رشحات قلم ہیں۔ بعض انگریزی الفاظ من وعن استعمال ہوئے ہیں جیسے سوسیٹی Society مجسٹریٹ وغیرہ۔ اکثر کا ترجمہ کیا گیا ہے آرٹیریز (شرائین) رکٹم (مستقیم) اسپازٹیری (استھاپک) انٹرمٹنٹ فیور (باری کی تپ) چونٹی بجائے چیونٹی، پانوں بجائے پاؤں اور ادستے بجائے اس سے لکھا ہے تہاں، جدا، تدا، تس، کدھی کدھی جیسے متروک الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

جیمز ایڈورڈ الیگزنڈر

الیگزینڈر کا تعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج سے تھا۔ وہ پہلے ۱۳ ویں لائٹ ڈراگون رجمنٹ میں لفٹنٹ تھا۔ بعد میں فورٹ سینٹ جارج کے گورنر کا باڈی گارڈ بن گیا الیگزنڈر نے مشرق وسطےٰ کی سیر کی تھی اور وہاں فارسی زبان سیکھی تھی برّ صغیر میں قیام کے دوران اس نے اردو میں دست گاہ حاصل کی۔ ان دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر کی استطاعت پیدا کرلی تھی۔
نواب اعتصام الدین موضع پاچنی پور بنگال کے رئیس تھے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ وہ انگلستان بھی گئے تھے اور اپنا سفرنامہ "شگرف نامہ ولایت" کے نام سے تحریر کیا تھا۔ الیگزینڈر نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی اور اردو پر کس حد تک حاوی تھا الیگزینڈر کا اردو ترجمہ ۱۸۲۷ء میں لندن سے شایع ہوا تھا۔

صدر عدالت علاقہ دکن

اردو کی مقبولیت اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اوائل انیسویں صدی میں عدالتی احکامات اردو میں جاری کیے جاتے تھے۔ چنانچہ صدر عدالت علاقہ دستی کے احکامات پر مشتمل ایک قلمی کتاب انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں تھی جس میں ۲۹ رجنوری ۱۸۰۵ء سے ۱۸ رمئی ۱۸۲۹ء تک کے احکامات جمع ہیں جو سب کے سب اردو میں ہیں۔ آخر میں ٹی۔ ڈی۔ کیمبل رجسٹرار کے دستخط ہیں۔ اس قلمی کتاب کے ۵۶ اصفحات ہیں۔

www.taemeernews.com

نامعلوم مصنف

اسی زمانے کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں ہے بلوم ہارٹ نے اس کا نام فارموکو پیا آف یوروپین میڈیکمنٹ لکھا ہے جو نستعلیق ہیں ۱۸ رصفر ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) کا مکتوبہ ہے مخطوطہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"یہ سب چیزیں جو کہ دنیا میں موجود ہیں یا سالدم Saldium یابس یا لیکویدیم Liquidum یعنی رطب یا ویپرم Vaporum یعنی بخار یا بھاپ ہیں اور یہی تینوں یعنی رمدیت اور طوبیت اور بخاریت چیزوں کی تین حالتوں کو کہتے ہیں"

بلوم ہارٹ کے مطابق یہ کسی انگریزی طبی مقالے کا ترجمہ ہے جو کسی انگریز مترجم نے کیا ہے ——

پلیفیر

پلیفیر میڈیکل کالج آگرے کے پرنسپل تھے انھوں نے "پراکٹیکل فارمیسی" پر ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ایک تصنیف کی تھی جس کا مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہے۔ نہایت صاف اور رواں زبان میں ادویات سازی کی کل ترکیبیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ ۱۸۳۴ء کا مکتوبہ ہے ——

چارلس فنک

چارلس فنک نے بھی سائنس کے مضامین پر دو کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق علم طبعیات سے ہے، اس موضوع پر "علم حکمت" کے نام سے ۳۰۱ صفحات کی کتاب ۱۸۴۳ء میں کلکتہ میں چھپی۔ علم حکمت سائنس کی ان کتابوں میں ہے جو دہلی کالج کے زیر اہتمام درنیکلر سوسائٹی کے لیے لکھی گئیں۔ دوسری تصنیف کا تعلق نفسیات سے ہے اس کا نام "تعلیم النفس" ہے، چارلس فنک نے یہ کتاب ہنری کارٹر کی تحریک پر منشی چرنجی لال کے تعاون سے انگریزی سے ترجمہ کر کے ۱۸۵۹ء میں شایع کی تھی ——

چارلس فنک کی مساعی میں اخبار "صدر الاخبار" کا اجرا بھی ہے یہ آگرہ کالج کے زیر اہتمام شایع ہوتا تھا اس کے اجرا کی تحریک فنک نے کی تھی اور سرمایے کی فراہمی کے لیے ۵، ۵ سو کے دو حصص فروخت کیے تھے۔ اس اخبار کا مقصد طلبہ کے لیے عمومی اور سائنسی معلومات فراہم کرنا تھا ——

ہنری فنک

ہنری فنک نے "دولت ہند" کے نام سے فنِ زراعت پر ایک کتاب لکھی جو مطبع مصطفائی شہر کانپور میں ۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے ۱۳۵ صفحات اور ۲۰ ابواب ہیں۔ کتاب کی افادیت کے بارے میں کئی سرٹیفکیٹ بھی ہیں جن میں سے ایک فضل الرحمن قاضی صدر کلکتہ کا محررہ ۴ رمضان ۱۲۶۱ھ کا ہے جو فارسی میں ہے دوسرا امان علی خاں کا اور تیسرا احمد حسین خاں کا۔ ان کے علاوہ ایک سرٹیفکٹ ایسا بھی ہے جس پر کئی حضرات کے نام ہیں۔ کتاب کی زبان نہایت مشکل اور مسجع ہے نثر کی شان نے تصنیف کو علمی سے زیادہ ادبی بنا دیا ہے ——

ڈاکٹر ولیم میکنزی

ڈاکٹر ولیم میکنزی حیدر آباد دکن کے مشہور طبیب گزرے ہیں۔ نواب شمس الامراء بہادر نے سائنس کی کتابیں شایع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک "سنگی چھاپہ خانہ" بھی قایم کیا تھا۔ ولیم میکنزی کی دو تصانیف اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک "رسالہ خلاصۃ الادویہ" مطبوعہ ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء ہے، اور دوسری نافع الامراض مطبوعہ ۱۲۶۲ھ م ۱۸۴۵ء ہے۔ رسالہ خلاصۃ الادویہ ۲۳۴ صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے ۲۸ صفحات کی صرف فہرست مضامین ہے۔ تصنیف کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے ——

"واقفانِ علم و حکمت اور شائقانِ فن طبابت پر ظاہر ہو تاکہ یہ کتاب کان اسکپلرس کا ترجمہ، جاننے والے حقیقتوں،

www.taemeernews.com

معالم طبعی اور ہندسی کے ڈاکٹر ولیم میکنزی صاحب میڈیکل اسٹور کیپر علاقہ نظام واسطے تعلیم اور زود فہمی اور برابر سمجھ میں آنے نیٹو ڈریسر دن علاقہ فوج سرکار دولت مدار نظام اور افادہ خاص و عام کا خدا نام کے چھاونی الوال برس اٹھارہ سو پینتالیس عیسوی میں صاف اور سلیس زبان ہندی میں تصنیف کیے ــــ اور اس کتاب کا نام خلاصۃ الادویہ رکھا گیا۔ صاحبان فضل و ہنر سے امید یہ ہے کہ اگر سہو یا خطا اس میں نظر آوے تو عیب گیری نہ کریں اور قلم اصلاح کا اس پر جاری رکھیں"۔

صفحہ ۱۴ سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے اور دوائیں بنانے کی ترکیبیں بتلائی گئی ہیں۔ آخر حصہ زہر کے علاج سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر میکنزی کی دوسری تصنیف "نافع الامراض" بھی علم الادویہ سے متعلق ہے اس میں نباتات، نمک، تیزاب، دھات، مشک اور شہد وغیرہ کی خاصیتیں، تاثیر اور فائدے بیان ہوئے ہیں۔ چند صرف و نحو کی غلطیوں کے سوا زبان نہایت صاف، سادہ اور رواں ہے یہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

پارکنس

پارکنس ایک مسیحی مبلغ اور مغربی سائنس کے ماہر انگریز تھے ان کی تصنیف "بحر حکمت" بھاپ سے چلنے والی مشین کے متعلق ہے۔ ۵۸ صفحات کی یہ کتاب ۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ کے مطبع مسیحائی میں چھپی۔ آخری صفحہ کی عبارت ہے۔

" یہ کتاب مسمی بہ بحر حکمت، بیچ دریافت کرنے احوال حکمت روانگی اور ترکیب تیار کرنے دخانی کل کے جو تالیف کی ہوئی پادری پرکنس صاحب کی ہے حسب فرمایش بعض صاحبان عالی شان کے مطبع مشتہرہ مسیحائی میں بہ اہتمام اضعف العباد واحقر الافراد مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد مرحوم کے بیچ دار السلطنت کے کشمیری محلہ میں چھاپی گئی۔ عبارت صاف اور آسان ہے۔ انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے مثلاً اسٹیم = دخانی، تھرمامیٹر = تاپ درجہ نما۔

- فریزنگ پوائنٹ = نقطہ انجماد آب، مرکیوری = پارہ بوائیلنگ پوائنٹ = نقطہ جوش آب ـــ

متعدد انگریزی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جیسے ایرپمپ، اسکیل، ٹیلر لوائیلر پستن۔ سلنڈر، کیوبک فٹ۔

مرے

دو تراجم ایسے ملتے ہیں جن کے ترجمہ کرنے والوں کا نام مرے ہے۔ لیکن ان کے حالاتِ زندگی کا پتہ نہ چل سکنے کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں کا مترجم ایک ہی ہے یا مرے نام کے دو مختلف افراد گذرے ہیں۔ ان میں سے ایک ترجمہ "رسالہ چیچک" ۱۸۳۶ء میں حیدرآباد دکن سے شایع ہوا۔ جو ڈاکٹر میکمان کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

دوسری کتاب "رسالہ تطعیم" یعنی ٹیکا لگانے کی کتاب ہے جو عربی زبان کی کتاب مصنفہ احمد حسن رشیدی کا ترجمہ ہے اور ۱۸۵۳ء میں آگرے کا مطبوعہ ہے مترجم اول الذکر کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے وہ وہاں مدرسہ طبابت میں مترجم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی انگریزی دانی اور اردو دانی تو معلوم حقیقتیں ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ عربی بھی جانتے تھے یا نہیں؟ ــــــ

بہرحال مدرسہ طبابت کے مترجم مرے نے "رسالہ چیچک" کا ترجمہ شمس الامرا کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ میں کیا تھا جو ان کے سنگی چھاپے خانے میں چھپا تھا۔ زبان کافی مشکل ہے۔ نمونہ عبارت:

www.taemeernews.com

"امراض موتسیر کا قانون عام یہ ہے کہ ہر شخص کو سالم عمر میں صرف ایک مرتبہ وارد ہوتے ۔ بخار سے ابتدا ہو کر ایک اوقات معین پر چھوٹے جلن دار بثور نمودار ہوتے اکثر بو لوز پوست پر پھیلے ہوئے ۔ ان بثور کی نہایت عجیب و غریب خاصیت ہے اور چیچک و گوبری میں با یک دیگر کم و بیش قربت رہتی ہے" اس کتاب کے ۵۰ صفحات ہیں ۔

دوسرا ترجمہ "رسالہ تطعیم" یعنی ٹیکا لگانے کی کتاب ہے ۔ اس میں بھی مرض چیچک، اس کی علامتوں، چیچک کا ٹیکہ تیار کرنے کے طریقے اور ٹیکہ لگانے کے اصول درج ہیں ۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل مصر دو صدی قبل مسیح بھی فن تطعیم سے واقف تھے ۔

ڈاکٹر جیمس ہنری بٹلر

ڈاکٹر بٹلر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے اور اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر فائز تھے ۔ انھوں نے کوپر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "رسالہ اعمال جراحی" کے نام سے کیا جو ۱۸۴۳ء میں مطبع دارالعلوم دہلی میں چھپی سرورق پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں رسالہ مصنف اور مترجم کے نام درج ہیں ۔

"رسالہ بیچ بیان اعمال جراحی کے"

"یہ اعمال فن جراحی کے سیموئیل کوپر صاحب کی کتاب سے ڈاکٹر جیمس ہنری بٹلر صاحب نے زبان اردو میں ترجمہ کیے ہیں ۔ یہ اس فن پر قدیم ترین اردو کتب میں سے ایک ہے ۔ ابتدا میں ان قاعدوں کا ذکر ہے جو آپریشن سے پہلے ضروری ہوتے ہیں اس کے بعد آلات جراحی کی تفصیل ہے پھر جسم کے مختلف حصوں پر جراحی کرنے کے اصول بیان کیے گئے ہیں ۔ کتاب ۱۱۹ صفحات پر مشتمل ہے ۔

ولیم میکفرسن اور ایکوٹ

ان دونوں انگریزوں نے باہمی اشتراک سے سول عدالتوں کے طریق کار کے بارے میں "دستور العمل عدالت دیوانی" اردو میں لکھے اور ۱۲۶۸ھ م ۱۸۵۱ء کلکتہ سے شایع کیا ۔

ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور

ڈاکٹر بالفور گورنر کے باڈی گارڈ کے اسسٹنٹ سرجن تھے انھوں نے "اصول فن قبالت" کے نام سے ڈاکٹر کنکوئیسٹ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے ۱۸۵۱ء میں شایع کیا سرورق پر مترجم کا نام "عیڈورڈ بالفور" لکھا ہے ۔ کتاب کے ایک صفحہ پر انگریزی اور اس کے مقابل صفحہ پر اردو ترجمہ ہے ۔ یہ کتاب ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے گویا ۷۰ صفحات انگریزی کے اور ۷۰ صفحات اردو کے ہیں ۔ اس میں زچگی سے متعلق امور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں ۔ عورت کے ان تمام اعضا کا ذکر بھی ہے جو حمل اور وضع حمل سے متعلق ہیں ۔ اس دوران کی جانے والی احتیاطوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ لیڈی ڈاکٹر، دائی اور گھریلو عورتوں کے نقطۂ نظر سے نہایت کارآمد کتاب ہے ۔

ولیم لاکر

ولیم لاکر نے اسپرنگر کی فرمایش پر "تحریر اقلیدس" کے نام سے ایک کتاب ۱۸۵۲ء میں کلکتہ سے شایع کی ۔

www.taemeernews.com

جان پارکس لیڈلی

لیڈلی نے انگریزی سے معاشیات کی ایک کتاب کا ترجمہ "رسالہ علم المعیشت" کے نام سے کیا جو ۱۲۶۹ھ م ۱۸۵۳ء میں آگرے سے شایع ہوا۔

لیڈلی آگرے میں سرکاری مترجم تھے اور انھوں نے آگرے میں ایک مطبع بھی قایم کیا تھا۔

بلیو۔ سنڈیمن

سنڈیمن عہد واجد علی شاہ میں لکھنؤ کے جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے "رسالہ چیچک کا علاج" تصنیف کیا جو ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۳ء میں الہ آباد مشن پریس میں چھپا۔ یہ دس صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے جس کی ابتدا اس جملہ سے ہوتی ہے: "سب زمینداروں اور دوسرے لوگوں کو جن کے پاس یہ رسالہ پہنچے صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر کا سلام۔"

جان ولیم پیل

پیل آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور جدید سائنس پڑھایا کرتے۔ فزکس (طبیعات) اور کیمسٹری میں ماہر تھے۔ ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

بجلی کی ڈاک	مطبوعہ آگرہ	۱۸۵۴ء
طبیعات	مطبوعہ آگرہ	۱۸۵۴ء
رسالہ آلات طبعی	مطبوعہ آگرہ	۱۸۵۴ء

آخرالذکر کتاب مولوی کریم الدین مدرس اول کی مدد سے تیار کی گئی تھی جو علم طبیعات کے آلات کے نقشوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تکمیل ۱۸۵۰ء م ۱۲۶۵ھ میں ہوچکی تھی لیکن اشاعت چار سال بعد ہوئی۔ دیباچہ میں تحریر ہے کہ

"یہ کتاب واسطے مدد ان طلبہ کے جو علم طبعی کے لیکچروں یعنے درسوں میں حاضر ہوا کرتے ہیں بموجب حکم جناب معلی القاب جیمس طامسن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربیہ کے تیار کی گئی تھی۔"

آرتھر رابرٹس (۱۸۱۸ء — ۱۸۶۸ء)

آرتھر رابرٹس برطانوی ہند میں سول سروس سے متعلق تھے۔ بسلسلہ ملازمت طویل عرصہ یہاں گذارا۔ شاہجہاں آباد کے کلکٹر اور مجسٹریٹ بھی رہے علم وادب اور آثار قدیمہ سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ آرکیالوجیکل سوسائٹی آف دہلی کے جنرل میں "کھڑکی کی جامع مسجد" پر ایک مضمون شایع کیا تھا جس میں سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" سے بڑی حد تک استفادہ کیا گیا تھا۔ آرتھر رابرٹس کی اردو زبان کی خدمت کے سلسلہ میں یہ اہمیت ہے کہ انھیں کی وجہ سے سرسید نے "سلسلۃ الملوک" تالیف کی تھی۔ رابرٹس نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی (برطانیہ) کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے رکن کرنل سیکس کے ایما پر آثار الصنادید کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا تھا۔ اس کے لیے سرسید سے تعاون کی درخواست کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ اصل تصنیف کی کوئی غلطی ترجمہ میں باقی نہ رہے چنانچہ غلطیوں کے ازالہ کے لیے سرسید نے سلسلۃ الملوک مرتب کی جس میں دہلی کے ان راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست ہے جنھوں نے ۵ ہزار سال کے دوران دہلی پر حکومت کی۔ غرض کہ رابرٹس کی ضرورت نے سرسید سے اس قدر اہم تالیف مکمل کروائی۔ رابرٹس نے آثار الصنادید کا ترجمہ شروع تو کر دیا تھا۔ لیکن مکمل نہ

www.taemeernews.com

یا نہیں، اس کا حال کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہوتا۔

شیرنگ میتھوا ایٹمور

ایٹمور نے مرزا پور کی تاریخی عمارتوں کا حال "عمارات المعروف" کے نام سے لکھا ۱۰۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں عمارات کی فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے خصوصیات اور ان کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں مرزا پور سے شایع ہوئی۔

جوزف جیکب

جیکب عیسائی مبلغ تھے جنھوں نے انجیل میں مذکور مقامات کے جغرافیائی حالات پر مشتمل ایک کتاب "جغرافیہ پاک کتاب" تصنیف کی اگرچہ یہ مذہبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی لیکن موضوع کے اعتبار سے علمی کتاب ہے جو ۱۸۶۷ء میں آگرے سے شایع ہوئی۔

انڈیا کے لشکری آئین

برطانوی حکومت، ہند میں جو قوانین نافذ کرتی ان کی اردو میں تشہیر ضروری سمجھتی کیونکہ یہی عامۃ الناس کی زبان ہی ہے اس سے انتظامی مسائل کے حل میں آسانی ہوتی۔ لیکن دوسرا فائدہ یہ بھی تھا کہ ہر شعبہ کے بارے میں اظہار کے طریقے متعین ہونے لگے۔ آئین و قوانین کی زبان عام علمی اور ادبی زبان سے مختلف ہوتی ہے اس لیے ہم اسے بھی زبان کی خدمت سمجھتے ہیں کہ حکومتِ وقت نے اردو میں لشکری آئین مرتب کرکے اس شعبہ کے اسلوب کے تعین میں مدد کی۔

"انڈیا کے لشکری آئین" کے نام سے جو کتاب ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئی اس میں اسی سال نافذ شدہ پانچواں آئین ہے اس کے بارے میں ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ

"انڈیا کے گورنر جنرل صاحب بہادر مع کونسل کے آئین جو نیچے مرقوم ہوتی ہے ۱۸۶۹ء کے فروری کی چھبیسویں تاریخ کو جناب گورنر جنرل صاحب بہادر کے پسند ہوئی اور خاص و عام کی اطلاع کے لیے اشتہار دی گئی"۔

مطبوعہ "مطبع مخزن الاخبار" مدراس۔ صفحات ۲۱۹۔

ایڈانفس۔ ایس۔ جے

ایڈانفس نے حیدرآباد دکن میں سکونت اختیار کرلی تھی اور اردو میں تحریر و تقریر کی استطاعت رکھتے تھے۔ "رسالہ جہاں بیں" کے نام سے جغرافیہ کے موضوع پر ۱۸۷۰ء میں ایک کتاب مطبع محبوب شاہی حیدرآباد میں چھپوا کر شایع کی۔

ٹی۔ ڈبلیو تالبورٹ

ہندوستان کی نسلیں مصنفہ جارج کیمبل کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مطبوعہ ۱۸۷۰ء

ڈاکٹر جانسٹن

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ایک مخطوطہ "رسالہ جراحی" کے نام سے ہے جس پر بصراحت مصنف یا مترجم کا نام درج نہیں۔ لیکن اختتامیہ میں تحریر ہے۔

www.taemeernews.com

"تمت تمام شد بالخیر بروز پنجشنبہ بتاریخ بست وپنجم ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ بر وقت یک ونصف کتاب سرجری تالیف اوستاد ڈاکٹر جانسٹن صاحب بہادر باتمام رسید"۔

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ جانسٹن کی اپنی تصنیف ہے۔ اس میں بکثرت انگریزی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً "باب اول جراحی کے امراض۔ مقامی ہیرپمبال کا بیان۔ ہیرپمبال کو کنجیشن بھی کہتے ہیں۔ کنجیشن سے مراد یہ ہے کہ کسی جائے میں خون رکنے کا بہ سبب کثرت خون جمع ہو"۔

اس مخطوطہ کے ۱۵۱ اوراق ہیں۔

گرین فیلڈ

گرین فیلڈ نے "علم ہئیت" کے نام سے ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ لیتھو میں چھپوا کر گورکھپور سے شایع کیا تھا۔

فرگوسن اور بروسٹر

سورج گہن اور چاند گہن کے بارے میں فرگوسن اور بروسٹر نے "اعجاز الہیئت" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو لدھیانے میں لیتھو میں ۱۸۶۶ء میں چھپی۔

رینکنگ۔ جی۔ این

رینکنگ کا ذکر سطور ماقبل میں ہو چکا ہے انھوں نے اردو سکھانے کے سلسلے میں چند کتب تصنیف کی تھیں ان کے علاوہ ان کی دو تصانیف علمی نوعیت کی بھی ہیں۔

- مدایتہ الحکمۃ: یہ کتاب ہندوستانی میڈیکل افسروں کو ہدایت دینے کے سلسلے میں لکھی گئی جو بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ میں ۱۸۷۰ء میں چھپی۔ ناشر: تھاکر اینڈ اسپنک کمپنی۔
- منتخب تاریخ ہندوستان: یہ تاریخ مدارس کے لیے مرتب کی گئی تھی جو ۱۸۹۷ء میں سنٹرل پرنٹنگ پریس کلکتہ میں چھپی۔

جے۔ بی۔ فلر

جے۔ بی فلر کی تصنیف "فن زراعت" ہے جو مطبع افغانی امرتسر میں ۱۸۹۱ء میں چھپی۔ مندرجات کے لیے ۱۰ اسباق کے عنوانات قایم کیے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں تعلیمی ضروریات تھیں۔ اس کتاب میں تصاویر اور نقشوں کی مدد سے فن زراعت کی جزئیات سمجھائی گئی ہیں۔ آخری حصے میں ۳ صفحات پر مشتمل ایک فرہنگ بھی ہے۔ زبان اور طرز بیان نہایت آسان ہے۔ صفحات (۸۰)

راکویل

راکویل کی مترجمہ کتاب "فرنیالوجی یعنی علم کاسۂ سر" نہ صرف اس موضوع پر اولین کوشش ہے بلکہ ہماری دانست میں اردو میں اس کے علاوہ کوئی کتاب نہیں، یہ کومپ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں سر کی حالت اور شکل سے شخصیت شناسی کے علم سے بحث کی گئی ہے مترجم کے بیان کے مطابق اس علم کے موجد ڈاکٹر گال (۱۷۵۷ء ۔۔۔ ۱۸۲۸ء) تھے جو

www.taemeernews.com

دہلی میں طبابت کیا کرتے تھے۔ اس میں سر کی شکلوں اور تصویروں کے ذریعہ آدمی کی صفات کو پہچاننے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

کالن۔ ایس۔ ویلنٹائن

کالن۔ ایس۔ ویلنٹائن "بحر ہوا" کے مصنف ہیں۔ ویلنٹائن جے پور کے مہاراجہ کے خاص معالج اور فیلو آف دی رائل کالج آف سرجنس تھے۔ کرۂ ہوا کے بارے میں نہایت معلومات افزا باتیں بیان کی ہیں۔ ۷۷ صفحات کی یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں سکندرہ کے یتیموں کے چھاپے میں چھپی اور آگرہ سے شایع ہوئی۔

یہ انگریز مستشرقین کی اردو خدمات کا ایک اجمالی خاکہ ہے اس کے علاوہ بھی ان کے شاندار کارنامے صرف ونحو اور فرہنگ کی تالیفات کے سلسلہ میں ملتے ہیں جن سے زیادہ تر لوگ واقف ہیں۔ اردو ادبیات کے تراجم کا کام بھی وسیع پیمانے پر انھوں نے سرانجام دیا ہے۔ باغ و بہار (کے ڈاسمتھ، ایسٹ وِک، بیری، فاربس، کوائین) توتا کہانی (ا سمال) بیتال پچیسی (پلاٹس، ہولنگس، برٹن) آرائش محفل (کورٹ) توبۃ النصوح (ایم۔ کیمپسن) قصہ گل بکاولی یا مذہب عشق (اینڈرسن، امینول) کے تراجم بھی انیسویں صدی کے دوران ہوئے ہیں جب کہ جیکسن نے "قصہ شیخ چلی (۱۸۴۳ء)" کارکرن نے "اخلاق ہندی" (۱۸۴۵ء) اور کیمپسن نے "قصہ جمیلہ خاتون (۱۸۶۴ء)" تصنیف کیے۔

ان کارناموں کی تفصیل متقاضی ہے کہ اس شعبے میں تحقیقی کام کیا جائے۔

(زیر ترتیب کتاب "تذکرۂ مستشرقین" کا ایک باب)

●●

شفیع عقیل کی کتابیں

- پنجابی لوک کہانیاں
- پنجابی لوک داستانیں
- پنجاب رنگ (پنجابی شاعری کے منظوم اردو تراجم)
- پنجابی کے پانچ قدیم شاعر (تنقید، تحقیق، ترجمہ)
- میاں محمد بخش اور سیف الملوک (تحقیق، تنقید، ترجمہ)
- زہر پیالہ (پنجابی نظمیں اردو ترجمے کے ساتھ)
- سوچاں دی زنجیر (پنجابی نظمیں اردو ترجمے کے ساتھ)
- چینی لوک کہانیاں
- جاپانی لوک کہانیاں
- سیر و سفر

www.taemeernews.com

مُحمد علی صدیقی

اینگلو انڈین ادب کا فکری پس منظر

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان ۔خصوصیت کے ساتھ اردو نثر کی ترقی وتدریج ۔انگریزی دورِ اقتدار میں بڑھ چڑھ کر ہوئی۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ ایک اور کلمۂ حق بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ اردو زبان کی ترقی محض انگریز لغت نویسوں، سرپرستوں اور عمّال ہی کی مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ خود اس زبان کی خلقی صلاحیت کا بھی منہ بولتا ثبوت ہے ۔جب انگریز حکمرانوں نے ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ انگریزی زبان کو عدالتی زبان قرار دیا تو اس فیصلے کا مقصد غالباً یہی تھا کہ وہ اپنے کچھ عرصہ پہلے تک کے مقتدر حریف رؤ لیکن اُس وقت کے کمزور حریفوں کی ثقافتی برتری، ایک جھٹکے کے ساتھ ختم کردینا چاہتے تھے ۔یہ فیصلہ ہر لحاظ سے، فارسی زبان میں دست گاہ رکھنے والی اشرافیہ پر ضربِ کاری کا حکم رکھتا تھا اور بے پناہ تشویش کا باعث بنا۔

انگریزوں نے فارسی کی جگہ انگریزی زبان کے تفوق کے لیے ۱۷۸۱ء سے ۱۷۹۱ء تک کلکتہ اور بنارس میں السنۂ شرقیہ کے کالجوں کی داغ بیل ڈالنی شروع کردی تھی اور ۱۸۰۰ء میں مارکوئس ولیزلی کے زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس مہم کو مزید تیز تر کردیا تھا ۔برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی "متوازن حکمتِ عملی" (Ring-Fence Policy) کا دور ۱۸۱۳ء پر ختم ہوتا ہے ۔اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کی دیگر طاقتوں کے ساتھ "توازن" قایم کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی ۔۱۷۵۷ء سے ۱۸۱۳ء تک کے عرصے میں انگریز خود کو مقتدرِ اعلیٰ قوت Paramount Power کا درجہ دینے میں مصروف تھے ۔لیکن اُنھوں نے اس وقت تک اپنی "بالادست حیثیت" کا اعلان نہیں کیا تھا اور شاید اسی لیے ہم اس زمانے کے انگریز عمّال کے طرزِ رہائش اور اندازِ فکر سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اس زمانے میں دیوانی معاملات کی ٹھیکے داری کے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مشرقی زبانیں اور مشرقی علوم کی تحصیل میں مصروف نظر آتے ہیں ۔لیکن اُن کی مصلحت شعاری کا یہ عالم ہے کہ ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے خاتمے پر میجر منرو اودھ پر قبضے کا اعلان کرسکتا تھا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا ۔روہیلہ علاقہ انگریزی امداد سے فتح ہوتا ہے ۔لیکن سلطنتِ اودھ کے حوالے کردیا جاتا ہے، مرہٹوں کا استیصال ۱۷۸۲ء میں معاہدہ سالبائی کے وقت ممکن تھا ۔لیکن حیرت انگیز طور پر توسیع پسندانہ پیش قدمی سے احتراز برتا جاتا ہے اور بعد میں میسور کی جنگوں کے ثمرات بھی انگریزوں کی بجائے اتحادیوں کے حصے میں آئے ۔لیکن ۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۸ء تک کا دور جسے "زیرنگیں علٰحدگی" Subordinate Isolation کا نام دیا گیا تھا ۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی جارحانہ روش کا دور ہے ۔۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی

www.taemeernews.com

تجارتی سرگرمیاں ختم کردی گئی تھیں اور کمپنی کے علاقۂ محروسہ کا انتظام تاجِ برطانیہ کا تفویض کر دیا گیا (Trust) علاقہ قرار دیا گیا تھا اور ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کے مشہور زمانہ 'فرمان' کے اجرا کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۸ء تک تبدیل شدہ برطانوی حکمتِ عملی کی وجہ سے وسطی ہندوستان کی ۱۴۵، کاٹھیاواڑ کی ۱۴۵ اور راجپوتانہ کی ۲۰ ریاستوں پر برطانوی عمل درآمد کا آغاز ہوا اور پھر ڈلہوزی نے نظریۂ الحاق Doctrine of Lapse کے ذریعے ستارا، ناگپور، تنجور، جے پور اور جھانسی کی ریاستوں کو ہڑپ کیا اور بدانتظامی کا الزام عاید کرنے کے بعد "انتزاعِ اودھ" کا اعلان کیا۔

میں نے مندرجہ بالا پس منظر صرف اس وجہ سے بیان کیا ہے کہ مضمون کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔ اگر برصغیر میں انگریزی عمل داری کا جائزہ "فکشن" نگاروں کی تحریروں کی بین السطوری فکر کے ذریعے لیا جانا مقصود ہو تو اُس دور کے سیاسی حالات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا ہوں یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہ کام بہت وسیع اور بسیط ہے۔ لیکن برصغیر کے سماجی مطالعے کے لیے از بس ضروری بھی ___

آئیے اس مطالعے کی ابتدا اس پس منظر سے کریں کہ بارھویں و تیرھویں صدی ہی میں اردو بہر حال عوامی بولی کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اُس زمانے میں اُردو کی کیا شکل تھی۔ وہ "اُردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" مولفہ مولوی عبدالحق کے مطالعے سے عیاں ہو جاتی ہے۔

مثلاً بابا فرید گنج شکرؒ (متوفی ۶۶۴ھ) کے مندرجہ ذیل اشعار ؎

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک　　پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
خاک لانے سے گر خدا پائیں　　گائے بیلاں کبھی واصلاں ہو جائیں

یا پھر شاہ بو علی قلندرؒ کا یہ مشہور دوہا ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

اور اس کے بعد شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) کے نمونۂ کلام کی جانب نظر دوڑائیں تو زبان کی مندرجہ ذیل شکل ہے ؎

دھن کارن آپے آپ سنوارا
بن دھن سکھی کنت کنہارا
جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں اور نہ کوئی
دیکھا بوجھا بچار منہہ سبھی آپیں سوئی

تو اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں رہتا کہ یہ زبان رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ عجائب" کی معرب اور مفرس اردو نہیں ہے اور نہ ہی فورٹ ولیم کالج کی زیرِ ہدایت 'ہندی' کتابوں کی سنسکرت زدہ ہندی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ میرامن کی زبان میں زیادہ صفائی اور روانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "کربل کتھا" کی زبان کی منجھائی ہوتے ہوئے "ہندی" اور "ریختہ" میر اور میر حسن کی سہلِ ممتنع شاعری اور میرامن کی زبان میں تبدیل ہوگئی۔ اردو زبان کے لیے انگریز عمل داروں کی کاوشیں چور دروازہ سے حاصل کردہ اقتدار پر مضبوط تر گرفت حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام سنسکرت یا فارسی کی ترقی اور ترویج سے کیوں کر حاصل ہو سکتا تھا۔

www.taemeernews.com

زندہ زبان حکمرانوں اور محکوموں کے لیے یکساں طور پر مفید ہوتی ہے۔ اگر حکمران زندہ زبان کے ترکش سے دجل و فریب کے تیر چلاتے ہیں تو محکوم اپنی جنگِ مدافعت میں اُسی زبان کے الفاظ کو تیر و تفنگ بنا کر اپنی جدوجہد آزادی کے رجز گاتے ہیں۔ اردو نے دیگر علاقائی زبانوں کی طرح، حکمرانوں اور محکوموں کی یکساں خدمت کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی' اپنے جوہر میں' اضافی اصطلاح ہے۔ کس سے آزادی' کس کے لیے آزادی اور کیسی آزادی کے سوالات بہر طور تصفیہ طلب رہتے ہیں۔ کاش کہ ہم جدوجہد آزادی کے دوران آزادی کے مجرد تصور کی بجائے اُس کے حقیقی خدوخال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ شعوری انداز نظر اختیار کر سکتے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ایک قیادت کے بعد دوسری اور پھر تیسری قیادت سے دل برداشتہ ہوتے رہنے کے طویل سلسلے کی زحمت سے بچے رہتے اور یہ جان سکتے کہ ہر قیادتیں زبان، علاقہ اور نسل کی بنیاد پر انتشار اور خلفشار کا ڈرامہ رچاتی رہتی ہیں۔

انگریزوں نے بھی اُردو اور دوسری زبانوں کے لیے یہی سب کچھ کیا۔ اُن کی سیاست "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی سیاست تھی اور اسی لیے سنسکرت زدہ اُردو کو ہندی کا نام دے کر اور اس طرح اسے خالصتاً ہندوؤں کی زبان بنا کر ۱۸۶۷ء میں بنارس کے شہر میں پہلے لسانی فسادات کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جب ہم اپنی آزادی کے "موہوم" اور "حقیقی" رُخ پر بحث کرنے کا یارا رکھتے ہیں تو پھر ہم اپنے مضمون کے موجودہ حصے میں اُردو کے محسنوں اور قاتلوں کے نام گنوانے کی بجائے اس اعتراف سے کیوں نہ کریں کہ ہندوستان کے کثیر اللسانی انبوہِ عظیم پر حکومت کرنے کے لیے انگریزوں نے علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ایک 'مقبول' زبان کا انتخاب کیا تھا۔ موخر الذکر زبان' بہر طور اردو قرار پائی۔ آپ خواہ سندھی، پنجابی، پشتو، براہوی، کشمیری، آسامی، بنگالی، تامل، تلگو، گجراتی، اور مرہٹی وغیرہ میں سے کسی بھی زبان کی تاریخ کا مطالعہ کریں آپ پر۔ کسی قسم کا تعصب درمیان لائے بغیر۔ ایک حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس زبان کی پہلی باقاعدہ (مغربی معنوں میں) لغت، ہموار نثر، سلیس نظم، قصہ کہانیوں اور رسومات کی تصنیفات کا سہرا انگریز اور یوروپی پادریوں یا عمّال کے سر بندھا دکھائی دیتا ہے۔ یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کہ استعماری پروگرام کے مطابق انگریز حکمرانوں کے لیے برصغیر ہند و پاک براعظم افریقہ کی طرح "سفید انسان کے بوجھ" سے زیادہ نہ تھا اور اس لیے اس علاقے کی تہذیبی اور علمی ترقی "انگریزی راج کی اخلاقی ذمہ داری" قرار پائی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے بعض جرمن اور انگریز دانشوروں نے قدیم ہندوستان کی تہذیب اور اُس کے فلسفے کے بارے میں بہت سرپرستانہ۔ یا پھر تعجب انگیز حد تک اعلیٰ اور ارفع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن جب بات ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے ہندوستانیوں تک آ پہنچتی ہے اور ہم انگریز حکمرانوں میں مقبول "اینگلو انڈین فکشن" کے مطالعے کی جانب قدم بڑھاتے ہیں تو یہ امر روشن حقیقت کی مانند عیاں ہونے لگتا ہے کہ انگریز مصنفین نے ہندوستانیوں کی تذلیل اور تحقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب برصغیر میں مغربی تعلیم کا فروغ ہوا تو ذہناً انگریز اور بظاہر ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کے ایک بڑے حلقے میں انگریز سامراج کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے اور آزادی کی "آئینی جدوجہد" میں اینگلو انڈین فکشن ہی نے مہمیز کا کام کیا۔

اگر اس کام سے پیشتر ہندوستانیوں کے بارے میں برطانوی حکمرانوں کے مربیانہ (جسے اشتعال انگیز بھی کہا جا سکتا ہے) خیالات پر نظر دوڑائی جائے تو اینگلو انڈین فکشن میں ہندوستانی باشندوں کے بارے میں تحقیر اور تذلیل آمیز رویئے کی اساس فراہم ہونے لگتی ہے اور اس طرح ہم اس نوع کے ادب اور حکمرانوں کی یکساں ذہنیت پر ماتم کر سکتے ہیں۔

www.taemeernews.com

یہ طے شدہ امر ہے کہ انگریز ۱۸۸۸ء تک بطور خاص مسلمانوں سے الرجک تھے۔ ڈبلو ڈبلو ہنٹر اپنی مشہور کتاب "ادر انڈین مسلمانز" (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں رقم طراز ہے:-

"مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اگرچہ اس کے جواز ہیں، بہت سے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم نے مسلمان اُمرا کو فوج میں داخل نہیں کیا۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت اُن کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے انھیں دیوانی کے منفعت بخش محکمے سے اس لیے خارج کر دیا کیونکہ "ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لیے ازحد ضروری تھا"۔ مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں، اُن پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی بے انصافی ہے اور اُن کے پرانے نظام مالیات سے ہمارا انحراف صریحًا وعدہ خلافی ہے۔

اُن کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات و واقعات پر زور دینا ناواجب ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوچنا چاہیے کہ جتنے مسلمان سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں سے ایک بھی مسلمان نہیں، حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو اُس سے کچھ عرصے بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے ..... لیکن اب کلکٹر کے سرکاری دفتر میں مسلمان قلی، چپراسی یا دفتری یا قلم بنانے والے کی آسامی سے اوپر کسی آسامی کا متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ اس کے افراد نہ صرف جرأت اور قوتِ بازو رکھتے تھے، بلکہ سیاست میں بھی سب سے ارفع و اعلیٰ تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع میں بھی انھیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباس کا سوائے اس کے کوئی اور مقصد نہیں کہ اینگلو انڈین فکشن کے سب سے پہلے دور میں۔ جسے "کوئی ہے" "Kui hai" دور کہا جاتا ہے کم از کم برصغیر کی سماجی اُتھل پتھل کا ایک رُخ زیادہ روشن کیا جا سکے۔ ہنٹر کی تصنیف ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے۔ لیکن اس میں دکھایا گیا ہے کہ برطانوی عمل داری میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشت اور جنگ و جدل کی فضا کی تیاری کیونکر ممکن ہوئی۔ ایک طرف مسلمانوں میں احساسِ محرومی اور دوسری طرف ہندوؤں میں احساسِ برتری اُجاگر کیا گیا جب کہ اس فتنہ پردازی کا بنیادی محرک "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا مذموم اصول تھا۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلم اتحاد کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آئیں کانپور کے مرہٹہ سردار رانا صاحب کے لیے مولوی عظیم اللہ خاں کی خدمات سے کون واقف نہیں۔ مولوی احمد اللہ کی قیادت میں حضرت محل کی افواج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی انگریزوں کے خلاف شانہ بشانہ جنگ ہم سب پر روشن ہے۔ ہنری ہیرنگٹن طامس کی کتاب "بغاوتِ ہند اور ہماری آیندہ پالیسی" کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی عملی تصویر کیا ہو سکتی ہے؟ ایک طرف ۱۷۹۳ء میں سیرام پور میں ولیم کیرے اور اُس کے رفقا کی نگرانی میں قائم ہونے والے مشن اسکول کے بارے میں "الفنسٹن اور ایف وارڈ یادداشت" کے ایک

www.taemeernews.com

دلچسپ اقتباس میں یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ

"۔۔۔ میں اعلانیہ تو نہیں مگر در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں۔ تب تک اُن کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں خواہ تعلیم سے اُن کی آرا میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں۔ تاہم اس سے وہ زیادہ ایمان دار اور محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔۔۔"

چارلس گرانٹ "اشاعت تعلیم" کے موضوع پر اپنی کتاب میں ہندو اور مسلمانوں، دونوں پر یکساں انداز میں برستے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو اینگلو انڈین فکشن، ہندوستان چارلس گرانٹ کے تعصبات کا آئینہ دار ہے۔

"۔۔۔ ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اسی لیے اُن کی سوسائٹی نہایت ذلیل و خوار ہے۔ ان خرابیوں کی اصلاح قانون کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں۔ دراصل تمام خرابیوں کی جڑ اُن کی مذہبی رسومات ہیں جن کی روح اُن کے قوانین میں موجود ہے اور اُن کے جھوٹے، ناپاک اور مضحکہ خیز مذہبی اصولوں میں مضمر ہے۔ ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہنچائی جائے جو تاریکی میں ہیں۔۔۔" (بحوالہ تاریخ التعلیم مصنفہ جسٹس سید محمود)

اور اس کا ثبوت ۱۸۵۷ء کے آغاز میں دار العوام میں اُس وقت سرکاری پارٹی کے قائد منگلس کی وہ تقریر ہے جس میں وضاحت کے ساتھ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندو مت اور اسلام پر حکمران قوم کے مذہب کو برتری حاصل ہے۔۔۔

یہ عجیب امر ہے کہ ایک طرف مستشرقین ہندوستان کی قدیم تہذیب، فلسفہ اور ادب کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے کرتے تھکے جا رہے تھے اور دوسری طرف میکالے اپنی مشہور زمانہ رپورٹ "نظریۂ تعلیم" (۱۸۳۵ء) میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہے۔۔۔

"۔۔۔ ہمیں پارلیمنٹ نے حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے لیے قوانین مرتب کریں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لاکمیشن کی امداد بھی بہم پہنچائی گئی ہے، جس وقت نیا ضابطۂ قانون نافذ ہوگا اس وقت منصفوں اور صدر امینوں کے لیے "شاستر" اور "ہدایہ" بالکل بے کار ہو جائیں گے۔۔۔۔ ہمارا یہ فعل بدیہی طور پر احمقانہ ہوگا کہ ہم نئی نسل کو اُن حالات کے پیش نظر تعلیم دیں جنھیں ہم اُن کے جوان ہونے سے پہلے بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عربی اور سنسکرت کے حق میں ایک اور دلیل جو اس سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور لغو ہے، یہ دی جاتی ہے کہ ان زبانوں میں چونکہ کروڑوں انسانوں کی مقدس کتابیں موجود ہیں اس بنا پر خصوصی امداد کی مستحق ہیں۔ سرکار انگریزی کا بلا شک و شبہ یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے مذہبی معاملات میں صرف روادار ہو بلکہ غیر جانب دار بھی ہو۔ مگر ایک ایسے ادب کی (جو مسلمہ طور پر بہت کم قدر و قیمت کا حامل ہے) محض اس وجہ سے حوصلہ افزائی کرتے چلے جانا کہ اس میں بعض اہم موضوعات پر انتہائی غلط باتیں موجود ہیں میرے نزدیک ایک ایسی روش ہے جس کی تائید نہ تو عقل کرتی ہے، نہ اخلاق، اور وہ غیر جانب داری جس کا قایم رکھنا ہم سب کا ایک مقدس فرض ہے۔۔۔ کیا ہم جھوٹی تاریخ، غلط تاریخ ہیئت اور

www.taemeernews.com

غلط تاریخ اس لیے پڑھائیں کہ ان سے ایک باطل مذہب کی تائید ہوتی ہے ـــــــ"

مندرجہ بالا پس منظر کی مُجمل وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ اینگلو انڈین ادب کے پہلے دور کی کتابوں میں جس "ٹائپ" کے ہندوستانی کردار نظر آتے ہیں وہ حاکم قوم کے جذبۂ انا پرستی کی پرورش کا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ "اینگلو انڈین" ادب کے ننانوے فی صد شہ پارے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمّال کی نسل پرستانہ ذہنیت کا مظہر ہیں۔ یہ برّصغیر کے بارے میں اس قدر بغض اور عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جذباتی اور ذہنی طور پر صحت مند قاری ـــ خواہ وہ کسی ملک اور علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔ برّصغیر کے عام انسانوں کے بارے میں انگریز حکمرانوں کی ذہنیت کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو امریکہ کے بہت سے "ویسٹرن" ناولوں میں نظر آتی ہے اور دنیا بھر کی نوآبادیات کے بارے میں لکھے گئے لٹریچر میں نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ فینن کی تصنیف The Wretched of the Earth کا دائرہ کار برّصغیر کے نوآبادیاتی دور کا احاطہ نہیں کرتا، لیکن جن حضرات نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ برّصغیر میں انگریزی نوآبادیاتی نظام کے عمّال کی نفس پروری کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ــــ

اس وقت تک ہم اینگلو انڈین ادب کے فکری پس منظر کی انشراح کے لیے حکمران فکر کے چند نمونے پیش کر چکے ہیں۔ اس لیے یہ امر ازبس ضروری ہو جاتا ہے کہ اینگلو انڈین ادب کے "حدود اربعہ" کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کریں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر ادب بنیادی طور پر فکشن سے تعلق رکھتا ہے۔ برطانیہ اور برّصغیر کے تاریخی رشتوں کے غیر جانب دارانہ مطالعے کے لیے اس ادب کی حیثیت کلیدی ہے۔ اگر ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیشتر عمّال کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ برّصغیر کے ساتھ جذباتی یا ذہنی لگاؤ نہیں رکھتے تھے تو انشراحِ صدر کے لیے برطانوی پارلیمنٹ میں وارن ہیسٹنگز کی متعصبانہ روش کے بارے میں تقاریر کا ریکارڈ بہت سے سوالات کا بلیغ جواب ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ رجنی پام دت کی شہرۂ آفاق تصنیف "انڈیا ٹوڈے" کے اوائل ابواب ایسے درجنوں اقتباسات سے بھرے ہوئے ہیں جو برّصغیر کے بارے میں انگریزی ذہن کی تشریح کرتے ہوئے ملتے ہیں ــــ

برّصغیر کے پس منظر میں انگریزی فکشن کی ابتدا وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ہوئی تھی اور آج آزادی کے ۳۲ سال بعد بھی اینگلو انڈین فکشن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ہر چند کہ بہت کم کم۔ خصوصیت کے ساتھ برّصغیر کے پس منظر میں برطانوی مصنفین کی تخلیقات اور اس مطالعے میں ہم خود کو برطانوی مصنفین کے کام تک محدود رکھے ہوئے ہیں کہ آزادی کے بعد انگریزی زبان میں لکھنے والے ہندوستانی ادبا کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ اگر ہم "جواب آں غزل" کے طور پر اینگلو انڈین ادب کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالیں تو پھر یہ موضوع بذاتِ خود ایک علٰحدہ کتاب کا متقاضی ہوگا ــــ

جہاں تک انگریزی ادب میں ہندوستان سے متعلق ارتعاشات کا تعلق ہے اُس کے اشارے مارلو (ٹیمبرلین ۱ (ا ز)) اور شیکسپیر کے ڈراموں (ہنری ہشتم (۱۱۰۱ ز)) میں موجود ہیں۔ فُٹ Foote کا ڈراما The Nabobe غالباً پہلی ڈرامائی کوشش ہے اور The Naoble or Aslatic Plunderers پہلی انگریزی طنزیہ نظم۔ ایل۔ ایف تھامسن نے Intrigues of a Nabobe شائع کی۔ ۱۷۸۵ء میں میکنزی نے مسز منٹرم کی ذات کے حوالے سے ہندوستانی نوابوں کے بارے میں لکھا۔ (اشارہ اُن انگریزوں کی طرف ہے جو ہندوستان میں دورانِ قیام

www.taemeernews.com

کے بعد ہندوستانی نوابوں کا چربہ معلوم ہوتے تھے ۔ آر سیکورٹ نے پہلے اینگلو انڈین ناول کے طور پر The Disinterested Nabob, A Novel نام تحریر کیا ہے جس کا مصنف نامعلوم ہے ۔ اور انھیں نے پہلا سفرنامہ Hearty House کو قرار دیا ہے جو ناول ہی کی شکل میں تحریر ہوا ہے ---

ان شہ پاروں میں کیا ہے ؟ ہندوستان کے بارے میں اُس قدیم تصور کی بازگشت کہ ہندوستان " سونے کی چڑیا " ہے۔ لیکن اس ملک کے باشندے لائقِ تحقیر و تذلیل ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انگریزوں کی زبان پر ہندوستان کا نام آتے ہی منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے ۔ شاید یہ بات اس قدر غلط کبھی نہیں جس قدر جملے کی قطعیت سے ہویدا ہوئی ہے ۔ جن حضرات نے فرانسیسی سیاح برنیر Bernier اور اطالوی سیاح منوچی Manuchi کے سفرنامے اور اکبر کے دور میں برطانوی سفیر طامس رو Thomas Roe کی یادداشتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستانی میں یوروپی شہروں کے مقابلے میں زیادہ بڑے اور خوبصورت شہر تھے اور زراعت اور چھوٹی صنعتوں کے امتزاج کی وجہ سے ہندوستان کا توازنِ ادائیگی یوروپی اقوام کے مقابلے میں کئی گنا بہتر تھا ۔ لیکن اٹھارویں صدی میں برطانوی حکمرانوں کی سازشی سیاست ۔ اور خود ہندوستانی حکمرانوں کی کمزوری اور ریشہ دوانیوں اور احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد ہندوستان کی معاشی حالت اس درجہ خراب ہوتی چلی گئی کہ اینگلو انڈین ادب کا ہندوستان " لالچی ، خود غرض ، ناقابلِ اعتبار حریص ، ڈرپوک ، شاطر اور بے ایمان " کرداروں کی مضحکہ خیز تصویر کشی بن کر رہ گیا جب کہ مستشرقین اور ماہرین ہندوستانیات مندرجہ بالا رجحان کے برخلاف ہندوستانی فکر اور ثقافت کی لن ترانیوں میں مصروف نظر آتے ہیں ۔ آخر یہ کون سی تقسیم کار ہوئی کہ فرصت کے اوقات ، تفننِ طبع کے طور پر ورق گردانی کے مشغلے میں گرفتار حکمراں طبقہ اپنی " رعایا " کے بارے میں اس درجہ بدگمان ہونے پر مائل ہوئے جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کرداروں کے وطن کو باقاعدہ طور پر غریب ملک بنانے کے لیے سرتوڑ کوششیں پردۂ خفا میں رکھی گئیں ۔ یہ وہ دور تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمّال نت نئے بہانوں اور طریقوں سے ٹوٹتی بکھرتی ہندوستانی معیشت کے سیم و زر پر ہاتھ صاف کر رہے تھے ، ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی ۔ ہندوستان دونوں ہاتھوں سے لوٹا جا رہا تھا ۔ منظر کچھ اس قسم کا تھا کہ انگلستان کے کاہل خاندانوں کی اولاد عہدے اور کمیشن خرید کر ہندوستان کے " ظالم موسموں " میں " خدمت " کرنے کا ناخوش گوار فریضہ انجام دینے کے لیے کمربستہ ہو رہی تھی اور اپنی ملازمت کی پہلی میعاد پوری ہونے پر فخریہ طور پر " نواب " کہلانے کے فراق میں مبتلا تھی ۔ انگلستانی ماحول میں پالکیں ، ٹم ٹم ، اور اُن میں اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے انگرکھا پوش انگلستانی ' نواب ' اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں پر ہندوستان کی ' امارت ' کے نقوش مرتسم کرتے ہوئے ملتے ہیں ۔ رہی سہی کسر اُن ' حرم خانوں ' سے پوری ہو جایا کرتی تھی جن میں ہندوستانی دوشیزائیں انگلستان کی آب و ہوا میں ہندوستانی نخرے بگھارتی تھیں ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے انگریزی دور میں انگریز ثقافتی طور پر ہندوستانی نظر آیا کرتے تھے ۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد انھوں نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو " ہندوستانی " نظر آنے کی مجبوری ختم ہو چکی تھی اور " سول لائنز " آباد کرنے کا زمانہ شروع ہو گیا تھا ۔ گویا رعایا اور حاکم دو متوازی خطوط کی طرح ایک دوسرے سے قریب نہ ہو سکنے کے سفر پر گامزن ہو چکے تھے اور اب ہندوستانیوں کی ثقافتی بالادستی ۔ جس کے ڈنکے انگریز ' نوابوں ' کے ذریعے یوروپ بھر میں بجتے رہتے تھے ۔ ختم ہو کر رہ گئی اور " بابو انگلش " بولنے والے ہندوستانی کے دور کا آغاز ہوا ۔ اب ہندوستانیوں کی تعلیم کا ایک ایسا دور شروع ہو چلا تھا جس میں وہ بہ اعتبارِ ذہن

www.taemeernews.com

انگریز اور بہ اعتبارِ جلد ہندوستانی نظر آنے لگے تھے ـــــ

ـــــ ـــــ

ہم سمجھتے ہیں کہ اینگلو انڈین ادب کا پہلا دور ۱۷۸۰ء سے ۱۸۵۷ء تک پر محیط ہے۔ یوں تو اس زمانے میں بہت سے ناول تحریر ہوئے۔ لیکن میڈوز ٹیلر Meadows Taylor اور ڈبلو۔ ڈبلو ارنالڈ کا شمار اس زمانے کے اہم مصنفین میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈبلو۔ بی ہوکلے W.B Hockley نے بھی اس زمانے میں تین اہم ناول لکھے ـ ـ ـ ـ
Panduring Hari or Memoires of Hindoo (1826) The English in India (1828)
اور Tales of the Zenana (1827) ان ناولوں میں ہندو زندگی کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اگر دیکھا جائے تو ہوکلے کا ناول "پینڈورانگ ہری" میڈوز ٹیلر کے ناول The Confessions of a Thug. کی بنیاد بنا۔ اس کے علاوہ سر والٹر اسکاٹ نے اپنے ناول "دی سرجنتز ڈاٹر" کے لیے ہندوستانی پس منظر منتخب کیا۔ اس کے خیال میں ایک اسکاٹ باشندے کے لیے ہندوستان ہی وہ جگہ ہے جہاں وہ خوش و خرم رہ سکتا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں اس نے برصغیر کے لیے اپنی پسندیدگی کی وجوہ بیان کی ہیں۔ لیکن اسکاٹ ان لوگوں میں سے تھے جو اٹھارویں صدی میں ہندوستانی بادشاہوں اور نوابوں کے خلاف جنگ لڑنے والے برطانوی کمانڈروں کو Demi-God, سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک "ہندو صابر، راجپوت جنگجو اور مسلمان مغرور تھا"۔ تھیکرے نے بھی اپنے شہرۂ آفاق ناولوں Newcomes Pendennis اور Vanity Fair میں اینگلو انڈین کردار استعمال کیے ہیں۔ ڈکنس نے Dombey and Son Little Dorrit اور David Copperfield میں ہندوستان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ـــــ

۱۸۵۷ء تک محیط برطانوی ادب میں وہ سارے اجزا شامل ہیں جو سو سال بعد کے بدلے ہوئے حالات کے باوجود "برطانوی یادداشت" سے اس درجہ چپکے ہوئے ہیں کہ برصغیر کا ذکر چھڑتے ہی سانپ، سپیرے، جنگل، شکار، مندر، مسجد، بازار، شکار، فقیر اور سادھو اُفقِ نظر پر چھانے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی مورخ نے جدید ایڈورٹائزنگ دور سے بہت پہلے ہی اپنے ہم وطنوں سے ہندوستان کو روشناس کرانے کے لیے ہندوستان کے لوگوں کو ناقابلِ اعتبار اور اس علاقے کے رنگا رنگ موسموں، علاقوں، ثقافتوں اور زبانوں کو ایک ایسا "میوزیم" قرار دینا چاہا تھا، جو بلغمی مزاج کے انگریزوں کو مہم جوئی کی جانب مائل کر سکے۔ تھیکرے ہوں یا اسکاٹ، میڈوز ٹیلر ہوں یا ڈبلو۔ ڈبلو ارنالڈ۔ الغرض ان سب کی تصنیفات میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے انگریز کردار بہت مرفہ الحال اور کامیاب لوگ ہوتے تھے جو اپنے وطن واپسی پر اس قدر بے تکے انداز میں شاہ خرچی کرتے تھے کہ دنیا اُن کی دولت پر اظہارِ حیرت کرتی تھی ـــــ غریب اور غیر متمدن ملک کے مالدار حکمران۔ غالباً یہی وہ تضاد تھا جسے دوررس انگریز ذہن نہ سمجھ سکا اور شاید اسی لیے اُس نے ہندوؤں کے فلسفۂ مایا کی اس قدر زبردست تبلیغ کی کہ انگریزی عملداری کا غریب ہندوستان فلسفۂ مایا ہی کو ساری دولت سمجھ بیٹھا ـــــ

بہرحال ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے متعلق انگریزی فکشن کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے اہم مصنفین میں فِل رونبسن Phil Robinson پریچرڈ Prichard کننگھم Cunningham اور الیگزنڈر لارڈائس Alexandar Allardyce کے نام آتے ہیں۔ ایک ایسا مصنف بھی ہے جو دو نوں

www.taemeernews.com

ادوار پر محیط ہے اور وہ کرنل میڈوز ٹیلر ہے۔ یہ شخص فارسی، اردو اور مرہٹی کے علاوہ بہت سی ہندوستانی زبانوں میں طاق تھا۔ اُس نے اپنی سوانح Story of my Life میں لکھا ہے کہ وہ "شرفا کے محاورے میں اردو بول سکتا ہے۔" اور یہ حقیقت ہے کہ سر چارلس میٹکاف کی وساطت سے نظام حیدرآباد کی فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے بعد وہ ریاستی اشرافیہ میں شامل ہو گیا تھا۔ اُس نے 1839ء میں Confession of a Thug میں امیر علی ٹھگ کا کردار بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ امیر علی کس قدر معصومیت سے لکھتا ہے "حیف وہ صرف ۷۱۹ قتل کر سکا ہے" اور یہ کہ وہ ہزار عدد تک نہ پہنچ سکا۔ یہ میڈوز ٹیلر کی کوشش ہی کا نتیجہ تھا کہ برطانوی حکومت نے ٹھگی جیسے خونریز پیشے کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ میڈوز ٹیلر نے کرنل سلیمن کے ساتھ ۱۸۳۲ء میں اودھ کا دورہ کیا تھا۔ میڈوز ٹیلر نے ٹیپو سلطان (۱۸۴۰ء) "تارا" (۱۸۶۳ء) اور "سیتا" (۱۸۷۲ء) جیسے مشہور ناول بھی تصنیف کیے اور وہ ہندوستان سے متعلق انگریزی ادب میں یقینی طور پر ایک اہم نام ہے۔

جب ہم ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے جانے والے ادب کی جانب بڑھتے ہیں تو ہمیں یک بیک اندازہ ہونے لگتا ہے کہ یہ ادب سیاسی بالادستی حاصل ہونے کے بعد کا ادب ہے۔ اس دور کے ناولوں میں ہندوستانیوں کے عمومی کردار کے بارے میں چندان رعایت نہیں ملتی۔ اُن میں ابھی تک وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جو "غیر مہذب لوگوں" کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن قاعدے کے مطابق اپنے پناہ طاقت وحشمت کی سطح سے گفتگو کرتے وقت سکہ بند طور پر بُرے کرداروں کے لیے نادانستہ طور پر کچھ کچھ فیاضی کا مظاہرہ ہونے لگتا ہے۔ تھیکرے، اسکاٹ اور میڈوز ٹیلر کے دور کے کردار جنھیں "نواب" قرار دینے کا مطلب "موٹا، بھدا، عیاش اور بیوقوف" ہوتا تھا۔ اب بہت مشکل موسمی حالات میں برطانوی راج کی خدمت پر مامور وطن پرست قرار دیے جانے لگے۔ شاید اس تبدیلی کی ایک وجہ جزائر برطانیہ میں جمہوری طریقۂ زندگی کا روز افزوں ارتقا ہو۔ اب ہندوستان میں مستقبل آزمانے والوں کے لیے عہدے نیلام نہ ہوتے تھے، بلکہ مقابلے کے امتحانات کے قدیم چینی طریقے پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ایک بات بہرطور طے شدہ رہی کہ ہندوستان انگریزوں کے لیے "برطانوی راج کے دور سے اب تک پُراسرار جنگل کی طرح ایک ایسی پہیلی ہے جسے وہ آج تک بوجھ رہے ہیں۔" برصغیر نے انگریزوں کو اس قدر کچھ دیا ہے کہ ہم برطانوی ذہن کی بہت سی ناقابلِ ادراک جہتوں میں اپنا سر کھپاتے وقت یہ حقیقت اکثر و بیشتر فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ جیسے ہم "این ہمہ آوردۂ تست" کہنا چاہتے ہوں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرے گا اور برصغیر اپنے ذہن سے اپنے ذہن کا مطالعہ کرے گا اُس وقت ہم پر ہندوستان کے سرچشمۂ فکر سے انگلستان کی سیرابی کی طویل داستان منکشف ہوتی چلی جائے گی ___

اینگلو انڈین ادب کا تیسرا دور (۱۸۵۹ء سے ۱۹۰۱ء تک) ہر لحاظ سے ایک عجیب و غریب دور ہے۔ انگلستان اپنی تاریخ کے سنہری دور میں داخل ہو چکا ہے اور برصغیر۔ تقریباً ڈیڑھ سو سالہ افراتفری کے بعد۔ بدیسی حکمرانوں کی "لا اینڈ آرڈر" حکمت عملی پر ایک طوفان بدوش سکون کی چغلی کرتا ہوا ملتا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ برصغیر انگریز حکمرانوں کی نگاہ میں "سفید آدمی کے بوجھ" کی منزل سے ترقی پا کر "برطانوی راج کا سب سے شاندار ہیرا" بن چکا ہے۔ رڈیارڈ کپلنگ Kipling کی تحریریں اس دور کی نمائندہ تحریریں ہیں۔ ہرچند کہ وہ وفادار ہندوستانیوں کے ساتھ مربیانہ سلوک کا وکیل تھا۔ لیکن حریت پسندوں کے لیے شمشیر برہنہ۔ یہ علحدہ بات ہے کہ اُس کے ناولوں میں آزادی کے متوالوں کا ذکر تک نہیں ملتا ہے۔ وہ ایک توہم پرست انگریز کی طرح "آزادی" کے مطالبے کو بدروحوں کی ہذیانی گفتگو خیال کرتا ہے۔ وہ ہندوستان میں برطانوی عمل داری

www.taemeernews.com

کی لازوالی کا اس قدر بڑا وکیل تھا کہ اگر اُس کے سامنے آزادیِ ہند کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے ماتھے پر "یونین جیک" اُبھر آتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ عثمانیہ سلطنت سے یونان کی آزادی کی حمایت کرنے والے برِصغیر کے لیے کس قدر متضاد رویہ رکھتے تھے۔ کپلنگ نے ہندوستان کے بارے میں زیادہ تر ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۱ء تک لکھا۔ اس دوران چار مجموعے پلین ٹیلز فرام دی ہلز Plain Tales from the Hills سولجرز تھری اینڈ ادر اسٹوریز Soldiers Three and Other Stories دی ولی ونکی اینڈ ادر اسٹوریز Wee Willie Winkie and other stories اور لائفس ہنڈی کیپ۔ (Lifes' handicap)

ان مجموعوں میں ۹۶ کہانیاں ہیں جن میں سے صرف ۲۸ ہندوستان سے متعلق ہیں۔ ان کہانیوں میں ایک کہانی بھی ایسی نہیں جس میں آزادیِ ہند کے بارے میں اشارتاً تذکرہ ملتا ہو۔ اُس کے ناولوں Kim اور Naulakha بھی ہندوستان کے صحیح جذبات کی ترجمانی تو ایک طرف رہی، ہندوستان کے اصل مسئلے تک رسائی کی کوششیں بھی نہیں کرتے۔

کپلنگ سے ذرا پہلے، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد شہرت پانے والوں میں فل رابنسن کا ناول In my Indian Garden (1871) کا تذکرہ ضروری ہو جاتا ہے جس کا پیش لفظ مشہور مستشرق سر ایڈون ارنالڈ نے تحریر کیا ہے۔ اس ناول کے مقدمے کا ایک حصہ مندرجہ ذیل ہے۔ آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اُس وقت تک "ہندوستان کا ہمدرد" ہونا کس قدر اہم بات تھی۔

"ہمارا مصنف اُن چند خوش نصیب لوگوں میں سے ایک ہے جو ہندوستانی مناظر اور اشیا کے ساتھ آگہی حاصل کرنے کے باوجود اُن سے لاتعلقی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔"

فل رابنسن ایک ایسا ناول نویس ہے جسے ہندوستان کا "ہمدرد" کہا جا سکتا ہے۔ اُس نے اپنے ناول کے پیش لفظ میں لکھا ہے: "میں ہندوستان آ کر تین روز تک لگاتار ہنستا رہا اور پھر اس ہنسی کی جگہ جذبۂ ترحم نے لے لی۔ اس تبدیلی کے بعد ہندوستان اور اُس کے عوام پر ہنسنا چھوڑ دیا۔"

اس دور میں بے پناہ افراد نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر ناول لکھے لیکن ان میں سے ایک ناول بھی ادبی معیار پر پورا نہ اُترا۔ خصوصیت کے ساتھ صوبۂ سرحد پر درجنوں ناول لکھے گئے۔ اس دور کے چند اچھے ناولوں میں پریچرڈ کا ناول ----- The Chronicles of Budgepore (1871) اور سر ہنری اسٹوئرٹ کننگھم کا ناول Chronicles of Dustypore شامل ہے۔ موخر الذکر ہی کی بنیاد پر کپلنگ کی مشہور تصنیف Plain Tales from the Hills تخلیق ہوئی۔ دستی پور دراصل "لاہور" ہے۔ پھر ہماری توجہ لازمی طور پر مسز فلورا اینی اسٹیل (Mrs. Flora Anne Steel) کے ناولوں کی طرف جاتی ہے۔ انھوں نے پنجاب کے دیہات کو موضوع مطالعہ بنایا ہے From the Five Rivers اس موضوع پر نمائندہ ناول ہے۔ اس کے بعد ہم مسز بی۔ ایم۔ کروکر (B.M. Croker) سے گزرتے ہوئے (اس ناول نویس نے تیس سے زاید ناول لکھے ہیں) جے۔ ڈبلیو۔ شیرر (J.W. Sherer) کے ناول ----- A Princess of Islam (1897) کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اس ناول میں جارج ولٹن George Wilton نامی کردار ایک مسلمان ریاست کے نواب کی بہن شہزادی نورالنسا سے محبت کرتا ہے جو شادی پر منتج ہوتی ہے۔ ہم اس ناول نگار کے شکرگزار ہو سکتے ہیں کہ اُس نے اپنے کردار کو اس بنا پر لعن طعن کا نشانہ بنایا کہ وہ ایک

www.taemeernews.com

"غیر مہذب خاتون" کو اپنی دلہن بنا بیٹھا۔ بلکہ مقام تعجب ہے کہ شہزادی کا کردار بہت ہمدردی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ اس دور کے ناول نگاروں میں مس ہلڈا گریگ Miss Hilda Greigg کے ناول بطور خاص اہم ہیں ۔۔۔۔ In Farthest Ind میں اورنگ زیب کے دور میں سوات شہر کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موضوع پر ۔۔ یعنی انگریزی ناول نگاری کے لیے "غدر" پر کافی ناول لکھے گئے جن میں ڈی۔ ایچ۔ طامس کے ناول The Touchtone of Peril (1887) اور مسز اسٹیل Mrs. Steele کا ناول On the Face of the Waters (1896) قابل ذکر ہیں ۔۔

اب ہم چوتھے دور (۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء) تک میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دور کا کپلنگ بھی بدستور استعمار پرست ہے۔ لیکن ہندوستان کے سماج میں بہت سی ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہیں جن میں تحریک "آزادی" کے ارتعاشات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس دور میں گوتم بدھ اور بدھ مت کے بارے میں بہت سے ناول لکھے گئے۔ پال کیرس (Paul Carus) نے ۱۹۰۶ء میں Amtibha میں بدھ مت اور ہندو مت کا تقابلی جائزہ لیا ۔۔ کارل اڈولف گیلجریپ Karl Adolf Gjellerup کے ناول Kamanita The Pilgrim کا جے۔ ای۔ لوگی E. Logie Paul نے ۱۹۱۱ء میں ترجمہ کیا۔ یہ ناول گوتم بدھ کے آخری دلوں پر مبنی ہے اور بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ہرمن ہیس کو "سدھارتا" لکھنے کا خیال اسی تصنیف سے پیدا ہوا۔ پال مورنڈ Morand کی کتاب The Living Budha کا ذکر بھی ضروری ہو جاتا ہے جس میں فرض کیا گیا ہے کہ اگر گوتم بدھ آج کے پیرس اور نیویارک میں رہتے ہوتے تو اُن پر کیا گزرتی۔ اس کے بعد فلورا این اسٹیل کے ناول King Errant (1922) (بابر کے بارے میں) A Prince of Dreamers (1908) (اکبر اعظم کے بارے میں) Mistress of Men اور The Builders (1928) (جہانگیر اور شاہ جہاں کے بارے میں) خاصے مشہور ہوئے۔ مسز اسٹیل نے ہندوستانی بادشاہوں کے بارے میں خاصی معقولیت اور معروضیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغل دور کی شان و شوکت کے مقابلے میں اُس دور کی علم دوستی سے زیادہ متاثر تھیں۔ اسی دور میں فرینک آر سیل کا ایک رومانوی ناول Bhim Singh (1929) بھی خاصا مشہور ہوا جو ٹوڈ Todd کی مشہور تصنیف ۔۔ The Annals of Rajhistan کی اسپرٹ کے تتبع میں تخلیق ہوا۔ اس ناول میں راجپوت اقدار کی عکاسی کمال محبت اور احترام کے ساتھ کی گئی ہے۔ Mrs G.A. Bell کے ناول The Foreigner (1928) اور V.E. Bannisdale کے ناول Quest and Conquest میں جارج تھامس "جہازی صاحب" اور بیگم شمرو بطور ایک حریص، جذباتی اور ظالم حکمران کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ مسز بیل بیگم شمرو کا تعارف ان الفاظ میں کراتی ہیں :۔

"۔۔ بیگم اپنی ذات میں ہندوستانی تھی، پُراسرار، جاذبِ توجہ، حُسنِ بیمار، غیر مختتم بازگشت کا احساس اور بے پناہ جوش و جذبے کی مالک۔ یہ سب اُس کی صفات تھیں۔ وہ دوشیزگی کی منزل سے کافی آگے نکل گئی تھی۔ لیکن اپنی نسوانی بالیدگی کے شباب پر تھی۔ وہ ایک ایسے پیڑ کی طرح خوبصورت تھی جو مضبوط ہو، زمین کے

www.taemeernews.com

محمد علی صدیقی

اینگلو انڈین ادب کا فکری پس منظر

اندر گہری جڑیں پیوست کیے ہوا ورشاہانہ شان و شوکت کی مالک ہو —

اردو ادب میں جرمن شاعر فرانسو کے ضمن میں بیگم شمرو کا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن مسز ہبل نے بیگم شمرو کی تصویر کشی میں جو مہارت دکھائی ہے وہ اس قابل تھی کہ مندرجہ بالا اقتباس پیش کیا جائے — ۱۹۰۱ء کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں مسز ایف۔ ای۔ پینی Mrs F R Penny کا ناول The Unlucky Mark قابل ذکر ہے۔ اس ناول میں بنگالیوں کے لیے بے پناہ حقارت اور تضحیک کے علاوہ کچھ نہیں۔ پھر مسز ای۔ ڈبلیو۔ سوی (Mrs. E.W Savi) کا ناول A Prince of Lovers جو تقسیم بنگال سے متعلق ہے۔ اس میں ہندوؤں کے ساتھ برہمی کا رویہ کارفرما نظر آتا ہے اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں ہمدردانہ نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ ایل بریسفورڈ L. Beresford. کے ناول — — — The Second Rising میں آزادیٔ ہند کے مطالبات پر سخت موقف اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ناول نگار نے اس موقف کے گرد کہانی گھمائی ہے۔ اگر نرمی برتی گئی تو ۱۸۵۷ء کے واقعات کا اعادہ ہوگا۔ لیکن اس دور کا سب سے اچھا ناول ای۔ ایم۔ فارسٹر E M Forster کا A Passage to India اور ایڈورڈ تھامسن Edward Thomson کا A Farewell to India ہے۔ خصوصیت کے ساتھ فارسٹر کا ناول۔ فارسٹر کے پیش نظر انگریزوں کی خوشنودی ہے اور نہ ہندوستانیوں کی۔ زیادہ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ یہ ناول حقیقت پسندوں میں مقبول ہوا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس ناول میں ڈاکٹر عزیز کی صورت میں پہلی بار ایک ایسا مسلمان کردار سامنے آیا جو مغربی تعلیم سے مزین ہے اپنے پیشے میں ممتاز ہے لیکن اس کے باوجود اپنے شاندار ماضی پر فریفتہ بھی ہے۔ فارسٹر کے ناول کا انتساب سر راس مسعود کے نام کیا گیا ہے اور وہ شمالی ہند کی مسلم اشرافیہ سے ایک گونہ متاثر بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہندو مسلم منازعہ میں ہندوستان کے دوست کی حیثیت سے نہ ابھر سکے۔ کم از کم نیراد چودھری کے ناول A Passage to England کے مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہر چند کہ رمیش چندر دت کے ناولوں سے وطن پرستی کی تجسیم کی ابتدا ہوئی۔ لیکن نیراد جیسا اینگلو سیکسن ہندوستانی کبھی فارسٹر پر نقطہ نظر سے متفق نہ ہو سکا اور اس طرح اینگلو انڈین فکشن۔ ہندوستان کے تحیرانگیز لینڈ اسکیپ کے ساتھ وارفتگی اور اس کے عوام کے ساتھ ایک گونہ لاتعلقی یا ان کے بارے میں ناپسندیدگی کے جذبات کا حامل بنا رہا۔ البتہ تقسیم کے بعد اس رجحان میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے اور اینگلو انڈین ادب کے پانچویں دور میں جس میں ہندوستانی مصنفین اس قدر کثرت سے شامل ہیں کہ آزاد ہندوستان کے ناول نگار ادب ہی کی زبان میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے میں کمال مہارت دکھا رہے ہیں۔

ہم پانچویں دور میں بھی اپنا مطالعہ انگریز مصنفین کی حد تک محدود کر رہے ہیں۔ اس دور میں مس کے جے کارپٹ، جون ماسٹرز اور پال اسکاٹ کے ناولوں کا ذکر کرنا خالی از علت نہ ہوگا۔ یہ تین ناول نگار موجودہ دور میں خاصے مقبول ہیں اور برصغیر کے باشندوں کا خیال ہے کہ ہر چند یہ ناول نگار اینگلو انڈین کی روایت ہی کے لوگ ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ حضرات آزادی کے بعد کے برصغیر کی حقیقت سے غافل نہیں ہیں۔ اس لیے ان مصنفین کے ناولوں میں ہندوستان کے لیے محبت اور شیفتگی کا مظاہرہ ملتا ہے۔ شاید یہ آج کے زمانے کا تقاضا ہو۔ بہرحال ہمدردی کی خوشبو دور تک جا پہنچی ہے۔ اینگلو انڈین ادب میں یہ رویہ اس قدر زیادہ کارفرما ہے کہ ہم ماسوائے حیرت اور کچھ نہیں کر سکتے — یہ مطالعہ برصغیر کے بارے میں اینگلو انڈین فکشن کے بدلتے ہوئے خد و خال پر مبنی ہے۔ دیکھیے کہ مستقبل کا اینگلو انڈین ادب کس کروٹ بیٹھتا ہے —!

انڈین ادب میں یہ رویہ اس قدر زیادہ کارفرما ہے کہ ہم ماسوائے حیرت اور کچھ نہیں کر سکتے —

www.taemeernews.com

ڈاکٹر شمیم حنفی

مشرق و مغرب کا ادبی سنگم

انگریزوں کا سیاسی اقتدار تہذیبی سطح پر بڑی عہد آفریں تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ انگریزی تعلیم کا فروغ ہوا تو نئے علمی تصورات رونما ہوئے جن سے ثقافتی خاکوں میں نئے رنگوں کی آمیزش ہوئی، قومی اور مذہبی اصلاحات کی تحریک شروع ہوئی تو بہت سی فرسودہ روایات اور از کار رفتہ عقاید کے پردے چاک ہوئے اور اس طرح عقلی اور مادی حقیقتوں کی اہمیت واضح ہوئی۔ چھاپہ خانوں کے قیام سے نشر و اشاعت کی سہولتیں بڑھیں اور اب علم و فن کی نئی قدروں کو ابھرنے اور پھیلنے کا بہتر موقع ملا۔ انگریزی زبان کی مقبولیت نے تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے مغربی علوم، ادبیات اور فلسفے کی وہ دنیائیں پیش کر دیں جن کی روشنی میں ہندوستان کے ماضی اور حال دونوں سے متعلق نئے زاویے سامنے آئے اور خالص جذبہ یا وجدان کے بجائے عقل و شعور کے پیمانوں پر زندگی اور زمانے کے تجزیے کا رجحان عام ہونے لگا۔ جان ولسن اور الیگزنڈر ڈف نے ۱۸۲۹-۳۰ء میں ہندوستان آنے کے بعد تعلیم کا جو نیا خاکہ پیش کیا تھا کم و بیش وہی خاکہ اب تک رائج ہے [1] اس نئے خاکے کے فیضان نے اس عہد میں ایک طرف ہندوستانیوں کو حکومت کے مختلف محکموں میں شمولیت کے مواقع فراہم کیے اور دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ اس نئے نظامِ تعلیم کو قبول کرنے والا طبقہ ایک نئی تہذیبی اور علمی فضا کی تعمیر و تشکیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔۔۔۔

ان حالات کے پیشِ نظر ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب میں نئے تصورات و افکار کی آمیزش ایک نظری امر ہے بعض سیاسی اور سماجی اسباب کی بنا پر یہ عصری رجحانات پورے ملک پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ ان کی ہمہ گیری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی تمام زبانوں کے ادب میں ذہنی و فکری نشاۃ ثانیہ کے بہت واضح نشانات ملتے ہیں۔ اسی موقع پر یہ حقیقت بھی ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ نئے علوم و تصورات نے ہندوستانی معاشرے کو محض حال اور مستقبل کے ادراک اور عرفان کا ایک نیا شعور نہیں عطا کیا بلکہ وہ زاویۂ نظر بھی دیا جو موجودہ یا آیندہ زبانوں کے ساتھ ساتھ گزشتہ عہد کی تفہیم اور تجزیے کی بہتر صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے کی اکثریت جدید علمی مذاق سے ناواقف ہونے کے باعث اپنے قدیم علمی اور تمدنی سرمائے کی صحیح قدر و قیمت سے بھی بے خبر تھی۔ اس بے خبری یا غفلت کا ایک اور سبب وہ سیاسی اور تہذیبی پراگندگی تھی جس نے عہد عالمگیری کے اواخر سے لے کر اب تک ہندوستان کے ہر شعبۂ حیات پر اپنی کمندیں ڈال رکھی تھیں۔ مایوسی، نامرادی،

---

[1] H. C. E. Zacharias : Renascent India

www.taemeernews.com

بے حسی، بے دلی، حال کی کشمکش، ماضی کے عذاب اور مستقبل کے اندیشوں نے سوچنے، سمجھنے اور آگے بڑھنے کی تمام قوتیں سلب کرلی تھیں ۔ روایتی تصوف، مابعد الطبیعاتی تصور زندگی، سستی تفریحیں اور ذہنی عیاشیاں معاشرے کے عام مذاق سے دیمک کی طرح چمٹی ہوئی تھیں کہ ان کے دائرے میں کم از کم عارضی طور پر مادی حقایق کی تلخیوں کا احساس محو ہو جاتا تھا۔ اس انفعالیت زدہ اور مجہول طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ عظمت رفتہ کی چمک دمک بھی ماند پڑتی گئی اور وقار کا شیرازہ بکھرتا گیا۔ لیکن بعض مستشرقین نے ہندوستانی تاریخ کے عظیم الشان ماضی کو اپنے مطالعے کا مرکز بنا کر علمی، ادبی، ثقافتی اور فکری عظمتوں کا رس چھلکاتی ہوئی وہ تصویریں پھر سے زندہ کردیں، جو ہماری غفلت اور بے نیازی کی وجہ سے اپنا سارا رنگ و روغن کھو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں وارن ہیسٹنگز، سر ولیم جونس، سر چارلس ولکنس، کول بروک، ہوریس ولسن اور جیمس پرنسپ کے نام بہت اہم ہیں کہ انھیں نے ہندوستان کے قدیم کلاسیکی ادبی سرمائے کو نئے معانی و مفاہیم سے آراستہ کیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ ہندوستانیوں میں ماضی کی قدر و قیمت اور امتیاز و افتخار کا احساس ابھار کر انھیں زندگی کی نئی لہروں سے آشنا کیا بلکہ اس طرح ہندوستان سے باہر بھی ہمارے تہذیبی اور علمی وقار کا تصور عام ہوا۔ یورپ کی آنکھوں میں اپنی عظمت اور احترام کا عکس دیکھ کر ہندوستانیوں میں قومی بیداری اور خود اعتمادی کا احساس ابھرا اور بے بسی کے کرب سے پیدا ہونے والی افسردگی اور انفعالیت کے بادل چھٹنے لگے۔ ان کوششوں نے ہندوستان کو خود فراموشی کی صدیوں پرانی گراں خوابی سے بیدار کیا۔ مہر بہ لب دروازوں پر نئی صداؤں کی دستک شروع ہوئی، احساس کی گہرائیوں میں نئے سوالات کی تاک جھانک کا سلسلہ چلا اور مشرق و مغرب کے اس امتزاج نے ایک نئے شعور کو جنم دیا"[1]

یہی نیا شعور اس عہد کے ادبی تصورات کا بنیادی پتھر ہے ——

۱۸۲۸ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ ہندوستان کی ادبی اور لسانی تاریخ کا، اس لحاظ سے اہم ترین دور قرار دیا جا سکتا ہے کہ اسی دوران میں قدیم ذہنی و فکری سرمائے کی چھان بین کا سب سے زیادہ کام ہوا۔ ہندوستانی تہذیب کی اساس جن عقاید اور تصورات پر تھی، ان کا تجزیہ از سر نو کیا گیا اور انداز نظر بھی وہ رہا جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ یعنی احساس کو علم کے پیمانوں پر جانچنے اور سمجھنے کی کوشش۔ ہاجسن Hodgson نے اپنے نیپال کے دوران قیام میں (۱۸۳۳ء تا ۱۸۴۳ء) شمالی بودھی ادب کی تلاش و تحقیق کی اور اپنی کوششوں میں اسے نمایاں کامیابیاں ملیں۔ روتھ Roth نے ۱۸۴۶ء میں ویدوں کی تاریخ اور ادبی محاسن پر ایک کتاب شایع کی۔ رگ وید پر میکس مُلر Max Muller کا مشہور و معروف رسالہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۷۵ء کے درمیان لکھا گیا۔ پرنسپ اور کننگھم نے ہندوستان کے قدیم کتبوں اور آثار کے علاوہ قدیم فنی یادگاروں کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا۔ ہندوستانی ادب، فن تعمیر، مصوری، موسیقی، رقص، سنگ تراشی اور علمی و فلسفیانہ افکار کے قدیم نمونوں میں جذبہ اور احساس کی جو لطافت، دل کشی اور فکری بلندی ملتی ہے اس سے مغرب کی دلچسپی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ سائنس کی حیرت خیز تیزی کے باوجود داخلی طور پر یورپ تشنگی کے احساس سے دو چار تھا۔ اسے مادی لذتوں اور آسائشوں کی ایک دنیا حاصل تھی۔ لیکن روح کی پیاس نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ یہی پیاس اسے مشرقی فکر و فن کے اس "چشمۂ حیواں" تک لائی جو ہندوستان کے ماضی سے عبارت ہے۔ مشرق کے مطالعے کی یہ روایت ۱۸۵۷ء کے بعد بھی برقرار

---

[1] Humayun Kabir—The Indian Heritage اشاعت سوم۔ ص۔ ۱۶۳

www.taemeernews.com

رہی اور انیسویں صدی کے اواخر تک مغربی مستشرقین نے کئی ایسی کتابیں اور رسالے پیش کیے جن میں ہندوستان کی عظمتِ گم گشتہ کا سراغ ملتا ہے۔ ایسی کتابوں میں ذیل کی مطبوعات قابلِ ذکر ہیں :۔

- Sacred Books of the Eastern Children
- The Harvard Oriental Series (Oriental Studies)
- Dictionary of Pali Language-By Rhys Davids

ان کے علاوہ Waber اور Rhys Davids نے

- Encyclopeadia of Indo-Aryan Research

کی ترتیب بھی شروع کی جس کی تیاری میں ان کے علاوہ مختلف ممالک کے تیس محققین بھی شریک تھے[1]
ان کوششوں کے نتائج بے حد حوصلہ افزا ہے۔ ان کے پیشِ نظر یہ احساس ہوتا ہے کہ شخصیت انفرادی ہو یا قومی، اس کی تعمیر و تشکیل کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انفرادی صلاحیتوں، بین الاقوامی تصورات اور عقاید کے ساتھ ساتھ صحیح تاریخی شعور کی دولت بھی نہ حاصل ہو۔ ہر زمانہ آنے والے زمانے کے لیے خام مواد مہیا کرتا ہے۔ اس طرح انسانی فکر و فن کے ارتقا کا تصور اس زنجیر سے مشابہ ہوتا ہے جس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں۔ انگریزی سیاست ہندوستانی معاشرے کے لیے زہر تھی کہ اسی کے ہاتھوں ہندوستان کو سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی کی ایسی وحشت ناک وادیوں سے گزرنا پڑا جن کی ہیبت اور کرب موت سے کم نہیں۔ لیکن جدید علمی مذاق اور تصورات کی وہ لہریں جو مغرب کی جغرافیائی حدبندیوں سے نکل کر انگریزوں کے ساتھ ہندوستان آئیں ان کے فیض سے ہندوستان کو اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے میں بھی مدد ملی اور بزرگوں کے وہ کارنامے بھی جو طاقِ نسیاں کے نقش و نگار بن چکے تھے، ایک بار پھر سے جاگ اٹھے ____

تہذیبی ارتقاء کی اس منزل پر ماضی اور حال ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونے کے بجائے ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہوئے کہ ایک تیسری راہ نکل آئی اور پھر یہی راہ نئی منزلوں تک رسائی کا وسیلہ بن گئی۔ ہر موقع پر روایت اور بغاوت یا قدامت اور جدت کا مسئلہ بھی ذہن میں اُبھرتا ہے۔ مجنوں صاحب نے اس سلسلے میں بعض بڑی کام کی باتیں کہی ہیں ان کے الفاظ میں "ماضی کو اپنے سر کا بھوت بنا لینا تو یقیناً آسیب قسم کی بیماری ہے۔ لیکن ماضی سے یک سر انکار کر دینا یا اس کے وجود سے غافل ہو جانا بھی وہ دماغی عارضہ ہے، جس کو اصطلاح میں نسیان کہتے ہیں۔ ہم رجعت کے بغیر ماضی کی قدر کر سکتے ہیں اور اس کے صالح عناصر کو مستقبل کی تعمیر میں لگا سکتے ہیں۔ تواریخی مادیت کا پہلا سبق یہی ہے کہ ایک نظام اور دوسرے نظام کے درمیان ربط و تسلسل ہوتا ہے۔ ایک تمدن گزشتہ تمدن کی ارتقائی صورت ہوتا ہے اور آیندہ تمدن کا پس منظر"[2] چنانچہ "ادب کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آبائی میراث قبول کرے اور اس کو صحیح طور پر کام میں لا کر ترقی کے نئے اسباب مہیا کرے اور آنے والی نسل کے لیے پہلے سے بڑی میراث چھوڑ ے ...... زندگی کے دوسرے اکتسابات کی طرح ادب بھی بیک وقت وارث

---

[1] L. Vidyarthi—Indian Culture through the Ages اشاعت دوم۔ ص۔ ۲۳۸

[2] مجنوں گورکھپوری : نقوش و افکار۔ اشاعت ۱۹۵۵ء ص ۷۶

www.taemeernews.com

اور موثر دونوں ہوتا ہے"[1]

TIME PRESENT AND TIME PAST
ARE BOTH PERHAPS PRESENT IN TIME FUTURE
AND TIME FUTURE CONTAINED IN TIME PAST
IF ALL TIME IS ETERNALLY PRESENT
ALL TIME IS UNREDEEMABLE　　　T. S. ELIOT.

پس یہ بات صاف ہے کہ حال کے وجود کا تصور ماضی کے بغیر ممکن نہیں۔ "ایک روحانی اتحاد مردوں اور زندوں کو یعنی ہر زمانے کے نیک نفس، دلاور اور دانش مند افراد کو باہم مربوط کیے رہتا ہے"[2] لیکن فکروفن کی ہر ایسی منزل پر یہ خیال بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ماضی بہر حال ماضی ہے جسے حال اور مستقبل کے سفر میں حائل نہ ہونا چاہیے ——

فکر و فلسفہ میں ماضی اور حال یا روایت اور جدت کی یہ آمیزش ایک نئے ذہن کی معمار بن گئی۔ زبان و ادب میں یہ رنگ کئی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ جدید نثر کو ارتقا کے نئے راستے اور زاویے ملے اور ہندوستانی صحافت کی ایک باقاعدہ اور منظم روایت شروع ہوئی۔ تہذیبی انحطاط نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی زوال کی مہر لگا دی تھی۔ ذہنی و فکری افلاس اس عہد کے عام ادبی مذاق کا شناختی نشان ہے۔ ماضی اور حال دونوں سے لاتعلقی نے فکروفن کی ہر قدر ہوا میں معلق کر دی تھی۔ اپنی انفرادی صلاحیتوں کے باعث بعض ادیبوں نے فنی ریاضت اور عظمت کا معیار ایک حد تک قایم کیا، لیکن عام بد مذاقی نے کم و بیش ساری زبانوں کے ادب کو چوپٹ کر رکھا تھا۔ عام طور پہ جو تخلیقات سامنے آ رہی تھیں ان میں نہ تو ماضی کا جلال و جمال تھا اور نہ حال کے مطالبات کی تسکین و تشفی کا کوئی سامان۔ دوسرا المیہ یہ تھا کہ ہندوستان کی بیشتر ادبی سرگرمیاں شعر و شاعری کے ایک چھٹے پٹائے دائرے تک محدود تھیں۔ زبان و بیان کی بازی گری شاعرانہ کمال کا معیار سمجھی جاتی تھی۔ انگریزی علوم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے نظریات ہی نہیں بدلے، بلکہ ہندوستانی ادیبوں کو نئے اوصاف کی طرف متوجہ ہونے کا موقع بھی ملا۔ ناول، ڈرامہ، تنقید، افسانہ نویسی، مضمون نگاری، تمثیل یہ سب کے سب جدید ذہنی اور علمی تقاضوں کے رد عمل کے طور پر ہی ہندوستان کی ادبی فضا میں اپنا مقام بنا سکے۔ تبدیلی کے احساس اور ان تبدیلیوں سے اخذ شدہ نتایج نے شعوری طور پر ادیبوں کو نثر کی طرف متوجہ کیا۔ شاعری کے مقابلے میں نثر علم و فکر کی حدوں سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ کیونکہ نثر بجائے خود وہ ذریعہ ہے جس سے ترسیلِ علم کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ سماجی مقاصد بھی پورے کیے جا سکتے ہیں۔ "جن کا بروئے کار لانا کسی خاص زمانے میں ضروری ہو جاتا ہے"[3] انیسویں صدی کے تغیر پذیر شعور نے انسانی زندگی کے مادی حقایق کی وضاحت کر کے ہندوستانی ادیبوں میں اس کی حرمت اور

---

[1] مجنوں گورکھپوری: نقوش و افکار۔ ص ۶۷

[2] ورڈ سورتھ بحوالہ 〃 ص ۶۷

[3] سید احتشام حسین: اعتبار نظر۔ اشاعت ۱۹۶۲ء ص ۷۱

www.taemeernews.com

برگزیدگی کا احساس عام کیا۔" اس سے پہلے ہم زندگی کو ایک آسمان زاد حقیقت سمجھتے تھے اور اس کی جھوٹی مادرائیت کا رعب ہم پر چھایا ہوا تھا۔ صنعتی دور کا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ اس نے زمین کی مقدس قدر ہمارے دل میں بٹھائی اور ہم کو یہ بتایا کہ ہماری زندگی اس زمین کی پیداوار ہے اور اسی زمین کی عام خیر و برکت ہماری زندگی کی بھی ضامن ہے۔" [1]

احساس کے اس موڑ پر لامحالہ ہمارے ادیبوں کو ایک ایسے طرز اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی جو مدلل، ٹھوس، اثر انگیز اور عام فہم طریقے سے ان کے تصورات کی اشاعت کر سکے۔ چنانچہ:-

"یہی چیز جدید نثر کے ارتقا کا سنگِ بنیاد بن گئی۔ مذہبی تغیرات اور سماجی اصلاح کے تصورات وضاحت چاہتے تھے، نئی تعلیم کی وجہ سے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنا ضروری ہو گیا تھا اور جدید علوم کی ترویج وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بننے کے لیے ناگزیر ہو گئی تھی۔ ان تمام باتوں کے لیے نثری اظہار ہی ایک مضبوط ذریعہ بن سکتا تھا۔" [2]

وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور مطالبات کا احساس قبول کرنے میں اردو ادیبوں کا ایک طبقہ بڑی کشادہ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ آگے بڑھا۔ قلب و نظر کی کشادگی کی یہ روایت نئی نہیں تھی۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے بھی ہندوستان میں زمانے کے ارتقائی عمل کو سمجھ کر اس کے شانہ بہ شانہ چلنے کا رواج صدیوں پرانا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اہم ترین بات یہ رہی ہے کہ تاریخ کے انتہائی خراب اور تباہ کن موڑ پر بھی عارضی پراگندگی کے بعد ہندوستان نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے اور اس کی چھپی ہوئی قوتیں دوبارہ عود کر آئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کچھ عرصے تک یہ فضا ضرور قائم رہی کہ ہندوستان کی تہذیبی زندگی تحیر اور استعجاب کے عالم میں خاموش اور پریشان نظر آئی۔ اس وقت تھوڑی دیر کے لیے یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ مغرب سے ہندوستان کو نہ تو کچھ لینا ہے اور نہ اسے کچھ دینا ہے [3] لیکن جذباتی انتشار و ہیجان کے اس دائرے سے نکلتے ہی یہ جذبہ ابھرنے لگا کہ مغرب نے سیاسی اور معاشی طور پر ہندوستان کو خراب و خستہ کرنے کے باوجود ذہنی طور پر اسے بڑی گہری نیند سے بیدار کیا ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہندوستانی معاشرے نے نئے حالات کو نہ صرف یہ کہ قبول کیا بلکہ کھلے دل سے اس کا خیر مقدم بھی کیا۔ ہندوستانی معاشرے کی یہ رواداری روشن خیالی اور وسیع القلبی ایک ایسی روایت بن چکی ہے جس نے تاریخ کی ہر منزل پر نت نئے حالات سے سمجھوتہ کیا ہے۔ اروبندو گھوش کے الفاظ میں:-

" ہماری پرانی تہذیب کا موازنہ قدیم یا وسطی عہد کی تاریخ کے بڑے سے بڑے تغیر سے کیا جا سکتا ہے۔ ہماری تہذیب یونانیوں سے زیادہ دور رس، باریک بیں، مختلف النوع، بیدار اور ٹھوس رہی ہے، روما کی تہذیب سے زیادہ لائق اور انسانیت پسند رہی ہے، قدیم مصری تہذیب سے زیادہ روحانی اور وسیع القلب رہی ہے، ایشیا کی کسی بھی دوسری تہذیب سے زیادہ بلند رہی ہے۔" [4]

---

[1] مجنوں گورکھپوری: نقوش و افکار۔ ص ۱۲۷

[2] اعتبار نظر ص ۷۲

[3] Humayun Kabir—The Indian Heritage ص ۱۱۲

[4] Sri Aurobindo—Foundation of Indian Culture ص ۳۰-۳۱

www.taemeernews.com

یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر درست سہی لیکن ان سے زیادہ اہم اور سچی بات یہ ہے کہ جدید علوم نے ہندوستانی تہذیب کا جو خاکہ مرتب کیا وہی خاکہ تاریخ کے فطری عمل کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ تھا اس نے روایت کو بغاوت کی شان عطا کی اور اس کے بغیر ہندوستانی شعور کا سفر حرکی اور فعال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تبدیلی ہندوستان کے تہذیبی ارتقا کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اسی مقام پر ماضی اور حال یک جا ہوئے اور پھر فکر و فن کی ایک نئی صدا نے مستقبل کا راستہ دکھایا بقول ہمایوں کبیر:۔

"یہ تبدیلی حالات کا فطری اور لازمی تقاضہ تھی۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ ایک بہتر یا زیادہ بیدار اور ترقی پذیر تہذیب ہم پر غالب آتی جا رہی تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک تہذیب جو نسبتاً خاموشی، غفلت اور بے حسی کا شکار ہو جاتی ہے اس وقت اسے اگر کسی بیدار، باعمل اور حیرت خیز حد تک تخلیقی عناصر سے مالا مال تہذیب سے متصادم ہونا پڑے تو وہ زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ کامیاب قوتوں کی گرفت میں چلی جاتی ہے اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ نئے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ ہونے لگتی ہے۔"

ان حالات کی روشنی میں ادب کے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کا جائزہ لیتے وقت یہ خوش گوار حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہندوستانی دانشوروں اور فن کاروں نے نئے تصورات کا اثر اس شکل میں نہیں قبول کیا کہ اپنی معاشرتی انفرادیت کھو بیٹھتے۔ اسی وجہ سے انیسویں صدی میں جن ادبی روایات کی داغ بیل پڑی ان میں مشرق و مغرب دونوں کا خوبصورت سنگم نظر آتا ہے۔ دو مختلف قدروں کی اس آمیزش نے اس عہد کے ادب کو اینگلو انڈین ادب کا نام دیا ہے ——

جدید افسانوی ادب پر

شہزاد منظر

کے تنقیدی مقالات کا فکر انگیز مجموعہ

جدید اُردو افسانہ

جس میں
برصغیر کی آزادی کے بعد جدید افسانہ اور
افسانہ نگاروں کے فن سے بحث کی گئی ہے
عنقریب شایع ہو رہا ہے

---

www.taemeernews.com

برطانیہ میں اردو ایڈیشن

سیّد ہاشم رضا

ابن انشا

مختار زمن

مُطالعہ
مُشاہدہ

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

سید ہاشم رضا

قیامِ انگلستان کی یادیں

(ڈائری کے چند اوراق)

آکسفورڈ

ستمبر ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتے میں جب میں انگلستان میں پہلی مرتبہ وارد ہوا تو وطن کے چھٹنے کے غم کے ساتھ اردو کے چھٹنے کا غم ستا رہا تھا۔ لندن میں ہائیڈ پارک کی کشادہ فضا مرجع خاص و عام ہے۔ وہاں کی "سرپنٹائن" جھیل دن بھر چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے بھری رہتی ہے۔ شام کو سرسبز "لانز" پر مردوں عورتوں اور بچوں کا ہجوم رہتا ہے، "رائٹن رو" میں اسپِ تازی کی جولانی کے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن میرے دامنِ دل کو ہائیڈ پارک کا وہ کونہ کھینچتا تھا جہاں سنیچر اور اتوار کو مقرروں اور سامعین کی بھیڑ لگتی ہے اور جہاں ہر موضوع پر آزادانہ گفتگو ہوتی ہے اور سوال و جواب کا دلچسپ سلسلۂ گفتگو جاری رہتا ہے۔ میں جب پہلی مرتبہ "اوریٹرز کارنر" میں پہنچا تو یہ شعر میری زبان پر تھا ؎

بیا ورید گر ایں جا بود سخن دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

لندن میں چند دن قیام کر کے میں وسطِ اکتوبر میں آکسفورڈ پہنچا اور "ٹرم" کے شروع ہوتے ہی میں "ہندوستانی سبھا" کا ممبر بن گیا۔ اس سوسائٹی کے نام سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ یہ "ہندی" کے پرچار کے لیے بنائی گئی ہوگی، لیکن معاملہ بالکل برعکس تھا۔ دراصل یہ ادارہ آکسفورڈ میں اردو کی ترویج کا مرکز تھا، چونکہ ہر ہندوستانی طالب علم اس سوسائٹی کا ممبر تھا اور ہندو طالب علموں کی تعداد مسلمان طالب علموں سے دوگنی تھی۔ لہٰذا نام کے معاملے میں ہندو طالب علموں کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا اور کام کی بات اردو ہی میں ہوتی تھی۔

میرے آکسفورڈ میں دو برس کے قیام کے عرصے میں صرف ایک جلسے میں ہندی میں تقریر ہوئی، باقی سارے جلسوں میں اردو میں تقریریں ہوتی تھیں اور اس طرح دیارِ غیر میں اردو سننے اور اردو بولنے کی تمنا پوری ہوئی۔ "ہندوستانی سبھا" کے ایک جلسے میں میرے دوست سید فضل احمد کریم فضلی نے وہ دلچسپ نظم پڑھی جس کا عنوان ہے "آکسفورڈ" ——

www.taemeernews.com

اس نظم میں مشرقی تہذیب میں پروردہ طالب علم کی اس ذہنی کشمکش کا ذکر ہے جس میں وہ مغرب میں پہنچ کر مبتلا ہوجاتا ہے۔ علامہ اقبال جیسے دیدہ وروں کی اور بات ہے جنھوں نے انگلستان اور جرمنی میں اپنے ذہنی توازن کو بڑی آب وتاب کے ساتھ برقرار رکھا، ان کا شعر ہے ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

لیکن بیشتر ہندوستانی طالب علموں کا وہی حال ہوتا ہے جس کا ذکر فضلی نے اپنی نظم میں کیا۔ نظم کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

سُناتے ہیں اِک آپ کو نظم ہم — بھلاتے ہیں اس طرح کچھ دل کا غم
نہ کچھ فکر اپنی نہ کچھ فکرِ غیر — عجب وہ زمانہ تھا یادش بخیر
جو کرتے ہیں ظاہر خیالات یوں — جو بے پوچھے کرتے ہیں خود بات یوں
"ابے کچھ سُنا تم نے وہ ماجرا — جو کل بن رہا تھا بڑا پارسا
وہ ساتھ ایک لڑکی کے آیا نظر — بہت سٹ پٹایا مجھے دیکھ کر
خدا ہی کو معلوم ہے اصل حال — بظاہر پریشان تھے اس کے بال
ہنسی تو مجھے آئی بے انتہا — مگر ضبط سے کام میں نے لیا"
وہ حضرات یا تو گنہگار ہیں — نہیں تو گنا ہوں پہ تیار ہیں

بہرے سے نہیں یا تو وہ پارسا
اگر ہیں تو تقدیر ہے نارسا

دریائے ٹیمز جب آکسفورڈ کے حدود میں بہتا ہے تو اُسے "آئسس" (ISIS) کہتے ہیں، آکسفورڈ کے بہت سے طالب علم اور طالبات سہ پہر کے وقت اس دریا میں "پنٹنگ" کرتے ہیں، لو سکھیا حضرات کبھی کبھی دل کے ہاتھوں غوطے بھی کھاتے ہیں، اس منظر کو فضلی نے یوں بیان کیا ہے ؎

چلانا اناڑی کا ڈر ڈر کے "پنٹ" — وہ "پنٹوں" کا چلنا ادھر اَنٹ سَنٹ
اُدھر شاخ سے کوئی لٹکا ہوا — اِدھر ڈال میں کوئی اٹکا ہوا

اور جب پردہ پوشی کے لیے رات کا اندھیرا پھیلتا ہے اُس کا تذکرہ فضلی یوں کرتے ہیں ؎

چھڑے سلسلہ پھر اُسی بات کا — ہوا دن کا ذکر اب ہو کچھ رات کا
جدھر دیکھیے کوچۂ عاشقاں — عیاں عشق کی کار فرمائیاں
درختوں کے ہیں خول کیا خوش نصیب — چھپے جن میں ہیں عاشقانِ غریب

آکسفورڈ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ میں جہاں انڈین سول سروس کے پروبیشنرز کو ہندوستان کی تاریخ، قوانین اور زبانیں سکھائی جاتی تھیں، ایک پروفیسر مسٹر آر پی ڈیو ہرسٹ تھے، یہ یوپی کے سویلین تھے اور ریٹائرمنٹ

www.taemeernews.com

کے بعد انڈین انسٹی ٹیوٹ میں اردو پڑھاتے تھے۔ میرے والد ماجد جسٹس سید محمد رضا (مرحوم) بھی یوپی جوڈیشل سروس میں تھے اور ڈیوہرسٹ صاحب ان کے دوستوں میں سے تھے، میں جب اپنے والد ماجد کا خط لے کر ڈیوہرسٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے میرے والد کے خط کی جو خطِ شکست میں تھا بڑی تعریف کی۔ چونکہ اردو میری مادری زبان تھی لہٰذا ڈیوہرسٹ صاحب کی کلاس میں جانے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ میری تقرری بمبئی پریذیڈنسی میں ہوئی تھی اور میں نے انسٹی ٹیوٹ میں دو سال مرہٹی زبان سلیڈن صاحب سے پڑھی تھی جو کہ باہے سویلین تھے اور بڑودہ میں وزیر بھی رہے تھے۔

ایک دن ڈیوہرسٹ صاحب نے مجھے اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی اور ایک کتاب دکھائی جو لکھنؤ میں چھپی تھی اور جس کا عنوان تھا "انگارے" ڈیوہرسٹ صاحب بڑے مذہبی آدمی تھے اور مذہب اسلام کا احترام کرنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے صدیق بک ڈپو لکھنؤ کو آرڈر دے رکھا تھا کہ اردو کی جو بھی نئی کتاب چھپے اس کی ایک کاپی وی پی کے ذریعے انھیں آکسفورڈ بھیج دی جائے۔ "انگارے" کئی مصنفین کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو ترقی پسند کہلاتے تھے۔ اس مجموعے میں جہاں جہاں مذہب اور خدا کا مذاق اڑایا گیا تھا ڈیوہرسٹ صاحب نے وہاں لال پنسل سے حاشیوں میں لکیریں کھینچی تھیں۔ "انگارے" کے کچھ حصے مجھے سنا کر ڈیوہرسٹ صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے:

"مجھے بڑی حیرت ہے کہ تمھارے شہر میں ایسی کتابیں چھپتی ہیں"۔ میں نے جواب دیا کہ جہاں صبح کو روشنی ہوتی ہے وہاں شام کو اندھیرا بھی ہو جاتا ہے اور موقع غنیمت جان کر میں نے کہا کہ آپ اپنے جذبات کا اظہار نظم میں کیوں نہیں کرتے۔ میں نے انھیں ہندوستانی سبھا کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی جو ۱۵ر جون ۱۹۳۳ء کی شب کو منعقد ہونے والا تھا۔ ڈیوہرسٹ صاحب نے مشاعرے میں شرکت کا وعدہ کیا اور اب مجھے موقع مل گیا کہ ان سے اس مشاعرے میں کچھ پڑھنے کا بھی وعدہ لے لوں۔ ڈیوہرسٹ صاحب نے کہا کہ انھوں نے اس وقت تک کوئی شعر نہیں کہا لیکن میرے اصرار پر انھوں نے مشاعرے کے لیے مصرعہ طرح پر اشعار کہنے کا وعدہ کر لیا۔ مصرعہ طرح تھا۔ "کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں"، ان کی نظم کا روئے سخن ان ہندوستانی آئی۔ سی۔ ایس پروبیشنرز کی جانب تھا جو اپنی امیدواری کی مدت ختم کر کے ہندوستان واپس جا رہے تھے۔ ملاحظہ ہو ؎

کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں — کسی کی بات سے مجھ کو کچھ انتشار نہیں
اسی زمانے میں آپ اس عظیم مدرسے سے — روانہ ہوں گے زیادہ کچھ انتظار نہیں
معاف کیجیے اگر کچھ نصیحتیں کر دوں — عمل کرو نہ کرو اس پہ اختیار نہیں
سب اپنے مذہب و تہذیب پر رہیں قایم — کہ نقلِ غیر میں اپنا کچھ افتخار نہیں
وطن پہنچ کے بھی اپنی زبان اور آداب — نہ ترک ہوں نہ یہ سمجھیں کہ استوار نہیں
"نہ گھر نہ گھاٹ کا ہے" یہ کہیں گے سب ہنس کر — یہ ہے عجائبِ خلقت کچھ اعتبار نہیں
وطن کا شعلۂ آتش ہمیشہ دل میں جلے — نہ لکھنؤ کے "انگارے" جو پائدار نہیں

زبانِ اردو کا مدت سے میں ثنا خواں ہوں
یہ صدق دل سے میں کہتا ہوں اشتہار نہیں

www.taemeernews.com

اس مشاعرے میں چھ شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے اس مشاعرے میں یہ غزل پڑھی تھی ؎

کسی کو کیا کہیں جب دل پہ اختیار نہیں — کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں
ہمارے بس کی نگاہِ امیدوار نہیں — تڑپ کے پھر تجھے دیکھیں گے اختیار نہیں
پھر آج کیوں مجھے نیچی نظر سے تکتے تھے — تمھیں تو میری محبت کا اعتبار نہیں
نظر کے ساتھ بدلتی ہے دل کی کیفیت — حیات و موت کا قصہ کچھ ایک بار نہیں
یہیں پہ ہوگی کہیں جلوہ گاہِ یارِ ندیم — یہی ہے ایک وہ منزل جہاں غبار نہیں
نگاہِ یار کی افسوں طرازیاں دیکھو — قصور کیا ہے اگر دل پہ اختیار نہیں
وہی جو چھین کے صبر و قرار بیٹھے ہیں — وہ پوچھتے ہیں کہ کیوں آپ کو قرار نہیں

برس رہی ہیں گھٹائیں چھلک رہی ہے شراب
اٹھاؤ جام، ٹھہرنے کی یہ بہار نہیں

ڈیوہرسٹ صاحب کئی برس یو پی کے مختلف اضلاع میں سیشن جج رہے۔ انھوں نے جج کے دور میں اپنے اجلاس کی کارروائی کے لیے یہ حکم جاری کیا تھا کہ ان کی عدالت میں ہندوستانی وکیل، موکل اور گواہ اردو میں بیان دیں۔ وہ خود انگریزی میں کارروائی قلم بند کرتے تھے۔ ایک ہندوستانی بیرسٹر صاحب نے جو انگریزی کے نشے میں چور تھے اردو میں بحث کرنے سے انکار کیا اور ڈیوہرسٹ صاحب سے یہ سوال کیا کہ جب انگریزی اور اردو دونوں عدالت کی زبانیں ہیں تو آپ کیوں اصرار کرتے ہیں کہ وکیل اردو ہی بولے۔ ڈیوہرسٹ صاحب نے جواب دیا "آپ کی مادری زبان اردو ہے اور اکتسابی زبان انگریزی۔ میری مادری زبان انگریزی ہے اور اکتسابی زبان اردو۔ معاف کیجیے گا، آپ کی انگریزی کا تلفظ میرے کانوں پر اتنا ہی گراں گزرتا ہے جتنا کہ میری اردو کا تلفظ آپ کے کانوں پر۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اپنے اجلاس کے لیے یہ طریقۂ کار متعین کیا ہے کہ ہم سب اپنی اپنی مادری زبانوں میں گفتگو کریں۔

ہندوستانی سبھا آکسفورڈ کا سالانہ مشاعرہ جب جون ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوا تو ڈیوہرسٹ صاحب نے یہ غزل پڑھی ؎

حسنِ یوسف کو سرِ بازار رسوا کیجیے — اپنی حالت کو سراسر زیر و بالا کیجیے
میں جو کرتا ہوں نصیحت اس کی وقعت کچھ نہ ہو — خودستائی اور تکبر اپنا شیوا کیجیے
دین اور دنیا کو میں نے ہر طرح سے کھو دیا — اب نہ مجھ سے اور الفت کا تقاضا کیجیے
اب جدائی کا زمانہ سامنے آیا طویل — اس میں ہرگز میری باتوں کو نہ پسپا کیجیے

میں نے جرأت سے تخلص اپنا ثاقب کرلیا
اسمِ ثاقب کو مساوی بامسمّیٰ کیجیے

میں نے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ چھوڑا۔ ڈیوہرسٹ صاحب سے چند دنوں تک خط و کتابت رہی۔ آخری خط میں انھوں نے لکھا کہ تمھارے آکسفورڈ چھوڑنے کے بعد میں نے شاعری کو خیرباد کہہ دیا۔

www.taemeernews.com

ہندوستانی سبھا کی ماہانہ نشست جنوری ۱۹۳۳ء میں میں نے مرزا یگانہ چنگیزی پر ایک مضمون پڑھا تھا، یہ اس سلسلے کی کڑی تھی جس میں مقررا پنے دور کے پسندیدہ شاعروں پر مضامین پڑھا کرتے تھے، میں نے اپنے مضمون میں مرزا یگانہ کے منفرد اسٹائل اور فکرانگیز مضامین کا ذکر کیا اور اُن کے منتخب اشعار سنائے جن میں سے چند یہ تھے ؎

سہو وخطا ودیعتِ فطرت سہی مگر — سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو
ہر ایک ذرّے سے آتی ہے بوئے زندہ دلی — نہ جانے خاک ہے اپنی کس آستانے کی
ترکِ لذتِ دنیا کیجئے تو کس دل سے — ذوقِ پارسائی کیا فیضِ تنگ دستی ہے
اُسی نے خاک کیا تھا اُسی نے پاک کیا — خوشا نصیب جو پالے پڑے محبت کے
فقط دل کی بدولت گرم ہے پہلوئے جاں ورنہ — جسد میں روح اک دیوانۂ تنہانشیں ہوتی
یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں — یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھاکر — تو بندگانِ ضرورت کا آفریدہ سہی
دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

لندن

مشاعروں سے اردو ادب کی ترویج ہوتی ہے اور عوامی مشاعروں سے اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے، میں نے لکھنؤ میں اپنی طالب علمی کے دور میں کئی کوی سمیلن میں بھی شرکت کی مگر، ؏

وہ بات کہاں تھی مشاعروں جیسی

جون ۱۹۵۱ء میں جب میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ہائیڈ پارک اُورپیٹرز کارنر میں گھوم رہا تھا تو ایک مقرر پر نظر پڑی جو اکیلے سننے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک مسودہ تھا۔ لیکن کوئی ان کی جانب متوجہ نہ ہو رہا تھا، مجھے آتش کا شعر یاد آیا ؎

حسن بے پردہ ہے عاشق کا پتہ ملتا نہیں
فیض بخشی پر کریم آیا گدا ملتا نہیں

ہم دونوں مقرر کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہو فرمائیے ہم ہمہ گوش ہیں۔ انگریز مقرر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انھوں نے کہا، بہت بہت شکریہ۔ میں شاعر ہوں اور میں نے ایک نئی نظم کہی ہے لیکن انگلستان میں اب شعر کی کوئی قدر نہیں رہی۔ یہ سارے مقرر جو گلے پھاڑ رہے ہیں پالیٹکس کی علت میں گرفتار ہیں۔ ان کی تقریروں میں نفرت ہے میری نظموں میں محبت ہے، ؏

لیکن کوئی خواہاں نہیں اس جنسِ گراں کا

ہم دونوں بیس منٹ تک ان کی نظم سنتے رہے اور جب انھیں داد دی تو وہ پوچھنے لگے کہ آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟

www.taemeernews.com

ہم نے کہا کہ ہم پاکستانی ہیں، ہماری قومی زبان اردو ہے اور ہمارے ملک میں شعر سننے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہم نے اپنے مشاعروں کا ذکر کیا جہاں لوگ رات رات بھر جاگ کر دادِ سخن دیتے ہیں۔ مقرر کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ کہنے لگے "کاش میں پاکستان میں ہوتا، کاش میں اردو میں شعر کہہ سکتا!"

اردو کے معاملے میں ۱۹۷۶ء کا انگلستان ۱۹۵۱ء کے انگلستان سے بالکل مختلف ہے۔ اب وہاں اردو بولنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی ہے، اب وہاں پروفیسر رالف رسل جیسے اردو کے قدرداں پیدا ہو گئے ہیں،

انگلستان کی کنزرویٹو پارٹی کے کئی ممبر انگلستان میں پاکستانیوں، ہندوستانیوں اور ویسٹ انڈین کی بڑھتی ہوئی آبادی کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ عجب لطف کی بات ہے کہ ان احتجاج کرنے والوں میں جو صاحب سب سے زیادہ پیش پیش ہیں وہ مسٹر ایناک پاول Enech Powel ہیں جو نہایت ہی اچھی اردو بولتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ فوج میں تھے اور لکھنؤ میں متعین تھے وہیں سے انھیں اردو کا شوق پیدا ہوا جسے انھوں نے جاری رکھا۔ برطانیہ میں نوواردوں کی آمد پر ایک مرتبہ انھوں نے بہت سخت بیان دیا جس کے جواب میں چند پاکستانیوں نے ان کے خلاف ایک بڑا پوسٹر نکالا جس میں اینک پاول صاحب کو سخت سست کہا گیا تھا۔ ایک پاکستانی دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ اس پوسٹر کی ایک ہزار کاپیاں لے کر وہ پاول صاحب کے گھر گئے۔ انھوں نے گھنٹی بجائی، پاول صاحب کی میڈ نے دروازہ کھولا اور کہا کہ پاول صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ میرے دوست نے موقع غنیمت جان کر ایک ہزار پوسٹر گیلری میں پھیلا دیے۔ دو گھنٹے کے بعد پاول صاحب کا ٹیلیفون آیا اور انھوں نے نہایت شستہ اردو میں میرے دوست سے کہا: "جناب مجھے افسوس ہے کہ جب آپ آئے تو میں آپ کے خیر مقدم کے لیے اپنے گھر پر نہ تھا۔ آپ نے ایک ہزار پوسٹر میرے گھر میں چھوڑ کر اپنے مشن کے ساتھ ناانصافی کی، میرے لیے ایک ہی پوسٹر کافی تھا، آپ باقی ۹۹۹ پوسٹر لے جائیں اور انھیں دوسروں میں تقسیم کریں۔"

حال ہی میں مجھے ڈاکٹر فاخر حسین نے انگریزی کی ایک کتاب بھیجی ہے جس کا عنوان ہے "Lucknow the last phase of oriental culture"۔ یہ کتاب مولوی عبدالحلیم شرر کی اس کتاب کا ترجمہ ہے جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کا عنوان تھا "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ"۔ ڈاکٹر فاخر حسین نے جو سینٹ میریز کالج لندن میں سینیئر لکچرار ہیں، مولوی شرر کی کتاب کا ترجمہ کرنل ہارکورٹ کی مدد سے کیا ہے۔ کرنل ہارکورٹ بھی اینک پاول کی طرح لکھنؤ میں اپنی فوج کی نوکری کے سلسلے میں متعین تھے اور ان کو بھی وہیں سے اردو کا شوق پیدا ہوا جو اس نئی کتاب کی تکمیل کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ افسوس ہے کہ اس کتاب کے مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا، خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔

وہ انگریز جن کا سابقہ برصغیر کے لوگوں سے پڑتا ہے اردو کے سبق پڑھ رہے ہیں۔ حال ہی میں انگلستان کے شہرۂ آفاق اخبار لندن ٹائمز نے اردو کے جنگ انٹرنیشنل (لندن) کا تذکرہ تحسین و آفریں کے ساتھ کیا۔ مجھے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک ہر سال وزارتِ صحت و محنت کے سکریٹری کی حیثیت سے لندن جانے کا اتفاق ہوا تاکہ وہاں کے پاکستانی باشندوں کے مسایل کا جائزہ لیا جائے۔ اور ان کے جائز مطالبات کو حکومتِ برطانیہ کے اربابِ حل و عقد تک پہنچایا جا سکے۔ میں جب لندن کی ادبی تقریبوں اور مشاعروں میں شرکت کرتا تھا تو اُس وقت بڑی لذت محسوس کرتا تھا۔ جب سنتا تھا کہ اب جناب میر تشیر لندنی اپنا کلام سنائیں گے، اب جناب حمار گلاسکوی اپنی غزل عطا کریں گے، اب جناب بہار بریڈ فرڈی اپنی نظم سنائیں گے۔ انگلستان میں اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر علامہ اقبال کا یہ شعر ایک لفظ کے تصرف کے ساتھ اردو کی زبانی دہرایا جا سکتا ہے ؎

گئے دن کہ تنہا تھی میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

www.taemeernews.com

ابنِ انشا

تاریخ انگلستان جدید

"اذکار" کے دیرینہ رفیق ابنِ انشا ایک اچھوتے شاعر اور منفرد طنز نگار تھے۔ اُن کے طنز و ظرافت میں وہ لطافت اور معنویت موجود ہے جو انھیں اردو ادب کے ممتاز و معتبر طنز نگاروں میں مستقل حیثیت عطا کرتی ہے۔ اگرچہ اُن کے کالم اخبارات میں شایع ہوتے تھے۔ پھر بھی اُن کی تحریر میں ادبی شکوہ ملتا ہے ——

۱۹۷۷ء کے دوران وہ انگلستان میں مقیم تھے اور وہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔ دورانِ قیام انھوں نے روزنامہ "جنگ" کے لیے "آغاز تاریخ انگلستان" کے عنوان سے "جدید اردو ریڈر۔ حصہ دوم" لکھنے کی ابتدا کی۔ دوسری قسط میں اس کا عنوان انھوں نے "تاریخ انگلستان جدید" رکھا ——

افسوس کہ ان کی ناوقت موت کے سبب برطانیہ سے متعلق اُن کی یہ معرکہ آرا کتاب تشنۂ تکمیل رہ گئی۔ ہم اُن کے قیام انگلستان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے دو ابتدائی قسطیں بہ شکریہ "جنگ" پیش کر رہے ہیں ——

—————— صہبا

عزیز طالب علمو! — آؤ آج تاریخ انگلستان کا مطالعہ کریں ——

—— انگلستان کی تاریخ کا کچھ مطالعہ ہم نے ہائی اسکول کے دنوں میں بھی کیا تھا۔ لیکن جلد ہی بیزار ہو گئے تھے، کیونکہ اس میں اتنے سارے ایڈورڈ اور جارج اور ہنری آتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جیمس اور چارلس اور رچرڈ اور جان وغیرہ۔ اس پر مستزاد اور ملکائیں اس کے علاوہ۔ انگریزوں کو بادشاہ تو ملتے تھے لیکن ان کے نام نہیں ملتے تھے۔ ہمارے ہاں ہم نامی کا چکر زیادہ نہیں۔ یوں خاندانِ مغلیہ کے آخری دنوں میں ایک آدھ اکبر شاہ یا اکبر ثانی ہوا۔ یا ایک دو شاہ عالم یکے بعد دیگرے ہوئے۔ ورنہ بادشاہ کیسا بھی ہو، نام اس کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ اور فصیح و بلیغ لائے تھے۔ فرخ سیر، رفیع الدولہ، رفیع الدرجات وغیرہ۔ انگلستان کے بادشاہوں میں بہت سے جارج ایڈورڈ اور ہنری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ کارنامے بیان کرنے لگیں تو وہ کئے ہوتے

www.taemeernews.com

میں کسی داڑھی والے نے اور پکڑا جاتا ہے مونچھوں والا۔ آپ نے انگلستان کے بادشاہوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ ان میں کئی داڑھیوں والے تھے۔ کئی محض مونچھوں والے اور بعض صرف سر پہ پٹے رکھتے تھے، وہ بھی ہمیشہ اصلی نہیں، بلکہ اکثر مصنوعی۔ ان میں ہنری ہشتم کی آٹھ بیویاں تھیں۔ لیکن اس سے یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ اس وجہ سے وہ ہشتم کہلاتا تھا اور ہنری ہفتم کی سات اور ہنری ششم کی چھ زوجائیں ہوں گی۔ بعضوں کو تو ایک بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ ایڈورڈ ہشتم ہی کو لیجیے بیچارے کو ایک بیوی کرنے کے لیے اپنا تخت تک چھوڑنا پڑا۔ وہ بھی امریکن اور پہلے سے بیاہی، تکاحی۔ ہمارے اور انگلستان کے بادشاہوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انگلستان کا ایک ایک بادشاہ بیک وقت کئی کئی جگہ دفن ہے، سر کہیں، دھڑ کہیں، کان کہیں، ناک کہیں، دل کہیں، کلیجہ کہیں۔ مقصود یہ تھا کہ مختلف جگہ ان کی مغفرت کی دعائیں کی جاسکیں۔ ان میں سے بعض کے اعمال بھی ایسے تھے کہ ایک آدھ جگہ مغفرت کی دعا کافی نہ پڑتی۔

تاریخ انگلستان میں ہمیں زیادہ گہرا جانے کی ضرورت نہیں۔ خود انگریز بھی زیادہ گہرا نہیں جاتے۔ بلکہ کوئی بھی قوم اتنا گہرا نہیں جاتی جتنا ہم جاتے ہیں کہ بعض اوقات باہر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کوئی کمنڈ ا پھینک کر نکالے تو نکلے۔ دراصل کئی صدیاں تو اس ملک میں طوائف الملوکی کی رہی۔ یہ نہیں کہ طوائفوں کا راج تھا، بلکہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا معاملہ تھا۔ بھینسیں اس ملک میں زیادہ نہ تھیں۔ اب بھی نہیں۔ لیکن لاٹھیاں خاصی تھیں۔ یا پھر شمالی یورپ کے والی کنگ، سر پہ سینگ لگا کر (تاکہ کوئی ان کو گدھا نہ سمجھے) اور ہاتھوں میں کھانڈے لے کر ہر طرف خون خرابہ کرتے پھرتے تھے۔ ان دنوں یہاں کوئی ایمگ پاول نہ ہوتا تھا۔ نیشنل فرنٹ کا زور تھا، لہٰذا نہ صرف باہر سے کام یا مزدوری یا لڑائی کے لیے آنے والوں پہ کوئی پابندی نہ تھی۔ بلکہ یہاں کے لوگ انہی میں سے بعض کو بڑے ذوق و شوق سے بادشاہ بناتے تھے اور اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے انگلستان میں صحیح النسل انگریز بادشاہ کوئی بھی نہیں ہوا۔ یا تو ڈین یعنی اہل ڈنمارک نے راج کیا یا نارمن یعنی نارمنڈی کے فرانسیسی آئے یا جرمنوں نے حکمرانی کی۔ انگلستان کا موجودہ خاندان بھی جرمن نسل کا ہے۔ انگلستان والے حسب نسب کے معاملے میں بھی عموماً سیر چشمی، وسیع الظرفی اور درگزر سے کام لیتے تھے۔ ان کے کئی بادشاہ تو صاف حرامی تھے جس کی تصدیق مورخوں نے بھی کی ہے اور خود ان کے والدین کا بھی یہی بیان تھا۔ مثلاً ولیم فاتح ہیرالڈ اول۔ بعض ان میں ماں کی طرف سے حرامی تھے۔ بعض باپ کی طرف سے اور بعض نجیب الطرفین۔ یعنی دونوں طرف سے حرامی تھے۔ جو لوگ حسب نسب کے لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھے وہ اپنے عمل اور کردار سے اپنے کو ایسا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس میں بالعموم کامیاب رہتے تھے۔

انگلستان کی تاریخ میں سب سے پرانا نام حکمرانوں میں ملکہ بودیشیا کا ملتا ہے۔ یہ پہلی صدی عیسوی کی بات ہے۔ یہ بڑی لحیم شحیم خونخوار ملکہ تھیں۔ ان کے رتھ کے پہیوں میں تیز دھار کے چاقو کے پھل لگے رہتے تھے۔ جہاں سے رتھ گزرتا تھا لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتا جاتا تھا۔ انگلستان میں اور بھی کئی ملکائیں ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر کا انتقال بستر میں ہوا۔ بعض کا اپنے بستر میں، بعض کا کسی اور کے بستر میں۔ ایک دو کا سر قلم کرنا پڑا۔ لیکن ملکہ بودیشیا چونکہ میگنا کارٹا سے بہت پہلے پیدا ہوئی تھیں اور بااختیار ملکہ ہونے کے ساتھ مرد میدان بھی تھیں۔ اس لیے جب ان کو رومنوں کے مقابلے میں شکست ہوئی تو انھوں نے زہر کھا کر اپنی جان لے لی۔ اتنا زہر ان دنوں میسر نہ تھا کہ کسی اور کی تواضع اس سے کرسکتیں۔ ایسی غیرت مند ملکہ پھر انگلستان کی

www.taemeernews.com

تاریخ ہیں کوئی نہ ہوئی

آپ نے کنگ آرتھر کا نام بھی سنا ہوگا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہوا ہی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں ضرور ہوا ہوگا۔ اس کی راؤنڈ ٹیبل یعنی گول میز مشہور ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس مرحوم صدر ایوب نے ایجاد کی تھی یا اب نے چالیس پچاس برس پہلے انگریزوں نے سب سے پہلے گول میز بچھائی تھی اور اس پر سر آغا خان اور ڈاکٹر سر محمد اقبال وغیرہ کو بٹھایا تھا وہ غلطی پر ہیں اور تاریخ انگلستان سے بے بہرہ ہیں۔ سب سے پہلی گول میز کنگ آرتھر نے وہ خود ہوا ہو یا نہ ہوا ہو بنوائی تھی اور اس کے گرد اپنے سرداروں سرلانسیلاٹ وغیرہ کو بٹھاتا تھا اور ان سے مذاکرات وغیرہ کرتا تھا۔ سر کا لفظ ہمارے خیال میں سرداری سے نکلا ہے۔ سرداروں میں سے جو لوگ بغاوت کرکے سوئے دار چلے جاتے تھے وہ کیفر کردار کو پہنچ جاتے تھے۔ جو سمجھدار تھے اور کوئے یار کی فضا کو ترجیح دیتے تھے وہ سر کا خطاب پاتے تھے۔ چنانچہ سرلانسیلاٹ سے لے کر سر چھوٹو رام تک یہ سلسلہ بخوبی چلا۔ ہاں خان بہادر اور رائے بہادر وغیرہ تمہارے زمانے میں ایجاد ہوئے لیکن وہ بھی انگریز ہی ایجاد کر گئے۔ انگریزوں کی واپسی پر یہ ایجادیں اپنے موجدوں کے ساتھ انگلستان آنے پر مصر تھیں لیکن انگریزوں نے اس معاملے میں تھوڑی بے مروتی بلکہ طوطا چشمی سے کام لیا۔ سروں یعنی سرداروں کے علاوہ کنگ آرتھر کے زمانے کی ایک مشہور شخصیت مرلن صاحب بھی تھے۔ یہ ان کے دربار کے جادوگر تھے اور ہمیشہ الٹی مت دیتے تھے۔ اسی زمانے سے یہ رواج ہے کہ ہر بادشاہ کے ساتھ ایک مرلن ضرور لگا رہتا ہے جو بادشاہ پر ایسا جادو کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ جو کچھ کرتا ہے آنکھیں بند کرکے کرتا ہے۔ حتیٰ کہ قعر مذلت میں یا کسی اور گڑھے میں جا گرتا ہے۔ مثالیں بہت ہیں لیکن ہمارے قارئین خود تلاش کریں آخر ان کا بھی تو کچھ فرض ہے۔

(۲)

گول میز والے کنگ آرتھر کے بعد انگلستان میں دوسرا مشہور بادشاہ الفریڈ ہوا ہے۔ اس کی میز کس شکل کی تھی، یہ تاریخوں میں مذکور نہیں۔ اسے الفریڈ اعظم بھی کہتے ہیں جس طرح سکندر اعظم کو سکندر اعظم، اکبر اعظم کو اکبر اعظم اور جنرل اعظم خاں کو ---- تیران کا معاملہ دوسرا ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کو تحقیق کا موقع ملتا تو یہی بتاتے کہ الفریڈ اصل میں الفرید ہے اور یہ خاندان بنو امیہ کا کوئی شہزادہ تھا جو شوقِ تبلیغ میں تلوار مارتا ہوا انگلستان جا نکلا تھا۔ اتفاق سے اس بادشاہ کے شوقِ تبلیغ کا تاریخ میں ذکر ملتا بھی ہے۔ جب اس نے ڈینش سردار گوتھرم کی شورش کو رفع کیا اور وہ پکڑا آیا تو الفریڈ نے اس کی گردن پر تلوار رکھ کر کہا کہ برضا و رغبت دینِ مسیحی کی حقانیت کا اقرار کرو ورنہ ابھی بھٹا سا سر اڑاتا ہوں۔ چنانچہ وہ صدق دل سے بلا جبر و اکراہ مسیحی ہو گیا اور خداوند خدا کی مناجات گانے لگا۔ اسے مزید پکا کرنے کے لیے شاہ ممدوح نے بپتسمہ کے بہانے اُسے سمندر کے برفانی پانی میں غوطہ بھی دیا۔ بعد ازاں الفریڈ یعنی ہمارا شہزادہ الفرید اموی اسے مسلمان بھی ضرور کرتا جو عیسائیت کے بعد کا قدرتی مرحلہ ہے۔ (کسی کو ایک ہی ہلے میں مسلمان نہیں بنا لینا چاہیے۔ ورنہ گرم گرم سرد ہو جاتا ہے) اگر گوتھرم کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور وہ بپتسمہ کی وجہ سے نمونیے میں مبتلا ہو کر قبل از وقت خدا کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گیا ہوتا۔ یاد رہے یہ ہمارے سید ہاشمی مرحوم ہی تھے جنھوں نے کراچی کے بارے میں اس گمان کی تردید کی تھی کہ اسے کلاچی کے نام کے ایک مچھیرے نے اٹھارویں صدی آباد کیا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ بھلا مچھیرے بھی شہر بسایا کرتے ہیں؟ اسے ضرور محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے قریشیوں نے آباد کیا ہوگا اور قراشی نام

www.taemeernews.com

رکھا ہوگا جو بگڑ کر کراچی ہوگیا۔ اتفاق سے صدر ایوب قریشیوں سے بہت گھبراتے تھے، انھیں اس تحقیق کا معلوم ہوا تو اپنا پایۂ تخت کراچی سے اٹھا کر راولپنڈی لے گئے جس کے معرب کیے جانے کا امکان بہت کم تھا ــــــ

الفریڈ کے زمانے میں لوگ تعلیم کے مضر اثرات سے واقف تھے لہٰذا بچوں خصوصاً شرفا اور رؤسا اور والیانِ مملکت کے بچوں کو اس سے حتی الوسع دور رکھا جاتا تھا۔ الفریڈ کے والد ماجد کنگ ایتھل ولف نے بھی اس کی کما حقہٗ احتیاط کی۔ چنانچہ الفریڈ بارہ سال کی عمر تک خواندگی سے مامون اور محفوظ رہا۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اس کی ماں دوسری قسم کی تھی۔ اُس نے ایک روز چاروں بھائیوں کو اکٹھا کر کے ان کو کہانیوں کی ایک مصوّر قلمی کتاب پڑھ کر سنائی اور کہا تم چاروں میں سے جو پڑھنا سیکھے گا یہ کتاب اسے انعام میں ملے گی۔ باقی تین بھائی سمجھدار تھے لیکن الفریڈ لالچ میں آ گیا۔ اس نے صرف لاطینی زبان ہی نہ سیکھی، بلکہ اپنی مادری زبان انگریزی بھی پڑھی۔ الفریڈ کے تین بھائیوں کا بعد میں کیا ہوا اس کا ذکر انگریزی تاریخوں میں بہت آیا لہٰذا قارئین کرام کو اپنے خاندانِ مغلیہ کے کسی بھی بادشاہ کے بھائیوں کا حال پڑھ لینا چاہیے ــــــ

الفریڈ نے اپنی زندگی میں بہت سی لڑائیاں لڑیں اور بہت سے شورہ پُشت باغیوں کی سرکوبی کی۔ یاد رہے کہ گلگھڑ کسی نہ کسی نام سے ہر ملک میں ہوتے ہیں جب سب دشمن مطیع ہو گئے۔ کوئی نہ رہا جسے زک دے سکتا اور تیغ کے گھاٹ اُتار سکتا تو اُس نے لوگوں کو قلم کے گھاٹ اُتارنے کا منصوبہ بنایا اور لاطینی کی کچھ آسان آسان کتابیں لے کر ان کا مشکل انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن اسے پبلشر کوئی نہ ملا حالانکہ آج کا زمانہ ہوتا تو نہ صرف مقامی پبلشر بلکہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس والے بھی دوڑے دوڑے آتے اور اس کتاب کے افتتاحی جلسے نیشنل سنٹر میں ہوتے اور ان کتابوں کا بہت سی زبانوں میں حتیٰ کہ واپس لاطینی میں بھی ترجمہ کیا جاتا۔ کوئی پبلشر ملا بھی تو اس نے عذر کیا کہ جہاں پناہ ہم کتابیں کیسے چھاپیں۔ ابھی تو کیکسٹن نے چھاپہ خانہ ہی ایجاد نہیں کیا۔ کہتا ہے پندرھویں صدی کے آخر میں کروں گا۔ آپ چار صدیاں انتظار کرنا چاہیں تو مسودے چھوڑ جائیں، اس میں بھی مصلحتِ خداوندی تھی۔ چھاپہ خانہ ہوتا تو ساری رعایا کو ناحق یہ کتابیں پڑھنی پڑتیں۔ انگلستان میں اسکول بھی سب سے پہلے الفریڈ ہی نے قایم کیے۔ لیکن زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ انھیں نیشنلائز بھی کر سکتا ــــــ

الفریڈ کا سب سے بڑا کارنامہ جو کتابوں میں آیا ہے، یہ ہے کہ اس نے ایک بڑھیا کے کیک جلا دیے تھے۔ کیک تو کیا ہوں گے۔ روٹیاں یا کلچے ہوں گے۔ ہوا یوں کہ بادشاہت کے ابتدائی دنوں میں دشمنوں نے ایکا کر کے اس کی افواج قاہرہ کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا اور خود اس کی جان کے درپے ہوئے۔ ہرچند کہ ہمارا ممدوح بہت نڈر اور بے خوف تھا، تاہم چوٹ پیٹ کے ڈر سے بھیس بدل کر جنگل میں ایک دہقان کے جھونپڑے میں جا چھپا۔ دہقان کی بڑھیا نے اسے دلاسا دیا اور کہا۔ بیٹے۔ میں روٹیاں توے پر ڈالتی ہوں تو ذرا انھیں سینک دے۔ لیکن آنچ کا دھیان رکھنا اور پلٹتے رہنا۔ اب پکانا ریندھنا کوئی بادشاہی تو ہے نہیں کہ تاج سر پر رکھ لیا اور لباس فاخرہ پہن کر تخت پر فروکش ہو گئے اور الٹے سیدھے حکم دینے لگے یا آرڈی ننس نکالنے لگے، اس کے لیے تجربہ اور آنچ کی پہچان چاہیے۔ ہمارے بادشاہ سلامت اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے رہے۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ رعایا کی فکر میں منہمک تھے، لیکن یہ دریافت نہیں ہو سکا

www.taemeernews.com

کہ مورخوں کو اس کا کیسے علم ہوا۔ بہرحال روٹیاں جل گئیں اور اس نیک بی بی نے اسے بہت سخت سُست کہا کہ بڑا بادشاہ بنا پھرتا ہے۔ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ اس کے بعد سے یہ ڈگر بن گئی کہ جو بادشاہ آیا اُس نے رعایا کی روٹی ضرور خراب کی۔ یا تو جلا دی یا کچی چھوڑ دی یا اس میں کنکر ڈال دیے، یا پھر سیدھے سیدھے چھین کے اپنے مال خانے میں بھجوا دی کہ تم لوگ اسے کیا کرو گے۔ بھلا روٹی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اس کے کھانے سے نفخ ہوتا ہے، کیا ہمارے وطنِ عزیز میں پتھروں کی کمی ہے۔ ایک ایک اٹھا کر پیٹ پر باندھ لو۔ کم پڑ جائیں گے تو باہر سے منگا لیں گے ——

الفریڈ نے دشمنوں کی سرکوبی کر لی اور لاطینی کتابوں کو انگریزی میں ترجمہ کر لیا تو سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کرے۔ اپنا خالی وقت کیسے بتائے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کے لیے منصفانہ قانون بنانے شروع کیے۔ اس زمانے میں پارلیمنٹ وغیرہ کا ٹنٹا نہیں تھا نہ لوگ مقدمے لے کر عدالتوں میں دوڑے جاتے تھے کہ فلاں قانون 'قانونی' ہے یا غیر قانونی ہے۔ نہ بنیادی حقوق کا کھڑاگ تھا۔ جب بادشاہ کو سارے حقوق حاصل ہیں تو رعایا کو فرداً فرداً حقوق لینے کی کیا ضرورت ہے۔ الفریڈ اعظم کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چوروں اور ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا۔ چنانچہ روایت ہے کہ لوگ سونا اُچھالتے چلے جاتے تھے، کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ کچھ ایمانداری کی وجہ سے، کچھ حکومت کے خوف سے۔ بعض لوگوں نے تو سونا اُچھالنا اپنا کُل وقتی شغل بھی بنا لیا تھا۔ بعد میں سونے کی قلت ہو گئی تو لوگ یہ کام ٹوپیوں اور پگڑیوں سے لینے لگے۔ وہ بھی دوسروں کی ٹوپیوں اور پگڑیوں سے۔ الفریڈ نے وقت کو ناپنے کے لیے موم بتیاں ایجاد کیں لیکن ہوا چلنے سے بعض اوقات بتی جلد بجھ جاتی تھی اور وقت میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ لہذا بادشاہ نے موم بتیوں کے گرد کھڑکیاں لگا کر لالٹین ایجاد کی۔ سوچنے کی بات ہے کہ شاہ الفریڈ نہ ہوتا تو صدر ایوب کے زمانے میں اپوزیشن کیا کرتی۔ اسے نشستیں تو ایک طرف انتخابی نشان تک دستیاب نہ ہوتا۔ مشہور ہے کہ شاہ الفریڈ کی اپوزیشن نے بھی لالٹین کا نشان مانگا تھا، لیکن شاہ نے اس کو دھتا بتایا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ شاہ الفریڈ اعظم کی تمنا تھی کہ انگلستان خوشحال و خوش حال رہے۔ لیکن انسان کی یہ خواہش تھوڑا ہی پوری ہوتی ہے! ——

الفریڈ اعظم کو مذہب سے بہت شغف تھا۔ اس نے جابجا خانقاہیں بنوائیں، تاکہ لوگ وہاں جائیں اور راہب بن کر اپنی زندگی خدا کی بندگی میں بسر کریں لیکن انگریزوں کا رجحان اس زمانے میں بھی دکانداری کی طرف زیادہ اور رہبانیت کی طرف کم تھا۔ لہذا الفریڈ کو فرانس سے راہب منگا کر ان خانقاہوں میں بسانے پڑے۔ ہمارے ہاں بھی ایمان کی حرارت والے اپنی نیک، اور بعض اوقات غیر نیک کمائی سے مسجدیں تو بنا دیتے ہیں۔ لیکن نمازیوں کا بندوبست نہیں کر پاتے چنانچہ بعض علاقوں میں ایک ایک نمازی کے حصے میں تین تین مسجدیں آجاتی ہیں ——

الفریڈ اعظم نے ایک نامعلوم مرض سے سنہ ۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ ابھی میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہ کی تھی، ورنہ اس کے اتنے ٹسٹ ہوتے، اتنے ایکس رے ہوتے۔ اتنے مختلف ڈاکٹروں کے نسخوں پر اتنی جنرک اور غیر جنرک دوائیں اسے کھانی پڑتیں کہ دسویں صدی میں قدم رکھنے کی نوبت نہ آتی۔ نویں صدی کے آخر ہی میں علاج کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا۔ لوگوں کا مرنا، جیسا نوشتۂ قسمت کی بجائے نوشتۂ ڈاکٹر پر منحصر ہو جانا بہت بعد کی بات ہے ——

www.taemeernews.com

مختار زمن

انگلستان میں پاکستان

"اللہ میاں، بس ایک دفعہ لندن دکھا دیجیے۔ زیادہ نہیں، بس ایک دو دن کے لیے۔"

آپ کا خادم یہ دعا اُس وقت مانگا کرتا تھا جب کنگ ریڈر پڑھتا تھا جس میں داڑھی والے جارج پنجم اور تاج والی ملکہ میری کی تصویریں تھیں ـــــ پھر یہ ہوا کہ ایک دن چھوڑ، کوئی سات برس انگلستان میں گذارنے پڑے۔ اب دعا کی نوعیت بدل کر یہ ہو گئی۔ "بارالہا، بس اب خیریت سے پاکستان پہنچا دیجیے، گھر بہت یاد آ رہا ہے"۔ جب گھر پہنچ گئے تو حال یہ ہے کہ

"انگلینڈ" کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

(اس شعر کے بعد مرزا کے وہ اشعار جس میں کلکتے کے "بتانِ خود آرا" وغیرہ کا ذکر ہے آپ خود ہی پڑھ لیجیے۔ مجھے مزید گنہگار نہ کیجیے۔ جب کلکتے کا یہ حال تھا تو انگلینڈ میں کیا عالم ہوگا)

"انگریز" بھی پنج مزہ لفظ ہے۔ اس میں کھٹا، میٹھا، کڑوا، کسیلا، پھیکا ہر مزہ موجود ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس میں ہمیں ہر مزہ چکھایا گیا ہے۔ "ھپ" والا بھی اور "تھو" والا بھی۔ ہم نے ایک زمانے میں انگریز سے ہاتھ ملا کر ہاتھ بھی دھوئے اور بعد میں "انگریز کی ہیٹ" بھی کھائی۔ پہلے بہادر بنے اور دار پر چڑھے، پھر خان بہادر بن گئے۔ ایک ابتدائے عشق کی آگ تھی دوسری انتہا کی راکھ۔ پہلے انگریزی کو حرام سمجھا کیے، اب اسی انگریزی سے اردو کو حلال کرتے ہیں۔ وقت آیا تو انگریز کو انگریزی میں دھتکار کر گھر سے نکال باہر کیا، پھر انگریزی کو گلے لگا کر مزے سے سو گئے۔ اسے کہتے ہیں وقت وقت کی بات!

انگریز کے اثر سے بھی عجیب عجیب لوگ پیدا ہوئے۔ ایک سر سید تھے جو انگریزی نہیں سمجھتے تھے مگر انگریز کو خوب سمجھتے تھے۔ دوسرے اکبر جو انگریزی جانتے تھے اور انگریزیت سے لڑتے تھے۔ گو یہ بھی جانتے تھے کہ لڑائی برابر کی نہیں تھی۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ ـــ یا بعض کو امید ـــ تھی۔ طوفانی بہاؤ کے خلاف پیرتے پیرتے تھک کر شل ہو گئے۔

ہماری تہذیب، ادب اور سیاست پر انگریز نے جو اثرات پیدا کیے وہ محقق جانیں۔ لیکن اس کم ونبش دو صدیوں کے رابطے کا ایک نتیجہ ایسا بھی نکلا جس کا سان گمان نہ لارڈ میکالے کو تھا نہ میاں کالے کو۔ انگریز اپنے ہاتھوں میں بھی کھاتہ تھامے ہوئے آیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ عصائے حکومت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ ڈنڈا برسوں تک ہمارے سر پر اور دشمن انگریز کے گھر پر برستا رہا۔ پھر جو تقدیر نے پلٹا کھایا تو اقتدار کی کرسیوں سے گورے ہٹ گئے اور کالے آ گئے۔ لیکن یہ ایسے آفت کے پر کالے نکلے کہ دھارا

www.taemeernews.com

الٹا بہنے لگا جیسے دیکھیے، انگلستان چلاجارہا ہے۔ پہلے وہ ہمارے ملک سے کماتے تھے اب ہمارے سپوت انگلستان سے روزی پیدا کرتے ہیں۔ خزانے تو نہیں بھرتے لیکن دال روٹی سے خوش ہیں۔ یہ لوگ قابلِ عزت ہیں کہ پامردی کے ساتھ محنت کرکے کمائی کرتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے اُن سے معلوم ہوا کہ کم و بیش ایک لاکھ پاکستانی انگلستان میں بسے ہوئے ہیں۔ مانا کہ پاکستانی، ہندوستانی اور ویسٹ انڈین کالوں کی تعداد انگریزوں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن سمجھ لیجیے کہ یہ خال رُخِ یار کی طرح ہیں!

اب سے دور جب پاکستان پر حملہ ہوا، ملک ٹوٹا۔ ایک شام کو جو بنگالی سوئے تو پاکستانی سے بنگلہ دیشی بن گئے۔ اس لیے انگلستان میں بھی پاکستانیوں کی گنتی آدھی رہ گئی۔ پاکستان دولتِ مشترکہ سے نکلا۔ انگریز نے تارکینِ وطن پر پابندیاں لگانی شروع کیں، اور پابندیوں کے اطلاق کی تاریخ مقرر ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستانیوں نے دھڑا دھڑ اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کو انگلستان بلانا شروع کردیا اور پابندی کی تاریخ سے پہلے ہی خاندان کے خاندان وہاں پہنچنے شروع ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۶ء تک آتے آتے پاکستانیوں کی تعداد بڑھ کر دو ڈھائی لاکھ ہوگئی۔ خاندانی منصوبہ بندی اچھی چیز سہی، لیکن اول تو اس کا اطلاق ہمیشہ اپنے ملک میں ہوتا ہے۔ غیر ملک میں نہیں۔ دوسرے یوں بھی ہم، ماشاءاللہ کردار کے غازی ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں ع

بہتر نہیں دنیا میں کوئی چیز پسر سے

انگلستان میں پاکستانیوں کی اکثریت مزدور پیشہ ہے جو ملوں، فیکٹریوں اور دکانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب وہ اپنے جسم سے ذرا چھوٹا یا ذرا بڑا ریڈی میڈ سوٹ زیب تن کرکے ٹرانسسٹر لیے گھر آتے ہیں تو بڑے رعب سے اپنا پیشہ بتاتے ہیں۔ تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ وہ "شاپ منیجر" ہے تو سمجھ لیجیے کہ یا تو سیلزمین ہے، یا دکان میں سامان ڈھونے کا کام کرتا ہے۔ ہم سول سروس سے مراد وہ مخلوق لیتے ہیں جو انگریز کے دور میں اپنے کو خالق کائنات سے کچھ ہی کم تر سمجھا کرتی تھی، گو آہستہ آہستہ اب یہ نسل ناپید ہوتی جارہی ہے یا چولا بدل رہی ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنا پاکستانی بھائی آپ سے آکر یہ کہے کہ وہ برطانوی سول سروس میں ہے تو یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ وہ لندن شہر کا کمشنر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بقول سید محمد جعفری وہ محض انسان کا "رف ڈرافٹ" یعنی کلرک ہی ہو۔ وہاں چپراسی سے لے کر پرمننٹ انڈر سکریٹری تک سب سول سرونٹ کہلاتے ہیں ـــــ مگر اب پاکستانی ہر پیشے کی طرف توجہ کررہے ہیں۔ ڈاکٹر اور انجینیر بھی وہاں ہیں اور کاروباری بھی، جو چھوٹا موٹا بزنس اور دکان داری کرتے ہیں۔ پچھلے تین چار سال میں تو پاکستان کے "۲۲ بڑوں" میں سے بھی اکثر نے دفتر وہاں سجا لیے ہیں۔ مگر چھوٹے دکان داروں کا مرغوب پیشہ گوشت اور پرچون کی دکان کھولنا یا ریستوران چلانا ہے۔ بعض پاکستانی ڈاکٹروں وغیرہ کا معیار زندگی وہی ہے جو انگریز ڈاکٹروں اور انجنیروں کا۔

انگلستان میں ایک ہزار سے بھی زیادہ ریستوران ایسے نکلیں گے جہاں پاکستانی یا ہندوستانی کھانا ملتا ہے۔ ان میں اکثر بنگالیوں کے ہیں۔ لیکن پاکستانی بھی اس لائن میں بہت ہیں۔ بنگالیوں میں سلہٹ والے خاص طور پر یہ کام بہت کرتے ہیں۔ میں نے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی کہ یہ ریستوران کب اور کیوں کھلنے شروع ہوئے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ ہستی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جن کا نام عبداللہ ہے۔ اس وقت وہ اسّی کے پیٹے میں تھے

www.taemeernews.com

معلوم نہیں اب زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ عبداللہ صاحب لندن کے مضافات میں ایک عالی شان مکان میں رہتے تھے۔ ان کی فرم عبداللہ اینڈ کو مسالوں کا اور دوسرے کئی اقسام کا کاروبار کرتی تھی۔ خود تقریباً ریٹائر ہو چکے تھے۔ بیٹے پوتے کام چلاتے تھے۔ میں نے فون کیا کہ ملنا چاہتا ہوں۔ بولے "کل شام کو ٹاٹنیہیم کورٹ روڈ" ٹیوب اسٹیشن کے پاس فلاں "پب" (جسے گوکل بھی کہتے ہیں) میں آجاؤ — یہ "پب" یعنی شراب خانہ بھی انگریزی زندگی کا اسی طرح جزو لاینفک بن گیا ہے، جیسے چارپائی ہماری زندگی کی۔ ہر محلے میں ایک شراب خانہ ہوتا ہے۔ اور تقریباً ہر انگریز شام کو وہاں جاتا ہے اور ایک دو بیئر کے گلاس پیتا ہے۔ بلکہ ہفتے کے آخر میں جب تنخواہ ملتی ہے تو "اہلِ ذوق" انگریزوں کی بیویاں فیکٹریوں اور دفتروں کے دروازے پر ہی میاں سے تنخواہ وصول کر لیتی ہیں۔ اس اندیشہ سے کہ اگر صاحب موصوف "پب" پہنچ گئے تو آدھی تنخواہ پی ڈالیں گے۔

قصہ مختصر یہ کہ میں جب عبداللہ صاحب سے ملنے "پب" میں گیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ایک ثقہ صورت بزرگ تین بیس کا نہایت بڑھیا سلیٹی رنگ کا سوٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ سانولا رنگ، بال بالکل سفید، منہ پر ایک چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی جیسے لینن کے تھی۔ خیال ہوا کہ یہی عبداللہ ہوں گے۔ پوچھا تو وہی نکلے۔ کہنے لگے۔ "آؤ بھائی بیٹھو۔ پھر" بار میڈ" یعنی "ویٹرس یا بیرے کی مؤنث "بیری" کو بلایا کہ "تین وھسکی بناؤ۔ ایک میرے لیے۔ ایک مہمان کے لیے اور ایک اپنے لیے"۔ عرض کیا کہ میں ہنوز اس نعمت سے محروم ہوں۔ مجھ سے کئی بار معافی مانگی اور میرے لیے اسکوا یش منگوایا۔ جب اُن کی وھسکی آئی تو دونوں ہاتھوں میں گلاس پکڑ کر اٹھایا گویا یہ کوئی بڑی مقدس شے ہے۔ پھر بسم اللہ پڑھی۔ نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ بولے۔ "اے اللہ۔ ڈیر گاڈ۔ تیرا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔ کیا کیا نعمت تو نے ہم گنہگار لوگ کے لیے بنایا ہے۔" پھر وھسکی کا ایک گھونٹ لیا اور کہا "الحمدللہ"۔ پھر میرے سوال کے جواب میں یوں گویا ہوئے:۔

"میں جونا گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ میرا چچا بہت اچھا باورچی تھا۔ اور وہ سر عباس علی بیگ کا ملازم تھا جو وہاں وزیر تھے۔ میں لڑکا ہی تھا۔ لیکن چچا کی صحبت میں رہ کر تھوڑا بہت کھانا پکانا سیکھ گیا تھا۔ ایک دفعہ چھٹیوں میں سر عباس لندن آنے لگے تو میں نے ضد کی کہ میں بھی صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ صاحب کی خدمت بھی کروں گا اور پڑھوں گا بھی۔ میری ضد پر سر عباس مجھے لندن لے آئے۔ اُن دنوں لوگ جہاز سے آتے تھے اور ڈیک کا کرایہ بہت کم تھا۔ وہ تو کچھ دن رہ کر واپس چلے گئے اور میں لندن میں رہ پڑا —"

"یہاں رکنے کی وجہ کیوں پوچھتے ہو؟ بابا بس سمجھ لو کہ ہماری آنکھ لڑ گئی — تھوڑے دن بعد شادی کر لی۔ سوال یہ ہوا کہ پیٹ کیسے بھرا جائے۔ "چانسری لین" میں ایک کمرہ لے کر ایک چھوٹا سا ریسٹوران کھول دیا —" یہ چانسری لین ایک مشہور سڑک ہے۔ اس کے قرب و جوار میں انر ٹمپل اور مڈل ٹمپل یعنی وہ "اِن" ہیں جہاں بیرسٹری کی تعلیم ہوتی ہے۔

عبداللہ صاحب نے بتایا کہ اُس وقت بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے بیرسٹری پڑھنے آیا کرتے تھے۔ یہ قصہ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے کا ہے۔ یہ لوگ جب آتے تو اپنے ہندوستانی کھانے کو بہت یاد کرتے تھے۔ میں نے اپنے کمرے پر روٹی، گوشت پلاؤ سپلائی کرنے کا انتظام کیا۔ مسالہ وغیرہ ہندوستان سے منگوایا۔ چچا نے سب بھیج دیا۔ روز شام کو میں کھانا پکا کر رکھتا۔

www.taemeernews.com

بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے، راجے مہاراجے تک آتے۔ بل ول کہاں ایک بڑی پلیٹ رکھی رہتی تھی۔ جس کا جو جی چاہتا اس میں رکھ دیتا۔ کوئی دو شلنگ کوئی چار شلنگ۔ ایسے بھی لوگ تھے جو ایک ایک دو دو پونڈ رکھ دیتے تھے۔ وہ آج کل کے آنے والوں کی طرح کے لوگ نہیں تھے۔

"اب سالا آکر فیکٹری میں کام کرتا ہے چھ پنس کا کھانا کھاتا ہے باقی بچاتا ہے۔ بس یہ قیمت جو مجھے ملتی روٹی گوشت کی نہیں تھی۔ چٹخارے کی تھی"۔

عبداللہ صاحب نے گلاس خالی کیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نوٹ بھجیا کی طرح بھرے پڑے تھے۔ دو چار نوٹ بارمیڈ کو دیے۔ معلوم نہیں وھسکی کتنے کی تھی اور انھوں نے کیا دیا۔ پھر بولے چلو دوسرے "پب" میں چلتے ہیں۔ قریب ہی ایک "پب" تھا۔ وہاں گھس گئے۔ وہاں ایک موٹی سی بڑھیا بارمیڈ تھی۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بولی "ہلو مسٹر عبداللہ"۔ عبداللہ صاحب نے اس کے گال پر بوسہ ایسے خلوص سے ثبت کیا۔ گویا عبادت کر رہے ہیں۔ بولے "چالیس سال سے اس بار میں آرہا ہوں اور پچیس سال سے میری کو اسی طرح پیار کر رہا ہوں"۔ حسب معمول اُسے بھی ایک گلاس وھسکی پلائی۔ "بسم اللہ" اور "الحمدللہ" کے نعروں کے ساتھ خود بھی پینی شروع کی اور اپنی کہانی جاری رکھی۔ کہنے لگے کہ جب میرے پاس کچھ روپیہ آگیا تو میں نے پکیڈلی میں ایک بڑا ریستوران کھول لیا۔ "پکیڈلی سرکس" وسط لندن کی مشہور چورنگی ہے جس کے بیچ میں فوارہ لگا ہوا ہے اور "ایراس" دیوی کا مجسمہ نصب ہے۔ پھر بولے "انگریز لوگ کو بھی ہمارے کھانے کا چٹخارہ لگ گیا۔ کباب پلاؤ۔ کری خوب کھاتا ہے اور اپنی گرل فرینڈ کو بھی کھلاتا ہے"۔

"اس دوران پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہندوستانی سپاہی مڈل ایسٹ، میسوپوٹامیا یورپ میں آنے شروع ہوئے۔ وہ دال روٹی مانگتا تھا۔ لیکن دال روٹی کہاں سے آتی؟ اب چلو دوسرے "پب" میں چلتے ہیں۔

عرض کیا۔ "تیسرے میں"۔

"ہاں بابا۔ تیسرے میں۔ ہم ادھر کے سب "پب" میں تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ چنانچہ اٹھ کر ایک اور "پب" میں گئے۔ اور وہی عمل دہرایا گیا۔ پانچ شراب خانوں کی سیر کے بعد اُن کی داستان ختم ہوئی۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ دیسی کھانے کے ریستورانوں کی بنیاد انھوں نے ڈالی۔ مسالوں کو باریک پیس کر شیشیوں میں بند کر کے بیچنے کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کیا۔ اب وہ ریستوران کا کام چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے اسے خوب فروغ دیا ——— جب کہانی ختم ہوئی تو رات کے کوئی دس بج چکے تھے۔ کہنے لگے چلو کھانا کھائیں گے۔ چنانچہ ٹیکسی پر بیٹھ کر ہم لوگ ایک پاکستانی ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے جہاں ہر شخص اُن سے واقف تھا۔ عبداللہ صاحب ہمیشہ ٹیکسی پر چڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لندن میں کاروں پر کون گھومے۔ پارکنگ کی دقت ہے۔ پارکنگ کرنے کے بعد میل بھر پیدل چلو ٹیکسی سب سے اچھی۔ جہاں چاہو جاؤ۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ لندن میں پارکنگ ایک مشکل مسئلہ ہے۔ ٹیکسیاں بہ افراط ملتی ہیں۔ آواز دو، حاضر۔ یہ نہیں کہ آپ آواز دے رہے ہیں اور ٹیکسی ایک بت طناز کی طرح گل کترتی شانِ استغنا سے چلی جا رہی ہے۔ آپ کی طرف توجہ بھی نہیں کرتی۔ انگلستان میں اگر ٹیکسی کے کرائے کا فلیگ اٹھا ہوا ہے تو ڈرائیور ضرور رو کے گا اور چاہے آپ دور جائیں، یا نزدیک، وہ آپ کو ضرور پہنچائے گا۔ عبداللہ صاحب جیبوں میں نوٹ بھر کر روز شام کو نکلتے ہیں اور ان ٹیکسیوں پر گھومتے ہیں لکھ پتی

www.taemeernews.com

ہیں۔ کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ اللہ کے اس بندے نے ریستوران اور دیسی کھانوں اور مسالوں کا سلسلہ ایسی نیک گھڑی میں شروع کیا کہ خوب پھلا پھولا۔ یوں بھی لندن کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ اس شہر میں دنیا کے تقریباً ہر ملک کے کھانے اور ریستوران موجود ہیں۔ پاکستانی، ہندوستانی، ترکی، یونانی، اطالوی، انڈونیشی، ویت نامی، چینی، یوگوسلاوی، میکسیکی جو کھانا چاہے کھائیے ـــــ ان کے کھانوں کے بعد چٹخارے یا اُبکائیاں، آپ کے ذوق یا قسمت پر منحصر ہیں۔ مشرقی اور مرکزی لندن اور اکثر اوسط درجے کے علاقوں اور شہروں میں آپ کو پاکستانی، ہندوستانی ریستوران، حلال گوشت اور پرچون کی دکانیں ملیں گی۔ جتنی اقسام کا سامان لندن کی ان دکانوں میں دستیاب ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی نہیں ملتا ـــــ ایک طرف گائے کا گوشت سرد خانے میں رکھا ہے قیمہ چاہیے تو مشین لگی ہوئی ہے جو بجلی سے چلتی ہے۔ گوشت ڈالیے قیمہ نکالیے۔ تمام دالیں مثلاً ارہر، مسور، مونگ، ماش وغیرہ جو آپ کو پاکستان یا ہندوستان میں مل سکتی ہیں، قرینے سے مرتبانوں میں بھی ہیں۔ ان کے الگ پیکٹ بھی دستیاب ہیں۔ علاوہ ازیں بعض دالیں ایسی ہیں جو پاکستان میں نظر نہیں آتیں مثلاً چوڑے دانے کی مسور یا "بٹر بین" جو ویسٹ انڈیز یا مشرقی افریقہ سے آتی ہے اور بڑی مزے دار ہوتی ہے۔ مرچیں بھی مختلف ملکوں سے آتی ہیں۔ بعض معمولی اور بعض تیر دُنشتر۔ بعض مصالحے جو مدراس اور جنوبی ہند میں ملتے ہیں، شاید آپ کو کراچی، لاہور میں بھی نہیں ملیں گے۔ مگر انگلستان میں ضرور مل جائیں گے۔ سبزیاں ترکاریاں بھی ہر ملک کی موجود ہیں۔ اب تو فلمی آم بھی خوب ملتے ہیں مگر گراں ہیں۔ اپنے بس کے نہیں تھے۔ یہ کہہ کر صبر کر لیا کہ کون پیٹ بھاری اور جیب ہلکی کرے ـــــ آپ دوکان میں گئے، گوشت کٹوایا، دالیں خریدیں، کچھ سموسے خریدے، کچھ دال موٹھ کی پڑیاں بندھوائیں، ایک بوتل اچار کی لی۔ ایک بھٹی والا مرچوں کا اچار ڈبوں میں بند ملتا ہے۔ بڑی بڑی سرخ مرچوں میں بڑا تیز مسالا بھرا ہوتا ہے۔ ہمارا ایک دلّی والا دوست اُسے "کارتوس" کہتا تھا۔ بقول اس کے "میاں مسالا بارود ہو رہا ہے"۔

سیکڑوں پاکستانی جو برطانیہ میں رہتے ہیں ساری عمر دال چاول، قیمہ کباب، کوفتے کھاتے ہیں۔ لندن شہر میں ایک وارن اسٹریٹ ٹیوب اسٹیشن ہے۔ اس کے پاس ایک مٹھائی کی دکان کھلی "انبالہ سویٹ مارٹ"۔ ہم نے بھی مٹھائی چکھی۔ نام تو وہی ہیں "رس ملائی" "رس گلا" "گلاب جامن" ـــــ مگر لندن کی مٹھائی اور ہماری مٹھائی میں "بڑی غیریت" پائی جاتی ہے، نام کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں۔ یہ مٹھائی والے اسی ملک سے گئے ہیں، مگر ایسے بدل گئے کہ پہچانے نہیں جاتے۔ وہاں خالص دودھ، خالص میدے اور خالص گھی کی مٹھائی بناتے ہیں ـــــ اس لیے "اپنائیت" کی وہ بو نہیں آتی جو اپنی دیسی گرمی اور گرد آلود آٹے کی مٹھائی میں آتی ہے! ـــــ

چلیے ایک پاکستانی ریستوران بھی دیکھ لیجیے۔ بڑا سا کمرہ ہے۔ دو دو چار چار آدمیوں کے لیے میزیں لگی ہیں۔ کالے رنگ کے بیرے، کالے کوٹ پہنے، کالی بو باندھے کھڑے ہیں۔ چھری کانٹے، میز کرسی سب انگریزی انداز کے ہیں مگر کھانا اور بیرے دیسی ہیں۔ یعنی ہمارے دیس کے ہیں۔ دیواروں پر جو وال پیپر ہیں وہ بھی ذرا بھڑکیلے، عموماً سرخ رنگ کے ہیں۔ اندر کہیں دیسی فلموں کی دھنیں بج رہی ہیں۔ بعض ریستوران والے اپنے دروازے کے پاس طرّے دار پگڑی اور بھڑکیلی شیروانی پہنا کر ایک چوکیدار کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ انگریز کو اپنے سامراجی دور کی یاد ستائے، اور کچھ دیر کے لیے وہ ماضی کی خوش گوار یادوں کو تازہ کرنے کے بہانے کھانا کھائے ـــــ جب آپ ریستوران میں داخل ہوں گے تو بیرا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھے گا کہ آپ کیا پئیں گے۔ فکر نہ کریں بقدر

www.taemeernews.com

ہمت اوست، چاہے بیئر منگوائیے چاہے لیموں پانی۔ نظر دوڑائیے۔ کئی انگریز اپنی "میموں" کو اور کئی کالے اپنی "گوریوں" کو لیے بیٹھے ہیں۔ بیرے نے پانی کے گلاس بھر کر رکھ دیے۔ اور مینو دکھایا۔ یہ خالص پاکستانی یا ہندوستانی ہے۔ دہی، بریانی پراٹھا، کباب، دوپیازہ، آلو گوشت، دال۔ "بھاجی" اور "ونڈالو" ـــــ یہ شاید گوشت اور سبزی کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ ـــــ سُنا ہے کہ بعض ریستورانوں میں ڈھیروں قیمہ منگوا کر، مسالا ملا کر ریفریجریٹر میں رکھ دیتے ہیں۔ پیاز اور مسالے کا گاڑھا سیال الگ تیار رہتا ہے ـــــ اگر آپ نے کوفتوں کا آرڈر دیا تو قیمے کی گولیاں بنائیں، سیال میں ڈالیں اور حاضر کردیں۔ شامی کباب منگوائے تو گولیوں کو ذرا چپٹا کر کے تل لائے۔ آلو گوشت منگوایا تو اسی شوربے میں بوٹیاں اور آلو کے ٹکڑے ڈال۔ یہ صنعتی دور اور مغرب نے مشرق کے کھانوں پر کیا اثرات ڈالے۔ ریسرچ کیجیے اور پی۔ ایچ۔ ڈی لیجیے۔ اب وہ دور گیا جب دال کے بگھارنے میں پاؤ بھر گھی کھپایا جاتا تھا اور داروغہ مطبخ عرض کرتا تھا کہ "حضور اصل کھانا تو یہ ہے باقی سب حرام خوری ہے" ـــــ اب تو یہ حال ہے ؏

جو مل گیا سو کھانا، داتا کا نام جپنا

برطانیہ میں اگر آپ کسی مکان کے پاس سے گذریں کھڑکی سے دھواں نکلتا دیکھیں اور فضا مسالوں کی بو سے بوجھل ہو تو سمجھ لیجیے کہ یہ کسی پاکستانی کا رین بسیرا ہے۔ انگریز، پاکستانی ریستورانوں میں جا کر تو کھانا کھا لیتا ہے لیکن رہائشی علاقوں میں مسالوں کی بُو اور پراٹھوں کے تلنے سے جو دھواں نکلتا ہے اُسے برداشت نہیں کر سکتا ـــــ چنانچہ اکثر کرایہ داروں اور لینڈ لیڈیوں میں مسالے کے موضوع پر بڑی چٹ پٹی چخ ہوتی رہتی ہے۔ ہماری ذائقہ پرست زبان اور ان کی چڑھی ہوئی ناک میں جب جنگ چھڑتی ہے تو فلیٹ خالی کرنے کے نوٹس مل جاتے ہیں۔

بعض علاقوں میں یہ حالت ہوتی جا رہی ہے کہ اگر دو چار پاکستانی وہاں آ کر بس گئے یا انھوں نے مکان خرید لیے تو انگریز اُن علاقوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے جائداد کی قیمت گرتی ہے تو مزید رنگ دار حضرات تشریف لے آتے ہیں اور پوری سڑک "چناجور گرم روڈ" بن جاتی ہے۔ اگر آپ کو انگلستان میں ننھا مُنا پاکستان دیکھنا ہے تو تھوڑا بہت نمونہ تو لندن، برمنگھم، ناٹنگھم وغیرہ ہر شہر میں ملے گا۔ مگر بریڈ فورڈ شہر کی "لمب لین" تو خالص شاہراہ پاکستان بن چکی ہے۔ یہاں مجھے نہ کوئی دکان دار انگریز نظر آیا نہ خریدار۔ گوشت، مسالا، لحاف، بچھونے، پان تمباکو، چوڑیاں، سہاگ پڑے، دہی بڑے، اللہ کی سب نعمتیں موجود ہیں اور چاروں طرف فرزندان توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحر اسود ہے۔ لوگ اردو، پنجابی بول رہے، بھاؤ تاؤ ہو رہے ہیں۔ اور اگر اتوار کا دن ہے تو سینماؤں میں ہندوستانی اور کبھی کبھی پاکستانی فلمیں چل رہی ہیں۔ یار لوگ جون کو لیئر کا سِلا سلا یا سوٹ پہنے، عورتیں تیل سے سر پر پٹیاں جمائے، پان کھائے، رنگین شلواریں یا ساریاں پہنے جوق جوق چلی جا رہی ہیں۔ مونگ پھلیاں اور دال موٹھ کی پڑیاں بک رہی ہیں۔ ہال میں بیٹھ گئے۔ فلم چلی تو یہ بھول گئے کہ اپنے ملک سے پانچ ہزار میل دور ہیں۔

یوں اپنے ملک کی تو شان ہی نرالی ہے۔ کراچی میں الفنسٹن اسٹریٹ یا طارق روڈ سے گذریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انگلینڈ میں گھوم رہے ہیں۔ تقریباً سب دکانوں کے بورڈ انگریزی میں ہیں۔ سڑکوں پر جو ہدایت نامے لگے ہیں کہ "خبردار بائیں طرف نہ جائیے گا۔ یا دائیں طرف راستہ بند ہے" وہ بھی انگریزی میں ہے۔ پارکنگ بھی انگریزی میں منع ہے۔ پارکنگ کرنے والوں کی گاڑیوں کے نمبر بھی انگریزی میں ہیں۔ سوائے اُس عوامی ادب کے جو اشعار کی صورت میں لاریوں، بسوں اور

www.taemeernews.com

ٹیکسیوں پر گھومتا پھرتا ہے۔ ساری ہدایت، سارا کاروبار انگریزی میں ہے ـــــ مگر انگلستان کی لمب لین اور چند دوسرے مقامات پر ہماری گنہگار آنکھوں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ دکانوں کے بورڈ اردو میں لگے ہیں ـــــ اُردو کا جادو وہاں سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یہاں کسی کے سر میں اس کا سودا ہو تو سودائی سمجھا جاتا ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ "حلال" گوشت کی ایک دوکان پر لکھا تھا "ہلال" گوشت، مگر صاحبِ دکان کا حسنِ مذاق ملاحظہ فرمایئے کہ بورڈ پر احتیاطاً ایک چاند تارہ بھی بنا دیا کہ یہی پاکستانیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور اس طرح آپ کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ اسے "ہلال گوشت" پڑھ سکتے ہیں ـ ہائے حطی اور ہوز کے چکر میں نہ پڑیں ع

خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

جو گوشت اس خنجر کے نیچے آ گیا اُسے حلال ہی سمجھا جائے۔ اُسی گوشت سے چپلی کباب، آلو قیمہ، پسندوں اور کوفتوں کی دکانوں کی رونق ہے۔ خدا اس رونق کو قایم رکھے۔ آمین

دوکان داروں اور بازاروں کا ذکر چلا تو ایک بات اور عرض کر دوں کہ لندن میں اس طرح کا بازار یا پینٹھ یا میلہ بھی لگتا ہے جو عموماً ہمارے دیہات کا طرۂ امتیاز ہے۔ مشرقی لندن میں ایک سڑک ہے جس کا نام ہے "پیٹی کوٹ لین"۔ پیٹی کوٹ سے تو آپ خوب واقف ہوں گے۔ اس لیے کہ آج فیشن ایبل خواتین ساری کے نیچے زیر جامہ نہیں بلکہ پیٹی کوٹ ہی پہنتی ہیں۔ اس سڑک کا نام پیٹی کوٹ لین کیوں پڑا؟ مجھے معلوم نہیں۔ ممکن ہے محقق یہ بتائیں کہ سترھویں صدی میں یہاں پیٹی کوٹ سِلا کرتے تھے۔ انگریز کے نام کا کوئی اعتبار نہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی لارڈ میئر مسٹر پیٹی کوٹ نام کے گذرے ہوں جن کے نام پر سڑک کا نام رکھ دیا گیا ہے۔

ہر سنیچر کی صبح کو یہاں ٹھیلوں پر لاد کر سامان لایا جاتا ہے۔ برتن، کپڑے، چمڑے کا سامان، کھانے کی اشیا روزانہ استعمال کی چیزیں، غرض یہ کہ ہر قسم کا مال تجارت ٹھیلوں پر سجاتے ہیں۔ ان میں انگریز، پاکستانی، سکھ، ہندو، حبشی، اطالوی ہر قسم کے دکان دار شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ ٹھیلوں کے پاس کھڑے ہو کر وہ مزے دار آوازیں، اور ایسے ایسے نعرے لگاتے ہیں جو شاہی کے زمانے میں دلی کے دکان دار لگایا کرتے تھے۔ اُس وقت حقے کا دم "شربت کا گھونٹ"، نکتیاں، ریشم کے جال، ککڑیاں "لیلیٰ کی انگلیاں" اور کنویں کا ٹھنڈا پانی "آبِ حیات" بتایا جاتا تھا ـــــ بس اسی طرح سمجھ لیجیے کہ چینی کی پیالی چمچے سے بجا بجا کر انگریز دکان دار بھی آواز لگا کر آپ کو یقین دلاتا ہے کہ یہ خالص بیتھوون کی موسیقی ہے اور یہ پیالی، فولاد کی طرح مضبوط ہے اور قصر بکھنگم میں اسی طرح کی پیالی استعمال ہو رہی ہے۔ وہ اتنی سستی بیچ رہا ہے کہ اگر آج ہی پورا سیٹ نہ خریدا تو مرنے کے بعد روح بے چین رہے گی اور پیٹی کوٹ لین میں ہر سنیچر کی رات کو آ کر رویا کرے گی۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ یہاں ٹھیلے والوں کا سامان بہت سستا ہوتا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ فیکٹریوں میں بعض سامان ایسا بن جاتا ہے جو "غیر معیاری" یا "سب اسٹینڈرڈ" سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ ایسا سامان کوڑیوں کے مول اٹھا لاتے ہیں اور سستا بیچ دیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انھیں دوکان کا کرایہ، بجلی پانی وغیرہ کا خرچ نہیں اٹھانا پڑتا ـــــ بعض سامان خاصا اچھا مل جاتا ہے۔ سوائے چشمِ بینا کے معیار کے پرکھنے کی استعداد کسے ہوتی ہے؟ اگر چائے کی پیالی پر جو پھول پتی بنائی گئی ہے۔ اس میں کسی پتی کا رنگ ذرا تیز ہو گیا یا ہلکا رہ گیا تو وہ معیار سے گر گئی۔ آدھے داموں میں مل جائے گی۔

www.taemeernews.com

پیٹی کوٹ لین میں پاکستانی خریدار بہت آتے ہیں۔ کچھ ٹھیلے بھی لگاتے ہیں۔ ٹھیلے تو اور بازاروں میں بھی لگائے جاتے ہیں، لیکن وہ ہنگامہ اور شور جس سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے اور کہیں سننے میں نہیں آتا۔ ایک دفعہ ٹیلی وژن پر ایک دکاندار دکھایا گیا۔ وہ صرف بنیان اور معمولی پتلون پہنے ٹھیلہ لگائے کھڑا تھا۔ دوسرے سین میں دیکھا کہ وہ ایک آراستہ گھر میں نہایت عمدہ سوٹ پہنے بیٹھا ہے۔ گھر کے سامنے رولس رائس کھڑی ہے۔ ۸۔۱۰ سال میں ٹھیلے سے اس نے اتنا پیسہ کمایا کہ دولت مندوں میں شمار ہونے لگا۔ خیر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بورژوا قسم کے لوگوں کو چھوڑیے۔ یہ جو اَن پڑھ مزدور میرپور، آزاد کشمیر، سرگودھا، پشاور، کراچی وغیرہ سے جا کر وہاں مزدوری کرتے ہیں اِن کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیجیے گا۔ یہی لوگ ہیں جو پاکستان کو زرِمبادلہ جیسی نعمت فراہم کرتے ہیں۔ اس سال تیس کروڑ روپیہ زرِمبادلہ کی صورت میں پاکستان آیا ہے جو ہمارے ملک کے جوانوں نے اپنی محنت سے کمایا ہے۔ یہ لوگ دن رات مزدوری کرتے ہیں۔ اپنے اوپر کم خرچ کرتے ہیں۔ روپیہ بچا بچا کر گھر بھیجتے ہیں۔ گھر والے زمین خریدتے ہیں۔ مکان بنواتے ہیں۔ اور حکومت پونڈ کماتی ہے۔ ہمارے ملک کی برآمدات میں سرِفہرست ہمارے یہ بھائی ہیں ——— لیکن بعض دفعہ اُن کی کُفایت شعاری اور اَن تھک محنت سے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے قریب یہ سننے میں آیا کہ ایک صاحب نے کہیں مکان خریدا۔ اس میں ایک کمرے میں بارہ آدمی رہتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ فرش پر گدّے اور لحاف ڈال دیے۔ رات کو چھ آدمی برابر برابر سو گئے۔ صبح اٹھ کر وہ سب فیکٹری چلے گئے۔ اور دوسرے چھ آدمی جو رات کی شفٹ میں کام کر رہے تھے انھیں بستروں پر آ کر دراز ہو گئے جو ابھی تک گرم تھے۔ قانون یہ ہے کہ ایک کمرے میں ایک خاص تعداد سے زیادہ آدمی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کہ یہ حفظانِ صحت کے اصول کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ مالک مکان اس جرم میں دھر لیے گئے۔ انگریز کالے آدمیوں کو اپنا کرایہ دار بنانا پسند نہیں کرتا۔ سردی ایسی ہے کہ سڑک پر یا دکانوں کے تختوں پر رات بسر نہیں ہو سکتی۔ کالے بچارے بھی کیا کریں، کہاں جائیں ——— لیکن جوں جوں لوگ وہاں مستقل طور پر جم رہے ہیں اپنی جائدادیں خود بنا رہے ہیں اور مکان کرایے پر چلا رہے ہیں ——— تجربہ اور تعلیم سے ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ انگریز مزدور اوور ٹائم کام کرنے اور چھٹیوں کا فائدہ نہ اٹھانے کے خلاف ہے۔ پاکستانی زیادہ کام کرتا ہے اور چھٹیاں نہیں لیتا۔ اس لیے اکثر یونین کے انگریز اس بات کو پسند نہیں کرتے ——— کبھی کبھی اور بھی دلچسپ واقعات سننے میں آتے ہیں۔ ایک دفعہ پاکستانی ہائی کمشنر کے پاس کسی شہر سے میئر کی چٹھی آئی کہ اپنے آدمیوں کو سمجھا دیجیے کہ قانون کی خلاف ورزی نہ کریں ——— ہوا یہ کہ ایک بھائی لمبا سا اوورکوٹ پہنے گلے کو مفلر سے چھپائے اور سینے پر ہاتھ باندھے بس میں آ کر بیٹھ گئے۔ سردی کی وجہ سے بسوں کی کھڑکیاں بند رہتی ہیں۔ اسٹاپ سے جب بس روانہ ہوتی ہے تو سخت سردی میں دروازے بھی بند کر دیے جاتے ہیں۔ بس چلی تو یہ صاحب ذرا کلبلائے۔ سینے کو اور زور سے بھینچا۔ پہلو بدلے، چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ جیسے عشق اور ہارٹ اٹیک کے بعد ہوتے ہیں۔ پھر کوٹ کے اندر سے دبی دبی، چوں چوں کی آوازیں آئیں، اور چند منٹ بعد ہنڈیا چوراہے پر پھوٹ گئی۔ اوور کوٹ کے اندر سے ایک چیختی چلاتی، تندرست مرغی پھڑپھڑا کر نکلی اور بس کے اندر اِدھر سے اُدھر اڑتی، ہل چل پیدا کرتی قیامتِ صغریٰ کا نمونہ بن گئی ——— جو انگریز جنٹلمین اور لیڈیاں بس میں سوار تھیں، وہ ہڑبڑا کر اٹھیں اور چیخنے چلانے لگیں ——— ہر طرف سے "او، اُو، مائی گاڈ" کا شورِ قیامت برپا ہوا۔ کنڈکٹر مرغی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر مرغی ہے کہ بجلی بنی ہوئی ہے اِدھر گری، اُدھر کُودی، ابھی سیٹ کے نیچے، ابھی صاحب کے کاندھے پر، ابھی میم صاحب کے گھونسلے نما سر پر، مگر قرار کہیں نہیں۔ بالآخر

www.taemeernews.com

بس روکی گئی۔ دروازہ کھلا، مرغی تو قید سے چھوٹ کر پھر سے گئی۔ مگر مرغی والے پکڑے گئے۔ وہ تو مرغ پلاؤ کے منصوبے بنا رہے تھے۔ لیکن قانون نے صرف خیالی پلاؤ تک محدود کر دیا۔ قانون کے ماتحت کوئی شخص مرغی یا بکری وغیرہ اپنے گھر پر حلال نہیں کر سکتا۔ مگر ہمارے بھائی کہتے ہیں کہ "ہم وہ گردن مڑوڑی حرام مرغیاں نہیں کھائیں گے جو بازاروں میں ملتی ہیں۔ زندہ مرغی لائیں گے۔ ہاتھ دھونے کے بیسن میں ذبح کریں گے اس کے پر کموڈ میں ڈال کر فلش کر دیں گے۔ یہ مداخلت فی الدین برداشت نہیں کریں گے"۔ ایک دفعہ یہ واقعہ بھی ہو چکا ہے کہ پر کموڈ میں پھنس گئے اور پانی کی لوری لائنیں بند ہو گئیں۔ میئر کی درخواست پر ہائی کمشنر نے کیا فیصلہ کیا مجھے معلوم نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ حلال گوشت کی دکانوں میں حلال کی ہوئی مرغیاں بھی ملنے لگی ہیں۔ البتہ بہت سے لوگ اسٹوروں سے برف میں منجمد مرغیاں لا کر بھی کھانے لگے ہیں۔

پاکستانی، عید بقرعید، پان چھالیا، پلاؤ قورمہ، اردو فلم، اردو اخبار، فلمی گانے، مشاعرے، قوالی، غرض یہ کہ ان تمام لوازمات سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں جو ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اجنبیت کے اس جنگل میں "جنگ" اور "ملت" پڑھتے اور منگل مناتے ہیں۔ موم کی پتلیوں کو گھورتے ہیں مگر نکاح عموماً گھر کی ماہ سیماؤں سے پڑھواتے ہیں۔ بیئری کھاتے ہیں مگر سوئیوں کا مزہ یاد رکھتے ہیں۔ دراصل پاکستان سے باہر جا کر پاکستان کی انسیت اور اپنے کلچر کی حس کچھ زیادہ تیکھی اور تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ صفات عام پاکستانیوں میں دیکھی ہیں ورنہ یوں تو ایسے کالے بھی ملیں گے جو چند ہی سال میں اپنے کو ملکہ وکٹوریہ کی اولاد سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ گھبرا کر اپنے گھر والوں پر اپنی انگریزیت کا رعب تو جما سکتے ہیں۔ لیکن انگریز انھیں پرکاہ سمجھتا ہے ——— البتہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ جو لوگ وہاں جا کر بس گئے ہیں۔ اب ان کی اولاد جوان ہو رہی ہے۔ اُن کے گھر کے ماحول اور باہر کے ماحول میں فرق ہے۔ بیس پچیس سال بعد یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جائے گا۔ مزدور باپ کے بیٹے اب لکھ پڑھ رہے ہیں۔ انگریز بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اسکول میں انگریزی کورس پڑھتے ہیں۔ انگریزی کھانا کھاتے ہیں۔ انگریز کے لہجے میں انگریزی بولتے ہیں، گھر میں اردو اور پنجابی بولتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آیندہ اکثریت اردو پڑھے گی۔ پڑھائے گا کون؟ اور کس وقت پڑھائے گا؟ ———

عاقبت کی خبر خدا جانے۔ اس وقت تو حالت یہ ہے کہ میکالے کی قوم کو کالوں نے اردو پڑھنے پر راغب کر ہی لیا ہے۔ جن حلقوں میں پاکستانی اپنے خاندانوں سمیت آباد ہیں وہاں پولیس والوں کو جرائم کی تحقیقات اور روزانہ کے کاروبار میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ میاں کارخانے گئے ہیں۔ اُن کی اہلیہ محترمہ جن کی آدھی سے زیادہ عمر میاں چنوں میں گذری، گھر پر چنے کی دال یا مرغ چھولے پکا رہی ہیں۔ سپاہی نیلی وردی اور الٹی بالٹی کی طرح کا کنٹوپ پہنے آتا ہے اور گھنٹی بجاتا ہے اور انگریزی میں پوچھتا ہے۔ " میڈم ...... "

میڈم کو "یس" اور "نو" کے سوا کچھ نہیں آتا۔ زبان یارمن انگلش، تحقیقات ہو تو کیسے۔ "مائی صاحب نو ہوم"۔ بے چارہ بے نیل و مرام واپس چلا جاتا ہے۔ ان سماجی حالات نے ایسا مجبور کیا کہ لوکل کونسلوں نے چند انگریز پولیس والوں کو اردو پڑھوانی شروع کر دی۔ میں خود ایسے دو سپاہیوں سے ملا جنھیں حکومتِ برطانیہ نے پاکستان بھیجا کہ وہاں جا کر اردو سیکھیں اور بول چال، رہن سہن سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ سنا ہے کہ اب وہ سپاہی پاکستانیوں سے فر فر اردو بولتے ہیں اور پھر تھانے پہنچ کر اپنے افسروں کو گٹ پٹ انگریزی بول کر رپورٹ پیش کر دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اردو کے ذکر کے ساتھ بی بی سی اردو سیکشن کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب انگریزوں کو یہ ضرورت پیش آئی کہ برصغیر پاک و ہند کے سامعین سے رابطہ قایم کیا جائے تو بی بی سی کی اردو سروس شروع کی گئی۔ ذوالفقار علی بخاری صاحب مرحوم لندن پہنچے اور انھوں نے اردو نشریات کا آغاز کیا۔ بی بی سی سے کم و بیش چالیس زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ ان میں ہندی، اردو، بنگلہ، نیپالی، انڈونیشیائی، ملائی، چینی، برمی، سنہالی، فارسی، اور یورپ کی تمام زبانیں شامل ہیں۔

بی بی سی اردو سروس کے متقدمین میں بخاری صاحب مرحوم، آغا محمد اشرف مرحوم، صدیق احمد صدیقی مرحوم وغیرہم تھے۔ اب تقریباً نصف درجن حضرات اردو سروس سے منسلک ہیں۔ ان میں اطہر علی اسٹاف کے سینیئر ممبر اور مستقل ملازم ہیں۔ ضمیرالدین احمد بھی بی بی سی میں ہیں۔ راقم الحروف بھی ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک بی بی سی میں کام کر چکا ہے۔ لیکن اختلافات و حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ دل اچاٹ ہو گیا اور واپس چلا آیا۔ خیر یہ ایک الگ قصہ ہے۔

بی بی سی اردو سیکشن ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جہاں اردو کے اکثر مصنفین اور شعرا جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان یا پاکستان کا کوئی اردو شاعر یا مصنف صحافی، دانشور لندن جائے تو بی بی سی سے عام طور پر اس کا انٹرویو یا کلام ضرور نشر کیا جاتا ہے۔ خود میرے قیام کے دوران فیض احمد فیض، ن۔م راشد، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، جمیل الدین عالی، ابن انشا، ادا جعفری، حکیم سعید وغیرہ تشریف لائے۔ کئی صحافی جن میں جنگ کے اڈیٹر اور مالک میر خلیل الرحمٰن بھی شامل ہیں۔ نشریات میں حصہ لے چکے ہیں۔

ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے علاوہ ایکٹروں، فن کاروں، قوالوں، اور موسیقاروں کو بھی بی بی سی کے پروگراموں میں حصہ لینے کے مواقع دیے جاتے ہیں۔ وزرا، سیاست داں اور عمائدین جو پاکستان سے لندن جاتے ہیں۔ اکثر بی بی سی پر بھی بولتے ہیں۔ راجہ محمود آباد مرحوم، میاں ممتاز دولتانہ کے ساتھ گفتگو میرے زمانے میں نشر ہوئی تھی۔ بی بی سی کی لائبریری میں قائداعظم کی آواز کا ریکارڈ بھی محفوظ ہے۔ بی بی سی کی نشریاتِ خارجہ کا محکمہ برطانوی وزارت خارجہ سے متعلق ہے۔ دراصل اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ برطانیہ کی عام زندگی، سیاسی، سماجی حالات، علمی اور ادبی کارناموں سے اردو سامعین کو روشناس کرایا جائے اور لگے ہاتھوں اپنی پالیسی بھی کان میں ڈال دی جائے۔

ظاہر ہے کہ اپنے پروگرام کو قبول عام کا درجہ دینے کے لیے اس علاقے کے لوگوں کو بھی نشریات میں شریک کرنا پڑتا ہے جہاں پروگرام سنا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ادبا اور پاکستان کے مشاہیر کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بی بی سی کے پاس آوازوں کا اچھا خزانہ موجود ہے۔ مثلاً فیض صاحب اور بخاری صاحب کے ساتھ بیٹھ کر ہم سب نے ڈیڑھ دو گھنٹے گفتگو کی۔ اُن کی سوانح حیات اور شعر و ادب پر اُن کے خیالات کے بارے میں سوال کیے گئے۔ یہ ساری گفتگو ریکارڈ ہو گئی جو بی بی سی کے پاس محفوظ ہے۔ اسی طرح راجہ صاحب محمود آباد کا ایک طویل انٹرویو بھی محفوظ ہے۔

بی بی سی سے اردو میں ڈرامے، نغمے، فیچر پروگرام، معلوماتی مضامین، کتابوں پر تبصرے بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ اکثر طبع زاد پروگرام وہ لوگ تحریر کرتے ہیں جو انگلستان میں مقیم ہیں۔ مگر خبریں، خبروں پر تبصرے اور سیاسی نوعیت کے پروگرام بی بی سی کے ارباب حل و عقد انگریزی میں لکھ کر ہر زبان کے شعبے میں بھیج دیتے ہیں اور ان کے صرف ترجمے نشر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ برطانوی پالیسی کا مسئلہ ہے۔ بی بی سی کی اردو خبریں نہ صرف پاکستان، ہندوستان بلکہ افریقہ، مشرق وسطیٰ،

www.taemeernews.com

سنگاپور، یورپ، غرض یہ کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں جہاں اردوداں موجود ہیں، سنی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے بی بی سی بھی اردو زبان کی توسیع میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے ــــــ

بی بی سی کی خارجہ سروس کے دفاتر ایک مرکزی علاقے اسٹرینڈ میں "بُش ہاؤس" نامی عمارت میں واقع ہیں۔ تھوڑی ہی دور پر اخباروں کا مرکز فلیٹ اسٹریٹ ہے۔ بیرسٹروں کی دانش گاہیں یا "اِن" بھی دور نہیں۔ ڈکنس کی "اولڈ کیوریاسٹی شاپ" اور بعض پرانی عمارتیں بھی قریب ہی ہیں ــــــ

"بُش ہاؤس" کی کینٹین بھی دلچسپ جگہ ہے۔ درجنوں آدمی سیلف سروس کاؤنٹر سے کھانا اور چائے لاکر میزوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں ــــ اسی جگہ پر چائے اور کھانے کے وقت کسی نہ کسی میز پر اردو بھی ضرور آپ کے کان میں پڑے گی۔ یہاں اردو اور ہندی کی تفریق کم نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ ہندی سروس کے اراکین بھی اسی زبان میں اردو والوں سے باتیں کرتے ہیں جس سے آپ ہم سب واقف ہیں۔ اُن کی گفتگو کی زبان اُن کی نشریات سے مختلف ہوتی ہے اس لیے کہ بولنے کی زبان تو وہی ہے جو ہندوستانی عوام اور ہندوستانی فلم کی زبان ہے۔ لطف یہ کہ بعض ہندوستانی اردو اور ہندی دونوں شعبوں میں جانتے ہیں اور نشریات میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک دفعہ منشی پریم چند کے صاحبزادے لندن آئے جو بھارت سے ایک ہندی رسالہ نکالتے ہیں، وہ اردو شعبے میں آئے تو اردو میں تقریر نشر کی۔ ہندی شعبے میں گئے تو ہندی میں براڈکاسٹ کرآئے ــــ

انگلستان میں کئی اردو روزنامے اور ہفتہ وار اخبار نکلتے ہیں۔ مشاعرے کی محفل برپا کیجیے تو داد سے چھتیں اُڑ جاتی ہیں۔ مشاعروں میں ہندوستانی ہندو اور سکھ بھی شرکت کرتے ہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ رالف رسل اور ڈیوڈ میتھیوز سلامت رہیں۔ لندن یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قایم ہے۔ تحقیق و تدقیق کے لیے جو مواد برٹش میوزیم انڈیا آفس لائبریری اور آکسفورڈ اور کیمبرج میں موجود ہے، وہ کہیں نہیں۔ اردو کا مولد و مسکن چھوڑکر اردو کے بارے میں ریسرچ کرنے کے لیے لوگ انگلستان جاتے ہیں۔ یہ صورت اس وقت بھی تھی جب صرف معدودے چند اردوداں انگلستان میں رہتے تھے اور آج بھی ہے جب اُن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا تعلق اردو والوں یا پاکستانیوں کی تعداد سے نہیں ہے، بلکہ اس حقیقت سے ہے کہ انگریزکو کتابیں، رسالے، مخطوطے، نوادرات، پمفلٹ اور کاغذ کا ہر پرزہ جمع کرنے کا ذوق اور اپنے ملک میں لے جاکر لائبریری میں رکھنے کی استطاعت حاصل رہی ہے۔ اپنے عروج کے دور میں اُس نے اپنا گھر علم کے خزانوں سے بھی بھر لیا۔ اگر اردو دنیا میں قایم رہی۔ اور امید ہے کہ ضرور رہے گی ــــــ تو برطانیہ میں اردو کی ریسرچ کے مواقع بھی باقی رہیں گے۔ چاہے آج کے اردو والوں کے بیٹے پوتے آیندہ اردو بولیں یا انگریزی اختیار کرلیں ــــــ ہوا کا رُخ دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری تیسری نسل میں پاکستانی الاصل لڑکے اور لڑکیاں انگریزی میں پڑھیں گے اس لیے کہ وہی اُن کی روزمرہ کی ضروریات کی کفیل ہوگی۔

انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ جب پاکستان میں اس سے مفر نہیں تو انگلستان کے پاکستانی اسے پوری طرح کیوں نہ اختیار کریں گے؟ یوں بھی اردو سے انھیں پچاس سال بعد کیا فائدہ ہوگا؟ ممکن ہے کہ موجودہ نسل کے بعد لوگوں کا پاکستان آنا جانا بھی ختم ہوجائے اور یہ رشتے ہی کٹ جائیں ــــــ

البتہ پاکستان کے ایرانی النسل باشندوں کو دیکھ کر یہ خیال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ شاید انگلستان میں اردو کسی نہ کسی صورت

www.taemeernews.com

میں باقی رہ جائے۔ ہمارے یہاں ایرانی آباد ہیں۔ ان میں اعلیٰ افسر اور صنعت کار بھی ہیں اور ایرانی ریستورانوں کے چھوٹے سرمایہ دار بھی۔ پاکستانیوں کے ساتھ یہ سب لوگ اردو میں بات کرتے ہیں۔ لیکن آپس میں فارسی میں گفتگو کرتے ہیں۔ سو پچاس سال بعد ممکن ہے اسی قسم کے پاکستانی انگلستان میں بھی باقی رہ جائیں ـــــ لیکن یہ سب تخیل کی کارفرمائیاں ہیں۔ بہت سے داخلی و خارجی عوامل کا پتہ ہمیں نہیں۔ انگلستان کی آیندہ اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالت کیا ہوگی؟ کالے گورے کا جھگڑا ختم ہو جائے گا یا باقی رہے گا؟ اور اگر باقی رہا تو مشرقی افریقہ کی تاریخ تو نہیں دہرائی جائے گی جہاں سے ہندوستانی پاکستانی نسل کے سب ہی لوگوں کو سو سال تک قیام کرنے کے بعد بھی اپنا بوریا بستر سنبھالنا پڑا ـــــ

اینک پاول کا گروہ نسلی تعصب اور رنگ کی بنا پر امتیازی سلوک کے رجحانات کو ہوا دے رہا ہے۔ چند سال سے تو یہ حالت تھی کہ پاکستانیوں کی پٹائی کر دینا سفید فام نوجوانوں کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ نوجوان انگریز سائیکلوں کی چین اور ڈنڈے لیے، موٹے تلوں کے بوٹ پہنے گھوما کرتے تھے اور کہیں اکا دکا سیاہ فام آدمی نظر آتا تو اس کی پٹائی کر دیتے۔ میں نے خود دیکھا کہ ویسٹ کنسنگٹن اسٹیشن کے پاس شام کے وقت ایک شخص چلا جا رہا تھا۔ دو لڑکے دوڑتے ہوئے آئے اچھل کر لوٹ سے سینے پر لات ماری۔ وہ گرا۔ اس کے دو تین گھونسے جمائے اور بھاگ گئے۔ خیر انگلستان کے معقولیت پسند طبقے نے روک تھام کی تو یہ لعنت کچھ ختم ہوئی۔ مگر نہ معلوم پھر کب ابھر آئے؟ ـــــ

جب بنگلہ دیش کی تحریک چل رہی تھی اس وقت بھی پاکستانیوں کے اور پاکستان کے خلاف بڑی نفرت پھیلائی گئی۔ انگلستان کے سرمایہ دار یہودیوں نے مخالفت کے لیے خزانے کے منھ کھول دیے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں تک نے ہمارے ملک کو توڑنے والی قوتوں کو شہ دی۔ اس زمانے کے اخبارات، بی بی سی اور آئی ٹی وی ٹیلی وژن اور ریڈیو اسٹیشن پاکستان کی آزادی اور وحدت کے خلاف اتنا پروپیگنڈا کرتے تھے کہ دل گھٹا ہو گیا۔ مجھے ان دنوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں اور بے یار و مددگار رہوں۔ پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر کی پالیسیوں کی مخالفت تو سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن وہاں تو یہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان کا وجود ہی غلط ہے۔ بھارت کے حملے اور جارحیت کی مخالفت تو کجا اس کی آؤ بھگت کی جاتی اور اسے ریڈیو اور ٹی وی پر بولنے کی دعوت دی جاتی۔ پاکستان کی طرف سے کوئی جواب دینا چاہتا تو اس میں بڑی ہیر پھیر کی جاتی۔ یہ باتیں میرے دل پر نقش ہیں۔ اسی قسم کے رویے کو دیکھ کر بہت سے لوگ کہتے تھے کہ یورپ کے لوگ ابھی تک صلیبی جنگوں کو نہیں بھولے۔ بارے وہ وقت بھی گزر گیا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ وہی شیخ مجیب جنھیں انگریزی پریس نے پہلے "ہیرو" بنا کر پیش کیا تھا۔ "ولین" قرار پائے۔ انگریز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چار آدمی ہر گروپ میں رکھتا ہے۔ جب سب پاکستان کے مخالف تھے اس وقت بھی ایک دو ممبر پارلیمنٹ پاکستان کے ساتھ تھے۔ موقع ملنے پر وہ آگے آئے اور وزیر اعظم بھٹو کو دورے کی دعوت بھی دی گئی ـــــ یہ بھی زمانے کی نیرنگیاں ہیں ؏

ہم دیکھتے رہے ہیں جو کچھ دکھائے دوست

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اینک پاول، "ولن جورڈن" اور انجہانی آسولڈ موسلے کے فسطائی خیالات کو فروغ حاصل ہوگا یا آزاد اور غیر متعصب نقطۂ نظر ان کی تنگ خیالی کو پچھاڑ دے گا۔ امید تو یہی رکھنی چاہیے کہ آیندہ انگریزی سوسائٹی میانہ روی کی چال چلے گی۔ اگرچہ ہمیشہ کی طرح اس سوسائٹی میں آج بھی کالوں کے مخالف موجود ہیں، مگر پھر بھی انگریز کالوں اور

www.taemeernews.com

مٹیالوں، کشمشی رنگ والوں کو کسی نہ کسی حد تک تو برداشت کر ہی رہا ہے۔ اور لاکھوں آدمی باہر سے آکر وہاں آباد ہو رہے ہیں۔ ویسے انگلستان میں نسل کی بنا پر تعصب برتنا غیر قانونی ہے۔

ایک قصہ سنیے۔ کسی شخص نے ایک اخبار میں اشتہار دیا کہ "ہمارے ہوٹل میں باورچی کی آسامی خالی ہے۔ صرف اسکاٹ لینڈ والے درخواستیں دیں"۔ ___ قانون فوراً حرکت میں آگیا اور اشتہار دینے والے صاحب خود اشتہار عبرت بن گئے۔ نسلی رابطے کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ جج نے فیصلہ سنا دیا کہ یہ کہنا کہ صرف اسکاٹ لینڈ والے درخواست دیں نسلی تعصب ہے۔ اگر اشتہار دینے والا یہ کہتا کہ "اسکاچ" کھانا پکانے کے ماہر ہی درخواست دے سکتے ہیں، تو وہ قانون کی گرفت میں نہیں آسکتا تھا۔ بیچارہ ہوٹل والا صرف اس بنا پر قانون کے شکنجے میں آگیا کہ فاسقوں اور فاجروں کے ملک انگلستان میں وہ "کوٹا سسٹم" نافذ نہیں کیا گیا جو ہم فرزندان توحید نے ایجاد کیا ہے! یہ بھی خدا کی شان ہے۔

اور خدا کی شان تو یہ بھی ہے کہ کالے ایک طرف تو گوروں کی ملیں اور فیکٹریاں چلا رہے ہیں۔ جو سخت اور گندہ کام انگریز مزدور نہیں کرنا چاہتا۔ یہ اس پر بھی راضی بہ رضا ہیں۔ کم تنخواہ اور اوور ٹائم پر بھی معترض نہیں ہوتے ___ اور دوسری طرف جعلی پاسپورٹ بنوا کر رشوتیں دے کر سردی سے کپکپاتے چوری چوری اندھیری راتوں میں انگلستان کے ویران ساحلوں پر اترتے ہیں۔ پکڑے گئے تو جیل کی ہوا کھاتے ہیں ورنہ مزے سے کھاتے کماتے ہیں ___

اور یہ بھی خدا کی شان ہے کہ کافروں پر چار حرف بھیجتے ہیں اور کافراؤں کے دو بول کے لیے مرتے ہیں! غیر ملک کے کہر اور دھوئیں سے عاجز آکر اپنے گھر کی دھوپ اور روشنی کا ذکر کرتے ہیں۔ واپسی کے ارمان دل میں لیے پھرتے ہیں، مگر واپس نہیں آتے ___ اور کبھی واپس آئے بھی تو اپنے ملک کی گرمی اور مچھروں کی شکایت کرتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا سے کبھی بخار آجاتا ہے، کبھی پیٹ چلنے لگتا ہے۔ چنانچہ پھر انگلستان کے لیے چل کھڑے ہوتے ہیں، پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں "زمیں پہ بجلی فلک پہ باراں" کے نظارے ہیں۔ اپنی دھوپ چھوڑ کر انگریز کی آگ تاپنے لگتے ہیں، اور تپتے رہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انگریز کا شہر لندن بڑا گندہ ہے۔ یہاں بے غسل خانوں کے گھر، بے روشنی کے کمرے ہیں، جن میں سیلن کی بو بسی ہوئی ہے، چوہوں سے بھری کوٹھریاں موجود ہیں۔ کسی امریکی میگزین نے سنہ ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ پوری ریسرچ کرکے لکھا تھا کہ کئی ہزار مکان ایسے ہیں جہاں نہانے کا کوئی بندوبست نہیں اس لیے کہ سو پچاس برس پہلے جب مکان بنے تھے تو وہاں نہانے کا رواج نہیں تھا۔ کبھی کبھار نہانے کو جی چاہا تو پبلک باتھ میں چلے گئے۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں اتنی سخت برف باری ہوئی کہ دسمبر سے مارچ تک تقریباً روزانہ کئی انچ برف پڑتی تھی۔ یورپ میں بھی یہی حال تھا۔ اس وقت خود انگریزی اخباروں نے اس بات پر بڑی نکتہ چینی کی تھی کہ انگریز کی قدامت پرستی وبال جان ہے۔ انگلش چینل پار کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر گھر میں سنٹرل ہیٹنگ کا انتظام ہے۔ لوگ آرام سے رہتے ہیں اور انگلستان میں ابھی تک آتش دان میں کوئلے جلانے کا صدیوں پرانا طریقہ رائج ہے۔ برف باری ہوئی تو ریلیں رک گئیں۔ کانوں سے کوئلہ آنا بند ہو گیا۔ کمرے سرد خانے بن گئے۔ درجنوں آدمی سردی سے اکڑ کر مر گئے۔

قدامت پسندی کی ایک اور مثال بھی سننے میں آئی۔ کبھی وکٹوریہ کے زمانے میں جب پانی کے نل لگائے گئے تھے تو یہ قانون بنایا گیا کہ نل تو زمین دوز ہوں گے۔ لیکن جس مقام پر وہ گھر کے اندر داخل ہوں وہاں دو چار انچ کھلے چھوڑ دیے جائیں

www.taemeernews.com

تاکہ ٹیکس کے انسپکٹر کو آسانی سے معلوم ہو جائے کہ اس گھر میں نل لگا ہوا ہے اور وہ ٹیکس عاید کر دے۔ زمانہ بدل گیا۔ مگر قانون نہ بدلا۔ برف باری ہوتی ہے تو اسی چندا پخ کھلے ہوئے حصے میں برف جم جاتی ہے۔ پیچھے سے پانی زور کرتا ہے تو اکثر نل پھٹ جاتے ہیں۔ پانی بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خود میرے گھر میں برف باری اور بارش نے کربلا پیدا کر دی۔ اب سنٹرل ہیٹنگ اور دوسری اصلاحات پر زور دیا جا رہا ہے۔

ان پرانے فیشن کے گھروں کے ساتھ ساتھ یہ نہ بھولیے کہ اسی لندن میں قصر بکھنگم اور ہائیڈ پارک بھی ہے۔ پارلیمنٹ کی خوبصورت عمارت بھی ہے۔ البرٹ ہال بھی ہے جہاں دنیا کے عظیم ترین فن کار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، یہاں ٹیٹ گیلری اور نیشنل گیلری بھی ہے۔ جہاں آرٹ کے خزانے ہیں۔ یہاں برٹش میوزیم بھی ہے جہاں علم کی دولت کے انبار لگے ہیں۔ اسی جگہ "داس کیپٹال" تصنیف کی گئی۔ یہاں میٹو نے پیغمبر اسلام اور اسلام کے خلاف کتاب لکھی اور اسی لندن میں بیٹھ کر سرسید نے میٹو کا جواب لکھا اور اس کے پرخچے اڑائے۔ اور ان لائبریریوں سے مواد حاصل کیا۔

یہ ہائیڈ پارک بھی عجیب جگہ ہے۔ اس کا ایک کونا ایسا ہے جہاں اظہار خیال اور تقریر کی مکمل آزادی ہے۔ یہاں لوگ ڈبے اور اسٹول وغیرہ لاتے ہیں اور ان پر کھڑے ہو کر مجمع لگاتے ہیں۔ یہی لوگ ہائیڈ پارک کارنر کے "سوپ کیس اوریٹر" کہلاتے ہیں۔ اسی جگہ جنگ آزادی کے زمانے میں پاکستانی نوجوان تقسیم ہند کی بات کرتے تھے۔ یہاں میں نے ایک کانے، جذامی حبشی کو بارہا تقریر کرتے سنا جو ملکہ انگلستان کو گالیاں دے رہا تھا۔ انگریزوں کی عصمت پر حملہ کر رہا تھا۔ اور انگریز سپاہی کونے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ آپ اگر ہاتھا پائی نہ کریں تو جو جی چاہے کہہ ڈالیں۔ قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔

جن لوگوں نے انگریزی ادب کے خُم سے ایک دو جرعے چڑھا لیے وہ مست ہو گئے۔ وہ اس گلوب تھیٹر کو دیکھتے ہیں جہاں شیکسپیئر لڑکپن میں اُن رئیسوں کے گھوڑوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا جو تھیٹر دیکھنے آتے تھے۔ اور اسی شہر میں رہ کر وہ دنیا کا عظیم تمثیل نگار بنا — شیکسپیئر کی جائے پیدائش اسٹریٹ فورڈ آن ایوان کا قصبہ پرستاران ادب کی زیارت گاہ ہے۔ وہ پھونس کا گھر کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ جہاں موصوف کی سسرال واقع تھی اور اُن کی بیگم این ہاتھاوے جو عمر میں اُن سے بڑی تھیں، رہا کرتی تھیں اور بعد میں خود بدولت بھی گھر داماد بن کر اسی گھر میں اُٹھ آئے۔

یہاں فلیٹ اسٹریٹ میں وہ قدیم شراب خانہ ہے جہاں ڈاکٹر جونسن ہر شخص پر اور خصوصاً اسکاٹ لینڈ والوں پر فقرے چُست کیا کرتا تھا — اور اسکاٹ لینڈ ہی کا ایک باشندہ باسویل یہ فقرے سنتا اور اپنی ڈائری میں ٹانک لیتا — جونسن کی سوانح اسی کی مرہونِ منت ہے —

اسی لندن میں سیکڑوں تاریخی مقامات، درجنوں اہل علم و عمل کے مکانات ہیں، جہاں تہذیب و ادب کی تاریخ بنی۔ چارلس ڈکنس، لارڈ رسل، سڈنی ویب اور نہ معلوم کس کس کے گھر یہاں موجود ہیں۔ پارلیمنٹ کا تاریخی ایوان جس میں ہماری غلامی کے محضر تیار ہوئے، اسی جگہ ہے۔ اور پھر اسی پارلیمنٹ کے در و دیوار نے ہماری جنگ آزادی کی داستانیں سُنیں۔ یہ سب راز اور سب واقعات یہاں محفوظ ہیں — اسی لندن کی رسل روڈ کنسنگٹن پر نمبر ۳۵ کا سہ منزلہ مکان موجود ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پچھلی صدی کے آخر برسوں میں اس مکان کے ایک کمرے میں کون رہتا تھا؟ وہاں ایک دبلا پتلا لڑکا رہتا تھا جو بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ ایک آزاد ملک کا بانی بننے والا تھا۔ اس کا نام محمد علی جناح تھا۔ لگ بھگ چالیس

www.taemeernews.com

برس بعد وہ قائداعظم بنا ـــــ اب رسل روڈ کے اس مکان پر ایک گول نیلی تختی لگی ہوئی ہے۔ جس پر لکھا ہے کہ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح بہ زمانۂ طالب علمی یہاں رہتے تھے۔ غرض یہ کہ اس سرزمین میں ہزار کرشمے ہیں جو دامن دل کو کھینچتے ہیں۔
انگلستان کا جزیرہ حضرت نوح کی کشتی کی طرح ہے۔ اس میں بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مزدور، ادیب، ڈاکٹر، سائنس داں، بدمعاش، اسمگلر، شراب خور، پارسا، لچے لچیاں، صوفی، متقی، گھنٹیاں بجانے والے سرمنڈے پنڈت جو آکسفورڈ اسٹریٹ پر "ہرے رام ہرے رام" کی رٹ لگاتے رہتے ہیں، داڑھی والے مولوی جو اسلامک کلچر سینٹر میں حلقے بنا کر الا اللہ کی ضربیں لگاتے ہیں ـــــ اسلام پر ریسرچ کرنے والے، پورنوگرافی کا مطالعہ کرنے والے، اسلامی آرٹ و فن کی نمائش برپا کرنے والے اور ننگی تصویریں کھینچنے، کھنچوانے، بیچنے اور خریدنے والے غرض یہ کہ سب کے لیے خدا نے اپنی شانِ کریمی سے اس ملک میں رزق اتارا' اور مادی، روحانی، ذہنی اور جسمانی لذتوں اور دلچسپیوں کا سامان مہیا کر دیا ہے ـــــ اسی لیے حضرت اکبرالہ آبادی اور شیخ صاحب میں پرخ ہو گئی۔ بیچارے سیدھے سادے شیخ کو انھوں نے خدا کا گھر دیکھنے کے لیے چلتا کیا اور خود خدا کی شان دیکھنے کی ٹھانی ؎

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

مکتبۂ اربابِ قلم (کراچی) کی مطبوعات

①	مثنوی سیر کراچی	شبنم رومانی	(طنز و مزاح)	۱۹۵۸ء	۵ روپے
②	جزیرہ	شبنم رومانی	(شعری مجموعہ)	۱۹۶۹ء	۵ روپے
③	رزم و بزم	جلیل احمد	(شعری مجموعہ)	۱۹۶۶ء	۱۰ روپے
④	غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	(تنقید)	۱۹۶۴ء	۲۵ روپے
⑤	لاوا	اکرام بریلوی	(ناول)	۱۹۷۰ء	۳۵ روپے
⑥	زرد پتے	جمیل زبیری	(افسانے)	۱۹۷۰ء	۱۵ روپے

مکتبۂ اربابِ قلم، ۲۰۷ گھڑیالی بلڈنگ، صدر کراچی

www.taemeernews.com

پروفیسر شریف کنجاہی

فارغ بخاری

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی

کامل القادری

ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری

علاقائی ادب
اور
برطانوی اہلِ قلم

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

شریف کنجاہی

پنجابی ادب اور برطانوی اہلِ قلم

پنجاب کا انگریزی سلطنت سے الحاق ہر چند ۱۹۴۹ء میں ہوا لیکن اس برصغیر کی دوسری بہت سی علاقائی زبانوں کی طرح انگریزوں کی پنجابی زبان سے دلچسپی کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور ہی میں آغاز ہوگیا تھا۔ اس دلچسپی کے محرکات سیاسی بھی تھے۔ مذہبی بھی تھے اور علمی بھی۔ ان تینوں میں سے بھی حقیقت یہی ہے کہ مذہبی محرک بالادست تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انگریز پادریوں نے ہی پنجابی زبان سیکھنے سمجھنے کے لیے اس کی ویاکرن جاننے کی کوشش کی۔ اس طرح انگریزوں کی لسانی خدمات میں سرِفہرست گرامریں ہیں جن کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز میں سیرام پور میں ہوگئی تھی اور ولیم کیری کے سر سب سے پہلی پنجابی گرامر لکھنے کا سہرا بندھتا ہے۔ یہ کوئی ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ کی بات ہے، اور ہر چند اس سے بیس بائیس برس بعد۔ یعنی ۱۸۳۳ء میں کننگھم نے History of the Sikh اور ۱۸۳۴ء میں پرنسپ نے Origin of the Sikh۔ سیاسی نوعیت کی کتابیں لکھ کر اس خطے کے حالات سے اپنے ہم وطنوں کو باخبر کیا۔ بلکہ میلکم نے تو ۱۸۱۲ء ہی میں Sketch of the Sikhs. تصنیف کردی تھی۔ لیکن الحاق پنجاب کے بعد صحیح معنوں میں پنجابی زبان کی طرف توجہ دی گئی اور لدھیانہ اس کا اسی طرح مرکز بنا جس طرح سیرام پور تھا۔ یہاں سے ہی بائیبل کی نشرو اشاعت شروع ہوئی اور ساتھ ساتھ لغت ولسان کی کتابوں کی تالیف و ترتیب کا سلسلہ بھی چل نکلا۔ یوں ہم ان تصنیفات و تالیفات کو تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ (ا) گرامریں (ب) ڈکشنریاں (ج) انا جیلی تراجم۔

(ا) گرامریں۔ پنجابی زبان کی سب سے پہلی گرامر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ڈاکٹر ولیم کیری نے ترتیب دی تھی۔ اسی کو بنیاد بنا کر جان نیوٹن نے "گرامر آف دی پنجابی لینگویج" کے نام سے نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کی۔ یہ گرامر لدھیانہ مشن نے ۱۸۵۱ء میں شایع کی۔ اس کتاب کو لکھتے وقت مؤلف کے سامنے صرف وہ قاری تھے جو اردو جانتے تھے اور اس کے واسطے سے پنجابی سیکھنا چاہتے تھے۔ اسے انگریزی گرامر کے انداز پر لکھا گیا تھا۔ اسی کو آگے چل کر ۱۸۹۰ء میں مؤلف کے بیٹے ای۔ پی نیوٹن نے کچھ ردو بدل اور اضافے کے ساتھ انگریز پنجابی سیکھنے والوں کے لیے مفید تر کرکے شایع کیا۔ کیونکہ اس میں ان دشواریوں کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی جن سے برطانوی قارئین کو دوچار ہونا پڑتا تھا اور بعد میں کوئی دو تو اعد نویس بھی باپ بیٹے کی اس مخلصانہ محنت کے نتائج

www.taemeernews.com

سے بہرہ در ہوئے بغیر آگے نہ بڑھ سکا۔ انھیں دنوں ریورنڈ گجلڈل نے لندن میں پنجابی گرامر پر کتاب لکھی۔ اور پھر بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ڈاکٹر گراہم بیلی نے A Brief Grammer of Punjabi as spoken in Wazirabad Dist — لکھ کر پنجابی زبان کے علاقائی لہجوں کی طرف توجہ دلائی۔ پھر پندرہ بیس برس بعد ایک اور کتاب مینوئیل اینڈ گرامر مجموعی پنجابی کے بارے میں تصنیف کی۔ ان کے علاوہ جان بیمز نے ہند آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے پنجابی زبان کو بھی موضوعِ بحث بنایا۔ یہ کتاب غالباً ۱۸۶۲ء کے لگ بھگ اشاعت پذیر ہوئی تھی — اسی طرح اے سی ولنر نے Introduction to Prakrit تحریر کرکے زبان شناسی کی طرف قدم اٹھایا —

(ب) ڈکشنریاں — گرامر ہر کسی کی ضرورت ہوتی ہے نہ ہر مزاج کی پسند۔ اسی لیے غیر ملکیوں کی توجہ ہر جگہ قواعد سے ہٹ کر لغت نویسی کی طرف جلد مبذول ہو جاتی ہے۔ پنجابی زبان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ دیاکرن کی کتب کے مقابلے میں لغاتی کتب کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ابتدا پنجاب میں یوں ہوئی کہ ۱۸۵۱ء میں لدھیانہ مشن والوں نے ریزولیوشن پاس کیا کہ پنجابی زبان کی ڈکشنری تیار کی جائے۔ نیوٹن ہی کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ فراہمی الفاظ کا کام کرے۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں نمونے سمیت اس ڈکشنری کا اشتہار ہی نہ چھپا، بلکہ ڈکشنری بھی تیار ہو گئی۔ سمپادن کا کام ریو۔ ایل۔ جان ڈیر نے کیا ۱۸۵۴ء میں اسی چربے پر ایک اور لغت تیار ہوئی۔ جب کہ ۱۸۵۳ء میں کیپٹن اسٹارکی نے انگریزی، پنجابی ڈکشنری مرتب کی۔ پھر ۱۸۵۱ء میں او براؤن نے ملتانی گلاسری ترتیب دی۔ اسٹارکی کی ڈکشنری کے مزاج سے ملتی جلتی ایک ڈکشنری سول اینڈ ملٹری پریس لاہور نے شایع کی تو بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے ڈاکٹر گراہم بیلی۔ کی انگلش پنجابی دکیبولری۔ اپنی پہلی گرامر کی کتاب کی طرح اس ڈکشنری کا دائرہ بھی وزیر آباد اور گوجرانوالہ کے دیہاتی مسلمانوں کی پنجابی زبان تک محدود رہا جس کی اپنی اہمیت تھی۔ اسی طرح سر جیمز ولسن نے شاہ پور گلاسری تو جیوکس نے ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازی خاں کے حوالے سے ڈکشنری آف جنگی ترتیب دی جب کہ ڈاٹک نے کلو گلاسری —

الفاظ میں دلچسپی کا لازمی حصہ محاوروں میں دلچسپی ہوتا ہے چنانچہ اس دلچسپی میں بھی ہم برطانوی واردین کو اسی طرح شریک پاتے ہیں۔ محاوروں کا سب سے پہلا کوشش پادری جان ڈیر نے تیار کیا اور ۱۸۴۲ء میں لدھیانہ مشن نے چھاپا۔ ۱۸۴۲ء میں سر لالیل (جیمز براڈوڈ) نے ضلع کانگڑہ کی رپورٹ مرتب کی تو اس میں کانگڑی لہجے کے محاوروں کا انتخاب شامل کیا! اسی طرح ڈی جی واکر نے چند سال بعد لدھیانہ رپورٹ میں اس علاقے کے محاورے اور کہاوتیں یک جا کیں۔ ڈاکٹر فالن نے ہندی پنجابی اردو کی کہاوتوں کو اکٹھا کیا۔ ٹمپل نے مشرقی پنجاب کے بعض پنجابی ناموں اور بعض دیہات کے ناموں کو موضوعِ تحقیق بنایا —

(ج) اناجیلی تراجم — برصغیر میں برطانوی تسلط کے دور کا مزاج وہی تھا جو صدیوں سے چلتا رہا تھا کہ حکمران اکثر اپنا مذہب بھی ساتھ لے کر آتے تھے اور فولادی تلوار کے ساتھ ساتھ فکری تلوار بھی اپنی کاٹ دکھاتی تھی۔ یہاں جس طرح زرتشی مذہب اور اسلام سیاسی اقتدار کی چھتر چھاؤں میں آئے۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے شبدیز پر سوار ہو کر عیسائیت آئی اور پنجابی زبان میں نصرانی لٹریچر دوسری علاقائی زبانوں کی طرح منتقل ہونے لگا۔ ای پی نیوٹن نے ضمیمے کے طور پر ان کتب و رسائل کی تفصیل A Review and Descriptive Catalouge of Urdu 'Christian Literature. کے آخر میں دی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۶ء میں پنجاب ریلجن بک سوسائٹی کے

www.taemeernews.com

زیرِ اہتمام شایع ہوئی تھی۔ پنجابی ضمیمہ گیارہ صفحات کا تھا جس میں مصنف یا مترجم کا نام۔ کتاب کا نام۔ صفحات۔ سائز۔ قیمت۔ ناشر۔ سال اشاعت اور تعداد اشاعت کو یک جا کیا گیا تھا۔ اس ضمیمے پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ کام جے۔ نیوٹن نے کیا۔ اس کے بعد مس وڈ تھن کا نام آتا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں ایک احساس ہوتا ہے اور اس کا اشارا اصل کتاب کے مصنف نے بھی کر دیا ہے کہ پنجابی زبان میں مشنری لٹریچر زیادہ تر "ہندو پنجابی" میں ہے اور وہ اپنے اس احساس کو ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ "مسلمان پنجابی" (ریڈ ونوں اصطلاحیں اس کی اپنی ہیں) جو فارسی رسم الخط میں ہے نامناسب طور پر نظر انداز کی گئی ہے۔ میں نے اس بات اور ان اصطلاحوں کی طرف اشارا اس لیے کیا ہے کہ ساٹھ سال بعد جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو پنجابی کے یہ دونوں روپ ایک بار پھر اپنے اختلافات کے ساتھ سامنے آ گئے۔

اس بات کا اعادہ بے جا نہ ہوگا کہ پنجابی میں ترجمے اور تصنیف کا کام بیشتر لدھیانہ مشن کی سرپرستی میں ہوا جس کی بنیاد ۱۸۳۴ء میں رکھی گئی تھی جب کہ سیرام پور مشن نے ۱۸۱۵ء میں پہلی بار عہد نامہ جدید کا پنجابی ترجمہ شایع کیا تھا۔ پنٹا ٹیچ کا ۱۸۱۸ء میں اور تمام صحف کا ترجمہ ۱۸۲۶ء میں از سرِ نو ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ریورنڈ جے نیوٹن نے اسی امریکی مشن کی جانب سے جس کا گڑھ سیرام پور تھا ۱۸۳۲ء میں از سرِ نو ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اور بالآخر عہد نامہ جدید کا مکمل ترجمہ اور عہد نامہ قدیم کے بعض حصوں کا ترجمہ کر کے ان کو اشاعت آشنا کیا۔ لیکن ویاکرن۔ لغت اور تراجم کے علاوہ بھی برطانوی اہلِ قلم کی بعض کتابیں انیسویں اور بیسویں صدی میں طبع ہوئیں۔ جو نہ پنجابی زبان میں تھیں اور نہ پنجابی زبان کے متعلق۔ البتہ پنجاب کے متعلق ضرور تھیں اور ساری کی ساری سیاسی نوعیت کی تھیں۔ ان میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں:۔

Origin of the Sikh power in Punjab by Prinsep. 1834

Some passages in the life of an adventurer in Punjab by Lawrence (1842)

History of the Sikhs by Megregor (1846)

Courts and Camps of Ranjeet Singh by Osbourne (1848)

History of the reigning family of Lahore by Smith (1847)

A year in the Punjab Frontier (1848-49)

Punjab Chiefs by Griffen (1865)

Ranjeet Singh by Griffen (1892)

Memoires of Gardner (1899)

Punjab in peace and war by Thorborne (1904)

Punjab Mosalmans by Wikely (1915)

فارغ بخاری

پشتو ادب اور برطانوی اہل قلم

کوئی قوم من حیث القوم بری نہیں ہوتی۔ چند ایک ستم پیشہ یا لٹیرے افراد کے سیاہ کارناموں سے پوری قوم کے کردار سے بدظنی کوئی مستحسن فیصلہ نہیں۔ اچھے برے افراد ہر ملک اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں خود ہمارے ہاں بھی اور دنیا کے ہر گوشے ہر کونے میں ہر انسان کو ایسے عناصر سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔

انگریز ایک شائستہ اور مہذب قوم ہے۔ ان کی عالی ظرفی، وسیع النظری، علم دوستی اور ہنر مندی میں کلام نہیں، لیکن اپنے مقبوضہ علاقوں میں بحیثیت حکمراں کہیں بھی ان کا رول اچھا نہیں رہا۔

ایشیا اور افریقہ میں ان کے مقبوضہ علاقوں کی تفصیل یہ تھی۔

مشرق بعید۔ سنگاپور، ملایا، ہانگ کانگ۔ جنوبی ایشیا: بنگلہ دیش۔ سری لنکا۔ مالدیپ، برما، متحدہ ہندوستان۔

مشرق وسطی: شرق اردن، عراق، کویت، جنوبی یمن، ابوظہبی، قطر، انڈومان۔ بحرین، متحدہ امارات۔

افریقہ: جنوبی افریقہ۔ جنوب مغربی افریقہ۔ ملاوی۔ زمبیا۔ کینیا۔ یوگنڈا۔ تنزانیہ۔ مصر۔ گھانا وغیرہ۔

ان مقبوضات پر صدیوں ان کی حکومت رہی اور اگر دوسری جنگ عظیم ان کی قوت کو پارہ پارہ نہ کر دیتی تو ان بدنصیب ملکوں کو اب تک ان سفید فام ظالم حکمرانوں سے نجات نہ ملتی۔ یہ ہمیشہ اپنے مقبوضہ علاقوں میں آقا بن کر رہے اور ان ملکوں کے حقیقی وارثوں کے ساتھ زر خرید غلاموں سے بھی بدتر سلوک کیا۔ ان کی ثقافت کو پامال کیا۔ ان کے جذبۂ حریت کو کچلنے کی کوشش کی اور ان کے تہذیبی ورثے کو مٹا ڈالا۔ ان خطوں سے آزادی کے متوالوں کا ان شقی اور سنگ دل حکمرانوں نے اس قدر خون بہایا کہ لوگ چنگیز و ہلاکو کو بھول گئے اور اپنے دور اقتدار میں اس قدر تاریخی رسوائی خریدی کہ فرعون و شداد کو بخشوا کر دم لیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے ایسے گہرے گھاؤ رہ گئے جو نسلوں تک پر نہیں ہو سکتے۔ تاہم یہ ملکہ معظمہ کی حکومت کا کارنامہ تھا اور انگریز عوام کو اس کے لیے الزام نہیں دیا جا سکتا۔

انگریزوں کے اپنے ملک انگلستان میں فکر و خیال کے اظہار کی آزادی کا یہ عالم ہے کہ ایشیا کی تمام محکوم قوموں کے حریت پرست راہنماؤں کے لیے یہ سرزمین واحد پناہ گاہ رہی ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی تحریک آزادی کو پروان چڑھایا۔ انگریز حکمرانوں کے خلاف خود ان کے ملک میں بیٹھ کر اخبار جاری کیے اور انگریزوں کی شقاوت و درندگی کے واقعات ساری دنیا پر آشکارا کیے۔ یہی نہیں بلکہ انگلستان کے اخبارات نے جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی فائرنگ کے خوں ریز واقعات کو شہ سرخیوں سے شایع کیا اور

www.taemeernews.com

فارغ بخاری

پشتو ادب اور برطانوی اہل قلم

اپنے افتتاحیہ مقالوں میں اسے اس صدی کا ایسا المیہ قرار دیا جو تاریخ میں سیاہ حروف سے لکھا جائے گا۔

یہ اسی انگریز قوم کے افراد کا کردار ہے جو ایک طرف مقبوضہ علاقوں میں جلاد حکمرانوں کا رول ادا کرتے رہے تو دوسری طرف اپنے ملک میں آزادئ تحریر و تقریر کے سب سے بڑے داعی بنے رہے۔

بظاہر انگریزوں کے کردار کا یہ تضاد بڑا حیران کن لگتا ہے۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ انگریز من حیث القوم برے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان کے متعلق یہ فیصلہ دے سکتے ہیں کہ ــــــ

انگریز بحیثیت انسان بہت اچھے ہیں ــــ

اور ــــــ

بحیثیت حکمران بہت برے ثابت ہوئے ہیں ــــ

انگریز مستشرقین کی تصنیفات میں بھی زیادہ تر ان کی یہی سیاسی عصبیت کارفرما نظر آتی ہے انھیں میں سے بیشتر نے صوبہ سرحد کی پشتون تہذیب و ثقافت اور یہاں کے باشندوں کے کردار کو مسخ کرنے اور پشتون کو جاہل، اجڈ اور وحشی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، جو ان مصنفین کی کتابوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

"خیبر میں اٹھارہ سال" (Eighteen years in Khyber) (۱۸۷۹-۹۸)

یہ کتاب مسٹر واربرٹن کی تصنیف ہے جو پنجاب میں ڈپٹی کمشنر بھی رہا اور خیبر میں اٹھارہ برس پولیٹیکل ایجنٹ کے فرائض انجام دیئے یہ اقتباس اس کتاب سے پیش کیا جاتا ہے ــــ

"ایک عظیم طاقت ۲۵ سالہ پرامن قبضے کے بعد بھی اس نیم وحشی قوم پر ہمارا بہت کم اثر قایم ہو سکا اور ہمیں اس کے متعلق اتنا کم علم ہے کہ اس کا اہم ترین شہر پشاور کبھی ایک ہیبت کدہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں شہر سے دو میل دور بھی انگریز کی جان کے بچاؤ کے لیے کوئی ضمانت نہیں۔"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے ــــ

"آفریدی کو پیدا ہوتے ہی سارے بنی آدم سے نفرت سکھائی جاتی ہے، وہ ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھ کر حملے کی ابتدا کرتا ہے تاکہ کوئی اسے زیر نہ کر سکے۔ مگر اسے قابو میں لانے کے لیے محبت اور منافقت کی ضرورت ہے۔"

لارڈ لٹن اپنی کتاب (Frontier) میں لکھتا ہے ــــ

"سرحد کے جاہل باشندوں پر ہم طاقت اور بربریت سے بھی قابو نہ پا سکے ایک ربع صدی کے قبضے کے بعد بھی وہ نہ سرحدی جسموں پر قبضہ کر سکے نہ دلوں پر ــــ"

میجر جیمز کی کتاب "وحشی قوم" کا اقتباس دیکھیے ــــ

ــــ "پشاور کا علاقہ پٹھانوں کی آبادی پر مشتمل ہے اور پٹھان اور خون آشامی ہم معنی الفاظ ہیں"

رابرٹ منٹگمری کی رائے ہے ــــ

"سرحدی خون بہانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں وہ انتقام لینے کو تقدیس سمجھتے ہیں مسلسل اور

www.taemeernews.com

فارغ بخاری

پشتو ادب اور برطانوی اہلِ قلم

متعدی خون خرابہ ان کا نشاطیہ پہلو ہے اور خون بہانا ان کے نزدیک ایک نیکی اور مقدس فریضہ ہے۔
خوں ریزی ان کا جدی ورثہ ہے وہ عدل وانصاف کی جگہ خون بہاتے ہیں اور غلطی کی اصلاح تلوار کی
نوک سے کرتے ہیں ۔۔۔۔"

مسٹر ہربرٹ ہیوز کہتا ہے ۔۔۔۔

"پشاور میں پٹھان صرف ۷۶ فی صد ہیں لیکن یہاں کی ہوا کی کچھ ایسی خاصیت ہے کہ ہر مسلمان
میں تشدد اور خون آشامی کا جذبہ ہے ۔۔۔۔"

سر الفریڈ رقم طراز ہے ۔۔۔۔

"پٹھان قوم کے کردار پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ان پر تشدد سے حکومت کی جائے
کیونکہ جنگلی گھوڑے کو ریشم کی لگام نہیں دی جا سکتی ۔۔۔۔"

برصغیر کی دوسری زبانوں کی طرح پشتو زبان و ادب کے سلسلے میں بھی بعض مستشرقین کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔ پشتو زبان وادب کی تحقیق و تدقیق کے لیے فرنچ اور جرمن اسکالر بھی کام کرتے رہے انھوں نے پشتو زبان کی تحقیق کے علاوہ پشتو زبان سیکھنے سکھانے کے لیے گرامر اور لغت کی کتابیں بھی لکھ کر شائع کیں، مغلوں کے بعد اس علاقے کی حالت بہت ابتر تھی۔ درانی حکمرانوں کی خود غرضی اور خوانین کی بے اتفاقی نے پہلے تو سید احمد بریلوی کی تحریک کو ناکام بنا کر سکھوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع دیا پھر ان کے بعد انگریزوں کے لیے راہ کھل گئی۔ دراصل انگریز مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ اقتدار سے پہلے ہی ان علاقوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں ایرانیوں سے سازباز میں لگے ہوئے تھے، انہی دنوں روس بھی ان علاقوں میں دلچسپی لینے لگا، پٹھانوں سے براہِ راست رابطہ پیدا کرنے کے لیے روس انگریزوں سے بھی آگے تھا اس زمرے میں پہلا اہم نام مشہور مستشرق پروفیسر ڈورن Prof. Dorren کا سامنے آتا ہے جس نے روسی حکومت کے ایما پر پشتو زبان اور اس کے ادب کے متعلق معلومات فراہم کیں۔

انگریزوں نے بھی پٹھانوں سے بلاواسطہ رابطہ پیدا کرنے کے لیے ان کی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس کی اور نصاب کی کتب کے علاوہ زبان وادب میں بھی دلچسپی لی۔

دراصل یہ ایک نہایت گہری سیاسی مہم تھی۔ وہ تمام بیرونی طاقتیں جو اس خطے میں اپنا اثر بڑھانے میں دلچسپی رکھتی تھیں ان کے لیے یہی ایک واحد راستہ تھا کہ پٹھانوں کی زبان سیکھ کر براہِ راست ان سے رابطہ بڑھائیں کیونکہ اس کے بغیر انھیں تسخیر کرنا، ان پر قابو پانا اور ان پر حکومت کرنا ممکن نہ تھا۔ اس سلسلے میں ان سب بیرونی طالع آزما قوموں میں مقابلے کی دوڑ ایک عرصہ تک جاری رہی۔ لیکن انگریز شاطر اس دوڑ میں سب سے آگے نکل گئے اور ان کی حکمتِ عملی نے سب کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔

انگریز مستشرقین نے اسی سلسلے میں پشتو زبان میں دسترس حاصل کر کے زبان اور نصاب کی کتابیں اپنی قوم کے لیے لکھیں اور اس طرح اپنے حکمران طبقے کی مدد کی، ورنہ دراصل پشتو زبان سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، اپنی حکومت کی طرف سے پشتو زبان جاننے والے افسروں کے لیے خاص الاؤنس مقرر تھا اور پشتو زبان سکھانے والے انگریزوں کو انعام واکرام سے

www.taemeernews.com

نوازا جاتا تھا ـــــــ

تاہم کچھ انگریز مستشرقین ایسے بھی ہیں جنھوں نے خالص علمی و ادبی لگن سے پشتو زبان و ادب میں دلچسپی لی اور ایسی قابل قدر خدمات انجام دیں جن کے احسانات سے پشتو زبان و ادب کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہم اپنے اس مقالے کو انہی عظیم انگریز مستشرقین کے ذکر تک محدود رکھتے ہیں ـــــــ

کلاب رابرٹ کی کتاب پشتو گرامر ۱۸۱۱ء میں سینٹ برگ سے شایع ہوئی اس کا ذکر پروفیسر ڈارن نے کیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے ـــــــ

"پروفیسر ڈورن نسلاً انگریز تھے ۱۸۰۵ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۸۲۶ء میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۵ء میں سینٹ پیٹرز برگ کی اورنٹیل انسٹیٹوٹ میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۸۴۲ء میں ایشیاٹک میوزیم کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔ ۱۸۴۳ء میں امپیریل پبلک لائبریری کے چیف لائبریرین ہوئے۔ انھیں افغانستان اور کاکیشیا کی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ درسی کتب کے علاوہ ۱۸۳۶ء میں پٹھانوں کی تاریخ، ۱۸۴۵ء میں پشتو لغت اور ۱۸۴۷ء میں پشتو زبان پر ایک کتاب شایع کی۔ انھوں نے غلام نعمت اللہ کی پشتو تاریخ کا ترجمہ بھی کیا اور اس کے حواشی بھی لکھے۔ ۱۸۸۱ء میں سینٹ پیٹرز برگ میں انتقال ہوا ـــــــ

ایچ۔ جی۔ راورٹی (H. G. Roverty) مشہور انگریز مستشرق اور پشتو زبان کے عالم اور نامور مصنف تھے۔ فوج میں لفٹنٹ بھرتی ہوئے۔ ترقی پا کر میجر ہو گئے۔ اُن کا تعلق پنجاب آرمی کی بمبئی ڈویژن سے تھا۔ ایک عرصہ تک پشاور میں رہے۔ انھوں نے نہ صرف خود پشتو زبان میں سیادت حاصل کی۔ بلکہ پشتو کی گرامر، لغت اور ادب سے متعلق کئی کتابیں بھی لکھیں، انھوں نے دوسرے لوگوں کے علاوہ خصوصیت سے دو استادوں سے استفادہ کیا۔ ایک ہشت نگر کے علاقے کا تھا، دوسرا قندھار کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پشتو زبان کے دونوں لہجوں (Dialects) کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے انھوں نے اپنی کتاب میں میجر لیچ (Maj. Leech) کا اور پروفیسر ڈررن Prof. Dorren کا ذکر بھی کیا ہے۔ میجر لیچ کی گرامر اس سے پہلے چھپ چکی تھی۔ راورٹی نے اپنی گرامر بڑی محنت سے لکھی اگرچہ راورٹی کے بعد بھی مستشرقین نے پشتو گرامر پر بڑی اچھی کتابیں تصنیف کیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی راورٹی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ راورٹی کی گرامر کا پہلا ایڈیشن کلکتہ میں چھپا تھا جب اس کا دوسرا ایڈیشن لندن میں چھپا تو انگلستان کے بعض اخبارات و رسائل نے اس پر بڑے اچھے تبصرے کیے۔ راورٹی کی دوسری مشہور پشتو تصنیف "گلشن روہ" ہے جو پشتو کے نامور شعرا کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر ڈارن نے بھی پشتو منظومات اور نثر کا انتخاب شایع کیا تھا۔ مگر راورٹی کی کتاب بہت پسند کی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔ خود پروفیسر ڈارن نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ راورٹی نے ان اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کر کے پشتون شعرا کو یورپ میں متعارف کرایا۔ علامہ اقبال بھی راورٹی کے اس ترجمہ کی وساطت ہی سے پہلی دفعہ پشتون شعرا خصوصاً خوشحال خان خٹک کے کلام سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ان کی بعض اصطلاحات شاہین، شہباز اور خودی وغیرہ کا ماخذ خوشحال خان کا کلام ہی بتایا جاتا ہے۔

راورٹی نے مینول آف پشتو (Manual of Pushtu) کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی اور آخر میں پادری جیمز کی

www.taemeernews.com

مشہور کتاب (Aesap Fables) کا پشتو ترجمہ شایع کیا۔ یہ کتاب پشتو نثر کی غالباً پہلی مطبوعہ کتاب ہے جسے مغربی طرز پر نہایت آسان اور سلیس پشتو میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں لندن میں شایع ہوئی جو اب نایاب ہے۔
دی ہوم نیوز (The Home News) اپریل ۱۹۰۳ء کی اشاعت میں اس کتاب کو راورٹی کی آخری کاوش بتایا ہے۔ ڈیلی نیوز (Daily News) نے ۱۸۵۳ء میں راورٹی کو (Very Young) لکھا ہے اس لیے اگر اُسے اس وقت بیس یا پچیس برس کا خیال کیا جائے تو بھی ۱۸۷۱ء میں وہ اتنا معمر نہ تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے کچھ اور کام بھی کیا ہو۔
راورٹی فارسی، گجراتی اور مرہٹی زبانیں بھی جانتا تھا ان زبانوں کے متعلق بھی اس نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ راورٹی نے اپنی پشتو گرامر میں اس کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا، مگر معلوم نہ ہوسکا کہ وہ یہ ترجمہ مکمل کرسکا یا نہیں۔
ہنری والٹر بیلیو (Henry Walter Bellew) بنگال آرمی میں اسسٹنٹ سرجن تھا اس نے پشتو گرامر اور پشتو سے انگریزی اور انگریزی سے پشتو لغات کی کتابیں لکھیں جو علی الترتیب ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں لاہور سے شایع ہوئیں، انھوں نے خوش حال خان خٹک کا دیوان بھی شایع کیا۔
جیمز ڈارمسٹیٹر (James Darmestator) مشہور مصنف اور محقق تھا ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۴ء میں انتقال کیا۔ ۱۸۷۵ء میں ژند اوستا پر مقالہ لکھا، ۱۸۷۷ء میں ژند کے استاد مقرر ہوئے۔ ۹۳-۱۸۹۲ء میں ژند اوستا کا تین جلدوں میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے میکس مولر کے لیے ژند اوستا کی تدوین کی۔ ۱۸۸۵ء میں کالج آف فرانس میں ایرانی اور پشتو زبان و ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں انھیں ہندوستان اس غرض سے بھیجا گیا کہ وہ پٹھانوں کے عوامی گیت جمع کریں۔ انھوں نے یہاں چند سال گزارے، کچھ عرصہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔
انھوں نے مشرقی ادب پر متفرق کتابیں لکھیں جن میں ایرانی زبانوں کا مطالعہ (Studies of Iranian Languages) اور فارسی شاعری کے ماخذ (Origin of Persian Poetry) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
پشتو عوامی گیتوں کا مجموعہ "بہار و بہار" کے نام سے ۱۸۸۸ء میں پیرس سے شایع ہوا۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں پشتو زبان کے لغوی، اشتقاقات اور علم الاصوات (Phanetics) پر بیرحاصل تبصرہ ہے اور دوسرا حصہ پشتو زبان کے لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔
اپنی اس کتاب میں ڈارمسٹیٹر نے نہ صرف پشتو زبان کی اصل کے متعلق محققانہ بحث کی ہے بلکہ پشتو کے ایسے چاربیتے بھی محفوظ کردیے ہیں جو اس وقت کے سیاسی حالات اور پٹھانوں کے جذبۂ حریت اور جہاد کی عکاسی کرتے ہیں، علاوہ ازیں اس کتاب کی وساطت سے بعض ایسے شعرا کے نام بھی ہم تک پہنچے ہیں، جو بصورت دیگر سیکڑوں ہزاروں دوسرے عوامی شعرا کی طرح تاریکی ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔
گرائیگر (Greager) نے پشتو زبان کے اشتقاقات Etymology پر ایک رسالہ لکھا جس میں پشتو الفاظ کا مقابلہ اوستا اور سنسکرت کے الفاظ سے کیا ہے۔
پادری ہیوز (T. P. Hughes) پشتو زبان کے مشہور عالم تھے، ان کی خدمات پشتو زبان و ادب کے سلسلے میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ انھوں نے پشتو نظم و نثر کے منتخب شہ پاروں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب "کلید افغانی" کے نام سے لاہور

www.taemeernews.com

میں طبع ہوئی۔ کلید افغانی کا ایک حصہ "چمن بے نظیر" کے نام سے موسوم ہے جو دراصل اس بڑے مجموعہ کا انتخاب ہے جو پادری ہیوز نے برٹش میوزیم کے کتب خانے کو دیا تھا۔ اس حصے میں اس وقت تک کے مشہور پشتون شعرا کے کلام کے نمونے دیے گئے ہیں ان میں سے بعض کے دیوان پچھلے برسوں میں شایع ہو چکے ہیں، مگر کچھ ایسے بھی ہیں جن کے نہ تو دیوان دستیاب ہو سکے ہیں نہ ہی حالات منظر عام پر آئے ہیں۔

پادری ہیوز پشتو زبان میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے بڑی محنت اور کوشش سے جہاں کہیں سے بھی کسی شاعر کا دیوان یا کوئی کتاب مل سکی اسے ہر قیمت پہ حاصل کیا اگر قلمی نسخہ نہ ملا تو اس کی خوش خط نقل کرائی، انھوں نے یہ تمام نوادرات برٹش میوزیم کے کتب خانے کو تفویض کر دیے۔ صرف پادری ہیوز ہی نے نہیں بلکہ راورٹی اور دوسرے مستشرقین نے بھی یہ نوادرات جمع کر کے اپنے ملک کے کتب خانوں کی زینت بنائے۔ اپنے بزرگوں کے ان شہ پاروں کو یورپ کے کتب خانوں میں دیکھ کر ہر علم دوست انسان کے دل کو دھچکا لگتا ہے مگر ساتھ ہی ہم علم و ادب کے ان قدر دانوں کے شکر گزار بھی ہیں جنھوں نے ان نوادرات کو محفوظ کر لیا ورنہ یہاں تو اپنی قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ اس قسم کی پرانی کتابیں دریا برد کر دی جاتی تھیں۔ یا کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ خدا جانے کتنی ہی ایسی بیش قیمت کتب اس طرح ضایع ہوئی ہوں گی۔

ٹی سی پلوڈن (T. C. Plouden) نے انگریز افسروں کے پشتو نصاب کے لیے "گنج پشتو" لکھی جس کا ۱۸۷۵ء میں انگریزی ترجمہ شایع ہوا پھر ۱۹۰۳ء میں ایک اور انگریز بی۔ ای۔ ایم گرڈن (B. E. M Gurden) نے اس کا ترجمہ چترالی زبان میں کلکتہ سے شایع کیا۔

کپتان واگن (Capt. Waugan) بنگال آرمی میں تھے ان کا ذکر راورٹی نے کیا ہے، انھوں نے پشتو گرامر کی ایک مختصر سی کتاب لکھی جو ۱۸۵۴ء میں لندن سے شایع ہوئی۔

گریرسن (Sir George Abraham Grierson) ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔ ٹرنٹی کالج ڈبلن میں تعلیم پائی ۱۸۷۱ء میں انڈین سول سروس کے ممبر منتخب ہوئے اور ہندوستان میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۳ء تک وہ لنگوسٹک سروے آف انڈیا کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے برصغیر ہندو پاک کی زبانوں اور ادب پر مختلف کتابیں لکھ کر شایع کیں۔ جب انھوں نے اپنا تحقیقاتی کام ہندوستانی لسانیات کا جائزہ (Linguistic Survey of India) مکمل کیا تو اس عظیم کارنامے پر انھیں آرڈر آف میرٹ (Order of Merit) کا اعزاز ملا یہ کتاب ۱۹ جلدوں میں ۱۹۲۷ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب کی دسویں جلد میں پشتو زبان اور اس کے مختلف لہجوں (Dialects) پر بھرپور بحث کی گئی ہے اور ان کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

گریرسن کو انگریز مستشرقین میں غیر معمولی مقام حاصل ہے، وہ ایک جینئس انسان اور پیدایشی زبان دان (Linguistic) تھا، تحقیق و تدقیق کا ذوق اسے فطری طور پر ودیعت ہوا تھا۔ "ہندوستانی لسانیات کا جائزہ" اس کا اتنا عظیم کارنامہ ہے جسے لسانیات کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

مالیون (Malivan) نے پشتو زبان کے کچھ عوامی قصے کلکتہ سے شایع کیے۔

مارگنسٹرن (Dr. George Merganstierne) ناروے کی اوسلو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ایک عرصے تک

www.taemeernews.com

افغانستان میں رہے، ان کی پشتو زبان اور پشتون قوم کے متعلق کتابی شکل میں ——

(Report on a Linguistic Mission to North West India)

کے نام سے ۱۹۳۲ء میں اوسلو یونیورسٹی کی طرف سے شایع کی گئی۔ انھوں نے ایک کتاب پشتو اشتقاقات Etymology پر اور ایک کتاب خوش حال خان خٹک کی شاعری پر بھی لکھی۔

ڈاکٹر پنیرل (Dr. Herbert Penrel) پہلے امریکہ کی مشیگن یونیورسٹی میں جرمن زبان پڑھاتے تھے۔ بعد میں کیلیفورنیا یونیورسٹی چلے گئے۔ آپ نے کافی عرصہ افغانستان خصوصاً قندھار میں گزارا اور پشتو زبان کی ساخت اور گرامر پر عبور حاصل کیا۔ ۱۹۵۵ء میں جدید لسانیات کی روشنی میں پشتو گرامر کی ایک اہم کتاب لکھی۔ یہ گرامر زیادہ تر قندھاری پشتو سے متعلق ہے۔ آپ نے انگریزی میں پشتو کے متعلق کئی رسائل لکھے، ۷۳-۱۹۷۱ء میں کچھ پشتون ادیبوں سے مل کر امریکی طلبہ کے لیے ابتدائی اور پوسٹ گریجوایٹ درجہ کے لیے پشتو کی نصابی کتابیں لکھیں، علاوہ ازیں پشتو انگریزی لغت کا کام بھی شروع کیا تھا، مگر بعض وجوہ کی بنا پر مکمل نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر ٹرمپ (Dr. Ernest Trump) نے ۱۸۷۳ء میں پشتو گرامر لکھی جو لندن میں وی آنا امپیریل اکیڈمی آف سائنس کی امداد سے شایع ہوئی۔ یہ کتاب انھوں نے نہایت احترام کے ساتھ پروفیسر ڈارون کے نام معنون کی ہے۔ ڈاکٹر ٹرمپ نے اس کا دیباچہ ٹیوبنگن (جرمنی) میں لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو اور عربی فارسی کی کتابیں جو ٹیوبنگن کے کتب خانہ میں موجود ہیں وہ ڈاکٹر ٹرمپ کی وساطت سے وہاں پہنچیں، ان قلمی نسخوں میں بانیٔ انصاری کی مشہور کتاب "خیرالبیان" بھی ہے جو دنیا بھر میں اس کتاب کا واحد نسخہ ہے۔ اس کتاب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مولانا عبدالقادر مرحوم ڈائرکٹر پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے حاصل کرکے اپنے آخری ایام میں اسے اکیڈمی کے زیر اہتمام شایع کیا۔ مولانا مرحوم کا یہ کارنامہ پشتو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

یہ باب ۱۹۰۰ء پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد کے مستشرقین کا ذکر دوسرے باب سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسرا باب

روس کیپل (Roos Keppie) شمال مغربی صوبۂ سرحد میں پہلے پولیٹیکل ایجنٹ تھے، انھوں نے آخر تک اپنے ساتھی نواب سر عبدالقیوم خان کا ساتھ دیا، جو صوبۂ سرحد میں انگریزی حکومت کے نہایت معتمد افسر اور صوبۂ سرحد کے پہلے وزیر اعلیٰ تھے۔ روس کیپل نے ۱۹۰۱ء میں مینول آف پشتو (Manual of Pushtu) کے نام سے ایک درسی کتاب شایع کی جس میں پشتو گرامر کے علاوہ انگریزی پشتو ترجمہ کے اسباق بھی ہیں۔

لاریمیر (Laremeer) نے وزیری پشتو گرامر مرتب کی جو ۱۹۰۲ء میں لندن میں طبع ہوئی، اس کے علاوہ ۱۹۱۵ء میں آکسفورڈ سے پشتو زبان کی صرف و نحو پر ایک کتاب شایع کی۔

میجر کاکس (Maj. A. B. Cox) پنجابی رجمنٹ میں تھے انھوں نے ۱۹۱۱ء میں پشتو گرامر پر ایک کتاب لندن سے شایع کی۔

www.taemeernews.com

گلبرٹسن (Gilburtson) انھوں نے پشتو زبان پر اپنی پہلی تصنیف بنارس سے اور دوسری کتاب ـ ـ ـ ـ (Pushtu Language) پشتو زبان ۱۹۲۹ء میں ہرٹ فورڈ سے شایع کی۔ اسی سال ان کی ایک اور کتاب پشتو محاورہ لغت پر (The English Pushtu Colloquial Dictionery) بھی شایع ہوئی۔

بیڈلف (E. C. Biddulf) ٹرنٹی کالج کیمبرج میں پروفیسر تھے انھوں نے ۱۸۹۰ء میں ایک کتاب "سترھویں صدی کی پشتو شاعری" (Afghan Poetry of 17th Century) لکھی جو لندن سے شایع ہوئی۔ یہ کتاب خوش حال خان خٹک کی نظموں پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر میکنزی (Dr. M. Mackenzie) لندن اسکول آف اورنیٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے خوش حال خان خٹک کی کچھ نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔

سراولف کیرو (SirOlif Ceroe) قیام پاکستان سے پہلے صوبۂ سرحد کے گورنر رہ چکے ہیں انگلستان واپس جاکر انھوں نے دی پٹھان (The Pathan) کے نام سے ایک ضخیم تاریخی کتاب لکھی جس میں پشتو زبان، پشتون قوم، پشتون قبائل، صوبۂ سرحد کے تاریخی اور جغرافیائی کوائف، سیاسی حالات اور مذہبی و ثقافتی واقعات پر اپنے نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے نظریات اور تجربات کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ پشتو اکیڈیمی نے شایع کیا ہے۔

اسی طرح اوالڈ (Evald) فریڈرک ہاٹ (Fredrik Hot) اور چائلڈ (Child) وغیرہ نے بھی پشتو زبان و ادب پر قابل قدر کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

انگریز مستشرقین نے پشتو شعر و ادب، پشتو ثقافت، پشتو لوک گیتوں اور پشتون قبیلوں پر گراں قدر کام کیا ہے۔ پشتو زبان پر ان کی برسوں کی تحقیقاتی کاوشیں آج بھی اس زبان کے محققین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو رہی ہیں۔ انھوں نے جہالت کی ظلمتوں میں علم کے جو چراغ جلائے ہیں ان کے اجالے آج اربابِ فکر و نظر کے ذہنوں کو روشنی عطا کر رہے ہیں۔

ہمیں ان عظیم محققین کے عظیم علمی کارناموں کو دیکھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوا ہے کہ ان کی ان علمی ادبی اور تحقیقی خدمات نے اپنی قوم کے ظالم اور سفاک حکمرانوں کے رسوائے زمانہ کردار کی بہت حد تک تلافی کردی ہے۔ انھوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں یہاں کے پر امن اور نہتے عوام پر اپنے بہیمانہ مظالم سے اس خطے کے باشندوں کے دلوں میں انگریز قوم کے خلاف نفرت کے جو بیج بوئے، اس قوم کی علمی شخصیتوں کی مخلصانہ علمی کوشش نے کم از کم یہاں کے اہلِ علم کو اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے بچایا ہے کہ انگریز قوم مجموعی طور پر اپنے ظالمانہ کردار کے باعث قابلِ نفریں ہے۔ ان عظیم علمی رہنماؤں کا پشتو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ انگریز قوم پر بھی بے پناہ احسانات ہیں کہ انھوں نے محکوم قوموں کے دلوں سے اس نفرت کے داغوں کو دھونے اور ان کی شدت کم کرنے میں بڑی مدد دی جو انگریز آقاؤں نے نشۂ اقتدار میں بہک کر اپنے انسان دشمن رویے سے پیدا کی تھی ـــــ

ہمیں یقین ہے کہ پشتو زبان و ادب کی تاریخ اپنے ان محسن انگریز مستشرقین کے لازوال محققانہ کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کرسکے گی اور ان کی یہ عظیم علمی کاوشیں ہمیشہ زندہ و پایندہ رہیں گی۔

www.taemeernews.com

کتابیات

Selection of the Poetry of the Afghan by H. G. Roverty

A Grammer of Pushtu Language by H G. Roverty

Afghan Poetry of the 17th Century by C. E. Bundulph

The Poems of Khushal Khan Khattak by E. Howell & Caroe

Pushtu Verse by D. N. Mackenzie

The Pathan by Sir Olf Caroe

Afghanistan by Sir Frazer Tytler

Corrigendum of an Historical Fact by Nawab Sir Mohd Akbar Khan of Hoti

Development of Kharoshti Script by Dr. C. C. Das

Naqluna by Col. C. A. Boyle

The Kingdom of Kabul by Elphinston

A Nomadic Tribe of Eastern Afghanistan by Capt. Robinson

Linguistic survey of India by George Grierson

Encyclopaedia Britannica

Encyclopaedia Americana

۱-	پختانہ شعرا حصہ اول	از عبدالحیٰ حبیبی	۱۴-	خوش حال خان خٹک	دوست محمد کامل
۲-	دپختو ادب تاریخ	از صدیق اللہ رشتین	۱۵-	پشتو ادب	اجمل خٹک
۳-	پختو ادب	از عبدالحلیم اثر	۱۶-	منتخبات خوش حال	انوار الحق
۴-	دپختو تاریخ	از قاضی عطاء اللہ	۱۷-	تاریخ پشاور	——
۵-	پختانہ لیکوال	ہمیش خلیل	۱۸-	تاریخ ہزارہ	——
۶-	دپختو ادبیاتو تاریخ	عبدالحیٰ حبیبی	۱۹-	چار بیتے	نصر اللہ خان نصر
۷-	لوئے احمد شاہ بابا	〃	۲۰-	ٹپے	اکبر صابر
۸-	ہارو بہار	ڈار مسٹیٹر	۲۱-	اردو میں پشتو کا حصہ	علامہ عرشی رامپوری
۹-	سرحد کے رومان	رضا ہمدانی	۲۲-	رنگا رنگ گلونا	فضل غنی مجاہد
۱۰-	ادبیات سرحد پشتو	〃	۲۳-	دخلکو سندرے	حبیب اللہ رفیع
۱۱-	اٹک کے اس پار	〃	۲۴-	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک ہند	(علاقائی ادب)
۱۲-	تاریخ افغانستان	حیات خان	۲۵-	آثار قدیمہ	عنایت علی شاہ بخاری
۱۳-	تاریخ یوسف زئی پٹھان	اللہ بخش یوسفی			

www.taemeernews.com

ڈاکٹر عبدالمجید میمن سندھی

سندھی ادب اور برطانوی اہلِ قلم

یورپی اقوام کی آمد

سکندر مقدونی کے بعد، یورپی سفید اقوام میں پرتگیزوہ پہلے بحری قزاق تھے جنھوں نے سمندری راستے سے ہندوستان کا پتہ لگایا اور یہاں پہنچ کر مشرق کی بے پناہ دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کیا اور لوٹتے رہے۔ یہاں تک کہ اس لوٹ کھسوٹ کو دیکھ کر دوسری یورپی قومیں بھی للچائیں اور مغلیہ دورِ حکومت میں کئی ایک مغربی سیاح ہندوستان کا اقتصادی جائزہ لینے کی غرض سے یہاں آ پہنچے۔ ان آنے والوں میں کچھ ڈاکٹر تھے تو کچھ پادری، کچھ یورپ کے بادشاہوں کی طرف سے بھیجے گئے سفیر تھے تو کچھ توپچی جنھیں مغل بادشاہوں نے اپنے توپ خانے میں بھرتی کرلیا اور اس طرح یہ لوگ اپنے اصل مقصد کے لیے کام کرنے لگے ـــــــ

پرتگیزوں کی سندھ میں آمد

سندھ کے ارغون حکمران شاہ حسن ارغون کی وفات کے بعد یہاں کی حکومت دو حصوں میں بٹ گئی جن میں شمالی سندھ پر محمود بکھری قابض ہوئے اور بکھر کو دارالسلطنت بنایا جب کہ جنوبی سندھ پر مرزا عیسٰی خان کا قبضہ ہوگیا۔ دونوں حکومتیں آپس میں لڑنے لگیں چنانچہ ۹۷۳ھ مطابق ۶۶-۱۵۶۵ء میں مرزا عیسٰی بکھر کے حاکم محمود بکھری سے نبردآزما ہونے کے لیے بکھر کی طرف روانہ ہوئے تو عین انہی دنوں میں مرزا کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پرتگیز سندھ کے لاہری بندر کے راستے ٹھٹھہ میں داخل ہوئے اور نہ صرف یہ کہ انتہائی بے دردی سے ٹھٹھہ کو لوٹا، بلکہ یہاں آگ لگا کر انتہائی نقصان پہنچایا۔ خود مغربی مورخین کا بیان ہے کہ پرتگیزی یہاں سے اس قدر مال لوٹ کر لے گئے کہ شاید ہی انھیں اتنا مال کسی اور جگہ سے ملا ہو ـــــــ

پرتگیزی سیاحوں میں "ڈیوریٹ باربوسا" پہلے سیاح ہیں جنھوں نے جزیرہ ہرمز سے لے کر گجرات تک سمندری مسافت کی اور بہت کچھ لکھا جس میں سندھ کے متعلق بھی کچھ مواد ملتا ہے مگر انتہائی غلط اور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"سندھ پر عربوں کی حکومت ہے۔ یہاں کے باشندے خشک مچھلی گھوڑوں کو کھلاتے ہیں ـــــــ

www.taemeernews.com

یہاں کے ایک پودے کے تنے آدمی کی ٹانگوں جیسے موٹے ہوتے ہیں۔ سندھ دریائے فرات سے نکل کر ایرانی نہر سے ہوتی ہوئی کھنبھات کی نہر میں گرتی ہے"۔[1]

یہ ایسی باتیں ہیں، جو کسی بھی زاویے سے درست نہیں ——

سندھ میں انگریزوں کی آمد

۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے سورت میں اپنی پہلی تجارتی کوٹھی قایم کی جس کے بعد انگریز سیاح ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کرنے لگے۔ جو لوگ سندھ آئے اُن میں انتھونی ستارے کا نام سرِ فہرست ہے۔ یہ شخص ۱۶۱۲ء میں جاسوسی کی غرض سے ٹھٹھہ پہنچا۔ لیکن قبل اس کے کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا۔ ایک پرتگیز پادری نے لاہری بندر میں اسے زہر دے کر ہمیشہ کی نیند سُلا دیا ——

انتھونی ستارے کے بعد تھامس پادیل نامی شخص تجارتی فوائد کا جائزہ لینے ٹھٹھہ پہنچا اور اس کے بعد ۱۶۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے نکولس وتھنگٹن کو نیل خریدنے کے لیے احمد آباد سے سندھ بھیجا گیا۔ یہ شخص "میرپور بٹھور" تک پہنچا تھا کہ راستے میں بلوچوں نے لوٹ لیا اور وہ واپس ننگر پار پہنچ کر اپنے ایک شناسا ہندو تاجر سے روپیہ لے کر احمد آباد پہنچ گیا۔ دورانِ سفر اس نے جو کچھ دیکھا وہ قلم بند کیا ہے جس سے سندھ کے متعلق بھی کچھ مواد ملتا ہے ——

ٹامس رو

۱۶۱۵ء میں جیمز اوّل بادشاہ انگلستان کی طرف سے بھیجا گیا۔ سفیر ٹامس رو سندھ آیا اور ۱۶۱۵ء کی چوبیس دسمبر کو اس نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو سندھ کے متعلق رپورٹ پیش کی جس میں لکھتا ہے:

"مجھے یقینی طور پر معلوم ہے کہ سندھو دریا تجارت کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد ہے کیونکہ لاہور سے سندھ تک بآسانی سفر کیا جا سکتا ہے۔ نیز سندھ کی آب و ہوا صحت بخش ہے اور سندھ کا نیل اور دیگر کئی ایک اشیا انگلستان کے لیے سودمند ثابت ہوں گی"۔[2]

سندھ میں انگریزوں کی پہلی کوٹھی

۱۶۳۵ء میں انگریزوں نے ٹھٹھے میں پہلی تجارتی کوٹھی کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں جو تجارتی وفد یہاں آیا ان میں ولیم فریمیلین، جان سپلز اور رچرڈ موٹلی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ملازمین کو کپڑا خریدنے کی تاکید کی ——

۱۶۴۱ء میں ایک پرتگیزی پادری دریائے سندھ کے راستے لاہور سے نو دن کا سفر کر کے بکھر پہنچا۔ وہ لکھتا ہے:

---

[1] Dames—The Book of Durate Barbose, PP, 106-107 (1918)

بحوالہ جنت السندھ میر رحیم داد خاں مولائی شیدائی ص ۴۷

[2] W. W. Faster : The Embassy of Sir Thomas Roe, PP, 75-76

www.taemeernews.com

" بکھر کے علاقے میں باغات کی وجہ سے پھلوں کی کثرت ہے۔ سندھ بہت ہی سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔
یہاں ہر سال خراسانی قافلے تجارتی مال بھر کر لاتے ہیں "۔۔۔۔۔

موصوف کا سفرنامہ دو جلدوں میں ۱۶۴۳ء میں چھپا۔۔۔۔۔

۱۶۴۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو نمایندے ہینری گاری اور گلبرٹ ہیرسین ٹھٹھہ آئے اور نہایت عیارانہ انداز میں اپنی تجارتی بنیادیں مضبوط کیں۔ جس کے بعد سندھ کے کپڑے بنانے والوں کو خوب خوب لوٹا گیا۔۔۔۔۔

نکولا منوچی

ایک اطالوی تھے جو دارا شکوہ کے توپ خانے میں ملازمت کرتے تھے اور اُس کے محاصرے کے وقت (۱۶۵۹ء میں) بکھر کے قلعے میں موجود تھے۔ قلعہ بکھر کے بارے میں لکھتے ہیں:

" بکھر ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اس کے بیچ میں ایک برج تھا جہاں سے دریائے سندھ کے پر لطف مناظر دیکھے جاتے تھے "۔۔۔۔۔

کلہوڑہ دور میں انگریز

انگریزی تجارتوں نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا سندھ کے پارچہ سازوں کو اندھا دھند لوٹنا شروع کر دیا تو یہاں کے لوگوں نے احتجاج کیا اور ۱۶۶۲ء میں سندھ میں قحط پڑا تو انگریزوں کو اپنی کوٹھی بند کرنی پڑی۔۔۔۔۔

الیگزینڈر ہملٹن

۱۶۹۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک سیاح اور تاجر کیپٹن ہملٹن سندھ پہنچے جن کا سفرنامہ "نیو اکاؤنٹ آف دی ایسٹ انڈیا" ۱۷۲۷ء میں ایڈنبرگ سے دو جلدوں میں شایع ہوا۔۔۔ لکھتے ہیں:

" شہر ٹھٹھہ دینیات، لسانیات اور سیاسیات کی تدریس و تعلیم کے سلسلے میں خاص شہرت کا مالک ہے وہاں چار سو کالج ہیں، جہاں طالبانِ علم کو مختلف علوم پڑھائے جاتے ہیں "۔۔۔۔۔

کیپٹن کک

۱۷۴۸ء میں ایک اور انگریز کیپٹن کک ٹھٹھہ پہنچے اور یہیں فوت ہوئے۔ ٹھٹھہ میں مکلی کے مقام پر ان کی قبر ہے۔ چونکہ یورپ میں سندھ کے کپڑے کی بڑی مانگ تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے یہاں اپنی اُس کوٹھی کی جو بند کر دی گئی تھی دوبارہ اور شدید ترین ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ وہ لوگ اس سلسلے میں مسلسل کوشاں رہے اور بالآخر ۲۲ دسمبر ۱۷۵۸ء کو رابرٹ سیٹن کی کوششوں سے میاں غلام شاہ کلہوڑے نے دوبارہ یہ کوٹھی قایم کرنے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی ساتھ کئی ایک دیگر تجارتی مراعات بھی عطا کر دیں بعد ازاں اور بھی کئی رعایتی پروانے ملے۔۔۔۔۔

دور تالپور۔ ناتھن کرو

وہ تجارتی تعلقات جو کلہوڑہ دور میں قایم ہوئے تھے تالپور خاندان کے ابتدائی حکمرانوں نے بھی قایم رکھے چنانچہ اس دور میں بھی انگریزوں کی چند ایک کوٹھیاں ٹھٹھہ اور شاہ بندر کے مقامات پر موجود تھیں اسی زمانے میں بمبئی سول سروس کے ایک بہت مکار عملدار "ناتھن کرو" بطور ایجنٹ سندھ میں آئے انھیں تجارت کے علاوہ سیاسی اختیارات بھی حاصل تھے ناتھن کرو نے کراچی میں ایک عمارت بھی بنوائی جو یہاں انگریزوں کی پہلی

www.taemeernews.com

عمارت تھی۔ اپنی کمپنی کو ایک خط میں سندھ کے متعلق اس نے لکھا:۔

"۔۔۔سندھ میں انگریزوں کی موجودگی کی وجہ سے شاہ افغانستان زمان شاہ کی تمام تر توجہ سندھ پر رہے گی جو ایک اسلامی ملک ہے اور جس سے دوستی رکھنے پر ہم آسانی سے قندھار پر فوج کشی کر سکیں گے۔ افغان بادشاہ کی اگر تالپور حکمرانوں سے جنگ ہوئی تو ہم بہر حال فائدے میں رہیں گے۔ نیز سندھ میں قیام کرنے کی بنا پر ہم وسط ایشیا کے حالات پر نظر رکھ سکیں گے"۔۔۔۔

چونکہ انگریز تاجروں سے سندھ کے تعلقات شاہ افغانستان کے مفاد کے خلاف تھے۔ لہٰذا اس نے تالپور حکمرانوں کو لکھا کہ انگریزوں کو نکال دیا جائے۔ ناتھن کرو کو سندھ میں آئے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو سندھ کے حاکم میر فتح علی خاں نے انگریزوں کو ۱۵ دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور وہ ۲۹ اکتوبر ہی کو ٹھٹھہ سے نکل کر بمبئی چلے گئے۔ ناتھن کرو نے بمبئی پہنچ کر کمپنی کے اعلیٰ عمل داروں کو جو رپورٹ پیش کی اُس سے خود "کرو" کی ذہنیت اور انگریزوں کے گھناؤنے ارادوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ رقم طراز ہے:۔

"۔۔۔انگریز سندھ پر حملہ کرنا چاہیں تو ان کو پہلے کراچی سے دس میل کے فاصلے پر "گسری" نامی مقام پر اپنی فوجیں اتارنا چاہیے جس کے جنوب مشرق کی سمت سمندر میں بڑے جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں کنارے پر فوجیں اتاری جائیں اور اُن کی حفاظت کے لیے توپ خانہ ہونا چاہیے۔ کراچی سستا شہر ہے جہاں پالتو جانور، گھی اور گھاس بکثرت ہے اور کراچی ہی سے سیدھا راستہ ٹھٹھہ جاتا ہے، جس کی راہ سے توپ خانہ بآسانی گزر سکتا ہے۔ دریائے سندھ کی کشتیوں پر قبضہ کرنے کے بعد حیدرآباد کا قلعہ صرف چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں صرف اتنی پریشانی ہے کہ یہاں بلوچی لشکر ہر وقت مستعد رہتا ہے ٹھٹھہ اور حیدرآباد کے درمیان "جھرک" نامی ایک شہر ہے جہاں پالتو جانور اور گھی کثرت سے ملتا ہے۔ کراچی پر قبضہ کرنا ہر حال میں بہتر رہے گا"۔۔۔۔

کیپٹن ڈیوڈسن

ناتھن کرو کے بعد جس انگریز عیار سے سندھ کا واسطہ پڑا وہ کیپٹن ڈیوڈسن تھا۔ ہوا یوں کہ جب میر غلام علی سندھ کے حاکم ہوئے تو انھوں نے پڑوسی علاقوں کے حالات کے مدنظر انگریزوں سے اپنے تعلقات ضروری سمجھے۔ لہٰذا ۱۸۰۳ء میں اپنا ایک نمائندہ بمبئی بھیجا اور ناتھن کرو کے سندھ سے نکل جانے پر گورنر سے اظہار ہمدردی کیا۔ نتیجتہً ۱۸۰۹ء میں کیپٹن ڈیوڈسن کو نامزد کر کے غلام علی خاں کے دربار میں حیدرآباد بھیجا گیا۔ اس کیپٹن نے یہاں آ کر تالپور حکمرانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی شرائط کو بغور دیکھنے سے یہ حقیقت نہایت ہی واضح شکل میں اُبھرتی ہے کہ انگریزوں کے دلی مقاصد پورے ہو گئے اور عروسِ سندھ کی صاف ستھری گردن میں انگریز غلامی کا پہلا طوق اپنی تمام تر گھناؤنی مگر بظاہر خوبصورت شکل میں آ پڑا۔۔۔۔۔

ہنری پاٹنجر

دوسرا انگریز وفد دس جون ۱۸۰۹ء میں ٹھٹھہ پہنچ کر حیدرآباد آیا اور سندھ کے تالپور حکمرانوں نے اسے بھی شرف باریابی بخشا۔ اس وفد کی سربراہی "نکولس ہنکی اسمتھ" کر رہا تھا اور جو چند ڈاکٹروں، چند ایک سول اور فوجی عمل داروں پر مشتمل

www.taemeernews.com

تھا۔ ۲۳ اگست ۱۸۰۹ءسنہ کو اس وفد نے کمپنی کی طرف سے تالپور حکمرانوں سے ایک اور معاہدہ کر لیا جو پہلے کے معاہدے سے آگے کی طرف ایک اور قدم تھا۔ اس وفد کے اراکین میں ایک تجربہ کار فوجی افسر ہنری پاٹنجر (۱۷۸۹-۱۸۵۶ءسنہ) تھا جس نے اپنے سفر کی روداد کتابی شکل میں لکھی " The Travels in Sind & Bilochistan " کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کو محمد حنیف صدیقی مرحوم نے انگریزی سے سندھی زبان میں منتقل کیا اور حال ہی میں سندھی ادبی بورڈ نے اسے شایع کیا ہے۔ سفرنامے کے ساتھ ساتھ اس میں سندھی تاریخ، جغرافیہ، ثقافت اور ادب کے متعلق بھی کچھ مواد شامل ہے مگر چونکہ موصوف سندھ کی تاریخ سے کما حقہٗ واقف نہیں تھے۔ اس لیے کئی ایک جگہ ایسے افسانوی واقعات بھی شامل کر دیے ہیں جن کا تاریخی طور پر کہیں پتہ نہیں چلتا اور حقیقتاً غلط ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے مذہب سے متعلق بھی کئی ایک جگہ ناموزوں اور نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن ان تمام تر غلطیوں کے باوجود اس کتاب میں سندھ کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کچھ مواد ضرور ملتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتا ہے:۔

"کہا جاتا ہے کہ جب نادر شاہ (۱۷۴۲ءسنہ) میں دہلی سے واپس ہوئے تو ٹھٹھہ آئے۔ اس وقت ٹھٹھہ میں لنگیوں اور گربیوں (دونوں قیمتی کپڑے کے نمونے تھے) بنانے والے جولاہوں کی چالیس ہزار کھڈیاں تھیں۔ صرافوں، تبادلہ زر کا کاروبار کرنے والوں، اناج کے تاجروں اور دوسرے کاروبار کرنے والوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک تھی۔ نیز ہنر اور فن کے دوسرے کاریگر رہتے تھے جن کی تعداد بیس ہزار بتائی گئی ہے" ــــــ

ڈاکٹر جیمس برنس

۱۸۲۶ءسنہ میں مراد علی خاں بیمار ہو گئے۔ دیسی ڈاکٹروں نے جنھیں حکیم کہا جاتا ہے۔ بہتیرا علاج کیا لیکن شفایاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ انگریز ریذیڈنٹ کی معرفت بمبئی کے گورنر کو انگریز ڈاکٹر بھیجنے کے لیے لکھا گیا اور جوابًا ۲۵ اکتوبر ۱۸۲۷ءسنہ کو 'کچھ' کے انگریز ریذیڈنٹ کے ڈاکٹر جیمس برنس حیدرآباد آئے اور تین ماہ تک شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام کیا۔ دورانِ قیام ڈاکٹر موصوف نے ملک اور دربار کی ہر چیز کو بغور دیکھا۔ یہاں کی نشست و برخاست کا عمیق مطالعہ کیا اور ۱۲ جنوری ۱۸۲۸ءسنہ کو بیش بہا تحائف کے ساتھ روانہ ہوئے۔ انھوں نے بھی سندھ کے سفر اور سندھی دربار سے متعلق ایک کتاب لکھی جو A Narative of a visit to the Court of Sind—A sketch of the history of Cutch. کے نام سے ۱۸۳۱ءسنہ میں انگلینڈ سے شایع ہوئی۔ مرحوم محمد حنیف صدیقی نے اس کا سندھی ترجمہ کیا اور ۱۹۶۴ءسنہ میں سندھی ادبی بورڈ نے اسے شایع کر دیا۔ کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ برنس نے سندھ کے شاہی دربار کی بڑی تعریف کی ہے۔ تالپوروں کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"یہ تمام خاندان بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ان لوگوں کے اخلاق اور تہذیب کی تعریف کرنی پڑے گی اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کم از کم ظاہری طور پر وہ جس ترقی اور عروج کو پہنچے ہیں وہ اس کے اہل ہیں۔ چھوٹے شہزادوں میں تو اتنی لیاقت اور فضیلت ہے کہ مشکل سے یورپی اور دیسی آدمیوں میں نظر آئے گی" ــــــ

www.taemeernews.com

الیگزینڈر برنس

ازاں بعد انگریزوں نے انتہائی عیارانہ حربوں کے ذریعہ تالپور حکمرانوں سے دریائی تجارت کی تحقیقات کے لیے اجازت حاصل کرلی اور مذکورہ جیمس برنس کے بھائی الیگزینڈر برنس کی سربراہی میں ایک وفد سندھ پہنچ گیا جو بظاہر حیدرآباد سندھ کی ارضی و بحری تجارت کے لیے تحقیقات کرنے آیا تھا۔ لیکن حقیقتاً اس وفد نے کابل اور خراسان کے راستوں کا فوجی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ اس نے دریائے سندھ کے راستے سندھ سے پنجاب کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر پنجاب کے حاکم راجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کی۔ وفد کو سندھ سے گزرتا دیکھ کر سندھ کے ایک دانشور نے کہا:-

"افسوس کہ آج فرنگی دریائے سندھ سے واقف ہو گئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ سندھ تالپوروں کے ہاتھ سے گیا"——

ہنری پاٹنجر کی دوبارہ آمد

ہنری پاٹنجر جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔ دسمبر ۱۸۳۱ء میں دوبارہ ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے آیا اور ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء کو میر مراد علی خاں سے ایک نیا معاہدہ کیا جو انگریزوں کی طرف سے تالپور حکمرانوں کے ساتھ چوتھا معاہدہ تھا۔ ہنری پاٹنجر کا یہ وفد خیرپور تک گیا اور راستے بھر تالپوروں کے بازداروں نے پرندوں کے شکار سے اراکین کی تفریح کا سامان بہم پہنچایا۔ ۱۱ مئی کو وفد واپس لکھپت پہنچا——

کیپٹن اسٹیوک

۱۸۳۹ء میں "کچھ" کے انگریز ایجنٹ ہنری پاٹنجر نے کیپٹن اسٹیوک کو سندھ کی سفارت پر بھیجا۔ اسٹیوک سندھی بلوچی اور فارسی زبانیں اچھی طرح جانتے تھے اور سندھیوں نیز تالپوروں کے ساتھ ان کی ہمدردیاں تھیں۔ انھوں نے ایک سفرنامہ لکھا جو ۱۸۴۴ء میں Dry leaves from Young Egypt "نئی مصر کے پرانے اوراق" کے نام سے پہلی مرتبہ شایع ہوا۔ اس سفرنامے کے سندھی اور اردو ترجمے چھپ چکے ہیں اور اس میں سفرنامے کے ساتھ ساتھ سندھ کی تاریخ، جغرافیائی حالات اور سندھ کی ثقافت بھی بیان کی گئی ہے۔ ایک جگہ سندھ کی مشہور مچھلی "پلا" کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے پکڑنے کا مخصوص طریقہ بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ "تیلگو زبان میں میر بحر کو "پلیوادو" کہا جاتا ہے جو میرے خیال میں سندھی لفظ "پلے وارو" سے تعلق ظاہر کرتا ہے"——

تیلگو دراوڑی خاندان کی زبان ہے جو جنوبی ہند میں بولی جاتی ہے۔ موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قدیم زمانے میں سندھی زبان کا دراوڑی زبان سے گہرا تعلق رہا ہے۔ کیپٹن اسٹیوک کی مہارت کا اندازہ لگائیے کہ انھوں نے بہت پہلے نشان دہی کر دی تھی کہ سندھی زبان کا دراوڑی سے تعلق ہے——

کیپٹن اسٹیوک نے سندھی زبان کی گرامر اور لغت پر بنیادی کام کیا ہے اور سندھی لغت بھی مرتب کی ہے۔ اس لغت کی ترتیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مجھے سندھی لغت مرتب کرنے کا کام بھی سونپا گیا تھا جس میں چار سے پانچ ہزار تک الفاظ تھے اور ہر لفظ پر کئی ایک منشی بیٹھ کر بحث کرتے تھے۔ اسی ترتیب کے سلسلے میں مجھے سندھی زبان کی خصوصیات بھی سیکھنی پڑیں۔ مثلاً ایک سندھی لفظ ہے "پِرِی" جس کے معنی ہیں محبوب۔ لیکن

www.taemeernews.com

اگر اس پر زبر نہیں ہوگی تو "برے" بھی پڑھا جا سکتا ہے جس کے معنی ہیں "دور"۔
اس باریک فرق کو ظاہر کرنے کے لیے اسٹیوک سندھی زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط کے حق میں تھے اور انھوں نے اس پر بڑا زور دیا تھا لیکن کامیاب نہ ہوئے ۔۔۔۔۔

کیپٹن لیوپولڈ

ستمبر ۱۸۴۲ء میں ایک جرمن "کیپٹن لیوپولڈ ون اور لچ" بمبئی سے کراچی آئے۔ کراچی سے حیدرآباد، سیہون اور سکھر ہوتے ہوئے پنجاب گئے۔ ان کا سفرنامہ پہلے جرمن زبان میں چھپا اور اس کے بعد ایوانس لارڈ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا جو Travels in India including Sind & the Punjab کے نام سے دو جلدوں میں چھپا۔ اس میں سندھ کے متعلق کچھ مواد ملتا ہے۔ سندھ کی مشہور "پلا" جو اس زمانے میں ایک مخصوص طریقے سے سکھر کے قریب دریائے سندھ میں پکڑی جاتی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے کیپٹن لیوپولڈ لکھتے ہیں:-

"میر بحر کے پاس لوہے کا بڑا گھڑا ہوتا ہے جو دریائے سندھ میں چھوڑ کر اس کے اوپر الٹے لیٹ جاتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے پیٹ سے گھڑے کا منہ بند کر لیتے ہیں اور بازوؤں نیز ٹانگوں سے تیرنا شروع کرتے ہیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پندرہ فٹ کا لمبا لکڑا ہوتا ہے جس میں جال بندھا ہوتا ہے۔ وہ جال مع لکڑے کے دریا میں ڈال دیتے ہیں اور جب پلا اس جال میں پھنس جاتا ہے تو اسے کھینچ کر جال اوپر کر لیتے ہیں۔ پلا نکال کر سوے سے چھید کر گھڑے میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح پلے پکڑ کر گھڑے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ چونکہ پلا دریا کے بہاؤ سے مخالف سمت چلتا ہے۔ اس لیے میر بحر پہلے دریا کے کنارے کنارے کچھ فاصلہ پیدل چلتے ہیں اور آگے چل کر گھڑا دریا میں ڈال کر دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیرنا شروع کر دیتے ہیں"۔۔۔۔۔

میجر ولیم نیپیر

۱۸۴۳ء میں انگریزوں کی طرف سے سر چارلس نیپیر نے انتہائی عیاری و مکاری سے سندھ فتح کر لیا۔ ان کے بھائی پی۔ ایف۔ نیپیر نے "فتح سندھ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۸۴۵ء میں لندن سے شایع ہوئی۔ پی۔ ایف نیپیر سندھ کے تالپور حکمرانوں سے متعلق رقم طراز ہیں:-

"بلوچ دشمن کو للکار کر کھلے میدان میں مقابلہ کرتے ہیں۔ صلح اور امن کے زمانے میں جب اپنی پوشاک پہن کر اور اسلحہ زیب تن کر کے نکلتے ہیں تو ان کے لمبے بالوں کو دیکھ کر انسان خود بخود تسلیم کرتا ہے کہ بلوچ ایشیائی اقوام میں غیر معمولی تصویر ہیں وہ بلند قامت بھی ہیں اور دلیر و بہادر بھی"۔۔۔

میجر آؤٹرام

سر چارلس نیپیر کے سیاسی کمشنر تھے۔ شروع ہی سے ان کی تالپوروں سے ہمدردیاں تھیں اور نیپیر کو اس کی جارحانہ کارروائیوں سے روکتے رہتے تھے۔ ولیم نیپیر نے اپنی کتاب "فتح سندھ" میں جہاں اپنے بھائی چارلس نیپیر کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے۔ وہاں میجر آؤٹرام پر کڑی تنقید بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ اس تنقید کے جوابی ردِ عمل کے طور پر میجر آؤٹرام

www.taemeernews.com

نے "فتح سندھ پر تبصرہ" نامی کتاب لکھی اور چارلس نیپیر کی حرکات کو بے نقاب کیا۔ رچرڈ نیپیر نے اس کتاب کا جواب دیا، جس کے بعد عام بحث چل نکلی اور اخبار میں مضامین چھپنے لگے۔ جنرل جیکب نے آؤٹرام کی اور اے۔ وی۔ سی مانٹگومری سے اور حیدرآباد کے کلکٹر نے نیپیر کی حمایت کی۔ ان لوگوں کے مضامین کراچی ایڈورٹائزر میں چھپتے تھے جو حیدرآباد سے لیتھو پر شایع ہوتا تھا۔ مذکورہ مضامین کی وجہ سے چارلس نیپیر کی ظالمانہ و جارحانہ کارروائیوں کی نقاب پوری طرح اتر گئی اور ساتھ ہی ساتھ نیپیر کی شخصیت واضح طور پر داغدار بن گئی۔ اس کی ایک وجہ ولایت کے اخبارات ---
Edinburgh Review. اور Examiner Times کا مذکورہ بالا بحث میں بھرپور حصہ تھا ــــــ

چارلس ڈکلے

انگریزوں کی سندھ سے متعلق بدنیتی ایک انگریز صحافی "چارلس ڈکلے" کے بیان سے نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے جو اس نے انگریزی اخبار "دی گریٹ برٹن" میں لکھا۔ وہ کہتا ہے:۔

"انگریز اعلیٰ فوجی افسر جب کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو یہ گفتگو کرتے ہیں کہ فلاں نواب یا فلاں راجہ مال دار ہے۔ خاص طور پر تالپوروں سے متعلق کہتے ہیں کہ ان کے پاس سونے اور چاندی کے علاوہ بہت سے جواہرات بھی ہیں۔ ان کا (انگریز افسروں کا) کہنا ہے کہ سندھ کی بندرگاہ شمالی ہندوستان کی طرف مال پہنچانے کے لیے نہایت کارآمد ہے" ــــــ

سندھی زبان

انگریزوں کے سندھ فتح کرنے سے پہلے ہی یورپی عالموں نے سندھی زبان میں خاص دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا جیسا کہ ہم مندرجہ بالا سطور میں کیپٹن اسٹیوک کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ کیپٹن موصوف نے سندھی زبان کی ساخت اور لغت کا عمیق مطالعہ کیا اور سندھی لغت سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۳۶ء میں بنام ------
Vocabulary of Sindhi Language کلکتہ سے شایع ہوئی۔ اس کے علاوہ مسٹر لیچ نے ایک کتاب بنام ــــ
Vocabularies of Se.en Languages spoken in countries of West of Indus
لکھی، جو بمبئی سے شایع ہوئی۔ اس میں بھی سندھی زبان اور اس کی لغت کا تذکرہ موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سندھی گرامر پر بھی ان علما نے کام کیا۔ مسٹر ٹیلپ نے سندھی زبان کی گرامر مرتب کی جو ۱۸۳۵ء میں Grammer of Sindee Language نام سے بمبئی سے شایع ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ سندھی زبان میں بائبل کا ترجمہ بھی کیا گیا۔ اولاً کلکتہ کے قریب سیرامپور میں رہنے والے پادریوں نے سندھی زبان سیکھ کر انجیل سے "متی" (St Mallhews) کا سندھی زبان میں دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ترجمہ کیا جو ۱۸۲۵ء میں شایع ہوا۔ بعد ازاں اس ترجمے کو کیپٹن جارج اسٹیک نے نیا انداز دے کر اسے دیوناگری رسم الخط میں ۱۸۵۰ء میں شایع کیا ــــــ

سندھی زبان کا موجودہ رسم الخط

۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ فتح کیا اور جلد ہی اس کی جداگانہ حیثیت ختم کر کے بمبئی کے علاقے کا ایک حصہ بنا دیا چنانچہ ۱۸۴۵ء میں بمبئی بورڈ کے سامنے سندھ میں تعلیمی ترقی کا سوال آیا تو اس سلسلے

www.taemeernews.com

میں بورڈ کے سامنے سندھ ایجوکیشنل ایجنسی کے قیام کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس وقت ایک تحریک یہ بھی تھی کہ سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان بنادیا جائے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۱ء میں کمشنر سندھ سر بارٹل فریئر نے ایک حکم نامہ جاری کیا جس میں کہا گیا کہ تمام سرکاری افسران سندھی زبان کا امتحان پاس کریں۔ چنانچہ اس وقت سندھی زبان کو تعلیمی و سرکاری زبان بنانے کی ضرورت کے پیشِ نظر اس کے مقررہ رسم الخط کی اہمیت محسوس کی گئی، اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ایلیس کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو دو یورپی ماہرین اور آٹھ مقامی علما پر مشتمل تھی۔ ان دو یورپی علما میں ایک جارج اسٹاک تھے جن کی رائے تھی کہ سندھی زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط مقرر کردیا جائے۔ لیکن دوسرے عالم کیپٹن برٹن مصر ہو گئے کہ اس کے لیے عربی رسم الخط مقرر کیا جائے، کیونکہ اس رسم الخط میں پہلے سندھی زبان کی بہت سی کتابیں موجود ہیں اور سندھ کے مدرسوں، مکتبوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ نتیجتہً انتہائی غور و فکر کے بعد ایلیس صاحب نے فیصلہ دے دیا کہ سندھی کے لیے عربی رسم الخط اختیار کیا جائے اور کمشنر سر بارٹل فریئر کو یہ رپورٹ بھیج دی گئی۔ ازاں بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے بھی عربی سندھی رسم الخط کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس طرح ۱۸۵۳ء میں سندھی زبان کے لیے عربی سندھی رسم الخط مقرر ہو گیا اور اس میں باقاعدہ تعلیم و تدریس اور سرکاری خط و کتابت کا کام ہونے لگا اور ۱۸۵۴ء تک سندھی زبان میں مختلف علوم و فنون پر کئی کتابیں شایع ہو گئیں۔ ان کتابوں میں درسی نصاب سے متعلق بھی تھیں اور ادبی و تفریحی کتب بھی۔ طلبہ کو باقاعدہ سندھی زبان میں تعلیم دی جانے لگی ساتھ ہی انگریزی پڑھنے والوں کے لیے بھی سندھی زبان لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جانے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۳ء میں سندھی زبان کو کالج میں بی۔ اے کلاسوں تک لازمی مضمون کا درجہ دیا گیا ـــــــ

سر رچرڈ فرانسس برٹن

برٹن ۱۸۲۱ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ انگریزوں نے جب سندھ پر حملہ کیا اُس وقت وہ ۱۸ نمبر فوجی رجمنٹ میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ ۱۸۴۳ء کی شروعات میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ کراچی آئے اور فتح سندھ کے بعد ۱۸۴۵ء سے زمینوں کے سروے کے محکمے میں افسر کی حیثیت سے کام کیا ـــــــ

وہ کئی زبانیں جانتے تھے اور عجیب و غریب طبیعت کے مالک تھے۔ ۱۸۵۳ء میں وہ افغان حکیم حاجی عبداللہ کے فرضی نام سے حرمین شریفین گئے۔ ۱۸۵۴ء میں افریقہ کے ملک سومالیہ کے دارالخلافے "ھرار" کی مہم پر روانہ ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے مسٹر اسپیک کے ساتھ مل کر مصر کے مشہور دریائے نیل کے نکلنے کی جگہ معلوم کی۔ چنانچہ آپ کی ان خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ کی جانب سے "سر" کا خطاب ملا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو انگلینڈ میں فوت ہوئے۔

برٹن کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل چار تصانیف سندھ سے متعلق ہیں:۔

۱۔ سندھ یا دکھی وادی (۱۸۵۱ء)
1— Scind or the unhappy valley

۲۔ سندھ اور وادیِ سندھ کی قومیں (۱۸۵۶ء)
۲— Scind and the races that inhabit in the valley of Indus.

www.taemeernews.com

۳۔ وادیٔ سندھ میں شکرابازی (۱۸۵۲ء) — 3-- Falconary in the valley of Indus.

۴۔ سندھ کی دوسری مرتبہ زیارت (۱۸۷۷ء) — 4— Scind—Revisited

ان کے سوانحی حالات پر حال ہی میں "بائرن فاروبل" کی تصنیف شایع ہوئی ہے ــــــ

برٹن نے اپنی کتابوں اور مقالات میں سندھ کی تاریخ، ثقافت، اور علم وادب سے متعلق بڑی معلومات فراہم کی ہیں۔ لیکن وہ طبعاً انتشار پسند اور جنسیات کی طرف مائل تھے۔ اس لیے سندھی ثقافت کو صحیح معنیٰ میں پیش کرنے سے قاصر رہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہ تو انھوں نے وہ باتیں لکھ دیں جو سندھی ثقافت کی روح کے منافی ہیں۔ ان لغزشوں کے باوجود انھوں نے سندھی علم وادب سے متعلق چند مفید اور معلومات آفریں امور بھی تحریر کیے ہیں۔ اپنی مذکورہ بالا کتاب "سندھ اور وادیٔ سندھ کی قومیں" میں سندھی زبان وادب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"سندھی ادب کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ جب انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھا اس وقت کسی بھی مقامی زبان میں اتنا علم وادب موجود نہیں تھا جتنا کہ سندھی زبان میں موجود تھا۔"

کیپٹن جارج اسٹیک

سندھی رسم الخط کمیٹی کے دوسرے انگریز ممبر جارج اسٹیک ۱۸۴۵ء میں سندھ آئے اور حیدرآباد کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے انھوں نے سندھی زبان میں مہارت حاصل کی اور سندھی رسم الخط میں حصہ لینے کے علاوہ سندھی زبان سے متعلق مندرجہ ذیل تصانیف شایع کیں:۔

۱۔ انگریزی سندھی لغت بمبئی ۱۸۴۹ء

۲۔ انگریزی میں سندھی گرامر بمبئی ۱۸۴۹ء

۳۔ سندھی انگریزی لغت بمبئی ۱۸۵۵ء

مندرجہ بالا دو لغات انھوں نے حیدرآباد کے دو برہمنوں مسٹر سچا نند اور جیٹھا نند کی مدد سے تیار کیں اور سندھی الفاظ کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا۔ کیپٹن موصوف کی یہ لغات سندھی زبان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں کیپٹن موصوف نے انگریزی کتاب ــــ

۴۔ گاسپل آف سینٹ میتھیوز کا سندھی ترجمہ بھی کیا جو اُس وقت سندھ کے مشن اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

میجر ایف۔جی گولڈاسمڈ

سندھ میں اسسٹنٹ کمشنر اور محکمۂ تعلیم کے افسر انچارج رہے ہیں۔ ان کی کوششوں اور محنت سے ۱۸۶۲ء میں ایک مفصل اور مستند سندھی گرامر شایع ہوئی جسے میاں محمد حیدرآبادی اور منشی پربھداس آنندرام نے تیار کیا اور خود میجر صاحب موصوف نے پیش لفظ لکھا۔ اس گرامر کی تیاری اور اشاعت کے علاوہ میجر موصوف کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مشہور عشقیہ داستان سسّی پنوں سے متعلق سندھی ابیات جمع کیے اور ان کو ترتیب دے کر سندھی زبان ہی میں ۱۸۶۳ء میں شایع کرایا۔ بعد ازاں ان ابیات کا انگریزی ترجمہ کیا اور اس مجموعۂ ابیات کو انگریزی ترجمے کے ساتھ شایع کیا ــــ

آپ نے زراعت، جڑی بوٹیوں اور ادویات سے متعلق سندھی زبان کے الفاظ اور اصطلاحات کو جمع کیا اور پھر ان کو ترتیب دے کر ایک کتابی صورت میں بنام Vocabulary of Sindhi Agricultural Terms, Herbs & Drugs جرمنی کے مشہور و معروف شہر لیپزگ سے ۱۸۵۵ء میں شایع کرایا۔ ان کی یہ کتاب بڑی حد تک مفید اور معلوماتی ہے اور سندھی زبان سے اُن کی دلچسپی، محبت اور مہارت کی بہترین مثال بھی ———

ڈاکٹر ارنیسٹ ٹرمپ

۱۳ مارچ ۱۸۲۸ء کو جرمنی کے ایک گاؤں ایلز فیلڈ میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے "جپسی" زبان میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ "جپسی" ایک خانہ بدوش قوم ہے جو یورپ کے تمام ممالک میں موجود ہے اور اس کے خانہ بدوش قبیلے ایران، عراق کے علاوہ دوسرے مشرقی ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پارسی میں ان کو گولیاں یا گوریاں کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل وطن سندھ ہے۔ ٹرمپ کو جپسی زبان سے گہری دلچسپی نے برصغیر کی مختلف زبانوں کے مطالعے پر اُکسایا اور بالآخر یہی کشش اُنھیں جرمنی سے برطانیہ لے گئی۔ جہاں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے کام کیا جہاں انھیں مشرقی زبانوں کا مطالعہ کرنے کے وافر مواقع ملے ———

ٹرمپ کے انتہائی شوق کے پیشِ نظر چرچ مشن سوسائٹی نے انھیں مشرق کی مختلف زبانوں پر مزید تحقیق کے لیے کراچی بھیج دیا۔ وہ اوّلاً بمبئی پہنچے جہاں پارسی زبان میں مہارت اور عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد کراچی آئے لیکن شومیٔ قسمت کہ یہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور بیمار ہو گئے۔ لہٰذا چرچ مشن سوسائٹی نے انھیں علاج کی غرض سے فلسطین بھیجا۔ شوقِ زبان دانی نے یہاں بھی انھیں بیکار نہ بیٹھنے دیا لہٰذا یہاں رہ کر عربی زبان میں مہارت حاصل کی اور ۱۸۵۸ء میں دوبارہ کراچی پہنچے۔ آپ کراچی کے علاوہ حیدرآباد میں بھی رہے اور ان مقامات پر رہ کر انھوں نے سندھی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ مقامی سندھی علما کی مدد سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالہ مرتب کیا اور اسے ۱۸۶۶ء میں جرمنی کے شہر "لیپزگ" سے شایع کرایا۔ شاہ صاحب موصوف کے رسالے کا یہ پہلا نسخہ ہے جو چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ ٹائپ میں چھپا ہے اور ۱۸ + ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۷۳ شعر ہیں نیز جس رسم الخط میں یہ رسالہ چھپا ہے اُس میں اور موجودہ سندھی رسم الخط میں تھوڑا فرق ہے۔ ٹرمپ نے اس عظیم کارنامے کے علاوہ سندھی زبان و ادب کی اور بہت خدمت کی ہے مثلاً اس نے سندھی زبان سیکھنے کے لیے عربی اور دیوناگری رسم الخط میں ایک کتاب Sindhi Reading Book — in the Sanskret and Arabic characters. — تیار کی اور ۱۸۵۸ء میں لندن سے شایع کرائی جس کے آخر میں "سورٹھ راے ڈیاچ" کی رومانی داستان سے متعلق قدیم سندھی شاعروں کے ابیات جمع کیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بائبل کے دس احکام بھی سندھی ترجمے کے ساتھ شامل کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کا تیسرا بڑا کام انجیل کا سندھی میں ترجمہ ہے جو پہلے دیوناگری رسم الخط میں ۱۸۶۸ء میں شایع ہوا اور بعد میں عربی سندھی رسم الخط میں شایع ہوا ———

۴۔ سندھی زبان کے سلسلے میں ان کا ایک اور عظیم کارنامہ مفصل سندھی گرامر ہے جو انھوں نے انگریزی میں لکھی اور لندن اور لیپزگ سے ۱۸۷۲ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے سندھی رسم الخط پر مفصل

www.taemeernews.com

بحث کی ہے جو نہ صرف مفید و کارآمد ہے، بلکہ بہترین ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے ٹرمپ مشہور و معروف مستشرق اور بہت بڑے علما میں سے ایک تھے جو اپنی مادری زبان جرمنی کے علاوہ بہت سی زبانوں کے ماہر تھے، مثلاً انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، افریقی، حبشی، عربی، فارسی، سندھی، سرائیکی، پنجابی، پشتو، سنسکرت، براہوی کے علاوہ پاکستان کے علاقے کافرستان کی زبان پر بڑی حد تک مہارت حاصل تھی۔ آپ نے ان زبانوں کے متعلق کئی ایک کتابیں اور مقالے لکھے۔ ۵ راپریل ۱۸۸۵ء میں ٹرمپ فوت ہوئے ـــــ

ریونڈر جارج شرٹ

سندھی لغت اور لسانیات سے متعلق جارج شرٹ نے مندرجہ ذیل تحقیقی کتابیں شایع کیں ـــــ

۱۔ **اکھر دھاتو:-** یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں شایع ہوئی جس میں سندھی الفاظ کی سنسکرت بنیادیں دی گئی ہیں۔
(ایسے سندھی الفاظ جن کی بنیادیں سنسکرت پر رکھی گئی ہیں)

۲۔ **انگریزی سندھی ڈکشنری:-** اور سندھی انگریزی ڈکشنری ۱۸۷۹ء میں شایع کرائیں ـــــ

سرجان جیمس

۱۸۳۷ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۹ء میں ہندوستان آئے۔ انھیں ہندوستان کی مختلف زبانیں اور سنسکرت کی ساخت اور لسانیات پر تحقیق کا شوق تھا لہٰذا دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ سندھی زبان بھی سیکھی۔ جس کے بارے میں جیمس کہتے ہیں کہ انھوں نے سندھی زبان کتابوں اور خصوصاً ٹرمپ کی کتابوں سے سیکھی۔ بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد انھوں نے ہندوستان کی جدید زبانوں کی تقابلی گرامر بنام

A comparative Grammer of Modern Arayan's languages of India.

لکھی جو دو جلدوں پر مشتمل ہے جس کی پہلی جلد ۱۸۷۲ء میں لندن سے شایع ہوئی جس میں سندھی، پنجابی، ہندی، گجراتی، اڑیا، مراٹھی اور بنگالی زبانوں کی ساخت، اصل نسل اور لسانیات پر بحث ہے۔ نیز ہندوستان کے مذہب اور فلسفے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ـــــ دوسری کتاب گرامر کی ہے جو ۱۸۷۵ء میں شایع ہوئی۔ اس کے علاوہ موصوف نے ہندوستان کے فلسفے پر ایک کتاب نیز کئی ایک مقالات قلم بند کیے ہیں۔ جیمس موصوف ۱۹۰۲ء میں برطانیہ میں فوت ہوئے۔ آپ نے سندھی زبان کے متعلق مذکورہ بالا کتاب میں لکھا ہے:۔

"اس زبان (سندھی) میں کئی جنگلی پھول موجود ہیں جن میں میں نے وہ فطری حسن و دل کشی دیکھی اور محسوس کی جو ہندوستان کے مشرق کی طرف کی زبانوں میں قطعاً دیکھنے میں نہیں آئی" ـــــ

سرجارج ابراہم گریئرسن

ہندوستانی زبانوں کے بہت بڑے ماہر اور محقق سرڈاکٹر جارج ابراہم گریئرسن انڈین سول سروس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ہندوستانی زبانوں پر ان کا عظیم الشان تحقیقی شاہکار گیارہ ضخیم جلدوں میں ۱۹۰۴ء تا ۱۹۲۷ء کلکتہ سے اشاعت پذیر ہوا۔ جس کی آٹھویں جلد میں آپ نے سندھی زبان کی ساخت، لسانیات اور محاورات پر تفصیل کے ساتھ نہایت محققانہ بحث کی ہے۔ اس زبان کی لسانی حدود پہ بات کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

www.taemeernews.com

"۔۔گو کہ سندھی خاص صوبۂ سندھ کی زبان ہے لیکن اپنی اعلیٰ حیثیت اور بے پناہ مقبولیت کے باعث علاقائی حدود عبور کرتے ہوئے اپنے پڑوسی علاقوں تک بھی پہنچ گئی ہے اور وہاں بھی نہایت محبت و خلوص کے ساتھ مروّج ہے۔ اسی طرح بولی جاتی ہے جس طرح اپنے اصل وطن میں بولتے ہیں"۔۔۔

آگے چل کر ان پڑوسی علاقوں کا جہاں سندھی بولی جاتی ہے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"۔۔سندھی زبان، سندھ کے شمال کی طرف سے سندھی حدود عبور کرتے ہوئے شمال مغرب کی طرف بلوچستان اور مکران کی سمت پہنچی اور مشرق کی طرف پنجاب و بھاول پور کے علاقوں تک اثر انداز نظر آتی ہے۔ بلوچستان کی خاص زبان بلوچی ہے۔ لیکن اس علاقے کا وہ حصہ جو دونوں صوبوں کے درمیان اونچے پہاڑوں کی کم اونچائی والی اراضی پر مشتمل ہے اور جس کے رہنے والوں کی آمد و رفت بغیر کسی تکلیف کے سندھ کی طرف ہوتی رہتی ہے وہاں کے باسی اکثریت میں سندھی زبان بولتے ہیں۔ بلوچستان ہی کے جنوب مغربی حصے لسبیلہ کے لوگوں کی زبان تو صرف سندھی ہے"۔۔۔

کچھ اور گجرات کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :۔

"۔۔ادھر "تھر" کے جنوب مشرق کی طرف جغرافیائی حدود عبور کرکے یہ زبان (سندھی) گجرات میں پہنچی اور وہاں گجراتی زبان کے ساتھ ساتھ پورے صوبے کی سیر کرتی نظر آتی ہے"۔۔۔

مذکورہ کتاب کے علاوہ سر جارج گریرسن نے پراکرت کی ایک شاخ وراچڈ اپ بھرنش اور سندھی زبان کے تقابلی مطالعے پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "وراچڈ اور سندھی" Varachada and Sindhi ہے۔ یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۰۲ء میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔۔۔

سر ٹرنر

ٹرنر صاحب نے سندھی اور نیپالی زبانوں کے تقابلی مطالعے پر ایک کتاب بنام Nepali Eytonioligical and comparative Dictionery لکھی ہے۔ جو ۱۹۳۱ء میں لندن سے شایع ہوئی۔ اور طالبانِ علم و ادب کے لیے ایک اچھا سرمایہ ہے۔۔۔

سیمور :۔ ایک اور انگریز مصنف و عالم مسٹر سیمور نے سندھی گرامر سے متعلق انگریزی زبان میں ۔۔۔۔۔ A Grammer of Sindhi Language. کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو کراچی سے ۱۸۸۴ء میں شایع ہوئی۔۔۔

سے • ڈبلیو• ھیسکل جو کراچی گرامر اسکول کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے بھی انگریزی میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ A Grammer of Sindhi Language. کے نام سے سندھی گرامر لکھی، جو کراچی سے ۱۹۲۳ء میں شایع ہوئی۔ گرامر کے علاوہ اس میں سندھی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے مشقیں بھی دی گئی ہیں۔۔۔

ڈاکٹر سورلے

آپ سندھ کے کلکٹر کی حیثیت سے یہاں فائز رہے ہیں۔ اوّلاً سندھی زبان میں مہارت حاصل کی۔ بعد ازاں شاہ

www.taemeernews.com

عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری کا خصوصی مطالعہ کیا اور اتنا عمیق مطالعہ کیا کہ انگریزی زبان میں Shah Abdul Latif of Bhit نام سے ایک انتہائی محققانہ کتاب لکھی جس پر سورلے کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی اور وہ ڈاکٹر ہو گئے۔ اس کتاب کے مقدمے میں آپ نے شاہ عبداللطیف کی زندگی کے حالات بھی دیے ہیں اور ان کے افکار و فن پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنے گراں قدر مقدمے کے ساتھ ساتھ انھوں نے شاہ صاحب کے "رسالو" کا انتخاب کر کے اس کا منظوم انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۰ء میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔

مذکورہ کتاب کے علاوہ ڈاکٹر سورلے نے اپنی ایک اور کتاب "موسا پراڈ گالنس" میں بھی شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے جو دنیا کے باکمال غنائی شعرائے کرام کے افکار پر مشتمل ایک اعلیٰ اور اچھی تصنیف ہے۔ آپ کا ایک اور تصنیفی کارنامہ "سندھ گزیٹئر" ہے جو حال ہی میں شایع ہوا ہے۔

مس این میری شمیل

یہ ایک مشہور مستشرق جرمن خاتون ہیں جو ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ انھیں کئی ایک مشہور مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ سندھی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے اور سندھی ادب خصوصاً شاہ عبداللطیفؒ پر کئی ایک مقالات لکھ چکی ہیں اور کئی ایک کتابوں میں شاہ صاحبؒ کا ذکر کیا ہے۔ نیز شاہ کے اشعار کا جرمنی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

سندھ کی تاریخ اور ثقافت

سندھی زبان و ادب کے علاوہ سندھ کی تاریخ و ثقافت پر بھی بہت سے مستشرقین نے کام کیا ہے جن میں مسٹر اٹکن، کننگھم، کزنس، ایلیٹ، ڈوسن، ایم۔ آر ہیگ، ہیوز، ایچ۔ جی راورٹی اور ایچ۔ ٹی سمبرک کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے سندھ کی تاریخ، آثار قدیمہ اور ثقافت پر بڑی تحقیق، توثیق اور جستجو کے بعد مفید کتابیں اور مقالے لکھے ہیں۔ سندھ پر ان کی لکھی گئی کتابوں اور تحقیقی مقالات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان پر تفصیلی تبصرہ اس مضمون میں ناممکن ہے۔ کسی اور موقع پر ان کتابوں کا تعارف کرایا جائے گا اور ان پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے گی۔

ماخذات

سندھی کتب

۱۔ "سندھ کی اقتصادی تاریخ"۔ از ڈاکٹر ایس۔ پی چھبلانی، سندھی ترجمہ سراج الحق۔ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ ۱۹۶۸ء

۲۔ "نئی مصر کے پرانے اوراق"۔ از کیپٹن اسٹیوک۔ سندھی ترجمہ ڈاکٹر ممتاز پٹھان۔ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ ۱۹۶۳ء

۳۔ "سندھ اور بلوچستان کا سیر و سفر"۔ از لیفٹیننٹ ہنری پاٹنجر سندھی ترجمہ محمد حنیف صدیقی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ ۱۹۶۷ء

۴۔ "سندھی صورت خطی"۔ از ڈاکٹر غلام علی جی الانہ۔ مطبوعہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۶۴ء

۵۔ "سندھ کا دربار"۔ از جیمس برنس سندھی ترجمہ محمد حنیف صدیقی۔ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ ۱۹۶۴ء

۶۔ "سندھی نثر کی تاریخ"۔ از منگھارام ملکانی۔ مطبوعہ بمبئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۶۸ء

۷۔ "سندھی نثر کی تاریخ"۔ ڈاکٹر الانہ ۔ ۔ ۔ ۔ مطبوعہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۶۶ء

www.taemeernews.com

۸ — "سندھی ادب کی مختصر تاریخ" — از ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو — — — — — — — — — سنہ ۱۹۷۳ء

۹ — "سندھی ادب کا تاریخی جائزہ" — از ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی تیسرا ایڈیشن سکھر — — — — — — — سنہ ۱۹۷۷ء

۱۰ — "سندھی ادب اور مشہور مستشرقین" — از حبیب اللہ بھٹو، شکارپور — — — — — — — — — سنہ ۱۹۷۳ء

۱۱ — "جنت السندھ" — از میر رحیم داد خاں مولائی شیدائی۔ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ — — — — —

۱۲ — "تاریخ تمدن سندھ" — از میر رحیم داد خاں مولائی شیدائی۔ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی — — — — —

۱۳ — "وادی سندھ میں آباد قومیں" — از رچرڈ برٹن — سندھی ترجمہ — سندھی ادبی بورڈ — — — — — — —

اردو کتب

۱۴ — "تاریخ سندھ جلد دوم" — از اعجاز الحق قدوسی — مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ — — — — — — — سنہ ۱۹۷۴ء

انگریزی کتب

Travels in India including Sind & Punjab—Leopold Von Orlich—Translated from the German into English by I. I. Evans Lloyd, published in 1845—reprinted in 1976.

Bernier. F. Travels (Edited by Constable. 1914)

Burnes, Alexander : Travels in Bokhara., (London, 1835)

Abbot, J. Sind a reinterpretations of the unhappy valley, Oxford, 1924.

Allen, Rew: I. N. Diary of Sind and Baluchistan. (J. Hotchard, London, 1843)

Burton, F. R. (I) Sind the races that inhabit tne valley of the Indus, London, 1851.

(ii) Sind the unhappy valley. 2 vols : (Richard Bentley, London, 1851)

(iii) Sind Revisited—2 vols (Richard Bentley, London, 1877)

Burnes, James. A Narrative of a visit to the Court of Sind, Robert Cadell Edinburgh, 1831.

Sorley, H. T. Shah Abdul Latif of Bhit, (Oxford, 1940)

Ethis, B. H. Report on the Education in Sind, Bombay, 1855

Frere, B. Introductory remarks on the report on Education in Sind, Bombay, 1835.

Stack, G. A Grammer of Sindhi Language, American Mission Press, Bombay, 1853.

Trump. E. The Grammer of Sindhi Language, F. A. R. Rockhans, Leipzig, 1872.

www.taemeernews.com

کامل القادری

بلوچی و براہوی ادب اور برطانوی اہلِ قلم

تبت کی طرح بلوچستان کبھی ممنوعہ علاقہ نہیں رہا۔ پاکستان کا یہ مغربی دروازہ ہمیشہ اقوامِ عالم کے لیے کشادہ رہا ہے۔ پاکستان میں درۂ خیبر سے کم اور اس دروازے سے زیادہ لوگ آئے۔ بلوچوں کی آمد کا سلسلہ بارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ جن کا بحرِ خزر میں آئول نال گڑا ہے اور جن کی زبان بلوچی السنۂ ایرانیہ میں شمار ہوتی ہے جو "وسطی فارسی" اور "کُردی" سے انتہائی مماثلت رکھتی ہے، لیکن بلوچ قومی تفاخر کی بنا پر اسے اُمّ اللسان ظاہر کرتے اور ژند سے بھی قدیم بتاتے ہیں۔

بلوچستان مختلف لسانی تہذیبوں اور ثقافتوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ابھی تاریخ نے آنکھ نہ کھولی تھی کہ یہاں پروٹو نیگرائیڈ گروہ درگروہ آئے۔ بلوچستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ برِعظیم پاکستان و ہند میں سب سے پہلے انسانی آواز کا غلغلہ یہیں سُنا گیا اور بتدریج یہ آوازیں مشرق کی جانب سفر کرنے لگیں۔ پروٹو نیگرائیڈ کے بعد نیگرائیڈ، پھر سیکڑوں سال بعد پروٹو اسٹرالائیڈ اور اسٹرالائیڈ اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد بحرِ روم کی ساحلی پٹی پر آباد وہ لوگ آئے، جن کی یادگار موہن جوڈارو اور ہڑپا ایسے عظیم الشان شہر ہیں۔ عرفِ عام میں ہم انھیں "ڈرامیلا" یا دراوڑ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور ان کے بعد آریہ آئے[1] برِعظیم کی بھاری اکثریت ان ہی نسلی گروہوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔

طلوعِ تاریخ کے بعد بھی پاکستان کا مغربی دروازہ کھُلا رہا۔ سنہ [illegible] ق۔م میں ملکہ سیمی رامس نے ادھر کا رخ کیا، لیکن دشتِ لوط عبور کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ۵۵۰ سنہ ق۔م میں سائرسِ اوّل نے (جو تاریخ میں خورش کیخسرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین تھا) بلوچستان کو اپنی وسیع و عریض شہنشہی میں شامل کرلیا۔ بلوچستان کے کچھ علاقے دارا سوم تک ایرانی مملکت کی ایک "ولایت" میں شامل رہے، پھر سکندرِ مقدونیہ نے جب ایران پر تسلط جمالیا تو رسمی طور پر بلوچستان بھی اُس کے مفتوحہ علاقوں میں شمار ہوا۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک قایم نہ رہی۔ چندر گپت موریہ نے یونانی تسلط سے جلد ہی اس خطّے کو نجات دلادی[2]

ان مشہور فاتحوں کے بعد بھی بلوچستان میں طالع آزما حملہ آوروں اور "غذا، چراگاہ اور پناہ گاہ" کی تلاش میں مفلوک الحال

---

[1] تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: Inter-Relation of Culture, UNESCO, New York, 1954 (2 Vols)

[2] "قدیم بلوچستان" مصنفہ کامل القادری، بولان پبلیکیشنز — کوئٹہ

www.taemeernews.com

انسانی گروہوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور یہ خطہ اجڑتا بستا رہا۔ یہاں نوبہ نو اقوام، رسوم ورواج اور اُن کی بولیوں کا تال میل ہوتا رہا۔ معلوم وروشن تاریخی ادوار میں اسی مغربی دروازے سے ساکا، سفید ہن، منگول، عرب اور ترک اقوام آئیں، لیکن بلوچستان کی ہزاروں سال پرانی تاریخ میں چندرگپت موریہ کے بعد انگریز دوسرے حملہ آور تھے جنھوں نے مغربی سمت کی بجائے مشرقی جانب سے بلوچستان پر یلغار کی۔

برّعظیم پاکستان وہند میں بلوچستان وہ خطۂ آزادگاں ہے جو سب سے آخر میں مفتوح ہوا۔ یعنی موجودہ پاکستان کے صوبہ ہائے پنجاب وسندھ پر برطانوی تسلط کے بعد ۱۸۴۲ء میں بلوچستان بھی برطانوی ہند سے ملحق کرلیا گیا لیکن بلوچستان پر لشکرکشی سے بہت قبل بلوچستان کی دریافت اور ہر جہتی مساحت کے لیے فرنگی سیاحوں کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ سب سے پہلا سیاح جو بلوچستان آیا اُس کا نام ہنری پوٹنگر تھا۔ اُس نے کراچی سے براستہ لسبیلہ، مکران اور وسطی بلوچستان کی سیاحت کی۔ ۱۸۱۶ء میں اُس کا سیاحت نامہ شایع ہوا۔[1]

روبرٹ لیچ

۱۸۳۸ء میں بمبئی انجینرنگ کور کے ایک طالع آزما افسر روبرٹ لیچ نے براہوئی، بلوچی، پنجابی زبانوں کے صرف ونحو پر اپنی تحقیقی کتاب شایع کی۔[2] اس کتاب نے دنیائے اہل علم کی توجہ اِن زبانوں کی جانب مبذول کردی اور اِن زبانوں پر مغربی ماہرین لسانیات تحقیقی کام میں منہمک ہوگئے۔

چارلس میسن

ہنری پوٹنگر کے بعد دوسرا اہم سیاح چارلس میسن ہے۔ جس نے ۳۹-۱۸۲۶ء میں بلوچستان، افغانستان، پنجاب اور ریاستِ قلات کا متعدد بار سفر کیا اور اپنی سیاحت کی تفصیلی داستان لکھی۔ اس نے بھی بلوچی اور براہوی زبانوں کا سرسری ذکر کیا ہے البتہ بلوچ رسوم ورواج اور قبائل کے حالات پر اُس نے اپنے مشاہدات تفصیل سے لکھے ہیں۔[3]
۱۸۴۳ء میں اُس نے سفر کلات (قلات) کی داستان لکھی جو بے انتہا دلچسپ ہونے کے علاوہ اُس زمانے کے قبائلی سرداروں کے بارے میں بھی دلچسپ معلومات مہیا کرتی ہے۔[4]

انیسویں صدی کی مطبوعات

۱۸۴۱ء میں انگریزوں نے بلوچستان پر قبضہ کرلیا۔ اب بلوچستان میں آمد ورفت کا آزادانہ سلسلہ شروع ہوا اور انگریز

---

[1] Pottinger. Sir Henry, 1816–"Travels in Baluchistan & Sinde", London

[2] Leech, Robert, 1838–"Eptoms of the Grammar of the Brahuiky, the Biluchky and the Punjabi Languages", Calcutta.

[3] Messon, Charles, 1842–"Narrative of various journey in Baluchistan, Afghanistan, Punjab and Kalat" (4 Volms), London.

[4] Messon, Charles, 1843–"Narrative of journey to Kalat", London.

حکّام بلوچستان کی دریافت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ بے انتہا وسائل تھے۔ اصولِ جہاں بانی کے مزاج داں تھے۔ لہٰذا فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ علمی ذوق بھی نمو پاتا رہا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک یعنی کُل ساٹھ سالوں کے اندر بلوچستان کے مختلف موضوعات پر برطانوی مصنفین نے اچھی خاصی کتابیں لکھ ڈالیں جن میں بعض اب بھی تحقیقی معیار کے لحاظ سے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

برطانوی اہلِ قلم کی تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ان کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں۔ اول ایسی کتابیں جو تحقیقی رپورٹ سروے، گزٹیئر، کمیشن رپورٹ، فوجی اور سول انتظامیہ کی خفیہ رپورٹ، اور محکماتی ضرورتوں کے پیشِ نظر مرتب ہوئیں۔ ان گوناگوں تصنیفات و تالیفات کا تعلق براہِ راست امورِ جہاں بانی سے تھا۔ دوم ایسی کتابیں ہیں جو نوآمدہ برطانوی حکام کو مقامی زبانیں خصوصًا براہوئی، بلوچی اور بلوچستانی پشتو سکھانے کے لیے تالیف کی گئیں۔ ان میں بلوچی، براہوی اور بلوچستانی پشتو کی ٹیکسٹ بک، گرامر، کمپوزیشن، بول چال وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔ سوم ایسی کتابیں جو خالص علمی ذوق کی مظہر ہیں۔ اور یوں بیسویں صدی کے وسط تک ۵،۲ مستقل کتابیں اور رسائل شایع ہوئے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل، جغرافیائی جرنل، نیچرل اسٹڈی جرنل بمبئی" بین رلندن/ سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل اور دیگر رسائل و جرائد میں مضامین کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

برطانوی مصنفین اور محققین میں بعض نام بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور اپنے مخصوص موضوعِ مطالعہ میں اُن کی تحقیق سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً براہوئی زبان کے لسانی مطالعے کے لیے سر ڈینس برے کا نام اس وقت تک حرفِ آخر ہے۔ بلوچی ادب اور نسلیات کے بارے میں لونگ ورتھ ڈیمز کا تحقیقی کارنامہ ابھی باسی نہیں ہوا ہے۔ جغرافیہ کے میدان میں ایم۔ آر۔ ہیگ، جی۔ پی۔ ٹیٹ، ایچ۔ جی۔ ریورٹی کا نام انمٹ ہے۔ آثارِ قدیمہ کے مطالعے میں اسٹار پیگوٹ، سر آریل اسٹین، سر پرسی سائیکس، سر آر۔ ای۔ ایم۔ ویلر، کا کیا کہنا۔ لسانیات کے میدان میں جی۔ گیئرسن، مورگن اسٹیئرین اور الفن بن کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے۔ تاریخی دستاویزات اور خوانینِ قلات کی تاریخ، سند، فرمان وغیرہ کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں جی۔ یو۔ ایچی سن [1]، فلائیر [2]، ہیوج [3]، میک گرے گار [4]، ساؤتھی [5]، سائیکس [6]، ییٹ [7]

---

[1] Attichison, G. U. 1932–"A Collection of Treaties, Engagement and Sanads".

[2] Floyer, Earnest Ayscogbe, 1882–"Unexplored Baluchistan", London.

[3] Hughes, A. W. 1877–"The Country of Baluchistan, London.

[4] Mac Gregor, Sir Charles M., 1882–Wandering in Baluchistan", London

[5] Southey, R. 1891–"Gazetteer of Baluchistan", London.

[6] Sykes, Sir Percy, 1941–"Exploration in Baluchistan", Asiatic Review, London, Vol. 37 and 1902 "Ten Thousand Miles in Persia", London.

[7] Yate, Sir Charles, 1906–"Baluchistan", London.

ہولڈیچ [1] اور سلویا [2] کا نام قابلِ ذکر ہے۔

انگریز اہلِ قلم کی کاوشوں کے تنوع پر نظر کیجیے، وہ کون سا موضوعِ مطالعہ ہے، جس پر انھوں نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو، جدھر نظر اٹھ گئی ایک دفترِ فکر و نظر مرتب ہو گیا۔ مطالعہ، مشاہدہ، تحقیق، تجزیہ اور غور و فکر کے لو بہ لو ابواب سے ذہن رسا کی شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اگر نظر نباتات کی جانب اٹھ گئی تو بلوچستان کے ایک ایک پودے کی جملہ کیفیت قلم بند کر ڈالی [3]، پھولوں کے نام شمار کر لیے اور مزے کی بات یہ ہے کہ پھولوں کے مقامی نام بھی درج کیے جن سے بلوچی اور براہوی لغات نویسوں نے استفادہ کیا اور اصطلاحی و علمی نام بھی، نیز خوشبو، رنگ، بناوٹ، قد و قامت، تخم کاری کا موسم، پھول کھلنے کی رُت، خواص، پھولوں کے امراض، علاج معالجہ غرض کہ ہر قسم کی معلومات پھولوں کے شیدائیوں کے لیے یک جا کر دی گئیں [4]، پرندوں کی جانب متوجہ ہوئے تو اڑتے پرندوں کے پر پرے گن ڈالے۔ ان کی نسلی خصوصیتیں، جوڑ کھانے، انڈا دینے، انڈا سینے کے اوقات، قد و قامت، وزن، چونچوں اور پنجوں کی ساخت، رنگ، فطرت و جبلت غرض کہ جملہ معلومات اکٹھی کر ڈالیں، پھر بلوچستان کے مقامی پرندوں کے ساتھ ساتھ مہمان پرندوں کا بھی ذکر کر دیا کہ وہ کس موسم میں مہمانی کھانے کھانے ادھر آ نکلتے ہیں [5]

---

[1] Holdich, Sir, T.H (1) 1892–"Ethnographical and Historical Notes on Mekran", Calcutta (2) 1894–"The Antiquities, ethnography and History of Las Bella and Mekran", London

(3) 1896–"Notes on Ancient and Medieval Mekran". J.R.G.S. Vol. 7. No. 4.

(4) 1897–"The Perso Baluch Baundry". J R G.S. Vol. 9.

(5) 1899–"The Arab Tribes of our Indian Frontiers". J.R.A.D. Vol. 29

(6) 1901–"The Indian Boderland". 1800–1900. London.

[2] Sylvia, A. Matheson, 1967–"The Tigers of Baluchistan", Arthur Baker Ltd. 5. Winsley Street, London W.1.

[3] Noetling, F.W. 1895-97–"Fauna of Baluchistan," G.S.I. Calcutta, Vol. I

[4] Burkill, I.H. 1909–"A working List of the Flowering Plants of Baluchistan", London.

[5] St. John Oliver B. 1889–"On the Birds of Southern Afghanistan and Kalat.

— Delme-Red Cliffe, H, 1915–"List of the Birds of Baluchistan" J.B N.H S. Bombay. Vol.

- Tichehurst, C.B. 1223-24' "The Birds of British Baluchistan". J.B.N.H.S. Bombay.

www.taemeernews.com

یہاں تک کہ سُرمہ[1]، خربوزہ[2]، گھوڑا[3]، اور اونٹ[4] پر بھی مفصل کتابیں لکھی گئی ہیں۔

مستقل کتابوں سے قطع نظر ایک بڑا ذخیرہ سروے، سنسز، کمیشن رپورٹ، سرکاری دستاویزات، تحقیقی کمیشن، سرکاری ڈائری اور بُلو بُک نیز نسلی، لسانی، معدنی، آثارِ قدیمہ، اقتصادی سروے وغیرہ کی رپورٹوں پر مشتمل ہے جس سے بلوچستان کے ذرے ذرے کے بارے میں گھر بیٹھے معلومات حاصل کریجیے۔ ان تصانیف میں سے بیشتر آج بھی بلوچستان کی روح میں اُترنے، وہاں کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالت کو سمجھنے کے لیے بے حد کار آمد ہیں۔

عموماً یہ عامیانہ جملہ ہماری زبان پر اکثر آتا ہے کہ برطانوی اہلِ قلم نے محض سامراجی مقاصد کے پیشِ نظر فورٹ ولیم کالج کی تشکیل کی تھی اور برِ عظیم پاکستان و ہندپر ہر جہتی علمی و ادبی تحقیق و دریافت کی جہد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ نقطۂ نظر بھی ایک حد تک درست ہو سکتا ہے۔ لیکن علمی، ادبی اور تحقیقی کام کے لیے اس سے جو مثبت فضا پیدا ہوئی اُس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نیز جب علم کی دیوی سرسوتی کسی پر اپنا سایہ ڈالتی ہے تو وہ علم کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ برطانوی مصنفین کی بعض تصانیف خالصًا علمی ذوق کی مظہر ہیں۔ مثلاً ایچ۔ جی۔ بلوچ کی باغ ناڑی کی بیلوں پر کتاب کس سیاسی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے[5]۔ پھر بلوچستان کے ناپید جانوروں مثلاً گینڈا[6] اور شیر[7] پر تحقیقی مقالے خالص علمی ذوق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

اس مختصر مقالے میں برطانوی اہلِ قلم کی جملہ کاوشوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اب آیئے ہم یہ دیکھیں کہ بلوچی کے لسانی مطالعے اور ادب کے بارے میں اُنھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں ــــ

بلوچی زبان و ادب

بلوچی السنہ ایران کی ایک زبان ہے، بارھویں صدی عیسوی میں جب بلوچوں کے طائفے بلوچستان آئے، یہ زبان بھی

---

[1] Le Mesuries, George, 1844—"Antimony and lead mines of Baluchistan. J.R.A.S.B. Vol. 2.

[2] Cleghorn, J, 1914—"Melon Culture and Melon Fly Pest", A.J.I. Calcutta, Vol. 9.

[3] Buller, R.H. 1905—"Horse and Horse Breeding in Baluchistan", London.

[4] Hughes Buller—"The Camel of Baluchistan", London.

[5] Baluch, H G. 1926—"Baghnari breed of cattle in Sind and Baluchistan". D.A B No. 126.

[6] Forster-Cooper, Oliver, 1934—"Extinct Rhionoceros of Baluchistan". P.T.R.S, London.

[7] Pocok, R.I., 1935—"The Lion in Baluchistan", J.B.N.H.S. Vol. 38, Bombay.

www.taemeernews.com

اُن کے ساتھ آئی، اور اجنبی زبانوں کے نرغے میں پل بڑھ کر تحریری سطح کو پہنچی۔ اس وقت بلوچستان میں بلوچی بولنے والوں کی تعداد ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۵,۲۳,۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔

اس زبان سے اہل مغرب کی شناسائی کی ابتدا ۱۸۱۲ء میں پوٹنگر کے سیاحت نامے کے طفیل ہوئی۔ پھر رابرٹ لیچ نے ۱۸۳۸ء میں اس زبان کے صرف و نحو کا ابتدائی مطالعہ پیش کیا۔ لیکن اس کی نشو و نما کی جانب اُس وقت توجہ کی جانے لگی جب بلوچستان کی انتظامیہ سے وابستہ برطانوی حکام کے لیے بلوچی زبان جاننا لازمی قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ ضرورت تھی جس نے انگریزی حکام کو بلوچی دانی کے لیے "ٹیکسٹ بک، کمپوزیشن اور بول چال کی کتابیں مرتب و تالیف کرنے پر مجبور کیا۔ اولین "تاریخ بلوچستان" کے مولف لالہ ہتو رام آنجہانی اس حقیقت کی جانب یوں اشارا کرتے ہیں:

> "۱۸۷۳ء رزولیشن گورنمنٹ عالیہ ہند متضمن تاکید تلقین زبان سرحدی بناہ حکام اضلاع سرحدات صادر ہوا۔ تب سے حکام سول ضلع ہذا دریافت وحصول ماہیت زبان ہذا کے مشتاق و مجاہد ہوئے۔ گویا کہ تب سے اس زبان کی قدر و منزلت بڑھی۔ اب بہت لوگ مشتاق اس زبان کے پائے جاتے ہیں ؎
>
> بادشہ یک نگاہ کند ز ہیر
> کیمیا دار سنگ گردد زر
>
> .... اب حسب الارشاد مسٹر گلیڈاسٹون صاحب بہادر بفرمائش پُر زیبائش صاحب سکریٹری گورنمنٹ پنجاب ان اجزا مختلفہ کو حسب ناقص عقل خود بقرینہ موافق ترتیب دے کر یہ "بلوچی نامہ" تصنیف کیا۔
>
> (از دیباچہ "بلوچی نامہ" مولفہ ہتو رام ص ۲-۱)

اسی ضرورت کے ماتحت گلبرٹسن [1]، گلیڈاسٹون [2]، مارسٹن [3] اور بروس [4] نے بھی درسی کتابیں لکھیں۔ جو ہر چند ابتدائی درجے کی ہیں۔ لیکن بلوچی زبان کی ساخت کو سمجھنے میں آج بھی بڑے کام کی چیز ہیں۔ نیز ان سے بلوچی زبان کے نشو و ارتقا کو تحریک ملی اور اُس نے "بولی" سے "زبان" کی جانب پہلی زقند لگائی۔

گویا بلوچی، براہوی اور بلوچستانی پشتو پر ابتدائی کتابوں کی تصنیف و تالیف درسی ضرورت کا نتیجہ تھیں۔ لیکن بعض برطانوی اہل قلم نے جب ان زبانوں میں دست گاہ پیدا کرلی تو اس کے رس میں ڈوب گئے۔ ایسے ہی صاحب دل لوگوں میں لانگ ورتھ ڈیمز بھی تھا۔

---

۱ Gilbertson, G W. 1923—"The Baluchi Language - a Grammar and Manual, assisted by Ghano Khan Haiddani", Lahore.

۲ Gladston, C.E. 1874—"Baluchi Hand Book-assisted by Hetu Ram and Mean Jiwan, Munsis", Lahore.

۳ Marston, E.W. 1842—"Lessons in the Makrani-Baluchi Dialect", Karachi.

۴ Bruce, R.I. 1874—"Manual and Vacabulary of the Baluchi Dialects", Lahore.

www.taemeernews.com

لونگ ورتھ ڈیمز

مینسل لونگ ورتھ ڈیمز برطانوی ہند کی سول سروس سے وابستہ تھا۔ جب وہ ڈیرہ غازی خان میں ڈپٹی کمشنر متعین ہوا تو اُس نے بلوچی زبان سیکھنی شروع کی اور پھر تمام عمر بلوچی زبان و ادب کے مطالعے میں بسر کر دی۔ اس کی وفات ڈیرہ غازی خان میں ہی ہوئی۔

ڈیمز کے علمی و تحقیقی کاموں کا دائرہ سہ گونہ تھا۔ اُس نے مشرقی و مغربی بلوچی بولیوں کا نہایت ژرف نگاہی سے لسانی مطالعہ پیش کیا۔ بلوچوں کے نسلی اور تاریخی کوائف پر اتنی عمدہ تحقیق کی کہ اب تک نو رس و تازہ ہے۔ اُس کا سب سے بڑا کارنامہ بلوچی کے شعری ادب کو گوئیوں سے سن کر قلم بند کر کے شایع کرانا ہے۔ آیئے اب اس کے کاموں کا ہم تفصیلی جائزہ لیں کہ نہ صرف بیرونی دنیا بلکہ خود بلوچ محققوں میں اس کا موخر الذکر کارنامہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۱۸۸۱ء میں ڈیمز نے بلوچی زبان کا خاکہ تیار کیا۔ بلوچی صرف و نحو، فرہنگ اور زبان کے نمونے پیش کیے۔ نیز مشرقی و مغربی بلوچی بولیوں کے امتیازی فرق کی نشان دہی کی[1]

۱۸۹۱ء میں اُس نے بلوچی زبان کی ٹیکسٹ بک مرتب کی جس میں بلوچی لوک کہانیاں، نظمیں اور حماسے شامل کیے۔ نیز بلوچی انگریزی فرہنگ مع صراحت پیش کی[2]

۱۹۰۴ء میں اُس نے منشی گل محمد کے تعاون سے آر۔ ایس۔ جمعیت رائے کی مرتبہ ٹیکسٹ بک کا انگریزی میں ترجمہ کیا[3] نیز اسی سال بلوچوں کا نسلی و تاریخی خاکہ پیش کیا اور پہلی مرتبہ بلوچوں کے مرز بوم کی تحقیق کرتے ہوئے بحیرہ خذر سے بلوچستان تک کی مہاجرت کا قصہ یوں مرتب کیا کہ بلوچوں کی ہرزہ گردی کی کڑی سے کڑی مل گئی۔ ڈیمز کی یہ تحقیق بہتر سال گزر جانے کے بعد بھی تازہ و مستند ہے اور روسی مستشرق گینکوفسکی اور الفن بن بھی ڈیمز کی تائید کرتے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ راقم السطور نے "بلوچ قبائل" کے عنوان سے کیا ہے، جو متداول ہے[4]

۱۹۰۷ء میں اُس نے بلوچی شعری ادب کا ایک ضخیم مجموعہ شایع کیا[5] جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد بلوچی نظموں کے انگریزی ترجمے اور ایک مبسوط دیباچے پر مشتمل ہے اور دوسری جلد میں اصل بلوچی متن رومن رسم الخط میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ترجمے کی خوبی کا کیا کہنا۔ بلوچی شاعری انگریزی لباس میں سرو قامت مجسم نظر آتی ہے۔ اس سے بھی اہم تر تحقیقی کارنامہ

---

۱ Dames, Mansel Longworth, 1881—"A Sketch of the Northern Baluchi Languages".

۲ Dames, Mansel 1891—"A Text Book of the Baluchi Languages".

۳ Dames, Mansel 1904—"A Text Book of the Baluchi Languages" tr. R.S. Diwan Jamiat Rai.

۴ Dames, Mansel Longworth, 1904—"An Historical and ethnological sketch of the Baluchi Race", London.

۵ Dames, Mansel—1907 "Popular Poetry of the Baloches", London.

www.taemeernews.com

ڈیمز کے وہ وضاحتی نوٹ ہیں جو اُس نے ہر نظم کی ابتدا میں شامل کیے ہیں۔ اس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ نظم اُس نے کس علاقے کے گویّے سے کب اور کہاں سُن کر قلم بند کی ہے۔ اس کے کتنے متداول متن ہیں ان میں جزوی فرق کیا ہے، کس عہد کی ہے اور اندرونی شہادت اور زبان کے لحاظ سے کس عہد کی معلوم ہوتی ہے۔

نظموں کے بارے میں یہ تفصیلی معلومات بلوچی ادب کی تنقید میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اس سے ہم بلوچی شعری ادب کے عہد بہ عہد تغیر پذیر رنگ و آہنگ اور زبان و ادب کی کیفیات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چونکہ یہ نظمیں اب سے اُنہتر[۶۹] برس پہلے احاطۂ تحریر میں آئی ہیں۔ لہٰذا لسانی مطالعے، لغات نویسی اور گرامر کے لحاظ سے بھی یہ نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔

ڈیمز کا دیباچہ بھی نہایت معرکہ آرا ہے۔ یہ دیباچہ اور وضاحتی نگارشات بڑے کام کی چیزیں ہیں اور ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلوچی شعری ادب کے بحر مواج کا کتنا بڑا غوّاص تھا بلوچی زبان و ادب کا کتنا بڑا مزاج داں اور پارکھ تھا۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین ڈیمز نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل میں بھی لکھے ہیں۔ نیز ایک طویل مقالہ "لیجنڈ آف پنجاب" مرتبہ مسٹر ٹمپل میں بھی شامل ہے۔ جس کا اردو ترجمہ راقم السطور نے "بلوچی دنیا" (ثقافت نمبر) کے لیے کیا تھا اور اب اس مکمل کتاب کا اردو ترجمہ شایع ہو چکا ہے۔ ایک مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے لکھا[۱] اور ایک کسٹمز آف دی ورلڈ کے لیے سپرد قلم کیا[۲]۔ آخر الذکر مقالہ بلوچوں کے رسم و رواج پر ہے اور اس میں ترسٹھ[۶۳] برس پہلے کے بلوچوں کی معاشرتی زندگی اور مہد سے لحد تک کی رسوم کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

ای۔ پائیرس

۱۸۷۵ء میں مکرانی بلوچی پر تفصیلی مقالہ ای۔ پائیرس نے لکھا جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل میں شایع ہوا[۳]۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بے انتہا اہمیت رکھتا ہے کہ اب تک مغربی بلوچی کی بولیوں کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ ضلع مکران کے پانچ علاقے (اب تحصیلیں) مثلاً تربت، کلمت، پنجگور اور زامُران کی بولیاں ہر چند جُدا جُدا ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر انھیں "مکرانی بلوچی" یا "مغربی بلوچی" کہا جاتا ہے۔ ڈیمز اور دیگر نے اب تک مشرقی بلوچی کے شعری ادب اور زبان پر کام کیا تھا، جس پر سندھی، سرائیکی اور پنجابی کا گہرا اثر تھا۔ ہے۔ اس کے برعکس مکرانی بلوچی اپنے زاد بوم سے قدرے نزدیک ہونے کے سبب فارسی سے قربت رکھتی ہے پائیرس کا یہ مطالعہ اسی صورتِ حال کا آئینہ دار ہے۔

ای۔ موکلر

موکلر نہایت ذی علم برطانوی افسر تھا۔ اس نے مختلف موضوعات پر نہایت بلند پایہ تحقیقی کام کیا ہے۔ ۱۸۷۶ء میں اُس نے ضلع مکران کا دورہ کیا و روہاں کے آثار قدیمہ پر ایک انکشافی مقالہ سپرد قلم کیا[۴]۔ ۱۸۷۷ء میں اس نے بلوچی

۱؎ Dames, Mansel 1913—"Baluchistan in Encyclopaedia de Islam".

۲؎ Dames, Mansel 1912-13—"Customs of the world", Vol. I P.P. 576-84, London.

۳؎ Pierce, E. 1875—"Makrani Baluchi", J.R.A.S.P., Vol. II No. 31.

۴؎ Mockler, E. 1876—"On Ruins in Makran", J.R.A.S. Vol. 9.

www.taemeernews.com

گرامر پر ایک نہایت مفصل کتاب لکھی [1] جس کا اردو ترجمہ بلوچی اکاڈمی کوئٹہ شایع کر رہی ہے ۔ ۱۸۷۹ء میں اُس نے قدیم تاریخ خصوصاً ایرین، بطلیموس اور مارسین کے بیان کردہ قدیم مقامات کی تطبیق پر ایک مقالہ لکھا [2] اور ۱۸۹۵ء میں اُس نے بلوچوں کی نسل کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا [3]

موکلر کے یہ علمی مضامین موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے متعدد دریچے کھولتے ہیں اور بلوچوں اور اُن کی زبان و نسل کے بارے میں گوناگوں معلومات مہیا کرتے ہیں ۔

ٹی ۔ ایس ۔ میئر

ڈیمز کے بعد ٹی ۔ ایس ۔ میئر کا نام بلوچی زبان و ادب کے ہوا خواہوں میں آتا ہے ۔ میئر پادری تھا اور گوناگوں صفات کا مالک ۔ اُس نے مختلف علاقوں میں سبزہ گردی کر کے بلوچی شعری ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا ۔ لیکن افسوس کہ اصل بلوچی متن وہ شایع نہ کرا سکا اور بلوچی ادب کا یہ بیش بہا سرمایہ امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا ۔ بہر کیف اُس نے "بلوچ کلاسک" کے عنوان سے بلوچی نظموں کا انگریزی ترجمہ شایع کیا [4] اُس کی یہ کتاب ڈیمز کی "پاپولر پوئٹری آف دی بلوچیس" سے سات سال پہلے شایع ہوئی تھی اور ڈیمز نے میئر سے جا بجا استفادہ کیا ہے ۔

میئر کی زبان بہت سادہ ہے ۔ وہ ڈیمز ایسی شاعرانہ صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کر سکا، اس کے باوجود اُس کی یہ کاوش بھی بلوچی شعری ادب کے تعارف کے سلسلے میں قابلِ داد ہے ۔

۱۹۱۰ء میں میئر کا شاندار کارنامہ انگریزی بلوچی لغات کی تدوین ہے [5] یہ لُغات بڑی ضخیم اور مرتبے کی ہے ۔ اس میں نہ صرف مشرقی بلوچی بلکہ مختلف قبائل کی بولیوں اور خانہ بدوش بلوچوں کی بولیوں کی فرہنگ بھی شامل ہے ۔ یوں اس لغات کی مدد سے قدیم شعری ادب کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے ۔

پادری میئر براہوی زبان سے بھی واقف تھا ۔ اور اُس نے درسی ضرورتوں کے پیشِ نظر "براہوی ریڈنگ بک" (۳ جلدیں) بھی مرتب کی تھیں ۔ یہ کتاب لدھیانہ سے شایع ہوئی تھی ۔ اور سالوں براہوی کورس میں شامل رہی ۔ وہ اُردو سے بھی بخوبی واقف تھا ۔

جی ۔ گیئرسن

جی ۔ اے ۔ گیئرسن "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کے چیف ایڈیٹر تھے ۔ ۱۹۲۱ء میں جلد دہم شایع

---

[1] Mockler, E. 1877–"Introduction to a Grammar of the Baluchee Language", London.

[2] Mockler, E. 1879–"On the identification of Places on the Makran Coast by Arrian, Ptolemy and Marcian. "J.R.A.S. Vol. II, PP. 128-54.

[3] Mockler, E 1895–"Origin of the Baloch", J.A.S B, Vol. 64, Pt. I, No. I.

[4] Mayer, T.J.L. 1900-7–"Baloch Classics, Fort Munro", Agra.

[5] Mayer, T.J.L. 1910–"English Baluch Dictionary", Calcutta.

www.taemeernews.com

ہوئی[1] جس میں بلوچی پر بھی ایک مقالہ شامل کیا گیا۔ اس میں بلوچی صرف و نحو، افعال، مشرقی و مغربی بلوچی کی امتیازی خصوصیتیں اور بلوچی کے لسانی رشتے پر نہایت مستند و معتبر معلومات ہیں۔

اس سے قبل ۱۹۰۶ء میں جلد چہارم کلکتہ سے شایع ہوئی تھی۔ اُس میں براہوی زبان پر سر ڈینس برے کا مقالہ شامل کیا گیا تھا۔

بہرکیف گیرسن نے جس حسن و خوبی سے برصغیر کے لسانی سروے کی رپورٹ کو ایڈٹ کیا ہے، وہ قابلِ داد ہے اور یہ علمی کارنامہ اُسے صدیوں تک زندہ رکھے گا۔

گلبرٹ سن

گلبرٹ سن نے ۱۹۲۳ء میں بلوچی دانی پر ایک کتاب لکھی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اُس کے بعد وہ بلوچی کی روزمرہ اور بازاری Colloquial فرہنگ پر تحقیقی کام کرتا رہا اور ۱۹۲۵ء میں "انگریزی بلوچی کالوکیئل ڈکشنری" شایع کی[2]۔ میئر کے بعد یہ دوسری اہم لغات ہے جس میں بلوچی کے بے شمار ایسے الفاظ کے معنی بہ تحقیق درج ہوئے ہیں جو اب بلوچی کی عام بول چال میں نہیں۔ بعض میں صوتیاتی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ بعض نئے معنوں میں مستعمل ہو چکے ہیں اور بعض متروکات کی فہرست میں داخل ہو چکے ہیں۔ البتہ قدیم شعری ادب میں یہ الفاظ اب بھی موجود ہیں۔ قدیم بلوچی ادب کی تفہیم میں گلبرٹ سن کا یہ کام ہمیشہ دستگیری کرتا رہے گا۔

جی۔ ایلفن بن

پاکستان کی تشکیل کے بعد بھی مقامی ادبا کے ساتھ ساتھ اطالوی، برطانوی، روسی، امریکی اور ایرانی مستشرقین نے بھی بلوچی زبان و ادب پر تحقیقی کام کیا ہے۔ بلوچی زبان و ادب شناسی میں انجم قزلباش، ملک محمد پناہ عبداللہ جان جمالدینی، عاقل خان مینگل اور کامل القادری کی خدمات اور تصانیف محتاجِ تعارف نہیں۔ اسی طرح دو امریکی اسکالر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر (فلپ بارکر) اور ڈاکٹر ایمینو کی کاوشیں بلوچی زبان کے لسانی مطالعے میں بیش بہا اضافہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر بوسانی نے پاکستانی زبانوں کے ادب پر ایک ضخیم کتاب اطالوی زبان میں لکھی ہے، جس میں ایک باب بلوچی زبان و ادب کا بھی ہے۔ اور جس کا انگریزی ترجمہ امریکی رسالے "محفل" میں شایع ہو چکا ہے۔

برطانوی ماہرِ لسانیات میں جے۔ ایلفن بن نے پاکستان بننے کے بعد بلوچی زبان کے لسانی مطالعے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اُس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ وہ بسلسلۂ تحقیق بلوچستان بھی آ چکے ہیں۔ لہٰذا انھیں بلوچی زبان و ادب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور خوش بختی سے عبداللہ جان جمالدینی ایسا معاون اُنھیں مل گیا جس کی مادری زبان بلوچی ہے اور جس نے بلوچی زبان و ادب کے مطالعے میں ایک عمر بسر کی ہے۔

۱۹۶۰ء میں ایلفن بن نے بلوچی زبان و ادب پر ایک مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے لکھا[3]۔

---

[1] "Baluchi in the Linguistic Survey of India". Calcutta Vol. 10.

[2] Gilbertson, G.W. 1925—"English Baluchi Colloquial Dictionary", London.

[3] Elffenbin, J. 1960—"Baluchistan B. Languages in Encyclopeadia of Islam".

www.taemeernews.com

- ۱۹۶۱ء میں انھوں نے "بلوچی ٹیکسٹ" شایع کی، جس میں مغربی بلوچی کی معروف لوک کہانیاں شامل ہیں[۱]
- ۱۹۶۳ء میں انھوں نے "مروی بلوچی" کا مطالعہ پیش کیا۔ اُن کی تحقیق کی رو سے علاقہ مرو اور رخشانی بلوچی میں یک گونہ مماثلت ہے[۲]
- ۱۹۶۶ء میں انھوں نے بلوچی بولیوں کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا[۳] اس میں انھوں نے بلوچی کی رخشانی بولی کو مرکزی حیثیت دی ہے اور اس کے اثرات اور پھیلاؤ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں بعض بلوچی شعرا کی نظمیں مع انگریزی ترجمہ اور لسانی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ ان شعرا میں گل خان نصیر، میر عیسیٰ خان قومی آزاد جمالدینی، عطا شاد وغیرہ ہیں۔

بہ ایں ہمہ الفن بن کا یہ موقف متنازعہ فیہ ہے کہ ضلع چاغی میں بولی جانے والی بلوچی (رخشانی) مرکزی حیثیت کی مالک ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ رخشانی بولی پر براہوئی کا اثر غالب ہے اور اس کے مقابلے میں مغربی بلوچی کی بولیاں زیادہ صاف و شستہ اور کم مخلوط ہیں۔

برین اسپونر

۱۹۶۶ء میں برین اسپونر کا تحقیقی مقالہ شایع ہوا[۴] یہ مقالہ ہر چند ایرانی بلوچستان کی بلوچی بولیوں خصوصاً سراوانی (علاقۂ ایران) بلوچی کے بارے میں ہے۔ لیکن تدریِ اوّل کی تحقیق ہے اور اس سے مغربی بولیوں کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

برین اسپونر ایک مدت تک بلوچستان میں مواد جمع کرنے کے لیے دورہ کرتا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی معلومات تازہ ترین صورتِ حال کی غمازی کرتی ہیں۔ "فیلڈ ریسرچ" سے حاصل کردہ مواد لسانی مطالعے میں نئی جہت پیدا کرتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کا مقابلہ ایم۔ اے۔ نازم (تھیسس ۱۹۶۲ء یونیورسٹی آف طہران) اور جی۔ ایچ بہزاد نجد (تھیسس ۱۹۶۴ء یونیورسٹی آف ایران) کے ایرانی بلوچستان پر تحقیقی مقالات سے کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔

جی۔ مورگن اسٹیرن

جی۔ مورگن اسٹیرن بین الاقوامی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ لسانیات اُن کا علاقۂ مطالعہ ہے۔ ۱۹۳۲ء سے وہ

۱ـ Elfenbin, J. 1961–"Baluchi Text with trarslation and Notes". B.S.O.A.S. XXIV I. P.P. 86-103.

۲ـ Elfenbin, J. 1963–"A vocabulary of Marw Baluchi Maples, Elymological glossory of published text of the Marw Dialects".

۳ـ Elfenbin, J. 1966–"Baluchi Dialectology". London.

۴ـ Brain Spooner, 1966–"Notes on the Baluchi Spoken in Persian Baluchistan". Journal of Persian Studies' P.P. 51-71. Tehran.

www.taemeernews.com

بلوچی اور براہوئی زبانوں کا مطالعہ کررہے ہیں اور اب تک متعدد مقالات وکتب لکھ چکے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں انھوں نے "لنگوا ٹک مشن" کی رپورٹ مرتب کی تھی لے اسی سال انھوں نے بلوچی اور براہوی فرہنگ پر اپنا مطالعہ پیش کیا ۲ے ۱۹۴۷ء میں انھوں نے "بلوچی زبان" پر اپنی تحقیقی کتاب مکمل کی ۳ے ۱۹۴۸ء میں بلوچی زبان پر متفرق مقالات کا مجموعہ شایع کیا ۴ے اور ابھی اُن کے قلم کی جولانی تھمی نہیں ہے۔

براہوئی زبان وادب

براہوئی السنۂ دراوڑی کی ایک منفرد زبان ہے۔ اس خاندان کی دوسری زبانیں تامل، ملیالم، کنڑی، تولو، تیلگو وغیرہ جنوبی ہند اور بعض لنکا میں بولی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں اس خاندان کی ایک زبان کا علم نہ صرف ماہرین لسانیات کے لیے دلچسپی کا سبب بنا بلکہ مورخوں کے لیے بھی فکر ونظر کی نئی راہیں کھُل گیئں اور یہ قیاس کیا جانے لگا کہ ہو نہ ہو جنوبی ہند اور لنکا کی دراوڑی بولیاں بولنے والے تاریخ کے کسی نازک موڑ پر بلوچستان ہی سے اُدھر جا نکلے ہوں۔

بلوچستان میں براہوی زبان کی موجودگی کا اہلِ مغرب کو پہلے پہل علم پوٹنگر کے سفرنامے سے ہوا۔ پھر آر لیچ نے گرامر کا خاکہ پیش کیا بعدہٗ میسن نے اپنے سیاحت نامے میں مزید مواد فراہم کیا۔ اور اس فراہم شدہ مواد کی تنقیح کرسچن لیسن - - - (Christian Lasson) نے کی، اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ براہوی میں ہند آریائی زبانوں کی فرہنگ شریک غالب ہے۔

اس وقت تک براہوی کے بارے میں قطعیت سے یہ رائے قایم نہیں کی جا سکی تھی، کہ یہ دراوڑی خاندان کی زبان ہے بھی یا نہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ رابرٹ کاڈویل براہوی زبان کی گرامر مرتب کرتے ہوئے اسے دراوڑی السنہ کی زبان تسلیم نہیں کرتا۔ محض دراوڑی زبان کے اجزا کی موجودگی کی تصدیق کرتا ہے ۵ے اس کے بعد بھی براہوی کا مطالعہ جاری رہا۔

- ۱۸۳۸ء میں ہنری نیلکس نے ایک مقالہ لکھا جو آر۔ لیچ کے پیش کردہ مواد پر مبنی ہے۔
- ۱۸۷۴ء میں سر ہنری بیلو کا سفرنامہ شایع ہوا ۶ے اس میں اُنھوں نے براہوئی زبان کے صرف ونحو کا خاکہ اور معتدبہ تعداد میں فرہنگ شامل کی۔
- ۱۸۷۴ء میں سر جارج کیمبل نے ہندوستان کی زبانوں کا نمونہ پیش کیا ۷ے جس میں براہوئی زبان کا نمونہ بھی شامل کیا گیا۔

۱ے Morgenstern, G, 1932–"Areport on a Linguistic Mission to N.W. India".

۲ے Morgenstern, G, 1932–"Notes on Baluchi Etymology".

۳ے Morgenstern, G, 1947–"Baluchi Language".

۴ے Morgenstern, G, 1948–"Baluchi Miscallanea".

۵ے Robert Culdwill, 1856–"A comperative grammar of the Dravidian on South Indian Family of Languages". (2nd Edition, 1875-3rd Edition 1913.
(راقم السطور کو پہلا ایڈیشن دستیاب نہیں ہوسکا)

۶ے Bellow, Sir Henry, 1874–"From the Indus to the Tigris", London.

۷ے Campbell, Sir George, 1874–"Specimens of Languages of India"

www.taemeernews.com

- ١٨٧٧ء میں کیپٹن ۔ ایم ۔ نکلسن نے "براہوئی ریڈر" مرتب کی۔ یہ کتاب نوآمدہ برطانوی حکام کو براہوئی زبان سکھانے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر مولوی اللہ بخش اس سے قبل براہوی ریڈر لکھ چکے تھے۔

اس وقت تک مواد کی فراہمی کے علاوہ متعدد درسی کتابیں انگریزی حکام کو براہوی سکھانے کے لیے لکھی جا چکی تھیں لیکن اس وقت تک یہ معما نہ کھلا تھا کہ یہ کس السنہ کی زبان ہے۔ ١٨٨٠ء میں میونخ یونیورسٹی کے ماہرِ لسانیات ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے براہوئی زبان کا لسانی مطالعہ پیش کیا اور اسے السنہ دراوڑ کی ایک منفرد زبان قرار دیا۔ اُن کی اس رائے کو آج تک چیلنج نہیں کیا جا سکا ہے۔

"ڈاکٹر ٹرمپ کے اس فاضلانہ مطالعے (بزبان جرمن) کا انگریزی میں ترجمہ بنگال آرمی کے سرجن میجر تھیوڈور ڈوکا ۔ ۔ ۔ (Theodor Duka) نے کیا جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل (نیو سیریز جلد نوزدہم) میں شایع ہوا۔ راقم السطور نے اسی انگریزی ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔

اس حقیقت کے کھُل جانے کے بعد بھی براہوئی کا مطالعہ اور مواد کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہا، مثلاً

- ١٨٨٤ء میں پادری شرٹ نے ایک براہوی لوک نظم اصل متن مع ترجمہ شایع کیا (انڈین اینٹی کوری جلد یازدہم)
- ١٨٨٢ء میں میک گریگر نے بلوچستان میں اپنی ہرزہ گردی کی داستان "ونڈرنگ ان بلوچستان" کے نام سے لکھی۔ اس میں اس نے براہوئی فرہنگ بھی شامل کیا۔
- ١٩٠٢ء میں بگ وِدھر ایف کی کتاب رہنمائے براہوئی شایع ہوئی[1]
- ١٩٠٦ء میں "لنگوسٹ سروے آف انڈیا" جلد چہارم شایع ہوئی جس میں براہوئی پر ایک مقالہ شامل ہے، اسی سال لدھیانہ سے "یوحنا" کا براہوئی میں ترجمہ (رومن میں) شایع ہوا اور اگلے سال براہوئی رسم الخط (فارسی طرز) میں "یوحنا" کو پیش کیا گیا۔ پادری میئر نے (جن کا ذکر قبل کیا جا چکا ہے) ان ہی دو سالوں میں براہوئی ریڈنگ بک کی تین جلدیں لدھیانہ سے شایع کرائیں، اور اس طرح براہوئی "بولی" سے "زبان" بننے لگی۔ کیونکہ "یوحنا" کی براہوئی میں اشاعت نے بلوچستان میں آگ لگا دی تھی اور علما نے پہلی مرتبہ براہوئی اور بلوچی میں تصنیف و تالیف کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دُرخان میں براہوئی اور بلوچی کے اشاعت گھر قایم کر دیے تھے۔

اس سرسری جائزے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک جن اہلِ قلم نے براہوئی زبان کی جانب توجہ کی اُن میں ایک قسم ایسے مصنفوں کی ہے جنھوں نے محض براہوئی زبان کے بارے میں مواد فراہم کرنے پر اکتفا کیا۔ دوسری قسم ایسے مصنفوں کی ہے جنھوں نے براہوئی زبان دانی کے لیے انگریز حکام کے لیے درسی کتابیں مرتب کیں۔ واقعہ یہ ہے کہ برے سے قبل براہوئی پر سیر حاصل کام نہ ہو سکا تھا۔ ٹرمپ نے لسانی مطالعے کے بعد محض اس کے دراوڑی السنہ کی شہادت دی تھی اور بس۔

سر ڈینس برے

سر ڈینس برے (١٨٧٥ء - ١٩٥١ء) نہایت بلند پایہ انشا پرداز اور محقق تھا۔ برطانوی ہند کی سول سروس سے وابستہ تھا

---

[1] Bigg, Wither, F. 1902–"A guide to the Study of Brahui", Allahabad

www.taemeernews.com

نہایت علم دوست، عالی ہمت اور بلند فکر انسان تھا۔ اُس نے براہوی زبان اور ثقافت پر جو کام کیا ہے وہ انمٹ ہے۔ اُس کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اُس کے تحقیقی نتائج اب تک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۰۹ء میں "براہوئی زبان" شایع ہوئی ۱؎۔ اس میں براہوئی گرامر کا تفصیلی مطالعہ برے نے پیش کیا۔ براہوئی ابجد، صوتیاتی نظام، اسم، فعل، حرف، صنعت، متعلق فعل، ضمیر، حروف عطف پر سیر حاصل بحث کی ہے ۱۹۳۴ء میں اس کتاب کی دوسری جلد شایع ہوئی ۲؎ جس میں اُس نے "براہوئی مسائل" والے حصے میں براہوئی کی وجہ تسمیہ، نسل، تاریخ اور براہوئی زبان کے دوسری زبانوں سے رشتے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور اس قیاس پر اپنی جملہ گفتگو کو سمیٹ لیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بانی براہوئی بولنے والے ہوں۔ حصہ سوم براہوئی کی اشتقاقی لغت پر مشتمل ہے، اور اس میں برے نے براہوئی میں مستعمل الفاظ کے ماخذ کی تلاش اور لسانی صراحت میں بڑی دیدہ ریزی اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ سندھی، پنجابی، سرائیکی، بلوچی، اردو، فارسی، عربی، ترکی کی مشترکہ لغات کے تقابلی مطالعے کے ساتھ ساتھ براہوئی اور دیگر دراوڑی زبانوں میں مستعمل مشترک ذخیرۂ الفاظ کی نازک سے نازک تبدیلی کی بھی نشان دہی کی ہے۔

۱۹۱۳ء میں براہوئی رسوم درواج پر برے کی نہایت قیمتی اور معلومات افزا کتاب شایع ہوئی ۳؎۔ اس میں اُس نے مہد سے لحد تک کے نہایت دلچسپ پیرائے میں براہوئی رسوم کا بیان کیا ہے۔ منگنی، شادی، زچہ بچہ، بچے کی پرورش، معتقدات، عقیقہ، ختنہ، علاج و معالجہ، موت اور موت کے رسوم —— غرض کسی بھی پہلو کو برے نے تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور اسلوب ایسا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جائے۔ برے کی یہ کتاب بہ لحاظ انشا پردازی بھی اُسے انگریزی زبان کے صف اول کے ادبا میں شمار کرنے کے لیے کافی ہے۔

برے نے ان دو اہم باضابطہ تصانیف کے علاوہ متعدد معرکہ آرا مقالے بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ جن کا ذکر یہاں پر غیر مناسب نہ ہوگا۔

- ۱۹۱۳ء میں برے نے سینس آف انڈیا کی تکمیل کی ۴؎ اس میں براہوئی زبان پر اُس کا مقالہ شامل ہے ۴؎ نیز بلوچستان کا نسلی مطالعہ پیش کیا ۵؎
- ۱۹۱۵ء میں اُس نے "بلوچستان" کے عنوان سے ایک مقالہ "مین" کے لیے لکھا ۶؎
- ۱۹۱۶ء میں اُس نے بلوچستان کے قبائل کا جائزہ پیش کیا ۷؎
- ۱۹۲۸ء میں اُس نے بلوچستان کے دشت و بیابان میں پائے جانے والے پتھروں کے بنے دائروں پر ایک تفصیلی مقالہ

۱؎ Bray, Sir Denys, 1909–"The Brahui Language", Vol. I. Part I, London

۲؎ Bray, Sir Denys, 1934–"The Brahui Language". Vol. 2. Part 2, 3, London

۳؎ Bray, Sir Denys, 1913–(1) "The Life History Brahui", London.

۴؎ Bray, Sir Denys, 1913–(2) "Census of India ", Vol 4, Pts 1-2, Calcutta.

۵؎ Bray, Sir Denys, 1913–(3) "Ethnographical Survey of Baluchis" 2 Vols. Bombay.

۶؎ Bray, Sir Denys, 1915–"Baluchistan", Man, Vol. 15, P-39. London.

۷؎ Bray, Sir Denys, 1916–"Statistical analysis of the tribes of Baluchistan. 1911", Calcutta.

www.taemeernews.com

لکھا ہے[1]

سر ڈینس برے کے کاموں کا یہ اجمالی بیان اُن کی علمی خدمات اور ذہن رسا کی غمازی کرتا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جس موضوعِ مطالعہ پر اُنھوں نے قلم اٹھایا ہے اُسے یوں سمیٹ لیا ہے کہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔

پاکستان کی تشکیل کے بعد براہوئی زبان کے بارے میں جو کام ہوا ہے اُس میں وطنی محققوں میں پروفیسر انور رومان، پروفیسر عبدالرحمٰن براہوئی اور کامل القادری کا نام سر فہرست ہے۔ مستشرقین میں ایم۔ بی۔ ایمینو اور عبدالرحمٰن بارکر (فلپ بارکر) شامل ہیں۔ عبدالرحمٰن بارکر کے توسط سے پروفیسر ایمینو کے براہوی زبان کے لسانی مسائل پر مطبوعہ کام کے علاوہ متعدد غیر مطبوعہ مضامین بھی راقم السطور کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ سر ڈینس برے نے براہوئی زبان کا اس قدر جامع لسانی مطالعہ پیش کیا ہے کہ مزید اضافے کی گنجائش نہیں۔ عبدالرحمٰن بارکر بڑی تلاش و تجسس اور فیلڈ ریسرچ کے بعد ایک درجن ایسے براہوئی الفاظ جمع کیے ہیں جو سر ڈینس برے کی لغات میں شامل نہیں۔ البتہ براہوئی ادب کا خانہ بالکل خالی ہے۔ ڈینز جیسا کوئی مستشرق براہوئی ادب کو میسر نہ آیا جو اُس کے ادبی سرمائے کو اکٹھا کرکے شایع کرتا۔ یہ کمی اب ممتاز اسکالر عبدالرحمٰن براہوئی اور راقم السطور پوری کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

زرک خان

بلوچستان کی تلاش و جستجو اور اُس کی روح کی دریافت پر جو کام برطانوی اہلِ قلم نے کیا ہے یہ اُس کا مختصر سا جائزہ ہے۔ اس مضمون میں مختلف و متنوع موضوعات پر برطانوی مصنفین کی بعض اہم تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ صاحبِ کتاب مصنفین کے علاوہ ایسے قلم کاروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جنھوں نے ایک دو مقالے ہی لکھے ہیں اور یہ مقالے اتنے جامع اور دقیع ہیں کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کے علاوہ ایک سو چھیاسٹھ رسائل و جرائد میں انگریزی مصنفین کے مضامین شایع ہوتے رہے ہیں۔ یہ ہماری قومی ضرورت ہے کہ ہم اپنے ملک کے محققین کی سہولت کے لیے برطانوی عہد کے اس ذخیرے کی چھان بین کرکے ایک جامع حوالے کی کتاب مرتب کریں اور جس اہم کام کی بنیاد "اذکار" ڈال رہا ہے، اس کی تکمیل قومی سطح پر کی جائے۔

ابھی ایک اہم کتاب کا ذکر باقی ہے۔ زرک خان ایک تاریخی شخصیت ہے۔ وہ ضلع لورالائی (بلوچستان) کے ملازئی قبیلے کا فرد تھا اور اس کے اخلاف ابھی زندہ ہیں۔ وہ انگریزوں سے خفا ہوکر پہاڑ پر چلا گیا تھا۔ "پہاڑ پر جانا" اس بات کی علامت ہے کہ وہ برطانوی ہند کی عمل داری سے باہر نکل چکا ہے، لیکن انگریزوں نے اسے گرفتار کرنے کے لیے اُس کے سر کی قیمت ایک لاکھ مقرر کی۔ پھر کیا تھا۔ زرک خان نے انگریزوں کی فوجی چھاونیوں پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ انگریز اُس کے نام سے تھرانے لگے اور پھر زرک خان اور انگریزوں کے مابین صلح صفائی ہوئی اور وہ ایک معزز شہری کی طرح اپنے آبائی گاؤں میں آکر رہنے لگا۔ وہیں وفات پائی۔ راقم السطور زرک خان کے اخلاف میں سے بعض سے مل چکا ہے۔

لے Bray, Sir Denys, 1928–"Wedding Stone-Circles in Baluchistan Antiquity".
Vol. 2, P.P. 346-47, Glouchester, London.

www.taemeernews.com

زرک خان ایک تاریخی شخصیت ہے اور اس تاریخی شخصیت پر مبنی جو کتاب اے۔ جے ربیون نے لکھی ہے لے اس میں زیبِ داستان کے طور پر بعض دل آزار واقعات بھی ہیں، جو نہ حقیقتِ حال پر مبنی ہیں اور نہ ان کے حذف کر دینے سے نفسِ موضوع مجروح ہوتا ہے۔ اس کتاب پر مبنی فلم بھی بن چکی ہے۔ ہمیں ایسی کتابوں اور نگارشات پر بھی تنقیدی کام کرنے کی ضرورت ہے، جس میں دانستہ یا نادانستہ برطانوی مصنفین سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

لے Beavan, A.J. 1950—"The Story of Zarak Khan", 3rd, Ed. 1865, Arrow Books Ltd, 178-202, Great Portland Street, London, W. I.

—8—

مجنوں اکیڈمی کی تجزیہ پیش کش

ارمغانِ مجنوں

مجنوں گورکھپوری کی زندگی، شخصیت اور فن پر پہلی دستاویزی کتاب

جس میں

- مجنوں گورکھپوری کے غیر مطبوعہ خطوط نیلم اور ولارام کے نام
- خودنوشت کی پانچ مکمل قسطیں
- مجنوں صاحب کے نئے، فکر انگیز اور غیر مطبوعہ مضامین
- مجنوں صاحب کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل مضامین

—— اور ——

جشن مجنوں منعقدہ کراچی کا تفصیلی جائزہ ——

۸ صفحات کی نادر و یادگار تصاویر ——

طباعت تو لڑ آفسٹ —— ○ —— سرورق: اقبال مہدی

قیمت مجلد —— چالیس روپے

ناشر

مجنوں اکیڈمی — معرفت ماہنامہ افکار — رابسن روڈ — کراچی

---

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری

کشمیری ادب اور برطانوی اہل قلم

کشمیری زبان وادیٔ کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں کشتواڑ۔ رامبن۔ پونچھ۔ ڈاب گڑھ وغیرہ میں قریب قریب ایک سو پچاس میل کی لمبائی اور پچاس میل کے عرض میں بولی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر اس زبان کے بولنے والے اور سمجھنے والوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ ہے۔ یہ زبان بہت پرانی اور قابلِ مطالعہ زبان ہے۔ بوجہ تفصیلی گرامر رکھنے کے یہ ہندوستانی زبانوں میں بڑی وقعت رکھتی ہے۔ اس میں گردانوں کی نئی حالتیں پرانے اصول سے مرتب کی گئی ہیں، جو دیگر زبانوں کے لیے بہت ہی مشکل ہے ــــ

کشمیری زبان کے تار و پود کے بارے میں روایتی ' خیال آرائی ' یہ تھی کہ اس کا تعلق داردی زبان سے ہے، قابل قبول رائے نہیں ہے۔ بلکہ درست یہ ہے کہ اس زبان کا تعلق قدیم زبان بردشتکی سے ہے۔ مہا بھارت کے زمانے میں ہندوستان میں مختلف زبانیں پھیلی ہوئی تھیں، چنانچہ کشمیری بھی مروجہ سنسکرت زبان سے تغیر پذیر ہونے لگی تھی اور سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورت میں بردشتکی کے رنگ میں اس زبان نے نیا روپ دھار لیا ــــ

آج کل کی کشمیری زبان کا یہ جنم پانچویں اور چھٹی صدی بکرمی کے درمیان شمار کیا جاتا ہے۔ راج ترنگنی کے مصنف کلہن کے زمانے میں، یعنی گیارھویں اور بارھویں صدی کے وسط میں کشمیری زبان کشمیر میں مروج تھی جس کا نام اس زمانے میں سردگو چرد یشں بھاشا زبان سے موسوم تھا۔ اس زبان کی حروف تہجی ہندوستان کی موجودہ زبانوں سے مختلف ہے۔ حروف علت کی بہتات ہے۔ ماہرین زبان کو کشمیری زبان میں ستائیس حروف علت نظر آئیں گے۔ یہ زبان ضرورت کے مطابق شاردا رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ آج کل کشمیری زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور شاردا رسم الخط برہمنوں تک محدود رہا ہے۔ بڈشاہ زین العابدین (۱۴۲۵ء تا ۱۴۷۰ء) کے دور میں کشمیری زبان نے کافی فروغ حاصل کیا۔ اس دور کے دو مشہور ادیب، یودھ بٹ اور سوم پنڈت گزرے ہیں۔ یودھ بٹ نے پہلا ڈراما کشمیری زبان میں "زینہ ولاس" کے نام سے لکھا اور سوم پنڈت نے سوانح عمری زین العابدین کشمیری زبان میں لکھی تھی۔ جو زینہ چرت سے موسوم تھی۔ بڈشاہ کے بعد کشمیری تہذیب و تمدن کا زوال شروع ہوا اور کشمیری زبان کے عروج کی جگہ فارسی زبان نے لے لی ــــ

بعض ادبا اور شعراء نے فارسی زبان میں اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ فارسی زبان کے اہل زبان تک انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور اسی سرمستی میں اپنی مادری زبان کو بھی بھول گئے۔ حتیٰ کہ پانچ سو سال تک کسی شاعر یا ادیب نے اپنی مادری زبان کی

www.taemeernews.com

طرف توجہ نہ کی۔ دورِ غلامی نے کشمیری ادیب اور شعرا حضرات پر زبان کے تحکمانہ اثرات بدرجۂ اتم چھوڑے اور محکوم قوم نے سرکار کی خوشنودی میں اپنی زبان ہی کو فراموش کر دیا۔ سکھوں کے عہدِ حکومت تک اس زبان میں کسی کشمیری شاعر یا ادیب نے تحریری طور پر کوئی قابلِ قدر خدمات انجام نہیں دیں۔ اس زبان کی مقامی بے اعتنائی کا معاملہ جس قدر عبرت ناک ہے، اسی قدر حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یورپ کے محققین نے بحر و بر کی ہزاروں منزلیں طے کر کے کشمیر میں اپنی بساط سے زیادہ محنت اور مشقت سے کام لے کر کشمیری ادب کی خدمت کی اور کشمیری زبان کے ان شعرا کے حالات قلم بند کیے جن سے خود کشمیری ادیب بھی واقف نہ تھے۔ ان مستشرقین نے ان کی تصنیفات اور ان کی فہرستیں مرتب کیں، اپنے انداز سے تنقیدیں لکھیں، اس زبان کے مختلف عناصر پر قابلِ قدر مضامین اور کتابیں تحریر کیں۔ تاریخی نکتے حل کیے اور جہاں تک ممکن ہو سکا معلومات کا خزانہ ہم تک بہم پہنچایا۔

ان مستشرقین نے جہاں بائیبل کا ترجمہ کشمیری زبان میں کیا، وہاں کشمیری زبان کی گرامر اور ڈکشنری بھی لکھ کر شائع کی۔ مشنریوں کو کشمیری زبان سکھانے کے لیے کشمیری زبان کے تلفظ پر تحقیقاتی کتابیں لکھنی پڑیں۔ کشمیری زبان کی ضرب الامثال اور محاورے کتابی صورت میں پیش کیے۔ کہاوتیں کتابی صورت میں لکھیں۔ وادیٔ کشمیر میں جو عیسائی مشنری وارد ہوئے، انھوں نے کم سے کم وقت میں کشمیری زبان میں مہارت حاصل کر کے کشمیری اہلِ ادب سے داد تحسین حاصل کی۔

جن مستشرقین نے کشمیری زبان و ادب کے بارے میں تحقیقی سرمایہ ہم تک بہم پہنچایا، ان میں گریرسن، بیلو، جی۔ ٹی ڈین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ بیلو نے تحقیقاتی رپورٹ میں لکھا ہے کہ انھوں نے لاہور کے عجائب گھر میں سنہ ۱۸۷۲ء میں ایک پتھر کا کتبہ دیکھا تھا جو کشمیری زبان میں لکھا ہوا تھا۔ یہ کتبہ رانی دیدہ حکمرانِ کشمیر کے عہدِ حکومت سنہ ۹۸۰–۱۰۰۴ء میں لکھا گیا تھا۔ اس پر اس ملکہ کا فرمان کندہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیری زبان اس زمانے میں مکمل تحریری زبان تھی۔ اسی طرح جی۔ ٹی ڈین نے اپنی محققانہ رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> "— کشمیری زبان میں ۵۰ فی صد سنسکرت۔ ۱۰ فی صد فارسی۔ ۵ فی صد ہندی۔ ۲ فی صد عربی کے الفاظ۔ اس کے بعد ۳۳ فی صد تبتی۔ داردی۔ ڈوگری زبان کے مخلوط الفاظ ملتے ہیں۔ کشمیری زبان میں انگریزی اور عربی کی طرح نہایت وسعت ہے اور ان الفاظ کے تلفظ میں ایسی عجیب عجیب آوازیں نکلتی ہیں جو کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک حرف کو کئی کئی آوازوں سے ادا کیا جاتا ہے، اور ایک لفظ کے کئی ایک معنے نکلتے ہیں۔ اس زبان کے حروفِ تہجی کی تعداد ۶۵ کے قریب دریافت کی گئی ہے —"

گریرسن لکھتا ہے:۔

Kashmiri has one true dialect.—Kashtawari, spoken in the Valley of Kashtawar (commonly known as Kishtwar), lying to the south-east of the Valley of Kashmir. Kashmiri has also overflowed the Pir Pantsal Range into the Jammu Province of the State, and in the valleys between the southern hills of the range, between the water-shed and the valley of the

www.taemeernews.com

Chinab. There are a number of mixed dialects, such as Poguli, Siraji of Dodo, and Rambani. The first two of these represent Kashmiri merging into Western Pahari, while the third rather represents Kashmiri merging into Dogri. Further east, over the greater part of the Riasi District of the State, there are more of these mixed dialects, about which nothing certain is known, except that the mixture is rather between Kashmiri ane the Chibhali form of Lahnda. Grammars are given below of Kashtawari, Poguli, Siraji, and Rambani, but no materials are available for these Riasi dialects.

اسی طرح ایف۔ نیو اور ڈی آر وید کی تصنیفات بھی قابل قدر ہیں جنھوں نے کشمیری گرامر رومن رسم الخط میں لکھ کر کشمیری محققین اور زبان دانوں کے لیے آسانیاں پیدا کردیں۔ لائٹنر نے "دردستان" لکھ کر ایک بڑی ادبی ضرورت پوری کی۔ اس طرح وہ کمی جو گریرسن کی تحقیقات میں رہ گئی تھی، پوری ہوگئی۔ مغربی نقادوں اور ماہرین لسانیات نے کشمیری زبان کو داردی زبان سے منسلک کردیا تھا۔ لائٹنر نے اپنی تحقیقی کتاب "دردستان" میں اس مفروضے کا بطلان کیا اور ثابت کیا کہ کشمیری زبان کا تعلق داردی زبان سے نہیں بلکہ قدیم بروشسکی اس زبان کی اساس ہے۔

ذیل میں ہم مستشرقین کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں، جنھوں نے کشمیری زبان کی ترویج اور اشاعت کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں:۔

	Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
1.	Ansley.	Our Visit to Hindostan, Kashmir and Ladakh (1879)	H. W. Allen-London
2.	Archaeological Department of Kashmir.	Kashmir State Annual Progress Report (1917)	J & K Government Press, Srinagar.
3.	Barbara Eare.	Tekeling in Kashmir with a family on without one (1930)	C.M.G. Press, Lahore.
4.	Basu, J.C.	Kashmir & Its Prince (1889)	Published in Calcutta.
5	Bates, Captain & Bravet, Major Charles, Ellison.	A Gazetteer of Kashmir and the adjacent districts of Kashmir-Bhadarwab, Jammu, Naoshera, Poonch and the Valley of Kishan Ganga (1813)	Supdt. Govt. Printing, Calcutta.
6	Bellow, Suggeon Major, H W.	Kashmir & Kashgar (January 1873, 74)	Trabver & Company, Ludgate Hill, London 1875

www.taemeernews.com

	Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
7	Bemett F.M.M.P.	Kashmir Speaking Frankly, Text of the speach delivered at Caxton Hall on July 10, 1958.	Printed at Process Pakistan, Karachi.
8.	Bernier, Dr. Franqorius	Travels in the Mugual Empire (1656—68)	V A Smith, Oxford, University Press, 1914.
9	Biddulph J. Col.	Tribes of Hindukush (1907)	V. A Smith Oxford, University Press, 1914.
10.	Bingley, Capt A.H.	Dogras (1899)	Simla.
11.	Bird Wood, Hord.	Two Nations & Kashmir.	Robert Hale, London.
12.	Biscoe.	Kashmir in Sunlight & Shade (1922)	Seeley Services & Company Ltd., London.
		Fifty Years Against the Stream (1930)	Wesleyon Mission Press, Mysore.
13.	B. O. Coventry.	Wild Flowers of Kashmir.	Raithley Lawrence and Company, London,
14	Brown, The late Mrs. Percy.	Chinar Leaves, (Poems of Kashmir with an introduction by Lady Linlithgow)	Thaker & Apink & Co. Calcutta.
15.	Brace, Hon, Mrs. C.G.	Kashmir (Peeps at many lands series) (1915)	A & C Black, Ltd., London.
16	Carter G.E.L.	The Stone Age in Kashmir (1924)	A & C Black, Ltd., London.
17.	Dake, Col.	Kashmir and Jammu.	A & C Block, Ltd., London.
18.	Darrah, H. Z.	Sports in the High Lands of Kashmir (1898)	Rowland Ward, London.
19.	De Bourbel	Routes in Jammu & Kashmir (1897)	Published in Calcutta.
20.	Denison Ross, E.	Translation of "Tarikh-i-Rasheedi", by Haider Mirza Duglat, (Written during 1544 to 1547).	London.
21.	Dermot Norris,	Kashmir : the Switzerland of India (1932)	Crown SVO W, Newman and Company, Calcutta.
22.	Denys, F W. Ward	Our summer in the Vale of Kashmir. (1915)	James William Bryan Press, Washington, D C. U. S. A.

www.taemeernews.com

	Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
23.	Digby, William.	Condemned Un-heard-The Government of India and the Maharaja of Kashmir (1890)	Sands, London (1902)
24.	Donghty Marion.	A foot through the Valleys of Kashmir, (1902)	Edward Standford, London
25.	Drew Frederic	The Jammu and Kashmir Territories, (1857)	-do-
26.	Dule, Sir James	The Punjab North West Frontier Province and Kashmir (1916)	—
27.	Duke	Duke's Guide to Kashmir	—
28.	Dutt, Jogdish Chandar	Kings of Kashmir (1887-98) Translation of Ragatrangani	Arthur, London.
29.	Elmslie, Dr.	Kashmir English Dictionary (1876)	—
30.	Eucusllus	Kashmir Raj. (1867).	—
31.	Evelyn Russul, Capt.	Daugh*er of the Dal.	—
32.	Forrens	Travels in Laddakh & Kashmir (1915)	—
33.	E. Ward Denys	Our summer in the vale of Kashmir (1915)	James William Bryan Press, Washington D.C. (USA).
34.	Gidlestone	Memorandum on Cashmeere & some adjacent countries (1874)	—
35.	Gordon J Col	The roof of the World. (1875)	—
36.	Grierson, Sir George.	1. Dictionary of the Kashmiri language.	Royal Asiatic Society Calcutta.
37.		2. Manual of the Kashmiri language, 2 vols. (1911)	—
		3. Grammar of the Kashmiri language.	—
38	Growese, E.S.	Architecture of Kashmir.	The Calcutta Review, Jan. 1872.
39.	Haig, Lt. Col. T.W.	The chronology & genealogy of the Mohammaden Kings of Kashmir.	Journal of the Royal Asiatic Society, 1918.
40.	Hedin, Dr. Sven	Southern Tibet (1916-22)	—

www.taemeernews.com

Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
41. Hervey, Mrs.	Adventures of a lady in Tartary, Tibet, China & Kashmir.	Hope, London 1854.
42. H H Wilson	The Hindu History of Kashmir — (1900)	—
43. Honigherger	Thirty Five years in the East-adventures, discoveries, and historical sea-ches, relating to the Punjab and Kashmir (1852)	—
44. Hugel Baron.	Travels in Krshmir & the Punjab (1845)	John Patherem, London.
45. Hutchison	1. History of Jammy State (Journal of the Panjab Historical Society) Vol. VIII.	—
	2. History of Kashmir State (Journal of the Panjab Historical Society) Vol. IV	—
	3. History of Bhederwah (Journal of the Panjab Historical Society) Vol. IV	—
46. Jahangir, Emperor	Tuzke Jahangiri - Translated by Elexander Rogers & Henry Beveridge Vol. I(1909), Vol. II(1914)	Royal Asiatic Society London.
47. Jammu & Kashmir Government.	Notes for visitors to Kashmir (1942)	Government Press, Jammu
48 J B. Jervis	Travels in Kashmir & Panjab (1895)	—
49. John Ince	The Kashmir hand book; a guide for travellers with map and routes (1876).	Princton University Press. New Jersey.
50. Joseph Kerbel	Danger in Kashmir (1954). (with a forward by C. W. Nimitz).	—
51. Joseph Wolf	Researches & missionary labours.	—
52. Kashmir publication Muzaffarabad, Azad Kashmir.	Inside Indian held Kashmir.	Kashmir publications Muzaffarabad.
53. Knight, E F.	Where three empires Meet	Longmans Green & Co London (1893)

www.taemeernews.com

	Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
54.	Knowles, Rev. T. Hinton.	1. Dictionary of Kashmiri proverbs, sayings (1885)	Trubner London.
		2. Folks tales of Kashmir (1893)	-do-
55	Lamb, Alestair	Crisis in Kashmir (1947-66)	London Routledge & Kegan Paul, Broadway House, Cartar Land, London.
56.	Lambert. C.	A trip to Kashmir & Laddakh.	H S. King London.
57.	Lawrence, Walter R.	The valley of Kashmir (1895)	Oxford University Press.
58.	L. Kipling	Kashmir & Jammu Industries (Brass & Coperware)	—
59.	Luculus	The Kashmir Raj	—
60.	Margarret Cotter Morison.	A lovely summer in Kashmir (1903)	—
61.	Melony	Hisrory of Kashmir	Christian Literature society for India.
62.	Mhaffe A.D.C.	Road to Kashmir (1948)	Ripon Press, Lahore.
63.	Milne, James	The Road to Kashmir	Holdder & Stoughton London.
64	Moore, Thomas	Lala Rookh (1846)	George G. Harrap Co London.
65.	Mrs. Burrows	Kashmir on Famile (1900)	—
66.	Mrs. Charles Cranville	Kashmir	—
67.	Neve, Earnest F.	Things seen in Kashmir	Seeley service & Co, London (1931)
68.	Neve, Major Arthur	1. Beyond the Pirpanjal life among the mountains and valley of Kashmir (1912)	—
		2 Crusader in Kashmir (1928)	—
		3. Manual of Lessons in the Kashmiri language.	—
		4. Picturesque Kashmir (1900)	Sands, London.
		5 Valley of Kashmir (1912)	—

www.taemeernews.com

Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
	6. The tourist guide to Kashmir, Ladakh, Skardo, etc. (1932)	C. M. G. Press, Lahore.
	7. Thirty years in Kashmir (1913)	Edward Arnold, London.
69. Newall, Lt D.J.F.	1. A sketch of the Mohammaden history of Kashmir (1854)	J. S. A. B. No. V
	2. Highlands of India, 2 vols. (1882-87)	do
	3. Some account of the Rishis or Hermits of Kashmir	do
70. Nicholls, W H.	1. Mohammaden Architecture in Kashmir.	—
	2. Archaeological survey - Annual report 1906-7.	Govt. Printing Press Calcutta (1909)
71. O'Conner	Charm of Kashmir (1920)	Longmans Green & Co. London.
72. Orlich, Capt. leopold von.	Kashmir—its Govt. contrasted with that of Multan. 2 vols.	Longman, Brown Green. London, 1845.
73 Pandit Ranjit Sita Ram	Rajatarangani-The Saga of the Kings of Kashmir (1935)	Indian Press Ltd., Allahabad.
74. P. E. Richard	Vagabond in Kashmir	—
75. Pearce Gervis	This is Kashmir (1954)	—
76. Pealsart.	Jehangir's India.	—
77. Peter Schmid	India : Mirage & reality, translated by E. Osers.	—
78. Peter Young	Himalayan holiday a translated Himalayan Diary.	Jenkins, London.
79. Pierie, P.	Kashmir-the land of streams and solitude.	John lave, The bodley Head, London
80. P. N. Koul Bamzai	History of the culture and people of Kashmir.	—
81. Ramchand Kak	1. Ancient monuments of Kashmir (1933)	—
	2. Hand book of the archaeological and Numismatic Sections of the Sri-Partap Singh Museum, Srinagar (1923)	—

www.taemeernews.com

	Name of Author	Name of Book	Name of Publisher
82.	Rothfield	Kishtwar-with pen and rifle. (1918)	—
83.	Stein, M.A.	Rajtrangini's translation in English. 2 Vols. (1900)	Archibald Constable & Co. Ltd., West minister.
84.	Stein Grierson	Hatim's tales-Kashmir stories and songs.	—
85.	Sinclair Gordon	Kheybar carvan through Kashmir, Waziristan, Afghanistan, Bulochistan and Northern India (1938)	—
86	Temple, Sir Richard	The word of lalla the Prophetess.	Cambridge University Press (1924).
87.	Thrope Robert	Kashmir mis-government (1868)	Wyman Bros, Hare street, Calcutta.
88	Vigne, G T.	Travels in Kashmir, Ladakh & Iskardo and the Himalaya	Henry Colburn London (1842)
89.	Wade, T.R.	Grammar of the Kashmiri language as spoken in the valley of Kashmir (1888)	—
90.	Wakefield	Recollections	London
91.	Ward, Col, A.E.	Sportsman, guide to Kashmir and Ladakh	Calcutta central Press and Co. Culcutta
92.	William Moorcraft	Travels in the Panjab, Ladakh & Kashmir 2 Vols (1819)	—
93.	William Digby	Condemned unheard (the Govt. of India and Maharaja of Kashmir)	Published in London.
94.	Wilson Andrew	The abode of snow (1875)	William Blackwood & Sons, Edinburgh.
95.	Wakefield, M.D., Dr. W.	The happy valley (1879)	Sampson, London.
96.	Young Husband, Sir Francis (Former resident of Kashmir)	Kashmir (1909)	A & C Black Ltd. Soho Square, London W. I

اس طویل فہرست کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے سے میرا مقصد یورپین ادبا کے بے لوث، ہمہ گیر عالمانہ جذبے کو سراہنا ہے جنھوں نے رات دن محنت کرکے کشمیری زبان و ادب کی لازوال خدمت کی۔ خصوصًا جارج گریرسن اور پروفیسر لائٹنر ایسی شخصیتیں ہیں جو ہمارے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوسکتیں۔ ان کے علاوہ کشمیری زبان اور محاوروں کے مصنف جیسے ایچ ناولز

www.taemeernews.com

کا بیان بھی لائق ملاحظہ ہے ——

"I have spent two long quiet winters here and Dictionary of Kashmiri Proverbs and Sayings" is the result of many hours of my labour, study, anxiety during these leisurable months. This book I believe contains nearly all the proverbs and proverbial sayings now extent among the Kashmiri people.

ضرورت اس بات کی ہے کہ کشمیری اہلِ قلم بھی ایسے باکمال مستشرقین کو مشعلِ راہ بناکر زبان وادب کی مزید ترقی کے لیے خود کو وقف کردیں ——

احمد ندیم قاسمی
کی ادارت میں شایع ہونے والا مشہور جریدہ
فنون
۴ — میکلوڈ روڈ — لاہور

فریدہ شیخ
کی ادارت میں شایع ہونے والا واحد ایشیائی اخبار
راوی
۱/۲۷ — تھارنٹن روڈ بریڈفورڈ (یوکے)

جمیل زبیری
کا سفرنامہ انگلستان، کینیڈا اور امریکہ
دھوپ کنارہ
عنقریب شایع ہو رہا ہے

ادیب سہیل
کا پہلا نمایندہ شعری مجموعہ
رختِ سفر
دبستانِ جدید کے زیرِ اہتمام شایع ہو رہا ہے

رضی مجتبیٰ
کا پہلا شعری مجموعہ
حرفِ سادہ
شایع ہوگیا

حسن عابد کا پہلا نمایندہ مجموعۂ کلام
سوچ نگر
بہترین گیٹ اپ کے ساتھ شایع ہوگیا
قیمت :- بلا جلد — ۱۲ روپے ○ مجلد ۱۸ روپے
ہر بک اسٹال سے حاصل کیجیے

www.taemeernews.com

مسعود حسین

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

جے۔ ایف۔ بلوم ہارٹ

سلیم الدین قریشی

افسر صدیقی امروہوی

کتب خانے
مخطوطات

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

مسعود حسین

برٹش میوزیم لائبریری

'برٹش میوزیم لائبریری' جس میں پچاس لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں ہیں، دنیا کے چار بڑے کتب خانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ برٹش میوزیم، قدیم نوادر اور قومی کتب خانے کے مجموعہ کا نام ہے۔ آج کل 'لائبریری' چار صیغوں میں منقسم ہے۔ طبع شدہ کتب، قلمی نسخے، مشرقی طبع شدہ کتب اور قلمی نسخے، اور فنونِ لطیف و نقش و نگار۔

عام طور سے طبع شدہ کتب ہی کو 'لائبریری' کہا جاتا ہے۔ گویہ دنیا کے چار سب سے بڑے کتب خانوں میں سے ایک ہے، لیکن مختلف زبانوں کی کتابوں کی کثرت اور کتب بیں اشخاص کے ساتھ وہاں کے ملازمین کے پرخلوص رویہ کی وجہ سے اس کی پرانی شہرت، جس نے کہ اس کو اولیت کا مرتبہ بخشا اور جس کی کہ وہ مستحق تھی، اب تک قایم ہے۔ بقیہ تین بڑے کتب خانے یہ ہیں: پیرس کی 'ببلیو تھیک نیشنیل'۔ واشنگٹن کی 'کانگریس لائبریری'، اور ماسکو کی 'لینن لائبریری'۔

اگر کتابوں کی سب الماریوں کو ایک قطار میں رکھا جائے تو وہ اٹھاسی میل تک پہنچ سکتی ہیں۔ زمانۂ امن میں اُن کا اضافہ ایک میل سالانہ تھا۔ کتابوں کی تعداد پچاس لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن سب بلومبری میں 'برٹش میوزیم' ہی کے اندر نہیں رکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ سنہ ۱۹۰۶ء سے اخبارات لندن کی شمال مغربی سمت کے مضافات میں ہینڈن کے ہوائی مستقر سے متصل ایک علحدہ عمارت میں رکھ دیے گئے ہیں۔

کتابیں حاصل کرنے کا قانونی طریقہ

ان کتابوں کے وسیع ذخیرے کا ایک بڑا حصہ گذشتہ صدی کے دوران میں حق تصنیف و تالیف کے قوانین کے ماتحت حاصل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا قانون سنہ ۱۸۴۲ء میں نافذ کیا گیا تھا اور سب سے آخری، علاوہ ایک یا دو تفصیلی ترمیمات کے سنہ ۱۹۱۱ء میں۔ پارلیمنٹ کے ان قوانین کی رو سے برطانیہ عظمیٰ کی ہر طبع شدہ کتاب کے ناشر کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی ایک جلد 'میوزیم' کو پیش کرے۔ ذاتی طور پر چھپوائی ہوئی کتابیں اس قانون سے مستثنیٰ ہیں اور وہ یا تو تحفہ کے طور پر یا خرید کر حاصل کی جاتی ہیں۔

بسا اوقات اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ غیر ضروری اور بے کار کتابوں کے انبار کو رکھنے سے ملازمین کے وقت اور کمروں کو برباد کرنا ہے۔ لیکن اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کون سی کتابیں غیر ضروری اور بے کار ہیں، ناممکن ہے، اور یہ طے کرنا کہ ایک صدی۔

www.taemeernews.com

کے بعد ان کتابوں کے متعلق کیا خیال ہوگا اور بھی ناممکن ہے۔ انتخاب کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے' کتابوں کا اخراج ضروری ہے اور اس طرح سے بہت سی کتابوں کا وجود ختم ہو جائے گا جو اخلاف کے نزدیک نہایت اہم اور ناگزیر ہوں گی۔ کسی انتخاب کرنے والے نے بلیک رمبا' دبوہم' اور بہت سے دیگر مصنفین کی تصنیفات کو منتخب کرکے حفاظت سے رکھا ہوگا ؟ لیکن جو درحقیقت بے کار ہے وہ بھی مجموعی حیثیت سے اگلے مورخین کے لیے بہت زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ اس سے اس زمانے کے عام خیالات اور مذاق کی رفتار پر روشنی پڑتی ہے "آج کی مٹی کل کا سونا ہے"

بیرونی ممالک کی کتابیں

بیرونی ممالک کی کتابیں اور حق تصنیف و تالیف کے قوانین سے پہلے کی برطانوی کتابیں ہمیشہ خرید کر یا تحفہ کے طور پر حاصل کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں۔ "میوزیم" کا مستقل سرمایہ معمولی ہے اور منتظمین کو اپنے تمام اخراجات کے لیے پارلیمنٹ کی سالانہ امداد پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور اہم مواقع پر خاص امداد کا' جیسے کہ ۱۹۳۳ء میں انجیل مقدس کے دوسب سے قدیم قلمی نسخوں میں سے ایک کوڈکس سینے ٹیکس کی خریداری پر دی گئی تھی۔ لائبریری کی پوری تاریخ کے دوران میں نہ صرف اہمیت کے لحاظ سے ہر درجہ کی لاتعداد مختلف جلدیں ــــــ حقیقی قدر و قیمت سے لے کر وقتی قدر و قیمت تک کی ــــــ حاصل کی گئی ہیں بلکہ نادر ذخیرے بھی ہیں۔ جو معطیان کے ناموں کے ساتھ ایک ہی جگہ رکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر طبع شدہ کتب میں حسب ذیل ذخیرے شامل ہیں : دی کنگس (شاہ جارج سوئم کی کتابوں کا ذخیرہ جو ۱۸۲۳ء میں شاہ جارج چہارم نے عنایت کیا) دی گرین ول (مسٹر ٹامس گرین ول کی کتابوں کا ذخیرہ جو ۱۸۴۷ء میں ان کی وصیت کے مطابق حاصل ہوا) اور دی ہتھ (پچاس غیر معمولی طور پر نادر اور قیمتی جلدیں جو ۱۹۰۱ء میں مسٹر اے۔ ایچ۔ ہتھ نے اپنی مرضی سے "میوزیم" کے لیے چھوڑیں)

"لائبریری کے ذیلی شعبے "نقشہ جات" اور "تحریر نغمہ" کے ہیں۔ دوسرے شعبہ میں شاہ جارج پنجم کا عاریتاً دیا ہوا "شاہی ذخیرہ" رکھا ہوا ہے۔ یہ ہینڈل کی ان قلمی تحریرات نغمہ کی وجہ سے بہت گراں بہا ہے جو اس نے شاہ جارج سوئم اور اس کی ملکہ کے لیے تصنیف کیے تھے۔ فن طباعت کے ابتدائی زمانے کی کتابیں (سنہ ۱۵۰۰ء سے پہلے کی چھپی ہوئی) جن کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے (یعنی میونخ کی "اسٹیٹ لائبریری" سے کچھ ہی کم اگرچہ درحقیقت وہ نقصان سے بچ گئی ہے) رابرٹ پراکٹر کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق لائبریری' ہیں ان شہروں اور مطبعوں کے ناموں کے ساتھ جہاں پر وہ شایع ہوئی ہیں ایک ہی جگہ رکھی ہوئی ہیں۔

"لائبریری" کے ابتدائی زمانے میں طبع شدہ حصہ قلمی نسخوں کے مقابلے میں بہت کم حیثیت کا خیال کیا جاتا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں بادشاہ کا کتب خانہ ملنے سے "لائبریری" کی کتابوں کی تعداد میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہوگیا اور اس کی حقیقی قدر و قیمت اس سے بھی کہیں زیادہ ہوگئی' کیونکہ شاہ جارج سوئم نے اپنے کتب خانہ کو قاعدے میں ترتیب دیا تھا اور اس کا مہتمم کتب خانہ ڈاکٹر جانسن سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں "میوزیم" کا ذخیرہ نہایت بے ترتیبی کے ساتھ جمع کیا گیا تھا۔ چند سال بعد ایک اطالوی سیاسی پناہ گزین کے عملے میں شامل ہونے سے "میوزیم" کو اس سے بھی بڑا ایک اور ذخیرہ حاصل ہوا۔

انیٹینیو پینیزی

یہ اطالوی انیٹینیو پینیزی تھا۔ یہ دور وہ تھا جب "انسانیت نے اپنے خیمے گاڑ دیے تھے اور ترقی کی جانب گامزن تھی۔

www.taemeernews.com

پنیزی کی دوررس نگاہوں نے مستقبل کی دنیا کو دیکھ لیا تھا اور وہ اس پرانے خیالات کے اڈّے میں بھی ایک عظیم انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ جمود پیدا کرنے والی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوا اور جب وہ مہتمم اعلیٰ کے عہدے سے سبکدوش ہوا تو میوزیم، کو دنیا کے کتب خانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بنا دیا تھا۔ اس نے ۱۸۳۶ء میں پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے اپنا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ایک غریب طالب علم کو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے وہی ذرائع حاصل ہوں، اسی طرح اپنے ادبی مشاغل جاری رکھ سکے اسی طرح مستند اسناد سے مدد لے سکے اور دقیق نکات کو حل کر سکے۔ جس طرح کہ ملک کا سب سے دولت مند آدمی کر سکتا ہے۔"

اس مقصد کی تکمیل کے لیے پنیزی نے 'میوزیم' کی ضرورتوں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد کتابوں کی خریداری کے لیے حکومت سے معقول امداد حاصل کی، لیکن اگر اس 'لائبریری' سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا تھا تو ضرورت اس امر کی تھی کہ کتابوں کو مناسب جگہ پر رکھا جائے، معقول ترتیب دی جائے، اور ان کی فہرست تیار کی جائے۔ ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ عمارت کو کشادہ کیا جائے تاکہ ایک ہی وقت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ مطالعہ کر سکیں۔

پنیزی پہلا شخص تھا جس نے کہ ان صریح حقائق کو دیکھا۔ اس نے کتب خانے کی عمارت کا ایک نئی قسم کا نقشہ بنایا۔ ایک بڑا گنبد دار مطالعہ کا کمرہ جس کے اندر سب طرف لاکھوں کتابیں رکھنے کے لیے الماریاں لگی ہوں۔ یہ 'میوزیم' زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالنے کے فن عمارت کے ان اصولوں پر بنایا گیا تھا جو اس زمانے میں ۱۸۵۱ء کی عظیم الشان نمائش کے لیے بنائے ہوئے 'کرسٹل پیلس' کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہو رہے تھے۔

دارالمطالعہ، جس میں کہ ایک ہی وقت میں تقریباً ۴۵۰ آدمی بیٹھ سکتے ہیں، ۱۸۵۷ء میں کھولا گیا۔ یہ اب تک استعمال میں ہے اور جتنا کہ مشہور ہے اتنا ہی مفید بھی ہے۔ 'فولادی لائبریری' (جیسا کہ عام طور سے کتابوں کی الماریوں کو کہا جاتا ہے) کو بدل کر ایک نئی طرز کی اور زمانۂ حال کے مطابق عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ پنیزی نے یہ بھی محسوس کیا کہ کتابوں کے اس عظیم الشان ڈھیر کی سائنٹفک اصولوں پر ایک مناسب فہرست تیار کی جائے اور اس قسم کی پہلی فہرست اسی کی کوششوں کی رہینِ منت ہے۔

عالموں کا اجتماع

یہ دارالمطالعہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء کی جنگ میں دشمن کے ہوائی حملے سے صدمہ پہنچنے کی وجہ سے مرمت کرنے کے بعد ۳ر جون ۱۹۴۶ء کو دوبارہ کھولا گیا ہے۔ دنیا کے بین الاقوامی مقامات اجتماع میں سے ہے جہاں ہر ملک کے عالم و فاضل نظر آتے ہیں۔ داخلے کے اجازت نامے (جس کی ہر چھ مہینے بعد تجدید کرانی پڑتی ہے) کے لیے اس کے علاوہ کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے کہ عمر اکیس سال کی ہو۔ ایک قابلِ یقین وجہ کا اظہار کہ اس کو صرف اسی کتب خانے کی ضرورت ہے نہ کہ دیگر کتب خانوں کی جن میں کہ اب آسانی سے داخلہ مل سکتا ہے، اور کسی معزز اور ذمہ دار شخص کا ایک خط جس میں درخواست کنندگان کے اچھے چال چلن کی تصدیق کی گئی ہو۔ ان شرائط سے صرف کتابوں کی حفاظت مدنظر ہے۔ دارالمطالعہ کو اس شہرت کی سزا یہ ملی ہے کہ بہت سے اشخاص بغیر کسی ضرورت اور اہلیت کے اس کو استعمال کرنے کے لیے درخواست کرتے ہیں۔ ناظم کتب خانہ ایسے لوگوں کو بہت مسرت کے ساتھ مناسب مشورہ دیتا ہے۔

www.taemeernews.com

اگر نقش و نگار اور فنون لطیفہ کے شعبوں میں ان کی پرانے زمانے کی انگریزی آب رنگ تصاویر، سادی تصاویر، اور نیم رنگ تصاویر کے عدیم المثال ذخیرہ اور فرانس، ہالینڈ، جرمنی، اطالیہ اور دیگر بیرونی دبستانوں کے نشان دار ذخائر کی خوبیوں اور دلچسپیوں کا مناسب تذکرہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ یہی حال مشرقی کتب خانے کا ہے جس میں عہد عتیق کے عبرانی اور شامی نوشتے، اور اس سے بھی زیادہ پرانی چینی اور وسطی ایشیائی تحریرات جو ٹن ہانگ میں سر آریل اسٹین کو ملے تھے، اور خوبصورت ایرانی اور عربی نقش و نگار موجود ہیں۔

میوزیم کا مایۂ فخر

مغربی قلمی نسخوں کا ذخیرہ مع یونانی نمونہ ہائے سنگ تراشی، میوزیم کا مایۂ فخر تصور کیا جاتا ہے۔ یونانی نمونہ ہائے سنگ تراشی کو چھوڑتے ہوئے "لائبریری" اور "میوزیم" کی تخلیق کا اصلی سبب یہی مغربی نسخوں کا ذخیرہ ہے۔

انگلستان میں ۱۵۲۵ء سے ۱۵۵۰ء کے زمانے کی تحریک تجدید مسیحیت کے دوران میں ضبط شدہ خانقاہوں کے کتب خانوں کو ختم کر دیا گیا تھا اور ان کی زیادہ تعداد بالکل برباد کر دی گئی تھی۔ صرف گنتی کے اشخاص نے جو کچھ کہ بچ رہا تھا اس کی قدر و قیمت بحیثیت قوم اور مذہب کی یادگار کے محسوس کی اور جو کچھ ان کو مل سکا جمع کر لیا۔ ان میں سے ایک شخص سر رابرٹ کاٹن کا جمع کیا ہوا ذخیرہ ۱۷۰۰ء میں حکومت کو مل گیا۔ اس کو ۱۷۳۱ء میں آگ سے سخت نقصان پہنچا اور یہ ظاہر ہے کہ یہی قومی کتب خانے کی بنا ثابت ہوا۔

۱۷۵۳ء میں ایک بہت زیادہ کتابیں جمع کرنے والے سر ہنس سلون نے جس کو خصوصاً پچھلی دو صدی کے اکتشافات سائنس میں بہت دلچسپی تھی اپنے ذخائر کو، جس میں ایک عام بڑا کتب خانہ بھی شامل تھا۔ بہت کم قیمت پر حکومت کو پیش کر دیا۔ تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا اور ایک سرمایہ فراہم کر کے ماٹیگ ہاؤس تعمیر کیا گیا۔

پارلیمنٹ کے فاؤنڈیشن ایکٹ کے ماتحت ابتدائی سرمائے میں سے کاٹن اور سلون کے کتب خانوں میں ایک بڑے کتب خانہ کا جو کاٹن کے اصولوں پر آکسفورڈ کے پہلے لارڈ رابرٹ ہارلے نے جمع کیا تھا، اضافہ کیا گیا۔ ان میں شاہ جارج دوئم نے (جو گوٹنجن یونیورسٹی اور اس کے مشہور کتب خانے کا بھی بانی تھا) اپنے کتب خانہ کے عطیہ سے، جو قرون وسطیٰ تک کے انگلستان کے فرماں رواؤں کے قلمی نسخوں کے لیے خاص طور پر مشہور تھا، اور اضافہ کیا ——

محمد خالد اختر

کی مشہور کتابیں

- بیس سو گیارہ (۱۹۵۲ء) ناول
- چاکیواڑہ میں وصال (۱۹۶۵ء) ناول
- کھویا ہوا اُفق (۱۹۶۶ء) مضامین اور افسانے

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو

مانچسٹر کے بعض مخطوطات

جون ریلینڈ لائبریری مانچسٹر میں عربی و فارسی کی قلمی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے اور ان کی تفصیلی فہرستیں شایع بھی ہو چکی ہیں۔ وہاں مجھے اس بات کی اطلاع ملی کہ اردو کی بھی کچھ قلمی کتابیں یہاں موجود ہیں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں۔ میں نے پہلی فرصت میں ان کتابوں کو جو تعداد میں ۸۴ ہیں منگوا کر دیکھا اس میں دو مجموعے خاص طور پر پسند آئے جن میں اردو فارسی کے کچھ رقعات ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ذخیرے کی کچھ کتابوں کا بہت مختصر طور پر ذکر کر دوں۔ فارسی کے مخطوطات میں حسب ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ کلیات مرزا زین الدین خان عشق دہلوی[1] رنمبر۔ فارسی ۲۱۹) یہ بڑی تقطیع پر ۱۳۱۹ اوراق کا بہت ضخیم کلیات ہے۔ یہ نسخہ خود مصنف نے وارن ہیسٹنگ گورنر جنرل کو پیش کیا تھا جیسا کہ سر ولیم جونس کی تحریر سے جو اس نسخے پر ثبت ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً ہر غزل کی ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس موقع پر کب اور کس مشاعرے کے لیے یہ غزل لکھی گئی۔

ایک غزل ہے "صبح گاہِ طلب"، ورق ۱۹۲ الف اس کے متعلق لکھا ہے:

"در مشاعرۂ نواب علی ابراہیم خان، خلیل ۱۱۹۵ھ"۔

ایک غزل ہے جس کی ردیف "ہمہ شب" ہے اس کے متعلق یہ صراحت موجود ہے "غزل ہمہ شب" در عظیم آباد بہ حسب فرمایش شاہ رکن الدین سلمہ در ۱۱۹۱ھ" ورق ۱۹۲ ب۔

علی ابراہیم خاں، تذکرۂ گلزار ابراہیم کے مؤلف ہیں۔ اور شاہ رکن الدین سے ان کی مراد حضرت عشق عظیم آبادی ہیں۔ اسی طرح عظیم آباد، دہلی اور دوسرے مقامات کے بہت سے مشاعروں کے متعلق اطلاعیں ملتی ہیں اور اس کلیات پر کبھی کام کیا گیا تو بہت سے نئی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

۲۔ دیوان مبتلا د عشق زمانۂ کتابت تقریباً ۱۷۷۰ء (فارسی: ۲۱۹)

۳۔ دیوان سراج الدین حسین زمانۂ کتابت تقریباً ۱۸۰۰ء (فارسی: ۴۰۰)

۴۔ راحت الافراس مصنفہ آنند رام مخلص دہلوی متوفی ۱۱۶۴ھ (فارسی: ۴۳۱)

---

[1] ان کا مختصر حال اور کچھ اردو اشعار تذکرۂ مسرت افزا میں ملیں گے ص ۱۴۳ و ص ۱۴۴ مرتبہ جناب قاضی عبدالودود صاحب

www.taemeernews.com

٥ - تذکرۂ ہمیشہ بہار مرتبۂ اخلاص تقریباً سنہ ۱۸۳۰ء (فارسی : ۳۲۳)

٦ - تذکرۂ لامعلوم تقریباً سنہ ۱۷۵۰ء (فارسی : ۳۳۸)

۷ - دیوانِ حشمت تقریباً سنہ ۱۷۵۰ء (فارسی : ۶۲۱)

اوراق ۳۴ ۔ ناقص الآخر ۔ یہ نسخہ ہملٹن کے کتب خانے کا ہے وہاں اس کا نام نمبر ۵۳۸ تھا۔

۸ - عطار الکرم فی شرح طور الکلم از انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی (فارسی : ۶۱۶)

یہ انشا کی نادر تصنیف ہے اور شایع کرنے کے لایق، راقم کا ارادہ اس پر ایک مختصر سا مضمون لکھنے کا ہے۔

۹ - نکات غالب، مصنفۂ مرزا غالب دہلوی صفحات ۱۹ سطور ۱۷ (فارسی : ۶۱۴)

سرورق : " رسالہ لغات فارسی تالیف اسد اللہ خان غالب معروف بہ مرزا نوشہ مسمّٰی بہ " نکاتِ غالب " اس پر اغلاط کی تصحیح کسی اور قلم سے موجود ہے۔ اور مجھے شبہ ہے کہ خود مرزا کے قلم کے تصحیحات ہیں۔ یہ نسخہ ہملٹن کے کتب خانہ کا ہے۔ تعجب نہیں کہ خود مرزا نے تصحیح کر کے یہ نسخہ ہملٹن کو بھیجا ہو۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ جو ۱۸۶۷ء میں چھپا تھا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے تفصیل کے لیے دیکھیے ذکر غالب ص ۱۴۷ طبع سوم۔

۱۰ - قصیدہ در مدح ملکۂ انگلستان و ہندوستان مصنفۂ مرزا غالب (فارسی : ۶۱۳) سرورق پر یہ عبارت درج ہے۔ قصیدۂ برگزیدہ در مدح .. ملکۂ معظمۂ انگلستان خلد اللہ ملکہ (کذا) بالعدل والاحسان' یہ قصیدہ وہی ہے شمار یافت، روزگار یافت جو دستنبو طبع اول کی ابتدا میں چھ صفحوں میں درج ہے۔

اس قصیدے کے بعد دستنبو شروع ہوجاتی ہے۔ اس نسخے میں بھی ترمیمیں اور اصلاحیں ہیں اور غالباً بہ خط غالب' یہ نسخہ بھی کرنل ہملٹن کے کتب خانے کا ہے اور تعجب نہیں جو مرزا نے خود اسے بھیجا ہو۔

اب فارسی مخطوطات کے بعد اردو کی قلمی کتابوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱ - دیوان ولی (ہندوستانی : ۲۷) سلیمان جاہ اور ہملٹن کے کتب خانوں میں یہ نسخہ رہ چکا ہے۔ اوراق ۸۷، مکتوبہ میر نیاز علی بست و ہشتم محرم الحرام سنہ ۱۲۲۳ھ بروز یکشنبہ سلیمان جاہ کی سرخ مستطیل مہر ہے۔ جس میں ۱۲۴۴ کے اعداد منقوش ہیں۔ ان کے کتب خانے میں یہ کتاب غالباً ماہ رمضان سنہ ۱۲۳۷ھ کو پہنچی۔ محمد علی شاہ کی مہر بھی موجود ہے اور جائزہ نہم ربیع الاول سنہ ۱۲۶۳ھ کا۔

۲ - کلیات جرأت (ہندوستانی : ۲۵) مکتوبہ بست و ہفتم ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ ابتدائی اور آخری اوراق سادہ اوراق پر کسی نے " غزل ولی عہد بہادر " کے عنوان سے ظفر کی متعدد غزلیں نقل کی ہیں۔ یہ نسخہ بھی کرنل ہملٹن کے کتاب خانے کا ہے۔

۳ - کلیات سودا مکتوبہ سنہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی : ۱۷)

۴ - کلیات سودا (ہندوستانی : ۴۳)

۵ - دیوان ناسخ مکتوبہ سنہ ۱۸۴۳ء (ہندوستانی : ۲۶)

٦ - مثنوی بحر الحقیقت از مولوی محمد حسن نوشتہ غلام محمد خان سنہ ۱۲۵۶ھ (ہندوستانی : ۲۹)

www.taemeernews.com

۷ ۔ ہزلیات جعفر زٹلی مکتوبہ سنہ ۱۷۷۰ء (ہندوستانی : ۳۲)
۸ ۔ قصۂ چندر بدن (منظوم) از مقیمی مکتوبہ سنہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی : ۲۴)
۹ ۔ رقعات و مکتوبات وغیرہ از میر جعفر زٹلی مکتوبہ سنہ ۱۷۶۰ء (ہندوستانی : ۱۸)
۱۰ ۔ ترجمۂ بھگوت پران مکتوبہ سنہ ۱۷۷۰ء (ہندوستانی : ۱۰)
۱۱ ۔ تواریخ آگرہ مصور مکتوبہ سنہ ۱۸۳۵ء (ہندوستانی : ۳۰)
۱۲ ۔ اصول النغمات فن موسیقی مکتوبہ سنہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی ۲۰)
۱۳ ۔ قصۂ کامروپ منظوم از تحسین مکتوبہ سنہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی : ۳۳)
۱۴ ۔ سندر سنگار منظوم مصنفہ شاہ علی گجراتی ؟ مکتوبہ سنہ ۱۷۱۹ء (ہندوستانی : ۳۶)
۱۵ ۔ عمارات دہلی مکتوبہ سنہ ۱۸۵۴ء (ہندوستانی : ۳۷)
۱۶ ۔ حالات کمال صاحب ترمذی شاہ اور سلطان محمد تغلق (ہندوستانی : ۳۹)
۱۷ ۔ فرس نامہ سعادت یار خان رنگین مکتوبہ سنہ ۱۸۳۲ء (ہندوستانی : ۴۰)
۱۸ ۔ صنم کدۂ چین سید حسین شاہ حقیقت، مکتوبہ سنہ ۱۸۶۱ء (ہندوستانی : ۴۱)
۱۹ ۔ راگ مالا مصور مکتوبہ ماہ ۱۸۰ (ہندوستانی : ۴۲)
۲۰ ۔ بارہ ماسا کاظم علی جواں مکتوبہ سنہ ۱۸۰۲ء (ہندوستانی : ۴۴)

اردو کے منفرد اور معتبر جدید شاعر اور اہم نقاد

پروفیسر انجم اعظمی کی کتابیں

(۱) لب و رخسار (محبت کی نظمیں) سنہ ۱۹۵۱ء ---------- قیمت: ۱۵ روپے
(۲) لہو کے چراغ (شعری مجموعہ) سنہ ۱۹۶۱ء ---------- قیمت: ۲۰ روپے
(۳) چہرہ (آدم جی انعام یافتہ شعری مجموعہ) سنہ ۱۹۷۵ء ---------- قیمت: ۱۵ روپے
(۴) ادب اور حقیقت (تنقید) سنہ ۱۹۷۹ء ---------- قیمت: ۲۵ روپے
(۵) اعلیٰ تعلیم (فلسفۂ تعلیم) سنہ ۱۹۸۰ء ---------- قیمت: ۷ ½ روپے
(۶) زیر آسماں (شعری مجموعہ) سنہ ۱۹۸۰ء ---------- قیمت: ۲۰ روپے

ہم سے طلب کیجیے

اشاعت گھر ۱۶/۱۱۰۸ — فیڈرل بی ایریا — کراچی ۳۸

www.taemeernews.com

مرتبہ :———— جے۔ ایف۔ بلوم ہارٹ

تلخیص و ترجمہ :———— سلیم الدین قریشی

نظرِ ثانی :———— افسر صدیقی امروہوی

فہرست مخطوطات اردو

انڈیا آفس لائبریری۔ لندن

کئی سال ہوئے فرانس میں موجود اردو مخطوطات کی ایک فہرست شایع ہو چکی ہے۔ ضرورت تھی کہ یورپ کے مختلف ممالک میں ہماری ثقافت و زبان کے جو جواہر پارے ہیں ان کو بھی اردو میں منتقل کرکے اہلِ وطن کو استفادے کا موقع دیا جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ جناب سلیم الدین قریشی صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور انڈیا آفس کی فہرست اردو مخطوطات کا اردو ترجمہ کرکے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کیٹلاگ مطبوعہ موجود ہیں۔ لیکن وہ سہل الحصول نہیں ہیں۔ اُمید ہے کہ اس ترجمے سے وہ اردو داں حضرات جو تحقیق و تنقید کے سلسلے میں ان مخطوطات کی تفصیلات حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے اب قرار واقعی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ قریشی صاحب نے اپنی دانست میں ہر مخطوطے کے بارے میں ضروری معلومات مہیا کر دی ہیں اور وہ اس محنت و جاں کاہی کے لیے شکریے کے مستحق ہیں۔ یہاں ایک کمی کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ مصنف و کاتب وغیرہ کی تشریح کے ساتھ ساتھ آغاز و اختتام کی ایک دو سطروں اور ترجمے کی عبارت کو بھی مخطوطے کے تعارف کے سلسلے میں خاص اہمیت حاصل ہے، جس سے دوسرے نسخوں کے ساتھ تقابل کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے اور یہ ایک ہی نام کے دو مختلف مصنفوں کے مخطوطوں میں امتیاز کرنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب اس کمی کو پورا کرنا بظاہر دشوار معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اُن فہرستوں کی تیاری میں جو اس کے بعد مرتب کی جائیں، ان دونوں باتوں کا التزام ضروری ہے ————

افسر صدیقی

(انجمن ترقی اردو۔ کراچی)

۶ راگست ۱۹۷۷ء

www.taemeernews.com

محترمی صہبا صاحب ــــ السلام علیکم!

بلوم ہارٹ کی فہرست کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ اس کو مکمل کرنے میں تین چار ہفتوں کی تاخیر ہوگئی ہے۔ امید ہے معاف فرمائیں گے اور اسے اپنے خاص شمارے میں جگہ دے سکیں گے ــــ

اس فہرست میں صرف وہ مخطوطات شامل کیے گئے ہیں جو بلوم ہارٹ نے اپنی فہرست میں شامل کیے تھے۔ مضامین کی ترتیب میں کچھ تبدیلی کردی گئی ہے۔ مثنویات کو علٰحدہ کردیا گیا ہے۔ تاریخ و جغرافیے کو یک جا اور وہ تمام نظمیں جن کا تعلق کسی خاص مضمون سے ہے وہ اس مضمون کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ایک ہی مصنف کے مختلف مخطوطات اور ہر ایک مخطوطے کے مختلف نسخوں کو یک جا کردیا گیا ہے ــــ

اس کے علاوہ جدید تحقیق کی روشنی میں اگر کسی مخطوط کے نام، مصنف، تاریخ تصنیف وغیرہ کے متعلق اگر کوئی مزید معلومات دستیاب ہوسکی ہیں، انھیں قوسین میں درج کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔ فہرست کے شروع میں بلوم ہارٹ کی فہرست کا سلسلہ نمبر دیا ہے اور موجودہ فہرست میں دیے گئے نمبروں کو جدول میں درج کیا گیا ہے تاکہ بلوم ہارٹ کی فہرست میں دیے گئے کسی مخطوطے کی موجودہ فہرست میں آسانی سے نشان دہی کی جاسکے۔ کتب خانے میں کسی ایک اردو مخطوطے کو منگانے کے لیے بلوم ہارٹ کی فہرست کا سلسلہ نمبر درج کرنا لازمی ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانے نے یہ مخطوطات کئی ایک ذرایع سے حاصل کیے تھے۔ ان میں سے میں نے صرف دہلی، گائیک واڑ، ٹیپو سلطان اور فورٹ ولیم کالج کے کتب خانوں سے حاصل شدہ مخطوطات کا حوالہ دیا ہے۔

وقت کی کمی کے باعث اس فہرست میں کئی ایک خامیاں اور غلطیاں رہ گئی ہوں گی۔ اگر کوئی نظر آئے تو براہِ کرم اس کی تصحیح کردیجیے۔ جن کتابوں سے اس فہرست کو مکمل کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں ــــ

۱ــ یورپ میں دکھنی مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی۔ حیدرآباد۔ ۱۹۳۲ء

۲ــ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔ لاہور۔ ۱۹۲۶ء

۳ــ مخطوطات انجمن ترقی اردو از افسر صدیقی امروہوی و سید سرفراز علی رضوی کراچی۔ ۱۹۶۵ء

۴ــ دہلی کے اردو مخطوطات۔ از صلاح الدین۔ دہلی، ۱۹۷۵ء

۵ــ سندھ میں اردو مخطوطات از سید احمد علی زیدی۔ لاہور، ۱۹۶۹ء

۶ــ پنجاب میں اردو از محمود خان شیرانی۔ لاہور۔ ۱۹۳۹ء

۷ــ تذکرہ مخطوطات از سید محی الدین قادری زور۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۵۱ء

سلیم الدین قریشی
(۸۶۔ کلیرنڈن روڈ۔ لندن)

۱۶؍اپریل ۱۹۷۷ء

www.taemeernews.com

وضاحتی فہرست

مع اشاریہ

سلسلہ نمبر	موضوعات	فہرست نمبر
۱	تراجم وتفاسیر القرآن	۱ — ۱۱
۲	اسلامیات	۱۲ — ۶۲
۳	ہندو مذہب	۶۳
۴	عیسائیت	۶۴ — ۶۵
۵	تاریخ	۶۶ — ۸۲
۶	جغرافیہ	۸۳ — ۸۶
۷	سوانح	۸۷ — ۸۹
۸	تذکرے	۹۰ — ۱۰۰
۹	حکایات	۱۰۱ — ۱۲۴
۱۰	مثنویات	۱۲۵ — ۱۶۱
۱۱	شاعری	۱۶۲ — ۲۸۹
۱۲	اخلاقیات	۲۹۰ — ۲۹۱
۱۳	طب	۲۹۲ — ۲۹۵
۱۴	موسیقی	۲۹۶ — ۳۰۶
۱۵	زراعت	۳۰۷
۱۶	قواعد افواج	۳۰۸
۱۷	مجموعۂ الفاظ	۳۰۹ — ۳۲۲
۱۸	لغات	۳۲۳ — ۳۲۴
۱۹	صرف ونحو	۳۲۵ — ۳۲۶
۲۰	متفرقات	۳۲۸ — ۳۳۴
۲۱	ضمیمہ اردو مخطوطات	— ۳۳۴

www.taemeernews.com

فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر
۹۵	۶۰	۳۱	۳۱	۱۳	۱
۹۶	۶۱	۳۲	۳۲	۱۲	۲
۹۷	۶۲	۶۴	۳۳	۱۴	۳
۹۸	۶۳	۶۵	۳۴	۱۵	۴
۹۹	۶۴	۳۳	۳۵	۱	۵
۱۰۰	۶۵	۶۶	۳۶	۵	۶
۲۰۵، ۲۸۹	۶۶	۶۷	۳۷	۶	۷
۸۳	۶۷	۶۸	۳۸	۷	۸
۸۴	۶۸	۶۹	۳۹	۲	۹
۸۵	۶۹	۷۰	۴۰	۳	۱۰
۸۶	۷۰	۷۱	۴۱	۴	۱۱
۳۴	۷۱	۷۲	۴۲	۸	۱۲
۱۲۴	۷۲	۷۳	۴۳	۹	۱۳
۳۵	۷۳/۱	۷۴	۴۴	۱۰	۱۴
۱۲۵	۷۳/۲	۷۵	۴۵	۱۱	۱۵
۱۲۶	۷۳/۳	۷۶	۴۶	۱۶	۱۶
۳۶	۷۳/۴	۷۷	۴۷	۱۷	۱۷
۳۷	۷۳/۵	۷۸	۴۸	۱۸	۱۸
۱۲۷	۷۳/۶	۷۹	۴۹	۱۹	۱۹
۳۸	۷۳/۷	۸۰	۵۰	۲۰	۲۰
۱۲۸	۷۳/۸	۸۱	۵۱	۲۱	۲۱
۳۹	۷۳/۹	۸۷	۵۲	۲۲	۲۲
۱۲۹	۷۴	۸۱	۵۳	۲۴	۲۳
۱۰۱	۷۵/۱	۸۹	۵۴	۲۵	۲۴
۱۰۲	۷۵/۲	۹۰	۵۵	۲۶	۲۵
۱۰۳	۷۶/۱	۹۱	۵۶	۲۷	۲۶
۱۰۴	۷۶/۲	۹۲	۵۷	۲۸	۲۷

www.taemeernews.com

فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر
۱۰۵	۷۶/۳	۹۳	۵۸	۲۹	۲۸
۱۰۴	۷۶/۴	۹۴	۵۹	۳۰	۲۹
۱۴۱	۱۲۳	۱۳۴	۹۴	۶۳	۳۰
۱۴۲	۱۲۴	۱۲۰	۹۵	۱۳۰	۷۷
۱۴۳	۱۲۵	۱۲۱	۹۶	۱۳۲	۷۹
۱۴۶	۱۲۶	۱۲۲	۹۷	۴۱	۸۰
۱۴۷	۱۲۷	۱۲۳	۹۸	۱۰۷	۸۱
۵۰	۱۲۸	۱۳۵	۹۹	۱۰۸	۸۲
۱۴۸	۱۲۹	۱۳۶	۱۰۰	۱۰۹	۸۳
۱۴۹	۱۳۰	۳۰۶	۱۰۱	۱۱۰	۸۴/۱
۱۵۰	۱۳۱	۱۶۲	۱۰۲	۱۱۱	۸۴/۲
۱۵۱	۱۳۲/۱	۱۳۷	۱۰۳	۱۱۲	۸۵
۱۵۲	۱۳۲/۲	۱۳۹	۱۰۴	۱۱۳	۸۶
۱۷۴	۱۳۳	۱۴۰	۱۰۵	۱۱۴	۸۷
۱۷۵	۱۳۴	۱۴۱	۱۰۶	۱۱۵	۸۸
۱۷۶	۱۳۵	۱۴۲	۱۰۷	۱۱۶	۸۹
۱۷۷	۱۳۶	۴۵	۱۰۸	۱۱۷	۹۰
۱۷۹	۱۳۷	۴۶	۱۰۹	۱۱۸	۹۱
۱۸۰	۱۳۸	۱۴۳	۱۱۰	۱۳۳	۹۲
۱۸۱	۱۳۹	۱۴۴	۱۱۱	۱۱۹	۹۳/۱
۱۵۳	۱۴۰	۴۷	۱۱۲	۴۲	۹۳/۲
۱۵۵	۱۴۱	۱۶۳	۱۱۳	۴۳	۹۳/۳
۱۵۶	۱۴۲	۱۶۴	۱۱۴	۴۴	۹۳/۴
۱۸۲	۱۴۳	۱۶۵	۱۱۵	۲۶۶-۶۷	۹۳/۵
۱۸۳	۱۴۴	۱۶۶	۱۱۶	۲۰۳	۹۳/۶
۸۲	۱۴۵	۱۶۷	۱۱۷	۲۸۸	۹۳/۷
۱۸۴	۱۴۶	۱۶۸	۱۱۸	۲۸۸	۹۳/۸
۱۸۵	۱۴۷	۱۶۹	۱۱۹	۲۱۳	۹۳/۹

فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر
۱۸۶	۱۳۸	۱۷۰	۱۲۰	۲۶۸	۹۳/۱۰
۱۸۷	۱۳۹	۴۹	۱۲۱	۱۸۹	۱۵۱
۱۸۸	۱۵۰	۱۳۸	۱۲۲/۱	۱۹۰	۱۵۲
۲۴۶	۲۰۱	۱۴۵	۱۲۲/۲	۱۹۱	۱۵۳
۲۴۷	۲۰۲/۱	۴۸	۱۲۲/۳	۱۹۲	۱۵۴
۲۴۸	۲۰۲/۲	۲۱۸	۱۷۶	۱۹۳	۱۵۵
۲۴۹	۲۰۲/۳	۲۱۹	۱۷۷	۱۹۴	۱۵۶
۲۵۰	۲۰۲/۴	۲۲۰	۱۷۸	۱۹۵	۱۵۷
۲۵۱	۲۰۲/۵	۲۲۱	۱۷۹	۵۱	۱۵۸
۲۵۲	۲۰۲/۶	۲۲۲	۱۸۰	۱۹۶	۱۵۹
۲۵۳	۲۰۲/۷	۲۲۳	۱۸۱	۱۹۷	۱۶۰
۲۵۴	۲۰۳	۲۲۴	۱۸۲	۱۹۸	۱۶۱
۲۵۵	۲۰۴	۲۲۰	۱۸۳	۱۹۹	۱۶۲
۲۵۶	۲۰۵	۲۲۶	۱۸۴	۲۰۰	۱۶۳
۲۵۷	۲۰۶	۲۲۷	۱۸۵	۲۰۱	۱۶۴
۲۵۸	۲۰۷	۲۲۸	۱۸۶	۵۳	۱۶۵
۲۵۹	۲۰۸	۲۲۹	۱۸۷	۱۵۸	۱۶۶/۱
۲۶۰	۲۰۹	۲۳۰	۱۸۸	۲۰۲	۱۶۶/۲
۲۶۱	۲۱۰/۱	۲۳۱	۱۸۹	۲۱۰	۱۶۷
۲۶۲	۲۱۰/۲	۲۳۲	۱۹۰	۲۳	۱۶۸
۲۶۳	۲۱۰/۳	۲۳۳	۱۹۱	۲۱۱	۱۶۹
۲۶۴	۲۱۰/۴	۲۳۴	۱۹۲	۲۱۲	۱۷۰
۲۶۵	۲۱۱	۲۳۵	۱۹۳	۱۵۹	۱۷۱
۲۶۹	۲۱۲	۲۳۶	۱۹۴	۲۱۴	۱۷۲
۲۷۰	۲۱۳	۲۳۷	۱۹۵	۲۱۵	۱۷۳
۲۷۱	۲۱۴	۲۳۸	۱۹۶	۲۱۶	۱۷۴
۲۷۲	۲۱۵	۲۴۲	۱۹۶/۱	۲۱۷	۱۷۵
۲۷۳	۲۱۶	۲۳۹	۱۹۶/۲	۲۷۸	۲۲۱

www.taemeernews.com

فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر	فہرست نمبر	بلوم ہارٹ نمبر
۲۷۴	۲۱۷	۲۴۰	۱۹۷/۳	۵۴	۲۲۲/۱
۲۷۵	۲۱۸	۲۴۱	۱۹۷/۴	۵۵	۲۲۲/۲
۲۷۶	۲۱۹	۲۴۳	۱۹۸	۵۶	۲۲۲/۳
۲۷۷	۲۲۰	۲۴۴	۱۹۹	۵۷	۲۲۲/۴
۳۱۱	۲۴۶	۲۴۵	۲۰۰	۲۷۹	۲۲۲/۵
۳۱۲	۲۴۷	۲۸۵	۲۲۷/۲	۲۸۰–۲۸۱	۲۲۲/۶
۳۱۳	۲۴۸	۳۳۴	۲۲۷/۴	۲۰۴	۲۲۲/۷
۳۱۴	۲۴۹	۲۸۶	۲۲۷/۵	۱۶۰	۲۲۲/۸
۳۱۵	۲۵۰	۲۸۷	۲۲۷/۶-۷	۱۷۸	۲۲۲/۹
۳۱۶	۲۵۱	۲۹۰	۲۲۸	۴۰	۲۲۳/۱
۳۱۷	۲۵۲	۲۹۱	۲۲۹	۵۸	۲۲۳/۲
۳۱۸	۲۵۳	۲۹۲	۲۳۰	۵۹	۲۲۳/۳
۳۱۹	۲۵۴	۲۹۳	۲۳۱	۵۲	۲۲۳/۴
۳۲۰	۲۵۵	۲۹۴	۲۳۲/۱	۶۰	۲۲۳/۵
۳۲۱	۲۵۶	۲۹۵	۲۳۲/۲	۶۱	۲۲۳/۶
۳۲۲	۲۵۷	۲۹۶	۲۳۳	۲۸۲	۲۲۴
۳۲۳	۲۵۸	۲۹۷	۲۳۴	۱۵۷	۲۲۵/۱
۳۲۴	۲۵۹	۲۹۸	۲۳۵	۲۰۶	۲۲۵/۲
۳۲۵	۲۶۰	۲۹۹	۲۳۶	۱۵۴	۲۲۵/۳
۳۲۷	۲۶۱	۳۰۰	۲۳۷	۲۰۷	۲۲۶/۱
۳۲۸	۲۶۲	۳۰۱	۲۳۸	۱۶۱	۲۲۶/۲
۳۲۹	۲۶۳	۳۰۲	۲۳۹/۱	۲۰۸	۲۲۶/۳
۳۳۰	۲۶۴	۳۰۳	۲۳۹/۲	۲۰۹	۲۲۶/۴
۳۳۱	۲۶۵	۳۰۴	۲۴۰	۲۸۳	۲۲۷/۱
۳۳۲	۲۶۶	۳۰۵	۲۴۱	۲۸۴	۲۲۷/۲
۳۲۶	۲۶۷	۳۰۷	۲۴۲		
۶۲	۲۶۸	۳۰۸	۲۴۳		
۳۳۳	۲۶۹	۳۰۹	۲۴۴		
		۳۱۰	۲۴۵		

www.taemeernews.com

تراجم وتفاسیر القرآن

موضح القرآن

شاہ عبدالقادر دہلوی ولد شاہ ولی اللہ

۱- تاریخ تصنیف : ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰-۹۱ء)

کاتب : نامعلوم - ۱۹ ویں صدی

اوراق ۱۸۱ : ۴/۱ ۱۱ × ۷ ، ۱۵ سطور۔ نسخ و نستعلیق

بی ۵ ، یو ۲ ، دہلی

عربی - اردو - پہلی چار سورتیں

القرآن

۲- مصنف : شاہ عبدالقادر ولد شاہ ولی اللہ

کاتب : نامعلوم - ۱۹ ویں صدی

اوراق ۴۰ : ۸ × ۵ ، ۱۴ سطور، نسخ و نستعلیق

بی ۹ ، یو ۶ ، دہلی

صرف ۳۰ واں پارہ - عربی و اردو سطر بہ سطر۔ آیتوں کی ترتیب الٹی ہے۔ شروع میں سورۂ فاتحہ دی ہوئی ہے۔

القرآن

۳- کاتب : نامعلوم ، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۳۷ ، ۸ × ۴/۱ ۵ ، ۱۱ سطور، نسخ و نستعلیق

بی ۱۰ ، یو ۷ ، بی ، دہلی

۳۰ واں پارہ مع تفسیر از موضح القرآن

ایضاً

۴- کاتب ، نامعلوم ، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۱۸۱ ، ۲/۱ ۱۳ × ۲/۱ ۸ ، ۲۲ سطور نسخ و نستعلیق

بی ۱۱ ، یو ۸ ، دہلی

آخر دسورۃ آل عمران کی پہلی ۸۸ آیات

القرآن

۵- شاہ رفیع الدین ولد شاہ ولی اللہ

کاتب : نامعلوم ، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۲۰۸ ، ۲/۱ ۱۱ × ۲/۱ ۷ ، ۱۴ سطور نسخ و نستعلیق

بی ۶ ، یو ۳ ، دہلی

آخر سے سورۃ الانعام کی پہلی تین آیات تک۔ حاشیے پر شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن سے تفسیر دی ہوئی ہے۔

القرآن

۶- مکتوبہ ، حافظ نجیب اللہ برائے والدہ سیف الرحمٰن خاں، ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۳-۲۴ء)

اوراق ۸۳ ، ۲/۱ ۱۳ × ۸ ، ۱۴ سطور، نسخ و نستعلیق

بی ۷ ، یو ۴ ، دہلی

آخری دو پارے ۔ عربی اردو سطر بہ سطر

القرآن

۷۔ مصنف، پارہ ۲۹ شاہ رفیع الدین، پارہ ۳۰ شاہ عبدالقادر۔

کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۲۹، ۱۲ × ۸ء۱۸، تا ۲۶ سطور، نسخ و نستعلیق

بی ۸، یو ۵، دہلی

حاشیے پر موضح القرآن سے تفسیر دی گئی ہے۔

تفسیر سیپارۂ عم

۸۔ مصنف، غلام مرتضیٰ [1]

کاتب، نامعلوم، پنج شنبہ ۴ ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء)

اوراق ۱۵۵، ۹½ × ۶¼، ۱۴ سطور، نسخ

بی ۱۲، یو ۱۱۰ اے

منظوم تفسیر مع اصل عبارت

تفسیر سورۂ یوسف

۹۔ مصنف، نامعلوم

کاتب، منصور علی، ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء)

اوراق ۷۹، ۸ × ۵¾ ۔ ۹ سطور، نسخ و نستعلیق

بی ۱۳، یو ۱۰ اے ۔ دہلی

تفسیر قاف والذاریات

۱۰۔ مصنف، نامعلوم

کاتب، نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی

اوراق ۲۴، ۸ × ۵½، ۹ سطور، نسخ و نستعلیق

بی ۱۴، یو ۱۰ بی، دہلی

سورۃ الذاریات نامکمل ہے۔

تفسیر سورۃ الرحمٰن

۱۱۔ مصنف، نامعلوم

کاتب، نامعلوم، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۱۲، ۸ × ۵¼، ۱۳ سطور، نستعلیق

بی ۱۵ ۔ یو ۱۰ سی ۔ دہلی

ب ۔ اسلامیات

خوب ترنگ

۱۲۔ مصنف، شیخ خوب محمد

تاریخ تصنیف: ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء)

کاتب، حسن آقا، ۲۸ ربیع الثانی ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۶ء)

اوراق ۱۷۹، ۹¼ × ۵¾، ۱۷ سطور، نستعلیق

بی ۲، بی ۶۰۴

خوب ترنگ

۱۳۔ کاتب، عبداللہ ۔ ۵ صفر ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء)

اوراق ۸۴، ۸¼ × ۴¾، ۷ تا ۲۳ سطور، نستعلیق

بی ۱ ۔ پی ۱۵۵۵

مثنوی خوب ترنگ اس کی فارسی شرح امواج خوبی کے حاشیے پر لکھی ہوئی ہے۔

---

[1] شاہ غلام مرتضیٰ تخلص جنوں ابن حضرت شاہ محمد تیمور شاہ الہ آبادی کی منظوم تفسیر کے چند اجزا دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں جو ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ پارۂ عم متعدد مطابع شایع کر چکے ہیں جب کہ انتیسویں پارے کی تفسیر کا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: "کلام پاک کا قدیم ترین منظوم ترجمہ و تفسیر" از ضمیر نیازی، مشمولہ سہ ماہی اردو ص ۲۰۹ تا ۲۱۹ بابت شمارہ ۲، ۱۹۷۵ء

www.taemeernews.com

شریعت نامہ[1]

۱۴— مصنف۔ شاہ ملک

تاریخ تصنیف۔ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶-۶۷ء)

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۴۸، ۸½ × ۵¼-۶ سطور۔ نسخ

بی ۳۔ پی ۱۲۳۶ ٹیپو

منظوم

ترنجن[2]

۱۵— مصنف۔ نامعلوم

کاتب۔ نامعلوم۔ ۴ رجمادی الاول ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳ء)

اوراق ۱۴۔ ۷¼ × ۴½ ۱۳ سطور نستعلیق

بی ۴۔ پی ۹۰۸

منظوم

خلاصہ سلطانی یا احکام النساء

۱۶— مصنف۔ قاضی غلام احمد

کاتب۔ نامعلوم۔ (۱۸ویں صدی)

اوراق ۸۶۔ ۸½ × ۵¾-۱۲ سطور نستعلیق

بی ۱۶۔ پی ۱۲۰۴۔ ٹیپو

عقاید و احکام شریعت کا بیان

ایضاً

۱۷— مصنف۔

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۳۳۔ ۸½ × ۶-۱۰ تا ۱۳ سطور نستعلیق

بی ۱۷۔ پی ۱۳۵۔ فورٹ ولیم کالج

تنبیہ المضلین

۱۸— مصنف۔ نامعلوم

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۳۳۔ ۹¼ × ۵¾-۱۱ تا ۱۳ سطور۔ نستعلیق و نسخ۔

بی ۱۸۔ پی ۱۱ اے

وہابی عقاید کے بیان میں ہے بجواب نصیحت المسلمین از مولوی خرم علی (تاریخ تصنیف ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۳ء)

تنبیہ الغافلین

۱۹— مصنف۔ شاہ رفیع الدین ولد شاہ ولی اللہ

مترجم (از فارسی) بینی نرائن کشتری

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۸۳۹ء

اوراق ۱۱۸۔ ۸½ × ۵½-۱۱ سطور۔ نسخ و نستعلیق

بی ۱۹۔ پی ۳۱۶۴

عقاید و احکام شریعت کے بیان میں

برق لامع

۲۰ — مصنف۔ مرزا جعفر علی فصیح ولد مرزا ہادی علی لکھنوی[3]

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۵۳۔ ۹¾ × ۶-۱۵ سطور نستعلیق

---

[1] اس رسالے کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ہے جس کا نمبر ۱۵۹ ہے یہ منظوم رسالہ ہے۔

[2] جوت نرنجن نام کی ایک کتاب شیخ رزق اللہ مشتاقی دہلوی کی تصنیف ہے جو "زبان علمی اہل ہند" میں تصنیف ہوئی ہے۔ مشتاقی کا انتقال ۸۸۹ھ میں ہوا ہے شاید مذکورہ بالا نسخہ اسی کی نقل ہو — (ا۔ص)

[3] لکھنؤ کے مرثیہ گو شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ (ا۔ص)

www.taemeernews.com

بی ۲۰۔ یو ۱۱۔ دہلی
منظوم۔ شیعہ عقاید کی تائید اور سیف القاطع کی تردید میں۔

اتالیق الصبیات

۲۱۔ مصنف۔ سید صالح محمد
کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی۔ اشاریہ ابواب و فصول از محمد امین الدین برائے الٰہی بخش۔
۲۱ رشوال ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۱۰۵۔ ۳/۴×۵۔ ۲۳ سطور نستعلیق
رک بی ۲۱۔ یو ۱۲ اے۔ دہلی

نصیحت المسلمین

۲۲۔ مصنف۔ مولوی خرم علی بلہوری (خرم خان)[۱]
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۳۲ھ (۱۷-۱۸۱۶ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۸ رصفر ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۳ء)
اوراق ۳۲۔ ۴۔ ۱/۴×۸۔ ۱/۵۔ ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۲۲۔ یو ۱۳ بی۔ دہلی
کفر و شرک کے بیان میں

نصیحت المومنین

۲۳۔ مصنف۔ مولوی خرم علی بلہوری
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۳۸ھ (۲۳-۱۸۲۲ء)
کاتب۔ محمد محب اللہ ساکن ڈھری۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۴۳۔ ۷-۱۲/۴×۹ ۱/۲-۳/۴ ۵۔ ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۶۸۔ یو ۱ ج

منظوم۔ ماخوذ از مصنف نصیحت المسلمین (دیکھیے نمبر ۲۲)

فضل بہار

۲۴۔ مصنف۔ حافظ سید فضل علی چشتی
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء)
کاتب۔ ارشد علی۔ ۱۰ ررجب ۱۲۶۷ھ
اوراق ۶۰۔ ۱/۴×۱۱ ۳/۴۔ ۷ ۱/۴۔ ۱۴ تا ۱۸ سطور نستعلیق
بی ۲۳۔ یو ۱۴۔ دہلی
عقاید و مسایل کے بیان میں

مایۃ المسایل

۲۵۔ مصنف۔ مولانا شیخ محمد اسحاق ولد شیخ محمد افضل فاروقی
مترجم (از فارسی) احمد اللہ ولد دلیل اللہ صدیقی
تاریخ ترجمہ۔ ۱۲۴۵ھ (۳۰-۱۸۲۹ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۲۷۳ھ (۵۷-۱۸۵۶ء)
اوراق ۸۲۔ ۳/۴×۷۔ ۵۔ ۱۰ تا ۱۸ سطور نستعلیق
بی ۲۴۔ یو ۱۵۔ دہلی
سنی عقاید و رسایل کے متعلق ۱۰۰ سوالات کے جوابات

مثال نامہ یا مثل نامہ

۲۶۔ مصنف۔ حکیم محمد مظفر حسین خان ولد حکیم عادل خان دہلوی
کاتب۔ شیخ عطاء اللہ۔ چتور۔ رجب ۱۲۴۷ھ
اوراق ۳۹۔ ۶۰×۴۔ ۹ سطور نستعلیق
بی ۲۵۔ یو ۱۱۶ اے۔ دہلی
تقویٰ و عاقبت کے بیان میں

۱؎ دہلی کے اردو مخطوطات از صلاح الدین۔ دہلی۔ ۱۹۶۷ء

حدایق اثنا عشری ترجمہ رسالہ سیفیہ
یا حساب شرع شریف

۲۷ـ مصنف ۔ سید مہدی علی ولد مقصود علی
تاریخ تصنیف ۔ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء)
مترجم ۔ سید سیف الدین حیدر
تاریخ ترجمہ ۔ ۱۲۵۵ھ (۱۸۱۶ء)
کاتب ۔ نا معلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۷۶، ۱۰¼ × ۷¼ ۔ ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۲۶، یو ۱۷ ۔ دہلی
احکام دین و شریعت

اوقات نماز پنج گانہ

۲۸ـ مصنف ۔ سید محبوب علی حنفی
کاتب ۔ شیخ امام علی قادری برائے مظہر علی خاں
شاہجہان آباد ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء)
اوراق ۲۴، ۱۰¼ × ۷، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۲۷، یو ۱۸، دہلی

ضیاء الایمان

۲۹ـ مصنف ۔ کفایت علی ولد عبد العلی حسینی بریلوی
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۴۷، ۱۱ × ۸، ۱۴ تا ۱۶ سطور نستعلیق
بی ۲۸، یو ۱۹، دہلی
ناقص الآخر ۔ شرک اور بدعتوں کے بیان میں

عہد نامہ

۳۰ـ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۶۶ ـ ۵۹، ۶ × ۴ ـ ۷ سطور ۔ نسخ
بی ۲۹، یو ۱۶، دہلی

نامعلوم الاسم (کتاب الاخلاق)

۳۱ـ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۷۹، ۸ × ۵¼، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۳۱، یو ۲۰ اے
احکام دین و شریعت و سزا و جزا کے بیان میں

قصیدہ بُردہ باشرح دکھنی

۳۲ـ مصنف ۔ محمد ابن سعد بُصیری
مترجم ۔ سید محمد
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۵۰، ۷¼ × ۵، ۸ و ۳ سطور نستعلیق
بی ۳۲ ۔ پی ۲۱۰۹، فورٹ ولیم کالج
منظوم

خاور نامہ یا نامہ شاہ[1]

۳۳ـ مصنف ۔
کمال خاں رستمی
تاریخ ۔ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء)
اوراق ۵۴۳، ۱۴ × ۱۰، ۱۹ سطور نستعلیق تصاویر
بی ۳۵، پی ۸۳۴

---

[1] خاور نامہ، خواجہ حمید الدین شاہد بی اے نے مرتب کیا ہے اور کراچی سے شایع ہو چکا ہے ۔ (ا۔ص)

www.taemeernews.com

حضرت علی اور ان کے دو حواری مالک اور ابوالمجن
کی لڑائیوں کی فرضی رزمیہ منظوم داستان ۔ ابن
حسام کی فارسی تصنیف (۸۳۵ھ) کا منظوم ترجمہ

قصہ ابو شحمہ [1]

۳۴۔ مصنف ۔ امین
تاریخ تصنیف ۔ ۲۷ رجب ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء)
کاتب ۔ نامعلوم ۔ سرنگا پٹم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۳۷ ۔ ۲۰۵ ۔ ۳½ × ۶ ۳½ ۴ ۔ ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۷۱ ۔ پی ۲۸۳۲
منظوم : ابو شحمہ ابن عمر ابن خطاب کی وصفی داستان
آخر میں حمد خدائے تعالیٰ اور حضرت عبدالقادر کی
منقبت میں چھ نظمیں دی ہوئی ہیں ۔

قصہ بی بی مریم

۳۵۔ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۳۸ ۔ ۲ ۔ ۸½ × ۵½ ، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱/ ۷۳ ، پی ۲۷۲۷ اے
منظوم

دعائے فاطمہ

۳۶۔ مصنف ۔ نامعلوم (ولی ویلوری)
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۔ برحاشیہ ۲۴ ۔ ۱ مختلف سطور نستعلیق
بی ۴/ ۷۳ ، پی ۲۲۷ اے
منظوم

مدح حضرت پیر دستگیر محی الدین سید عبدالقادر جیلانی (محی الدین نامہ) [2]

۳۷۔ مصنف ۔ افضل
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق برحاشیہ ۳۳ ۔ ۲۴ ۔ مختلف سطور نستعلیق
بی ۵/ ۷۳ ۔ پی ۲۷۲۷ اے
منظوم

مثنوی عشق صاحب

۳۸۔ مصنف ۔ ضعیفی
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق برحاشیہ ۵۲ ۔ ۳۸ ، غیر معین سطور نستعلیق
بی ۷/ ۷۳ ، پی ۲۷۲۷ اے
فارسی سے منظوم ترجمہ ۔ زنے برحضرت رسول
عاشق بود از عشق حضرت رسول در آتش افتاد ۔
فرضی اور وضعی قصہ

معجزہ بی بی فاطمہ [3]

۳۹۔ مصنف ۔ نامعلوم ۔ (شرف)
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱ ۔ ۷۱ ۔ ۵۹ ۔ ۸½ × ۲ ½ ۵ ، ۱۰ تا ۱۷ سطور نستعلیق
منظوم ۹/ ۷۳ ، پی ۲۷۲۷ اے

---

[1] قصہ ابو شحمہ اولیا نام کے ایک اور شخص نے بھی نظم کیا ہے اور اس کے دو نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ہیں (ا ۔ ص)
[2] اس کا نام محی الدین نامہ ہے اور اس کے کئی نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ہیں ۔ (ا ۔ ص)
[3] اس تصنیف کا نام شاید گلشن نامہ بھی ہے جس کا مخطوطہ ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں ہے اور ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں بھی یہی ہے ۔ (ا ۔ ص)

منظوم ۔ کفار مکہ کی حضرت فاطمہ کو ایک شادی کی تقریب میں شامل ہونے کی دعوت، حضرت فاطمہ کے پھٹے پرانے کپڑوں کے قیمتی پوشاک میں تبدیل ہونے اور کفار کے اسلام لانے کا بیان۔

ایضاً

۴۰ ۔ کاتب ۔ مخدوم حسینی، اواخر ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۲-۱، ۴/۳ ۸ × ۲/۱ ۵، ۱۵ سطور نسخ و نستعلیق
بی ۱/۲۲۳، پی ۶۹ ۲،

قصہ منصور

۴۱ ۔ مصنف ۔ احمد علی شیو اجیپوری[1]
کاتب ۔ احمد اللہ، ۴ صفر ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء)
اوراق ۷۰-۵۹، ۴/۳ ۹ × ۴/۳ ۵، ۱۱ تا ۱۵ سطور
نستعلیق ۔ بی ۸۰، یو اوڈی
منظوم ۔ قصہ شیخ حسین حلاج

نامعلوم الاسم

۴۲ ۔ مصنف ۔ تھانیسری
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۲-۱۰، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۹۳/۲، یو ۴۵، دہلی
حضرت محمدؐ کے معجزات ۔ لشکر کفار اور ان کے بادشاہ کے ایمان لانے کا بیان

نامعلوم الاسم

۴۳ ۔ مصنف ۔ فقیر
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۳۶-۲۲، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۱ تا ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۹۳/۳، یو ۴۵، دہلی
منظوم ۔ احکام دین و شریعت

اساس الوہابین

۴۴ ۔ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۴۷-۳۷، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۱ تا ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۹۳/۴، یو ۴۵، دہلی
دہلی میں وہابیت کے پھیلنے کی تاریخ

جنگ نامہ (محمد حنیف)[2]

۴۵ ۔ مصنف ۔ سیوک
تاریخ تصنیف ۔ ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء)
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۱۰، ۹ × ۲/۱ ۶، ۱۳ سطور ۔ نسخ
بی ۱۰۸، پی ۲۷۲۱
محمد حنیف بن علی کی یزید کے ساتھ جنگوں کی فرضی داستان

ظفر نامہ[3] (محمد حنیف) یا مفتاح العاشقین

۴۶ ۔ مصنف ۔ غلام علی خان قادری لطیف ساکن حیدرآباد

---

[1] یہ قصہ کبھی طبع ہو چکا ہے (ا۔ص)
[2] جنگ نامہ محمد حنیف کے چار مخطوطے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ان کے نمبر ۲۶۳ ف تا ۲۶۶ ف، ۵۰۷ ف و ۵۰۶ ہیں ۔ (ا۔ص)
[3] ظفر نامہ کا ایک مخطوطہ انجمن کے کتب خانہ خاص میں ہے ۔ (ا۔ص)

کاتب - نامعلوم - ۴ جلوس محمد شاہ (۱۷۲۳ء)
اوراق ۱۵۸، ۹×۵، ۱۷ سطور - نسخ
بی ۱۰۹، پی ۳۰۳۶
منظوم - آخر میں لطیف کے چند مراثی درج ہیں۔

روضۃ الشہدا

۴۷ - مصنف - ولی (ویلوری)
تاریخ تصنیف - ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء)
کاتب - سید جعفر عرف میاں صاحب، پالکاٹ۔
۲۵ رشعبان - ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء)
اوراق ۱۸۶، ۸½×۵¾، ۱۱ تا ۱۵ سطور -
نستعلیق و شکستہ آمیز
بی ۱۲، پی ۲۳۸۰
منظوم - شہیدان کربلا کے واقعات

ایضاً

۴۸ - کاتب - پیر محمد - ۱۰ رجب ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء)
اوراق برحاشیہ ۹۱-۱، ۹¾×۵، غیر معین
سطور نستعلیق -
بی ۱۲۲/۳، پی ۱۳۲۲

منطق الطیر یا پنچھی باچا[1]

۴۹ - مصنف وجیہ الدین وجدی

تاریخ تصنیف - ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء)
کاتب - محمد حسین منہی - ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۱ء)
اوراق ۱۲۴، ۹¼×۴¾، ۱۵ سطور -
بی ۱۲۱، پی ۲۳۷۵
ترجمہ منطق الطیر از فرید الدین عطار

آخرگشت[2]

۵۰ - مصنف - شاہ رمضان علی
تاریخ تصنیف - ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء)
کاتب - امید علی - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۱۰، ۸½×۵¾، ۱۱ تا ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۲۸، یو ۵۱، دہلی
منظوم - تقوی و پرہیزگاری کے بیان میں

دُر مجالس[3]

۵۱ - مصنف - سیف الظفر نوبہاری
مترجم - عبداللہ کمینہ ولد حافظ علی مطلبی
کاتب - نامعلوم - ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۱۴، ۸¼×۶، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۵۸، پی ۲۴۸۹

مثنوی حضرت عمر

۵۲ - مصنف - عبداللہ کمینہ ولد حافظ علی مطلبی

---

[1] پنچھی باچا کے بارہ مخطوطات انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں ہیں (ا - ص)

[2] اس کا صحیح نام "آخرگت" ہے آخرگشت نہیں ہے اور اس کے مصنف کا نام شاہ محمد رمضان ہے رمضان علی غلط لکھا گیا ہے۔ یہ ہیم ضلع رہتک کے رہنے والے تھے وعظ کہتے تھے راجپوتانے کے ہزار ہا راجپوتوں نے آپ کے وعظ سے متاثر ہو کر بت پرستی اور عقاید باطلہ سے توبہ کی ۱۲۴۰ھ میں بوہرہ قوم کے کچھ افراد نے ان کو شہید کر دیا۔ ہیم میں دفن کیے گئے۔ آخرگت کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں بھی ہے اس کے سوا ایک اور تصنیف عقاید العظم کا قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ (ا - ص)

[3] کمینہ، عبداللہ کا تخلص یا لقب نہیں ہے یہ از راہ انکسار لکھا گیا ہے۔ در مجالس کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ہے جس کا نمبر ۸۹۴ ف۳ ہے۔ اس کا تخلص محمد ہے جیسا کہ سخن شعرا کے صفحہ ۳۲۲ میں درج ہے۔ (ا - ص)

www.taemeernews.com

کاتب ۔ نامعلوم ۔ اوائل ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۷ ۔ ۵۸ ، ۴/۳ ۸ × ۶ ، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۴/۲۲۳ ، پی ۹ ۲ ۷
آنحضرت کی رسالت و حضرت عمر کے ایمان لانے
کا بیان

وفات نامہ پیغمبر

۵۳ ۔ مصنف ۔ میر تقی میر
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۲۱ ۔ ۱ ، ۸/۵ ۸ × ۴/۳ ۴ ، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۶۵ ، پی ۱۰۵۰ ، بی ۔ گیکواڑ
منظوم

باردالاشرار

۵۴ ۔ مصنف ۔ نعمۃ اللہ
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۴ر جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ
(۸ر اکتوبر ۱۸۳۵ء)
اوراق ۶ ۔ ۱ ، ۴/۱ ۸ × ۶ ، ۱۱ سطور نسخ
بی ۱/۲۲۲ ، یو ۱۱۶ اے ، دہلی
منظوم ۔ احکام دین و شریعت کی پیروی میں

قامع البدعۃ

۵۵ ۔ مصنف ۔ زین العابدین
کاتب ۔ سید مراد علی ۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۵ ۔ ۷ ، ۴/۱ ۸ × ۶ ، ۱۱ سطور نسخ
بی ۲/۲۲۲ ، یو ۱۱۶ اے ، دہلی
منظوم ۔ آخر میں مصنف کی ایک فارسی نظم دی
ہوئی ہے ۔

رسالہ توحید

۵۶ ۔ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب ۔ سید مراد علی ، دہلی ۔ ۳ر ربیع الاول ۱۲۵۱ھ
(۱۸۳۵ء)
اوراق ۱۹ ۔ ۱۶ ، ۴/۱ ۸ × ۶ ، ۱۱ سطور نسخ
بی ۳/۲۲۲ ، یو ۱۱۶ اے ، دہلی
منظوم ۔ روز قیامت اور سزا و جزا کے بیان میں

رسالہ مناجاتی

۵۷ ۔ مصنف ۔ شمس الدین گجراتی
کاتب ۔ سید مراد علی ۔ دہلی ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء)
بی ۴/۲۲۲ ، یو ۱۱۶ ،
اوراق ۲۵ ۔ ۲۰ ، ۴/۱ ۸ × ۶ ، ۱۱ سطور ، نسخ
منظوم ۔ شروع میں (ورق ۲۰) رمضان شاہ کی
ایک مناجات درج ہے ۔

مثنوی عقد فاطمہ

۵۸ ۔ مصنف ۔ مخدوم حسینی ، بہ امداد استاد حسن
تاریخ تصنیف ۔ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء)
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۱ر صفر ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء)
اوراق ۳۸ ۔ ۱۶ ، ۴/۱ ۸ × ۶ ، ۱۳ تا ۱۶ سطور نستعلیق
بی ۲/۲۲۳ ، پی ۹ ۲ ۷
فاطمہ اور علی کی شادی کے حالات جو کسی عربی قصے سے
اخذ کیے گئے ہیں ۔

معجزات رسالت

۵۹ ۔ مصنف ۔ مخدوم حسینی
کاتب نامعلوم ۔ وسط ۱۹ویں صدی
اوراق ۵۸ ۔ ۵۰ ، ۴/۱ ۸ × ۶ ، ۱۳ تا ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۳/۲۲۳ ، پی ۹ ۲ ۷

www.taemeernews.com

قصہ حسینی

۶۰۔ مصنف ۔ عزیز (خواص)
تاریخ تصنیف ۔ (۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء)
کاتب نامعلوم ۔ ۲۴ ربیع الثانی (۱۲۰۳ھ
(۱۷۸۹ء)
اوراق ۱۴۸۔ ۶۷، ۸½ × ۶ء۱۲، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۲۲۳/۵ پی ۹ ۲۷۲
مثنوی ۔ حضرت امام حسین کے متعلق ایک فرضی
قصہ ۔ شروع میں عبدالقادر جیلانی اور سید
محمد گیسو دراز کی مدح میں نظمیں ہیں۔

نامعلوم الاسم

۶۱۔ مصنف ۔ حسین احمد (احمد)
کاتب ۔ محمد قاسم، اوائل ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۹۹۔ ۱۴۸، ۸½ × ۶ء۱۰، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۲۲۳/۴، پی ۹ ۲۷۲
مثنوی ۔ حضرت علی، امام حسن اور امام حسین
کی شہادت کے حالات ۔
شروع میں اہل بیت اور رسول اکرم کی زندگی کے
کچھ واقعات کا ذکر ہے۔

فتوےٰ اذان پہلی نماز جمعہ کی

۶۲۔ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب ۔ غالباً مصنف ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۰۔ ۱، ۹ × ۶ء۳۰، سطور نستعلیق
بی ۲۶۸، یو ۱۳۰
۵۷۔ ۴۴ و ۴۳۔ ۶۷ اوراق پر مندرجہ بالا
فتوے کا فارسی ترجمہ دیا ہوا ہے ۔ اس کے علاوہ
مندرجہ ذیل دوسری تصنیفات بھی اسی جلد میں
شامل ہیں ۔

۱۔ اربعین فی احوال المہدین ۔ عربی ۔ حضرت مہدی
کے ظہور کے متعلق ۴۰ احادیث کا مجموعہ
۲۔ فارسی ۔ مولوی فیض علی خراسانی کے سوالات
کے جوابات ۔
۳۔ فارسی ۔ تراویح کے متعلق فتوے
۴۔ ناگری منتقات
۵۔ دعائیں اور ان کے اردو تراجم
۶۔ ہجرت کا رسالہ، جس میں مسلمانوں کو کفار کے
زیر تحت ملک سے ہجرت کرنے کو کہا گیا ہے۔
۷۔ نکاح ثانی کا رسالہ جو کہ ۲۸ مئی ۱۸۶۹ء کو تحریر
کیا گیا تھا ۔
۸۔ اس کے علاوہ اس میں حکمت کے چند نسخہ جات
وغیرہ درج ہیں۔

ہندو مذہب

بحث بطلان تناسخ

۶۳۔ مصنف ۔ نامعلوم
کاتب ۔ نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۴، ۹ × ۶¾، ۱۵ سطور شکستہ آمیز
بی ۳۰، پی ۵۴۵ ۳ بی
تناسخ روح کی تردید میں

عیسائیت

انتخاب نمازوں کا

۶۴۔ ہنری مارٹن

www.taemeernews.com

تاریخ ترجمہ : ۱۸۰۷ء

کاتب - نامعلوم - ۱۸۱۴ء

اوراق ۵۷، ۷ ۱/۲ × ۵ ۳/۴، ۱۱ سطور نستعلیق

بی ۳۳ ؛ پی ۳۱۱

ترجمہ انجیل مقدس Book of Common

انجیل مقدس

۶۵- مترجم - میر حسن علی

کاتب - مترجم ؟ ۱۸۱۶ء

اوراق ۶۱، ۷ × ۸ ۳/۴، ۱۱ سطور نستعلیق

بی ۳۴، پی ۳۰۶۳

The Gospel of St. Mathew

تاریخ وجغرافیہ

۱- تاریخ

علی نامہ

۶۶- مصنف - نصرتی

تاریخ تصنیف (۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۵ء)

کاتب نامعلوم، ۱۸ویں صدی

اوراق ۲۱۹، ۱۰ × ۶ ۳/۴، ۱۳ سطور، نسخ

بی ۳۶، پی ۱۰۰۰، ٹیپو

منظوم - علی عادل شاہ ثانی سلطان بیجاپور کی سوانح و مہمات کے حالات

جنگ نامۂ بھاؤ واؤلے

۶۷- مصنف نامعلوم۔

کاتب نامعلوم ۱۹ویں صدی

اوراق ۳۴، ۸ × ۵ ۳/۴، ۹ سطور شکستہ آمیز

بی ۳۷، پی ۳۰۸۰

منظوم - (۱۳۱) اشعار - احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی جنگ کے حالات

جنگ نامۂ بھاؤ مرہٹہ و شاہ درانی [2]

۶۸- مصنف نامعلوم - ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۴، ۹ × ۶ ۱/۴، ۱۰ سطور نستعلیق

بی ۳۸، یو ۲۱، دہلی

منظوم مخمس

آرائش محفل ترجمہ خلاصۃ التواریخ [3]

۶۹- میر شیر علی افسوس ولد سید علی مظفر خان

تاریخ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء)

کاتب نامعادم - ۱۹ویں صدی

اوراق ۲۶۴، ۱۰ ۱/۴ × ۷ ۱/۲، ۱۳ سطور نستعلیق

بی ۳۹، پی ۲۰۴۸

تاریخ ہندوستان مسلمانوں کی آمد تک سجان رائے کی فارسی تاریخ (۱۱۰۷ھ) کا اردو ترجمہ ہے۔

جنگ خراسان

۷۰- مصنف کریم الدین یا کریم بخش ٹپیالوی

کاتب نامعلوم ؛ ۱۹ویں صدی

اوراق ۶۹، ۱۲ × ۶ ۳/۴، ۱۷ تا ۱۹ سطور نستعلیق

بی ۴۰، پی ۳۲۲۳

---

[1] علی نامہ کے ۶ مخطوطے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ہیں (ا۔ص)

[2] یہ لڑائی ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی (ا۔ص)

[3] آرائش محفل کو مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپ دیا ہے۔ (ا۔ص)

www.taemeernews.com

منظوم۔ افغانستان کے شاہ شجاع کے حالات
۱۸۱۲ء تا ۱۸۳۸ء

دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ اس نے یہ حالات
منشی نظام الدین کی کتاب سے اخذ کیے ہیں۔

تاریخ شیرشاہی

۷۱۔ ترجمہ تاریخ عباس خاں ولد شیخ علی شیروانی
مظہر علی خاں عرف مرزا لطف علی ولا
تاریخ تصنیف ۵ رجمادی الاول ۱۲۲۰ھ
کاتب ۔ ۵ رجمادی الاول ۱۲۲۰ھ ر ۲ راگست (۱۸۰۵ء)
اوراق ۔ ۱۲۲، ۱۰ × ۴½، ۷/۱۳، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۴۱، پی ۲۹۳۶

حیدرنامہ

۷۲۔ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم : ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۰۰، ۷¾ × ۴¾، ۱۱ تا ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۴۲، یو ۲۲
والیِ میسور سلطان حیدر علی خاں کی زندگی کے حالات۔

سیدالتواریخ

۷۳۔ مصنف سید روشن علی خان ولد سید امانت علی خان
تاریخ تصنیف ۔ ۱۲۸۵ھ ر ۱۸۶۹ء)
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۶۸، ۱۲ × ۷½، ۱۳ تا ۲۰ سطور نستعلیق
بی ۴۳، یو ۲۳
تاریخ خاندان سادات بارہ

تاریخ سادات بارہ

۷۴۔ مصنف۔ خورشید علی خاں ولد آفتاب علی خان
کاتب نامعلوم، ۶ رفروری ۱۸۹۴ء
اوراق ۴۷، ۱۳½ × ۸، ۲۰ سطور نستعلیق
بی ۴۴ : یو ۲۴
سید حسن علی خان عرف عبداللہ خاں قطب الملک
سید حسین علی خان
امیرالامرا کے حسب ونسب اور زندگی کے حالات

تاریخ خاندان عباسی داؤدپوترہ

۷۵۔ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۱۰، ۱۲½ × ۸½، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۴۵، یو ۲۵
بہاولپور کے شاہی خاندان کے حالات ۱۸۱۱ء تک

تاریخ اقوام ہند

۷۶۔ مصنف نامعلوم
کاتب محمد عبدالعزیز۔ ۱۸ رفروری ۱۸۹۰ء
اوراق ۳۲، ۱۰ × ۶½، ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۴۶، یو ۲۶
ہندوؤں کی ذات پات اور پیشوں کے بیان میں

تواریخ جمالی

۷۷۔ مصنف عبدالقادر وکیل ساکن کرندہ
کاتب مصنف ۱۸۸۵ء
اوراق ۹-۱۳ × ۸، ۱۶ سطور، نستعلیق

www.taemeernews.com

بی ۴۷، یو ۲۷
تاریخ رسول پور جمال یا جمال پور تحصیل غازی پور

حالات پنجاب

۷۸ــ مصنف مہدی علی (خاں) ذکی مراد آبادی
تاریخ تصنیف ۱۸۴۹-۵۲ء
کاتب محمد عبدالعزیز ساکن بنہری - ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۴ء
اوراق ۴۷، ۹ × ۵ ۱/۲، ۱۳ تا ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۴۸، یو ۲۸
کپورتھلہ کے راجہ نہال سنگھ کے لیے تصنیف کی گئی۔

حالات نادر شاہ محمد شاہ

۷۹ــ مصنف تلوک داس
مترجم - نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۸، ۱۰ ۱/۲ × ۷، ۱۸ سطور نستعلیق
بی ۴۹، یو ۲۹
ہندی نظم سے اردو نثر میں ترجمہ

تواریخ نواب نجیب الدولہ

۸۰ــ مصنف درگا پرشاد ولد منا لعل
تاریخ تصنیف - ۱۸۹۰ء
کاتب محمد عبدالعزیز ساکن بنہری - ۲۵ فروری ۱۸۹۵ء
اوراق ۲۱، ۱۰ ۱/۲ × ۷، ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۵۰، یو ۳۰
تاریخ سرداران روہیلہ نواب نجیب الدولہ تا ۱۸۵۶ء

حالات نواب رشید خاں

۸۱ــ مصنف نامعلوم
کاتب علی اصغر، ۱۸۹۳ء
اوراق ۱۴، ۱۱ × ۷، ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۵۱، یو ۳۱

فتح نامہ ٹیپو سلطان

۸۲ــ مصنف طرب (میسوری) تاریخ تصنیف - اواخر ۱۸ ویں صدی
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۴۴، ۸ ۱/۴ × ۶، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۴۰، پی ۲۶۹۹
منظوم - ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کی جنگ و فتح نرگنڈ کے حالات

جغرافیہ

تاریخ بھدرہین

۸۳ــ مصنف - قاضی محمد شریف ساکن بھدوہی
تاریخ تصنیف - ۱۷ فروری ۱۸۴۷ء
کاتب شیخ محمد سلیم ساکن بہتری، ۱۴ مارچ ۱۹۰۴ء
اوراق ۳۸، ۱۰ × ۶ ۱/۲، ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۶۷، یو ۳۷

آئینہ بندیل کھنڈ

۸۴ــ مصنف سید منظور احمد
تاریخ تصنیف - اپریل ۱۸۶۷ء
کاتب نامعلوم - ۱۸۹۶ء

www.taemeernews.com

اوراق ۱۲۱، ۴/۱ ۱۲ × ۴/۱ ۷، ۱۴ سطور، نستعلیق

بی ۶۸، یو ۳۸

تاریخ وجغرافیہ بندیل کھنڈ

تاریخ ھسوہ

۸۵ — مصنف: نامعلوم

تاریخ تصنیف: ۱۸۸۱ء

کاتب علی اصغر ولد عبدالعزیز ساکن بہیری، ۱۹ویں صدی

اوراق ۲۸، ۴/۱ ۱۰ × ۷/۳ ۶، ۱۲ سطور، نستعلیق

بی ۶۹، یو ۳۹

وقائع شہر بنارس وجون پور

۸۶ — سید مہدی حسین جونپوری کی فارسی تاریخ (۱۹ویں صدی) کا ترجمہ۔

مترجم سید مبارک علی

اوراق ۱۵، ۸ × ۶، ۱۲ سطور، نستعلیق

بی ۷۰، یو ۴۰

ناقص۔ مع فہرست شعرا اردو

سوانح

منتخب

۸۷ — مصنف۔ شیخ فریدالدین عطار

مترجم: عزیز

تاریخ ترجمہ۔ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء)

کاتب۔ نامعلوم، ۱۹ویں صدی

اوراق ۷۶، ۸ × ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۵۲، پی ۲۸۱۷

ضیا الابصار

۸۸ — مولف ومترجم میر اکبر علی ابن سید فضل علی رضوی

نامعلوم۔ ۱۹ صدی

اوراق ۲۳۴، ۴/۱ ۱۰ × ۴/۱ ۶، ۱۲ سطور، نستعلیق ونسخ

بی ۵۳، یو ۳۲، دہلی

حضرت امام حسین کی زندگی اور شہادت کے متعلق احادیث اور ان کا اردو ترجمہ

دوازدہ مجلس

۸۹ — مصنف عطا

کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۴۴، ۴/۱ ۹ × ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۵۴، یو ۳۳، دہلی

رسول کریم، حضرت علی، فاطمہ اور کربلا کے شہیدوں کی وفات اور شہادت کے واقعات۔

تذکرے

مخزن نکات [1]

۹۰ — مصنف۔ محمد قیام الدین قایم چاندپوری

تاریخ تصنیف۔ ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء)

کاتب: نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۸۶ - ۸ تا ۴/۳ ۸ × ۴/۱ ۶ تا ۴/۳ ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۵۵، پی ۳۵۲۲

تذکرہ علی حسین گردیزی

۹۱ — مصنف۔ فتح علی عرف علی حسینی گردیزی

[1] مخزن نکات انجمن ترقی اردو ہند نے چھاپا تھا اب دوبارہ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے شایع ہو گیا ہے۔ (ا۔ ص)

www.taemeernews.com

تاریخ تصنیف ۱۱۶۵ھ (۵۲-۱۷۵۱ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۱۸۰ھ (۶۷-۱۷۶۶ء)
اوراق ۴۲، ۸ ۱/۸ × ۴ ۱/۲، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۵۶، پی ۱۶۸ ۱۳ الف

ایضاً

۹۰۔ کاتب۔ معین الدین بھاگل پوری، ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۲ء)
اوراق ۹-۷۰، ۸ ۳/۴ × ۵ ۳/۴، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۵۷، پی ۱۷۰، ۳ ٹیپو

ایضاً

۹۳۔ کاتب۔ امجد علی پنڈوی، کلکتہ، بکری ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء)
اوراق ۱۱۹-۳۲، ۸ ۳/۸ × ۶ ۱/۴، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۵۸، پی ۲۴۵۲

ایضاً

۹۴۔ کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۵۰، ۱۰ ۱/۲ × ۶ ۳/۸، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۵۹، پی ۳۱۲۳

گلشن ہند [1]

۹۵۔ مصنف۔ مرزا علی لطف ابن قاسم بیگ
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۹۶، ۱۱ ۱/۸ × ۶ ۱/۴، ۱۷ سطور، نستعلیق و شکستہ آمیز

بی ۶۰، پی ۳۱۲۶

گلستان بےخزاں یا نغمہ عندلیب [2]

۹۶۔ مصنف۔ حکیم سید غلام قطب الدین باطن
تاریخ تصنیف۔ ۲ ربیع الاول ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۴۶، ۱۲ × ۷ ۱/۴، ۲۱ سطور، نستعلیق
بی ۶۱، پی ۳۱۲۴

تذکرہ سرور [3]

۹۷۔ مصنف۔ میر محمد خان سرور
تاریخ تصنیف۔ ۹ محرم ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۲۶ رمضان ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء)
اوراق ۲۴۹، ۱۰ ۳/۸ × ۶، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۶۲، پی ۳۱۶۱، ۱۱ تیھے ۸۵۰

عیار الشعرا

۹۸۔ مصنف۔ خوب چند کالیتھا ذکا دہلوی
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۰۸-۱۳ھ (۹۹-۱۷۹۳ء)
کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۴۷۴، ۹ ۳/۴ × ۶، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۶۳، پی ۳۱۳۱۔
۱ تیھے ۴۰۲

---

[1] گلشن ہند کے چار مخطوطے انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ خاص میں ہیں۔ (ا-ص)

[2] یہ تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ گلشن بےخار کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ (ا-ص)

[3] اس تذکرے کا نام عمدہ منتخبہ ہے۔ کئی سال ہوئے دہلی سے خواجہ احمد فاروقی کی ترتیب اور مقدمہ کے ساتھ شایع ہو چکا ہے۔ اس کی تکمیل ۱۲۲۲ھ میں نہیں ہوئی بلکہ ۱۲۲۹ھ تک اضافے ہوتے رہے ہیں (ا-ص)

www.taemeernews.com

تذکرہ شعرائے اردو

۹۹۔ مصنف۔ نامعلوم

کاتب غالباً۔ تصنیف۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۲۵۸، ۱۱ ۴/۱ × ۸، ۱۵ تا ۱۹ سطور نستعلیق

بی ۶۴، یو ۳۴، دہلی

نامکمل اور ناقص ہے شاہ عالم آفتاب تا انعام اللہ خاں یقین۔

تذکرہ شعرا

۱۰۰۔ مصنف۔ نامعلوم

کاتب۔ نامعلوم۔ اوائل ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۱۳-۸۲، ۹ × ۷، ۱۵ سطور شکستہ آمیز

بی ۶۵، یو ۳۵ سی، دہلی

شاہ عالم آفتاب تا سندر لعل طرب

حکایات

حکایت سوداگر

۱۰۱۔ مصنف۔ مرزا محمد اسمٰعیل

کاتب۔ نامعلوم، ۱۹ویں صدی

اوراق ۴۹-۱، ۸ ۴/۱ × ۵ ۴/۱، ۸ تا ۱۰ سطور نستعلیق۔

بی ۷۵/۱، پی ۲۷۸۹

نقل موش کہ پادشاہت کرد

(بہار دانش مصنف عنایت اللہ سے ماخوذ)

۱۰۲۔ مترجم۔ مرزا محمد اسمٰعیل

کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۶۴-۵۰، ۸ ۴/۱ × ۵ ۴/۱، ۸ تا ۱۰ سطور نستعلیق

بی ۷۵/۱، پی ۲۷۸۹

نقل برہمن در باب نید

(بہار دانش سے ماخوذ)

۱۰۳۔ مترجم۔ مرزا محمد اسماعیل

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۲۷-۱، ۸ ۴/۱ × ۵ ۴/۱، ۸ سطور نستعلیق

بی ۷۶/۱، پی ۲۷۸۲، ۲۷۹۰

نقل زن برہمن

۱۰۴۔ مصنف۔ مرزا محمد اسماعیل

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۳۶-۲۷، ۸ ۴/۱ × ۵ ۴/۱، ۸ سطور نستعلیق

بی ۷۶/۲، پی ۲۷۸۲، ۲۷۹۰

حکایت بادشاہ

۱۰۵۔ مصنف۔ مرزا محمد اسماعیل

کاتب۔ نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۷۰-۳۷، ۸ ۴/۱ × ۵ ۴/۱، ۸ سطور نستعلیق

بی ۷۶/۳، پی ۲۷۸۲، ۲۷۹۰

شہزادہ بنگال کے عشق کی کہانی

حکایت دکشتی و بادشاہ دکن

۱۰۶۔ مصنف۔ مرزا محمد اسماعیل

کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۲۹-۸۸، ۸ ۴/۱ × ۵ ۴/۱، ۸ سطور نستعلیق

بی ۷۶/۴، پی ۲۷۸۲، ۲۷۹۰

www.taemeernews.com

ترجمہ چڑیل اور بادشاہ دکن کی کہانی

ہشت گلشت ترجمہ ہشت گلگشت

مصنف شاہ حسین حقیقت

۱۰۷ــ مترجم غلام احمد دہلوی
تاریخ ترجمہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء)
کاتب ۔ پنڈت جے کشن ۔ ناگپور ۔ ۱۱ دسمبر ۱۸۲۱ء
اوراق ۱۴۱، ۹¼ × ۶، ۹ سطور نستعلیق
بی ۸۱، پی ۶۹۸۶

قصہ رنگین گفتار

۱۰۸ــ مصنف عظمت اللہ نیاز
تاریخ تصنیف ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء)
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۔ ۱۰۵ ـ ۱۵۱، ۱۱ × ۶¾، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۸۲، یو ۱۴ بی، دہلی
لنکا کے شہزادے ہمایوں بخت اور مہر چہرہ دختر دلارام کے عشق کی داستان۔

قصہ گل وہرمز

۱۰۹ــ مصنف نامعلوم
کاتب ۔ نامعلوم ۔ اوائل ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۱۸، ۸¾ × ۶½، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۸۳، پی ۲۷۲۳
روم کے شہزادہ ہرمز اور خوزان کی شہزادی گل کے عشق کی داستان

قصہ انار دانی

۱۱۰ــ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۶۷ ـ ۹۰، ۸½ × ۶، ۹ تا ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۸۴/۱، پی ۲۶۲۴
شہزادی انار کے عشق کی داستان

قصہ بندگان عالی

۱۱۱ــ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
بی ۸۴/۲، پی ۲۶۲۴
اوراق ۹۱ ـ ۱۱۴، ۸½ × ۶، ۹ تا ۱۲ سطور نستعلیق
خلیفہ ہارون الرشید کی ایک بڑھیا کی لڑکی سے شادی کا قصہ

مجموعۂ حکایات

۱۱۲ــ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۹، ۸¾ × ۵¼، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۸۵، پی ۲۷۱۷
۱ ـ خراسان کے شہزادے فیروز اور وزیر زادے کی حکایت ۲ ـ شکاری اور کبوتروں کی نقل۔ ۳ ـ بلبلان کی نقل اور عشق اُن کا گُل پر اور کہانی احمقی کوے کی۔ ۴ ـ ایک چور کی داستان جو ایک عورت پر عاشق ہوا اور اس کی فرمائش کے مطابق بادشاہ کی شال چُرا لایا۔ ۵ ـ عرب کے چوران کی کہانی ۶ ـ پہلوان اور اس کے سفر کی کہانی ۷ ـ ایک عارف صاحب کمال کا ذکر جو شیر پہ سوار تھا ۸ ـ بادشاہ کی داستان جس نے ایک بادشاہزادی کو جنگل سے لا کر اپنی شادی کی۔

۹ ۔ نورجہاں اور ایک بادشاہ کے اس پر عاشق
ہونے کی داستان ۱۰ ۔ بہار دانش کی داستان
۱۱ ۔ ایک سوداگر اور باوفا کتے کی کہانی ۱۲ ۔ ایک
منجم اور فقیر اور ایک کتے کی کہانی ۱۳ ۔ ایک
بادشاہ منجم اور تجیبے حکمت فلاطون کی داستان۔

انوار سہیلی

(کلیلہ دمنہ)

۱۱۳ ۔ ملا حسین ابن علی الواعظ الکاشفی کی فارسی انوار سہیلی
کا ترجمہ۔
مترجم نامعلوم
کاتب صدر الدین ۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۳۲۶ ، ۸ ۱/۲ × ۵ ۱/۲ ، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۸۶ ، یو ۴۲
دیباچہ و پہلے چار باب ۔ ناقص الآخر

ایضاً

۱۱۴ ۔ کاتب نامعلوم ، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۱۹ ، ۱۱ × ۷ ۱/۲ ، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۸۷ ، پی ۱۵۴۲
دوسرے باب کی آٹھویں حکایت تک ۔ اس میں
ملا حسین کی فارسی تمہید شامل نہیں ۔

ایضاً

۱۱۴ ۔ کاتب نامعلوم ، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۱۹ ، ۱۱ × ۷ ۱/۲ ، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۸۷ ، پی ۱۵۴۲
دوسرے باب کی آٹھویں حکایت تک ۔ اس
میں ملا حسین کی فارسی تمہید شامل نہیں ۔

ایضاً

۱۱۵ ۔ کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۷۵ ، ۱۱ × ۷ ۳/۴ ، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۸۸ ، پی ۱۵۳۶
ناقص الاول ۔ پہلے چار باب

ایضاً

۱۱۶ ۔ کاتب نامعلوم ، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۰۲ ، ۹ ۱/۲ × ۵ ۳/۴ ، ۱۳ تا ۱۷ سطور
نستعلیق
بی ۸۹ ، پی ۲۰۷۶
پہلے باب (نامکمل) تک

ایضاً

۱۱۷ ۔ کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۵۰ ، ۱۱ ۱/۲ × ۶ ۱/۲ ، سطور نستعلیق
بی ۹۰ ، یو ۴۳
صرف پہلے دو باب

ایضاً

۱۱۸ ۔ کاتب نامعلوم ، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۸ ، ۱۰ ۳/۴ × ۷ ۳/۴ ، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۹۱ ، پی ۱۸۹۹
صرف دیباچے کا کچھ حصہ

گریہ نامہ [1]

۱۱۹ ۔ مصنف ۔ سید غلام علی دہلوی
کاتب عبدالکریم ، ۲۵ محرم ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء)
اوراق ۹-۱ ، ۶ ۱/۴ × ۹ ، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۹۳/۱ ، یو ۴۵ ، دہلی

[1] اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں بھی ہے

www.taemeernews.com

ماخوذ از انوار سہیلی

مجموعہ حکایات

۱۲۰ — مصنف - نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۸۰، ۹×۶، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۹۵ پی ۳۸ ۳۴۳
۱۰۸ کہانیوں کا مجموعہ

گلستاں

۱۲۱ — مصنف - سعدی شیرازی
مترجم نامعلوم
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۶۷، ۹¼×۶، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۹۶ رایل سوسائٹی

ایضاً

۱۲۲ — مترجم نامعلوم
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۰۹، ۸½×۶، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۹۷، پی ۶۷ ۲۷

باغ و بہار

۱۲۳ — میرامن دہلوی
مصنف قصہ چہار درویش - امیر خسرو
تاریخ ۱۲۱۵-۱۶ھ (۱۸۰۱-۰۳ء)
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۰۰، ۱۰½×۷½، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۹۸، پر ۴۷

قصہ طالب و موہنی [1]

۱۲۴ — مصنف میر سید محمد والہ
تاریخ تصنیف ۱۷۵۵ء کے بعد
کاتب نامعلوم، محمد پور - ۳ رجمادی الآخر ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۸ء)
اوراق ۱۵۶-۹۳، ۸×۵½، ۹ سطور شکستہ آمیز
بی ۹۹، پی ۲۷ ۲۷ سی
آخر میں خالق باری کا کچھ حصہ، جعفر زٹلی کا ایک خط اور کچھ اشعار درج ہیں۔

مثنویات

وہ مثنویات و قصاید جن کا تعلق اسلام سے ہے؛ وہ اسلامیات کے تحت درج ہیں۔

قصہ فیروز شاہ [2]

۱۲۵ — مصنف عاجز

---

[1] طالب و موہنی منظوم داستان ہے اس کا سال تصنیف ۱۷۵۵ء نہیں، بلکہ بعد ۱۸۰۰ء ہونا چاہیے۔ سید محمد والہ موسوی محمد باقر خراسانی مقیم حیدرآباد دکن و مدراس نے ۱۱۸۴ھ میں وفات پائی یہ سید نظام الدین احمد مصنف حدیقۃ السلاطین کے داماد تھے اور وہ عبد اللہ قطب شاہ والی گول کنڈہ متوفی ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء کے داماد تھے۔ طالب و موہنی کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں بھی ہے اور ایک نسخہ ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں ہے یہ موخرالذکر نسخہ ادارۂ مذکور کی جانب سے شایع ہو چکا ہے۔ (ا۔ص)

[2] قصہ فیروز شاہ کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ہے جو فہرست میں بادشاہزادی مصر کے نام سے درج ہے۔ (ا۔ص)

www.taemeernews.com

تاریخ تصنیف ۱۱۰۰ھ (۱۶۸۸ء)
کاتب نامعلوم - ۱۸ویں صدی
اوراق ۴۹ - ۳۸، ½۴ × ½۸، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۴۳/۲ - پی ۱۲۷۲۷ اے
ملکہ مصر کے سو سوالوں کے جوابات اور اس کے عبدالعلیم کے ساتھ شادی کرنے کا بیان

قصہ پدماوت [1]

۱۲۶ـــ مصنف غلام علی (عشرت) و (ضیاء الدین عبرت)
کاتب نامعلوم - ۱۸ویں صدی
اوراق ۷۱-۵۰، ½۴ × ½۸، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۴۳/۳، پی ۱۲۷۲۷ اے
رتن سین راجۂ چتور اور شہزادی پدماوت کے عشق کی کہانی

قصہ خاوند بیوی و ساس

۱۲۷ـــ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۸ویں صدی
اوراق برحاشیہ ۳۸-۴۳ مختلف سطور نستعلیق
بی ۴۳/۶، پی ۱۲۷۲۷ اے
خاوند بیوی اور ساس کے جھگڑے کی داستان

قصہ جھگڑالو بیوی کا

۱۲۸ـــ مصنف مخدوم
کاتب نامعلوم - ۱۸ویں صدی
اوراق - برحاشیہ ۵۸-۵۳، مختلف سطور نستعلیق
بی ۴۳/۸، پی ۱۲۷۲۷ اے

قصہ ابراہیم ادہم شاہ بلخ [2]

۱۲۹ـــ مصنف نامعلوم
کاتب شیخ اسمٰعیل ولد شیخ محمد، کولار، ۱۹ویں صدی
اوراق ۸۲-۶۳، ½۳ × ۸، ۶ × ۴، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۷۴، پی ۲۴۹۵ پی

قصہ مینا

۱۳۰ـــ مصنف نامعلوم
کاتب غلام حیدر - ۱۸ویں صدی
اوراق ۹۲-۷۲، ۵ × ۸، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۷۷، پی ۲۷۲۷ بی
ایک وفادار بیوی اور ایک بادشاہ کی کہانی

ایضاً

۱۳۱ـــ کاتب حسن محمد فاروقی ساکن بیجاپور، بنگلور، ۷ ربیع الآخر ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء)
اوراق ۲۳، ½۴ × ½۸، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۷۸، پی ۵۱۵ ڈی - ٹیپو

قصہ بہلول صادق

۱۳۲ـــ مصنف لطفی
کاتب نامعلوم، ۱۸ویں صدی

---

[1] پدماوت کا صحیح سال تصنیف ۱۲۱۱ھ ہے جو تصنیف دو شاعرے برآمد ہوتا ہے۔ اس تصنیف کے تین مخطوطے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں ہیں (ا-ص)

[2] قصہ ابراہیم ادہم کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی میں بھی ہے۔ (ا-ص)

www.taemeernews.com

اوراق ۷، ۸/۵، ۴ × ۳/۱ ۴، ۱۰ سطور نستعلیق

بی ۹، پی ۱۰۵۰ اے گیکوار

بنارس کے بہلول اور ایک ہندو حسینہ کے عشق کی داستان

قصہ سبز و رنگ

۱۳۳۔ مصنف عاشق

کاتب نامعلوم ۱۸ ویں صدی

اوراق ۱۶، ۴/۱ ۱۳ × ۴/۱ ۹، ۱۶ تا ۱۷ سطور شکستہ آمیز

بی ۹۲، یو ۴۴

گلستان کے بادشاہ بہار کے لڑکے سبز اور گلشن کے بادشاہ صبا کی لڑکی رنگ کے عشق کی داستان

قصہ ہشام و قمر

۱۳۴۔ مصنف میر محبت اللہ شاہ عرف حضرت میر صاحب ساکن رتھاسی

کاتب حبیب اللہ ولد عصمت اللہ ساکن تھاسی

تلمیذ مصنف ۔ ۱۹ ویں صدی

بی ۹۴، یو ۴۶

شام کے شہزادے ہشام اور شہزادی قمر کے عشق کی داستان

اوراق ۳۹، ۴/۳ ۹ × ۲/۱ ۶، ۱۳ سطور نستعلیق

قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال[1]

۱۳۵۔ مصنف غواصی

تاریخ تصنیف ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۸ء)

کاتب عزت اللہ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء)

اوراق ۶۲، ۲/۱ ۸ × ۶، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۹۹، پی ۹۵ ۲۴ اے

قصہ چندر بدن و مہیار[2]

۱۳۶۔ مصنف عزیز (مرزا محمد مقیم مقیمی)

تاریخ تصنیف ۱۰۳۷-۵۰ھ (۱۶۲۷-۴۰ء)

کاتب سید موسیٰ رضا علی ۔ ۲۰ رجب ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء)

اوراق ۱۵۱-۱۰۴، ۴/۱ ۸ × ۶، ۱۳ سطور نستعلیق

بی ۱۰۰، پی ۸۷ ۲۷ سی

پھولبن[3]

۱۳۷۔ مصنف ابن نشاطی

تاریخ تصنیف ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵-۵۶ء)

کاتب نامعلوم ۔ ۱۷ ویں صدی

اوراق ۱۳۳، ۴۳ تصاویر، ۱۳ × ۴/۱ ۸، ۱۱ سطور نسخ

بی ۱۰۳، پی ۱۴، ٹیپو

مثنوی کے اختتام پر ابن جعفر محمد حیدر ولد محمد جعفر کا اضافہ ہے جس میں ثمن بر کی شادی کے حالات و رسومات کا ذکر درج ہے ۔ یہ اضافہ جس میں تقریباً ۱۳۰ اشعار ہیں ۔ کریم خان ابن محسن خان کی فرمائش پر کیا گیا تھا ۔

پھولبن

۱۳۸۔ مصنف ابن نشاطی

---

[1] سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے اور اس کے ۸ مخطوطے انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے کی زینت ہیں (ا ۔ ص)

[2] چندر بدن و مہیار کے چار مخطوطے انجمن ترقی اردو کراچی میں ہیں (ا ۔ ص)

[3] مثنوی پھولبن انجمن ترقی اردو کی جانب سے شایع ہو چکی ہے ۔ اس کے ۶ مخطوطے انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص میں ہیں ۔ (ا ۔ ص)

www.taemeernews.com

کاتب حاجی محمد رضا ولد مراد بیگ ولد محمد کریم
مازندرانی - حیدرآباد ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء)
اوراق ۵۷، ۹ ۳/۴ × ۵، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱/۱۲۲، پی ۱۳۳۳، ٹیپو

گلشن عشق [1]

۱۳۹- مصنف محمد نصرت نصرتی
تاریخ تصنیف ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷-۵۸ء)
کاتب غلام قادر، ۱۳ شوال ۱۱۹۹ھ (۱۷۵۵ء)
اوراق ۱۵۵، ۹ ۱/۲ × ۶، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۰۴، پی ۲۶۲۱

ایضاً

۱۴۰- کاتب غلام صفدر، ۳ شعبان ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۶ء)
اوراق ۱۵۴، ۸ × ۴ ۱/۲، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۰۵، پی ۳۰۴۰

ایضاً

۱۴۱- کاتب شیخ میراں انصاری، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۳۳۶-۲۰۱، ۸ ۱/۴ × ۵ ۳/۴، ۱۷ سطور، نسخ
بی ۱۰۶، پی ۲۴۸۷ اے

ایضاً

۱۴۲- کاتب نامعلوم، اوائل ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۵۴، ۱۰ ۱/۴ × ۶ ۱/۲، ۱۳ سطور، نسخ
بی ۱۰۷، پی ۱۴۳۴

ناقص الاخر واول

قصہ لعل وگوہر [2]

۱۴۳- مصنف عاجز
کاتب ہردے نرائن، حیدرآباد، ۱۱۲۹ھ (۱۷۱۷ء)
اوراق ۳۰، ۴۴ تصاویر، ۹ ۱/۲ × ۵ ۱/۴، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۱۰، یو ۸۴

ایضاً

۱۴۴- کاتب نامعلوم آخری چار اوراق کسی اور کاتب کے ہیں - ۱۸ ویں صدی
اوراق ۹۷-۳، ۸ × ۵ ۳/۴، ۱۱ تا ۱۲ سطور نستعلیق
بی ۱۱۱، پی ۲۴۹۵ سی

مثنوی قطب مشتری [3]

۱۴۵- مصنف (وجہی)
کاتب - حاجی محمد رضا، حیدرآباد ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء)
اوراق ۱۲۱-۵۸، ۹ ۳/۴ × ۵، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۲/۱۲۲، پی ۱۳۳۳، ٹیپو
گول کنڈہ کے شہزادے محمد قلی اور بنگال کی شہزادی مشتری کے عشق کی داستان

قصہ کامروپ وکلا کام [4]

۱۴۶- مصنف تحسین الدین

---

[1] گلشن عشق بابائے اردو کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شایع ہو چکی ہے۔ (ا-ص)
[2] مثنوی لال وگوہر کے مصنف کا نام عارف الدین خاں ہے وہ اورنگ آباد کے باشندے تھے اور عاجز تخلص کرتے تھے ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں فوت ہوئے شفیق نے چمنستان شعرا میں اس کی مثنوی کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ (ا-ص)
[3] مثنوی قطب مشتری انجمن کی طرف سے شایع ہو چکی ہے (ا-ص)
[4] مثنوی کا نام ہے "قصہ کامروپ وکلا" جسے گارساں دتاسی نے فرانسیسی ترجمہ مع اردو متن کے پیرس کے پادشاہی چھاپہ خانہ سے ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء سے شایع کیا۔ اس مثنوی سے متعلق تفصیلی مضمون کے لیے دیکھیے: "دو گارساں دتاسی کی مرتب کردہ - ایک قدیم دکنی مثنوی" - از ضمیر نیازی مشمولہ نیا دور (کراچی) شمارہ نمبر ۶۹-۷۰ ص ۲۶۵ تا ۲۸۱

www.taemeernews.com

تاریخ تصنیف ۔ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء)

کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۶۵۔۱۱، ۸½ × ۵، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۱۲۶، پی ۱۲۴۳ بی

ایضاً

۱۴۷۔ کاتب امین اللہ ولد شیخ نعیم الدین ولد شیخ محمد صالح ساکن قلعہ مدراس، ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء)

اوراق ۳۸، ۹½ × ۶½، ۱۴ سطور ۔ نستعلیق و شکستہ

بی ۱۲۷، پی ۳۱۲۹

نو طرز مرصع

۱۴۸۔ مصنف محمد حسین عطا خان تحسین ولد میر باقر خان شوق

تاریخ تصنیف ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء)

کاتب نامعلوم ۔ ۷ رمضان ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء)

اوراق ۱۳۲، ۷½ × ۴½، ۱۳ سطور ۔ نستعلیق و شکستہ ۔ کرم خوردہ

بی ۱۲۹، یو ۵۲، دہلی

ترجمہ قصہ چہار درویش ۔ مصنف امیر خسرو

ایضاً

۱۴۹۔ کاتب منشی میر محمد باقر، ۱۹ویں صدی

اوراق ۶۱، ۸¾ × ۶، ۱۲ تا ۱۳ سطور نستعلیق

بی ۱۳۰، یو ۵۳، دہلی

پہلے درویش کی کہانی تک مع اضافہ قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ

ایضاً

۱۵۰۔ کاتب محمد بخش خاں ۔ لکھنؤ، ۱۹ویں صدی

اوراق ۴۶، ۹ × ۵، ۱۷، ۱۵ سطور نستعلیق و شکستہ

بی ۱۳۱، پی ۱۰۳۶

صرف پہلے درویش کی کہانی ہے

ایضاً

۱۵۱۔ کاتب بختاور سنگھ کایستھ، ۲۹ محرم ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۹۰۔۰۰، ۷¾ × ۴¾، ۱۵ سطور شکستہ

بی ۱۳۲/۱، یو ۵۴، دہلی

مروارید

۱۵۲۔ مصنف مرزا محمد ہادی غافل

کاتب بختاور سنگھ کایستھ، ۲۹ محرم ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۱۷۴۔۷۱، ۷¾ × ۴¾، ۱۵ سطور شکستہ

بی ۱۳۲/۲، یو ۵۴ ۔ دہلی

قصہ چہار درویش امیر خسرو کا ترجمہ ۔ دوسرے اور تیسرے درویش کی کہانی ۷۰ ۔ ۹۰ اوراق پر تحسین کی نو طرز مرصع کا دیباچہ اور پہلے درویش کی کہانی دی ہوئی ہے۔

خواب و خیال

۱۵۳۔ مصنف سید محمد میر اثر

کاتب محمد حسین، دہلی، ۱۱ ربیع الاول ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۴۶، ۱۱½ × ۷½، نامعین سطور ۔ شکستہ آمیز

بی ۱۴۰، یو ۵۹، دہلی

مثنوی میر اثر

۱۵۴۔ مصنف سید محمد میر اثر

کاتب نامعلوم ۔ جے پور، ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۵۰۔۷۵، ۱۱ × ۶¾، ۱۴ سطور نستعلیق

تلخ: تحسین کی نو طرز مرصع اردو ادب کی ابتدائی نثری داستانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اسے حکایات کے تحت شامل ہونا چاہیے تھا لیکن غلطی سے مثنویات کے سیکشن میں شامل ہوگئی ہے۔ (صبا)

www.taemeernews.com

بی ۳/۲۲۵، یو ۱۴۱ اے، دہلی

مثنوی میر حسن یا سحر البیان یا قصہ بدر منیر

۱۵۵۔ مصنف میر غلام حسن حسن ولد میر غلام حسین ضاحک
تاریخ تصنیف ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء)
اوراق ۱۰۲، ۹ × ۵½، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۴۱، یو ۶۰

ایضاً

۱۵۶۔ کاتب سید رضا حسن، ۱۵ ذی القعدہ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء)
اوراق ۸۷، ۱۱ × ۷، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۴۲، یو ۶۱، دہلی

ایضاً

۱۵۷۔ کاتب نامعلوم جے پور۔ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۳ء)
اوراق ۴۰-۱۰۱، ۱۱ × ۶¾، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۱/۲۲۵، یو ۱۰ اے۔ دہلی

مدلل شمع و پروانہ

۱۵۸۔ مصنف نامعلوم
کاتب نصر اللہ، ۲۴ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء)
اوراق ۴۴، ۹½ × ۶½، ۱۳ تا ۱۶ سطور نستعلیق
بی ۱۶۶، یو ۷۱، دہلی
چتوڑ کے راجہ رتن سین اور لنکا کی شہزادی پدماوت کے عشق کی منظوم کہانی۔ ناقص الآخر

شاہنامہ یا قصہ خسروان عجم[1]

۱۵۹۔ مترجم مول چند منشی
تاریخ ترجمہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء)
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۳۵۷، ۹½ × ۶، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۷۱، پی ۳۱۲۸
توکل بیگ کے فارسی نثر میں خلاصے کا منظوم اردو ترجمہ

قصۂ شادی افیونی

۱۶۰۔ مصنف بھجو بیگ اکبر دہلوی
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۲۱-۳۸، ۸½ × ۶، ۱۳ سطور۔ نسخ
بی ۸/۲۲۲، یو ۱۱۶ اے۔ دہلی

مثنوی مصحفی در جواب میر تقی[2]

۱۶۱۔ مصنف شیخ غلام ہمدانی مصحفی
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۵-۵۲، ۸½ × ۵½، غیر معین سطور نستعلیق
بی ۲/۲۲۶، یو ۳۵ بی، دہلی

دواوین

دیوان عزلت[3]

۱۶۲۔ مصنف سید عبد الولی عزلت ولد سید سعد اللہ

---

[1] فردوسی کے شاہنامہ سے ماخوذ (ا-ص)

[2] اس مثنوی کا نام بحر المحبت ہے اور یہ مولوی عبد الماجد بی اے دریابادی کے مبسوط مقدمے کے ساتھ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں شایع ہو چکی ہے۔ (ا-ص)

[3] دیوان عزلت کو عبد الرزاق قریشی نے مرتب کیا ہے اور ہندوستان میں شایع ہو چکا ہے۔ (ا-ص)

www.taemeernews.com

ساکن سورت
کاتب سید عبدالنبی؟ ۱۱۷۳ھ؟ (۱۷۵۹ء؟)
اوراق ۷۷-۴۵، ۸½×۴½، ۵½×۵، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۰۲، پی ۲۳۸۰ ڈی

دیوان ولی

۱۶۳ - مصنف شاہ ولی اللہ دکنی
کاتب حفیظ اللہ، ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۳۶ھ
(۱۷۲۳ء)
اوراق ۱۱۰، ۹½×۴½، ۵½×۴، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۳، پی ۳۱۲۷
رباعیات، مستزاد، مثنویات، ترجیع، مخمسات،
قصائد وغیرہ

ایضاً

۱۶۴ - کاتب محمد نورالدین، ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۵۵ھ
(۱۷۴۲ء)
اوراق ۲۱۲، ۷½×۴، ۴½×۴، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۱۱۴، پی ۹۳۱
غزلیات، رباعیات، قصاید، مثنویات وغیرہ

ایضاً

۱۶۵ - کاتب محمد تقی ولد سید ابوالمعانی ۲۱ ذیقعدہ
۱۱۵۶ھ (۱۷۴۴ء)
اوراق ۱۳۴، ۸½×۴½، ۴¾×۴، ۱۵ سطور شکستہ آمیز
بی ۱۱۵، پی ۶۸ - گیکوار
غزلیات اور دوسری نظمیں

ایضاً

۱۶۶ - کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۱۶، ۸×۵، ۱۳ تا ۱۷ سطور، نستعلیق،
کرم خوردہ
بی ۱۱۶، پی ۲۲۴۸
مع اضافہ ترجیع بند

ایضاً

۱۶۷ کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۰۶، ۹½×۴½، ۵½×۴، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۱۷، یو ۴۹، دہلی

ایضاً

۱۶۸ - کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۸۵، ۸¾×۴، ۶×۴، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۱۸، پی ۲۴۸۳ سی
غزلیات، ۲ مستزاد، مخمسات

ایضاً

۱۶۹ - کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۰۷، ۹½×۴، ۶×۴، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۱۱۹، پی ۲۷۳۷
غزلیات - ناقص الاول و آخر

ایضاً

۱۷۰ - کاتب نامعلوم، سورت، ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۳ء)
اوراق ۴۲، ۱۲×۷، ۷×۱۲، ۲۱ سطور نستعلیق
بی ۱۲۰، رائل سوسائٹی
غزلیات

دیوان آصف

۱۷۱ - مصنف نواب آصف الدولہ آصف ولد نواب
شجاع الدولہ
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۴۲، ۱۰×۴½، ۵ تا ۶ سطور نستعلیق

www.taemeernews.com

بی ۱۲۳ ، پی ۳۵

دیوانِ سجاد

۱۷۲۔ مصنف حکیم میر محمد سجاد ولد میر محمد اعظم
کاتب نامعلوم ، ۱۸ویں صدی
اوراق ۳۹ ، ۱۱×۷½ ، ۶½×۴ ، ۱۹ سطور ، نستعلیق
کرم خوردہ
بی ۱۲۴ ، یو ۵۰ ، دہلی

دیوان یقین [1]

۱۷۳۔ مصنف انعام اللہ خان یقین ولد اظہرالدین خاں
کاتب عبدالرزاق خان ، ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء)
اوراق ۲۹ ، ۸½×۱۰ ، ۴½×۶ ، ۱۷ سطور ، نسخ
بی ۱۲۵ ، پی ۲۱۴۶

کلیات زٹلی

۱۷۴۔ مصنف میر جعفر زٹلی
کاتب نامعلوم ، ۱۸ویں صدی
اوراق ۴۲ ، ۷½×۴ ، ۵½×۲ ، ۱۲ سطور ـ
نستعلیق ـ کرم خوردہ
بی ۱۲۳ ، یو ۵۵ ـ دہلی
فالنامہ ، قصائد ، غزلیات ، مثنویات ، رباعیات

ایضاً

۱۷۵۔ کاتب نامعلوم ، ۱۸ویں صدی
اوراق ۴۷ ـ ۸×۴¾ ، ۵½×۲ ، ۱۵ سطور ـ
شکستہ آمیز ـ آخری سات اوراق کرم خوردہ

بی ۱۳۴ ـ پی ۲۴۴۶

ایضاً

۱۷۶۔ کاتب شجاعت علی حسینی ساکن بردھوان برائے
قربان علی ۱۰ ذوالقعدہ ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۴ء)
اوراق ۱۶۳ ، ۸½×۴½ ، ۵×۲¾ ، ۸ تا ۹ سطور نستعلیق
بی ۱۳۵ ، یو ۵۶

ایضاً

۱۷۷۔ کاتب برادر کاشی ناتھ ـ دہلی ، ۲ مارچ ۱۸۴۳ء
اوراق ۳۹ ، ۸×۶ ، ۱۱ سطور ، نستعلیق
بی ۱۳۶ ، یو ۵۷ ، دہلی
مع فال نامہ

عرض داشت در مضمون میوہ جات

۱۷۸۔ مصنف میر جعفر زٹلی
کاتب نامعلوم ، ۱۹ویں صدی
اوراق ۴۳ ـ ۱۰ ـ ۴ ـ ۸¼ × ۶ ، ۱۳ سطور نسخ
بی ۹/۲۲۲ ، یو ۱۱۱۷ ، دہلی
فارسی

دیوان اجدی

۱۷۹۔ تصنیف میر محمد اسماعیل خان ابجدی
تاریخ تصنیف ، ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء)
کاتب نامعلوم ، ۱۵ محرم ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء)
اوراق ۳۲ ، ۹½×۴ ، ۵¾ ، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۳۷ ، پی ۲۵۱۲

دیوان درد

۱۸۰۔ مصنف خواجہ میر درد

---

[1] دیوان یقین انجمن ترقی اردو دہلی کی جانب سے شایع ہو چکا ہے (ا ـ ص)

www.taemeernews.com

کاتب محمد عطاء اللہ خاں، الگنوہ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء)
اوراق ۴۲، ۸×۵، ۱۴ سطور، شکستہ آمیز
بی ۱۳۸، یو ۳۵ اے، دہلی

ایضاً

۱۸۱ — کاتب نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۶۲، ۴/۱ ۱۱×۷، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۳۹، یو ۵۸، دہلی

دیوان قایم [۱]

۱۸۲ — مصنف محمد قیام الدین قایم
تاریخ تصنیف ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء)
کاتب مصنف (۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء)
اوراق ۲۰۰، ۴/۱ ۹×۶، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۱۴۳، یو ۶۲، دہلی
مع رمز الصلوٰۃ و حیرت افزا

دیوان سوز

۱۸۳ — مصنف سید محمد میر سوز
کاتب نامعلوم، ۱۴ رجمادی الثانی ۱۲۱۶ھ
(۱۸۰۱ء)
بی ۱۴۴، پی ۲۸۶۲، فورٹ ولیم کالج

کلیاتِ سودا

۱۸۴ — مصنف مرزا محمد رفیع سودا
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۳۷۰، ۴/۳ ۱۱×۴/۳ ۶، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۱۴۶، پی ۲۵۳
شبیہہ مصنف برسرورق

کلیات سودا

۱۸۵ — کاتب میر مقبول نبی ولد انعام اللہ خان یقین، دہلی،
۱۱ رجمادی الاول ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء)
اوراق ۴۷۷، ۴/۱ ۱۰×۶، ۱۷ سطور، نستعلیق، کرم خوردہ
بی ۱۴۷، یو ۶۳، دہلی
مراثی، سلام، قصاید، مثنویات، غزلیات وغیرہ

ایضاً

۱۸۶ — کاتب محمد امین بیگ، ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء)
اوراق ۳۷۱، ۲/۱ ۱۳×۴/۳ ۸، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۴۸، پی ۲۴۰۵
غزلیات فارسی، اردو، قصاید، مثنویات وغیرہ

ایضاً

۱۸۷ — کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۳۴۹، ۲/۱ ۱۴×۹، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۴۹، پی ۲۶۴۶
مہر سید غلام رضا رضوی ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء)

ایضاً

۱۸۸ — کاتب شیخ طیب اللہ برائے ٹیلر صاحب
(J. W. Taylor)
۲ جنوری ۱۸۱۷ء
اوراق ۵۷۳، ۲/۱ ۱۴ × ۲/۱ ۹، ۱۷ سطور،
نستعلیق
بی ۱۵۰، پی ۲۱۱۹، فورٹ ولیم کالج

---

[۱] یہ دیوان مجلس ترقی ادب لاہور نے شایع کردیا ہے (ا - ص)

www.taemeernews.com

ایضاً

۱۸۹ــ کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۲۹۵، ۱/۲ ۱۲ × ۱/۲ ۸، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۵۱، یو ۶۴

دیوان ریختہ۔ دیوان قصدیات عاقب نمبر۔
دیوان فارسی۔ دیوان در بیان تاریخ وقطعہا۔
دیوان ہجویات۔ دیوان مخمسات۔ دربیان عشق۔

ایضاً

۱۹۰ــ مولف میر منشی محمد عبدالقادر خان ہمت
کاتب ـ مولف ـ ۱۸۴۴ء
اوراق ۳۲۶ (دو حصوں میں) ۱۳ × ۸،
۱۷ سطور، نستعلیق
بی ۱۵۲، پی ۲۳۵۲ ـ ۲۳۵۳
گلدستہ بند۔

ایضاً

۱۹۱ــ کاتب نامعلوم ـ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۹۱، ۱/۲ ۱۲ × ۸، ۱۷ سطور، نستعلیق
بی ۱۵۳، یو ۶۵

ایضاً

۱۹۲ــ کاتب نامعلوم ـ اوائل ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۸۴، ۸ × ۱/۲ ۵، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۵۴، پی ۲۳۹۶
آخر میں ایک فارسی نظم، نسخہ جات حکمت اور
خضاب بنانے کی ترکیب درج ہے۔

ایضاً

۱۹۳ــ کاتب حسن علی، اوائل ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۸۶، ۹ × ۳/۴ ۵، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۵۵، پی ۲۱۸۱، فورٹ ولیم کالج

دیوان بیدار

۱۹۴ــ مصنف میر محمد علی بیدار عرف میر محمدی یا شاہ بیدار
کاتب اوحیدالدین برائے مصنف، بدایوں ۷ رجب
۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء)
اوراق ۹۷، ۹ × ۱/۲ ۵، ۱۳ سطور نستعلیق، کرم خوردہ
بی ۱۵۶، یو ۶۶، دہلی

ایضاً

۱۹۵ــ کاتب نامعلوم ـ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۴۶، ۱/۲ ۱۰ × ۸، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۵۷، یو ۶۷، دہلی
مع دیوان فارسی

دیوان افسوس

۱۹۶ــ مصنف میر شیر علی افسوس
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۳۰۵، ۹ × ۶، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۵۹، پی ۲۵۷۵
غزلیات، سلام، مثنوی بہار سخن۔ رباعیات وغیرہ

دیوان زادہ حاتم

۱۹۷ــ مصنف شیخ ظہورالدین حاتم ولد فتح الدین دہلوی
کاتب ـ مصنف، ۱۸ویں صدی
اوراق ۷۸، ۱/۲ ۸ × ۵، ۱۵ سطور۔ نستعلیق،
کرم خوردہ
بی ۱۶۰، یو ۶۸، دہلی

دیوان محبت

۱۹۸ــ مصنف نواب محبت خاں محبت ولد حافظ رحمت خاں

www.taemeernews.com

کاتب بخش اللہ، ۱۲ر شعبان ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء)
اوراق ۱۵۵، ۹½ × ۵، ۱۰ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۱، پی ۱۶۹۶، جانسن

ایضاً

۱۹۹- کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۴۴، ۹ × ۵¾، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۲، پی ۲۱۹۵، فورٹ ولیم کالج

دیوان جرأت [1]

۲۰۰- مصنف شیخ قلندر بخش جرأت (یحییٰ امان)
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۲۹۷، ۱۲ × ۸½، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۳، یو ۶۹، دہلی

دیوان میر

۲۰۱- مصنف میر محمد تقی میر
کاتب احمد علی خان، ۱۳ر محرم ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء)
اوراق ۲۲۰، ۶ × ۸، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۴، یو ۷۰، دہلی
دیوان اول مع چند قصاید و رباعیات۔

وفات نامہ پیغمبر
مصنف میر محمد تقی میر (دیکھیے سلسلہ ۵۳)

مثنوی دریائے عشق

۲۰۲- مصنف میر محمد تقی میر
کاتب نصر اللہ، ۲۴ر ربیع الاول ۱۲۴۴ھ
(۱۸۲۸ء)
اوراق ۴۳-۶۵، ۹¼ × ۶¾، ۱۳ تا ۱۶ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۶/۲، یو ۱۷، دہلی

ایضاً

۲۰۳- کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۲-۴، ۹ × ۵، ۶¼، ۱۴ سطور، نستعلیق
بی ۹۳/۶، یو ۴۵، دہلی

ایضاً

۲۰۴- کاتب سید مراد علی، ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء)
اوراق ۳۸-۲۹، ۸¼ × ۶، ۱۳، نستعلیق
بی ۲۲۲/۷، یو ۱۱۶ اے، دہلی
مثنوی گلزار ارم

ایضاً

۲۰۵- کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۰-۵۹، ۸½ × ۳¼، ۱۲، ۱۴ سطور، نستعلیق
بی ۶۶/۱۴، یو ۳۶، دہلی

ایضاً (دریائے عشق از میر)

۲۰۶- کاتب جے پور، ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۳ء)
بی ۲۲۵/۲، یو ۱۴۱ اے، دہلی

ایضاً

۲۰۷- کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۵۲-۴۳، ۸½ × ۵½، غیر معین سطور، نستعلیق
بی ۲۲۶/۱، یو ۳۵ بی، دہلی

شعلۂ عشق

۲۰۸- مصنف میر محمد تقی میر

---

[1] جرأت کا کلیات ڈاکٹر اقتدا حسن نے مرتب کیا ہے اور اٹلی سے شائع ہو چکا ہے (ا۔ص)

www.taemeernews.com

کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۷۴-۶۶، ۸½×۵½، غیر معین سطور
نستعلیق
بی ۲۲۶/۳، یو ۳۵ بی، دہلی

اعجاز عشق

۲۰۹- مصنف میر محمد تقی میر
کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۸۱-۷۴، ۸½×۵½، غیر معین سطور
نستعلیق
بی ۲۲۶/۴، یو ۳۵ بی، دہلی

انتخاب دیوان جہاں دار شاہ[1]

۲۱۰- مصنف مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ ولد شاہ عالم
کاتب محمد علی مشہدی، ۱۹ویں صدی
اوراق ۸۶، ۹×۵½، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۷، پی ۵۸
مثنوی، فارسی اور اردو غزلیں اور متفرقہ نظمیں

بکٹ کہانی

۲۱۱- مصنف گوپال (گوپال افضل)[2]
کاتب نامعلوم، اواخر ۱۸ویں صدی
اوراق ۲۰، ۷×۴¾، ۱۱ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۹، پی ۱۲۴۴

بارہ ماسہ کی شکل میں ہے

ایضاً

۲۱۲- کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۰، ۸¼×۵، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۰، پی ۱۲۴۳
ترمیم و اضافے کے ساتھ

ایضاً

۲۱۳- کاتب عبدالکریم، ۲۵ شعبان ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء)
اوراق ۹۵-۸۶، ۹×۴½، ۱۴ سطور، نستعلیق
بی ۹/۹۳، یو ۴۵، دہلی

دیوان ترقی

۲۱۴- مصنف مرزا محمد تقی خان ترقی ولد سید محمد امین خان (نیشاپوری)
کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۰۵، ۲½×۴، ۸½، مختلف سطور، نستعلیق
بی ۱۶۲، یو ۴۲، دہلی

دیوان احسان

۲۱۵- مصنف حافظ عبدالرحمٰن خان احسان ولد حافظ غلام رسول خان
کاتب نامعلوم، ۱ جمادی الثانی ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء)
اوراق ۱۳۲، ۳½×۱۱½، ۷½، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۶۳، یو ۴۳

دیوان عشق

---

[1] جہاں دار شاہ کا مختصر دیوان ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کیا ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور سے شایع ہو چکا ہے (ا۔ص)
[2] اس کے مصنف محمد افضل جھنجھانوی ہیں انھوں نے خود کو گوپال بھی کہا ہے، بکٹ کا سال تصنیف قبل از ۱۱۳۵ھ ہے (ا۔ص)

www.taemeernews.com

۲۱۶۔ مصنف حکیم میر عزت اللہ خان عشق ولد حکیم میر قدرت اللہ خان قاسم
کاتب میر ثناء اللہ، دادری، ۵ ذی القعدہ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء)
اوراق ۲۰۷، ۱۱×۷، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۱۷۴، یو ۷۴، دہلی

دیوان عیش

۲۱۷۔ مصنف حکیم آغا جان دہلوی
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۱۴، ۱۱½×۷½، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۷۵، یو ۷۵، دہلی

کلیات انشا

۲۱۸۔ مصنف میر انشاء اللہ خان انشا
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۳۸۸، ۱۲½×۹، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۷۶، یو ۷۶، دہلی
مع فارسی غزلیات، مثنویات، شرح مائۃ عامل، قصائد فارسی اردو، ترکی و چیستان، دیوان بے نقط، مثنوی بے نقط، شکار نامہ، مرغ نامہ، دیوان، ریختی، طلسمات وغیرہ

کلیات ممنون

۲۱۹۔ مصنف میر نظام الدین ممنون (خلف میر قمر الدین منت)
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۳۷۹، ۱۱½×۷½، ۱۵ تا ۱۶ سطور نستعلیق
بی ۱۷۷، یو ۷۷، دہلی

آدمی کی زندگی کا انتظام

The Economy of Human Life

۲۲۰۔ مصنف رابرٹ ڈوڈسلے

Robert Dodesley

مترجم ڈبلیو۔ آر۔ پوگسن

W. R. Pogson — مولوی سید کریم حسین

کاتب ڈبلیو۔ آر۔ پوگسن، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۲۵، ۱۱½×۷½، ۱۵ سطور، نسخ و نستعلیق
بی ۱۷۸، پی ۳۴۲۲
اردو فارسی و عربی منظوم ترجمہ

دیوان ریختہ

۲۲۱۔ مصنف سعادت یار خاں رنگین
تاریخ تصنیف ۔ باندہ، ۹ ربیع الثانی ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
اوراق ۱۰۹، ۹×۶، ۱۴ سطور نستعلیق، کرم خوردہ
بی ۱۷۹، یو ۷۸، دہلی
دیوان اول

دیوان بیختہ

۲۲۲۔ مصنف ایضاً
تاریخ تصنیف ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰–۱۸۰۱ء)
کاتب :۔ مصنف باندہ، رجب ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
بی ۱۸۰، یو ۷۹، دہلی

www.taemeernews.com

دیوان دوم

ایضاً

۲۲۳۔ کاتب محمد ولی، ۲۰ر محرم ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء)
اوراق ۹۶، ۷×۱۰، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۱۸۱، یو ۸۰، دہلی

دیوان آمیختہ

۲۲۴۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف باندہ، ۳ر جمادی الثانی
۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
اوراق ۴۳، ۹×۶، ۱۵ تا ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۸۲، یو ۸۱، دہلی
دیوان سوم

دیوان انگیختہ

۲۲۵۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف، باندہ، ۲۵ر رجب
۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
بی ۱۸۳، یو ۸۲، دہلی
دیوان چہارم

مجموعۂ رنگین

۲۲۶۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف باندہ، ۱۷ر ربیع الثانی
۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
اوراق ۴۰، ۹×۶، ۱۵ سطور نستعلیق، کرم خوردہ
بی ۱۸۴، یو ۸۳، دہلی
دیوان پنجم

مجالس رنگین

۲۲۷۔ مصنف رنگین
تاریخ تصنیف ۱۲۳۵ھ (۲۲-۱۸۱۹ء)
کاتب۔ مصنف، باندہ، ۵ر جمادی الاول
۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
اوراق ۵۳، ۹×۶، ۱۴ تا ۱۶ سطور نستعلیق، کرم خوردہ
بی ۱۸۵، یو ۸۴، دہلی
نسخہ ششم نورتن رنگین

ایضاً

۲۲۸۔ کاتب علی اصغر ولد عبدالعزیز ساکن بہتری، غازی پور، ۱۴ر دسمبر ۱۸۹۸ء
اوراق ۲۷، ۴½×۱۱ ۷½×، ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۸۶، یو ۸۵

امتحان رنگین

۲۲۹۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف، باندہ، ۱۲۴۶ھ (۳۳-۱۸۳۰ء)
اوراق ۳۴، ۹×۶، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۱۸۷، یو ۸۶، دہلی
نسخہ ہفتم نورتن رنگین

اخبار رنگین

۲۳۰۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف باندہ، ۱۹ر جمادی الاول ۱۲۴۹ھ
(۱۸۳۳ء)
اوراق ۴۰، ۹×۶، ۱۵ تا ۱۷ سطور نستعلیق
بی ۱۸۸، یو ۸۷، دہلی

www.taemeernews.com

نسخہ ہشتم نورتن رنگین

شش جہت رنگین

۲۳۱— مصنف رنگین

کاتب نامعلوم، ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء)

اوراق ۱۶۱، ۴/۳ ۱۲، ۲/۱ ۸، ۹، ۱۰ سطور، نستعلیق

بی ۱۸۹، پی ۳۱۲۵

ایجاد رنگین

۲۳۲— مصنف رنگین

کاتب نامعلوم۔ غالباً ۱۸۱۴ء

اوراق ۴۹، ۹ × ۶، ۱۳ سطور، نستعلیق

بی ۱۹۰، یو ۸۸، دہلی

نسخہ اول شش جہت رنگین

عجائب وغرائب رنگین

۲۳۳— مصنف رنگین

کاتب بانکی سنگھ، دہلی، ۱۹ ذی الحجہ اکبر شاہ ثانی (۱۸۱۴ء)

اوراق ۴۶، ۹ × ۶، ۱۲ سطور، نستعلیق

بی ۱۹۱، یو ۸۹، دہلی

نسخہ دوئم شش جہت رنگین

داستان رنگین

۲۳۴— مصنف رنگین

کاتب۔ مصنف، باندہ، ۱۲ محرم ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۱۴، ۹ × ۶، ۱۴ سطور، نستعلیق

بی ۱۹۲، یو ۹۰، دہلی

نسخہ سوئم شش جہت رنگین

چار چمن رنگین

۲۳۵— مصنف رنگین

کاتب مصنف، باندہ، ۱۹ محرم ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۴۰، ۹ × ۶، ۱۴ سطور، نستعلیق

بی ۱۹۳، یو ۹۱، دہلی

نسخہ چہارم شش جہت رنگین

پنجۂ رنگین

۲۳۶— مصنف رنگین

کاتب۔ مصنف۔ دہلی، ۹ ربیع الاول ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۳۱، ۹ × ۶، ۱۲ سطور، نستعلیق

بی ۱۹۴، یو ۹۲، دہلی

نسخہ پنجم شش جہت رنگین

نظم رنگین

۲۳۷— مصنف رنگین

تاریخ تصنیف، ۱۲۲۰ھ (۰۶-۱۸۰۵ء)

کاتب۔ مصنف۔ باندہ۔ ۲۸ صفر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۴۱، ۲/۱ ۹ × ۶، ۱۴ سطور، نستعلیق

بی ۱۹۵، یو ۹۳، دہلی

نسخہ چہارم پنجہ رنگین

داستان رنگین

۲۳۸— مصنف رنگین

www.taemeernews.com

تاریخ تصنیف: ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء)
کاتب۔ مصنف باندہ: ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء)
اوراق ۳۸، ۹ ۱/۲ × ۶، ۱۳-۱۴ سطور، نستعلیق
بی ۱۹۶، یو ۹۴، دہلی
نسخہ پنجم پنجۂ رنگین

نصاب ترکی

۲۳۹۔ مصنف رنگین
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹-۲۰ء)
کاتب ۔ مصنف۔ شاہجہاں آباد، ۱۰ محرم ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹-۳۰ء)
اوراق ۴۹-۷۴، ۸ × ۵ ۱/۲، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۱۹۶/۴، یو ۹۵، دہلی

مثنوی بہ طرز حضرت مولوی روم

۲۴۰۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف۔ باندہ، ۱۷ رجب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۷۴-۵۰، ۸ × ۵ ۱/۲، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۹۶/۳، یو ۹۵، دہلی

حکایات رنگین

۲۴۱۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف۔ باندہ، ۲۸ شوال ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۷۵-۹۸، ۸ × ۵ ۱/۲، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۹۶/۴، یو ۹۵، دہلی
نسخہ پنجم خمسہ رنگین

جنگ نامۂ رنگین

۲۴۲۔ مصنف رنگین
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء)
کاتب۔ مصنف۔ باندہ، ۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء)
اوراق ۲۳-۲، ۱۲، سطور، نستعلیق
بی ۱۹۶/۱، یو ۹۵، دہلی

نسخہ اول خمسہ رنگین

جنگ نامہ رنگین

۲۴۳۔ مصنف رنگین
کاتب مصنف۔ باندہ، ۱۰ رجب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۲۱-۴، ۸ ۱/۲ × ۵ ۱/۲، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۱۹۸، یو ۹۶، دہلی
نسخہ اول خمسۂ رنگین

حکایت رنگین

۲۴۴۔ مصنف رنگین
تاریخ تصنیف۔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء)
کاتب۔ مصنف۔ باندہ، ۴ رجب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۲۲، ۸ ۱/۴ × ۵ ۱/۲، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۱۹۹، یو ۹۷، دہلی
نسخہ دوئم خمسہ رنگین

نصاب رنگین

۲۴۵۔ مصنف رنگین
کاتب۔ مصنف۔ باندہ، ۴ رجب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۴-۲۴، ۸ ۱/۲ × ۵ ۱/۴، ۱۲ تا ۱۳ سطور، نستعلیق

www.taemeernews.com

بی ۲۰۰، یو ۹۸، دہلی

نسخہ سویم خمسہ رنگین

حکایات رنگین

۲۴۶ـــ مصنف رنگین

کاتب ـ مصنف ـ باندہ ۱۰، شوال ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۲۲؛ ۸½ × ۵½، ۹ تا ۱۳ سطور، نستعلیق

بی ۲۰۱، یو ۹۹، دہلی

نسخہ پنجم خمسہ رنگین

تصنیف رنگین

۲۴۷ـــ مصنف رنگین

کاتب ـ مصنف ـ شاہجہاں آباد ـ ۷، رجب ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء)

اوراق ۱۳، ۸½ × ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۲۰۲، یو ۱۰۰، دہلی

نسخہ اول سبع سیارۂ رنگین (نسخہ اول خمسہ رنگین)

گلدستۂ رنگین

۲۴۸ـــ مصنف رنگین

کاتب ـ مصنف ـ شاہجہاں آباد ـ ۵، رجب ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء)

اوراق ۱۴-۴۰، ۱۳-۱۴ سطور، ۸½ × ۶، نستعلیق

بی ۲۰۲، یو ۱۰۰، دہلی

نسخہ دویم سبع سیارہ رنگین (نسخہ ہفتم نورتن رنگین)

رنگین نامہ

۲۴۹ـــ مصنف رنگین

کاتب ـ مصنف ـ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء)

اوراق ۵۸-۶۶، ۸½ × ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۲۰۲، یو ۱۰۰، دہلی

نسخہ چہارم سبع سیارہ رنگین

سنجۂ رنگین

۲۵۰ـــ مصنف رنگین

کاتب ـ مصنف ـ شاہجہاں آباد ـ ۷، رجب ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء)

اوراق ۴۱-۵۷، ۸½ × ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۲۰۲، یو ۱۰۰، دہلی

نسخہ سویم سبع سیارہ رنگین

ساقی نامہ رنگین

۲۵۱ـــ مصنف رنگین

کاتب ـ مصنف ـ باندہ، ۷، شوال ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۶۷-۷۷، ۸½ × ۶، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۲۰۲/۵، یو ۱۰۰، دہلی

نسخہ پنجم سبع سیارہ رنگین

تجربۂ رنگین

۲۵۲ـــ مصنف رنگین

تاریخ تصنیف ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲-۳۳ء)

کاتب ـ مصنف ـ باندہ ۲۵، جمادی الثانی ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۶۸-۹۶، ۸½ × ۶، ۱۳ سطور، نستعلیق

بی ۲۰۲/۴، یو ۱۰۰، دہلی

نثر ـ طریقۂ تربیت انواع و استعمال اسلحہ وغیرہ

www.taemeernews.com

کلام رنگین

۲۵۳ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ، باندہ ، ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۱۰۷ـ۹۷ ، ۸½×۴ ، ۱۳ سطور ، نستعلیق

بی ۲۰۲/۷ ، یو ۱۰۰ ، دہلی

نسخہ ہفتم سبع سیارہ رنگین

تصنیف رنگین

۲۵۴ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ۔ شاہجہاں آباد ۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۱۵ ، ۸½×۴ ، ۱۲ سطور ، نستعلیق

کرم خوردہ

بی ۲۰۳ ، یو ۱۰۱ ، دہلی

نسخہ اول سبع سیارہ رنگین

گلدستۂ رنگین

۲۵۵ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ، شاہجہاں آباد ۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۲۳ ، ۸½×۶ ، ۱۲ سطور ، نستعلیق

بی ۲۰۴ ، یو ۱۰۲ ، دہلی

نسخہ دویم سبع سیارہ رنگین

رنگین نامہ

۲۵۶ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ۔ شاہجہاں آباد ۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

اوراق ۱۱ ، ۸×۶ ، ۱۲ سطور ، نستعلیق

بی ۲۰۵ ، یو ۱۰۳ ، دہلی

نسخہ چہارم سبع سیارہ رنگین

ساقی نامہ رنگین

۲۵۷ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ۔ باندہ ، ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء)

اوراق ۱۲ ، ۸½×۶ ، ۱۲ سطور ، نستعلیق

بی ۲۰۶ ، یو ۱۰۴ ، دہلی

نسخہ پنجم سبع سیارہ رنگین

تجربۂ رنگین

۲۵۸ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ۔ باندہ ، ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء)

اوراق ۱۶ ، ۸½×۶ ، ۱۳ تا ۱۶ سطور ، نستعلیق

بی ۲۰۷ ، یو ۱۰۵ ، دہلی

نسخہ ششم سبع سیارہ رنگین

کلام رنگین

۲۵۹ــ مصنف رنگین

کاتب ۔ مصنف ۔ باندہ ، ۱۰ شعبان ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء)

اوراق ۱۸ ، ۸½×۶ ، ۱۳ سطور ، نستعلیق ۔ کرم خوردہ و خستہ

بی ۲۰۸ ، یو ۱۰۶ ، دہلی

نسخہ ہفتم سبع سیارہ رنگین

فرسنامہ (اسپ نامہ)

۲۶۰ــ مصنف رنگین

کاتب۔ رنگین ۔ ۱۱ر صفر ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء)
اوراق ۵۹، ۹ × ۶½، ۱۰ سطور، نستعلیق
بی ۲۰۹، یو ۱۰۷، دہلی
مع صیغہ نکاح (ع۔ بی)، و نسخہ جات حکمت

قوت الایمان

۲۶۱ — مصنف رنگین
تاریخ تصنیف، ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء)
کاتب ۔ مصنف، باندہ، ۲۸ر جمادی الاول ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء)
اوراق ۹-۱، ۸ × ۵½، ۱۰ سطور، نستعلیق
بی ۲۱۰، یو ۱۰۸، دہلی

ترجمہ قصیدہ غوثیہ

۲۶۲ — مترجم رنگین
کاتب ۔ مصنف، باندہ، ۲۶ر جمادی الاول ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء)
اوراق ۱۸-۱۰، ۸ × ۵½، ۱۱ سطور، نستعلیق
بی ۲۱۰، یو ۱۰۸، دہلی
مع قصیدہ غوثیہ از شیخ عبدالقادر جیلانی

ترجمہ قصیدہ بانت سعاد یا البردہ

۲۶۳ — مصنف کعب ابن زہیر المزنی
مترجم رنگین
کاتب ۔ مترجم، باندہ، ۸ر رجب ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء)
اوراق ۳۱-۱۹، ۸ × ۵½، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۲۱۰، یو ۱۰۸، دہلی
مع اصل عبارت ع۔ بی

قصیدہ درمدح نواب غازی الدین خاں عماد الملک

۲۶۴ — مصنف سودا
کاتب رنگین، باندہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء)
اوراق ۳۶-۳۲، ۸ × ۵½، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۲۱۰، یو ۱۰۸، دہلی
مع تصحیح و اضافہ از رنگین

(انتخاب از کلام رنگین)

۲۶۵ — کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۷، ۷ × ۴¾، ۴ × ۳¾، ۱۱ سطور، نستعلیق
بی ۲۱۱، یو ۱۰۹، دہلی
انتخاب از گلدستہ رنگین، شش جہت رنگین۔ پنجہ رنگین۔ سبع سیارہ رنگین، چہار چمن رنگین۔ دیوان ریختہ، بیختہ،
ہر ورق پر مضموں، اشارہ میر امر ذوق کے مطالعے لکھے ہوئے ہیں۔

انتخاب طوطا کہانی

۲۶۶ — مصنف رنگین
کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۴۸-۴۷، ۹ × ۶½، ۱۴ سطور، نستعلیق
بی ۹۳/۵، یو ۴۵، دہلی
مثنوی ۔ ماخوذ از گلدستہ رنگین و شش جہت رنگین

چار باغ

۲۶۷ — مصنف رنگین
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی

www.taemeernews.com

اوراق ۴۸ - ۴۷، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۴ اسطور نستعلیق

بی ۵/۹۳، یو ۴۵، دہلی

مثنوی۔ ماخوذ از گلدستۂ رنگین و شش جہت رنگین

چار باغ

۲۶۷۔ مصنف رنگین

کاتب نامعلوم ۔ ۱۹ ویں صدی

اوراق ۵۳ - ۴۹، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۴ اسطور نستعلیق

بی ۵/۹۳، یو ۴۵، دہلی

مثنوی رنگین

۲۶۸۔ مصنف رنگین

کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۱۰۳ - ۹۶، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۴ اسطور نستعلیق

بی ۱۰/۹۳، یو ۴۵، دہلی

حصہ اول پنجہ رنگین و حصہ پنجم شش جہت رنگین

دیوان آتش

۲۶۹۔ مصنف خواجہ حیدر علی آتش

کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۱۵۸، ۱۱ × ۷، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۲۱۲، یو ۱۱۰، دہلی

دیوان اول

دیوان مومن

۲۷۰۔ مصنف حکیم محمد مومن خاں مومن

تاریخ تصنیف ۱۲۴۳ھ (۲۸-۱۸۲۷ء)

کاتب دولت سنگھ ۔ ۱۵ ذوالقعدہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۹ء)

اوراق ۲۰۳ - ۴/۳ ۱۰ × ۴/۱ ۶، ۱۵ سطور نستعلیق۔

کرم خوردہ

بی ۲۱۳، یو ۱۱۱، دہلی

غزلیات، مثنویات، اشعار وغیرہ

مثنوی مومن

۲۷۱۔ مصنف حکیم محمد مومن خاں مومن

کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۵۵ - ۳۶، ۴/۱ ۱۰ × ۴/۱ ۶، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۲۱۴، پی ۳۱۶۲

دیوان حسام

۲۷۲۔ مصنف چودھری حسام الدین ولد چودھری سعادت علی

کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی

اوراق ۸۱، ۲/۱ ۸ × ۲/۱ ۶، ۱۶ سطور، شکستہ

بی ۲۱۵، یو ۱۱۲، دہلی

مخمسات و رباعیات و قصاید وغیرہ

دیوان شور

۲۷۳۔ مصنف مرزا محمود بیگ

کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی

اوراق ۲۸، ۲/۱ ۸ × ۲/۱ ۵، ۱۳ سطور نستعلیق و شکستہ

بی ۲۱۶، یو ۱۱۳، دہلی

نامکمل ۔ ا، س، ش، ن ردیف کی غزلیں

دیوان فقیر

۲۷۴۔ مصنف سید محی الدین خاں فقیر دہلوی

www.taemeernews.com

کاتب نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۲۵، ۱۱ × ۶½، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۲۱۷، یو ۱۴، دہلی
نامکمل

دیوان چندا

۲۷۵ — مصنف چندا (ماہ لقا)
کاتب نامعلوم - ۱۸ ویں صدی، دیباچہ (فارسی) ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء)
اوراق ۳۴، ۹½ × ۵½، ۱۱ سطور نستعلیق
بی ۲۱۸، پی ۲۷۶۸
یہ نسخہ چندا نے ۱۸ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو ناچ کے دوران سر جان مالکم کو نذرانہ کے طور پر پیش کیا تھا۔

دیوان سراج

۲۷۶ — مصنف سراج الدین اورنگ آبادی
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۱، ۱۱¾ × ۷½، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۲۱۹، رائل سوسائٹی

دیوان ولایت

۲۷۷ — مصنف میر ولایت اللہ خاں ولایت عرف شاہ ولایت
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۹۴-۱۵۱، ۷¾ × ۴¾، غیر معین سطور، نستعلیق
بی ۲۲۰، پی ۱۴۴۸

مکاشفات الاسرار

۲۷۸ — مصنف سید علی غمگین دہلوی عرف حضرت جی
کاتب مصنف نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۰۴، ۹½ × ۵¾، ۱۴ تا ۲ سطور۔ نستعلیق و شکستہ
بی ۲۲۱، یو ۱۱۵، دہلی
دیوان رباعیات

نامعلوم الاسم

۲۷۹ — مصنف شمس الدین گجراتی
کاتب: سید مراد علی، دہلی، ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء)
اوراق ۲۷-۲۵، ۸½ × ۶، ۱۳ سطور نستعلیق
بی ۲۲۲/۵، یو ۱۱۶ اے، دہلی

سہرا مرزا جہاں بخت

۲۸۰ — مصنف مرزا اسد اللہ خاں غالب
کاتب سید مراد علی، جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء)
اوراق ۲۸ و پر، ۸½ × ۶، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۲۲۲/۶، یو ۱۱۶ اے، دہلی
آخر میں غالب کی ایک غزل ہے مطلع۔
منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

سہرا مرزا جہاں بخت

۲۸۱ — مصنف شیخ محمد ابراہیم
کاتب سید مراد علی، جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء)
اوراق ۲۷ ب پر، ۸½ × ۶، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۴/۲۲۴، یو ۱۱۶ اے، دہلی

بیاض اشعار

۲۸۲۔ مولف نامعلوم
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۲۸، ۴/۱ ۹ × ۴/۱ ۶، غیر معین سطور
نستعلیق۔ بی ۲۲۴۔ یو ۱۱۷، دہلی
آفتاب سے مصحفی تک شعرا کے کلام کا انتخاب

نامۂ جرأت

۲۸۳۔ مصنف شیخ قلندر بخش جرأت
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۵۹-۵۵، ۴/۳ ۸، ۴/۳ ۶، غیر معین سطور نستعلیق
بی ۱/۲۲۷، پی ۲۵۸۵
نامۂ بحرالفت۔ حصۂ اول مختار الشعراء

ہجو خارش

۲۸۴۔ مصنف شیخ قلندر بخش جرأت۔
تاریخ تصنیف ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء)
کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۳-۵۹، ۴/۳ ۶، غیر معین سطور نستعلیق
بی ۴/۲۲۷، پی ۲۵۸۵

انتخاب غزلیات جرأت

۲۸۵۔ مصنف شیخ قلندر بخش جرأت
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۶-۶۵، ۴/۳ ۸ × ۴/۳ ۶، غیر معین سطور،
نستعلیق۔ بی ۳/۲۲۷، پی ۲۵۸۵

انتخاب غزلیات علی جان

۲۸۶۔ مصنف علی جان
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۶۸-۶۳، ۴/۳ ۸ × ۴/۳ ۶، غیر معین سطور،
نستعلیق۔ بی ۵ و ۳/۲۲۷، پی ۲۵۸۵

انتخاب مراثی اصغر

۲۸۷۔ مصنف اصغر
کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۷۲-۶۹، ۴/۳ ۸ × ۴/۳ ۶، ۲۴ سطور نستعلیق
بی ۷/۲۲۷، ۴/۳ ۸ × ۴/۳ ۶، ۲۴ سطور نستعلیق
۳۷ مراثی ۷۵-۷۲، اوراق پر کسی دوسرے شاعر کے ۳۷ اور مراثی دیئے ہوئے ہیں۔

تیرہ ماسہ

۲۸۸۔ مصنف قطبی
کاتب عبدالکریم، ۲ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ (۱۸۵۶ء)
اوراق ۷۷-۶۳، ۹ × ۴/۱ ۶، ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۹۳/۷، یو ۴۵، دہلی
۸۵-۷۸ اوراق پر ایک نامعلوم الاسم فارسی مثنوی درج ہے۔

بیاض

۲۸۹۔ مولف نامعلوم
کاتب سید اصغر علی، فتح سنگھ وغیرہ، انبالہ
۵۹-۱۲۵۲ھ (۴۳-۱۸۳۶ء)

www.taemeernews.com

اوراق ۹۵، ۲½ × ۸ × ۴½، ۸ تا ۱۲ سطور نستعلیق

بی ۶۶، یو ۳۶، دہلی

یہ مجموعہ مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ اشعار فارسی از طوسی، مرزا صائب، امیر خان، محمد شاہی، مولوی معنوی، مرزا ناصر علی، ذکی ہمدانی، مظہر جان جاناں، افسردہ، والہ، امیر خسرو، رتن لعل، سلیم، زیب النسا، محمود خیر پوری، حسرت وغیرہ

۲۔ بسمل کی دو غزلیں۔ تاریخ کتابت ۲۷-۲۶، جمادی الثانی ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء)

۳۔ اردو اشعار از ذوق، جرأت، شیر، سودا، والہ، انشاء اللہ خان، رنگین، معروف، احمد، مصحفی، ظہور اللہ خان نور، حسرت، عشق، عشرت، اثر، نصیر، امیر، افسردہ، حزیں اور افسوس۔

۴۔ مثنوی بسمل۔ تاریخ کتابت، ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء)

۵۔ اردو اشعار از جرأت، مصحفی، سوختہ، نجیف یا نحیف، سودا، مرزا، اثر، درد، عشرت، ظہور، سرور، عشق، انشا، ناسخ، نصیر، ثناء اللہ خان فراق، میر تقی، موہن لعل، مخمسات از بسمل۔ کاتب فتح سنگھ

۶۔ بسمل کی دو غزلیں الف کی ردیف میں
کاتب سید اصغر علی رضوی

۷۔ ذوق کی دو غزلیں ردیف 'و' میں

۸۔ غزلیات بسمل
کاتب سید اصغر علی رضوی، انبالہ، ۱۱ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء)

۹۔ اعداد مردم شماری، علی گڑھ از رابرٹسن (Robertson) ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ، جون ۱۸۴۵ء

۱۰۔ رنگین کے دو واسوخت
کاتب سید اصغر علی رضوی، ۱۱ شعبان ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء)

۱۱۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں رخشاں کی غزلیں (ردیف ن)

۱۲۔ ۱۸۴۸-۱۸۴۹ کے دوران لیے گئے قرضے واداکگی کا حساب کتاب

۱۳۔ مرثیہ (فارسی)

۱۴۔ دریائے عشق از میر تقی میر۔ دیکھیے نمبر ۲۰۵

۱۵۔ مخمسات از حمید

۱۶۔ غزلیات آتش، علی ناسخ و بسمل
کاتب سید اصغر علی، ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء

۱۷۔ مثنوی رنگین (نسخہ ششم شش جہت رنگین)
کاتب سید اصغر علی، ۱۷ اکتوبر ۱۸۴۳ء

۱۸۔ غزلیات و اشعار از بسمل
کاتب نامعلوم، ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء)

اخلاقیات

سلک جواہر

۲۹۰۔ مصنف محمد فخر الدین حسین
کاتب محمد قدرت اللہ، شاہجہاں آباد، ۱۱ جمادی الثانی ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء)

اوراق ۸۳، ½ ۱۱ × ½ ۷، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۲۲۸، یو ۱۱۸، دہلی

ماخوذ از پندنامہ لقمان

تجربہ خاص

۲۹۱۔ مصنف بشن دیال۔ ساکن فرخ آباد

کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی
اوراق ۳۱، ۱۱ × ۸، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۲۲۹، یو ۱۱۹

طب

طب انگریزی

۲۹۲- مصنف نامعلوم
مترجم از انگریزی: نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۸ر صفر ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)
اوراق ۶۶، ۹ × ۵½، ۱۱ تا ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۲۳۰، یو ۱۲۰، دہلی
فہرست خواص ادویات انگریزی - یہ کسی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے استاد کیپٹن جان ولیم ٹیلر کی تصحیح اور اضافہ کے ساتھ

خواص الادویہ

۲۹۳- مصنف نامعلوم
مترجم کسی یورپین نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے
کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی
اوراق ۸۶، ۱۲ × ۹، ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۲۳۱، یو ۱۲۱، دہلی

فہرست ادویہ ہندی و لغت عربی از کتاب مخزن الادویہ

بموجب شمار ہندسہ

۲۹۴- مصنف محمد حسین
مولف نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی
اوراق ۸۵-۱، ۱۰½ × ۶½ - نستعلیق
بی ۲۳۲/۱، پی ۳۵۲۶
ہندی الفاظ کے عربی اور فارسی متبادل بھی دیے ہوئے ہیں

فہرست ادویہ ہندی از کتاب بھاؤ پرکاش

۲۹۵- مصنف بھاؤ مسرا
مولف نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۳۱-۸۹، ۱۰½ × ۶½، نستعلیق
بی ۲۳۲/۲، پی ۳۵۲۶

موسیقی

مفرح القلوب[1]

۲۹۶- مصنف حسن علی عزت (میسوری)
تاریخ تصنیف - ۱۰۹۶-۹۹ھ (۱۶۸۳-۸۵ء)
کاتب نامعلوم - دو مختلف کاتب۔ اوائل ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۸۵-۱/۸، ۷ × ۵¾، ۹ سطور، شکستہ آمیز
بی ۲۳۳، پی ۲۸۰۹

ایضاً

۲۹۷- کاتب نامعلوم - دو مختلف کاتب - ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۹۷، ۸½ × ۵¾، ۹ سطور، نستعلیق
بی ۲۳۴، پی ۱۲۳۵، ایتھے ۲۰۲۵، ٹیپو

---

[1] مفرح القلوب کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ہے ۵۲ ف (ا۔ص)

www.taemeernews.com

ایضاً

۲۹۸۔ کاتب نامعلوم۔ ۱۹ویں صدی
اوراق ۱۹۸، ۸⅞ × ۴¾، ۵²/ ۹ تا ۱۱ سطور، شکستہ
بی ۲۳۵، پی ۲۱۸۹، ۱، تھیے ۲۰۲۶، فورٹ ولیم کالج

ایضاً

۲۹۹۔ کاتب نامعلوم۔ دو مختلف کاتب۔ ۱۹ویں صدی
مہر فورٹ ولیم کالج ۱۸۲۵ء
اوراق ۲۰۱، ۸½ × ۸⅝، ۵⅝، ۹ سطور، شکستہ
بی ۲۳۶، پی ۲۲۷۳، ۱، تھیے ۲۰۲۷، فورٹ ولیم کالج

ایضاً

۳۰۰۔ کاتب نامعلوم، دو مختلف۔ ۱۹ویں صدی،
مہر فورٹ ولیم کالج ۱۸۲۵ء
اوراق ۲۰۲، ۸ × ۴¾، ۵، ۹ سطور، شکستہ
بی ۲۳۷، پی ۲۲۷۸، ۱، تھیے ۲۰۲۸، فورٹ ولیم کالج

ایضاً

(خلاصہ مفرح القلوب)

۳۰۱۔ کاتب نامعلوم، اوائل ۱۹ویں صدی
اوراق ۴۹، ۸⅞ × ۴½، ۶، ۹ سطور، نستعلیق و شکستہ
بی ۲۳۸، پی ۲۲۰۳، ۱، تھیے ۲۰۲۹، فورٹ ولیم کالج

ایضاً

۳۰۲۔ کاتب نامعلوم۔ اوائل ۱۹ویں صدی
اوراق ۴۹، ۸⅞ × ۴½، ۶، ۹ سطور، شکستہ
بی ۲۳۹/۱، پی ۲۱۹۰، ۱، تھیے ۲۰۳۰، فورٹ ولیم کالج

ایضاً

۳۰۴۔ کاتب سید علی رضا، اواخر ۱۸ویں صدی۔
دستخط ٹیپو سلطان
اوراق ۳۸، ۸½ × ۴½، ۱۱ سطور، شکستہ
بی ۲۴۰، پی ۱۶۳۸، ۱، تھیے ۲۰۳۱۔ ولیم کرک پیٹرک

ایضاً

(انتخاب نغمات از مفرح القلوب)

۳۰۵۔ کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی
اوراق ۵۲، ۸⅛ × ۴¾، ۵³/، ۱۱ تا ۱۲ سطور، شکستہ
بی ۲۴۱، پی ۳۳۹۵، ۱، تھیے ۲۰۳۲

راگ مالا[1]

۳۰۶۔ مصنف سید عبدالولی عزلت ولد سید سعد اللہ ساکن سورت
کاتب سید عبدالنبی ولد سید محمود ولد محمد رضا صفوی برائے مصنف
۲۵ محرم ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء
اوراق ۴۴، ۸½ × ۸½، ۵، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۱۰۱، پی ۲۳۸۰ سی

زراعت

توصیف زراعت

۳۰۷۔ مصنف مرزا کلب حسین خان نادر
تاریخ تصنیف ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء
کاتب سید طاہر علی، ۲ ستمبر ۱۸۶۵ء برائے مسٹر اردن

---

[1] راگ مالا کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ہے۔ اس کا نمبر ۱۳ ف ہے۔ (ا۔ص)

www.taemeernews.com

اوراق ۱۳۱، ۴/۱ ۱۰ × ۴/۱ ۸، ۱۵ سطور نستعلیق

بی ۲۴۲، یو ۱۲۲

قواعد افواج

آئین انتظام فوج سرکار شاہ شجاع الملک

۳۰۸۔ مصنف نامعلوم

کاتب نامعلوم، ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۱۷، ۷ × ۴/۱ ۵، ۱۰ سطور نستعلیق

بی ۲۴۳، یو ۱۲۳

تجربہ رنگین از سعادت یار خان رنگین

دیکھیے نمبر ۲۵۲

مجموعۂ الفاظ

آموختن

۳۰۹۔ مصنف نامعلوم

کاتب مرزا امام بیگ، ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۰۴ھ

(۱۷۹۰ء)

اوراق ۲۴، ۴/۱ ۸ × ۶، ۱۳ تا ۱۷ سطور نستعلیق

بی ۲۴۴، پی ۲۱۸۸، فورٹ ولیم کالج

فارسی و اردو

ایضاً

۳۱۰۔ کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی

اوراق ۲۳۸ - ۲۶۵، ۲/۱ ۸ × ۶، ۱۲ تا ۱۶ سطور

نسخ - بی ۲۴۵، پی ۲۲۰، اتیھے ۲۴۴۳

ایضاً

۳۱۱۔ کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۶۳-۱۹۶، ۴/۱ ۸ × ۴/۱ ۶، ۱۲ تا ۱۴

سطور نستعلیق و شکستہ

بی ۲۴۶، پی ۲۵۵۶، اتیھے ۲۴۴۴

آمد نامہ

۳۱۲۔ مصنف نامعلوم

کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی

اوراق ۳۷-۱۲، ۴/۳ ۷ × ۴/۱ ۱۰، ۷ سطور نستعلیق

بی ۲۴۷، پی ۸۱۹، اتیھے ۲۴۴۵

کتاب آمدن - فارسی - اردو

نامعلوم الاسم

۳۱۳۔ مصنف نامعلوم

کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۶۱، ۱۲ × ۴/۱ ۱۰، ۷ سطور نستعلیق

بی ۲۴۸، پی ۲۵۲۳

اردو - پشتو

تحفۂ پنجاب

۳۱۴۔ مصنف پنڈت آجودھیا پرشاد تحصیل دار لاہور

کاتب محمد علی، ۱۹ویں صدی

اوراق ۴۸۱، ۸/۱ ۱۱ × ۴/۱ ۷، غیر معین سطور نستعلیق

بی ۲۴۹، پی ۲۴۵۳، اتیھے ۲۵۲۸

مصور - پنجابی - اردو - فارسی - ہندی - مع اصطلاحات

زراعت

مصطلحات ٹھگی

۳۱۵۔ مصنف علی اکبر

تاریخ تصنیف - ۱۸۳۵ء ؟

کاتب نامعلوم - ۱۹ویں صدی

www.taemeernews.com

اوراق ۷۳، ۷×۴¾، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۲۵۰، یو ۱۲۴
برائے کیپٹن ڈبلو ایچ سلیمن نصف کیا گیا
(W. H. Sleeman)

نامعلوم الاسم

۳۱۶۔ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۱۹، ۱۲×۴¾، غیر معین سطور، نستعلیق
بی ۲۵۱، پی ۱۳۹۷
اردو۔ انگریزی

خالق باری یا مطبوع الصبیان

۳۱۷۔ مصنف امیر خسرو
کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۱۱، ۸½×۴½، ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۲۵۲، پی ۱۲۰۰، گیکوار
عربی۔ فارسی۔ اردو

ایضاً

۳۱۸۔ کاتب نامعلوم، آگرہ، ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء)
اوراق ۷-۱۰، ۸½×۵½، ۱۴ تا ۱۵ سطور، نستعلیق
بی ۲۵۳، پی ۱۰۸۳
فارسی دیباچہ کے بغیر۔ حاشیے پر کچھ اضافات ہیں۔

ایضاً

۳۱۹۔ کاتب نامعلوم۔ ۱۸ ویں صدی
اوراق ۷۵-۶۹، ۹½×۵¾، ۵ تا ۱۶ ابیات،
نستعلیق

بی ۲۵۴، پی ۲۷۲۰
نامکمل

ایضاً

۳۲۰۔ کاتب نامعلوم، ۱۸ ویں صدی
اوراق ۴۸-۳۹، ۷½×۵½، ۹ سطور، شکستہ آمیز
بی ۲۵۵، پی ۵۰۵

حمد باری

۳۲۱۔ مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۸۸-۸۲، ۸×۶، ۱۳ سطور، نستعلیق
بی ۲۵۶، یو ۵۷، ای، دہلی
عربی۔ فارسی۔ اردو۔ ناقص الآخر

رازق باری

۳۲۲۔ مصنف والہ (سید محمد والہ)
کاتب نامعلوم۔ ۲۵ ماہ خسروی ۱۲۲۲ھ (۱۷۹۵ء)
اوراق ۳۶-۲۰، ۷¾×۵¼، ۹ تا ۱۲ سطور، نستعلیق
بی ۲۰۷، پی ۲۸۵

لغات

مدار الافاضل

۳۲۳۔ مصنف مولانا شیخ اللہ داد فیضی بن اسد العلماء علی شیر سرہندی
تاریخ تصنیف۔ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء)
مترجم نامعلوم
کاتب برائے مسٹر چانڈلر (Chandler)
مرشد آباد، ۱۱۸۶-۸۹ھ (۱۷۷۳-۷۶ء)

www.taemeernews.com

۳ جلدیں - اوراق ۴۵ ۲، ۲۹۳، ۳۴۰ ر
۱۰۳/۴ ، ۸½ × ۱۱ ، ۱۱ تا ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۲۵۸، پی ۷۷، ۱۷۵، ۱۵۰۳
اردو ترجمہ - عربی، فارسی، ترکی - اردو۔

اردو ڈکشنری

۳۲۴ ـ مصنف آگسٹس والٹر
(Lt. Augustus Walter)
کاتب نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۷۷، ۸ × ۵½، تقریباً ۳۲ سطور
بی ۲۵۹، یو ۱۲۵
رومن - اردو - انگریزی

قواعد صرف و نحو

A Grammar of the Hindostan Language
Benjamin Schulzius or Shultz.
۳۲۵ ـ مصنف
تاریخ تصنیف ۳/ جون ۱۷۴۱ء
ترجمہ از لاطینی
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۱۰۷، ۱۲½ × ۱۲ ⅝ × ۳/۴ ۷ تا ۸ ،
غیر معین سطور - بی ۲۶۰، پی ۲۵۳۱
اردو - انگریزی

ایضاً

۳۲۶ ـ مترجم نامعلوم
کاتب نامعلوم، ۱۹ ویں صدی
اوراق ۴۸ - ۴، ۱۲¾ × ۸

بی ۲۶/۱، پی ۳۴۲۳
آخر میں اردو مصادر اور ان کے فارسی متبادل
اور سودا و تابان کے کچھ اشعار درج ہیں۔

قاعدہ زبان پنجابی

۳۲۷ ـ مصنف منشی کاشی راج کھتری ساکن لاہور
کاتب نامعلوم برائے ڈاکٹر جیمس ہیر
(Dr. James Hare)
۱۹/ نومبر ۱۸۱۱ء
اوراق ۸۴، ۸½ × ۴½ ، ۱۰ تا ۱۴ سطور نستعلیق
بی ۲۶۱، یو ۱۲۶

متفرقات

نامعلوم الاسم

۳۲۸ ـ مولف منشی محمد شاکر
کاتب سراج الدین برائے مسٹر بولٹس
Mr. W. Bolts
۱۸ ویں صدی
اوراق ۴۸، ½۱۱ × ۷، ۱۵ سطور نستعلیق
بی ۲۶۲، پی ۲۶۷۵
یہ مخطوطہ فن خطوط نویسی پر مشتمل ہے اور اس ضمن میں مولف نے نجی اور سرکاری خطوط، شاہی فرامین، اسناد و دوسری دستاویزات سے اقتباسات بطور مثال پیش کیے ہیں۔ اس میں شاہ عالم کے فرامین، نواب سراج الدولہ، کرنل کلائیو، ایسٹ انڈیا کمپنی، مہاراجہ جگت رام رائے اور دوسرے ہندو راجاؤں کے خطوط شامل ہیں۔ آخر میں جلال الدین رومی کی نصیحت اور سکندر اعظم کی وفات کے حالات درج ہیں۔

www.taemeernews.com

اعداد وشمار زمینداران

۳۲۹— یہ مختلف سائز کے کاغذات کا مجموعہ ہے جن میں جدول کی شکل میں علی گڑھ، بریلی، بدایوں، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور کی تحصیلوں میں بسنے والے زمینداروں کے اعداد وشمار، ان کی قومیت، مذہب، ان کے قبضے میں زمین کی پیمائش، اور ہر پرگنہ کی مختصر تاریخ اور دوسری معلومات درج ہیں۔ یہ معلومات ۱۸۴۷ء میں حکومت ہند کے احکامات کے تحت ہر پرگنہ کے قانون گو اور دوسرے حکام نے مرتب کی تھیں۔

بی ۶۳، یو ۱۲۷

عرض داشت از جانب رئیسان ومالکان زمین پنجاب بحضور ڈیوک آف آرگائیل صاحب

۳۳۰— پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۶۸ء کو ملتوی کرنے کے لیے پنجاب کے زمینداروں کی طرف سے ہندوستان کے سیکریٹری آف سٹیٹ ڈیوک آف آرگائیل کی خدمت میں عرض داشت۔ اس پر تقریباً ۲۰۰ زمینداروں کے دستخط موجود ہیں۔

بی ۲۶۴، یو ۱۲۸

عجیب اللطائف

۳۳۱— مصنف نا معلوم

کاتب نا معلوم۔ ۱۹ویں صدی

اوراق ۶۱، ۱۰ ۱/۴ × ۶ ۱/۲، ۱۱ سطور، نستعلیق

بی ۲۶۵، یو ۱۲۹

ذو معنی الفاظ، محاورات واشعار کا مجموعہ

دیوناگری رسم الخط

۳۳۲— مولف نا معلوم

کاتب نا معلوم، ۱۹ویں صدی

اوراق ۱۵۷، ۹ ۳/۴ × ۴ ۱/۲، ۶، غیر معین سطور۔

دیوناگری و نستعلیق

بی ۲۶۶، سنسکرت ۳۲۱۸

یہ کسی دیوناگری سیکھنے والے طالب علم کی نوٹ بک ہے جس میں مندرجہ ذیل حکایات ومضامین دیوناگری رسم الخط میں تحریر کیے گئے ہیں۔ تقریباً ہر فقرے میں کچھ الفاظ نستعلیق خط میں شامل ہیں۔

۱— احوال مشتمل جواب وسوال
۲— قصہ بصیر وکوہانہ پشت
۳— کیفیت شادی مسلمانان
۴— کوائف دفن کردن مردہ مسلمانان
۵— کیفیت شادی ہندوان
۶— ریختہ از سودا
۷— ریختہ از ولی
۸— انگریزی تحریر
۹— سوال وجواب در قوانین دہلی
۱۰— سوال وجواب در مقدمہ کاشت کاری
۱۱— سوال وجواب در مقدمہ زمینداری
۱۲— سوال وجواب در دفع دینوک (دیمک)
۱۳— ہندی مصادر با ترجمہ
۱۴— در احوال کلکتہ ومردم بنگالی
۱۵— قصہ سپاہی وفقیران
۱۶— قصہ من بہار دانش
۱۸— ہندی الفاظ، اعداد وشمار وغیرہ

www.taemeernews.com

۱۸ — کلمات پراگندہ ہندی

۱۹ — مثلہائے ہندی

۲۰ — دنوں اور مہینوں کے نام وغیرہ

ڈاکٹر بلنٹائن

۳۳۳- پرنسپل [Dr. Ballantyne]
گورنمنٹ کالج بنارس کے نام خطوط و رائقش
کا مجموعہ جو ۴۷-۱۸۴۶ء کے دوران لکھے گئے
تھے - اس میں بنارس کے مجسٹریٹ
F. W. Gibbins کا ۱۸۵۴ء کا
ایک فیصلہ اور مختلف علوم و ہنر حاصل کرنے

کے لیے کتابوں کی ایک فہرست بھی شامل ہے
بی ۲۶۹ ، یو ۱۳۱

نامعلوم الاسم

۳۳۴- مصنف نامعلوم
کاتب نامعلوم - ۱۹ ویں صدی
اوراق ۲۲-۶۳ ، ۸۳/۴ × ۶۳/۴ ، ۱۰ سطور -
نستعلیق
بی ۲۲۴/۴ ، پی ۲۵۸۵
جہانگیر اور نور جہاں کے درمیان ایام حیض کے
متعلق گفتگو

بلوم ہارٹ کے مندرجہ بالا اردو مخطوطات کے بعد سلیم الدین قریشی اور اُرسلا سمس ولیمز نے تلاش و تجسس کے بعد ۱۹ اردو مخطوطات کا مزید کھوج لگایا اور ان مخطوطات کا ایک ضمیمہ مارچ ۱۹۷۸ء میں شایع کر دیا اور اس طرح بقول مرتبین اردو مخطوطات کی مجموعی تعداد ۵۰۷ تک پہنچ گئی۔ ذیل میں ہم ضمیمے میں شایع شدہ مخطوطات کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں تاکہ قارئینِ فکار نئے تلاش شدہ مخطوطات سے بھی فیض اٹھا سکیں ۔۔۔

- مذاہب پر ۱۸ ○ تاریخ - ۱۷ ○ جغرافیہ و نقشہ سازی ۵ ○ لسانیات اور قواعد - ۲۱
- ادبیات ۴ ○ برطانوی ہند سے متعلق دستاویزات و متفرقات ۔۔۔ ۸

ادب، فن اور تاریخ سے متعلق تلاش مخطوطات کی تفصیل درج ذیل ہے: ۔۔۔ صہبا

نثری داستانیں اور رومان

قصہ حاتم طائی

مصنف: نامعلوم
تاریخ تصنیف: - ۲۳ نومبر ۱۷۹۹ء
کاتب: - نامعلوم - ۱۷ × ۲۸ ، ۱۳-۱۲ سطور نستعلیق

ترجمہ: - خلیل علی خاں اشک (اردو)
تاریخ تصنیف: - فورٹ ولیم ۱۸۰۳ء
کاتب: - نامعلوم ۱۸ × ۲۶ سطور ۱۳ نستعلیق

قصہ امیر حمزہ

مصنف: - مولانا جلال بلخی (فارسی)

"توتا کہانی" (۱)

مصنف: - محمد قادری (فارسی)
ترجمہ: - سید حیدر بخش حیدری

www.taemeernews.com

تاریخ تصنیف :- اوائل ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم - ۱۹×۲۹ سطور ۱۹ نستعلیق

توتا کہانی (۲)

مصنف :- محمد قادری (فارسی)

ترجمہ :- سید حیدر بخش حیدری

تاریخ تصنیف :- وسط ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم ۱۹×۲۹ سطور ۱۵ - نستعلیق

توتا کہانی (۳)

مصنف :- محمد قادری

ترجمہ :- سید حیدر بخش حیدری

تاریخ تصنیف :- وسط ۱۹ ویں صدی

کاتب :- سید یعقوب ۲۰×۱۰ سطور ۱۰ نستعلیق

شکنتلا

مصنف :- کالی داس

تراجم :- کاظم علی جواں

تاریخ تصنیف :- ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم - ۲۳×۱۳ سطور - ۱۴ - نستعلیق

مذہب عشق

مصنف :- عزت اللہ بنگالی

ترجمہ :- نہال چند لاہوری

تاریخ تصنیف : ۱۸ ویں صدی / ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم - ۲۲×۱۵ - نستعلیق

بیتال پچیسی

مصنف : مظہر علی خاں

تاریخ تصنیف :- وسط ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم - ۲۸×۲۰ سطور ۱۰-۱۳ - نستعلیق

گلستان

مصنف :- نامعلوم

تاریخ تصنیف :- ۱۹ ویں صدی

کاتب : نامعلوم - ۲۸×۲۱ سطور ۱۰-۱۲ نستعلیق

شاعری

قصہ اعظم شاہ

مصنف :- نامعلوم

تاریخ تصنیف :- ۱۸ ویں صدی

کاتب : سیف بیگ ۲۳×۱۲ سطور ۱۳ - نستعلیق

قصہ ملکۂ مصر

مصنف : محمد عاجز

کاتب :- نامعلوم ۵۱×۲۳ سطور ۱۳ -

قصہ لعل گوہر

مصنف :- عارف الدین خاں عاجز

تاریخ تصنیف :- وسط ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم - ۲۷×۲۰ سطور ۱۵-۱۰ نستعلیق

اسرارِ محبت

مصنف :- خواب محبت خاں

تاریخ تصنیف :- ۱۰ ذوالحجہ ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۳ء

کاتب : نامعلوم - ۲۵×۱۵ سطور ۱۳ - نستعلیق

سحر البیان (۱)

مصنف :- میر غلام حسن دہلوی

تاریخ تصنیف :- یکم محرم ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء

کاتب :- غلام حسین - ۳۱×۱۴ سطور ۱۴-۱۳ - نستعلیق

سحر البیان (۲)

مصنف : میر غلام حسن دہلوی

تاریخ تصنیف :- ۱۹ ویں صدی

کاتب : نامعلوم -

۱۹×۱۲ سطور ۱۳ - نستعلیق

www.taemeernews.com

قصہ سانول

مصنف :- شیخ دین

تاریخ تصنیف :- ۸ ذوالقعدہ سنہ ۱۲۶۵ھ مطابق سنہ ۱۸۴۹ء

کاتب :- مانک لال۔ ۱۹ × ۲۹ سطور ۱۴ ۔ نستعلیق

بیاض اشعار (انتخاب)

مصنف :- نامعلوم

تاریخ تصنیف :- ۱۹ ویں صدی

کاتب :- نامعلوم - ۱۶ × ۲۳ سطور - مختلف نستعلیق

قصہ معیار چندر بدن

مصنف :- سیف اللہ

تاریخ تصنیف :- سنہ ۱۲۱۰ھ مطابق سنہ ۱۷۹۵ء

کاتب :- نامعلوم - ۱۲ × ۱۸ سطور ۱۰- نستعلیق

دیوانِ شاداں

مصنف :- راجہ چندولال مہاراجہ بہادر شاداں

تاریخ تصنیف :- ۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۳ھ مطابق سنہ ۱۸۲۸ء

کاتب :- محمد الہ الدین حسن ۔ ۱۵ × ۲۳ - ۱۲ - نستعلیق

تعریف روضہ حضرت مخدوم شیخ احمد کھٹورہ

مصنف :- نصرت ابنِ ابی محمد علوی

تاریخ تصنیف :- سنہ ۱۸۴۲ھ

کاتب :- نامعلوم ۱۸ × ۲۳ - نستعلیق

قصہ سبز پوش

مصنف : شاہ رحمٰن

تاریخ تصنیف :- سنہ ۱۸۷۳ء

کاتب :- نامعلوم ۱۰ × ۵

کلیات اقبال بیگم تخلص ترک

مصنف :- اقبال بیگم ترک

تاریخ مصنف :- سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق سنہ ۱۸۹۲ء

کاتب :- اقبال بیگم ترک ۱۹ × ۳۲ نستعلیق

ترکاری نامہ

مصنف :- قابل لکھنوی

تاریخ تصنیف :- سنہ ۱۹۰۳ء

کاتب :- محمد عبدالعزیز ۱۴ × ۲۳ سطور ۱۵ - نستعلیق

سوانح

تذکرۂ مصحفی

مصنف :- غلام ہمدانی مصحفی

تاریخ تصنیف :- ۴؍ جولائی سنہ ۱۸۹۶ء

کاتب :- محمد عبدالعزیز ۱۶ × ۲۵ سطور ۱۰

موسیقی

معدن الموسیقی

مصنف :- کاتب : محمد کرم امام

تاریخ تصنیف :- سنہ ۱۲۸۶ھ مطابق سنہ ۱۸۶۹ء

۱۸ × ۲۹ سطور ۱۵ نستعلیق

شمیم جاوید

کا

پہلا نمائندہ شعری مجموعہ

پیمبرِ گل

(زیرِ طبع)

○ سرورق — صادقین ○ آفسٹ طباعت

ناشر :- غضنفر اکیڈمی آف پاکستان - کراچی

www.taemeernews.com

رسالف رسل

محمود ہاشمی

غلام قادر آزاد

ڈاکٹر سعید اختر درّانی

سلطان محمود

محسنہ جیلانی

قیصر تمکین

مقصود الٰہی شیخ

ش۔ صغیر ادیب

محسن شمسی

بلدیو سنگھ

پروین مرزا

چاند کرن

انگلستان میں مقیم

اردو کے اہلِ قلم

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

رالف رسل

انگریزوں کی اُردو دوستی

انگریز دو سو سال کی طویل مدت تک برصغیر پاک و ہند کے وسیع و عریض علاقوں پر حکمرانی کرتا رہا اور اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں تو تقریباً پورے ملک پر اس کا تسلط قایم ہو چکا تھا۔ ان تاریخی حقایق کی روشنی میں غیر ملکی حکمرانوں کا اس سرزمین کی زبانوں، ثقافت، تاریخ اور زندگی کے دیگر شعبوں کے مطالعہ میں جو حصہ رہا ہے اسے دیکھ کر زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

درحقیقت فوری طور پر جو بات زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا میدانوں میں برطانیہ اپنی تمام تر مساعی کے باوجود اور بھی بہت کچھ کر سکتا تھا اور پھر بعینہٖ اسی انداز سے دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس آگہی پر چنداں تعجب نہ ہونا چاہیے، جب دو ممالک اور اس کے عوام کے درمیان آزادی اور مساوات کے رشتے کے بجائے حاکم اور محکوم کے تعلقات ہوں تو پھر اول الذکر کے ہاں اپنی رعایا کی ثقافت کے بارے میں دلچسپی کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا اور یہ حقیقت کہ میرے اور آپ کے عوام کے درمیان مذکورہ بالا رشتہ تھا اپنی جگہ بجائے خود اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اردو زبان و ادب کے سلسلے میں برطانیہ کی مساعی حسب توقع نہ تھیں۔ کم از کم اضافی طور پر تو یہی بات کہی جا سکتی ہے۔

آپ میں سے چند حضرات فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) اور ہیلی بری کالج (انگلستان) میں جان گل کرسٹ اور اُن کے ساتھیوں اور جانشینوں اور بعد میں آنے والوں مثلاً فیلن (Fallon) اور پلاٹس (Platts)، نے اردو لغت نویسی کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور جس عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر میرے مذکورہ بیان پر حیران ہوں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میری اس رائے سے نہ تو کسی کی حق تلفی ہو رہی ہے اور نہ کسی کے ساتھ ناانصافی ــــ بشرطیکہ آپ اس سارے مقدمے کے بنیادی حقایق پر غور فرمائیں۔

برطانوی دور اقتدار کے طویل عرصے میں لاکھوں انگریز برصغیر میں قیام پذیر ہوئے اور ملازمتیں کیں۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں سے کتنے لوگ ایسے تھے جنھیں اس ملک کی ثقافت سے گہری معلومات تو رہی ایک طرف، گہری دلچسپی بھی تھی، جن پر وہ کم و بیش دو سو سال تک حکومت کرتے رہے۔ آپ فی الحال معتدبہ علم کی بات اٹھا رکھیں، یہ سب اس کے باوجود ہے کہ جب میں اسکول کا طالب علم تھا تو مجھے بہت سنجیدگی کے ساتھ یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ برصغیر میں برطانوی حکومت کا وجود خود محکوم رعایا کے مفاد میں ہے۔

جب میں پہلی بار ۱۹۴۲ء میں ساڑھے تین سال کے قیام کی غرض سے برصغیر آیا تو جس بات نے مجھے سب سے زیادہ

www.taemeernews.com

مشوش کیا وہ بہت بڑے پیمانے پر ــــــ بلکہ یوں کہوں کہ کلّی طور پر برصغیر میں مقیم میرے ہم وطنوں میں اس دانستہ لاعلمی کا احساس تھا جو وہ اس ملک اور اس کی ثقافت کے بارے میں برت رہے تھے۔ لیکن اب وقت کا دھارا اپنا رُخ موڑ چکا ہے اور امتدادِ زمانہ سے ثقافتی رشتوں کی نوعیت بھی بدل چکی ہے اس لیئے میں ماضی پر کم اور حال و مستقبل پر زیادہ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنی بات بہرحال ماضی سے ہی شروع کرنی ہوگی کیونکہ ماضی کے صحیح ادراک کے لیے ان معروضات کو اپنے ذہن میں رکھنا ضروری ہے، خواہ ابھی ابھی میں نے پیش کی ہیں۔

اردو زبان میں برطانوی دلچسپی کا آغاز اٹھارھویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔ اس کی دو مختلف نوعیتیں تھیں۔ ایک شعوری اور دوسری غیر شعوری۔ شعوری کوشش قابلِ تعریف تو ضرور تھی لیکن اس کی کوئی افادی حیثیت نہیں تھی۔ اس گروہ میں وہ انگریز شامل تھے جو اپنے ملک اور گھر بار کو تج کر یہاں آبسے تھے اور انھوں نے فارسی اور اردو کو اپنا لیا۔ موخرالذکر زبان میں شاعری کی اور مشاعروں میں شریک ہوئے۔ اس طرح یہ اُن سامعین کی تعریف و تحسین کے مستحق ٹھہرے جن کی مادری زبان اردو تھی۔ اس قسم کے لوگ مغلیہ سلطنت کے آخری پچاس سال میں خاصی تعداد میں نمودار ہوتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جب مغلیہ دربار کے اقتدار کو گھن لگ چکا تھا۔ لیکن دربار کی شان و شوکت کے پیشِ نظر ملکی اور نوواردقوم کے درمیان ظاہرا طور پر باہمی عزت و وضعداری کا رشتہ ابھی برقرار تھا جس کا ثبوت سلیمن (Sleman) جیسے افراد کی آرا سے مل سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مرزا غالب اور ولیم فریزر (William Fraser) جیسے متنازعہ فیہ اور روشن خیال شخص کے تعلقات کی مثال دی جاسکتی ہے۔ فریزر کے قتل پر غالب نے تاریخ کے نام ایک خط میں اپنے رنج و غم کے اظہار کے بعد یہاں تک لکھا تھا کہ بچپن میں اپنے والد کے انتقال پر افسوس کے بعد اس سانحہ پر انھیں پہلی بار اتنا زیادہ رنج ہوا تھا لیکن اس طرح کے ذوقِ ثقافتی لوگ تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ غدر کی عظیم شورش میں غالب کے کئی دوست اور شاگرد مارے گئے جن میں کئی انگریز بھی شامل تھے۔ وہ اپنے خطوط میں ان سب کا ماتم کرتے ہیں۔ ان مقتولین میں انھوں نے الیگزنڈر ہیڈرلی (Alexander Heatherley) اور جان جیکب (John Jacob) کا بھی ذکر کیا ہے ــــ

رام بابو سکسینہ کی حالیہ تحقیقات (اردو کے انگریز شعرا) سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چند حضرات کے متعلق ریکارڈ موجود ہے۔ وہ کتنے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی درست ہے کہ ان حضرات (انگریز شعرا) کی اردو زبان و ادب کے سلسلے میں خدمات صفر کے برابر ہیں۔ ان میں ایک کا بھی مطمحِ نظر یہ نہیں تھا کہ وہ دونوں ثقافتوں کے درمیان اتحادِ فکر و نظر کی کوشش کرے اور نہ ان کا یہ مقصد تھا کہ وہ مشرقی ثقافت میں اپنے آپ کو ضم کرلیں۔ یا دوسرے کو اپنی ثقافت میں ضم کرلیں۔ اور ہمیں اس پر تعجب بھی نہیں ہونا چاہیے ــــــ

اردو زبان و ادب میں دلچسپی کی دوسری قسم برطانوی سامراج کی ضروریات کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ کیا یہ تاریخ کی بوالعجبی نہیں ہے کہ اس دلچسپی کے پیشِ نظر نوواردقوم کے بعض افراد نے سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر ایسے اقدامات کیئے جن سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ جان گل کرسٹ اور ان کے ساتھیوں نے حاکم و محکوم اقوام کے درمیان سیاسی سطح پر رابطہ قائم کرنے کے لیے اردو کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی تاکہ حکمراں جماعت کے افراد برصغیر کی مقبول عام زبان میں شد بد پیدا کر کے ملکی معاملات بخوبی انجام دے سکیں۔ فورٹ ولیم کالج اسی حکمتِ عملی کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ کالج سے

www.taemeernews.com

متعلق مصنفین کی تصانیف کی مقبولیت کے پیشِ نظران کے متعلق تفصیلی اظہار غیر ضروری ہے۔ لیکن ان تصانیف کے بارے میں دو ایک نکات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلا نکتہ یہ کہ کالج سے متعلق تمام مصنفین اور اُن کے آجر ادب سے زیادہ زبان میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان تمام تصانیف کے بارے میں برطانوی نقطۂ نظر افادی تھا اور یہ کہ کہانیوں کا اندازِ تحریر ایسا دل نشیں ہو کہ طلبۂ (انگریز) اسے دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرسکیں۔ یہ وہ مقصد تھا جو نثر کی دیگر اقسام سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ قصوں اور کہانیوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ کالج کے منشی بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ان کے آجر سادہ اور بے تکلف نثر میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس احساس کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی دانست میں ایسے قصے لکھے جو ادبی پیرائے میں بیان کیے گئے تھے۔ جیسے میرامّن کی باغ و بہار یا قصۂ چہار درویش۔

خود برطانیہ میں بہت پہلے ہی اس قسم کی کہانیاں فکشن (Fiction) کے دائرے سے باہر ہوچکی تھیں اور ڈیفو (Defoe) سوئفٹ (Swift) رچرڈسن (Richrdson) فیلڈنگ (Fielding) اسمولیٹ (Smollett) اور اسٹرن (Sterne) اٹھارھویں صدی کے ان چند نامور ناول نگاروں یا ناول کے انداز میں دلچسپ قصے لکھنے والوں میں تھے جنھوں نے جدید حقیقت پسندی کو اعلیٰ معیار عطا کیا۔ اس قسم کے طرزِ تحریر کو اوائل انیسویں صدی کے اردو ادب میں سمویا نہیں جاسکتا تھا۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اس رجحان سے قطعًا ناواقف تھے۔ اگر وہ ان سے واقف بھی ہوتے تو ان کے معیار پر پورے نہ اترتے۔ اردو میں یہ رجحان تقریبًا اسّی سال بعد ہی ممکن ہوسکا جس کا بیّن ثبوت مرزا رسوا کا ناول امراؤ جان ادا ہے۔ اس ناول کے بعد ہی اردو میں جدید حقیقت پسندی کے میلانات پنپ سکے۔ اس طرح اُردو نثر بامِ ثریا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ (امراؤ جان ادا کا سالِ طباعت ۱۸۹۹ء) ہے۔

دوسرے یہ کہ ان ادیبوں (فورٹ ولیم کالج) کے اردو ادب پر اثرات بھی متنازعہ فیہ مسئلہ ہیں۔ ٹی گراہم بیلی (T. Grahame Bailey) جیسے برطانوی مصنفین نے صورتِ حال کی صحیح اور معقول صراحت کے بجائے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوکر اس کے اثرات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے برعکس محمد صادق اپنی تاریخ میں اسی رائے کے بالکل مخالف سمت کی ترجمانی میں پیش پیش ہیں۔ اور یہ بات بھی عیاں ہے کہ باغ و بہار کا اثر نہ تو فوری تھا اور نہ اتنا جاندار کہ ہم گراہم بیلی کی بات کو من و عن قبول کرلیں۔ بیلی کی یہ رائے اگر درست ہوتی تو رجب علی بیگ سرور اسے ہدفِ تنقید نہ بناتے۔ اگر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے اثرات کا باقاعدہ اور مفصل مطالعہ اور جائزہ لیا جائے تو بہت سے دلچسپ نتائج برآمد ہوں گے۔

تیسرے یہ کہ میں ان برطانوی مصنفین کی مساعی پر بھی کچھ اظہارِ خیال کروں گا جنھوں نے فورٹ ولیم کالج کے لیے چند کتابوں کے ترجمے کیے اور چند کتابیں ترتیب دیں۔ ان مصنفین کی تعداد خاصی ہے اور وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں جس کے باعث آج بھی انھیں عزت و توقیر ملنی چاہیے۔ مثلاً میں آج بھی اپنے طلبہ کی توجہ باغ و بہار کے اس ترجمہ کی طرف مبذول کراتا رہتا ہوں جسے ڈنکن فاربس (Duncan Forbes) نے مرتب کیا تھا۔ ہرچند کہ میرے دوست ایس۔ ایم تیماہ نے مجھ سے کہا تھا کہ فاربس نے اپنے ایک پیش رو کے ترجمہ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے جس کا نام اس وقت میرے ذہن سے محو ہوچکا ہے۔ میں یہاں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ اس دور کے برطانوی مصنفین کا علمی اخلاق تجارت کے میدان میں

www.taemeernews.com

اپنے ہم عصروں کے اخلاق سے بہت بلند نہ تھا۔ گل کرسٹ اور اس کے فوری بعد کے عہد میں جس تیز ابیت کے ساتھ یہ برطانوی دانشور ایک دوسرے کے خلاف جس قسم کی محاذ آرائیوں میں مبتلا تھے وہ ہمیں سودا کی ہجویات کی یاد دلاتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف تک فورٹ ولیم کالج کے عہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی تک برطانوی مصنفین نے علم و ادب کی کوئی قابلِ ذکر خدمت نہیں کی۔ یہاں دوبارہ سیاسی فضا فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ۵۹-۱۸۵۷ء کی عظیم شورش کے زمانے میں اردو بولنے والی آبادی اور انگریزوں کے درمیان باہمی نفرت کی فضا پروان چڑھی۔ اگر اسے باہمی نفرت کا نام نہ دیا جائے تو اسے باہمی عداوت اور ناپسندیدگی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ کوئی غیر فطری بات بھی نہیں تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک برطانوی باشندوں کی جانب سے ہنٹر (Hunter) اور مسلمانوں کی طرف سے سر سید احمد خاں جیسی شخصیات منظرِ عام پر نہ آئیں جنھوں نے حالات کا جائزہ لے کر افہام و تفہیم، باہمی اشتراکِ عمل اور ذہنی آمادگی کے لیے راہیں ہموار کیں۔ اگر اس طرح کے لوگ منظرِ عام پر آتے تو فریقین میں ارتباطِ ذہنی کی فضا پیدا نہ ہوتی اور نہ اردو زبان و ادب میں برطانوی باشندوں کی دلچسپی۔

یہ تعجب خیز امر ہے کہ نئی حاکم قوم کے افراد نے لغت نویسی کے میدان میں اعلیٰ قسم کا کام سر انجام دیا۔ اگر صرف دو ناموں پر ہی اکتفا کیا جائے تو ان میں پہلے فیلن کا نام آئے گا۔ اور پلیٹس اس کا پیش رو ثابت ہوا۔ ان دونوں نے لغت نویسی کے میدان میں اعلیٰ درجے کا کام کیا۔ میرے لیے یہ بات ہمیشہ موجبِ استعجاب رہی ہے کہ یہاں پلیٹس کے مقابلے میں فیلن کا کام زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اگر میری یادداشت درست ہے تو اس کا نام مولوی عبدالحق کی اردو لغت نویسی کے جائزے میں بھی نظر نہیں آتا جو اسٹینڈرڈ اردو ڈکشنری کے مقدمہ[1] میں موجود ہے جو کنسائز آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے طرز پر تیار کی گئی ہے۔ دوسرے علما کی طرح پلیٹس کی لغت بھی کمزوریوں سے پاک نہیں ہے۔ اس نے اپنے پیش رووں سے استفادہ تو ضرور کیا ہے لیکن واللہ اعلم اسے ناروا طریقہ پر پوشیدہ رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اس نے برطانوی راج کی اردو بولنے والی رعایا کی مساعی کا بھی اعتراف کرنے میں کسرِ شان سمجھی جن کے کاموں سے اس نے خوشہ چینی کی تھی۔

میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی انگریز ماضی یا مستقبل میں اس پائے کی لغت اس وقت تک مرتب نہیں کر سکتا جب تک وہ ان افراد کا تعاون حاصل نہ کرے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ یہ امر باعثِ شرم ہے کہ پلیٹس کی لغت میں ان حضرات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جن کے اشتراکِ عمل کے بغیر اس طرح کے اعلیٰ پائے کا کام وجود میں ہی نہ آتا۔ بہر حال پلیٹس اور ان کے نامعلوم معاونین کا کام اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ایسے کسی ایک برطانوی کا نام بتاؤں جس نے اس شعبہ میں دیگر تمام مساعی کو پیچھے چھوڑ دیا ہو تو بہت سوچ بوجھ کے بعد میرا یہی فیصلہ ہوگا اور میں صرف پلیٹس ہی کا نام لوں گا۔ یہ مقامِ تعجب ہے کہ اس کی ہندوستانی گرامر نے مجھے بہت کم متاثر کیا۔

پلیٹس کے علاوہ ایک اور شخص جس نے اس میدان میں قابلِ ذکر خدمت انجام دی ہے وہ کیمپسن (Kempson) ہے جو شمال مغربی صوبہ (بعد میں یوپی) کے محکمۂ تعلیمات سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ کیمپسن ہی تھا جس نے ڈپٹی نذیر احمد کی اردو

---

[1] مولوی صاحب نے اس مقدمہ میں پلیٹس کی لغت کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ اس کی قواعدِ اردو مطبوعہ ۱۸۷۴ء (لندن) کا ذکر اپنی قواعدِ اردو کے مقدمہ میں کیا ہے۔ قواعدِ اردو مقدمہ ص ۳۴ مطبوعہ لاہور (مدیر)

www.taemeernews.com

فلکشن میں ندرت پسندی کو دریافت کیا۔ توبۃ النصوح کے انگریزی مدیر یا مترجم (جو کسی قدر مختصر ہے) انگریزی قارئین کی توجہ کا باعث نہ بن سکا (پہلے پانچ ابواب کا ترجمہ بعد میں ہوا) بہر حال یہ وہ ترجمہ ہے جس کی جانب میں اپنے طلبہ کی توجہ مبذول کراتا رہتا ہوں۔ گو کہ اس کی بعض تراکیب موجودہ نسل کے لیے اجنبی اور دقت طلب ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ میری نسل کی طرح موجودہ نسل لاطینی قواعد سے بخوبی واقف نہیں۔

اس کے بعد مراۃ العروس کا ایک ایڈیشن جی۔ ای۔ وارڈ (G. E. Ward) نے رومن رسم الخط اور ساتھ ہی اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔ مذکورہ دونوں کتابیں میں اپنے طلبہ کے لیے بہت مفید سمجھتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں انھیں ان کتابوں کے مطالعہ کی سفارش کرتا رہتا ہوں۔ میرے خیال میں نذیر احمد اردو نثر کے ایک ایسے فقید المثال ماہر تھے اور ہیں جن کی نثر کی توانائی ان کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نصاب میں اس کی شمولیت کو ایک صحیح فیصلہ سمجھتا ہوں۔

وارڈ کے اس کارنامے کے بعد کام کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی۔ دو عظیم جنگوں کے درمیان ہندوستان میں مقیم برطانوی افسران کے لیے دیسی زبانوں کی ضرورت بھی محدود سے محدود تر ہوتی گئی۔ اب دیسی زبان کا مصرف یہ رہ گیا تھا کہ میم صاحب کو اپنے خانساماؤں اور صاحب بہادروں کو اپنے ماتحت سپاہیوں پر حکم چلانے کے لیے ٹوٹی پھوٹی زبان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اردو زبان سکھلانے کے لیے کورس بھی اسی طرز کے تیار کیے جانے لگے۔ جن میں سائیسوں اور خانساماؤں کے ساتھ گفتگو کو خاصی اہمیت دی جاتی تھی۔ جس کا ثبوت ہالرائڈ (Holroyd) جو پنجاب میں اپنے کام کی وجہ سے مشہور ہیں، اور ڈی۔ سی۔ فلٹ (D. C Phillott) کی ہندوستانی مینول (Hindustani Manual) اور ہندوستانی اسٹمبلنگ بلوکس (Hindustani Stumbling-Blocks) ہیں۔ یہ بات خاصی دلچسپی کا موجب ہے کہ اس عہد میں فلٹ جب اردو ادب کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے جس کتاب کا انتخاب کیا وہ سعادت یار خاں رنگین کی وہ کتاب تھی جس کا تعلق گھوڑوں کی اقسام اور ان کی نسل سے ہے۔ اس دور کے علما ادبی کاموں کے بجائے فوجی اہمیت وضرورت کی تحریروں پر زیادہ زور دیتے تھے۔ میرے زمانے میں ہندوستانی فوج میں برطانوی افسران کی تعلیم کے لیے دو کتابیں منظور کی گئی تھیں (وہ بھی نچلے معیار کی تھیں) ابتدائی جماعتوں کے لیے "ہمارے سپاہی اور سوار" اور ثانوی جماعتوں کے لیے "خواب وخیال"۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے ایک سپاہی کی داستان ہے، جس کا ذیلی عنوان ہے: "سپاہی سے صوبہ دار تک"۔ یہ کتاب انگریزی سے اردو میں دوبارہ منتقل کی گئی ہے۔ حالانکہ اصل میں یہ کتاب اردو ہی میں تھی لیکن اب اس کا مطبوعہ نسخہ یا مخطوطہ ناپید ہے۔

فلیٹ کے بعد اس کا کام منشیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ان میں ایک سہگل اور دوسرے نسبتاً معروف منشی صدیق احسن خان ہیں۔ ان منشیوں کا کام کئی وجوہ کی بنا پر مفید ہے لیکن ان کی ساری تصانیف شکایتوں اور احکامات کے گرد گھومتی ہیں۔ مثلاً "یہ تازہ نہیں ہے"۔ "تم چاق وچوبند نہیں ہو"۔ اور اسی طرح کے دوسرے جملے۔ یا ان جوانوں سے متعلق جو بیماری کی رخصت پر جا رہے ہوں۔ یا محاذ جنگ یا گولیوں کی بوچھار میں۔ یا ان جمعداروں کے متعلق جو کسا ڈی میں راشن لینے جا رہے ہوں۔

آزادی کی آمد آمد ایک خوش گوار تبدیلی کا سبب بن سکتی تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب پرانے برٹش پبلک اسکول کے اسٹائل نے منشیانہ طرز تحریر کی جگہ لے لی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر زندہ زبان کو اس طرح برتا جاتا ہے جیسے وہ مردہ ہو۔ اب گولیوں کی بوچھار کی زد میں آنے والے جوانوں کے متعلق جملوں کی جگہ ایسے جملے نظر آتے ہیں جیسے "گناہ گار گناہ کرتے رہتے ہیں"

www.taemeernews.com

"بکچھ بھیڑوں کے چار سینگ ہوتے ہیں" "ہم نے سڑک پر راجہ کا ہاتھی دیکھا" "گاؤں کی لڑکیاں آسانی سے گھبرا جاتی ہیں اور چیخ اٹھتی ہیں"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کی آزادی کے بعد درس و تدریس کے سلسلے میں جب میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہوا تو انگریزی بولنے والے اردو کے طالب علموں کے لیے ہر طرح سے نئی کوششیں کرنی پڑیں۔ جو ابھی تک جاری ہیں۔ اب میں بطور تمہید جو کچھ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۷۲ء تک کی بابت ہے۔ میں اس عرصے میں ایک برطانوی دانش گاہ میں اردو کا واحد کل وقتی استاد تھا۔ اس لیے اگر آپ مجھے معاف فرمائیں تو میں چند لمحوں کے لیے ان کوششوں کا ذکر کروں جو اس میدان میں خود میں نے کی ہیں۔

سب سے پہلے میں نے پاکستان اور ہندوستان کے چند دوستوں اور ساتھیوں کے مشوروں اور تعاون سے اردو ادب کا مطالعہ کیا۔ ان کرم فرماؤں میں خورشید الاسلام، عزیز احمد اور اورنٹیل کالج کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو میں ۱۹۵۰ء سے بحیثیت ایک دوست اور ساتھی کے جانتا ہوں۔ ان حضرات کے علاوہ خالد حسین قادری صاحب ان دوستوں کی فہرست میں شامل ہیں جن سے وقتاً فوقتاً مجھے تعاون حاصل رہا۔ ان دوستوں کے مشورے سے میں نے اردو ادب کے مطالعے کی ایک بنیاد وضع کی، جو آزادی کے بعد پیدا شدہ حالات و تقاضوں کے پیش نظر باہمی عزت و توقیر کے جذبات پر مبنی ہو۔ جو ایک حاکم و محکوم کے افراد کے مابین ناممکن العمل تھا۔ میں آپ کو اس گفتگو کے اطناب سے زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ اور اس کا ذکر عمومی حد تک محدود رکھوں گا۔

میری حقیر کوششوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ تشکر خراج تحسین ایک اردو بولنے والے صاحب کی ہسپانوی بیوی کی طرف سے موصول ہوا جو مارکیٹ میں دستیاب کتابوں کے مطالعے سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہو کر میرے مرتب کردہ کورس کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اس نے کہا تھا ــــــ "یہ کورس انسانوں کے لیے لکھا گیا ہے"۔ یہ رائے مجھے سب سے زیادہ باعثِ مسرت محسوس ہوئی۔ اردو زبان کے مطالعہ اور ادب کی تفہیم واقعتاً انسانوں کے لیے ہونی چاہیے۔ اور وہ اس طرح سے کہ انگریزی اور اردو بولنے والوں کے درمیان بحیثیت انسان کے باہمی تعلقات پر یکساں زور دیا گیا ہو۔

اس سلسلہ میں کناڈا اور امریکہ میں ہونے والے کام پر گفتگو کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی میں مختصراً پروفیسر ایم۔ اے آر بارکر اور ان کے اردو بولنے والے ساتھیوں کی مساعی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا سارا کام میری طرح جذبۂ سرشاری کا نتیجہ ہے۔ اس کام پر پاکستان میں جو تنقید کی گئی اس سے میں بے خبر نہیں ہوں، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس تنقید کے کچھ حصوں سے میں متفق بھی ہوں۔ لیکن ہم میں سے کون ہے جو غلطیوں سے مبرا ہے۔ اس لیے بارکر آپ کی اور میری عزت و توقیر کے مستحق ہیں۔ خاص طور پر اس احتیاط اور خلوص کے لیے جن کا مظاہرہ انھوں نے اردو کی توسیع اور ترویج کے سلسلے میں کیا ہے۔

اپنی حد تک میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ اپنی باقی ماندہ عملی زندگی (جس کے چھ سال فوجی ملازمت کی نذر ہو گئے) ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے صرف کر سکوں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۱ء سے اس پر عمل پیرا ہوں، جب کہ لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ برطانوی عوام میں اردو زبان سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں اردو ادب کے چند

www.taemeernews.com

بہترین نمونوں کے ترجمے اور ان کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لوں اور ساتھ ہی زبان کی تدریس کے لیے ایک ایسا نصاب مرتب کروں جو موجودہ دور کی ضروریات پر پورا اترتا ہو۔ ساتھ ہی ایسی کتابیں بھی مرتب کروں جو طلبا زیادہ سے زیادہ ذوق و شوق سے مطالعہ کریں۔ ان کتابوں میں الفاظ کے معانی کے ساتھ حواشی بھی درج کروں تاکہ طلبا اپنی لغت میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر سکیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بہت سے نظم و نثر پر مشتمل متون بمعہ حواشی مدون کروں اور آخر میں تازہ ترین اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغات مرتب کروں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اسے ایک انگریز تنِ تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ اس سلسلے میں بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کی محبت اور تعاون کے لیے ان کا شکر گزار ہوں جن کا میں نے کچھ دیر قبل ذکر کیا تھا۔ لیکن ان کرم فرماؤں میں سے ایک شخص کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہیں خورشید الاسلام صاحب، جو سر دست مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔ اور دنیا کے اس حصہ میں میرے قریب ترین دوست رہے ہیں۔ اس وقت اردو شاعری میں جو سوجھ بوجھ مجھ میں پیدا ہوئی ہے اس کے لیے میں ان کا سپاس گزار ہوں۔ ہم دونوں کے ذوق، دلچسپیاں، آراء اور ادب کے عمومی مطالعہ اور وسعت اس قدر یکساں ہے کہ اس سے زیادہ مثالی اشتراک مشکل ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ ان کے ساتھ مل کر میں نے دو کتابیں تالیف کی ہیں جو ہم دونوں کے ناموں کے ساتھ شایع ہوئی ہیں۔

کچھ لوگ کہیں گے یہ عالمانہ کتابیں نہیں ہیں۔ اور ان حضرات کے الفاظ کو انھی معنوں میں لیتے ہوئے جن کے اظہار کے لیے وہ استعمال ہوئے ہیں خورشید صاحب اور میں بہ خوشی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معاملہ ایسا ہی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے یہ کتابیں علما کے لیے نہیں لکھی ہیں بلکہ ان مردوں اور عورتوں کے لیے جو اپنے علاوہ بھی دیگر انسانوں سے محبت کرتے ہیں ان کی ثقافت میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی بہتر تفہیم کے خواہاں ہیں۔

ہماری پہلی کتاب "تین مغل شعرا" (Three Mughal Poets) ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب ان خواتین و حضرات نے بھی پسند کی جنھیں اس کے مطالعے سے قبل یہ تک معلوم نہ تھا کہ اردو کیا ہے۔ ان میں سے ایک ماہر معاشیات، ایک ماہر ریاضی، ایک استاد اور ایک کم سن بچوں کی ماں ہے۔ کسی عالم یا ناقد کی تعریف ہمارے لیے اس قدر باعث تقویت ثابت نہ ہو سکی جس قدر ان متفرق شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی آرا۔

ہماری دوسری کتاب "غالب، زندگی اور خطوط" (Life & Letters of Ghalib) ہے جو ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر شایع کی گئی تھی۔ اور اب ہم تیسری کتاب پر کام کر رہے ہیں جو زیادہ مشکل ہے اور وہ ہے انگریزی داں عوام کے لیے غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے مبسوط انتخاب کا ترجمہ۔ دریں اثنا اردو زبان کے کورس کی تدوین کا کام مکمل کر چکا ہوں جس کا میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا دلچسپ انتخاب بھی مرتب کر چکا ہوں جو اخبارات کے اقتباسات اور دوسرا نثری ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ دونوں ابتدائی کتابوں کی صورت اختیار کرے گی۔

۱۹۶۹ء میں خورشید صاحب علی گڑھ سے رخصت لے کر لندن آئے تاکہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے لیے کل وقتی کام کر سکیں۔ ان کے ساتھ میں بھی اس منصوبے میں شریک تھا۔ اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ ہم پلیٹس کی اردو انگریزی ڈکشنری پر نظر ثانی کریں اور اس میں کچھ اضافے بھی کریں (اس طرح نہیں جیسا کہ اس سے پہلے کی انگریزی۔ اردو لغتوں میں ہوا ہے) اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اردو کے انگریزی داں طبقہ کی ضروریات کا بھی خیال رکھیں۔ اور ان لوگوں کا بھی جن کی مادری زبان اردو ہے

اس کام کے لیے بارہ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ درکار ہوگا۔ بہرحال کام آگے بڑھ رہا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ وقت، روپیہ اور صبر وتحمل اختتام کار تک ہمارا ساتھ دے سکیں گے۔

ہمارا ایک اور بھی منصوبہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اردو ادب کی ایک مبسوط و جامع تاریخ لکھیں۔ خورشید صاحب کا تعاون حاصل رہا اور ساتھ ہی اگر زندگی بخیر رہی تو ممکن ہے آیندہ پندرہ سال میں اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں اگر ایسا ہو سکا تو میں اطمینانِ قلب کے ساتھ مر سکوں گا۔ اور یہ کہ جس زبان وادب سے مجھے لگاؤ تھا اس کی میں نے حتی المقدور خدمت انجام دی۔

میرے لیے یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ حالیہ چند برسوں میں بہت سے برطانوی علما اس میدان میں سرگرم عمل رہے اور انھوں نے قابلِ قدر کام انجام دیے۔ اس سلسلے میں وکٹر کیرنن (Victor Kiernan) کا نام لیا جانا چاہیے۔ ان کی کتاب "اقبال کی نظمیں" (Poems of Iqbal) ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران شایع ہوئی تھی۔ اور تا حال اقبال کی اردو شاعری کا انگریزی میں شایع ہونے والا یہ کافی مقبول انتخاب ہے۔ اقبال کی فارسی شاعری پہلے ہی مغربی مترجمین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا چکی ہے۔ اس کے علاوہ حال ہی میں انھوں نے "فیض کی نظمیں" (Poems of Faiz) کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے ترجمہ کے سلسلے میں انھیں لاہور کی جانی پہچانی شخصیت نذیر احمد، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کا بے مثال مدد و تعاون حاصل رہا۔

حال ہی میں میرے جونیر ساتھی ڈیوڈ میتھیوز (David Matthews) اور کرسٹفورڈ شیکل (Christopher Shackle) نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی نیابتاً امداد سے۔ (An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics) یعنی "انتخاب غزلیات" شایع کی ہے اس کتاب پر ایک پاکستانی رسالہ آوٹ لک (Outlook) کراچی بابت ۲۴ فروری ۱۹۷۳ء میں محمد میاں نے ایک بہت ہی سخت تبصرہ لکھا تھا۔ کیا میں برسبیل تذکرہ کہہ سکتا ہوں کہ ہرچند کہ ان صاحب کے لیے ایماندارانہ طور پر اپنے خیالات کے اظہار کا حق تسلیم کرتا ہوں خواہ وہ خیالات وآرا کتنی ہی سخت کیوں نہ ہوں۔ محمد میاں صاحب بھی اس حق کے اتنے ہی مستحق ہیں جتنا کوئی اور — لیکن میری ناقص رائے میں اس درجہ مخاصمت اور درشت رویہ بہت مضبوط بنیادوں پر استادہ نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں مدیران نے بہت ہی مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا۔ اگر یہ حضرات کسی اردو داں سے مدد واستفادے کے طالب ہوتے تو میرا خیال ہے کہ انھیں مایوسی نہ ہوتی۔ اور یقیناً انھیں قرار واقعی مدد ملتی لیکن ان کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کے باوجود وہ اردو کے بہی خواہ ہیں اور ایک دوست کی کاوش چاہے وہ کتنی ہی نقائص سے پُر اور ناکافی ہو جا بیجا تنقید کے باوجود جذبۂ ستایش کی مستحق ہے۔

دوسرا اہم اور مفید لیکن مشکل کام (جو ایک عرصے تک عبوری نوعیت کا رہے گا) ان دنوں اسکول آف دی ایشین اسٹڈیز (Soas) میں جاری ہے۔ ہمارے ہاں بی۔ اے سلیبس اردو کے لیے کئی نصابی کتابیں ایسی ہیں جن میں حواشی اور ضروری لغت دوہرے (Duplicate) انداز میں درج ہیں۔ یہ کام بھی زیادہ تر ڈیوڈ میتھیوز اور کرسٹفورڈ شیکل نے کیا ہے۔ جس کے لیے وہ تعریف وستایش کے مستحق ہیں۔ جب پڑھنے پڑھانے کے دوران بار بار ان کی صحت پر توجہ دی جائے گی تو اس طرح نظرِ ثانی ہوتی رہے گی۔ اور انھیں روزمرہ کی ضرورت کے پیشِ نظر پرکھا جا سکے گا۔ پھر میں عبوری نوعیت کا کام باقاعدہ

www.taemeernews.com

تدوین شدہ متون کی جگہ لے لے گا۔ اور اس طرح کیمپسن (Kempson) کی روایت نہ صرف زندہ ہو جائے گی، بلکہ جاری بھی رہ سکے گی۔

میں اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے اپنے پاکستانی دوستوں اور ساتھیوں سے یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ جو کام برطانوی علمائے کیا ہے اور جو کر رہے ہیں یا آئندہ کرتے رہیں گے۔ وہ ان کی توجہ اور مدد کے مستحق نہیں ہیں۔ اردو کے مفادات اس حقیقت کے متقاضی ہیں کہ غیر اردو دنیا پر اس زبان کی قدر و قیمت ظاہر کرنے کی ہر قسم کی سعی کی جائے۔ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر وہ کوشش خواہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو ان تمام حضرات کے اشتراک و تعاون کی مستحق ہے جنھیں اردو زبان و ادب سے محبت ہے۔ اور اردو سے اس ملک کے عوام سے زیادہ محبت کون کر سکتا ہے جن کی قومی زبان اردو ہے۔

اردو زبان و ادب کے ماہرین اس رائے کو اگر تنقید پر محمول نہ کریں تو میں عرض کروں گا کہ اردو زبان و ادب کا مطالعہ ابھی تک دورِ طفلی سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ آپ ان تمام بڑے شعرا اور نثر نگاروں کے بارے میں خیال فرمائیں جن کی تصنیفات کے اب تک کوئی قابلِ اعتبار اور باقاعدہ تدوین شدہ متون کبھی نہیں چھپ سکے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال مرزا سودا کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے چوٹی کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ پھر آپ یہ بھی سوچیے کہ عظیم فن کاروں کی زندگیوں اور کام پر آپ کے ہاں کتنے ایسے کام ہوئے ہیں جنھیں آپ کافی سمجھ سکیں۔ صرف غالب اور اقبال پر جامع کام ہوئے ہیں۔ لیکن اور بھی بہت سے ادیب و شاعر ہیں جو غالب و اقبال کے ہم پلّہ نہ سہی کم از کم تقابلی طرز کی توجہ کے ضرور مستحق ہیں۔

مجھے اس کا علم ہے کہ پچھلے چند برسوں میں پاکستان کے کچھ اداروں اور افراد نے اس سلسلہ میں کافی کام کیے ہیں۔ امتیاز علی تاج (جن کے قتل سے اردو زبان و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے) کے زیرِ نگرانی مجلس ترقی ادب لاہور نے کلاسیکی ادب کی اشاعت کے سلسلے میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ اردو کے بہی خواہوں کے لیے باعثِ تسکین و راحت ہے۔ اسلم فرخی کا محمد حسین آزاد پر، ظہیر فتح پوری کا مرزا رسوا پر اور اقتدار احمد صدیقی کا نذیر احمد پر (اس وقت یہی تین نام میرے ذہن میں آ رہے ہیں) ایسے کام ہیں جنھیں مثال بنا کر اگر اردو کے دیگر بڑے ادبا کے لیے بھی ایسی ہی دقتِ نظری کا مظاہرہ کیا جائے تو پھر کہیں جا کر ہمیں یہ اطمینان ہونا شروع ہوگا کہ اردو ادب کی قرار واقعی خدمت کی جا رہی ہے۔

اورنٹیل کالج ایسی درس گاہ ہے جس نے پچھلی ایک صدی میں علم و ادب کی ترقی و ترویج میں شاندار حصہ لیا ہے۔ کالج اور اس کے پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کانفرنس کے انعقاد سے ایسی خدمت انجام دی ہے جس کے لیے وہ ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

سید انور کی تصنیفات

1. ایک اور سومنات (بحریہ پر پہلا اردو ناول) ۱۹۸۰ء
2. سورج بھی تماشائی (افسانوں کا مجموعہ) ۱۹۷۲ء
3. منزل کی طرف 〃 〃 ۱۹۵۰ء
4. آگ کی آغوش میں 〃 〃 ۱۹۵۶ء

www.taemeernews.com

محمود ہاشمی

ہم یہاں کیسے پہنچے؟

پہلا رابطہ

انگریز ہندوستان میں ۱۶۳۹ء میں پہنچے۔ جب انھوں نے اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلی تجارتی چوکی قایم کی حالات بڑے ناسازگار تھے اور انھیں مقامیوں (بقول انگریز نیٹوز) سے زیادہ ان پرتگیزی اور فرانسیسی ہم بازوں سے نبٹنا تھا۔ جو شمالی ساحل کے بڑے بڑے شہروں میں پہلے ہی سے اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ انگریزوں کو سو سال سے زیادہ عرصے تک جدوجہد کرنا پڑی تب کہیں جا کے ۱۶۶۰ء میں اُن کی رسائی بمبئی اور ۱۶۹۶ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ آخر کار ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدانِ جنگ میں انھوں نے اپنی برتری منوائی۔ پھر وسیع و عریض ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قایم کرنے کے لیے ایک نئی خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھے اور ہم تک پہنچے، جو ہزاروں میل دور جنوب میں رہتے تھے ——

اس دوران انگریز نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے ہے جن کی تہذیبی اور علمی روایات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ جنھیں اپنی تاریخ اور تمدن پر ناز ہے۔ اور جنھیں راہ پر لانے کے لیے بڑی سیاست اور بصیرت کی ضرورت ہے ——

یہ بصیرت لارڈ میکالے نے مہیا کی۔ ۱۸۱۳ء میں کمپنی نے "ادب کی تجدید و ترقی، نیز علماء و فضلا کی حوصلہ افزائی، اور ہندوستان کی عمل داری میں رہنے والوں کو سائنسی علوم سے متعارف کرنے اور فروغ دینے کے لیے" ایک لاکھ روپے سالانہ کی گرانٹ منظور کی۔ آیندہ بیس سالوں میں آہستہ آہستہ اسے ایک باقاعدہ پالیسی کی صورت دے دی گئی، اور لارڈ میکالے نے اس کی وضاحت یوں کی :- "ہمیں انتہائی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایک ایسا طبقہ پیدا کریں جو ہمارے ان کروڑوں افراد کے درمیان جن پر ہم حکومت کرتے ہیں ترجمان کا کام کر سکے۔ یہ طبقہ ایسے افراد کا ہو جو خون اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی ہو۔ لیکن جن کا ذوق، خیالات، طور و اطوار اور ذہن انگریزی ہو۔ یہ کام اس طبقے پر چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کی دیسی زبانوں کو سنوارے۔ انھیں منظم علوم کی مغربی اصطلاحات سے مالا مال کرے اور درجہ بدرجہ انھیں ایک ایسا موزوں ذریعۂ اظہار بنائے۔ جس کے ذریعے علم ساری آبادی تک پہنچ سکے ــ"

اس پالیسی کا بنیادی اصول "ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" (اوپر سے نیچے) تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ تعلیم صرف راجوں مہاراجوں نوابوں اور جاگیرداروں کے بیٹوں، بھتیجوں کو دی جائے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو علم کی یہ روشنی ان کے ذریعے نچلے طبقوں میں پھیلے گی اور تعلیم کا یہ سلسلہ "اوپر سے نیچے کی طرف" آ کر عوام تک نتھر نتھر کر پہنچتا رہے گا ——

www.taemeernews.com

یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے انگریز کا قرب حاصل کیا، وہ ریاستوں کے راجے اور بڑی بڑی جاگیروں اور زمینوں کے مالک تھے۔ لیکن محلات اور حویلیوں میں پل کر جوان ہونے والے ان خانزادوں کو تعلیم سے وہ دلچسپی پیدا نہ ہو سکی جس کی انگریز کو توقع تھی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر کتابوں کے ساتھ سر مارنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ "ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" والا اصول جس کی رو سے کلچر کو اس اونچے سماجی طبقے سے نیچے کے طبقوں تک پہنچنا چاہیے تھا بار آور نہ ہوا۔ کہاں راجوں مہاراجوں اور جاگیرداروں کے محل زادے اور کہاں ملازموں اور مزارعوں کی مٹی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی مخلوق! علم کی روشنی اوپر سے نیچے کی طرف کیسے آتی؟ راستے میں سو سو دیواریں کھڑی تھیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ انگریزی ذوق۔ انگریزی اطوار اور انگریزی ذہن اپنانے میں ان میں سے بعض تیز نکلے۔ اور نئی تعلیم پانے کے بعد انگریزوں سے بڑھ کر انگریز بن گئے۔ اس طرح ہندوستان میں ایک نیا طبقہ پیدا تو ہوا۔ لیکن اس کی افادیت صرف ان تک ہی محدود رہی۔ حکمران انگریز کا مسئلہ پورے طور پر حل نہ ہو سکا ——

اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ اعلیٰ تعلیم ان کو دی جائے گی جو اسے خود حاصل کرنا چاہیں گے۔ اعلیٰ تعلیم سے مراد انگریزی زبان میں انگریزی طرز کی تعلیم تھی۔ اس کے لیے ہائی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں انتظام کیا گیا۔ لیکن پرائمری تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ یہ ضروری اور ابتدائی مرحلہ افراد کے شوق اور ہمت پر چھوڑ دیا گیا۔ گنے چنے افراد کے لیے یہ راہ عیسائی مشنریوں کے قایم کیے ہوئے اسکولوں نے ہموار کی۔ ان اسکولوں کی فیسیں اور دوسرے اخراجات عام والدین کی برداشت سے باہر تھے۔ چنانچہ یہاں جاگیرداروں زمینداروں اور سرمایہ داروں کے بچے تعلیم اور تعلیم سے زیادہ نئی روش کی تربیت حاصل کرتے۔ اور پھر بیرسٹری کرنے انگلستان آ جاتے۔ جب یہاں سے واپس جاتے تو ان کا خاندانی طنطنہ، حکمران انگریز کی قربت اور ولایت پلٹ ہونے کی مہر ہم وطنوں پر قیامتیں ڈھاتی۔ ان کے بڑے ٹھاٹھ ہوتے۔ انگلستان آنا اس زمانے کے امرا کا فیشن تھا۔ بیرسٹری کے لیے انگلستان آنے والوں۔ کے علاوہ ایک اور گروہ بھی تھا۔ جو "بچ رہا ہے لندن میں عافیت کی شہنائی" کا ورد کرتے ہوئے آتا، اور "ڈپٹی کمشنری بھی خدائی سے کم نہیں" کے خواب پالتا واپس جاتا۔ یہ وہ آئی۔ سی۔ ایس تھے، جنہیں واپس جا کر سرکارِ انگلشیہ کا ستون بننا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو لارڈ میکالے کے خواب کی اصل تعبیر تھا۔ ہندوستانی خون، ہندوستانی رنگ۔ لیکن افرنگی ذوق، افرنگی اطوار اور افرنگی ذہن ——

لندن جاؤ، انگریزی پڑھو

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم سال ہے، جس کے بعد ایک بہت بڑا ملک سات سمندر پار سے آئے ہوئے کچھ تاجروں کے حوالے کر دینے کے بعد شکست خوردہ ہندوستانی اپنی قسمت پر قناعت کرنے کی عادت ڈال رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے آپ کو کمپنی بہادر کہلواتی تھی اور اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں سر سید کا حکم تھا، کہ "لندن جاؤ۔ انگریزی پڑھو۔ اور قوم انگلش سے ملو۔ سیکھو وہی وضع و تراشِ لباس" ——

خدا کی شان

ایک عظیم ملک انگریز کے پاؤں کے نیچے تھا۔ ہر طرف قبرستان کا سا امن و سکون چھایا ہوا تھا، اور اس قبرستان میں اکبر جیسے مرثیہ خواں کے اس طرح کے الفاظ کبھی طنز بھرے نشتر معلوم ہوتے۔ کبھی قبرستان میں چلتی پھرتی لاشوں کے لیے ایک لمحۂ طربیہ بنتے۔ کبھی ایک خیال انگیز تازیانہ۔ اور ہدایت اور رہنمائی کی بات۔ لیکن پھر پھر کے اکبر بھی اسی سمجھوتے میں سلامتی سمجھتا تھا کہ

www.taemeernews.com

سدھاریں شیخ کعبے کو، ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

انگلستان میں "خدا کی شان" دیکھنے اکبر الٰہ آبادی کے زمانے ۱۸۴۶-۱۹۰۵ء سے پہلے بھی ہندوستان کے لوگ آتے جاتے رہے ہیں۔ مرزا ابو طالب خاں ۱۷۹۹-۱۸۰۱ء کے سالوں میں آئے۔ اور واپس جا کر اپنا سفرنامہ "سیر طالبی فی البلاد افرنجی" کے نام سے لکھا، اور عوام الناس میں "لندنی" مشہور ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں حیدرآباد دکن کے رہنے والے یوسف کمبل پوش بھی یہاں آئے۔ اور انگریز خواتین سے بالخصوص بہت متاثر ہوئے۔ واپس جا کر انھوں نے اپنے سفرنامے میں ان "پریوں" کے بارے میں لکھا کہ "افسوس میں بادشاہ نہ ہوا۔ نہیں تو ہر پری کو ایک ایک ملک بخش دیتا۔" انگریز مردوں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات بیان کیے، اور تحریر کیا کہ "صد آفرین! امیرانِ انگلستان پر کہ کوئی تمام دن میں ایک گھڑی اپنی برباد نہیں کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔۔۔۔۔ رات کو عیش و عشرت کرتے ہیں خیالِ سیر ملکوں کا سر میں رکھتے ہیں۔۔۔"

یہ ملکہ وکٹوریہ کا برطانیہ تھا۔ برٹین گریٹ برٹین بن رہا تھا۔ اس کے بحری جہاز دنیا بھر کے سمندروں پر یونین جیک لہرا رہے تھے۔ اور اس چھوٹے سے جزیرے کی حکومت کی حدود افریقہ کے گھنے جنگلوں اور ایشیا کے وسیع میدانوں تک پھیل چکی تھیں۔ امیرانِ انگلستان کی ایک نئی پود پیدا ہو رہی تھی۔ چائے، کافی، کپاس، تیل اور ربڑ وغیرہ کے علاوہ افریقہ سے غلاموں کی تجارت بھی زوروں پر تھی۔ ماریشس، برٹش گنی، ٹرینیڈاڈ اور جمیکا کے گنے کے کھیت ان کے لیے مقناطیس کی سی کشش رکھتے تھے۔ ہر انگریز وہاں جانے کے لیے بے تاب تھا۔ دنیا کی کل آبادی کا چوتھائی حصہ برطانیہ کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ اور اس میں سے تقریباً ستر فی صد افراد ہندوستان کے اٹھارہ لاکھ مربع میل رقبہ میں رہتے تھے۔ ہندوستان تاجِ برطانیہ کا سب سے بڑا اور سب سے انمول ہیرا تھا۔ وہاں کی دولت (دس کروڑ پونڈ کی رقم پلاسی کی جنگ کے بعد کے چند سالوں میں ہندوستان سے انگلستان بنکوں کے ذریعہ لائی گئی تھی۔ بعد میں ساڑھے تین کروڑ پونڈ سالانہ یہاں پہنچتی تھی) تہذیب و تمدن اور علم و فن نے اہلِ برطانیہ کو انگشت بدنداں کر رکھا تھا، اور ہر برطانوی کے دل میں یہ حسرت تھی کہ اے کاش وہ بھی اپنے اہلِ وطن کے کمالات کو اُن نوآبادیوں میں جا کر دیکھ سکے۔ چنانچہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہ تھی کہ "امیرانِ انگلستان اپنے سر میں ملکوں کا خیالِ سیر رکھتے تھے۔۔۔"

۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ نے بڑے فخر سے اپنی ڈائری میں لکھا تھا: "میں ہندوستانی کے کچھ الفاظ سیکھ رہی ہوں تاکہ اپنے نوکروں سے باتیں کر سکوں۔۔۔" یہ نوکر ۲۴ سالہ منشی عبدالکریم اور محمد تھے، جو اُس سال جون میں ملکہ معظمہ نے ہندوستان سے بطورِ خاص منگوائے تھے۔ منشی عبدالکریم کا تعلق آگرے سے تھا۔ وہ ملکہ کے لیے "کری" پکاتے اور اسے "ہندوستانی" زبان کے الفاظ سکھاتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ "ہندوستانی" میں پھسڈی رہیں، اور منشی عبدالکریم کی زبان پر انگریزی نہ چڑھ سکی۔ ملکہ نے ان کے لیے ایک انگریز ٹیوٹر رکھا تھا۔ لیکن وہ بھی کسی کو اس قابل نہ بنا سکا کہ ملکہ معظمہ کم از کم آگرہ کے تاج محل کی کہانی وہاں کے رہنے والے کی زبانی سُن سکتیں۔۔۔

ملکہ اور اس کے ملازم کی شاگردی استادی تو نہ چل سکی۔ البتہ ہندوستان سے طالب علموں کا سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ اب متوسط طبقے کے طلبہ بھی آنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں اور اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں جو طلبہ یہاں آئے، ان میں بعض ایسے نام ہیں، جنھوں نے یہاں آ کر "خدا کی شان" کچھ اس نظر سے دیکھی کہ واپس جانے

www.taemeernews.com

کے بعد بجائے اس کے کہ اپنے پیش روؤں کی پیروی کرتے ہوئے انگریز حکمران کے معاون و مددگار ثابت ہوتے آزادی اور جمہوریت کے خواب دیکھتے ہوئے واپس گئے۔ ۱۸۹۰ء میں یہاں قانون کی تعلیم حاصل کرنے گاندھی جی آئے۔ دو سال بعد ۱۸۹۲ء میں محمد علی جناح پہنچے۔ جنھیں پاکستان کا بانی بننا تھا۔ ڈاکٹر اقبال بھی کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک رہے۔ اقبال جب اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس جا رہے تھے تو اسی سال ۱۹۰۷ء میں کیمبرج میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے آکر داخلہ لیا۔ اس سے قبل وہ لندن کے ہیرو اسکول میں دو سال گزار چکے تھے۔۔۔۔۔۔

ارن اینڈ لرن

بزرگوں کا کہنا ہے کہ بادشاہوں کی بات باتوں کی بادشاہ ہوتی ہے۔ ہندوستان کا بادشاہ برطانیہ تھا۔ اس لیے اس کی ہر بات سب پر بھاری تھی۔ ہندوستانی اسکولوں میں نئی پود سرکارِ انگلشیہ کی برکات، اور انگریزی کتاب۔۔ ''سمپل چیپٹرز آن انگلش لائف'' پڑھ پڑھ کر جوان ہو رہی تھی۔ اور اُن کے مستقبل کی کسوٹی یہ تھی کہ انھوں نے اس مطالعہ سے جو علم حاصل کیا ہے اسے کس حد تک اپنے دل میں جگہ دی ہے۔

اور اس سے ان کے ذہن کے کتنے گوشے روشن ہوتے ہیں؟۔ غلام ہندوستان کی باتوں میں کوئی خاص جان نہ رہی تھی۔ تاہم اس کے عظیم الشان ماضی سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ علم و فن کے جو خزانے اس کے ہاتھ لگے تھے، انگریز کو ان کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اپنی تحویل میں لینے کے بعد اس نے انھیں لندن منتقل کر دیا۔ انڈیا آفس لائبریری میں کتابیں، مسودات، پرانے سکے اور فنونِ لطیفہ کے بیش بہا شاہکار جمع کر دیے گئے۔ سلطان ٹیپو کا کتب خانہ بھی یہاں کی ایک لائبریری کا حصہ بن گیا۔ ہندوستان کے بارے میں علمی تحقیق کے لیے ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن'' کی بنیاد رکھی گئی اور پھر اس کے قیام کے پانچ سال بعد ۱۸۲۸ء میں سوسائٹی نے ایک دارالترجمہ بھی کھول دیا۔ جہاں عربی، فارسی اور سنسکرت کی علمی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے ہوتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں لندن میں ایک اور جماعت ''ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن'' کے نام سے قایم کی گئی جس کا بنیادی مقصد ''اہلِ ہند کی آئینی اور جائز طریقوں سے مدد'' کرنا تھا۔ اس کے قیام کے محرک غالباً ۱۸۵۷ء کے واقعات تھے اور یہ ایک طرح سے خیر سگالی کی جماعت تھی۔ اس کے بانیوں میں مشہور پارسی دادا بھائی نوروجی بھی تھے۔ اس کے بیس سال بعد ۱۸۸۹ء میں لندن میں پچیس میل دور دوکنگ کے قصبے میں ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر ہو گئی۔۔۔۔۔۔

بیسویں صدی شروع ہوئی تو لندن کے راستے کی اجنبیت ختم ہو چکی تھی اور یہاں خواص کے علاوہ عام والدین کے بیٹے بھی حصولِ تعلیم کے لیے آنے لگے۔ اب لندن، آکسفورڈ اور کیمبرج کے علاوہ ہندوستانی چہرے دوسری یونیورسٹیوں میں بھی نظر آتے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر حکومت نے ۱۹۰۹ء میں ان کی رہنمائی کے لیے ایک تعلیمی مشیر مقرر کر دیا۔ اتفاق سے یہ تعلیمی مشیر علامہ اقبال کے پرانے استاد گورنمنٹ کالج لاہور والے تھامس آرنلڈ تھے۔۔۔۔۔۔

ہندوستان میں ولایتی تعلیم کا رعب قایم تھا لیکن آہستہ آہستہ ولایت پاس نوجوانوں کے لیے ملازمتوں کا میدان محدود ہونے لگا اور ''سرمۂ چشمِ خسروی'' صرف آئی۔ سی۔ ایس ہی رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علموں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا، جسے برطانیہ سے واپس جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ بیرسٹری کے علاوہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ مقبول ہونے لگا۔ بیرسٹری اور پی۔ ایچ۔ ڈی میں

www.taemeernews.com

ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ دو سال کا کورس بڑی آسانی سے مزید کچھ سالوں تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جتنے زیادہ سال لگیں اخراجات اسی حساب سے بڑھیں گے۔ اس کا علاج "ارن اینڈ لرن" (کماؤ اور پڑھو) کا نسخہ تھا۔ ریستورانوں میں پلیٹیں دھو کر تعلیمی اخراجات پورے کرنا سکۂ رائج الوقت تھا۔ کمائی کا ایک اور ذریعہ ٹیوشن تھا۔ کچھ لوگ اس طرح بھی کچھ کمائی کر لیتے تھے ——

انگریز ہندوستان میں برطانوی راج کے مزے لینے کے بعد چھٹی پر گھر آتے تو جانِ محفل بن جاتے تھے۔ ہندوستان، بھیدوں بھرا ہندوستان! — مشرق پراسرار مشرق!! — ادھر جان ہین نے حافظ شیرازی کی غزلوں اور فٹنز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کر کے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ حافظ اور خیام کی رندی و سرمستی اس زمانے کے امیرانِ انگلستان کے مزاج کے عین موافق تھی۔ پھر جب انھیں بتایا جاتا کہ یہ سب معرفت کی رمزیں ہیں تو اسرار اور بھی بڑھ جاتے۔ اسرار کے پردوں میں جھانکنے کی لگن اور بھی تیز ہو جاتی۔ اس زمانے میں ایسے لارڈ اکثر مل جاتے تھے جو شام کے ایک دو گھنٹے شیری اور پورٹ کے مشروبات کی چسکیاں لیتے ہوئے حافظ اور خیام کے اشعار کی باریکیاں کسی مشرقی استاد سے سمجھنے کے لیے بے تاب ہوتے۔ ہندوستانی طالب علموں میں سے جس کسی نے بی۔اے میں فارسی پڑھی تھی اس کی چاندی ہو گئی، اور وہ فرصت کے اوقات میں کسی لارڈ کا ٹیوٹر بن بیٹھا۔ جو بے چارے فارسی سے نابلد تھے ان کے لیے بھی اللہ مسبب الاسباب تھا۔ ملازمت، تجارت یا محض پھرنے پھرانے کے لیے ہندوستان جانے والوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے کچھ یہیں سے ہندوستانی (اردو) زبان سیکھ کر جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اخبار میں اشتہار پڑھ کر یا خود اشتہار دے کر اس طرح کی ٹیوشن کا مل جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ بعض کی مشکل اس طرح بھی آسان ہوئی ——

سن ۱۹۳۰ء کے آتے آتے صرف لندن میں تقریباً ڈھائی ہزار ہندوستانی تھے۔ ان میں طالب علم بھی تھے، کاروباری بھی اور ملازم بھی۔ ملازمت کرنے والوں میں استاد سید علی کا بڑا نام تھا۔ یہ لندن کے چڑیا گھر میں ہاتھیوں کے استاد تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ہاتھی سدھانے میں ساری دنیا میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ زیادہ تعداد طالب علموں کی تھی پانچ سو کے قریب بیرسٹری کر رہے تھے۔ کچھ دوسرے علوم کی ڈگریاں لے رہے تھے۔ کچھ ڈگری لینے کے بعد یہیں رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے لیے یہاں ٹِک جانے میں سب سے آسانی تھی۔ ان کی سرجریوں میں مریضوں کی کمی نہ تھی۔ کم از کم چھ دیسی ریستوران بھی کھل گئے تھے جن میں سے پانچ لندن کے دل پکاڈلی کے اردگرد تھے۔ لیسٹر اسکوائر کے قریب جیرارڈ اسٹریٹ میں شفیع ریستوران تھا جہاں بقول اس کے منتظمین کے شہزادے اور شخصیتیں جاتی تھیں۔ سویلو اسٹریٹ (ریجنٹ اسٹریٹ کے ساتھ) میں ویراسوامی اور پرسی اسٹریٹ (ٹوٹنہم کورٹ روڈ کے پاس) میں کوہِ نور تھا۔ تاج محل چیئرنگ کراس روڈ پر تھا اور آدھی رات تک کھلا رہتا تھا۔ دہلی ریستوران ٹوٹنہم کورٹ روڈ پر مشہور فرنیچر اسٹور میپلز کے سامنے تھا اور اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہاں کے کھانے گرٹن کالج کیمبرج اور سمرویل کالج آکسفورڈ کی لڑکیوں سیلون کی خواتین اور ہندوستانی مہاراجوں میں خاص طور پر مقبول ہیں۔ شانتی نکیتن میں صرف سبزی والے کھانے ملتے تھے۔ یہ اندرونِ شہر سے ذرا دور گولڈرز گرین کے "پدمنی" علاقے کے نزدیک بلسائز پارک میں تھا۔ ہندوستانی گروسری کی دو دکانیں بھی اہلِ ذوق میں خاص طور پر مشہور ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک "کماریہ اینڈ کمپنی" چٹنیوں اور کری پوڈر میں اپنا کمال ظاہر کرتی تھی اور دوسری "ویسٹ انڈ گروسری" کی خصوصیت بمبئی کی مرغابی تھی۔ حلوائی کا کام بھی شروع ہو رہا تھا۔ نارتھ وڈ روڈ ہائی گیٹ میں گلاب جامن بنتے اور پھر دو شلنگ، اڑھائی شلنگ فی درجن کے حساب سے فروخت ہوتے تھے ——

www.taemeernews.com

دیسی اشیائے خوراک کے علاوہ خالص انگریزی طرز کے کاروبار بھی جاری ہو رہے تھے۔ ان میں پیش پیش بمبئی سے آئے ہوئے پارسی تھے۔ رستم جی داروو والا کی پرانے نوادرات کی دکان تھی۔ مسز آر۔ دادا چن جی اچھی نسل کے کتوں کی تجارت کرتی تھیں۔ اور بی جمشید صاحب نے انگریزی ڈانس سکھانے کی کلاسز کا انتظام کر رکھا تھا۔ جہاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے طالب علموں کو خاص رعایت دی جاتی تھی ـــــ

۱۹۲۲ء میں لندن کے علاقہ بیٹرسی نارتھ سے ایک ہندوستانی شاپور جی سکلت والا ممبر پارلیمنٹ بھی چنے گئے۔ حلقۂ انتخاب میں ہندوستانیوں کی تعداد برائے نام تھی۔ تاہم وہ جیتے اور ۱۹۲۹ء تک ممبر پارلیمنٹ رہے ـــــ

لندن شہر کی لاکھوں کی آبادی میں اڑھائی ہزار ہندوستانی آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ لیکن اس نمک کی ایک منفرد حیثیت ضرور تھی ـــــ

یہ طالب علموں اور پارسیوں کا لندن تھا۔ طالب علم پڑھ بھی رہے تھے، کمائی کے ذرائع بھی تلاش کر رہے تھے، اور یہ بھی ہو رہا تھا کہ "ارن اینڈ لرن" کی جد و جہد میں "ارن" کے معاملات "لرن" پر چھا جاتے اور تعلیم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادھوری رہ جاتی۔ نہ جانے اس زمانے میں کتنے ہونے والے بیرسٹر صرف ڈنر ہی جو کورس کا لازمی حصہ ہیں کھا سکے۔ اور امتحانات التوا میں پڑتے پڑتے محض ماضی کی یاد بن کر رہ گئے۔ اسی طرح نہ جانے پی۔ ایچ۔ ڈی کے کتنے تھیسس، اپنے انجام کو ترستے رہے، اور گراں بہا تحقیقی مقالات گندمنڈ کا بیوں اور بے ترتیب کاغذات کی فائلوں میں دفن ہو گئے ـــــ

دروازے کا کاروبار

اس زمانے میں ایک اور انکشاف ہوا کسی نے دریافت کر لیا کہ "پیڈلنگ" جسے عام طور پر جپسی یا سیلانی اور مست حال قسم کے لوگ اپنی روزی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اصل میں ایک نہایت دلچسپ اور سود مند کاروبار ہے ـــــ

طالب علموں اور بمبئی کے چند تاجر پیشہ پارسیوں کے علاوہ جو لوگ یہاں محض روٹی کمانے کے لیے آئے۔ انھیں پہلے سے آئے ہوؤں نے اسی راہ پر لگایا۔ مقامی پولیس اسٹیشن سے پیڈلرز لائسنس حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ تھی اور پیڈلنگ کے استادی گر اور "راہ و رسم منزل ہا" بتانے والے بھی موجود تھے۔ انداز یہ تھا کہ ہول سیل کی کسی دکان سے زنانہ ملبوسات خرید یے (کسی نہ کسی کی ہول سیل کی دکان سے پہلے ہی خیر سگالی قایم ہوتی۔ اور وہ نئے آنے والے کی امداد اور رہنمائی ایک فرض سمجھ کر کرتا۔ لہٰذا و اگر شستہ دار یا واقف کار نہ ہوتا تب بھی یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔ اس کی رہایش وغیرہ کا انتظام بھی یہی "ہمدرد رہنما" کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اپنے ساتھ ہی رکھ لیتے تھے) اور یہ مال کسی سوٹ کیس میں ڈال کر کسی ایسی بستی میں چلے جائیے جہاں کے مکانات سے ظاہر ہو کہ وہاں ورکنگ کلاس کے خوش باش و خوش طبع لوگ رہتے ہیں۔ کسی کا دروازہ کھٹکھٹائیے اور جب یہ کھلے تو ایک مسکراہٹ کے ساتھ "یو بائی سم تھنگ" کہہ کر دہلیز پر اپنا سوٹ کیس کھول دیجیے، بلکہ الٹ دیجیے۔ عام طور پر گھریلو بیویوں کو اس میں کوئی نہ کوئی ضرورت کی چیز نظر آ ہی جاتی ہے۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس وقت آپ کے پاس اسے خریدنے کے لیے نقد پیسے نہیں ہوں گے۔۔ تو اس کا طریقہ، بلکہ ایک طرح سے کاروبار کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جس شے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو وہ اسے قسطوں پر ادھار دے دیجیے اور پہلی قسط کی وصولی کے لیے اگلے ہفتے کا کوئی وقت طے کر لیجیے۔ اگلے ہفتے جب

www.taemeernews.com

وصولی کے لیے جائیں تو ایک آدھ ادھر تھما آئیں۔ اس طرح یہ سلسلہ مستقل ہوجائے گا۔ ایک دفعہ جو دروازہ کھلا تھا، ہمیشہ کے لیے کھلا رہے گا۔ جتنے زیادہ گھر ہوں گے اسی حساب سے آمدنی بھی زیادہ ہوگی ــــــ

یہ کاروبار بظاہر لاکھ معمولی معلوم ہو لیکن ہمت اور حوصلہ رکھنے والوں نے اس سے بڑی کمائی کی۔ پنجاب سے ہوشیارپور اور ضلع جالندھر اور ریاست جموں و کشمیر کے ضلع میرپور کے دیہاتوں سے آنے والوں نے اسے ایک منظم اور باقاعدہ کاروبار کی صورت دے دی۔ اس کاروبار میں ایک سہولت یہ تھی کہ ــــــ

لمبی چوڑی انگریزی بولے بغیر بھی کام چل جاتا تھا۔ نام یو بائی سم تھنگ۔ اور اس کے بعد پرائس۔ نیکسٹ ویک۔ ٹائم۔ تھینک یو۔ بائی بائی۔ جیسے چند الفاظ میں ساری منزلیں طے ہوجاتی تھیں۔ جہاں زبان نے کوئی رکاوٹ پیدا کی وہاں مسکراہٹیں خانہ پُری کردیتی تھیں اور مسکراہٹوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی ــــــ

ایسٹ لندن، گلاسگو اور نیوکاسل کے قریب ڈرہم کی کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والوں کی بستیوں میں یہ کاروبار جسے "ڈور بزنس" (دروازے کا کاروبار) کا نام دیا گیا تھا خوب پروان چڑھا۔ بعض نے جب انگریزی زبان میں کچھ مہارت پیدا کرلی تو زنانہ ملبوسات کے ساتھ ساتھ ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانا بھی شروع کردیا۔ دست شناسی سونے پر سہاگہ بنی اور اس نے کاروبار کو بڑی ترقی دی۔ بعض کے لیے تو یہ اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ وہ ملبوسات کا کام چھوڑ کر فل ٹائم "دست شناس" بن گئے۔ دوسروں کو قسمت کا حال بتاتے بتاتے انھوں نے اپنی قسمت کا راز پالیا ــــــ

دروازے کا کاروبار کرنے والے ان ہی لوگوں میں سے بعض نے بعد میں ڈریپری کی ہول سیل دکانیں کھول لیں۔ ظاہر ہے گاہکوں کی انھیں کوئی کمی نہ تھی۔ دروازے کے کاروباری سارے ہم وطن ان کے گاہک تھے۔ اس طرح کی اولیں دکانیں ایسٹ لندن۔ گلاسگو۔ نیوکاسل۔ مانچسٹر۔ لیڈز اور برمنگھم میں کھلیں ــــــ

اس ملک میں ہماری آمد کے اولیں دور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم بحری تجارتی جہازوں پر کام کیا کرتے تھے۔ یہ جہاز دیس دیس کے چکر لگاتے ہوئے برطانیہ کی کسی بندرگاہ پر لنگر ڈالتے تو کوئی نہ کوئی جہازی بھاگ نکلتا۔ اپنے جیسے کسی پہلے سے آئے ہوئے واقف کار کے ہاں پناہ لیتا۔ پھر پونڈ کمانے کی صورت بھی نکل آتی۔ جب یہ پونڈ وہ روپوں کی صورت میں اپنے لواحقین کو بھیجتا تو وارے نیارے ہوجاتے۔ علاقہ بھر میں دھوم مچ جاتی۔ کئی اور نوجوان ولایت پہنچنے کے خواب دیکھنے لگتے۔ اس طرح سینکڑوں سے ہماری تعداد ہزاروں اور پھر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اور ہم برطانیہ کے ہر اس شہر میں پہنچ گئے جہاں کی فیکٹریوں اور ملوں کو افرادی قوت کی ضرورت تھی ــــــ

بات اتنی صحیح نہیں۔ بحری جہازوں کو خیرباد کہہ کر برطانیہ میں رہ جانے کا دور دوسری جنگ عظیم سے ذرا پہلے شروع ہوا۔ جنگ کے دوران اپنے عروج کو پہنچا اور جنگ کے کچھ سال بعد تک جاری رہا۔ اس طرح آنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے کسی صورت زیادہ نہیں ــــــ

جنگ سے پہلے پنجابی جہازیوں کو انگلستان کی نسبت امریکہ اور آسٹریلیا زیادہ پسند تھا۔ سونیر پارسے جو جہازی یہاں پہنچے وہ عرب تھے یا سلہٹ کے بنگالی بھائی۔ ساؤتھ شیلڈ اور کارڈیف میں عربوں کی بستیاں خاصی پرانی ہیں۔ بنگالیوں کو دروازے کے کاروبار کی بجائے کسی دیسی ریستوران میں کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ ریستوران کا مالک ان کا واقف ہوتا یا واقف بن جاتا تھا۔ کچھ عرصہ ریستوران میں کام کرنے اور کاروبار کی اونچ نیچ سمجھ لینے کے بعد ان کے پاس کچھ سرمایہ جمع ہوجاتا تو وہ اپنا ریستوران کھول لیتے تھے۔ شاہ جہاں، نورجہاں اور تاج محل وغیرہ قسم کے مغلئی طمطراق والے ناموں پر انگریز مرمٹتا تھا۔ چنانچہ اس طرح کے ناموں کے ساتھ نئے نئے

www.taemeernews.com

کئی ریستوران کھلے۔ چھوٹے بڑے۔ انگریز کے آباؤ اجداد نے ہندوستان کی پہلی جھلکیاں مدراس اور بمبئی میں دیکھی تھیں، شاید اس لیے ان دو ناموں میں بڑی لذت تھی۔ مدراس کری اور بمبئی کری کا نام پاکر سالن اور بھی لذیذ بن گئے ــــ

جنگ کے دوران جب کوئی جہاز برطانیہ کی بندرگاہ پر پہنچتا اور جہازیوں کو شہر جانے کی چھٹی ملتی تو انھیں شہر کی سیر سے زیادہ یہ جستجو ہوتی کہ پردیس میں کسی ہم وطن اور ہم زبان سے ملاقات ہو۔ اگر حسن اتفاق سے یہ صورت پیدا ہو جاتی تو یہ ملاقات بڑے دوررس نتائج پیدا کرتی۔ کئی جہازیوں کے لیے اس ملک کے "دانہ پانی" کا سبب ایسی ہی ملاقاتیں بنیں۔ اس دوران ایسے لوگ بھی آئے جن کا دُور یا قریب کا کوئی رشتہ دار پہلے ہی سے یہاں ہوتا اور وہ اس کے ایما پر جہاز کی نوکری کرتے کرتے یہاں پہنچتے۔ جہاز کو چھوڑنے کے بعد ایک معینہ مدت کے ختم ہونے پر پولیس والوں سے انھیں یہاں ٹھہرنے کا پروانہ مل جاتا تھا۔ اور اسے حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ پولیس ان دنوں بڑی مہربان تھی ــــ

جنگ کے دوران یہاں کی فیکٹریاں دن رات اسلحہ اور لڑائی کا دوسرا سامان تیار کرتی رہتی تھیں۔ مردوں کی اکثریت میدانِ جنگ میں تھی۔ اس لیے فیکٹریوں کو افرادی قوت کی متواتر ضرورت تھی۔ کام کی کوئی کمی نہ تھی۔ زندگی اتنی آسان نہ تھی۔ ضروریاتِ زندگی کی بہت سی چیزیں آسانی سے دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ تاہم دردازے کا کاروبار کرنے والے ہمارے ہم وطنوں نے آہستہ آہستہ ایسے وسایل پیدا کر لیے تھے کہ مقامی آبادی کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہونے لگے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے خوب کمایا اور یہاں کے رہنے والوں کی بہت سی مشکلیں آسان کیے رکھیں۔ لڑائی کے دنوں میں انھوں نے "فش اینڈ چپس" کی دکانیں بھی کھولیں۔ اس کاروبار میں وہ جنگ کے بعد بھی کافی عرصے تک نمایاں رہے ــــ

سستے مزدور

جنگ کے بعد جب برطانوی زندگی کی نئے سرے سے ترتیب شروع ہوئی تو ہماری وجہ سے کئی شعبوں کے چھوٹے موٹے خلا بھی پورے ہوئے۔ لندن کے فلم اسٹوڈیوز میں ایسی فلمیں بن رہی تھیں جن میں ہندوستانی چہروں کے ہجوم کی ضرورت تھی۔ ایک صاحب نے مختلف ہندوستانیوں کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی جنھیں وہ وقتاً فوقتاً اکٹھا کر کے فلم اسٹوڈیو میں لے جاتے۔ اس فہرست میں شامل ایک "ایکٹر" صاحب بڑے فخر سے سُناتے ہیں، کہ ایک مرتبہ انھیں ایک گدھے پر چڑھنا تھا جو بڑا منہ زور تھا۔ اور کسی کو اپنے پیچھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا تھا۔ یہ ایک چھلانگ لگا کر اُس کی پیٹھ پر جا بیٹھے، اور اپنی ٹانگوں کو اس مضبوطی سے اُس کے جسم کے ساتھ چپکا دیا کہ وہ اُچھلا، کودا۔ دولتیوں پر دولتیاں ماریں۔ لیکن انھیں نہ گرا سکا۔ ہجوم ہنستا اور قہقہے مارتا رہا۔ فلم ساز صاحب اس سین پر بہت خوش ہوئے اور انھیں ان کی "چابک سواری" پر ایک پونڈ انعام دیا ــــ

ہم وطنوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن آپس میں محبت اور پیار بہت تھا۔ انھیں محنت ضرور کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس محنت کا معاوضہ یہاں کے عام معیار سے گو کم ملتا تھا ہندوستان کی مزدوری کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ یہ برطانیہ کے "سستے مزدور" تھے۔ لیکن ہزاروں میل دُور کے گاؤں میں ان کا کنبہ ان کی وجہ سے آسودہ اور خوش حال ہو رہا تھا۔ اس لیے یہ مطمئن تھے ــــ

لینڈ لیڈی سے لینڈ لارڈ تک

شروع شروع میں جو طالب علم یہاں آئے وہ عام طور پر کسی "لینڈ لیڈی" کے ہاں "پے انگ گیسٹ" یا کسی بڑے مکان میں

www.taemeernews.com

ہم یہاں کیسے پہنچے؛

ایک "لاجر" کے طور پر رہتے تھے۔ ہندوستان میں لینڈ لیڈی اور پے انگ گیسٹ کی کوئی روایت نہ تھی۔ یہ لوگ اپنے رہایشی معاملات کے بارے میں گھر خط لکھتے تو کچھ ایسی نقشہ کشی کرتے کہ "پے انگ گیسٹ" ہونا بڑا رومانوی معلوم ہوتا۔ لینڈ لیڈی کا تذکرہ ایک مشفق ماں کا سا ہوتا جو اپنے مکان میں جگہ دینے کے لیے کرائے اور کھانے کے لیے پیسے ضرور وصول کرتی تھی، گھر میں ایک خاص اصول اور ضابطے کی پابندی پر بھی بہت زور دیتی تھی۔ لیکن اس کی اکھروٹ کی سی سختی کے اندر بڑا نرم دل ہوتا تھا۔ اس کی عام طور پر ایک نوجوان بیٹی بھی ہوتی تھی جو "توم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش" کے سلسلے میں ہمارے طالب علموں کی بہت مدد کرتی، اور ایک ہمدرد اور اچھی ساتھی ثابت ہوتی۔ لینڈ لیڈی کے ساتھ اس کی بیٹی کا ذکر تو ہوتا تھا۔ لیکن یہ پتہ کبھی نہ چلا کہ لینڈ لیڈی کا کوئی شوہر اور اس کی بیٹی کا کوئی باپ بھی ہے۔ وہ نہ جانے کن پردوں میں چھپا تھا۔ ہمارے نوجوانوں نے بھی ان پردوں کو چاک کرنے کی کبھی ضرورت نہ سمجھی ــــــ

لاجر جو پے انگ گیسٹ کے دور سے ذرا بعد کی پیداوار ہیں، بڑے بڑے مکانوں کے کسی ایک کمرہ "بڈ سٹر" میں رہتے تھے۔ کمرے میں سونے کے لیے ایک چارپائی۔ بیٹھنے کے لیے دو ایک کرسیاں۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے ایک بیسن، اور کھانا پکانے کے لیے ایک گیس رنگ ہوتا تھا۔ ہمارے طالب علموں کو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا بڑا "انگلش" اور بڑا "رومنٹک" معلوم ہوتا ــــــ

لیکن ہندوستان کے دیہاتوں کی کھلی فضاؤں میں پل کر یہاں آنے والوں کو زندگی کے یہ طریقے نہ بھائے۔ انھیں بڑے بڑے مکانوں کے ایک کمرے میں اکیلے دبکے رہنے سے بڑی گھٹن ہوتی۔ کچھ عرصہ تو انھوں نے جوں توں کر کے گزارا کیا۔ جب انھیں اپنے آس پاس سے کچھ واقفیت ہونے لگی اور یہاں کی بات کرنے کا ڈھنگ آ گیا تو وہ کمرے کی بجائے مکان کرائے پر لینے لگے۔ پرانے محلوں میں ایک عام مکان ایک پونڈ فی ہفتہ پر مل جاتا تھا۔ مکان میں بہت سے مل جل کر رہتے۔ کرایے کی رقم کا حساب ہوتا تو شلنگ دو شلنگ فی کس پڑتا۔ اپنی مرضی کا کھانا پکانے کی سہولت بھی تھی۔ دروازے کے کاروباری گھومنے گھامنے والے لوگ تھے۔ کسی فارم سے مرغی لے آتے اور اسے حلال کر کے کھاتے ــــــ

دوسری جنگِ عظیم سے ذرا پہلے ایسٹ لندن کے علاوہ برطانیہ کے بعض دوسرے شہروں میں کرائے پر لیے ہوئے مکانوں میں رہایش شروع ہو چکی تھی اور اب کچھ لوگ کرائے کی بجائے مکان خریدنے کی سبیل بھی کر رہے تھے۔ خود لینڈ لارڈ بننے کا زمانہ آ رہا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں برمنگھم میں پہلا مکان بالسل ہیتھ کے علاقے میں خریدا گیا۔ اس زمانے میں کسی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ علاقے کی حیثیت کیا ہے۔ یا مکان کیسا ہے۔ برطانیہ کے سبھی مکان اعلیٰ معلوم ہوتے تھے ــــــ

ہندوستان میں حاکم انگریزوں نے اپنے لیے جدید طرز کے مکان "کن ٹون منٹ" یا "سول لائنز" میں شہر سے دور بنائے تھے۔ "ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" کی تعلیمی پالیسی کے تحت جو لڑکے تعلیم حاصل کر کے آئی۔ سی۔ ایس بنتے، یا کوئی اور عہدہ پاتے۔ انھیں بھی سول لائنز میں ہی انگریزی بنگلہ مل جاتا۔ اور یہ طبقہ برتری کی سند اور حکمرانوں کی قربت پا کر اپنے آپ کو "نیٹوز" سے دور کر لیتا تھا۔ "نیٹوز" یا تو دور دیہات کے کچے مکانوں میں رہتے تھے یا صدیوں پرانے شہروں میں جو سب کے سب "سلم" بنے ہوئے تھے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان اتنے فاصلے تھے کہ ان کے کوچہ و بازار کی بو سول لائنز اور چھاؤنیوں میں رہنے والوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ ان کی موٹر کاروں کے لیے شہر کی گلیاں بھی بہت تنگ تھیں۔ مقامی رہایشی مسایل پر ان کی نگاہ کیسے پڑتی ؟ ــــــ

اس سلسلے میں انگریزوں نے ہندوستان پر جو سب سے بڑا کرم کیا، وہ یہ تھا کہ دارالحکومت دہلی کے باہر نئی دہلی بنوا دی۔ یا چند

www.taemeernews.com

دوسرے بڑے شہروں میں شہر کے ایک طرف مال روڈ قسم کے نام کی ایک وسیع سڑک جو اکراس کے دو رویہ انگریزی سامان کی بڑی بڑی دکانیں کھلوادیں اور بس ـــــ لائل صاحب اور منٹگمری صاحب نے پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب میں نہروں کا ایک سلسلہ قایم کر کے ویرانوں کو کاشت کے قابل بنا یا۔ تاکہ وہاں کپاس بو کر لنکاشائر اور یارک شائر کی ملوں کے لیے خام مواد مہیا ہو۔ لائل پور اور منٹگمری جیسے شہر تعمیر ہوئے لیکن یہاں بھی گھنٹہ گھر اور کشادہ بازاروں پر ہی توجہ دی گئی۔ عوام کے رہایشی مکانات کو حکومت نے کبھی اپنی ذمہ داری نہ سمجھا۔ نئے نہری علاقوں کے دیہات میں صرف اس حد تک پلاننگ کی گئی کہ مکانات ـــ بے شک کچے رہیں ـــ ایک قطار میں ہوں اور گلیاں کشادہ ہوں ـــ

یہی وجہ تھی کہ ہمارے بیش تر جب یہاں پہنچے تو انھیں یہاں کے "سلم" بھی اپنے ہاں کے محلوں سے کہیں بہتر نظر آئے۔ ہر مکان "سول لائنز" کے مکانوں جیسا نظر آیا۔ یہ مکان سستے بھی تھے۔ کرائے پر بھی انھیں ان ہی علاقوں میں ملتے تھے اور اس بارے میں ان کے تجربات بڑے خوش گوار تھے ــــــ

ہمیں لینڈ لارڈ بنانے میں کارنر شاپ کی "مام" اور پڑوس کی "مسز" کا بڑا حصہ ہے (یہ ہمیں اب پتہ چلا ہے کہ ہم لینڈ لارڈ نہیں محض اوزار کو پاٹر تھے۔ بہر حال) اس ملک کے دفتری اور غیر دفتری سارے معاملات میں ان دو خواتین نے ہماری بڑی مدد کی۔ ہماری ٹوٹی پھوٹی انگریزی انھوں نے سمجھی اور ہمارے ٹیکس کے فارم انھوں نے پُر کیے۔ جب کبھی گیس یا بجلی کا میٹر پڑھنے والے انسپکٹر کو آنا ہوتا تو ان ہی میں سے کوئی ہمیں کام پر جاتا دیکھ کر ہم سے مکان کی چابی لے لیتی، اور ہمارے مکان کے دروازے پر انسپکٹر کے لیے یہ نوٹس لگا دیتی کہ "مکان کی چابی مکان نمبر ـــ سے حاصل کی جائے"۔ اگر ہمارے کچن کا سنک بند ہو جاتا تو بھی ہم ان ہی میں سے کسی ایک کے پاس جاتے۔ اور اس کا شوہر ہمارے ہاں آکر سنک ٹھیک کر دیتا اور ہمیں اس کی ساری کاریگری بھی سمجھا دیتا۔ تاکہ کبھی آیندہ ہمیں اس طرح کی پریشانی ہو تو ہم اپنی مدد آپ ہی کر سکیں ــــــ

جو لوگ ہمارے ساتھ محبت سے پیش آئے ہم نے اُن ہی کے گلی محلّوں میں مکان خریدے۔ یہ بات ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ جہاں ہم رہتے ہیں یہ اچھا رہایشی علاقہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ اسے کچھ سال بعد سلم کہا جائے گا۔ ہم نے اپنا رہایشی مسئلہ کو بڑے سیدھے سبھاؤ بغیر کسی پر بوجھ بنے خود ہی حل کر لیا تھا ــــــ

جنگ کے بعد نئے مکانات کی تعمیر کی منصوبہ بندی ہوئی اور اس پر زور و شور سے عمل ہونے لگا۔ ہر سال کئی ہزار مکان بنتے اور ان میں کئی لاکھ افراد اور کنبے آباد کیے جاتے۔ لیکن ہمیں ان نئی آبادیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم جہاں تھے وہیں خوش تھے۔ ہر شہر کی مقامی کونسلیں اپنے ہاں کے بے گھر افراد کو مکان یا فلیٹ کرایے پر دیتی تھیں اور اس طرح کے مسایل عام تھے کہ کونسل کے پاس مکان کم ہیں اور اس کے ہاؤسنگ رجسٹر پر مکانات کے امیدواروں کے نام بڑھتے جا رہے ہیں۔ انتظار کرنے والوں کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی۔ ان فہرستوں میں بھی ہماری وجہ سے کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ پولیٹیکل اینڈ اکنامک پلیننگ (پیپ) کے مطابق ۱۹۷۴ء میں ہم میں سے صرف ۴ فی صد کونسل کے مکانات میں رہتے تھے۔ چنانچہ ہم کسی کونسل کے لیے رہایشی مسئلہ نہیں بنے۔ یوں بھی کونسل سے مکان لینے کی شرایط کچھ ایسی تھیں کہ اس زمانے میں ہم آسانی کے ساتھ ان پر پورے نہیں اترتے تھے۔ کونسل کے ہاؤسنگ رجسٹر پر نام لکھوانے کے لیے ضروری ہے کہ درخواست دینے والا کونسل کے علاقے میں ایک معینہ مدت تک رہ چکا ہو۔ کم از کم ۱۹۶۰ء تک ہم میں سے بہت کم یہ شرط پوری کر سکتے تھے۔ ہم اس وقت تک سیلانی بندے تھے اور ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہلے سے بہتر کام کی تلاش ہمارا شعار تھا۔ پھر ہمیں ہر دو چار سال بعد دو چار سال کے لیے اپنے بال بچوں سے ملنے وطن بھی

www.taemeernews.com

جانا پڑتا تھا۔ فیکٹری میں اپنا کام چھوڑ کر جانے سے پہلے ہم عام طور پر کسی رشتہ دار کو منگوا لیتے اور اسے فیکٹری میں اپنی جگہ کام دلوا دیتے تھے۔ ہمیں ان فوائد کا ابھی تک پورے طور پر پتہ نہ تھا جو ایک ہی جگہ مستقل کام کرنے سے ہوتے ہیں۔ فیکٹری والوں کے لیے بھی یہ صورتِ حال بڑی سازگار تھی۔ ان کا کام جاری رہتا۔ ہم محض عارضی ورکر رہتے۔ اور اس وجہ سے مستقل ورکرز کی طرح اپنے حقوق کے لیے کوئی مطالبہ نہ کرتے۔ ہم اسی میں مگن تھے کہ اس ملک میں مستقل طور پر رہنے کے لیے تھوڑے آئے ہیں جو کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کا جھنجٹ پالتے پھریں ــــ

۱۹۴۷ء کے بعد

لڑائی ختم ہو چکی تھی اور برطانیہ کو مزدوروں کی بہت ضرورت تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت اور پاکستان سے ایسے لوگ زیادہ آئے جن کے لیے "ٹاؤن وارڈ فلٹریشن" کے ذریعے پہنچنے والی تعلیم میلوں دور رہی تھی۔ یہ ان دیہاتوں کے باسی تھے جہاں سے نزدیک ترین پرائمری اسکول کم از کم تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ مڈل اسکول اس سے بھی دور تھا۔ اور ہائی اسکول تو خیر بہت ہی دور کی بات تھی۔ ان کے جسم کا کس بل اور بازوؤں کا دم خم پنجاب، سرحد اور آزاد کشمیر کے دیہاتوں کی تازہ ہواؤں کی دین تھا اور اس کی برطانیہ کی فیکٹریوں میں بڑی مانگ تھی۔ برطانیہ نے اپنا دروازہ بڑی کشادہ دلی سے کھول رکھا تھا۔ طالب علموں کا دور ختم ہو رہا تھا۔ اب برطانیہ کی ضروریات مختلف تھیں ــــ

ہم یہاں آئے۔ ہم نے یہاں کی فیکٹریاں چلائیں۔ بسوں میں بس کنڈکٹری کی اور ریلوے کے پلیٹ فارموں پر پورٹر بنے۔ ہمیں کام کی ضرورت تھی اور برطانیہ کو کام کرنے والوں کی۔ ہم نے بڑی محنت اور خوش اسلوبی سے ان کے وہ سب کام کیے جو یہ خود کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہماری محنت کی جس نے ہمیں جو قیمت دی۔ وہ ہم نے دل اور جان سے قبول کی اور اس طرح اپنے ایمپلائرز کے "چہیتے" اور سستے مزدور بن گئے۔ ہم صرف اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ انگریزی زبان نہ ہمیں آتی تھی اور نہ سیکھنے کی فرصت تھی۔ ہمارے ایمپلائرز کو ہماری یہ بات بھی اچھی لگی۔ "اس طرح نہ ہمیں اپنے آس پاس کا پتہ چلے گا، نہ ہمارے حوصلے بڑھیں گے، اور نہ ہم زیادہ مزدوری مانگیں گے" ــــ ٹریڈ یونین نے بھی ہمیں کسی خاص توجہ کا مستحق نہ سمجھا۔ البتہ یونین کا ممبر ضرور بنا لیا اور ہم میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ہر ہفتے شلنگ دو شلنگ اپنے ہم زبان ساتھیوں سے اکٹھے کر کے اپنے ہاں کے "یونین والے" کو دے دیا کرے۔ یونین کا ممبر بننے سے جو حقوق اور مراعات حاصل ہونی چاہئیں، اُن کا نہ ہمیں علم تھا، نہ کسی نے بتانے کی زحمت گوارا کی۔ ہم بھی یونین کا ہفتہ وار چندہ ایک جزیہ قسم کا ضروری عطیہ سمجھ کر ادا کرتے رہے۔ ہم میں سے جتنے آئے وہ سب کے سب اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ ہمیں اکثر صورتوں میں اپنے دادا دادی۔ بلکہ چچاؤں اور اُن کے بیٹوں، پوتوں تک کی کفالت کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ کمائی کا بیشتر حصہ وطنِ عزیز کی جانب منی آرڈر ہو جاتا۔ یہاں رہائش کی صورت یہ تھی کہ ایک دوسرے سے ادھار لے کر کوئی ایک مکان خرید لیتا اور پھر اس میں دس بارہ افراد رہائش پذیر ہو جاتے۔ عام طور پر یہ سب رشتہ دار یا کسی قریبی گاؤں کے جان پہچان کے لوگ ہوتے تھے۔ ہانڈی روٹی ایک ساتھ پکتی۔ سب لوگ جان مار کر پورا ہفتہ کام کرتے۔ اتوار آتا تو اسی محلّے کی کسی اور گلی، یا کسی اور محلّے کے اسی طرح کے مکان میں اپنے دوستوں، رشتہ داروں سے ملنے چلے جاتے۔ گھر سے آئے ہوئے اپنے خط انھیں پڑھواتے۔ اور اگر ان میں سے کسی کا کوئی خط آیا ہوتا، تو وہ بھی سب کے لیے ایک مشترکہ اخبار بن جاتا۔ گاؤں، تحصیل، ضلع اور دوست، رشتہ دار، نمبردار، پٹواری سب کی خیر خیریت معلوم ہو جاتی۔ پھر بات سے بات چل نکلتی اور سارا دن اس مزے سے گزرتا کہ پورے ہفتے کی تھکن،

www.taemeernews.com

ہم یہاں کیسے پہنچے!

چند گھنٹوں میں دور ہو جاتی۔ بینک ہالی ڈے اور اگست کی چھٹیوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر ہوتا اور اسی طرح کے کسی مکان کے مکینوں سے ملاقاتیں اور باتیں ہوتیں۔ پردیس کا بوجھ کم ہو جاتا اور لگے ہاتھ اندرونِ ملک کی سیر بھی ہو جاتی۔ جب کسی کے پاس کچھ سال بعد اتنی رقم جمع ہو جاتی کہ وہ وطنِ عزیز کا ایک چکر لگا سکے تو وہ اپنے بیوی بچوں سے ملنے چلا جاتا اس مٹی سے جہاں اس نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی اپنا رشتہ قایم رکھتا اور ایک طویل "چھٹی" گذارنے کے بعد دوبارہ برطانیہ کی فیکٹریوں کا رخ کرتا۔ اُن دنوں صرف پاسپورٹ حاصل کرنے کی منزل کڑی ہوتی تھی۔ ورنہ اس کے بعد جب جی چاہے اور حالات اجازت دیں وہ بے جھجک آ جا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ اس ولایت میں رہتا۔ اور کچھ عرصہ وطنِ عزیز کی فضاؤں میں "فرصت کے رات دن" گنتا رہتا ——

زندگی کا یہ دور بڑا خوشگوار تھا۔ بیوی بچوں سے جدائی کے سال طویل ضرور تھے۔ لیکن آخر وہ بھی تو ہیں جو مرچنٹ نیوی کے جہازوں میں کام کرتے ہیں۔ بندرگاہ بندرگاہ پھرتے ہیں۔ مہینے اور بسا اوقات سال گذر جاتے ہیں۔ تب کچھ روز کے لیے بیوی بچوں کا منہ دیکھنے کی صورت بنتی ہے۔ جنگ کے میدان میں تو خیر کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ لیکن امن کے زمانے میں بھی سارے فوجیوں کو ان کی چھاؤنیوں میں "شادی شدہ کوارٹر" نہیں ملتے۔ اسی طرح سیکڑوں ایسی نوکریاں ہیں جن میں بیوی بچوں سے طویل وقفوں کے لیے جُدا رہنا پڑتا ہے۔ دُور کیوں جائیے۔ اس صنعتی برطانیہ میں ان لوگوں کو دیکھیے جو نائٹ شفٹ پر کام کرتے ہیں۔ شام پڑے جاتے ہیں۔ صبح منہ اندھیرے واپس آتے ہیں اور سارا دن سوتے ہیں۔ ان کے بارے میں تو ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ کہ ایسے کوئی صاحب ایک صبح رات بھر کام کرنے کے بعد اوور ٹایم لگ جانے کی وجہ سے معمول سے ذرا دیر کر کے گھر پہنچے۔ بچے جاگ کر اسکول جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک نے انھیں دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا تو کچن کی طرف دوڑا، جہاں ممی بریک فاسٹ بنا رہی تھیں، اور کہا "ممی ممی وہ آدمی آیا ہے جو ویک اینڈ ہمارے ہاں گزارا کرتا ہے" ——

ہمارے ہاں بالخصوص دیہات میں چچاؤں اور اُن کی بیویوں، بچوں اور درجنوں دُور اور نزدیک کے رشتہ داروں نے خاندان کے تصور کو بہت وسعت دے رکھی ہے۔ اور باپ اگر گھر سے دُور بھی رہے تو اُس کی غیر حاضری بچوں کی ذہنی نشو و نما پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتی جس کا شکار عام طور پر مختصر افراد پر محدود چھوٹے کنبوں کے بچے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ میں ہم اپنے بیوی بچوں سے جُدا ہونے کے باوجود کوئی ایسی غیر صحت مند حرکت نہیں کر رہے تھے جو ہمارے یا ہمارے اہلِ خاندان کے لیے کسی طرح مُضر ہوتی بلکہ کچھ سال یہاں رہنے کے بعد جب واپس جا کر ہم آیندہ کچھ سالوں کے لیے ساتھ رہتے تو زندگی میں تازگی پیدا ہو جاتی۔ محبتیں اور بھی بڑھ جاتیں ——

لیکن انگلستان والوں کو ہمارا یہ طرزِ زندگی پسند نہ آیا۔ اتوار کی صبح کو جب دس بارہ آدمیوں کا قافلہ بن سنور کر اپنے گھر سے کسی دوسرے گھر میں جانے کے لیے نکلتا تو فٹ پاتھ پر بسوں میں۔ ایک گھر سے نکلتے ہوئے۔ دوسرے گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ قافلے اتنے نمایاں نظر آتے کہ انگریز آنکھیں انھیں "کراؤڈ" سمجھنے لگیں، اور ہمسایوں ـــ بلکہ ہمسایوں سے بڑھ کر برطانوی اخبارات ـــ نے ہم پر انگلیاں اٹھانی شروع کر دیں۔ اور ہم نے انگریزی زبان کا ایک نیا لفظ سنا "ملٹی پل آکوپیشن"۔ اب یہ چرچے عام ہونے لگے کہ ہم ایک ایک مکان میں بہت زیادہ تعداد میں رہتے ہیں۔ جو صحتِ عامہ کے منافی ہے اور یہ کہ ہماری وجہ سے برطانیہ کا اعلیٰ معیارِ زندگی خراب ہونے لگا ہے اور اندرونِ شہر کے وہ علاقے جہاں ہم رہتے ہیں سلم بن رہے ہیں ——

۱۹۵۰ء کے آخری سالوں میں مکانات میں کثیر التعداد رہایش (ملٹی پل آکوپیشن) کی کہانیاں ـــ کچھ غلط ـ کچھ صحیح ـ کچھ

www.taemeernews.com

مبالغے سے بھرپور۔ اسکینڈل کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ ہم میں سے بعض اب لینڈ لارڈ بن چکے تھے اور اپنے مکان میں رہائشی کمرے کرایے پر دینے لگے تھے۔ ہمارے "لاجر" عام طور پر آئرلینڈ اور جمیکا سے آنے والے ہم ہی جیسے مزدور تھے۔ جو کسی نیوز ایجنٹ کے نوٹس بورڈ پر کرایے پر کمروں کے اشتہارات میں "نو آئرش ۔ نو کلرڈ پلیز" کا جملہ پڑھنے کے بعد ہمارے پاس آتے اور ہم انھیں کمرہ دے دیتے۔ اس طرح ہماری کمائی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جاتا۔ اور کسی کی رہایش کی مشکل بھی آسان ہو جاتی۔ لیکن پبلک ہیلتھ والوں کو ہم سے طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہونے لگیں ـــــ

اور پھر ۱۹۶۱ء میں ہاؤسنگ ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے پبلک ہیلتھ انسپکٹروں کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ مکان کا معائنہ کر سکتے ہیں اور اگر کسی مکان میں مناسب تعداد سے زیادہ افراد رہتے ہوں، یا اس میں ٹائیلٹ اور کچن کی سہولتیں معیار کے مطابق نہ ہوں تو وہ لینڈ لارڈ پر مقدمہ چلا سکتے ہیں۔ اس قانون کا غالبًا سب سے زیادہ استعمال برمنگھم میں ہوا جہاں اکثر بھارتی اور پاکستانی لینڈ لارڈز کو بڑے بڑے جرمانے ہوئے ـــــ

۱۹۵۰ء کے بعد ہر آنے والا سال ہمیں برطانیہ کا ایک نیا روپ دکھانے لگا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں بھارت اور پاکستان سے آئے ہوئے افراد کی سارے برطانیہ میں کل تعداد سات ہزار تین سو پچاس تھی جو برطانیہ کی آبادی کے مقابلے میں محض سمندر کا ایک قطرہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۵۰ء سے ایک ٹوری ممبر پارلیمنٹ سر سیرل اوسبورن ہماری وجہ سے بے حال ہونے لگے تھے اور انھوں نے متواتر یہ مطالبہ شروع کر رکھا تھا کہ دولتِ مشترکہ سے آنے والے تارکینِ وطن کے داخلے پر کنٹرول کیا جائے ـــــ

تارکینِ وطن؟ ہم آنے جانے والے لوگ تھے۔ ترکِ وطن کی کوئی نیت نہ تھی۔ تاہم جب ہمیں یہ نام ملا تو یہ سوچ کر کہ ہمارے لیے اگر کسی کو یہی پسند ہے، تو یہی سہی۔ آخر یہ کوئی گالی بھی تو نہیں۔ ہم نے بڑی بے نیازی سے اسے اپنا لیا۔ ۱۹۵۵ء میں ٹوری جماعت کی قانون ساز کمیٹی کونسل آف دی کنزرویٹو اینڈ یونینسٹ ایسوسی ایشن نے سر سیرل کی پُرزور حمایت کی۔ اور یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ دولتِ مشترکہ کے باشندوں کے لیے بھی وہی قانون ہونے چاہئیں جو غیر ملکیوں پر لاگو ہوتے ہیں اور یہ رعایت ختم کر دینی چاہیے کہ یہ لوگ جب چاہیں آئیں جائیں۔ اس وقت کی برمنگھم کی لیبر کونسل اور بعض لیبر ممبرانِ پارلیمنٹ بھی کنٹرول کے حق میں آواز بلند کرنے لگے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں سر سیرل اوسبورن کے ایما پر پارلیمنٹ میں امیگریشن کنٹرول پر بحث کی گئی۔ کنٹرول کے حامیوں کی ہار ہوئی لیکن بحث کے دوران بعض آنریبل ممبرانِ پارلیمنٹ کی زبانوں پر ایسی باتیں آئیں کہ انسانی عظمت، انسانی برادری اور اس بارے میں اخلاقی اقدار کے اُن بلند بانگ دعووں کا سارا پول کھُل گیا جن پر دولتِ مشترکہ کا سرپرست برطانیہ ناز کرتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں برمنگھم میں برمنگھم امیگریشن کنٹرول ایسوسی ایشن قایم ہوئی۔ جس نے امیگریشن کنٹرول کے حق میں عام شہریوں سے دستخط کرائے اور انھیں ممبرانِ پارلیمنٹ کو بھیجا۔ ۱۹۶۰ء کے آخری مہینوں میں ہوم سکریٹری نے ایک انٹرڈیپارٹمنٹل کمیٹی کو تارکینِ وطن کے بارے میں غور کرنے اور حقایق معلوم کرنے کو کہا۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ "باہر کے ملکوں سے صرف اتنے لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت ہونی چاہیے جتنی یہاں نوکریاں موجود ہوں"۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں اس کمیٹی کی رپورٹ اخبارات والوں کے ہاتھ لگ گئی۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت نے خود ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ پریس والوں کو اس خفیہ رپورٹ کی تفصیلات کا علم ہو جائے تاکہ عوامی ردِ عمل معلوم کیا جا سکے) اخبارات نے اس پر ہر زاویۂ خیال سے خوب خوب تبصرے کیے۔ اس دوران ۹ فروری ۱۹۶۱ء کو برمنگھم کے ایوننگ میل نے لکھا کہ ہوم سیکریٹری نے سینیر وزیروں کو بتایا ہے کہ امیگریشن پر کنٹرول کرنا چاہیے۔ ٹوری پارٹی کی ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں سالانہ کانفرنس ہوئی تو اُس میں

www.taemeernews.com

محمود ہاشمی

ہم یہاں کیسے پہنچے!

امیگریشن پر پابندیوں کے حق میں ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ اسی سال ۳۱ راکتوبر کو ملکہ نے تقریر کی جس سے حکومت کی پالیسی واضح ہوگئی۔ ملکہ نے کہا۔" دولتِ مشترکہ سے آنے والوں کے برطانیہ میں داخلے پر کنٹرول کرنا چاہیے"۔ تقریر کے دوسرے ہی دن یکم نومبر کو امیگریشن کنٹرول بل شایع ہوا۔ ۲۷ رفروری ۱۹۶۲ء کو یہ بل پاس ہوگیا۔ اور یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو امیگریشن کنٹرول ایکٹ کے ذریعے پابندیوں کا قانون لاگو ہوگیا۔ اب ایک مقررہ کوٹے کے تحت برطانیہ میں صرف وہی لوگ آسکتے ہیں جن کے پاس ورک ووچر ہوں۔ تاہم ان کو جو یہاں پہلے ہی سے مقیم تھے یہ حق دے دیا گیا کہ وہ جب چاہیں اپنے بیوی بچوں کو اپنے پاس منگوا سکتے ہیں ——

تارکینِ وطن کے برطانیہ میں داخلے پر پابندیوں کے اس قانون کے نفاذ سے پہلے حکومت، سیاست دانوں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن نے پورے ایک سال — غیر شعوری طور پر ہی سہی — ایک ایسی فضا پیدا کیے رکھی جیسے — بے دلی ہی سے سہی — وہ یہ دعوت دے رہے ہوں کہ "اے آنے والو! اب بہت سوچ وبچار نہ کرو اور جلدی جلدی آجاؤ، دروازہ بند ہونے والا ہے۔ قانون بن گیا تو پھر کبھی نہ آسکو گے۔ اس لیے بس اب آ ہی جاؤ۔۔۔" اور اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ۱۹۶۲ء میں اس قانون کے نفاذ سے پہلے کے چھ مہینوں میں دولتِ مشترکہ کے شہری یہاں قطار اندر قطار آئے ——

۱۹۶۱ء میں برطانیہ میں بھارت اور پاکستان سے آئے ہوؤں کی تعداد ساڑھے سات ہزار تھی۔ اس سے دس گیارہ سال قبل بھی قریب قریب اتنی ہی تھی۔ لوگ ان سالوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے نئے آنے والوں کی وجہ سے کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہورہا تھا۔ مزید برآں یہ تعداد روزگار ملنے یا نہ ملنے کے حالات کے مطابق کبھی بڑھتی اور گھٹتی رہتی تھی۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۵ء میں برطانیہ میں ہماری کل تعداد سات ہزار تین سو پچاس تھی (بریڈ فورڈ میں صرف اڑھائی سو پاکستانی رہتے تھے) لیکن ۱۹۵۹ء میں یہ تعداد قریب قریب آدھی ہوگئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۵۸ء میں برطانیہ کی فیکٹریوں میں کام کم ہوگیا تھا، اور اکثر افراد نے یہاں بے کار پڑے رہنے اور بے روزگاری کے الاؤنس پر گزارہ کرنے کی بجائے "چھٹی" منانے واپس وطن چلے جانے کو ترجیح دی تھی۔ لیکن جب ۱۹۶۱ء کے آخری مہینوں اور ۱۹۶۲ء کی جولائی تک دولتِ مشترکہ کے ممالک میں یہ آوازیں لگاتار پہنچنے لگیں کہ دروازہ بند ہونے والا ہے، تو ہر اس شخص نے جو "یہاں" ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں"۔ کی کیفیت کے ہلکورے لے رہا تھا، فوراً رختِ سفر باندھا اور برطانیہ آپہنچا۔ ۱۹۶۲ء کے پہلے چھ مہینوں میں برطانیہ میں ہماری تعداد ۴۸ ہزار ہوگئی۔ اگر پابندیوں کا یہ قانون نافذ ہوتا اور اس کے نفاذ سے پہلے اس شدت سے پابندیوں کے بارے میں واویلا نہ مچتا تو عین ممکن ہے اس ۱۹۶۷ء تک بھی ہماری تعداد اتنی زیادہ نہ ہوتی۔ اور موجودہ بے روزگاری کے دور میں یہ اور بھی کم ہوتی۔ بہر حال ——

برطانیہ میں داخلے پر پابندیوں کے اس قانون میں ایک شق "ری ٹرننگ ریذیڈنٹ" کے بارے میں تھی، جس کی وضاحت یہ کی گئی تھی کہ اگر دولتِ مشترکہ کا یہاں پہلے سے مقیم کوئی شہری برطانیہ سے باہر جائے، اور دو سال کے اندر اندر واپس آجائے، تو وہ "ری ٹرننگ ریذیڈنٹ" کے طور برطانیہ میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکے گا۔ لیکن اگر وہ برطانیہ سے باہر دو سال یا اس سے زیادہ عرصہ گزارے گا تو اسے یہ رعایت نہیں ملے گی۔ اسے باقاعدہ انٹری سرٹیفکیٹ لے کر آنا ہوگا اور اس پر وہ تمام شرائط لاگو ہوں گی جو قانون کے تحت نئے آنے والوں کے لیے لازمی قرار دی گئی ہیں۔ اسے یہاں اس طرح آنا ہوگا جیسے وہ یہاں پہلی مرتبہ آرہا ہو ——

اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کی طرح تین تین چار چار سال کی غیر معینہ مدت کی طویل "چھٹی" کی روایت ختم ہوئی اور اس نئی روایت کی بنیاد پڑی کہ کچھ سال یہاں کام کرو۔ پھر اپنے بال بچوں، عزیزوں، رشتہ داروں سے ملنے واپس جاؤ اور دن کم نہ زیادہ

www.taemeernews.com

پورے دو سال رہ کر واپس آجاؤ۔ اس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کچھ سالوں بعد قانون کی اس شرق کے معنی بدل جائیں گے اور انھیں ان دو سالہ "چھٹیوں" کا جو حساب دینا پڑے گا وہ انھیں بہت مہنگا محسوس ہوگا۔ پاکستان کے دولتِ مشترکہ سے نکل جانے کے بعد جب ۱۹۷۳ء میں پہلے سے یہاں آئے ہوئے پاکستانیوں کو برطانوی نیشنلٹی حاصل کرنے کا حق دینے کے لیے پاکستان ایکٹ معرضِ وجود میں آیا تو کئی محض اس وجہ سے برطانوی نیشنلٹی حاصل نہ کر سکے کہ وہ نیشنلٹی کے لیے درخواست دینے کی تاریخ سے پہلے کے آٹھ سالوں کے دوران برطانیہ میں پانچ سال کے قیام والی ضروری شرط پر پورے نہ اتر سکے۔ ان کو ڈو ڈو سال کی "چھٹیوں" نے مارا۔ ہوم آفس کے قانون دان افسروں نے ان دو دو سالوں کی غیر حاضری کو یہاں قیام کی مدت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا ——

۱۹۶۲ء کے امیگریشن کنٹرول ایکٹ کے بعد بیویوں اور بچوں کے برطانیہ آنے کا دور شروع ہوا ——

بیوی بچوں کو اپنے پاس منگوانے کے قانون میں ایک لازمی شرط یہ تھی کہ ان "بزرگ خاندان" کے پاس جو انھیں بلوا رہے ہیں رہائش کا معقول انتظام ہو۔ ہمارے لیے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اکثر کے اپنے مکان تھے۔ ان مکانات میں آئرش یا جمیکن کرایہ دار رہتے تھے۔ یا لینڈلارڈ کے رشتہ دار اور رواقف کار۔ جن کی روٹی ہانڈی ایک ساتھ پکتی تھی۔ اب جب لینڈلارڈ نے اپنے بیوی بچوں کو بلوانے کا ارادہ کیا تو مکانات میں بھی ایک تبدیلی آنے لگی۔ لاجنگ ہاؤس اور بورڈنگ ہاؤس ختم ہو کر آہستہ آہستہ فیملی ہاؤس بننے لگے۔ مکان میں رہنے والے رشتہ داروں اور رواقف کاروں نے بھی زمانے کی رو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو بلوا لیں گے۔ انھوں نے بھی کچھ رقم جمع کر کے اور کچھ ادھار لے کر اسی محلے میں مکان خرید لیا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اپنے رشتہ داروں اور گاؤں والوں کے قریب ہی رہا جائے۔ بیوی بچے آئے تو وہ بھی ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے اور اجنبی دیس میں انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی ——

یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے اکثر محلوں میں، جہاں ہم رہتے ہیں۔ ایک ضلع ایک تحصیل اور بعض اوقات ایک ہی گاؤں کے لوگ نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو پوری گلی میں ایک ہی گاؤں آباد ہے۔ برمنگھم کے علاقے سالٹلے میں جہاں ایک اندازے کے مطابق ۳۳ فی صد ایشیائی ہیں۔ بھارتی اور بنگلہ دیشی بھی ہیں۔ لیکن بہت کم۔ اسی طرح پنجاب اور سرحد کے بھی کچھ کنبے ہیں۔ لیکن اکثریت آزاد کشمیر کے ضلع میرپور کے علاقہ اندھرل کی ہے اور زیادہ تر لوگ سملوٹھ، کنڈور، تاج پور اور نواحی دیہات سے یہاں پہنچے ہیں۔ برمنگھم کا ایک اور ایشیائی اکثریت کا علاقہ ہینڈز ورتھ سکھوں کی نوآبادی ہے اور ان کے مقابلے میں پاکستانی آزاد کشمیری اور بنگلہ دیشی صرف دس فی صد ہیں۔ اسی طرح الیسٹن بنگالیوں کا مرکز ہے۔ اور اسپارک بروک میں گجراتی چھائے ہوئے ہیں۔ اسمال ہیتھ کسی زمانے میں میرپوری تھا۔ لیکن جب بالسل ہیتھ جو برمنگھم میں پاکستانیوں اور بھارتیوں کا پہلا گڑھ تھا۔ اُجڑا۔ اس کے پرانے مکان گرے۔ اور تعمیرِ نو ہوئی تو وہاں کے اکثر لوگ پڑوسی علاقہ اسمال ہیتھ میں چلے آئے۔ اب اسمال ہیتھ جہاں ۴۵ فی صد ایشیائی بستے ہیں۔ کسی مخصوص گاؤں، ضلع، صوبہ یا ملک کے لیے مخصوص نہ رہا۔ تاہم بعض گلیوں میں اکثر مکانات کسی ایک ہی گاؤں یا ضلع سے آئے ہوئے لوگوں کے ہیں۔ ان تمام محلوں ہینڈز ورتھ، الیسٹن، سالٹلے، اسمال ہیتھ، اسپارک بروک اور بالسل ہیتھ سے اسٹریٹ کی بس نمبر ۸ گزرتی ہے اور اس نے ان سب کو ایک طرح سے ایک لڑی میں پرو رکھا ہے ——

بیویاں اور بچے منگوانے کے اس دور میں جب کسی ایشیائی کے بیوی بچے آنے والے ہوتے ہیں اور انھیں مکان خریدنا ہوتا ہے تو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ سب سے پہلے اسی گلی یا محلے میں مکان تلاش کرتے ہیں جہاں ان کے آبائی گاؤں یا قریب کے

www.taemeernews.com

گاؤں کا کوئی رشتہ دار یا واقف کار کنبہ رہ رہا ہو۔ ہم ان امور کو کوئی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ مکان کی عام حالت کیسی ہے ؟

۱۹۷۱ء کے جنرل ہاؤس ہولڈ سروے کے مطابق برطانیہ کی ساری آبادی میں سے ۲۳ فی صد تارکینِ وطن (ایشیائی اور ویسٹ انڈین دونوں) ایسے مکانات میں رہتے تھے جنھیں رہائش کے مقررکردہ معیار سے کم اور سب اسٹینڈرڈ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے (مقامی آبادی سمیت) افراد کا رہائشی معیار خاصا بلند تھا۔ اور ان میں سے صرف ۶.۷ فی صد سب اسٹینڈرڈ مکانات میں رہتے تھے ــــــ

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے دوران معلوم ہوا کہ برطانیہ کی ساری آبادی کے مقابلے میں دولتِ مشترکہ سے آئے ہوئے تارکینِ وطن میں سے بیس فی صد کنبے کسی اور کنبے کے ساتھ مل کر ایک مکان میں رہتے تھے ــــــ

۱۹۷۴ء میں پولیٹیکل اینڈ اکنامک پلیننگ (پیپ) کے سروے کے مطابق ۴۱ فی صد ایشیائی۔ ۳۴ فی صد ویسٹ انڈین اور عام آبادی میں سے گیارہ فی صد ایک بیڈ روم کو دو یا دو سے زیادہ افراد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پیپ کے سروے سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ایشیائیوں میں سے ۷۶ فی صد کے اپنے مکان ہیں۔ اور ان میں سے صرف چار فی صد کونسل کے کرایہ دار ہیں۔ اور ۱۹ فی صد کسی عام لینڈلارڈ کے ہاں کرایے پر رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ویسٹ انڈین میں سے صرف پچاس فی صد اور دوسری عام آبادی میں سے ۵۴ فی صد کے اپنے مکان ہیں۔ کونسل کے کرایہ دار عام آبادی میں سے ۲۹ فی صد اور ویسٹ آبادی کے ۲۶ فی صد ہیں ــــــ

پاکستانیوں میں ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہے جن کے اپنے مکان ہیں۔ لیکن ان مکانات کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے پیپ نے بتایا کہ پاکستانی اور بنگلہ دیشی گھروں میں سے ۵۷ فی صد میں باتھ روم نہیں ہیں، اور ٹائیلٹ مکان کے باہر ہے۔ اس سلسلے میں بھارتیوں کی حالت ذرا بہتر ہے۔ ان کے گھروں میں سے ۳۷ فی صد ایسے ہیں جو ان سہولتوں سے محروم ہیں۔ دوسری عام آبادی میں ایسے گھروں کا تناسب صرف ۱۸ فی صد کے قریب ہے جن میں باتھ روم نہیں ہے اور ٹائیلٹ مکان کے باہر ہے ــــــ

ہم اب امیگرنٹ ہیں

کہتے ہیں ایک سیّد زادہ پھرتے پھراتے دُور کسی گاؤں میں جا نکلا۔ گاؤں والوں کو جب پتہ چلا کہ یہ سیّد زادہ ہے تو انھوں نے اسے گھیر لیا۔ عقیدت سے گلے لگایا اور اپنی ساری محبت اس پر نثار کر دی۔ جب اس نے واپسی کا عزم کیا تو سب کے سب اس کی راہ میں کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "سید بادشاہ اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ ہم تمھیں رکھیں گے، جب مرو گے تو تمھارا مزار بنائیں گے۔ اپنی منتیں پوری کرنے اور نذر نیاز چڑھانے کے لیے ہمیں پورے بیس میل دور مزار پر جانا پڑتا ہے۔ اللہ نے ہم گنہگاروں پر کرم کیا جو تمھیں ہمارے پاس بھیج دیا۔ اب تم یہیں رہو گے اور یہیں تمھارا مزار بنے گا ــــ"

معلوم ہوتا ہے ہم پر بھی کچھ ایسی ہی افتاد آ پڑی ہے۔ ہم وہ سیّد زادے نہ تھے جن کے مزار کی اہلِ برطانیہ کو ضرورت تھی اور یہاں کی فیکٹریوں، ملوں، ہسپتالوں، اسکولوں، بسوں اور ریلوے کو ہماری یقیناً ضرورت تھی اور یہاں کے ایمپلائر کی نگاہ میں ہم محنتی اور دیانت دار کر تھے۔ اس ملک میں ہمارا قیام یہاں کی ترقی کے لیے اشد ضروری تھا ــــــ

برطانیہ نے ہمارے لیے دروازہ کھولا اور پھر بند کر دیا۔ لیکن کچھ اس طرح کہ ہمارے شوق کی آگ اور بھڑکی۔ دروازے کو ــ اپنی ضرورت کے مطابق اور ہمیں ذرا تھپکی دینے کے لیے ــــ تھوڑا سا کھلا بھی رکھا گیا ــ سیاست گروں اور جمہور پسند و لستے ہم سے اپنا ئیت

www.taemeernews.com

محمود ہاشمی

ہم یہاں کیسے پہنچے:

بیگانگی کے عجیب عجب کھیل کھیلے۔ کبھی مسکرائے۔ کبھی تیوری چڑھائی اور بیٹھے تیکھے انداز میں ایسا الجھایا کہ ہم جو ولایت میں اس لیے نہیں آئے تھے کہ یہاں اپنا گھر بسائیں گے اور تارکینِ وطن کہلائیں گے۔ حالات کی سازش کا شکار ہو گئے ـــــ

ایک جنتی کو جنت میں بیٹھے بیٹھے ایک دن خیال آیا کہ نہ جانے جہنم کیسا ہوگا۔ اس کے بارے میں سُنا تو بہت کچھ تھا۔ لیکن اسے کاش کبھی اس کی جھلک دیکھنے کا بھی موقع مِل جاتا۔ قریب سے ایک فرشتہ گذر رہا تھا۔ ان جنتی صاحب نے اسے روک لیا اور پوچھا ـــ "میاں فرشتے یہ تو بتاؤ کہ ہم کبھی جہنم کی سیر کر سکتے ہیں؟" ـــ فرشتے نے کہا ـــ "محترمی آپ جنتی ہیں، جو چاہیں ہو سکتا ہے۔ جب چاہیں جا سکتے ہیں" ـــــ

کچھ ہی دیر بعد وہ جہنم میں تھے۔ لیکن انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جہنم کا جو نقشہ اُن کے ذہن میں تھا، یہ جہنم اس سے بہت مختلف تھا۔ یہاں ساز تھے، سنگیت تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں تھیں۔ ہر طرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی۔ نازنینوں کے غمزہ و ادا کی یہ کیفیت تھی کہ جنتی حور و غلمان کو بھولنے لگے۔ قیام عارضی تھا۔ اس لیے جلد ہی لوٹنا پڑا۔ لیکن اب جنت میں اُن کا دل نہیں لگتا تھا۔ ایک دن اُس فرشتے سے پھر ملاقات ہوئی، تو انھوں نے کہا۔ "ہم جہنم میں گئے پر جلد ہی لوٹنا پڑا۔ یہ تو بتاؤ اگر کوئی جنتی جہنم میں مستقل طور پر جانا چاہے تو کیا وہ جا سکتا ہے؟" ـــ فرشتے نے کہا ـــ "محترمی آپ جنتی ہیں۔ جو چاہیں ہو سکتا ہے۔ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔ وہاں مستقل رہنے کے لیے کچھ دفتری کارروائی ضروری ہے۔ لیکن یہ معاملہ بھی پلک جھپکتے میں ہو جائے گا" ـــ

دفتری کارروائی ہو گئی۔ اور وہ مستقل قیام کا پروانہ لے کر جہنم میں پہنچ گئے۔ اب کے پھر انھیں حیرت ہوئی، کہ جہنم کا جو نقشہ وہ پچھلی مرتبہ دیکھ کر گئے تھے، یہ جہنم اس سے بہت مختلف تھا۔ یہاں آگ کے الاؤ تھے۔ جہنمی لوگ پسینے میں شرابور مشقت کر رہے تھے۔ اردگرد بڑے بڑے گرز لیے ان کے نگہبان پھر رہے تھے۔ جونہی کوئی دم لینے کو رُکتا۔ دھم سے اس پر گرز کی ایک چوٹ پڑتی اور وہ پھر سے آگ کے الاؤ میں جلنے لگتا۔ ان سابق جنتی صاحب نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر پڑا، جس نے ان کے یہاں آنے کا انتظام کیا تھا۔ اس سے پوچھا ـــ "میاں فرشتے یہ جہنم وہ تو نہیں جو میں نے پچھلی مرتبہ دیکھا تھا" ـــ فرشتہ بولا: "محترمی جگہ وہی ہے۔ صرف فرق یہ آ پڑا ہے کہ پہلے آپ چھٹی منانے والے ٹورسٹ تھے اور اب امیگرنٹ ہیں" ـــ

برطانیہ میں اب ہم امیگرنٹ ہیں اور ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ مانیں یا نہ مانیں، ہمارا جنم مرن اب یہیں ہے ـــ

(کتاب "ایک گھر بنایا چاہیے" کا ایک باب)

علی حیدر ملک

کے

افسانوں کا پہلا مجموعہ

بے زمین بے آسمان

بہت جلد شایع ہو رہا ہے

www.taemeernews.com

غلام قادر آزاد

انگلستان میں جشنِ ندیم و افکار

ہنی مون اور تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے کیے جانے والے سفر کو کیا کہیے کہ اس کی منزل قمار خانۂ عشق و شوق ہے اور داں جو جائیں گرہ میں مال کہاں۔ یہ آخری بات میں نے صرف اپنے لیے عرض کی ہے اور اس میں کسی حسرت کو بھی قطعی دخل نہیں۔ وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ادب شناسوں کے مابین اکثر اشارے وضاحت صراحت سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہنی مون کا عزم اور تبدیلیِ آب و ہوا کی خواہش رکھنے والے "ارباب دل" اسے قطعی ذاتی رائے قرار دیں گے اور فقیروں سے کج ادائی کا مسئلہ سر نہیں اٹھائے گا۔ دراصل میں یہ عرض کرنے چلا تھا کہ سفر اپنی ہر شکل میں بنیادی طور پر ایک آزار و آزمایش ہے۔ آپ کے پاس خواہ پیغمبرانہ سخت کوشی کی صلاحیت ہو یا شاعرانہ عافیت طلبی کی عادت، اس کی صعوبت اور کلفت میں فرق نہیں آتا۔ اگرچہ آج کی دنیا میں اس کا ہلکان کر دینے والا تصور قریب قریب ناپید ہے اور آبلہ پائی کی جگہ بادہ پیمائی اور باد پیمائی نے لے لی ہے، مگر پھر بھی اس کی معنوی صعوبت بدستور موجود ہے۔ سفر کبھی پاؤں کا آزار تھا اب دل کا آزار ہے، اور یہ آزار سفرِ فرنگ سے مخصوص بھی نہیں، بلکہ خدا کی جس شان کی تخصیص اکبر الٰہ آبادی نے انگلستان کے سفر سے کر دی تھی، وہ شان اب کہیں زیادہ آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے اور دامانِ دل و نظر کے لیے موجبِ صد آزمایش ہے شاید اسی لیے کسی نے کہا تھا ؎

اگر بہ دل نہ خلد آنکہ در نظر گذرد\
خوشا درازیِ عمرے کہ در سفر گذرد

صاحبان!— سفر کانٹوں کی راہ تو ہے ہی مگر کہیں کہیں اس میں پھولوں کی نرمی و لطافت بھی ملتی ہے، اس کا احساس ادراک آج آپ کے تپاک اور طرزِ تپاک نے شدت کے ساتھ عطا کیا ہے، بلکہ اس شدت کے ساتھ کہ جی میں یہ تمنا چٹکیاں لینے لگی ہے کہ اس نشست کے برخاست ہوتے ہی میں پھر اسی سفر پر روانہ ہو جاؤں جس کا غبار دل و دماغ پر پڑا ہوا ہے۔ محبت بھی انسان کو کس قدر نرگسی بنا دیتی ہے۔ دل چاہتا ہے ؎

ہزار بار بروَد صد ہزار بار بیا

والی تمنا کا رُخ اپنی ہی طرف کر لوں۔ اب اگر اس تمنا نے زور مارا اور زور آوری آپ جانتے ہیں تمنا کے خمیر و ضمیر میں ہے تو شاید مجھے پھر سفر کے آزار سے فوری گذرنا پڑے گا۔ دیکھیے محبت اور عشق اپنی ہر شکل میں کوئی خطرہ بھی پوشیدہ ضرور رکھتے ہیں۔

www.taemeernews.com

شاید اسی لیے مغرب کا "عملی مزاج" عشق سے اُسے عشق بازی کی طرف لے گیا اور اس حد تک کہ انھوں نے جنسی آزادی کے سماج یعنی Permissive" Society کی تشکیل کر کے اسے بازیچۂ اطفال بنا ڈالا ہے جو غالب کے سامنے بلا شبہ کسی تماشے سے کم نہ ہوگا۔ بلکہ اب تو اس کا محض تماشہ کرنے والا خود کو غالب ہی خیال کرتا ہے۔ لیجیے غالب کے نام پر ایک بات اور یاد آئی۔ دشتِ غربت کی تنہا، اجاڑ، ویران اور سنسان گھڑیوں میں جب کبھی یادِ وطن آئی اور دل پر اجنبیت کا دکھ درد پہاڑ بن کر رک سا گیا تو دماغ کے نہاں خانوں سے غالب نے آواز دی ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں!

لیکن اس آواز کے فریب میں ہمیشہ مبتلا رہا۔ اس کی بدولت پہاڑ سی گھڑیاں میرے لیے سبک ہو جاتیں اور روح میں ایسی توانائی کا احساس جاگ اُٹھتا جو سفر کاٹنے اور غربت کا دکھ جھیلنے کے لیے بے حد ضروری چیز ہے۔ اور تو اور میں نے دل ہی دل میں یارانِ وطن کی بے مہریوں کی ایک طویل فہرست بھی مرتب کر لی، تاکہ آوازِ غالب پر لبیک بھی کہہ سکوں۔ مگر آج آپ سے مل کر خود سے شرمندہ ہوں۔ وہ فہرست کالعدم قرار دے رہا ہوں، لیکن ایک سوال میرے ذہن میں ابھرتا ہے کہ اب دوبارہ جب کبھی اُسی صورتِ حالات سے دوچار ہوں گا تو آپ کو بھلا دینے کا جواز کیا اور کہاں سے لاؤں گا؟۔ اس لیے کہ کچھ چیزیں بھلائے بغیر کچھ نئی چیزیں انسان اپنا نہیں سکتا اور نئی چیزوں کا اپنانا سفر کی چند کڑی شرائط میں سے ایک ادنیٰ سی شرط ہے۔ فانی ان شرائط کو نظر انداز کر کے دشتِ غربت میں وارد ہوئے تھے۔ اس لیے سفر اُن کے لیے حزن و ملال کا ایک باب مکمل تھا ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے!

صاحبان! مجھے یقین ہے فانی اگر حیدرآباد کی بجائے بریڈ فورڈ کا رُخ کرتے تو ہائے کہہ کر چپ نہ ہو جاتے، بلکہ مقدور نہ ہونے کے باوجود گھر کو ساتھ رکھتے۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں تو گھنی چھاؤں بھی اُس دھوپ سے زیادہ ہلاکت انگیز ہے جس سے بچ کر وہ اسی طرف کا رخ کرتے۔ یوں گھنی چھاؤں درختوں کی کثرت اور افراط کے باوصف ہمارے ہاں ہے بڑی نایاب۔ جس کڑی دھوپ کے وہ شاکی ہیں، ہم اُسی دھوپ کے تمنائی ہیں۔ دیکھیے موسموں کا تفاوت بھی انسانوں کے خیالات، نظریات، افکار اور اقدار میں کیا کیا اختلاف پیدا نہیں کر دیتی۔ کہیں واقعی اخلاقی اقدار بھی اضافی شے تو نہیں؟ کم از کم جس دیس میں ہم ہیں وہاں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہاں البتہ اُردو سماج میں ایسا نہیں۔ وہ وہاں بھی دال روٹی، چپاتی، چاول، ساگ گوشت کو ازلی اور ابدی حقیقتیں تصور کرتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہیں۔ ذائقے کتنی دیرپا چیز ہیں، اقدار و افکار میں اگر ذائقہ اور لذت دینے کی صلاحیت ہوتی تو ان کی شکست و ریخت اتنی آسان نہ ہوتی —

حضرات! — اب روٹی کی جو بات چلی ہے وہ جلد ختم ہونے کی نہیں اور مجھے شاید ادب کی بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم روٹی کی بات قطع کر کے ادب پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ضرور کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ اس کی روایت پہلے ہی سے موجود ہے اور ہم جی بھر کر ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ میرے وادیِ غربت میں قدم رکھنے کے بعد روٹی جیت گئی تھی یا ادب ہار گیا تھا یا معاملہ کچھ یوں رہا تھا کہ ع

www.taemeernews.com

وہ ہار کر بھی جیتی یہ جیت کر بھی ہارا

غور کریں تو بیسویں صدی کی افتاد اصل میں یہی ہے کہ اس نے بے شمار مسلّمہ اقدار و نظریات، عقائد و تیقّنات کی کایا پلٹ دی ہے۔ انسان ہر طرف سے کسی تحیّر اور کسی تشکک کے صدراہے پر کھڑا ہے۔ تشکیک اور حیرت کا یہ کرب۔ مغرب میں جہاں صنعتی تہذیب نے کُلّی طور پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، کچھ اور بھی واضح ہو کر نظر پڑتا ہے۔ مادیت پرستی کے غیر معمولی طوفان نے انسان کو محض حیاتیاتی سطح پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ بے حد تنہا اور بے حد بے وقعت خود کو محسوس کرتا ہے، اور بلا شبہ میکس شا کے یہ الفاظ بڑے وقیع ہیں کہ "ہم اس پہلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں انسان مکمل طور پر خود اپنے لیے ایک مسئلہ بن گیا ـــــ"

ہمارے لیے ان کی اہمیت دُہری ہے اس لیے کہ ہم زراعتی سماج سے نکل کر ایک مکمل صنعتی سماج میں پاؤں جمانے والے پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب لاکھوں کی تعداد میں پاکستانی انگلستان کو دوسرا وطن بنا رہے ہیں اور انگلستان بھی ایک صحیح Multi Racial Society کی تشکیل کر رہا ہے۔ تشکیل اور تکمیل کا یہ دور ہمارے اندر کی قدروں کے لیے غیر معمولی طور پر آزمائش، آویزش اور پیکار کا دور ہے۔ یہ ایک کرائسس ہے اور میری حقیر رائے میں ایسی فضا ادب کی تخلیق کے لیے نہایت سازگار ہوتی ہے۔ اس موڑ پر ایسے ادب کی تخلیق کے امکانات تو بے پناہ نہیں جو جدید ذہن کے مرکب نفسیاتی، روحانی اور جذباتی تجربوں کی عکاسی کرے۔ اس کے گم ہوتے ہوئے عقیدوں کی کہانی ہے کہ عقیدے اسی وقت گم ہوتے ہیں جب وہ زندگی کا ساتھ دینے کی ساری سکت اور صداقت سے عاری ہو جاتے ہیں۔ نئی قدروں کا شعور بخشنے اور جو بننے اور سنورنے والا اصل ہے اس کی نشان دہی کرتے ہوئے نئے تہذیبی اور سماجی احوال میں پاؤں جمانے کا حوصلہ عطا کرے۔ انگلستان میں اردو ادب کی فضا میں ابھی ایسے نقوش دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہاں کے لکھنے والے کسی کرب سے ضرور گزر رہے ہیں۔ تخلیق کا مسئلہ محض احساسِ کرب یا دردِ احساس ہی کا سارا مسئلہ نہیں۔ تاہم اس سے امید ضرور بندھتی ہے کہ

؎ کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

جہاں تک اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے اُس میں گزشتہ چند سالوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے جب کچھ برس پہلے افکار کے جوبلی نمبر میں انگلستان میں اُردو زبان و ادب کا جائزہ لیا تھا تو انھوں نے بریڈفورڈ کے الیکشن میں اشتہارات کے اردو میں چھپنے کا ذکر بھی کیا تھا۔ اب یہ سلسلہ بڑھ کر دوسرے شہروں میں بھی پھیل چکا ہے۔ یہی نہیں ایسی تمام فیکٹریوں میں جہاں تارکینِ وطن جن سے میری مُراد ایشیائی تارکینِ وطن سے ہے زیادہ تعداد میں کام کرتے ہیں وہاں ضروری اطلاعات اور ہدایات اُردو میں بھی نظر آتی ہیں۔ سماجی بہبود کا محکمہ ضروری کتابچے اردو میں بھی چھاپتا ہے۔ ادھر گزشتہ ڈیڑھ دو سال میں افریقہ سے مزید ایشیائی تارکینِ وطن کے انگلستان آجانے کے بعد اُردو زبان کے دائرۂ اثر و نفوذ میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اُردو مسلّمہ طور پر برصغیر پاکستان و ہند میں سب سے زیادہ سمجھی، بولی اور پڑھی لکھی جانے والی زبان ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس دیارِ غیر میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ یہ زبان مختلف لوگوں کے درمیان نہایت عمدہ سفیر اور خیر سگالی کی اعلیٰ پیغامبر بھی ہے۔ انگلستان میں ایشیائی تارکینِ وطن کی تعداد چونکہ سب سے زیادہ ہے اسی لیے اعداد و شمار کی روشنی میں کسی کا یہ سمجھنا بالکل صحیح ہے کہ انگریزی کے بعد اُردو ہی انگلستان کی سب سے بڑی زبان ہے۔ مختلف عقاید و نظریات رکھنے والے لوگوں کے مابین اس زبان کا اشتراک ایک غیر ملکی سرزمین پر جو فضا یگانگت کی پیدا کرتا ہے وہ ہمارے لیے خصوصی طور پر سمجھنے کی بات ہے ـــ

www.taemeernews.com

اردو زبان و ادب کی اشاعت کے حق میں سب سے عمدہ بات جو گذشتہ تھوڑے عرصے میں ہوئی ہے وہ یہ کہ اب اکثر و بیشتر لائبریریوں میں اُردو زبان و ادب کی کتب کے ایک ایک دو دو شیلف ضرور نظر آتے ہیں۔ کتابوں کا انتخاب بھی عمدہ ہوتا ہے۔ انگلستان کے بڑے شہروں میں خصوصاً وہ علاقے جو ہمارا گڑھ ہیں وہاں دکانوں کے نام اور اشیائے فروخت کی فہرست اور تفصیل اُردو میں نظر آتی ہے۔ اُردو کتب کی دکانیں بھی ان میں شامل ہیں۔ اگرچہ بالکل ہمارے یہاں کی طرح دودھ دہی، نان کباب، مٹھائی، گوشت، پرچون اور پنساری کی دکانوں میں کتابوں کی دوکان آٹے میں نمک کے برابر ہی جانیے گا۔ وہ لاہور ہو یا لندن، کتاب کی کھپت ہمارے ہاں ہمیشہ عبرت ناک حد تک ہر جگہ کم رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید کوئی ماہر سماجیات اسے اپنا موضوعِ فکر بنا سکے ــــ نہ جانے کتاب کے دن ہمارے درمیان کب پھریں گے اس میں وہ کتاب بھی شامل ہے جسے ہم سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور سب سے کم سمجھتے ہیں۔

اب لندن سے اُردو کے دو روزنامے روزنامہ ملت اور روزنامہ جنگ بھی چھپتے ہیں۔ ہفتہ وار پرچوں میں مشرق اور اخبار وطن بہت مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ برمنگھم سے آزادی شایع ہوتا ہے۔ بریڈ فورڈ سے المشتہر[1] بھی۔ ادبی انجمنوں میں پاکستان سوسائٹی بریڈ فورڈ، اقبال اکادمی کاونٹری، انجمن ترقی اردو لندن، بزم تعمیر ادب برمنگھم اور بزم ادب مانچسٹر معروف ہیں۔ ان ادبی انجمنوں کی رونق سامعین کے علاوہ جو انگلستان کی مصروفیت اور موسم کے قہر و جبر کے باوجود ان میں شریک ہوتے ہیں، وہ لوگ ہیں جو تخلیق ادب کے درد و کرب سے بھی گذرتے ہیں۔ ان میں مقصود الٰہی شیخ، ش صغیر ادیب۔ منیر دہلوی، غلام قادر آزاد، اقبال انجم، عقیل دانش، محمد شریف بقا، ساقی فاروقی، سحاب قزلباش، ڈاکٹر درانی، رونق کاشفی، جاوید قمر، حیات میر طارق، پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز، موج فرازی، احمد سعید انور، جاوید اقبال ستار، طاہر لطیف، ایس ایم شاہ اور دوسرے شامل ہیں۔ اس سال کی سب سے اہم ادبی نشستوں میں پاکستان سوسائٹی بریڈ فورڈ کی طرف سے جشن[2] افکار و ندیم و صہبا اور برمنگھم میں بزم تعمیر پاکستان کی طرف سے ۱۶ راگست کا اینگلو پاکستان مشاعرہ[3] شامل ہے جس میں حفیظ جالندھری، جمیل الدین عالی اور احمد فراز نے شرکت فرمائی۔ افکار۔ ندیم نمبر کی تقریب رونمائی اور جشن ندیم کی اہمیت اس لیے تاریخی ہے کہ ہماری ادبی دنیا میں غالباً پہلی بار ایک مرحوم نہیں موجود شاعر اور ادبی مدیر کو بیرونِ ملک نذرانۂ تحسین و عقیدت پیش کیا گیا۔ اس اجلاس کی کارروائی کو کتابی شکل دی جارہی ہے جو کتابت کے مراحل سے گذر چکی ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ کم از کم ہماری نسل کو یہ الزام نہ دیا جاسکے کہ وہ احسان مندی کے جذبات سے قطعی عاری اور بانجھ تھی۔

حضرات! اگرچہ اُردو ادب کی انگلستانی فضا نے کسی سجاد ظہیر، ایم۔ ڈی تاثیر اور تصدق حسین خالد کو جنم تو نہیں دیا مگر غالب سے معذرت کے ساتھ یہ تو کہا جاسکتا ہے ــــ

ع		بحر اگر بحر نہیں ہے تو بیاباں بھی نہیں

اس مختصر سے جائزے اور طویل گفتگو کے بعد ایک عرض کروں گا اور وہ یہ کہ اس کی سب خوبیاں میری اپنی ہیں اور تمام خامیاں میرے محترم و مشفق صہبا لکھنوی کی رہینِ منت ہیں۔ ہوا یوں کہ جب میں پاکستان جانے کے لیے اپنا رختِ سفر

---

[1] المشتہر اب "راوی" کے نام سے شایع ہوتا ہے۔
[2] یہ مضمون ۱۹۷۵ء میں جشن ندیم و افکار میں پڑھا گیا تھا۔
[3] اینگلو پاکستان مشاعرے میں احمد ندیم قاسمی صاحب تشریف نہیں لا سکے۔ اس لیے جشن ندیم و افکار کی اولین حیثیت برقرار ہے۔

www.taemeernews.com

باندھ چکا اور پرپرواز پھیلانے لگا تو یک لخت سنگ آمد و سخت آمد کے مصداق صہبا صاحب کا حکم ملا کہ آپ آتے وقت ایک عدد جائزہ اردو ادب کے انگلستان میں پھلنے پھولنے، بڑھنے پھیلنے کا بھی لیتے آئیے گا۔ اس حکم سے یوں لگا جیسے ایک بھاری بکس سامان کا ابھی کہیں پڑا ہوا ہے اور اُسے بھی سمیٹنا ہے اور بھاگنا ہے —— اور بکس بھی ایسے سامان کا جس میں سب کچھ بیوی نے سسرال والوں کے لیے رکھ چھوڑا ہو۔ گویا ؏

بوجھ وہ سر پہ پڑا ہے کہ اُٹھائے نہ بنے

اس کا اندازہ تو کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس مشکل منزل سے خود گذرے ہوں۔ اور مجھے یقین ہے صہبا لکھنوی صاحب تو کبھی نہیں گذرے۔ اسی لیے میں آپ سے شرمندہ ہونے کو تیار ہوں مگر صہبا صاحب سے انتقام لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیجیے اس سے ایک اور مشکل بھی حل ہوئی۔" اب بھی جب کبھی مسافرت میں یاد وطن ستائے گی تو غالب کے الفاظ سے جی ہلکا کر لیا کروں گا کہ ؏

تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

ممتاز شاعر انور حارث کی تخلیقات

(۱) "صدائے تیشہ" نیا مجموعۂ کلام (۱۹۸۰ء)

(۲) "رختِ سفر" علامہ اقبال کے نادر اور غیر مدون کلام کا مجموعہ (نقشِ ثانی) (۱۹۷۷ء)

(۳) "قائداعظم" بزبان انگریزی، قائد کی زندگی کے اہم موضوعات پر تالیف (۱۹۷۶ء)

(۴) "دی گریٹ اُمیدس" بزبان انگریزی جس میں ہزہائی نس سر آغا خاں کا اہم دیباچہ شامل ہے۔ (۱۹۵۴ء)

(۵) "قائداعظم" بزبان انگریزی "وھاٹ از ہز ٹریبیٹ آف برتھ" (۱۹۵۰ء)

(۶) "گلدستۂ عقیدت" بحضور قائداعظم (منظوم) جس میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو قائداعظم کے روبرو پڑھی گئیں —— (۱۹۴۵ء)

ملنے کا پتہ:-

۵/ ایل — بلاک ۶

پی ای سی ایچ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سعید اختر درانی

برطانیہ کے شب و روز

بی بی سی کے غیر ملکی پروگرام ایک عرصے سے شہرۂ آفاق ہیں۔ ان کے ذریعے دنیا کے ہر ملک کے باسیوں کو نہ صرف برطانیہ کے شب و روز کی جھلکیاں دکھائی دیتی رہتی ہیں، بلکہ یہاں پر آباد تارکین وطن کی مصروفیات اور ان کے مسائل سے بھی کما حقہٗ آگاہی رہتی ہے۔ بی بی سی کے اردو پروگرام برعظیم ہند و پاک میں تو ہر دل عزیز ہیں ہی، لیکن اس کے علاوہ تمام مشرقِ وسطیٰ اور دیگر متعدد ملکوں میں بھی بڑے شوق سے سُنے جاتے ہیں، جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے آباد ہیں۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۸ء میں بی بی سی کی اردو سروس میں میرے چار مکتوب نشر ہوئے۔ یہ نشریے "مکتوب لندن" نامی پروگرام کا ایک حصہ تھے۔ جو جناب وقار احمد اور اطہر علی صاحب کے زیرِ اہتمام براڈکاسٹ ہوا، اور جس میں اس ملک میں مقیم مختلف پیشوں کے نمایندہ کئی ایک اشخاص نے حصہ لیا۔ حضرت صہبا لکھنوی نے تقاضا کیا کہ انھیں مربوط کر کے افکار کے "برطانیہ میں اردو" ایڈیشن کے لیے بھیج دوں۔ چنانچہ ازرہِ امتثالِ امر یہ تحفۂ درویش (کہ سوغاتِ غریبِ شہر بھی ہے) حاضرِ خدمت ہے —————— (ڈاکٹر) سعید اختر درانی

پہلا مکتوب لندن

برطانیہ میں غیر ملکی طلبہ

پچھلے دنوں یہاں برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں نئے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوا ہے تو اس کے ساتھ ہی دنیا کے کونے کونے سے ہزارہا طالب علم بھی آوارد ہوئے ہیں۔ یہ طلبہ ہر قوم، نسل، رنگ، مذہب، زبان اور تمدن کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق فی الوقت برطانیہ کی یونیورسٹیوں اور پولی ٹیکنکس میں قریب اسّی (۸۰) ہزار غیر ملکی طالب علم زیرِ تعلیم ہیں، جو مقامی طلبہ کا دس سے پندرہ فی صد حصہ ہیں۔ یعنی ہر ساتواں یا دسواں طالب علم کسی بیرونی ملک کا باشندہ ہے۔

www.taemeernews.com

آئیے آج کی صحبت میں اس بات کا جائزہ لیں کہ اوّل تو برطانیہ کی یونیورسٹیاں دنیا میں اس قدر مقبول کیوں ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جو نئے طلبہ یہاں آتے ہیں، ان کا نصب العین کیا ہوتا ہے۔ یہاں کے معاشرے میں گھُل مِل کر رہنے اور تعلیم میں کامیاب ہونے میں انھیں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اور وہ کہاں تک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ان امور پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جو ہمارے ذہن میں آتی ہے، وہ برطانیہ کی قدیم تعلیمی روایات سے متعلق ہے۔ یہاں آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں آٹھ نو سو سال سے قایم ہیں اور ساری دنیا میں اپنے اعلیٰ معیار کے لیے مشہور ہیں۔ اسی طرح انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں چند یونیورسٹیاں بھی کئی سو سال پرانی ہیں۔ اور اگرچہ اس ملک کی باقی یونیورسٹیوں کی عمر بالعموم ڈیڑھ یا دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ یہاں کے پبلک اسکول، گرامر اسکول، یونیورسٹیاں، اور دیگر درس گاہیں دنیا کے بلندترین تعلیمی معیاروں کی حامل ہیں۔

دوسری بات آج کل کی دنیا میں انگریزی زبان کی اہمیت اور اُس کے فوائد ہیں۔ چنانچہ دنیا کے بیشتر ممالک سے بالخصوص ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ سے، طلبہ انگلستان، امریکا، کینیڈا اور آسٹریلیا جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہ نسبت جرمنی، فرانس یا روس میں تعلیم پانے کے۔ چونکہ برعظیم ہندو پاکستان میں اب تک اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان ہی ہے، اس لیے ہمارے طالب علموں کا انگلستان آنا ایک فطری امر ہے اور انھیں دنیا کے کئی دیگر ممالک کے طلبہ کی نسبت اس بنا پر بہت آسانی رہتی ہے۔ ایک اور فائدہ یہاں کے نظامِ تعلیم کی چُست روی بھی ہے۔ مثلاً جرمنی کی نسبت برطانیہ میں بی اے کرنے میں آدھا وقت اور پی ایچ ڈی کرنے میں عموماً صرف دو تہائی وقت صرف ہوتا ہے ــــــ

ایک اور بات جو ذرا سا مشاہدہ کرنے پر فوراً عیاں ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے دانش جو انگلستان میں زیادہ تر سائنسی مضامین کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، اور وہ بھی زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ سطح پر۔ اور اس کی وجہ ہمارے ملکوں کی سوچی سمجھی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہاں کی حکومتیں زیادہ تر وظائف انہی مضامین میں دیتی ہیں۔ یہ صورتِ حالات اُس وقت کے ماحول سے بہت مختلف ہے۔ جب میں پہلے پہل قریب پچیس سال ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج پہنچا تھا۔ کیونکہ اُن دنوں ہمارے ممالک سے بیشتر طلبہ Undergradute Studies کے لیے آیا کرتے تھے۔ اور اُن میں سے ایک خاصی تعداد آرٹس کے مضامین میں ہوتی تھی۔ مثلاً انگریزی، اقتصادیات، سیاست، تاریخ اور قانون۔ ہاں لندن کی Inns of Court میں آج بھی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، اور سری لنکا سے آنے والوں کی ایک کثیر تعداد زیرِ تعلیم ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ممالک کے قوانین اب بھی بڑی حد تک انگریزی قانون کے ماڈل پر مبنی ہیں۔

یہ تو ہوئیں اصولوں اور روایتوں کی باتیں۔ اب میں یہاں پہلے پہل وارد ہونے والے طلبہ کے ذاتی احساسات اور مشکلات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر مشکلات تو ایسی ہیں جو ہر ملک میں نوواردوں کو پیش آتی ہیں۔ مثلاً رہائش کا مسئلہ۔ آب و ہوا کی سرد گرمی۔ ماں باپ سے دوری۔ وطن کی یاد، وغیرہ۔ لیکن ہمارے اور یہاں کے معاشروں میں جو وسیع اختلافات ہیں، وہ بعض اوقات ان مسائل میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہاں کی خورد و نوش کی روایات۔ مغربی ممالک کی جنسی آزادی۔ مذہب اور فلسفہ حیات کے دگرگوں زاویے، وغیرہ وغیرہ، ویسے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے، آج کل کے طلبہ برطانیہ اور مغرب کے ماحول اور حالات سے کہیں زیادہ واقف ہیں، بہ نسبت

www.taemeernews.com

اُس کے کہ جتنے ہم لوگ یہاں پہلی مرتبہ وارد ہونے پر تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اب ذرائع ابلاغ اور نقل و حمل پہلے سے کہیں بہتر اور تیز تر ہیں۔ ہمارے ملکوں میں اب ٹیلی ویژن لگ گئے ہیں اور Communication Satellites پل پل میں دنیا بھر کے حالات دکھلا سکتے ہیں۔ جب ہم لوگ یہاں پہنچے تھے تو بحری جہاز سے سفر کرنے میں اُنیس بیس دن لگتے تھے۔ اور اب جیٹ طیاروں سے آٹھ دس گھنٹوں میں آدمی یہاں پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے، یہاں سے پلٹے ہوئے واقفوں اور عزیزوں سے یہاں کی باتیں سننے کے بعد اس ملک میں آکر آدمی کو اس قدر غیریت محسوس نہیں ہوتی جتنی پہلے ہوتی تھی، اور تیسرے، اب برطانیہ میں ہمارے دیسوں کے ہزاروں لاکھوں لوگ آکر آباد ہو گئے ہیں کہ خود کو ان کے درمیان پاکر اور اپنی زبان میں بات چیت کرکے یہاں آنے والے طالب علم کو غریب الوطنی کا احساس پہلے کی نسبت بہت کم ہوتا ہے ــــــ

ایک بڑی مشکل جس سے ہمارے ممالک کے طالب علموں کو بہر صورت دوچار ہونا ہی پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے تعلیمی معیار ہماری نسبت بہت بلند ہیں۔ اس لیے ان طلبہ کے لیے احساس کمتری کا شکار ہونا آسان ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملکوں کے ذہین طلبہ یہاں کے مقامی طلبہ سے ذہانت میں کسی طرح کم نہیں، ہاں معلومات میں کم تر ہونا الگ بات ہے اور اس کم تری کا علاج سوائے دل لگا کر کام کرنے اور پوری محنت اور تن دہی سے نئی چیزیں سیکھنے کی کوشش کرنے کے نہیں ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے دانش جوؤں کی بیشتر تعداد واقعی محنت اور لگن سے کام کرتی ہے۔

دنیا کے ہر ملک، اور زندگی کے ہر شعبے کی طرح تعلیم میں کامیابی کا گر محنت، لگن، خود اعتمادی، دماغ کا استعمال کرنے میں نہ جھجکنے، سمجھ میں نہ آئے تو سوال پوچھنے، غور کرکے جواب دینے، اور نئی چیزوں کے سیکھنے میں جھجک نہ کرنے پر منحصر ہے۔ اس سلسلے میں ہمہ دانی کا دعویٰ کرنا اور یوں ظاہر کرنا کہ ہر چیز پہلے ہی سے معلوم ہے اتنا ہی بُرا ہے جتنا احساسِ کم تری میں مبتلا ہو جانا کہ گویا ہر مشکل چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہے ــــــ

لیکن برطانیہ میں تعلیم پانے کا واحد مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ امتحان پاس کرکے اور ڈگریاں لے کر ہم واپس وطن پہنچ جائیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہاں کے معاشرے میں اور کونسی ایسی خوبیاں اور روایات ہیں جن کا حصول ہمارے طلبہ کی آئندہ زندگی میں فائدہ مند رہے گا اور جن سے روشناسی ہمارے ملکوں کے لیے بھی منفعت بخش ثابت ہوگی۔ لیکن یہ موضوعِ بحث ایک علٰحدہ مکتوب کا خواست گار ہے۔ چنانچہ اس مسئلے پر بات چیت میں اگلے ہفتے تک اٹھا رکھنا چاہتا ہوں ــــــ

دوسرا مکتوب لندن

مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا امتزاج

چند روز ہوئے میں برمنگھم یونیورسٹی کے کچھ پاکستانی طالب علموں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ موضوعِ گفتگو یہ تھا کہ ہمارے ملکوں سے آنے والے طلبہ کو کہاں تک مغربی معاشرے کی اقدار کو اپنانا چاہیے۔ ان طلبہ کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہمیں اپنی اخلاقی اور تہذیبی روایات سے قطعاً کنارہ کش نہیں ہونا چاہیے۔ مغربی آزاد خیالی۔ مادہ پرستی۔ مذہب سے دوری، اور جنسی بے راہ روی ایسی چیزیں ہیں کہ ان سے کامل تنفر ہی بہتر ہے اور ان روشوں سے اجتناب اُسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنی روایات اور ذہنی نہج پر پوری سختی سے قائم رہیں ــــــ

www.taemeernews.com

اس گروہ کے برعکس چند ایک ایسے طالب علم بھی تھے۔ جن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مشرقی ممالک آج کل کی دنیا میں جو اس قدر پس ماندہ ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرسودہ روایات پر کاربند ہیں۔ اُن کے ذہن اور خیالات منجمد ہیں' اور زمانے کے ساتھ حرکت کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں اگر ترقی کرنی ہے تو اُس کے لیے لازم ہے کہ ہم مغربی طرزِ فکر اور طریقِ حیات کو اپنائیں۔ اور خیال و عمل کی آزادی حاصل کریں ــــــ

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں کسی قدر صداقت بھی ہے' اور کچھ کمزوریاں بھی۔ میرا ارادہ ہے کہ آج کی صحبت میں اس مسئلے پر آپ سے کچھ بات چیت کروں ــــــ

دراصل اس "تہذیبی تصادم" کے کئی پہلو ہیں۔ یہ مسئلہ سب سے زیادہ سنگین صورت میں اُن لوگوں کو پیش آتا ہے۔ جو ہمارے مشرقی ممالک سے آنے کے بعد یہاں کم و بیش مستقل طور پر بس گئے ہیں۔ کیونکہ انھیں اپنے علاوہ اپنی اولاد پر بھی یہاں کی تہذیب و تمدّن کے دُوررس اثرات کے بارے میں فکر کرنا لازم ہے۔ پچھلے سال جب میں یہاں انجمن ترقیٔ اردو' برمنگھم' کا صدر تھا' تو ہماری انجمن نے ایک مباحثے کا اہتمام کیا تھا' جس کا عنوان تھا "مغربی معاشرے میں مشرقی اقدار کی بقا" ــــــ اس مباحثے میں برطانیہ میں بچوں کی تربیّت' مذہب کی تعلیم' زبانِ اردو کی تدریس' مشرقی رسم و رواج سے ہماری نئی پود کی روشناسی' لڑکیوں کے لباس اور شادی بیاہ کے مسائل' وغیرہ وغیرہ' کئی امور پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ میرے لیے آج کی صحبت میں یہ ممکن نہیں کہ ان سب موضوعات کا تفصیل سے جائزہ لے سکوں ــــــ

ہاں اس مسئلے کے اُس پہلو پر میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا' جو ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی طلبہ کو بالخصوص دعوتِ فکر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو ہمارے معاشرے سے ایک خاص مقصد' یعنی تعلیم کے حصول کی خاطر' یہاں ایک معیّن عرصے کے لیے آتے ہیں اور پھر اپنے وطن کو لوٹ جاتے ہیں ــــــ

میرا عقیدہ یہ ہے کہ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک مکمل انسان بننے کی طرف سفر کریں۔ یعنی صرف سائنس' یا ڈاکٹری' یا اقتصادیات' میں بلکہ حاصل کرنے سر تا بخ نہ ہو جائیں۔ بلکہ تکمیلِ ذات کی کوشش بھی کریں' اور اس کے لیے قوّتِ فکر کی نشو و نما اور شخصیت کی توسیع ضروری اُمور ہیں ــــــ

جہاں تک قوتِ فکر کا تعلق ہے۔ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم کے دوران جس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ طالبِ علم کو بذاتِ خود غور و فکر کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ تاکہ وہ سوچ بچار میں سہارے کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ یعنی اعلیٰ تعلیم صرف معلومات کے حاصل کرنے تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ اصل کسوٹی خود اُس کے افکارِ تازہ کی اُپج ہے۔ جیسا کہ علاّمہ اقبال فرما گئے ہیں ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اگر ہمارے طلبہ اس ایک خوبی کو یہاں سے حاصل کرلیں' تو وطن واپس جا کر وہ نئی روایات کی داغ بیل ڈالنے میں بہت مددگار ثابت ہوں گے ــــــ

اب آیئے تہذیبی اور انسانی کمالات کے حصول کی طرف۔ ہمارے ملکوں سے آئے ہوئے طلبہ یہاں کے معاشرے میں

www.taemeernews.com

ہماری تہذیب و تمدّن کے نمایندے ہیں۔ ہم یہ فرض کریں گے کہ ایک اچھا اور منجھا ہوا طالب علم ہماری تہذیب کی اعلیٰ قدروں سے مزیّن ہوگا۔ بلکہ اُسے ان قدروں پر بجا طور سے ناز ہوگا۔ اور یہ قدریں کیا ہیں؟ مشرقی وضع داری۔ خوش اخلاقی۔ بزرگوں اور استادوں کی تعظیم، علم و ہنر کی قدردانی، مشرقی تہذیب و تمدّن سے۔ یعنی ہمارے مذہب، ہماری تاریخ، اور ہمارے شعر و ادب سے آگاہی اور اُن سے دوسروں کو روشناس کرنے کا جذبہ ـــــ

لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایسا طالب علم مغربی معاشرے میں پہنچتا ہے۔ تو اُسے کہاں تک یہاں کی روایات کا اکتساب کرنا چاہیے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہاں آنے والے دانش جو کو چاہیے کہ وہ مشرق اور مغرب کی روایات اور تہذیبی اقدار کو خود میں سمونے کی پوری کوشش کرے۔ عمر اور امکانات کے لحاظ سے زمانۂ طالب علمی ایسے دل پذیر تہذیبی امتزاج کے پیدا کرنے کا ایک زرّیں موقع بہم پہنچاتا ہے، جسے ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ ایک نو وارد طالب علم کو میری یہ نصیحت ہوگی کہ مروّجہ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ وہ یہاں کی یونیورسٹیوں اور دانش گاہوں کی مختلف انجمنوں اور دیگر سرگرمیوں میں بھی حتی الوسع شریک ہو۔ کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہوگا جس کے لیے ان یونیورسٹیوں اور تمدّنی اداروں میں کوئی سوسائٹی قایم نہ ہو۔ یہ آثارِ قدیمہ ہوں یا مغربی کلاسیکی موسیقی۔ مختلف مذاہب کے درمیان مباحثے ہوں یا فلسفہ اور تاریخ، مصوّری اور فنِ تعمیر، سائنس اور ٹیکنالوجی، علمِ افلاک یا سیاسی نظریات، غرض ہر طرزِ فکر اور شعبۂ فن و ہنر کی انجمنیں یہاں کی یونیورسٹیوں میں قایم اور بڑی سرگرمی سے مصروف ہیں۔ بلکہ ان کی گہما گہمی اور دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست

ان کی علمی اور مجلسی کارروائیوں میں حصّہ لینے سے دانش جو کی شخصیت گہری اور پہلو دار ہوگی۔ اور یوں وہ ایک کامل تر انسان بننے کی طرف ترقی کرے گا ـــــ

لیکن ان انجمنوں کے علاوہ ہم مغربی اقوام کی روایات اور معمولات کا بطور خود بھی یہاں قیام کے دوران سفر و حضر میں غور سے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اور کئی اچھی باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ میں نے انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے میں ایک خاصا عرصہ گزارا ہے۔ مجھے یہاں کے لوگوں کی جو عادات خاص طور سے پسند آئی ہیں، اُن میں مندرجۂ ذیل شامل ہیں ـــــ یہاں کے باشندوں کی اعتدال پسندی اور کم گوئی۔ اپنے کام سے کام رکھنے اور بے جا نکتہ چینی اور عیب جوئی سے پرہیز کی عادت۔ عدل و انصاف، ذاتی اور سماجی معاملات میں دیانت داری۔ خود اعتمادی اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا حوصلہ۔ کوئی ذمہ داری لینا، تو اُس کو وقت کے اندر اور بغیر یاد دہانی کے سرانجام دینا۔ وعدے اور وقت کی پابندی۔ مصیبت زدوں اور اپنے سے کم خوش نصیبوں سے شفقت اور ہمدردی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس طرح انگلستان کی ایک اہم اور دیرینہ روایت، یعنی جمہوری طرزِ عمل، بہت قابلِ تقلید ہے۔ اور اس سے میری مراد صرف سیاسی جمہوریت ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اگر طالب علم کسی مسئلے میں اپنے اُستاد سے اختلاف رکھتا ہے، تو وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے سے نہیں جھجکتا۔ اور اگر اس کی بات صحیح نکلے تو اُس کا اُستاد بھی اُسے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ اور یہی امر اُس آزادیِ فکر کی بنیاد ہے، جس کا میں نے ذرا دیر ہوئی ذکر کیا تھا، اور اسی طور سے طالب علم کی قوتِ تخلیق جلا پاتی ہے۔ اور بالآخر اُس کے افکارِ تازہ سے جہانِ تازہ کی نمود کی راہیں کھلتی ہیں ـــــ

www.taemeernews.com

تیسرا مکتوب لندن

وطن کی واپسی کا مسئلہ

میرے ایک دوست، جنھوں نے حال ہی میں یہاں انجینرنگ کے ایک شعبے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، ان دنوں وطن واپس جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ مجھ سے بھی مشورہ کرنے آئے۔ اور اس سلسلے میں جن دشواریوں سے وہ دوچار ہو رہے ہیں، اُن پر بھی تفصیلی بات چیت ہوئی۔

یہ سوال آپ نے بھی بارہا سُنا ہوگا کہ پاکستانی سائنس دان، ڈاکٹر اور انجینر جو باہر کی یونیورسٹیوں میں تعلیم یا ٹریننگ حاصل کرنے جاتے ہیں، وہیں کے کیوں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور واپس آکر وطن کی خدمت کیوں نہیں کرتے؟

یوں تو Migration یعنی ترکِ وطن یا ہجرت، انسان کی ایک قدیم تہذیبی روایت ہے اور تاریخ میں اس کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ ہجرت کی یہ لہریں کبھی تو جنگ اور فتح یابی کے ساتھ آتی ہیں، کبھی نو آبادکاری کے ساتھ، اور کبھی تلاشِ معاش میں خانہ بدوشوں کے قافلوں کی صورت میں۔ بہت دنوں کی بات ہے، جب میں پہلے پہل انگلستان آیا تھا، تو اس زمانے میں صرف کچھ ہندوستانی اور پاکستانی ڈاکٹر ہی یہاں کے معاشرے میں نظر آتے تھے۔ لیکن آج کل اس ملک میں ہمارے ہم وطنوں کی آبادی اس قدر ہو چکی ہے کہ اُن کی خدمت کے لیے ہمارے یہاں کے کئی اور پیشوں کے ماہر بھی اب یہیں پر مستقل طور سے آباد ہو گئے ہیں، مثلاً اکاؤنٹنٹ، مدرس، تاجر، اور بیرسٹر ـــــ

لیکن چونکہ میں خود سائنس کے شعبے سے متعلق ہوں، اس لیے آج کی صحبت میں میں صرف اس مسئلے پر کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں کہ بالخصوص ہمارے یہاں کے سائنس دان کس وجہ سے ترقی یافتہ مغربی ممالک، یا مشرقِ وسطیٰ کے دولت مند ملکوں میں مستقل رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ اس Brain Drain کی کئی وجوہ ہیں ـــ

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سائنس ایک آفاقی یا عالم گیر ہنر ہے۔ اس میں ملک اور معاشرے کی وہ قید نہیں ہے، جو بیشتر اور پیشوں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک سائنس دان کے سامنے پوری دنیا کی بساط وا ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہُنر کو کیلی فورنیا میں استعمال کرے یا لاہور میں، یا دلّی میں، اور پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ سائنس صرف ایک پیشہ ہی نہیں، یہ ایک قسم کا مذہب بھی ہے، جس کی خدمت کی تڑپ ہر سچّے سائنس دان کے دل میں ہوتی ہے اور اپنے لیے سائنس کی دنیا میں نام پیدا کرنے کی آرزو بھی۔

لیکن یہ تو ہوئی سائنس کی خدمت اور اپنی ناموری کی تمنا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک سائنس دان کے لیے اپنے ملک کی، اور اپنے ہم وطنوں کی خدمت بھی لازم نہیں؟ سائنس اور ٹکنالوجی سے ملک اور معاشرے کی بڑی فلاح و بہبود ہو سکتی ہے، کیا اس کی ذمہ داری بھی اس پر عاید نہیں ہوتی؟

یہاں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دراصل سائنس کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو Pure Science یا بنیادی سائنس کہلاتی ہے۔ اس کا مقصد نئے سائنسی قوانین کی دریافت، اور فطرت کے عمیق ترین رازوں کی گتھیاں سُلجھانا ہوتا ہے۔ ایسی سائنس فوری طور سے مُلک اور معاشرے کی مشکلات کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتی۔ میرے خیال میں ایسی سائنس دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ بنیادی سائنس ایک ایسا

www.taemeernews.com

حیاتیاتی عنصر یا خون ہے جس کے بغیر کسی بھی ملک کے سائنسی جسم میں پوری طرح جان نہیں پڑ سکتی۔ یعنی بنیادی سائنس بھی آٹے میں خمیر کے برابر ہر ملک میں لازماً ہونی چاہیے۔

سائنس کی دوسری قسم وہ ہے جسے Applied Science یا قابلِ استعمال سائنس یا ٹکنالوجی کہا جاتا ہے۔ ایسی سائنس ہمارے ملکوں کی ترقی میں بڑا اہم حصہ لے سکتی ہے۔ اور ایسے سائنس دانوں، انجینیروں اور ڈاکٹروں کی ہمارے ملکوں کو بہت ضرورت ہے۔

تو آئیے اب اس بات پر غور کریں کہ اس کارآمد قسم کے بہت سے سائنس دان ہمارے ملکوں کو واپس کیوں نہیں جاتے۔ اور اگر جاتے بھی ہیں تو وہاں ٹھہرتے کیوں نہیں؟

سب سے پہلی عملی مشکل تو یہ ہے کہ کسی ترقی یافتہ ملک میں تعلیم یا ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد اگر کوئی سائنس دان، جسے ہماری حکومت نے خود باہر نہ بھیجا ہو، جب وطن واپس جانا چاہتا ہے تو وہ درجنوں درخواستیں ملک کے کئی اداروں کو بھیجتا ہے۔ لیکن ان کا جواب شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ یعنی اگرچہ ہمارے ملکوں میں شور تو بہت ہوتا ہے کہ سائنس دان واپس نہیں آتے۔ لیکن جب سائنس دان واپس آنا چاہتے ہیں تو کوئی ان کی بات نہیں پوچھتا۔ اسی طرح یوں تو ہر دوسرے تیسرے سال سائنس دانوں کی ڈائریکٹریاں ہماری حکومتیں تیار کرتی رہتی ہیں، اور یہ اعلان بھی ہوتا رہتا ہے کہ ملازمت کی تلاش میں آنے والے سائنس دانوں کو پہلے چند مہینے وظیفہ ملے گا۔ لیکن عموماً یہ منصوبے کاغذی خاکے بن کر ہی رہ جاتے ہیں۔ عمل ان پر بہت کم ہوتا ہے۔

اب فرض کیجیے کہ ایسا کوئی سائنس دان وطن پہنچ کر ملازمت حاصل کر بھی لیتا ہے۔ تو اُسے وہاں کیا مشکلات پیش آتی ہیں؟ ہمارا ماحول ایسا ہے کہ ایک طرف تو اُس کو قدم قدم پر رکاوٹیں، مخالفتیں، اور رخنہ اندازیاں درپیش ہوں گی، اور دوسری طرف سائنس کے آلات اور Spare Parts کا فقدان، کاریگروں اور ورکشاپ کی مشینوں کی قلت۔ اور سائنس کی ضروری کتابوں اور رسالوں کی کم یابی یا نایابی اُس کا رستہ روکے گی۔ اور ان سب پر مستزاد، عام طور سے تحقیق یا اطلاقِ ہنر کے لیے روپے کی کمی ہوگی۔ اِن سب دشواریوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیا نیا دیس پلٹ سائنس دان یا انجنیر بہت بددل ہو جاتا ہے، اور وہ بےچارہ جلد ہی پھر وطن سے بھاگ نکلنے کی سوچنے لگتا ہے۔

دوسرے، بدقسمتی سے ہمارے ملکوں میں معیارِ زندگی اس قدر پست ہے کہ جب تک کسی شخص میں حُب الوطنی اور قوم کی خدمت کا جذبہ بے انتہا شدید نہ ہو، وہ معاشی بدحالی سے تنگ آ کر جلد ہی یورپ، امریکہ، یا عرب ممالک کا رُخ اختیار کر لیتا ہے، جہاں اُس کو اپنی اور اپنے خاندان کی مادّی ترقی کی سُہانی صبحیں طلوع ہوتی نظر آتی ہیں۔

گویا یوں سمجھیے کہ یہ ایک انڈے اور مرغی کے چکر کا سا معاملہ ہے۔ سائنس دان واپس اس لیے نہیں جاتے کہ ہمارے ملک پس ماندہ اور غریب ہیں۔ اور ہمارے ملک پس ماندہ اس لیے ہیں کہ سائنس دان واپس نہیں آتے!

ہماری حکومتوں کو لازم ہے کہ وہ اس شیطانی چکر کے توڑنے کے طریقے ڈھونڈیں۔ اوّل، سائنس کی ترقی کے لیے وہ روپیہ لگانے میں جس قدر ممکن ہو فراخ دلی سے کام لیں۔ دوسرے یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے جو طالب علم تعلیم یا ٹریننگ کے اختتام کے قریب پہنچ رہے ہوں، اُن پر مغربی ممالک ہی میں کمند ڈالنے کی کوشش کریں۔

www.taemeernews.com

اس کا ایک طریقہ جو میرے ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک میں ہمارے سفارت خانے ایسے پاکستانی یا ہندوستانی سائنس دانوں کے حلقے یا بورڈ بنائیں جو اپنے لیے سائنس کی دنیا میں نام یا مقام پیدا کر چکے ہوں، اور سفارت خانوں کے تعلیمی شعبوں کے ذریعے اُن کے ساتھ ایسے نوجوان سائنس دانوں اور انجنیروں کے انٹرویو کروائیں جنھوں نے حال ہی میں وہاں اعلیٰ تعلیم یا ٹریننگ ختم کی ہو۔ یوں ہر سال لاکھوں روپے کے خرچ سے انٹرویو بورڈ باہر بھیجنے کی ضرورت نہ رہے گی ــــــ

مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے سائنس دانوں میں وطن اور قوم کی خدمت کے جذبے کی کمی نہیں ہے۔ یہ حب الوطنی جلد یا بہ دیر انھیں پاکستان یا ہندوستان واپس تو لے جائے گی۔ اس کے بعد امید یہ رکھنی چاہیے کہ بتدریج وہاں کے حالات میں بھی اس قدر تبدیلی آ سکے گی، کہ واپس جانے کے بعد وہ وہاں جم کر کام بھی کر سکیں گے ــــــ

چوتھا مکتوب لندن

روشنیوں کے تہوار

آخری 'مکتوب لندن' میں میرا خیال ہے آپ کو یہاں کے شب و روز کی کچھ جھلکیاں دکھاؤں۔ تاکہ یہ پروگرام روشنیوں کی گہما گہمی میں ختم ہو ــــــ

گزشتہ ہفتے، حسب دستور ابرطانیہ کے طول و عرض میں Guy Fawkes, Night بڑی دھوم دھام بلکہ دھوم دھماکے کے ساتھ منائی گئی۔ یہ اُس واقعے کی یادگار ہے جب ۴ اور ۵ نومبر ۱۶۰۵ء کی درمیانی رات کو گائی فاکس لندن کی پارلیمنٹ کے تہہ خانے میں گرفتار ہوا، جہاں اُس نے اور اُس کے چند ساتھیوں نے الغاروں بارود بیرلوں میں بھر کر چھپا رکھا تھا، اور وہ اُس کو آگ لگانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اُس شب کے اگلے روز، یعنی ۵ نومبر کو بادشاہ جیمز اول پارلیمنٹ کے نئے سیشن کا افتتاح کرنے والا تھا، اور سازشیوں کا مقصد بادشاہ اور اُس کی پارلیمان کے اُمرا کو بھک سے اُڑا دینے کا تھا۔

تاریخی ماخذوں کے مطابق اس سازش کی بنیادی وجہ انگلستان کے کیتھولک عیسائیوں کی بے اطمینانی اور ناراضی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ الزبتھ اول کے بعد، جو پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتی تھی، جب بادشاہ جیمز اوّل تخت پر بیٹھے گا تو شاید حالات اُن کے لیے سازگار ہو جائیں، کیونکہ وہ کیتھولک ماں، یعنی Mary Queen of Scots کا بیٹا تھا۔ لیکن جیمز اوّل نے خود بھی پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا، اور اُس نے کیتھولک عوام اور پادریوں کی زندگی بھی اجیرن کر دی۔ ان امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ایک بارسوخ کیتھولک اشخاص نے بادشاہ اور پارلیمنٹ دونوں کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے سے چند روز پہلے ایک گمنام خط کی وجہ سے اس سازش کا پول کھل گیا۔ گائی فاکس گرفتار ہو گیا، اور اس کے چند معاونین ہتھیار بند لڑائی میں مارے گئے۔ گائی فاکس پر مقدمہ چلا۔ اور چند ہفتوں بعد اُسے پارلیمنٹ کے احاطے میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا ــــــ اگرچہ چند روز ہوئے میں نے یہاں بی بی سی ٹیلی ویژن کا ایک بڑا دلچسپ پروگرام دیکھا تھا، جس میں اس تاریخی سازش کی تحقیقات آج کل کے تفتیشِ جرائم کے طور طریقوں کو استعمال کر کے ایک ڈاکومنٹری کے طور سے پیش کی گئی تھی۔ ٹیلی ویژن کے اناؤنسر نے خبروں کے پروگرام میں سازش کے طشت از بام ہونے کا حال یوں سُنایا جیسے یہ ہنگامہ ابھی ابھی وقوع پذیر ہوا ہو۔ پھر ٹیلی ویژن کے رپورٹروں نے پولیس اور چشم دید گواہوں سے انٹرویو کیے، وغیرہ وغیرہ۔ اس پروگرام کا خلاصہ یہ تھا کہ

www.taemeernews.com

گائی فاکس کا قصور ثابت نہیں ہو سکا ——۔

بہرحال، اب ہر سال انگلستان میں یہ تہوار نومبر کے پہلے ہفتے میں، ۵ یا ۶ نومبر کے لگ بھگ آتش بازی کے ساتھ منایا جاتا ہے اور جگہ جگہ بہت بڑے الاؤ یا Bonfires روشن کیے جاتے ہیں؛ اس روز سے ایک دو ہفتے پہلے ہی چھوٹے چھوٹے بچے عموماً چیتھڑوں اور روئی کا ایک پُتلا سا بنا کر اُسے کسی دیوار کے سہارے بٹھا دیتے ہیں۔ یا اُس کو کسی ٹھیلے یا... Pram میں ڈال کر راہ چلتے لوگوں سے، یا گھر گھر دروازے پر جا کر Penny for the Guy کی صدا لگا کر ایک دو آنوں کی بخششیں مانگتے ہیں۔ لیکن اصل رونق Bonfire Night کو ہوتی ہے جب جگہ جگہ ایندھن اور لکڑیوں کے بڑے ڈھیروں کو آگ لگائی جاتی ہے، جن کی چوٹی پر گائی فاکس کا پُتلا ہوتا ہے۔

تمام شہر میں جس طرف دیکھیں آتش بازی کے گولے، انار، St. Catherines Wheel کے چکراتے ہوئے آتشیں پرکالے اور شہابیاں آسمان کی طرف بلند ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ گھنٹوں تک ہر جانب سے پٹاخوں کی تڑ تڑ اور بارود پھٹنے کی دھائیں دھائیں کی آوازیں آتی ہیں، محلّے محلّے میں پارکوں اور کھیل کے میدانوں میں آگ کے الاؤ روشن ہوتے ہیں، جہاں ماں باپ اور بڑوں کے زیرِ نگرانی بچے آتش بازی اور پھلجھڑیوں کا تماشا دیکھتے ہیں اور اس کے بعد اس آگ پر گوشت کے تکلے، تکے، Sausages، Chestrunts اور Marsh Mallows وغیرہ بھون کر یا گرم کر کے کھاتے ہیں۔ یہ تماشا اور رونق شام کے چھ بجے کے قریب شروع ہو کر رات کے لو دس بجے تک جاری رہتی ہے۔ اور اگرچہ ہر سال کئی بچے کپڑوں میں یا جسم کو آگ لگنے سے زخمی ہو جاتے ہیں، تاہم اس رسم کی ہر دل عزیزی میں تین چار سو سال سے کمی نہیں آئی ——

ادھر اتفاق سے انہی دنوں برمنگھم، لندن، لیسٹر، مانچسٹر اور انگلستان کے کئی اور شہروں میں دیوالی کا تہوار بھی منایا جا رہا ہے۔ جو رام چندر جی کے بن باس سے لوٹنے کی خوشی کی یادگار ہے۔ اور بعض روایات کے مطابق لکشمی دیوی کے اعزاز کا جشن بھی ہے۔ اس ہفتے ان شہروں کی بعض عمارتوں پر چراغاں بھی کیا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ اُس پیمانے پر نہیں ہو سکتا جس پر ہندوستان بھر میں یہ تہوار منایا جاتا ہے ——

ان تہواروں کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آتش بازی، یا آگ اور روشنی کے اس قسم کے تہواروں کا مقصد یا بنیادی وجہ کیا ہے، اور انسان کب سے ایسے تہوار منا رہا ہے۔ کیونکہ دنیا کے تقریباً ہر خطّے اور ہر مذہب میں ایسی رسمیں، ریتیں پائی جاتی ہیں! اس سلسلے میں چند باتیں جو میرے ذہن میں آئی ہیں، وہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ——

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ انسان کی جہاں تک اس کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ جب انسان نے پہلے پہل آگ پر قابو پایا ہوگا، اور یہ دیکھا ہوگا کہ درندے اور خوف ناک جانور آگ سے ڈرتے ہیں اور دور بھاگ جاتے ہیں، تو ایک بڑی طاقت اُس کے ہاتھ آ گئی ہوگی۔ اسی طرح آگ کی بدولت جب تاریک راتوں میں اُجالا ہو گیا تو وہ جنگلوں اور ویرانوں میں رستہ ڈھونڈنے اور زہریلے کیڑے مکوڑوں سے بچنے کے قابل ہو گیا ہوگا! اس کے علاوہ آگ پر گوشت وغیرہ بھوننے اور جاڑوں میں سردی کی اذیت سے بچنے کے فائدے ظاہر ہیں، آگ کی دریافت کے بارے میں یونانی دیومالا کا قصہ تو آپ کو معلوم ہوگا ہی، جس میں Prometheus آسمان سے آگ چرا کر لایا تھا، اور اسے اُس نے انسانوں کے حوالے کیا تھا، چنانچہ انسان نے آگ کو ہمیشہ اپنا محسن اور قوت و مسرت کا سرچشمہ سمجھا ہے ——

www.taemeernews.com

مزید براں آگ جنگ کے ایک حربے کے طور سے بھی زمانۂ قدیم سے استعمال کی جاتی رہی ہے، اور آتش بازی اور آگ کے ذریعے غارت گری کی بے شمار مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ بارود اور آتش بازی کی دریافت سب سے پہلے غالباً چینیوں نے کی تھی۔ رومن سرکس میں بھی آگ اور آتش بازی کے تماشے ہوا کرتے تھے۔ پھر آتش بازی اور آتش بازی کے مشرقی طور طریقے اور نسخے صلیبی جنگوں کے دوران یورپ پہنچے۔ ہندوستان میں جو دسہرے کا تہوار منایا جاتا ہے، اور رام چندر جی کی فتح کی یادگار میں راون کے بہت بڑے راکشس نما پتلے کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے، وہ انگلستان میں گائی فاکس کے پتلے کو جلانے کے مماثل ہے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ آگ یا روشنی کو ہم ایک **Symbol** یا علامت کے طور سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ بعض مذاہب میں آگ کی پرستش بھی ہوتی ہے۔ مثلاً مذہب زرتشت میں اور کئی مذاہب میں آگ کو مقدس سمجھا جاتا ہے کیونکہ آگ چیزوں کو پاک کرتی ہے، اور اس کے شعلے ہمیشہ آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں۔ حضرتِ موسیٰ نے خدا کی تجلی جب کوہِ طور پر دیکھی، تو وہ بھی ایک بجلی کی طرح کوند گئی۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کو نور السمٰوات والارض، بلکہ نورٌ علیٰ نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تقدیس کے علاوہ آگ اور روشنی خوشی کی نشانی بھی ہے۔ مثلاً ہندو مت میں دیوالی کے تہوار پر گھر گھر دیے جلائے جاتے ہیں۔ کئی مسلمان گھرانوں میں شب برات کے موقع پر پھلجھڑیوں کی رونق بہار دکھاتی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں شادی بیاہ کے موقع پر چراغاں ہوتا ہے۔ پچھلے سال انگلستان بھر میں ملکہ الزبتھ دوم کی تخت نشینی کی جوبلی کے موقع پر ملک کے آر پار آگ کے الاؤ روشن کیے گئے اور آتش بازی کے مظاہرے ہوئے۔

اس سلسلے میں ایک چیز جو قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ روشنیوں اور چراغاں کے بہت سے تہوار عین اس وقت منائے جاتے ہیں، جب جاڑے اور اندھیری راتوں کا پورا زور ہوتا ہے، لیکن اس زور کے ٹوٹنے کے آثار نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال کرسمس کا تہوار ہے جو بعض ماخذوں کے مطابق عیسائیت سے بہت قدیم تر تہوار ہے۔ یہ تقریب چوبیس اور پچیس دسمبر کو منائی جاتی ہے، جب کہ موسمِ سرما کی سب سے لمبی رات بائیس یا تیئیس دسمبر کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ یعنی تاریکی کے دَور دورے کے بعد روشنی کی بالادستی پھر شروع ہوا چاہتی ہے۔ روشنی کی اس اُمید کو حضرتِ عیسیٰ کا ظہور سمجھیے، یا کرسمس کے سردِ چراغاں کی دلیل۔ یہ سرد چراغاں کرسمس کے موقع پر گھر گھر میں روشن کیے جاتے ہیں۔ اور ایک بہت بڑا درخت ہر سال ناروے سے لا کر لندن کے ٹریفالگر اسکوائر میں اس موقع پر نصب کیا جاتا ہے۔ اور اس پر رنگ برنگے قمقمے لگتے ہیں۔

اسی طرح یورپ کے کئی شمالی ملکوں، بالخصوص جرمنی اور اسکنڈے نیویا میں، اور بدھ مت کے پیرو بعض ایشیائی ممالک، جاپان وغیرہ میں، نئے سال کی آمد پر جو چراغاں اور آتش بازی ہوتی ہے، وہ بھی اندھیرے پر روشنی کی فتح کی علامت ہے، کہ تاریکی اور سردی ختم، اور بہار اور اُجالے کی آمد آمد ہے۔

چنانچہ اس ہفتے انگلستان میں **Guy Fawkes Night** اور ہندوستان میں دیوالی کے جو تہوار منائے جا رہے ہیں وہ انسان کی قدیم ترین تہذیبی روایتوں کی علامتیں ہیں۔

www.taemeernews.com

سُلطان محمود

برطانیہ میں اردو صحافت کا ارتقا

یہ نومبر ۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے۔

پاکستان سے صحافیوں کا ایک وفد پی آئی اے کی ایک افتتاحی پرواز کے ذریعہ لندن پہنچا۔ اس زمانے کے مقبول روزنامہ "کوہستان" کے سربراہ عنایت اللہ وفد کے رکن تھے۔ عنایت اللہ کا تعلق گوجرہ منڈی ضلع لائل پور سے تھا اور وہاں ہائی اسکول میں محمود ہاشمی اور عنایت اللہ کلاس فیلو تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد اُن کی راہیں جدا ہوگئیں۔ عنایت اللہ نے اسلامیہ کالج کے صدر دروازے کے عین سامنے قومی کتب خانے کی اوپر کی منزل میں انھیں رہنے کے لیے ایک کمرہ میسر آگیا۔ انھوں نے بعد میں اسی کمرے سے قومی کتب خانے سے چھپنے والے بچوں کے رسالہ "ہدایت" کی "ناجو" کے نام سے ادارت کی۔ نسیم حجازی کے سب سے پہلے ناول "داستان مجاہد" اور "محمد بن قاسم" کے بارے میں مصنف کے ساتھ سرجوڑ کر ان ناولوں کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا۔ اس کے بعد قومی کتب خانے کے مالک جناب ہمایوں کے بیٹے صفدر اور نسیم حجازی کے ساتھ مل کر راولپنڈی سے اردو کا ہفت روزہ "تعمیر" جاری کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ "تعمیر" جب اپنے شباب کو پہنچا تو نسیم حجازی اور عنایت اللہ "تعمیر" میں کام کرنے والے بہت سے کارکنوں سمیت ادارۂ "تعمیر" سے کنارہ کش ہو کر راولپنڈی سے ایک اخبار "کوہستان" کا اجرا کیا اور جب راولپنڈی میں "کوہستان" کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں تو اس کا ایک ایڈیشن لاہور اور کچھ عرصے بعد ملتان سے بھی چھپنے لگا۔

برطانیہ میں عنایت اللہ کی دلچسپی کے مرکز محمود ہاشمی تھے۔ اُن دنوں برطانیہ میں "نوائے وقت" کا اوورسیز ایڈیشن پہنچا کرتا تھا۔ لاہور میں "کوہستان" کا جس اخبار سے مقابلہ تھا وہ "نوائے وقت" ہی تھا، چنانچہ عنایت اللہ "کوہستان" کا اوورسیز ایڈیشن شایع کر کے لندن میں بھی "نوائے وقت" کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انھیں محمود ہاشمی کے تعاون کی ضرورت تھی۔ عنایت اللہ چونکہ ایک خاص مشن میں لندن آئے تھے اس لیے وہ یہیں رہ گئے۔ محمود ہاشمی برطانیہ سے ایک اردو اخبار کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ عنایت اللہ تو "کوہستان" کا اوورسیز ایڈیشن کا منصوبہ لے کر لندن آئے تھے لیکن محمود ہاشمی نے انھیں نئی منزل دکھا دی۔ نئے اردو اخبار کا اجرا "کوہستان" کا اوورسیز ایڈیشن شایع کرنے سے کہیں بہتر اور دل پسند خیال تھا۔ عنایت اللہ نے محسوس کیا کہ لندن جیسے بین الاقوامی اہمیت کے حامل سیاسی اور تجارتی شہر سے اردو کا پہلا اخبار نکالنے سے انھیں پاکستان کے تمام اشاعتی اداروں پر سبقت اور برتری حاصل ہو جائے گی چنانچہ انھوں نے "کوہستان" کے سمندر پار ایڈیشن کے منصوبے کو ترک کر دیا اور لندن سے اخبار نکالنے کے

www.taemeernews.com

مختلف پہلوؤں کا سنجیدگی اور یک سوئی سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔

۱۹۶۱ء تک برطانیہ میں آباد پاکستانی بنک کاری کی سہولیات سے کما حقہ روشناس نہ تھے اور نہ ہی برطانیہ میں کسی پاکستانی بنک کی کوئی شاخ ہوا کرتی تھی جہاں لوگ اپنی محنتِ شاقہ سے پس انداز کی ہوئی رقمیں جمع کرواتے۔ خان ولی نامی ایک آزاد کشمیری محمود ہاشمی کے ہاں رہائش رکھتے تھے۔ محمود ہاشمی اور عنایت اللہ کے درمیان اخباری موضوع پر مطلوبہ سرمائے کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ اخبار کے لیے ابتدائی انتظامات وغیرہ کے لیے پانچ سو پونڈ کی ضرورت ہے۔ یہ بات خان ولی نے نہ جانے کیسے سن لی کہ انھوں نے دوسرے ہی دن پانچ سو پونڈ کے نوٹوں کی گڈیاں نئے اخبار کے لیے پیش کر دیں اور اخبار کی منزل نزدیک سے نزدیک تر آگئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ برطانیہ میں اردو صحافت محمود ہاشمی اور عنایت اللہ کی منصوبہ بندی اور سرمایہ کاری میں خان ولی کی پہل قدمی کی مرہونِ منت ہے، تو بیجا نہ ہوگی۔۔۔

اس دوران برمنگھم سے یہ آواز اٹھی کہ محمود ہاشمی ایک اردو اخبار نکالنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک "پرائیویٹ لمیٹڈ" فرم کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب یہ بات عام ہوئی کہ لندن سے اردو کا ایک اخبار نکل رہا ہے تو لوگ نوٹوں سے بھری ہوئی جیبوں کے ساتھ محمود ہاشمی کی رہائش گاہ پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ لوگ مجوزہ اخبار پر سرمایہ لگانے کے اس لیے آرزومند تھے کہ انھیں محمود ہاشمی کی شرافت اور دیانت پر اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کا روپیہ صحیح اور درست طور پر صرف ہوگا۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں سرمایہ جمع ہو گیا۔ ۸ر فروری ۱۹۶۱ء کو "لاکشین پبلشرز لمیٹڈ" نامی ایک کمپنی معرضِ وجود میں آئی اور چودھری محمد یوسف (جو مشہور صنعت کار اور انگریزی روزنامہ "سن" کراچی کے سربراہ تھے) مذکورہ کمپنی کے چیرمین مقرر ہوئے۔۔۔

اخبار ہفت روزہ تھا اس لیے اس کا نام "مشرق" طے پایا۔ دفتر لندن میں کنگز کراس کے علاقے میں واقع تھا جو لندن کا ایک بہت ہی مشہور کاروباری علاقہ تھا۔ "مشرق" کا پہلا شمارہ یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو مشرق کے اپنے پریس سے نکلا۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ اخبارات کا جنم داتا انگلستان ہے اور برطانوی عوام اپنی کثرت اخبار بینی کے لحاظ سے دنیا بھر میں شہرت کے حامل ہیں۔ انگریزی کے علاوہ متعدد دیگر زبانوں میں بھی جرائد نکلتے ہیں۔ البتہ برطانوی دنیائے صحافت میں اگر کسی پرچے کی کمی تھی تو وہ اُردو اخبار ہی کی تھی۔ ۸ر اپریل ۱۹۶۱ء کے تاریخی دن یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ ہفت روزہ "مشرق" کا پہلا شمارہ بڑا ہی دیدہ زیب اور دلچسپ۔ موضوعات اور معیاری اور شگفتہ تحریروں کا شاندار مرقع تھا۔ مشرق کی اشاعت پر پاکستانیوں کے دل مسرت سے جھوم اُٹھے وہ خوش تھے کہ انھیں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھے بٹھائے ملکی حالات اور خبروں کا پتہ چلتا رہے گا۔ وطن سے دوری کا احساس کم ہوگا اور ان کی قومی زبان کو دیارِ غیر میں فروغ حاصل ہوگا۔ پاکستانی تو خیر خوش ہی تھے ہندوستانی تارکینِ وطن بھی جن میں ہندو، سکھ اور عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے، شامل تھے۔ کم خوش نہیں تھے اور وہ "مشرق" کے اجرا کو ایک قابلِ قدر کارنامہ سمجھنے پر مجبور تھے۔ مشرق کا پہلا شمارہ ہی اس امر کی نشان دہی کر رہا تھا کہ یہ اخبار ہر اس شخص کی دلچسپیوں کا آئینہ دار ہے جسے اردو زبان سے محبت اور برصغیر کے سیاسی اور معاشی حالات اور سماجی واقعات سے دلچسپی ہے۔ اپریل کے پہلے شمارے کے آخری صفحے پر جہاں پاکستانیوں کے نقطۂ نگاہ اور مطمحِ نظر سے اس قسم کی اہم خبریں شایع ہوتیں وہاں اسی صفحے پر ایسی خبریں بھی شایع ہوتیں جن میں ہندوستانی قارئین کے لیے دلچسپی ہوتی۔ خبروں کے علاوہ برطانیہ میں مقیم تارکینِ وطن کے مسائل کے بارے میں خصوصی مضامین بھی شامل ہوتے۔ اس میں کوئی ایسا مواد شامل نہ ہوتا جو متنازعہ فیہ ہو اور کسی فرقے یا قوم کی تضحیک اور

www.taemeernews.com

دل آزاری کا باعث ہو مختصر یہ کہ "مشرق" برطانیہ میں سکونت پذیر تمام تارکین وطن کے حقوق کا محافظ، ان کے جذبات کا ترجمان اور ان کے دکھ درد کا ساتھی تھا اس کی پالیسی آزاد اور متوازن تھی۔

برطانوی سرزمین پر ہفت روزہ "مشرق" لندن کے بعد اردو کے جس چمنستان کے وجود کا چشم فلک کو دیدار نصیب ہوا اس کا نام ہفت روزہ "ایشیا" ہے اور اس کے بانی حبیب الرحمٰن تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۵۳ء میں راولپنڈی کے روزنامہ "تعمیر" کے ایک اسٹاف رپورٹر کی حیثیت سے کیا۔ کچھ عرصہ بعد روزنامہ "کوہستان" راولپنڈی سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء کے اوائل میں راولپنڈی میں کراچی کے روزنامہ "جنگ" کے نمائندہ خصوصی مقرر کر دیے گئے۔ وہ ۱۹۶۳ء کے شروع میں انگلستان چلے آئے اور انھوں نے برمنگھم کا رخ کیا، جو لندن کے بعد برطانیہ کا سب سے بڑا شہر اور اہم صنعتی مرکز ہے۔ یہاں پاکستانی سب سے زیادہ تعداد میں رہتے ہیں۔ پاکستانیوں کی اس غیر معمولی تعداد کے پیش نظر حبیب الرحمٰن نے برمنگھم سے ایک اردو اخبار کی ضرورت محسوس کی اور انھوں نے یکم مئی ۱۹۶۳ء کو برمنگھم سے ہفت روزہ "ایشیا" کا پہلا شمارہ بڑے طمطراق سے نکالا۔ اگست ۱۹۶۹ء تک "ایشیا" خوب چلا۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں ادارہ "مشرق" نے اسے تیرہ ہزار پونڈ کے عوض خرید لیا۔ ادارہ مشرق نے "ایشیا" کو خرید کر ایسی فاش غلطی کا ارتکاب کیا کہ "ایشیا" "مشرق" کو بھی لے ڈوبا۔ "ایشیا" کی فروخت کے بعد حبیب الرحمٰن روزنامہ "جنگ" سے وابستہ ہو گئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ روزنامہ "جنگ" کا آغاز ان کی ہی جدوجہد اور منصوبہ بندی کا ثمر ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو لندن سے روزنامہ "جنگ" کا اجرا ہوا۔ انعام عزیز اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ وہ ایک پرانے اور کہنہ مشق صحافی تھے۔ سالہا سال تک جنگ کراچی کے نیوز ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ وہ سرخیوں کے بادشاہ کے لقب سے اخباری حلقوں میں خوب معروف تھے۔ وہ بی بی سی کی بیرونی نشریات کے شعبے سے بھی پانچ سال منسلک رہے۔ اب وہ جنگ کے لندن ایڈیشن کے ایڈیٹر تھے۔ ادارہ "مشرق" نے روزنامہ "جنگ" سے مقابلے کی ٹھانی اور ہفت روزہ "ایشیا" اور ہفت روزہ "مشرق" میں سے کسی ایک کو روزنامہ بنانے کے منصوبوں پر غور و خوض ہونے لگا۔ قرعہ اندازی "ایشیا" کے نام نکلی اور ۲ جون ۱۹۷۱ء کو ہفت روزہ "ایشیا" روزنامہ "ایشیا" بن گیا۔ ادارہ "مشرق" اندرونی خلفشار اور چپقلش کا شکار ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ادارے کے کچھ لوگ "ایشیا" کے روزنامہ بنائے جانے کے خلاف تھے اور اُن کا استدلال اور مطالبہ یہ تھا کہ "مشرق" کو جنگ کے مقابلے میں روزنامہ بنا لیا جائے۔ اس سوال پر اختلافات پروان چڑھے اور جو کارکن "مشرق" کو ڈیلی شایع کرنے کے حق میں تھے انھوں نے روزنامہ "ایشیا" سے لاتعلقی اور بے اعتنائی برتی۔ نتیجتاً ۱۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو روزنامہ "ایشیا" آخری بار شایع ہوا۔

ماہنامہ "آفاق" کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۴ء کو برطانیہ کے ایک مشہور شہر نوٹنگھم سے شایع ہوا۔ اس کے روح رواں کا نام محمد حارس خاں تھا۔ ان کا تعلق بھی راولپنڈی سے تھا۔ اُن کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ استاد ڈبنگی کے تخلص سے مزاحیہ شعر بھی کہتے تھے۔ انھوں نے مئی ۱۹۶۵ء میں "آفاق" کا دفتر نوٹنگھم سے لندن منتقل کر لیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد قدرت نے اُن سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا اور اس کے ساتھ "آفاق" بھی اس آفاقی منظر سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

"اخبار وطن" لندن اس وقت اُردو کا مقبول ترین اور سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ ہے۔ یہ یکم جولائی

www.taemeernews.com

۱۹۶۹ء کو معرضِ وجود میں آیا تھا اور اس کے بانی عنایت اللہ اور عبدالرزاق تھے۔ عبدالرزاق "مشرق" لندن کے شعبہ اشتہارات اور سرکولیشن کے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۷ء کے آخری مہینوں میں اُن کا مشرق کے ایڈیٹر محمود ہاشمی سے معمولی سی بات پر تنازعہ ہو گیا جو رزاق کی ادارہ "مشرق" سے علیحدگی پر منتج ہوا۔ عنایت اللہ جو محمود ہاشمی کے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ عبدالرزاق کو بھی بے حد عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے صلح صفائی کی بہت کوشش کی۔ لیکن سب کوششیں اکارت گئیں۔ اب عنایت اللہ اور محمود ہاشمی کے درمیان بھی اَن بَن ہو گئی۔ اور یہی ان بن "مشرق" کو نیچا دکھانے کے لیے "اخبار وطن" کے اجرا کی بنیاد بن گئی۔ اخبار وطن نے واقعی "مشرق" کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ "مشرق" دن بہ دن تنزل اور اخبار "وطن" عروج پذیر ہوتا گیا۔

ماہنامہ "گھرانہ" برطانوی تاریخ میں خواتین کے لیے اردو کا پہلا جریدہ تھا۔ اس کی ایڈیٹر اور خالق محترمہ تسیم چشتی تھیں جو لندن کے "مشرق" میں لکھا کرتی تھیں۔ برمنگھم میں اپوا کا قیام بھی اُن کا ایک کارنامہ ہے۔ کتابت، چھپائی اور معیاری نگارشات اور شگفتہ تحریروں کے اعتبار سے یہ پرچہ اپنی مثال آپ تھا۔ قدرت اللہ شہاب۔ فیض احمد فیض، قتیل شفائی۔ ایم اسلم نسیم حجازی۔ میرزا ادیب۔ منیر نیازی۔ رحیم گل۔ اسرار زیدی۔ کشور ناہید اور حفیظ جالندھری جیسے گلستانِ اُردو کے مہکتے ہوئے پھول اس کے قلمی معاونین تھے۔ چنانچہ یہ پرچہ بے حد مقبول ہوا۔ یہ واحد جریدہ تھا جو اپنے تمام اخراجات "سبیل" سے پورا کیا کرتا تھا جس سے اس کی اشاعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بی بی سی ٹیلی ویژن پر 'گھرانہ' کے بارے میں آدھ گھنٹے کا ایک خاص پروگرام پیش کیا گیا۔ اس پرچے کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا گیا کہ بی بی سی نے اپنی اردو سروس کے لیے 'گھرانہ' کے ہی نام سے ایک ہفتہ وار اردو پروگرام شروع کیا جو چودہ ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتا تھا۔ پورے دو سال تک "گھرانہ" بڑی باقاعدگی سے چھپا۔ بعد ازاں ادارہ "اخبار وطن" نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور پھر اس کی اشاعت بند ہو گئی، جس سے اردو ادب اور خصوصاً خواتین کے ادب کو نقصان پہنچا۔ 'گھرانہ' کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء میں شایع ہوا تھا۔ "گھرانہ" کے بند ہو جانے پر تسیم چشتی کراچی کے "اخبار خواتین" کی لندن میں نمایندہ خصوصی بن گئیں۔ کوئی ڈیڑھ سال تک وہ یہ کام کرتی رہیں۔ آج کل بی بی سی کے گھرانہ پروگرام کے لیے ہی لکھ رہی ہیں۔ "گھرانہ" کی جگہ بریڈفورڈ سے شایع ہونے والے ہفت روزہ جریدے "راوی" نے لے لی ہے۔ راوی کی مدیرہ فریدہ شیخ ہیں۔ کتابت، طباعت، متنوع مضامین کے معیار حسن کے سبب 'راوی' دن بہ دن مقبول ہو رہا ہے۔

۱۹۷۵ء کے شروع میں انعام عزیز "جنگ" کی انتظامیہ سے اختلافات کی بنا پر جنگ' کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور انھوں نے روزنامہ "ملت" کی داغ بیل ڈالی۔ روزنامہ "ایشیا" کے بند ہو جانے سے 'جنگ' کی اجارہ داری کی بنا پر جو خلا پیدا ہو گیا تھا، "ملت" نے اس کا مداوا کر دیا۔ یہ پرچہ بے حد مقبول ہے اور انعام عزیز کی "سرخیاں" پرچے کی مقبولیت کی ضامن ہیں۔ انعام عزیز کے بعد جنگ کے ایڈیٹر آصف جیلانی مقرر کیے گئے جو ایک عرصے تک جنگ گروپ کراچی کے اخبارات کے لندن میں نمایندہ خصوصی رہے ہیں۔

برطانیہ کے تقریباً ہر شہر کے مکینوں نے اپنی مدد آپ کے اصولوں پر فلاحی انجمنیں قایم کر رکھی ہیں جنھیں "ریذیڈنس ایسوسی ایشنز" کہا جاتا ہے۔ یہ انجمنیں اپنی تکالیف، مسائل اور مطالبات حکومت تک پہنچانے کے لیے گاہے بہ گاہے اخبار یا کتابچے چھاپتی رہتی ہیں۔ ایسے اخبارات کو کمیونیٹی نیوز پیپرز کا نام دیا جاتا ہے۔ برطانوی تاریخ میں اردو کا پہلا اور واحد کمیونیٹی نیوز پیپر "ساؤتھ آل نیوز" ہے، جس کے اجرا کا سہرا محمود ہاشمی کے سر ہے۔ یہ کارنامہ انھوں نے "مشرق" سے الگ ہو جانے کے بعد انجام دیا۔

محمود ہاشمی "مشرق" کے تاحیات چیف ایڈیٹر اور مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔ "مشرق" سے بعض وجوہ کی بنا پر ہٹنے کے بعد انھوں نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ۔ سانڈویل میں مشیر برائے ایشیائی امور کی حیثیت سے شمولیت اختیار کرلی۔ سانڈویل برمنگھم کا ایک بہت بڑا رہائشی اور صنعتی علاقہ ہے، جہاں تارکینِ وطن کل آبادی کا ۳۳ فی صد حصہ ہیں۔ ان تارکین میں پاکستانیوں کی تعداد ۵۰ فی صد ہے اور ان پاکستانیوں میں ۸۰ فی صد کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع میرپور سے ہے۔ محمود ہاشمی نے ایشیائی تارکین کی راہ نمائی کے لیے اُردو کا ایک اخبار جاری کیا، جس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ برطانوی تاریخ میں یہ اُردو کا پہلا اور واحد اخبار ہے جس کی اشاعت برطانیہ کے سرکاری اور نیم سرکاری محکموں کی سرمایہ کا نتیجہ ہے۔ یہ اخبار لوگوں کے گھروں میں بالکل مفت پہنچایا جاتا ہے ــــ

"سانڈویل نیوز" ایک ادارے سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنی پالیسی اور خدوخال کے لحاظ سے خود مختار رہا۔ اس کی حیثیت اردو کے پہلے کمیونٹی نیوز پیپر کی تھی۔ یہ اخبار برطانیہ میں رہنے والے ایشیائی تارکینِ وطن کے خالصتاً ان مسائل اور معاملات کے لیے مخصوص تھا جو انھیں درپیش تھے۔ "سانڈویل نیوز" کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے ہر شمارے کا انگریزی ترجمہ مقامی کونسلروں، مقامی ممبرانِ پارلیمنٹ اور ان تمام برطانوی اداروں کو بھیجا جاتا تھا جو تارکینِ وطن کے مختلف مسائل کے حل میں ممد ثابت ہو سکتے تھے ــــ

لندن کے مشرقی علاقہ "آل گیٹ" کی ایک عمارت سے نصر اللہ خاں کی زیرِ ادارت ہفت روزہ "عوام" کا پہلا شمارہ ۵ مئی ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا جس نے برطانیہ میں کھلبلی مچا دی، کیونکہ اس نے اس دور کے برسرِ اقتدار حکومت کے خلاف "سنسنی خیز انکشافات" کیے اور وزیروں اور سیاست دانوں پر نام لے لے کر الزامات عائد کیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان اور برطانیہ سے شائع ہونے والے اردو اخبارات برسرِ اقتدار طبقے کی شان میں ذرا سی بھی گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ برطانیہ سے شائع ہونے والے اردو اخبارات اور ان کے مدیران بھی اس کی تنقید سے محفوظ نہ رہے۔ لوگوں نے "عوام" کا ایک ایک لفظ چٹخارے لے لے کر پڑھا۔ اخبار بازار میں آتے ہی فروخت ہو جاتا اور لوگ اگلے شمارے کا بے قراری کے ساتھ انتظار کرتے رہ جاتے۔

'عوام' کے مدیر مسٹر نصر اللہ خاں کو صحافتی دنیا میں لانے کا سہرا روزنامہ "کوہستان" اور روزنامہ "مشرق" کے بانی عنایت اللہ خاں مرحوم کے سر ہے وہ پاکستان میں روزنامہ "مشرق" کے رپورٹر ہوا کرتے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن آئے اور "اخبار وطن" میں "میری ڈائری" کے عنوان سے کالم لکھنے لگے۔ یہ کالم قارئین میں بہت مقبول ہوا۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء میں اپنے احباب کے تعاون سے "ہم لوگ" کے نام سے ایک ہفت روزہ کا اجرا کیا جو چھ سات اشاعتوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ۱۹۷۶ء میں انھوں نے "عوام" کے نام سے ایک ہفت روزہ شائع کیا ــــ

برطانیہ میں اردو کے جتنے بھی اخبارات چھپ رہے ہیں ان میں "آزاد" کتابت، طباعت اور کوالیٹی کے لحاظ سے سب سے زیادہ خوبصورت اور نظر نواز اخبار ہے۔ "آزاد" اردو کا واحد اخبار ہے جسے حسن اور نفاست کے اعتبار سے برطانوی مجلّوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ کوالیٹی کا کاغذ، شان دار چھپائی اور عمدہ خطاطی نے "آزاد" کو اردو کا ایک منفرد اخبار بنا دیا ہے۔ متنوع موضوعات پر خیال افروز تحریریں اس کا خاصہ ہیں۔ دوسرے تمام اردو اخباروں کے بعد جاری ہونے والا یہ رسالہ اپنے حسن اور معیار کی وجہ سے بہت کم عرصے میں ایک مقبول جریدہ بن گیا ــــ

www.taemeernews.com

برطانیہ سے اردو کے ایسے اخبارات بھی شایع ہوئے جن کے مالکان ہندوستانی تھے۔ یہ اخبارات برطانیہ میں مقیم ہندوستانی باشندوں نے جاری کیے۔ لیکن ان کا معیار پاکستانیوں کے اردو اخبارات سے کمتر ثابت ہوا پاکستانیوں کے اردو اخبارات اور ہندوستانیوں کے اردو اخبارات میں وہی فرق ہے جو پاکستان اور ہندوستان کے اردو اخبارات میں ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ لندن سے اردو کا پہلا ہندوستانی اخبار اُس وقت جاری ہوا جب برطانیہ سے صرف "مشرق" اور "ایشیا" شایع ہوتے تھے۔ برطانیہ سے اردو کا پہلا ہندوستانی اخبار رمیش سونی نے شایع کیا۔ ان کا پہلا اخبار ۱۵ر اگست ۱۹۶۵ء کو ہفت روزہ "ملاپ" کے نام سے جاری ہوا۔ اس "ملاپ" کا ہندوستان سے شایع ہونے والے مشہور اخبار "ملاپ" سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندوستان کے "ملاپ" والوں نے لندن سے ۴ر جولائی ۱۹۷۲ء سے روزنامہ "ملاپ" کا ہفت روزہ ایڈیشن (انٹرنیشنل) لندن" کے نام سے جاری کیا۔ تب سے یہ اخبار یعنی اصلی "ملاپ" بھی بڑی باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے۔

ہفت روزہ "پرتاپ" اکتوبر ۱۹ء سے شایع ہو رہا ہے۔ یہ برطانوی تاریخ میں اردو زبان کا دوسرا بھارتی اخبار ہے۔ یہ اخبار گذشتہ پانچ سال سے بڑی باقاعدگی سے شایع ہو رہا تھا۔ لیکن حریف اخبارات کی جانب سے کاتبوں کو اُکسانے اور دوسری جگہ زیادہ معاوضے پر لے جانے کے باعث یہ اخبار بند ہوگیا۔ ماہنامہ "تصویر" برمنگھم، برطانوی تاریخ میں اردو کا پہلا فلمی جریدہ اور برطانیہ میں بھارتی صحافت کا سب سے زیادہ حسین اور شاہکار تھا جو کتابت وطباعت، علم و ادب اور نفاست کے اعتبار سے پاکستانی اخبارات سے بازی لے گیا تھا۔ یہ پہلا بھارتی جریدہ تھا جسے قبولِ عام حاصل ہوا۔

برطانیہ سے شایع ہونے والے اردو اخبارات کا آپس میں سخت مقابلہ رہتا ہے۔ لندن سے شایع ہونے والے اردو اخبارات نہ صرف برطانیہ کے پاکستانیوں کی اخبار بینی کی جملہ ضروریات سے انصاف کرتے ہیں بلکہ یورپ کے دیگر ممالک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے پاکستانیوں کو ملکی حالات اور اطلاعات بہم پہنچانے کا ذریعہ بھی ہیں۔ یہ اخبارات یورپ کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا کے ایسے شہروں اور قصبوں میں بھی جاتے ہیں جہاں پاکستانی موجود ہیں چنانچہ لندن کے اردو اخبارات تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ افراد کی تعداد کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں۔ مغربی دنیا میں پاکستانیوں اور اردو داں غیر پاکستانیوں کی اس قدر غیر معمولی تعداد کے باوجود یہاں اردو اخبارات کا مستقبل نہایت مخدوش ہے۔ قرائن یہی ہیں کہ برطانیہ میں اردو صحافت پندرہ بیس سال کے اندر ناپید ہو جائے گی۔

قمر ساحری — کے دو شعری مجموعے

باسلئے عہد — اردو غزلوں اور نظموں کا انتخاب

آسمان نامہ — فارسی غزلوں اور نظموں کا انتخاب

www.taemeernews.com

محسنہ جیلانی

اردو کا ایک انگریز پرستار

(رالف رسل سے ایک گفتگو)

ایک جگ بیت گیا ـــــ اسکول کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میگزین میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون کا موضوع کیا تھا اور کس نے لکھا تھا، اب کچھ یاد نہیں رہا۔ البتہ اس میں اُردو سے گہری محبت اور اردو پر وسیع قدرت رکھنے والے ایک انگریز کا ذکر یاد رہا ـــــ نام تھا ان کا "رالف رسل"۔ اس زمانے میں میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ علی گڑھ سے ہزاروں میل دور لندن میں ان سے ملنے کا موقع ملے گا ـــــ

پچھلے دنوں میں جب رسل صاحب سے ملی تو واقعی ایسا لگا کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ برف ایسے سفید بالوں، بار بار کھلکھلاہٹ کی حدوں کو چھوتی ہوئی مسکراہٹ سے شگفتہ چہرے اور شفقت اور انکساری سے بھرپور شخصیت کے ساتھ ساتھ میں ان کی سلیس اور تیز گرتے ہوئے جھرنے ایسی رواں دواں اُردو سے کہ جس میں انھوں نے ایک لفظ کے لیے بھی انگریزی کا سہارا نہیں لیا، میں اس قدر مغلوب ہوئی کہ میں اُن کے بارے میں جو بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھی، نہ پوچھ سکی اور ان پر رشک کرتی اور یہ سوچتی واپس آ گئی کہ ہم اردو بولنے والوں نے اپنی اُلٹی سیدھی قابلیت جتانے کے لیے ہر وقت انگریزی الفاظ اور انگریزی انداز اظہار کی بیساکھیاں لگا کر اُردو کو معذور بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ لیکن ابھی رالف رسل ایسے لوگ ہیں جن کی بدولت اردو کی شگفتگی اور شائستگی باقی رہنے کا امکان روشن ہے ـــــ

دوسری بار جب میں رالف رسل سے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اُن کے اردو شعبہ میں ملی، تو اُن کے بارے میں وہ تمام سوالات اُمڈ آئے جو میں پہلی ملاقات میں نہ پوچھ سکی تھی۔ قدرتی طور پر میرے ذہن میں پہلا سوال یہی اُبھرا کہ انھیں اردو سے دلچسپی کب اور کیسے شروع ہوئی۔ اُنھوں نے کہا:

"جنگ سے پہلے میں کیمبرج یونیورسٹی میں طالب علم تھا اور دوسری عالمی جنگ میں جبری بھرتی کا معاملہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے ہندوستان بھیجا جائے گا۔ لیکن ۱۹۴۲ء میں مجھے انڈین آرمی میں بھیجا گیا۔ انڈین آرمی کی زبان اُس زمانے میں اُردو تھی جو رومن کے ذریعے سکھائی جاتی تھی۔ بعض افسروں نے معمولی حد تک سیکھ لی۔ لیکن مجھے کچھ زیادہ دلچسپی تھی۔ میں لوگوں سے بات چیت کرنا چاہتا تھا تو میں نے ذرا اچھی طرح سیکھی۔ لکھنا پڑھنا بھی اسی زمانے میں سیکھا۔ البتہ ادب کا مطالعہ نہیں کیا، اور جب میں وہاں ساڑھے تین سال رہنے کے بعد انگلینڈ واپس آیا، تو چاہتا تھا کوئی نہ کوئی ملازمت ایسی ڈھونڈ لوں، جس میں اردو کا علم بڑھانے کا موقع

www.taemeernews.com

ملے — میں نے باقاعدہ بی اے آنرس کا کورس کیا اور اُردو کے ساتھ سنسکرت بھی پڑھی — تین سال کا کورس تھا۔ مجھے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ اگر میں فرسٹ کلاس لاؤں تو لکچرار بنا دیا جاؤں گا۔ میں خدا کے فضل سے فرسٹ کلاس لاسکا اور ۱۹۴۹ء میں میرا تقرر لکچرار کی حیثیت سے ہوا، تب سے میں یہاں ہوں۔ ویسے میں نے باقاعدہ تعلیم کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں لاطینی، یونانی اور دوسری قدیم زبانیں پڑھیں —"

میں نے جب اُن سے پوچھا کہ آپ کے اردو کے پہلے استاد کون تھے، تو انھوں نے کہا —

" فوج میں جو منشی ہوتے تھے وہی تھے، نام یاد نہیں البتہ جن لوگوں نے میری مدد کی ان میں ایک صاحب ہیں جو بعد میں پاکستان آرمی میں بڑے افسر بن گئے۔ اس زمانے میں وہ لیفٹیننٹ تھے۔ ہم ایک ہی تمبو میں رہتے تھے ان کا نام تھا محمد نواز خاں۔ پٹھانوں کی طرح اُردو بولتے تھے۔ انھوں نے کافی مدد کی جگہ جگہ ساتھ رہے۔ ہم برما سرحد کے قریب لیما میں تھے اس کے بعد منی روڈ، امپھال اور کوہیما میں رہے —"

آپ نے اُردو رومن کے ذریعے سیکھی ہے تو کیا رومن رسم الخط کی وجہ سے اُردو سیکھنی آسان ہے۔ یہ میرا اگلا سوال تھا۔

انھوں نے کہا۔" نہیں — رومن رسم الخط سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ میں نے شروع ہی سے طے کیا کہ میں اُردو رسم الخط سیکھوں گا۔ ویسے یہاں یونیورسٹی میں ہم ایک طرح کا رومن استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وہ رومن جو اُس زمانے میں سیکھی جاتی تھی وہ ناقص تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے آسانی تو کیا خاصی مشکلیں پیدا ہوئیں۔ اُردو میں ت کے لیے یا ٹ کے لیے انگریزی ٹی (T) لکھیں تو تلفظ میں کافی گڑبڑ ہوگی۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ اردو سیکھنے کے لیے رومن رسم الخط سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا —"

رسل صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی رہے۔ انھوں نے اس کے بارے میں بتایا :۔

" یہاں کے فوراً تقرر کے بعد میں نے کہا کہ میں سال بھر کے لیے ہندوستان اور پاکستان جانا چاہوں گا، تو سب سے پہلے میں علی گڑھ یونیورسٹی گیا۔ میں نومبر ۱۹۴۹ء میں پہنچا اور غالباً مئی تک وہاں رہا۔ اس کے بعد اور جگہوں کا سفر بھی کیا پاکستان بھی گیا۔ اس زمانے سے میرا تعلق علی گڑھ سے ہے جب ذاکر صاحب تھے۔ میں اور میری بیوی ان کے یہاں ٹھہرے اور اسی زمانے سے میری خورشید الاسلام سے دوستی ہے۔ خورشید صاحب سے مل کر میں نے جو کام کیا ہے یا یوں سمجھیے کہ جو ٹھوس کام میں نے کیا ہے انھیں کی شرکت سے کرسکا۔ اور اب بھی کر رہا ہوں — جب ۱۹۵۱ء میں عابد صاحب وہاں تھے تو صالحہ عابد حسین نے مجھے انیس کے مرثیے پڑھائے۔ عابد صاحب سے ۱۹۵۰ء میں جامعہ میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد جب وہ علی گڑھ آئے تو میرا کافی ساتھ رہا۔"

قدیم اور موجودہ لکھنے والوں میں آپ کو کون کون پسند ہیں۔ میرا اگلا سوال تھا۔

انھوں نے کہا۔

" میر اور غالب شاعری میں اور نثر نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد۔ میرا خیال ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں جو لوگوں نے لکھا ہے اس میں ان کی کم تعریف کی ہے۔ ایک تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ناول نگار تھے۔ نذیر احمد نے خود کبھی یہ دعوٰی نہیں کیا کہ "میں ناول نگار ہوں"! اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ ناول کے کچھ اصول ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں آپ نذیر احمد کی تصانیف کو دیکھیں، تو آپ بڑی غلطی کریں گے اور یہی غلطی نقاد کرتے ہیں۔ لیکن نذیر احمد کو اُردو زبان پر جس قدر قدرت اور عبور حاصل تھا، ان کے کسی ہم عصر میں وہ بات نہیں، اور آپ جب نذیر احمد کی تصانیف پڑھتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ بے ساختہ اور فصیح اردو میں لکھ سکتے

www.taemeernews.com

آپ یہ بات نہ تو حالیؔ، نہ سرشارؔ اور نہ ہی سرسیدؔ کے بارے میں کہہ سکتے ہیں ——"

میں نے اگلا سوال ان سے پوچھا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں اردو ادب میں جمود طاری ہو رہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ——؟

"بھئی سچی بات تو یہ ہے" انھوں نے بڑے مزے میں جواب دیا۔ "کہ آزادی کے بعد کے اُردو ادب کا میں نے کوئی خاص مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ مجھے اس کے بارے میں کوئی تعصب ہو۔ جو کوئی اردو ادب میں اضافے کی کوشش کرتا ہے، میں اس کی داد دیتا ہوں۔ یہ کوشش بذاتِ خود قابلِ تعریف ہے اور نہ مجھے کلاسیکی ادب سے اس لیے دلچسپی ہے کہ میں جدید اردو کو حقیر سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں، یعنی کسی بھی طریقے سے آپ لکھنا پسند کریں، میرے لیے جائز ہے۔ صرف بات اتنی ہے کہ جب آپ بعض شاعروں کو خاص طور پر انگریزوں کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں بہت سا وقت لگ جاتا ہے"

اردو ادب کے بارے میں، میں نے رسل صاحب سے پوچھا کہ آپ کو اُردو کے کس شعبہ سے زیادہ دلچسپی ہے ——

انھوں نے جواب دیا ——

"شاعری سے خاص طور پر کلاسیکی غزل سے۔ کلاسیکی غزل میں بیسویں صدی کے لوگ بھی آتے ہیں۔ حسرت موہانی کی شاعری مجھے بے حد پسند ہے۔ ان کو میں کلاسیکی غزل گو شاعر مانتا ہوں۔ غزل کے بعد مجھے مختصر افسانے اور ناول سے بھی دلچسپی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اردو ادب کی سب سے عمدہ اور بہترین چیز غزل ہے ——"

اردو ادب کے بارے میں بات چیت کرنے کے بعد میں اسی ادارہ یعنی SOAS کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ رسل صاحب اس ادارے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے آئے اور تین سال بعد لکچرار مقرر ہوئے۔ یعنی آپ ۱۹۴۶ء سے اسی ادارے سے وابستہ ہیں۔ یہ ادارہ پہلی عالمی جنگ کے آخر غالباً ۱۹۱۷ء میں قایم ہوا۔ رسل صاحب کے کہنے کے مطابق انھیں اچھی طرح یاد نہیں کہ سب سے پہلے ڈائرکٹر کون تھے۔ شاید سر ڈینی سن راس ہوں، ان کا کافی وسیع مطالعہ تھا ——

رسل صاحب نے بتایا کہ اس زمانے میں بھی اسی ادارے میں یہی اندازِ تعلیم و تدریس تھا، لیکن دوسری جنگ کے بعد اسٹاف میں استادوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا، اور طالب علموں کی تعداد بھی بڑھی۔ اس زمانے اور دوسری جنگ کے درمیانی عرصے میں زیادہ تر وہ لوگ آتے رہے جن کو کسی سرکاری حیثیت سے سلطنت کے مختلف حصوں میں بھیجا جا رہا تھا، یا وہ لوگ جو تجارت کے سلسلے میں کچھ زبانیں سیکھنا چاہتے تھے پھر دوسری جنگ کے بعد دوسری قسم کے لوگ آنے لگے جو میرے خیال میں ان سے بہتر ہیں ——"

میں نے رسل صاحب سے پوچھا کہ آج کل اس ادارے میں زیادہ تر کون لوگ اُردو سیکھنے آتے ہیں ——

انھوں نے بتایا —— "اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں میرے زمانے میں، جسے اب تیس سال ہونے کو آئے ہیں یہاں کافی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پہلے تو صرف انگریز آتے تھے، لیکن وہ پُرانے قسم کے سرکاری انگریز نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ انگریز ہوتے تھے جن کو واقعی وہاں کی زبانوں، کلچر اور تاریخ سے کافی گہری دلچسپی تھی اور اُن کو پڑھانے میں کافی لطف آتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے سوچا کہ چونکہ ہمارے اسکولوں میں اُردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے، اس لیے بی اے آنرس کے لیے تین سال کی بجائے چار سال کا کورس رکھنا چاہیے اور پہلے سال میں ہم صرف زبان پڑھائیں۔ لیکن بہت اچھی طرح پڑھائیں۔ اس کے علاوہ ہم نے

www.taemeernews.com

یہ بھی سوچا کہ صرف انڈر گریجویٹس کو موقع نہیں ملنا چاہیے بلکہ جو بھی صاحب آنا چاہیں اور سال بھر کے لیے پڑھنے کو تیار ہوں ان کو اجازت ہونی چاہیے۔ لہٰذا ہم نے ان لوگوں کو بلایا اور میرا خیال ہے کہ ۱۹۶۵ء کے شروع سے لے کر آج تک مختلف ڈیپارٹمنٹ کے لوگ استاد بھی اور طالب علم بھی اور مختلف ملکوں اور یونیورسٹیوں سے بھی لوگ آنے لگے، لہٰذا جرمنی سے، اٹلی سے، ہالینڈ سے طالب علم یہاں پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور تبدیلی ہوئی، جو بہت خوشگوار تبدیلی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت طالب علموں کی اکثریت پاکستانیوں پر مشتمل ہے۔ وہ ایسے لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو یہاں پیدا ہوئے تھے اور جن کو اپنے باپ دادا کے کلچر سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انگریزی بڑی روانی سے بولتے ہیں، اُردو ذرا ناقص ہے۔ لیکن سیکھنا چاہتے ہیں اور اپنا کلچر بھولنا نہیں چاہتے۔ ان کو پڑھانے میں بہت لطف آتا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں ــــــ"

کیا اسکول کا مستقبل روشن ہے اور کیا اس میں توسیع کا امکان ہے، میں نے سوال کیا۔

رسل صاحب نے کہا کہ اسکول کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو واقعی اس کا مستقبل روشن ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی تعداد کافی کم ہے۔ دس بارہ سے زیادہ طالب علم نہیں ہیں۔ لیکن پہلے کے مقابلے میں کافی زیادہ ہیں اور امید ہے کہ آگے چل کر اچھا خاصہ اضافہ ہوگا ــــــ"

میں نے پوچھا کہ کیا اس ادارے میں کوئی بڑا کام ہوا ہے ــــــ

انھوں نے کہا کہ بڑا کہیے یا نہ کہیے۔ لیکن بعض لوگوں نے ریسرچ کی ہے۔ میرے ساتھی خالد حسن قادری یہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے آئے تھے، انھوں نے حسرت موہانی پر تھیسس لکھی۔ میری رائے میں بہت عمدہ تھیسس ہے ــ اب چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں ــ پھر ایک صاحب ہندوستان کی ہیں جنھوں نے رتن ناتھ سرشار پر تھیسس لکھی ہے ــ وہ بھی اچھی خاصی ہے۔ میرے خیال میں ریسرچ پر کام ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ بھئی آپ اپنے ملکوں میں ہندوستان اور پاکستان میں ریسرچ کیوں نہیں کرتے وہاں زیادہ گنجایش ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی یہاں آئے ہیں جنھیں رہنا ہے۔ لگے ہاتھوں کچھ اردو کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی مدد کے لیے میں تیار رہتا ہوں ــ اور پھر ایسے بھی موضوع ہیں جن کے لیے مواد زیادہ تر نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ برٹش لائبریری میں کافی بڑا ذخیرہ ہے تو اس بنا پر یہاں بھی اچھا خاصا کام کر سکتے ہیں ــــــ

برطانیہ میں اردو بولنے والوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ہے جن کے بچوں کے لیے اُردو پڑھنا اور بولنا ایک سنجیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ لہٰذا اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے اُن سے پوچھا، کہ کیا اس بات کا امکان ہے کہ یہاں کے اسکولوں میں دوسری غیر ملکی زبانوں کی طرح اردو زبان بھی نصاب میں شامل ہو جائے ــــــ

انھوں نے کہا۔ "بھئی میرا بھی یہی جی چاہتا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ معقول بات ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انگریزوں کی طبیعت اس طرف ابھی نہیں گئی ہے۔ برمنگھم کی مثال لیجیے وہاں بے شمار پنجابی بچے ہیں۔ پاکستانی ہیں۔ برمنگھم کے انگریز بچے فرانسیسی پڑھتے ہیں، جرمن پڑھتے ہیں، تو اُردو اور پنجابی کیوں نہ پڑھیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یقیناً نصاب میں اس کی گنجایش ہونا چاہیے ــــــ"

آج کل رسل صاحب نے برٹن آن ٹرنٹ میں، اردو سکھانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے آپ نے بریڈ فورڈ میں بھی اُردو سکھانے کے لیے ایک کورس شروع کیا تھا ــــــ

اس کے بارے میں آپ نے بتایا کہ جب پہلے پہل میں یہاں آیا تو کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہاں پر اتنے ہندوستانی اور

www.taemeernews.com

پاکستانی آکر بس جائیں گے اور یہ کہ ان لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم نے سوچا کہ اس سلسلے میں ہمارے ادارے کو بھی کچھ مدد کرنا چاہیے۔ ہم نے یہ بھی سوچا کہ انگریزوں کو ان کے پس منظر سے تھوڑی بہت واقفیت کرائی جائے۔ میں نے اپنے اسکول کے ایکسٹرا موریل ڈیپارٹمنٹ سے یہ بات کہی وہ تیار ہوئے تو میں مختلف جگہوں پر جاتا تھا۔ اسکولوں کے استادوں اور ان لوگوں کو جن کا تعلق پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سے تھا، وہاں کا پس منظر بتاتا تھا۔ بعد میں ۱۹۷۲ء میں ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو اردو زبان بھی سیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اس وقت سے میں نے کوشش کی کہ جتنی بھی میں ان لوگوں کی مدد کرسکوں، کروں ——

رسل صاحب نے بتایا کہ — برٹن آن ٹرنٹ میں ایک خاتون ہیں۔ مسز جل ایونسن جنھوں نے وہاں پاکستانیوں کی بے حد مدد کی ہے، وہ بے حد عمدہ عورت ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں برٹن آؤں اور پڑھاؤں۔ میں ۱۹۷۵ء میں جانا چاہتا تھا۔ لیکن طبیعت خراب ہوگئی، نہ جاسکا، پھر اپریل ۱۹۷۶ء میں گیا اور دو ہفتے کا کورس پڑھایا۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں، میں پھر گیا اور اس دفعہ لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر یہ انتظام ہو سکے تو آنے والے سال میں باقاعدہ ہفتے میں ایک دن میں آیا کروں اور پڑھایا کروں۔ میں نے کہا کہ روپے کا مسئلہ ہے، اگر آپ فیس کا انتظام کرسکیں اور کرائے کا تو میں بڑے شوق سے آؤں گا۔ چنانچہ یہی ہوا تو سب سے پہلے ہم نے کمیشن فار ریشیل ایکوالٹی کو درخواست دی کہ یہ بہت عمدہ کام ہے، آپ کے کام سے۔ لیکن یہاں آنے جانے کا کرایہ اور فیس دیجیے تاکہ ہم پڑھانے کے سلسلے میں جس سامان کی ضرورت ہو حاصل کرسکیں CRE والے مان گئے۔ گرانٹ ملی لیکن ایک ٹرم کے لیے۔ جب ٹرم ختم ہونے لگا تو جن کی اس سے دلچسپی تھی ان سب کی ایک کانفرنس کرائی گئی۔ برٹن آن ٹرنٹ ٹیکنیکل کالج کے لوگ ایس او اے ایس کے لوگ CRE کی ایک صاحبہ تاج النساء حسین، وہ بھی آئی تھیں برمنگھم سے، تو اس میں یہ طے ہوا کہ میں یہ کلاس جاری رکھوں گا۔ جون کے آخر تک ٹیکنیکل کالج، لوکل ایجوکیشن بھی کچھ دے گا دوبارہ CRE کو درخواست دی۔ میں نے کہا کہ میں ایک نیا کورس مرتب کروں گا۔ بعد میں ایس او اے ایس اس تجرباتی کورس کو شایع کرنے پر تیار ہوگیا۔ CRE نے دوبارہ گرانٹ دی اور میں جون کے آخر تک پڑھاتا رہا اس سال بھی جاری ہے ——

کتنے طالب علم ہیں، میں نے سوال کیا ——

انھوں نے بتایا کہ وہاں میں تین کلاسیں پڑھاتا ہوں۔ صبح ۹ بجے سے گیارہ بجے تک بعض انگریز آتے ہیں، جن کا اب دوسرا سال شروع ہونے والا ہے، اور اس سال اُردو رسم الخط بھی سیکھنی شروع کی۔ یہ ۹ آدمی ہیں۔ پھر قیدیوں کے لیے دوسری کلاس ½۱ بجے سے ½۳ بجے تک اور اس میں بھی ۹ دس آدمی ہیں۔ بعض پاکستانی لڑکے بھی اس میں آتے ہیں، جو یہاں پیدا ہوئے تھے جن کی اردو معمولی ہے اور اچھی طرح سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستانیوں اور انگریزوں کا ساتھ ہونے سے میرا خیال ہے دونوں کو کافی فائدہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو جانتے ہیں، دوستی بڑھانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پھر تیسری کلاس ½۴ سے ½۶ بجے تک پڑھاتا ہوں۔ اس میں وہ پاکستانی لڑکے مختلف جگہوں سے آتے ہیں جو اُردو میں بولیوں کا امتحان دینا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ کم از کم اگلے سال تک۔ اور آج کل میں نے یہ تجویز بھی پیش کی۔ یہاں کے ارباب حل وعقد کے سامنے کہ یہاں SOAS میں اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ میں نے نظام بدلنے کی کوشش کی ہے میں نے جیسا کہ پہلے بتایا کہ یہاں اُردو پڑھنے کے لیے ایک سال کے لیے طالب علم آسکتے ہیں ——

www.taemeernews.com

اب میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ یہ گھنٹے کا کورس بالکل شروع میں رکھا جائے اور عام کردیا جائے۔ رسل صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ ایک بات دلچسپ ہے کہ اس وقت ہمارے اسکول میں اردو کے جو طالب علم ہیں ان میں لڑکیاں بہت زیادہ ہیں صرف ایک لڑکا ہے ——

میں نے آخر میں سوال کیا کہ کیا آپ کی بیوی اُردو جانتی ہیں ؟ ——

رسل صاحب نے جواب دیا۔ اب باقاعدگی سے سیکھنی شروع کی ہے البتہ پہلے جب ۱۹۴۹ء میں وہ میرے ساتھ ہندوستان اور پاکستان گئی تھیں تو تھوڑی سیکھی تھی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی بچے نہیں تھے، زیادہ مشکل نہیں تھی۔ اس کے بعد بچے پیدا ہوئے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کی وجہ سے وہ دوبارہ میرے ساتھ نہ آسکیں۔ لیکن ۱۹۷۶ء میں، میں جب گیا تو وہ میرے ساتھ ۳ مہینے رہیں اس وقت کچھ اردو سیکھی ——

رسل صاحب کو اپنے طالب علموں کو پڑھانے کے لیے جانا تھا اس لیے بات چیت کا سلسلہ یہیں ختم کردینا پڑا حالانکہ ابھی بہت سے سوالات تھے میرے ذہن میں۔ رسل صاحب واقعی جس لگن سے، جس محنت اور محبت سے برطانیہ میں اُردو کی خدمت کر رہے ہیں، وہ اُردو کے چاہنے والوں کے لیے قابلِ رشک ہے اور اگر انھیں آج برطانیہ میں بنیادی ستون کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا ——

●●●

محسن بھوپالی کے شعری مجموعے

- **شکستِ شب** (نظمیں۔ غزلیں) ۱۹۶۱ء دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع
- **جستہ جستہ** (قطعات)
- **نظمانے** (نظم و افسانے پر مشتمل منظومات)
- **ماجرا** (نیا مجموعۂ کلام)

عالمتاب تشنہ کے شعری مجموعے

- **موج موج تشنگی** (نظمیں۔ غزلیں)
- **قریۂ جاں** (نیا مجموعۂ کلام)

ناشر:۔ ایوانِ ادب ۔ ۸/سی ۔ محمد علی سوسائٹی ۔ کراچی ۔ ۸

www.taemeernews.com

قیصر تمکین

ہمارے دادا میاں مرحوم

ہندوستان اور پاکستان کے عام مسلمان گھرانوں میں منجملہ دیگر روایات جلیلہ کے ایک چیز دادا میاں بھی ہوتی ہے' اور ذکر اس عظیم المرتبت ہستی کا جو "حال" کی ظلمت سے بمنزلۂ منارۂ روشنی یا رہنما نشان ہوتی ہے' ہمہ وقت اور ہر موقع پر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس مرد کامل کے رطب اللسان گھر کے معمر ملازم یا بعض حالات میں رشتے کی بیوہ خالائیں یا غریب الحال خواتین' از قسم جگت آپا ہوا کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ افراد خاندان میں سے اگر کوئی "افسر اردو" یا "ہمارے ادب میں قابلِ قدر اضافہ" قسم کا جید پیدا ہوا تو پھر دادا میاں کی ذات والا صفات سے ادبی جریدوں کے صفحات بھی بھر سکتے ہیں ـــــ

مثال کے طور پر افسر اردو جو ادب میں بھی دفتری قسم کی تقدیم و تاخیر باعتبار عہدے کا قایل ہوتا ہے۔ کچھ اس طرح "اپنے اور اپنے عہد" کے بارے میں قصیدہ خواں ہوتا ہے ـ" زانوئے ادب جدا مجد حضرت ڈمدار بوڑم پوری کے حضور طے کیا۔ مرحوم اپنے دور کے فاضل اجل اور عالم بے بدل تھے۔ عربی و فارسی میں استعداد کاملہ کے علاوہ علم نجوم اور فقہ و تفسیر میں بھی حیثیت حبر طمطام اور بحر قمقام کی تھی۔ عارفانہ رنگ میں کہتے' اور حق یہ ہے کہ خوب کہتے تھے۔ اشعار کا سرمایہ تیس ہزار تک پہنچتا ہے۔ کئی دیوان غیر طبع شدہ چھوڑے' جو امتداد زمانہ (غدر۔ تقسیم ہند یا سقوط ڈھاکہ) کی نذر ہو گئے۔ مرحوم نے ایک بار جب میرا سن صرف دو سال تھا' میری زبان سے ایک مصرعہ سن لیا۔ "ٹیوں۔ ٹیوں۔ ٹمک ٹماں۔ لڈّوں" تو بے ساختہ گلے سے لگا لیا' اپنے منھ سے پان کی پیک میرے منھ میں ٹپکائی اور پیشین گوئی کی کہ اگر یہ لڑکا شاعری نہ کرے گا تو اردو ادب مفلس رہ جائے گا ـ ـ ـ ـ ـ "

اس طرح کے دادا میاؤں کا تذکرہ تقریباً تمام خود نوشت سوانح عمریوں یا رسائل کے مشاہیر نمبروں میں مل جاتا ہے۔ مگر سوشل اور کلچرل قسم کے دادا میاں جو انتہائی محیر العقول کارنامے انجام دیتے ہیں اور جن کی شخصیت اردو تنقید کی زبان میں بہت "پہلودار" ہوتی ہے۔ ایک تراشیدہ ہیرے کی مانند ہوتے ہیں' جو ہر رخ سے نئی روشنی پڑنے پر ایک نئی چکا چوند پیدا کرتا اور انیلی جوت جگاتا ہے ـــــ

ویسے تو دادا میاں سو فی صدی صوفی منش۔ مجذوب اور خدا رسیدہ قسم کے لوگ ہوتے ہیں' مگر بعض جلالی دادا میاؤں کے چرچے بھی سنے ہیں۔ مثلاً ہمارے گھرانے کے ایک دادا میاں بڑے جلالی بزرگ تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک خادمہ کو کہ نام جس کا گلفام تھا' خلاف شرع آڑی مانگ نکالے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا' غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ بُرا دالان اُن کی آنکھوں کی لپک سے

www.taemeernews.com

دہک اٹھا، جیسے کئی تنور ایک ساتھ جل رہے ہوں۔ دم کے دم میں گل قدم لونڈی بھسم ہو کر رہ گئی۔ صبح جب میکو دالان میں جھاڑو لگانے آیا تو راکھ صاف کرتے ہی میں اس کے بدن پر آبلے پڑ گئے۔ کئی دن تک بے چارہ اسپتال جاتا رہا۔ یقین نہ آئے تو اب بھی میکو سے پوچھ لیجیے۔ مگر وہ بتائے گا تھوڑے ہی۔ بات ٹال جائے گا ـــــ

ہاں بہت دنوں بعد بڑی بھاوج مرحومہ نے جو خود بھی اللہ بخشے بڑی جنتی بی بی تھیں۔ خواب میں دیکھا کہ گل قدم جنت کے ایک باغ میں آرام کر رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ دادامیاں نے بعد میں اس کو معاف کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اُس کی بخشش ہو گئی ـــــ

برسبیل تذکرہ یہ عرض بھی ضروری ہے کہ یہ بڑی بھاوج مرحومہ وہی جنتی بی بی تھیں جن کے بارے میں مفسدوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

وہ پردے ڈال کر سونا بڑی بھاوج کا کوٹھے پر
انھیں پردوں کا پھر خود کاشفِ اسرار ہو جانا

دادامیاں لوگ بڑے قابل اور "علم دریاؤ" ہوتے ہیں اور عام طور پر جنات کو درس دیتے ہیں چنانچہ وہ قصہ بھی آپ نے "ہمارے دادامیاں" کے بارے میں سنا ہو گا کہ ان کے پاس جن پڑھنے آتے تھے۔ ایک بار ایک لونڈی کھانا لے کر دیوان خانے گئی تو دادامیاں تھے نہیں۔ اس لیے کسی جن نے اپنی کاہلی میں کوٹھے سے بیٹھے بیٹھے ہی اپنا ہاتھ بڑھا کر کھانے کا خوان لونڈی کے ہاتھوں سے لے لیا۔ لونڈی اتنے لمبے لمبے ہاتھ دیکھ کر ایسی ڈری کہ بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں دادامیاں نے جنوں کو بہت ڈانٹا۔ مگر اس واقعے کے بعد لوگوں پر کھلا کہ یہ جو لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ دادامیاں سے "نورنامہ" اور "شہادت نامہ" پڑھتے تھے اصل میں جنات تھے۔

دادامیاں خوبصورت اور وجیہہ بھی ہوتے ہیں، مگر ان کے "مردانہ" اوصاف کے بارے میں صرف مرد لوگ ہی بتاتے ہیں۔ اس باب میں خواتین قدرے محتاط رہتی ہیں۔ ہاں ان دادامیاؤں کا رنگ بہت گورا ہوتا ہے۔ راقم الحروف جو سیاہی میں توے سے بھی گہری رنگت کا مالک ہے، اس بات پر مصر ہے کہ "ہمارے دادامیاں" بہت گورے تھے (گورا ہونا وطن عزیز کی عظیم ترین خوبیوں میں ہے) چنانچہ "ہمارے" دادامیاں جب پان کھاتے تھے تو پیک کی سرخی حلق سے جھلکتی تھی ـــــ

دادامیاں ہر دل عزیز بھی ہوتے ہیں اور ان کے سانحۂ ارتحال پر عام طور پر شہر میں مکمل ہڑتال ہو جاتی ہے اور جنازے میں ایک لاکھ سے لے کر چالیس لاکھ تک آدمی شریک ہوتا ہے۔ بیشتر اوقات سوگواروں کے ہجوم کو قابو میں کرنے کے لیے پولس کو لاٹھی چارج کرنا پڑتا ہے۔ نالہ و شیون سے مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے۔ پھر خوب ٹوٹ کر پانی برستا ہے۔ تاہم تدفین کے وقت "خدا کا کرنا" ایسا ہوتا ہے کہ آسمان بالکل صاف ہو جاتا ہے ـــــ

ہمارے حلقے کے ایک دادامیاں کے انتقال پر اصطبل کے گھوڑے تک رو رہے تھے اور منی آپا کی بلی نے تو کئی دن تک گوشت سونگھا تک نہیں ـــــ

ایک دو نسل پہلے تک دادامیاں خطاب یافتہ بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے اگر کہیں کوئی شفاء الملک، شمس العلماء، خان بہادر، یا خان صاحب قسم کی چیز ہو گذرا تو پھر کہنا ہی کیا؟ سینیر خواتین کا ہے ماہے بیان فرماتی ہیں کہ انگریز کلکٹر (گویا خود اللہ میاں) دادامیاں سے جھک کر ملتا تھا۔ گورنر، کمشنر، کلکٹر یا اسی قبیل کی کوئی اوردی۔ آئی۔ پی ہستی جب دادامیاں سے ملنے آتی تو

www.taemeernews.com

فٹن یا کار گلی کے نکڑ پہ ہی رُکوا دیتی اور وہاں سے دادا میاں کے دیوان خانے تک پیدل چل کر آتی۔ ایک بار تو برنز صاحب (کوئی بھی غیر ملکی نوعیت کا نام استعمال ہو سکتا ہے) نے خود کہا کہ وہ یہ بے ادبی نہیں کر سکتا کہ دادا میاں سے ملنے کے لیے دیوڑھی تک گاڑی پر بیٹھ کر آئے ــــــ

کچھ سر پھروں کی ایک نسل ایسی بھی بعد میں پیدا ہوئی جس نے دادا میاں کی روایت میں پخ لگانا شروع کر دی۔ ہمارے ایک چچا ابّن بے خوف نے ایسے ہی ایک موقع پر بتایا کہ درحقیقت یہی دادا میاں کلکٹر کے بنگلے پر ڈالی لگاتے، اور وفا دار ازلی بھیجدان بن کر جاتے تھے۔ بیرے کو پانچ کا نوٹ پکڑا کر صاحب کو سلام بھجواتے اور پھر گھنٹوں پورٹیکو میں بغیر گدے کی کرسی پر صاحب سے ملاقات کی معراج کی امید میں پہلو بدلا کرتے ــــــ

اب یہ دوسری بات ہے کہ خود یہ بے خوف قسم کی نسل بھی دادا میاؤں کے زمرے میں شامل ہو رہی ہے۔ چنانچہ متعدد سابقہ چچاؤں کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ "راشٹرپتی جی سے ملے۔ اپنا کلام سنایا اور خلعت پائی ــــــ"

مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تقسیم ہند کے بعد کے دادا میاؤں کی روایات قدرے مختلف ہیں۔ ایک نسل ادھر کے دادا میاں اب انتہائی قوم پرست ثابت کیے جاتے ہیں۔ یہ دادا میاں لوگ انگریز سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ایک دادا میاں نے تو زمانۂ طالب علمی ہی میں جوش میں آ کر اپنے قیمتی سوٹ گھر کے آگے سڑک پر کھلے عام جلا ڈالے اور پھر جو کھدر پہنا تو اللہ بخشے کفن تک کھدر ہی کا اوڑھ کر اس دنیا سے اُٹھے ــــــ

نئی کھیپ کے دادا میاؤں کے رعب و داب کی کہانیاں بھی اپنے لب و لہجے کے اعتبار سے خاصی باغیانہ ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ "ہمارے" ایک دادا میاں نے پنڈت پنت کو جو یو پی کے وزیر اعلیٰ تھے ایسا جواب دیا کہ وہ خاموش ہو کر رہ گئے۔ لگے ہاتھوں یہ قصہ بھی سُن لیجیے۔ ہوا یہ کہ پنت جی آنکھوں کے ایک اسپتال کا افتتاح کرنے ہمارے علاقے میں آئے اور باتوں باتوں میں مقامی معززین و عمائدین کو خطاب کرتے ہوئے ازراہِ تمسخر بولے "کیا اس بستی میں سب اندھے ہی بستے ہیں"۔

بس پھر کیا تھا دادا میاں نے تڑخ کر جواب دیا۔ "جی نہیں حضرت یہاں تو باہر سے آنے والوں کی آنکھیں کھول دی جاتی ہیں"۔ اشارا اس بات کی طرف تھا کہ کانگریس کے ایک جہاتے اس بستی سے الکشن ہار گئے تھے ــــــ

اس واقعے کے بعد پنڈت پنت جب بھی اس بستی میں آتے دادا میاں سے سہم کر ملتے، اور صاحب دادا میاں بھی اُن سے کیوں دبتے۔ پرانے قوم پرست تھے۔ نہرو، گاندھی کے ساتھ جیل گئے تھے ہاں یہ ضرور ہے کہ اوروں کی طرح وہ اپنی قربانیوں کی قیمت وصول کرنے اور کانگریس کے ٹکٹ کی بھیک مانگنے کہیں نہیں گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پنت جی کے بارے میں یہ قصہ اب یو پی کے تقریباً ہر دادا میاں کے سلسلے میں سننے میں آتا ہے۔ مگر خبر ملی ہے کہ حیدر آباد مرحوم میں بھی کئی دادا میاؤں نے یہی جواب آندھرا پردیش کے کسی وزیر اعلیٰ کو دیا تھا ــــــ

دادا میاں لوگ سیر و شکار کے بھی شوقین ہوتے ہیں اور دس دس ہاتھ لمبے شیر شکار کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ چنانچہ دو تین دادا میاؤں کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ ان کی لڑکی کی شادی کے موقع پر شہر میں قصائیوں کی ہڑتال تھی۔ "دادا میاں کو غصہ آ گیا اور بندوق لے کر نکل گئے پھر شام کو جو واپس آئے تو جو جی شکار شدہ نیل گایوں۔ ہرنوں اور مرغابیوں کے گوشت سے پٹ گئی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو چالیس پچاس جیپوں پر لاد کر جانور لائے تھے۔ تین دن تک بارات کا کھانا اسی گوشت

www.taemeernews.com

سے پکا۔ بعد میں قصائیوں کے لیڈر شیخ تفضل کو جب معلوم ہوا تو دادا میاں کے پیروں پر گر کر معافی مانگتا رہا۔"

دادا میاں اکثر ترک وطن بھی کرتے ہیں یا ان کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ اگر حسن اتفاق سے کوئی "دادا میاں منصف۔ تحصیل دار۔ یا ڈپٹی کلکٹر قسم کی چیز ہو گذرا تو پھر درجنوں "منڈ لکر"[1] بھی ان سے منسوب اساطیری روایات قلم بند کرنے سے قاصر رہیں گے ــــــ

خود" ہمارے "دادا میاں حضرت قبلہ غلام صورت بزدل پوری مرحوم و مغفور (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) بڑے ٹھسّے کے بزرگ تھے۔ "بزدل پور میں پیش کار تھے۔ کچہری دربار میں پوچھ تھی۔ انگریز منصف خود ان کو کرسی پیش کرتا تھا۔ جب تبادلہ ہو کر گاؤدی پور جانے لگے تو بزدل پور میں کہرام مچ گیا۔ چاروں طرف صفِ ماتم بچھ گئی لوگوں نے منتیں کیں کہ وہ نہ جائیں۔ اور نواور ابہریا چیرمین صاحب نے ان کے پیروں پر ٹوپی رکھ دی اور خوشامد کرنے لگے کہ حضور آپ نہ جائیں آپ ہی کے دم سے تو یہ بستی گلزار تھی۔ آپ نہیں تو پھر اس کا کیا ہوگا ــــــ

دادا میاں کے قدموں پر عام طور پر معززین و عمائدین اپنی ٹوپیاں ضرور رکھ دیا کرتے ہیں ــــــ

راقم الحروف جس کا سن صرف پانچ یا چھ سال تھا اس بارے میں اتنا ضرور جانتا ہے کہ کسی حادثے یا اتفاق کے تحت دادا میاں کا شملہ چیرمین صاحب کے پیروں کی طرف پھسل پڑا تھا۔ شاید ہوا تیز تھی یا ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ بہرحال بہت پرانی بات ہے۔ اب تفصیل کس کو یاد۔ ہاں ایک جملہ یاد ہے جو ابیریا چیرمین صاحب نے کہا تھا ــــــ

" دل۔ ام کچھ نائیں کرنے سکتا۔ ٹم کا یہاں گنجاسش نائیں ہے" ــــــ

چونکہ دادا میاں بھی خدا رسیدہ اور ولی اللہ ہوتے ہیں اس لیے حج بھی "کئی بار" کر چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے دادا میاؤں کا جب انتقال ہوتا ہے تو ان کے چہروں پر ایک خاص ایمان افزا نور برستا ہے اور ان کی قبروں سے ایسی عجیب و غریب اور تیز خوشبو نکلتی ہے کہ دنیا کی کسی چیز سے اس کا تقابل بیکار ہے۔ بس معلوم ہوتا ہے جیسے جنت کا در کھُل گیا ہو ــــــ

اس قسم کے اولیاء اللہ دادا میاؤں کی ساری عمریں۔ دراصل خفیہ پولس کو اطلاعات بہم پہنچانے، جعل سازی کرنے اور بے ایمانی میں ملوث ہونے یا ناجائز منشیات کی درآمد برآمد میں گذر جاتی ہیں اور چونکہ وہ گھر میں۔ "اللہ کا دیا بہت کچھ" چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی درویشی اور ولی صفتی کے افسانے دور دور تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس قماش کے ایک دادا میاں کے بارے میں سُنا ہے کہ دنیا سے ان کا علاقہ صرف دن بھر کا تھا ورنہ سورج ڈوبتے ہی وہ ایسے یاد اللہ میں کھوتے کہ خود اپنا ہوش ہی نہ رہتا بس تہجد پڑھا کرتے ــــــ

اس طرح کے دادا میاں حج کے ساتھ خدمت خلق کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ لہٰذا حج سے واپسی پر متعدد گھڑیاں۔ لائٹر اور ٹرانزسٹر وغیرہ بطور تبرک ضرور ساتھ لاتے ہیں اور برائے نام ہدیے کے عوض حاجت مندوں کو تقسیم کرتے اور عنداللہ ماجور ہوتے ہیں ــــــ

---

[1] منڈ لکر جی نے ایک لاکھ ایک جلدوں پر مشتمل "مہاتما" کی دیومالا رقم کی ہے۔ خاصی Homeric چیز ہے ــ

www.taemeernews.com

اسی نوع کے ایک دادا میاں جب گیارھویں حج کو جانے لگے تو پسر اکبر نے جو خود بھی اطراف و جوانب میں بڑی خوبیوں کے بزرگ مانے جاتے تھے، دفوراً ہیجان سے بے قابو ہو کر والد کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگے ــــــ

"حضور ابا۔ کہاں چھوڑ کر جا رہے ہو، اس عاصی پُر معاصی کو۔ قسم سے میرا دل اس دنیا سے اُچٹ گیا ہے بابا مجھ کو بھی لے چلو۔ اب یہاں دل نہیں لگتا۔" وغیرہ وغیرہ

دادا میاں کا دل بھر آیا۔ خاصی کشیدگی کے باوجود پسر اکبر کو گلے سے لگا لیا اور سوچا کہ شاید اس بہانے ان کی بھی عاقبت سنور جائے۔ چنانچہ مخصوص ذرائع استعمال کر کے علاقائی حج کمیٹی سے ایک ٹکٹ فرزند دل بند کا بھی حاصل کر لیا ــــــ

مگر ہوا یہ کہ مکہ معظمہ میں عین اس وقت جب دادا میاں خانۂ کعبہ کے طواف میں مصروف تھے، صاحب زادۂ بلند اقبال نے ان کا ٹینٹوا پکڑ لیا اور کہا:۔

"اب بتاؤ ابا۔ کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس اور کہاں گاڑ کر رکھا ہے۔ یہاں تو میاں جی جھوٹ نہ بول پاؤ گے ــــ"

دادا میاں مرحوم و مغفور ایک ثانیے کو سراسیمہ ہو گئے۔ مگر پھر بھی باپ تھے۔ نورِ چشم کے ہاتھ شکست کیسے تسلیم کرتے ــ فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑے ــــــ

مگر دادا میاں کی اس برجستگی اور فرزند والا صفات کی جنبش کے بارے میں یہ سب باتیں حاسدوں کی اُڑائی ہوئی ہیں ــ ورنہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے مرحوم بڑے استدو سے لوگ تھے۔ اگر انکساری نہ ہوتی تو اولیا میں ہوتے ــــــ

دادا میاؤں کی خوبیوں اور ان کی ہمہ گیر خصوصیات کو قلم بند کرنے اور ایک روشن روایت کی شکل میں محفوظ کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ راقم الحروف جو خود بھی ستر بہتر کے پیٹے میں ہے۔ متمنی اس بات کا ہے کہ اس کے زہد و اتقا، علم و فضل، اوصاف مردانہ اور جرأت کردار کی مثالیں دے کر نئی نسل کو گمراہی سے بچایا جا سکے ــ

عتیق احمد

اردو تنقید کا ایک معتبر نام

استفادہ

عتیق احمد کے تنقیدی مضامین کا نمایندہ مجموعہ

(زیر طبع)

www.taemeernews.com

مقصود الٰہی شیخ

توڑ دو دیواریں

یہ گول میز والوں کا ماہانہ ڈنر تھا۔ میرے بالکل سامنے جمی بیٹھا تھا۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ ایک بار پھر ہم یک جا ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر ان جان بن بیٹھے۔ میں اپنے میزبان سے بدستور باتیں کرتا رہا۔ اس ڈنر میں مجھے میک اونیل نے گول میز والوں کی طرف سے مدعو کیا تھا اور یہاں مجھے گورے لوگوں کو کالے لوگوں کے بارے میں بتانا تھا تاکہ باہمی سمجھ کاری میں مدد ملے ——

وجہ خود نہیں جانتا یہ میری عادت ہے۔ بات کچھ کرنی ہوتی ہے، کہنے کچھ اور لگتا ہوں۔ اب دیکھیے ذکر جمی کا شروع کیا۔ بیچ میں۔ میں نے اور فوراً ہی رخ میک کی طرف پھیر دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا اپنا تعارف پہلے کراؤں، جمی سے جانکاری مناسب ہے یا میک کا اتہ پتہ دوں، بڑی مشکل ہے۔ ڈنر کا قصہ گویا صاف ہی ہو گیا۔ لیکن گھبرائیے نہیں۔ وہاں میں نے کالا ہوتے ہوئے سفید فام، سفید کالر والوں کو کیا بتایا، یہ بعد کی بات ہے —— میں مقرر ہرگز نہیں ہوں۔ اس لیے تقریر سے نہ ان لوگوں کو بور کیا اور نہ آپ کو جمائیاں لینے پر مجبور کروں گا —— ذرا اتنا سوچیے انسانی رشتے کیا ہوتے ہیں؟ کیونکر قایم ہوتے ہیں؟ —— ان میں نفرت۔ حسد۔ جلن۔ انتقام کا عنصر کتنا اور کیوں ہوتا ہے، اور کس حد پر جا کر معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف محبت۔ ملن۔ دوستی۔ مسرت اور حوصلہ افزائی کی کارفرمائیاں کیا گل کھلاتی ہیں۔ بات تو یقیناً لمبی ہو گی، مگر پس منظر جان لینے کے بعد ابہام دور ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ ہے نا دلچسپ بات! میں پاکستانی ہوں۔ جمی انگریز ہے اور میک آئرش، حالانکہ اس کا عرف اسکاٹش ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ پھر یہ کیا دلچسپ نہیں، میں میک سے باتیں کرتا ہوں۔ سامنے جمی بیٹھا ہوا ور ہم ایک دوسرے کو یوں نظر انداز کریں، جیسے ایک دوسرے کو جانتے نہیں ——

میں Sixties میں انگلستان آیا۔ اس وقت جہاز بھر بھر کر پاکستان سے لوگ یہاں آرہے تھے۔ غرض میں بھی آگیا۔ معاف کیجیے گا میں اپنے ذاتی حالات بیان نہیں کروں گا۔ حسب عادت کہنے جا رہا تھا دیگر لوگوں کے آنے کی اور میری وجوہ مختلف تھیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور پھر عرض کیا نا، یہاں ذاتی حالات بتانے مناسب بھی نہیں۔ میرا تعارف یہی ہے کہ میں ایک امیگرنٹ ہوں جو رنگ کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ میں اپنے تئیں ایک انسان سمجھتا ہوں۔ انگریزوں کے بارے میں بھی یہی رائے ہے، پر سچ پوچھیے تو کتوں سے ان کا پیار دیکھ کر یہ مجھے اچھے خاصے خواجہ لوگ نظر آتے ہیں۔ میرا پہلا جنم کوئی ہوتا۔ میں ملکۂ

www.taemeernews.com

وکٹوریہ کے عہد میں آیا ہوتا تو شاید مائی باپ سمجھتا۔ اب تو انگریز اپنی ہی طرح کے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ رنگت سفید ہے۔ اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اگر کالوں میں احمق۔ سڑی اور چڑیا ہوتے ہیں تو ان گنہگار آنکھوں نے بہت سے پھٹیچر مہا بیوقوف۔ ڈرٹی اور پاگل انگریز بھی دیکھے ہیں جو انڈیا سے واپسی پر نہیں، پہلے سے یوں ہیں ——

—— تو صاحب یہ یوں ہوا ——

جمی کی بات یوں ہے۔ میں بڑا خوش نصیب تھا۔ کرسمس کی چھٹیوں میں ساتھی طلبہ کے ساتھ ڈاک تقسیم کرتے کرتے یہاں کی خنک ہواؤں، کھلی فضاؤں میں رنگ برنگے دروازوں پر دستک دینا اتنا بھایا کہ پوسٹ مین بن گیا۔ دیکھا جائے تو کالوں میں یہ نسبتاً معزز پوسٹ تھی۔ لیکن ایک روز اپنے گرائیں سے ملاقات ہوگئی۔ میری اچھی خاصی نوکری تھی، مگر اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں Refuse Collector ہوں۔ ذات برادری کا ڈر بعض اوقات تعمیری کام بھی کرادیتا ہے چنانچہ مارے غیرت کے میں کوشش کرکرا کے سول سروس کا امتحان پاس کر بیٹھا۔ اور کلریکل آفیسر ہوگیا۔ اپنے وہاں صرف اونچے خاندان کے نورچشموں کے نام کے ساتھ آفیسر لکھا جاتا ہے تاکہ طبقاتی امتیاز برقرار رہے۔ وہاں کلرک ہوتا ہے۔ چپراسی۔ چوکیدار ہوتا ہے سپاہی ہوتا ہے۔ یہاں کلریکل آفیسر۔ سیکوریٹی آفیسر اور پولیس آفیسر کہا جاتا ہے۔ سماجی حیثیت سب کی برابر۔ ڈسٹ بن مین۔ بریڈ مین۔ بلکہ یُن سب اپنے میں مگن۔ اپنی اپنی یونین اور ٹریڈ میں اہمیت رکھتے ہیں اور کوئی اونچ نیچ نہیں۔ وہاں آپ ڈبل روٹی والے کو بھنگی اور دودھ والے کو گوالا کہہ کر تو دیکھیے یا ایک دوسرے کے برابر جا بیٹیے، سب بھاؤ معلوم ہوجائیں گے ——

غرض اپنی برادری میں میں پہلا آدمی تھا جس نے انگلستان میں سول سروس جوائین کی۔ بہت سوری، میں پھر اپنا ذکر لے بیٹھا — دراصل یہ "میں" نہیے ہی بہت سے فتنوں کی جڑ۔ اپنا جمی بھی ڈاک خانے میں کام کرتا تھا اور اتنا ناشکرا تھا، قطعی محسوس نہ کرتا کہ میں سول سروس کا آدمی ہوں۔ مجھ سے صاحب، بڑی خار کھاتا۔ مجھے دیکھا اور لال بھبوکا ہوا۔ آپ نے کبھی اس کے بھائی بند کو دیکھ کر لاحول نہ پڑھی ہوگی۔ میں نے بھی کبھی اس جرم کا ارتکاب نہ کیا پر صورت حالات یہ تھی۔ جمی نے مجھے دیکھا اور اِدھر اُدھر کھسک لیا۔ پہلے پہل جان ہی نہ پڑا کہ آنجناب پہ حضرتِ بادل کا سایہ ہے۔ میں کرسٹی دکھاتا وہ کسرِ شان گردانتا، میں اُس کا دل جیتنے کی کوشش کرتا وہ جل بھُن جاتا۔ میرے سائے سے بھاگتا۔ میں اس کی خاطر سنوار سنوار کر انگریزی بولتا، وہ جھنجھلا جھنجھلا جاتا۔ انھیں دنوں بدقسمتی سے میرا سپروائزر تعطیلات پر چلا گیا اور مجھے اپنا کام جمی کو دکھانے کے لیے کہہ گیا۔ ہم لوگ بڑے محنتی ہوتے ہیں اس لیے میں خوش تھا۔ جمی کو قائل بلکہ مائل کرلوں گا۔ ممکن ہے میرے کام میں غلطیاں ہوتی ہوں، اس نے کبھی ٹوکا نہیں، مگر خوش ہو کے کبھی نہ دیا۔ میرا کام چیک کرتے ہوئے کئی کئی رنگ بدلتا۔ ان ایام میں وہ خود کلامی کا شکار بھی ہوگیا تھا۔ واگس۔ پس آف۔ بلیک سوائین وغیرہ وغیرہ ——اور وغیرہ مختلف لے میں کہتا سنائی دیا۔ ایک روز میں نے اٹھ کر نظر بھی دوڑائی کہیں۔ کالا۔ بھورا یا سفید سور دکھائی نہ دیا۔ دوگ کے بنڈل بھی ڈاک میں پڑے نظر نہ آئے —— یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا، وہ بزدل گالیاں دیتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے انگریزی کی ایک عام سی موٹی سی گالی آتی تھی جس کے آخر میں off ہے۔ مگر یہ تو تہذیب سے گری ہوئی گالی تھی —— اس روز جب میں نے پوچھ ہی لیا کہ جمی یار کس سے باتیں کر رہے ہو —— تبرے ہونٹ کاٹنے۔ چبا چبا کر بولا۔ "گٹ آف ——" میں اسٹول سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ اور سٹر خا گیا۔ میں قریب جانے لگا تو سہمے سہمے جمی نے اپنا اسٹول میری جانب لڑھکا دیا۔ میرا گھٹنا اُتر گیا۔ یہ اتفاق ہوگا، مگر بے حد تکلیف ہوئی۔ میں درد سے بلبلاتا رہا۔ اُس کافر نے یقین کرکے نہ دیا۔ اُلٹا میری شکایت لگا آیا کہ میں اُسے مارنے کے لیے اٹھا تھا، اور کچھ

www.taemeernews.com

عرصے بعد وہ ہمارے دفتر سے ہی چلا گیا ——— میں بھی زندگی کی دوڑ میں کہاں سے کہاں نکل گیا ——
آج کئی سال بعد ہم اس گول میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے ——

رہ گیا میک — کمپنی ڈائرکٹر ہے — ہم ایک ہی گلی میں رہتے ہیں — میرے مکان کا نمبر ۴۲ ہے اور اس کا ۲۴ — کرسمس پر طلبہ ڈاک تقسیم کرتے سمے بھول سے اِدھر کے خطوط اُدھر ڈال جاتے ہیں — ایسے ہی خطوں کا تبادلہ کرتے کرتے ضروری مسکراہٹ اور رسمی ہیلو بڑھتے بڑھتے دوستی میں بدل گئی — آج میک دائیں ہاتھ بیٹھا کیسا خوش نظر آرہا ہے — گول میز پر پہلی بار ایک کالا مدعو کیا گیا ہے اور وہ بھی اس کی معرفت — میں جانتا ہوں اتنا اچھا آدمی مربیانہ انداز اختیار نہیں کر سکتا، وہ تو سادگی سے کہہ رہا ہے "آج ہم لوگ تم سے بہت کچھ سیکھیں گے ——"

یہ سب کہہ چکنے کے بعد — آمدم بر سرِ مطلب ——

آپ تو جانتے ہیں ایسے موقعوں پر کیا ہوتا ہے — چیرمین نے مجھے خوش آمدید کہا — میک نے خلوص کے ساتھ میرا تعارف کرایا جس میں میری چارمنگ بیگم کا ذکر بھی تھا — خدا کا شکر ہے وہاں کوئی اور پاکستانی بھائی نہ بیٹھا تھا، ورنہ بڑی غیرت آتی اور کیا کیا نہ افسانے بنتے — اس کے بعد میں کھڑا ہوا، عرض کر چکا ہوں مقرر نہیں ہوں — تقریر لکھ کر لایا تھا — اٹھتے ہوئے تقریر جیب سے نکال بھی لی تھی، پھر جانے کیا خیال آیا — کاغذ دہرا کر کے میز پر پڑے گلاس کے تلے دبا دیا — بہتوں کی توجہ پہلے ہی میری طرف تھی، اتنے وقفے میں باقیوں کی نظریں بھی مجھ پر مرکوز ہو گئیں — میں نے جو کہا، سب نے سُنا اور سُننے کا انگریزوں کی طرح حق بھی ادا کیا — مجال ہے چڑیا نے پر مارا ہو ——— آپ کے دل میں کرید ہو رہی ہو گی ——— میں نے وہاں کیا کہا؟ خاص موضوع تو تھا نہیں — مناسب لفظوں میں تمہید باندھی — آپ نے میری عزت افزائی کی ہے — مجھے بڑی محبت سے یہاں بلایا ہے — آپ میرے ہم وطنوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں — کیونکہ Ignorance سے خواہ مخواہ تعصب پیدا ہوتا ہے — تعصب کوئی صفت نہیں — برائی ہے — اس کے کارن قوموں کا امن و امان تباہ و برباد ہو جاتا ہے ——— تعصب کا کوئی رنگ نہیں ہوتا مگر لہو پانی کی طرح بہانے کی قوت رکھتا ہے ——— آج میں اپنے بھائی بندوں کے بارے میں کچھ بتانے کی بجائے کیوں نہ یہ بتاؤں کہ میں نے اتنے سال یہاں رہ کر آپ لوگوں سے کیا سیکھا ہے؟ ——

بولتے بولتے میں نے اندازہ لگایا کہ گول میز کے اردگرد بیٹھے ہوئے یہ احباب میں خاصی دلچسپی سے میری باتیں سن رہے ہیں — میں چاہے سو فی صد سچی باتیں کرتا تب بھی اپنے اخبارات کے مقابلے میں انہیں میرے بیان پر شبہ رہتا، اور میں جانتا تھا نفسیاتی طور پر آدمی اپنے آپ سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے — اس ایک مختصر سی تقریر میں وہ ہماری تہذیب یا کلچر کے بارے میں کتنا کچھ جان پاتے — اس نفسیاتی گُر کو سامنے رکھ کر میں بولتا چلا گیا — آپ لوگ خندہ پیشانی سے نکتہ چینی سنتے ہیں — غیروں کو ان کی معاشرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں — ان کو اپنے میں مدغم کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں — ملکہ کے وفادار ہوتے ہوئے جمہوریت کے لیے کام کرتے ہیں — یہ سب کتنی اچھی باتیں ہیں — میں نہیں کہتا مسائل نہیں ہیں — زبان کا — رنگ کا — حصول ملازمت کا اور رہایش کا مسئلہ ہے — اونچ نیچ کا مسئلہ — کھانے پینے کی عادات میں فرق ہے — رہن سہن کا طرز الگ ہے — مرن کے — سنجوگ کے — غمی اور خوشی کے دستور جدا جدا ہیں — آپس میں میل ملاپ کے آداب مختلف ہیں — لیکن جیسے میں آپ کے درمیان کھڑا ہوں — میں رنگ دار، آپ سفید فام، مگر ہم میں ایک دوسرے کے ساتھ ان کہا عقلی سمجھوتہ ہوا ہے — ہم نے ایک دوسرے کو Accept کیا ہوا ہے جو جیسا ہے اسی طرح اور

www.taemeernews.com

مہذب لوگوں کی طرح اس گول میز پر بیٹھے سوچ بچار کر رہے ہیں۔ اگر کالوں کو اچھے رہائشی مکانات نہیں ملتے۔ ملازمت کے حصول میں رکاوٹیں ہیں۔ برابر کا درجہ نہیں دیا جاتا، تو کیا تمام گوروں کے پاس یہ سب سہولتیں ہیں؟ کیا ان کا استحصال نہیں ہو رہا؟ ان میں طبقاتی کشمکش نہیں؟ ہے، تو یہ سب کالے گورے کے مسائل نہ ہوئے یا کالوں اور گوروں کی پرابلم نہیں۔ عوام کے "انسانوں کے" انسانیت کے مسائل ہیں۔ یہ مل جُل کر ہی حل ہو سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم مل جل کر ان کو حل کرنے کی کوشش کریں؟ فرار یت کسی بھی چور دروازے سے اختیار کی جائے، مشکلات کے حل میں، عملی تخلیق میں مدد نہیں کرتی Talerance.understanding Acceptance اور پلاننگ ——— میں نے یہاں آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے اگر یہ تجویز کروں کہ مہربانی کر کے ملک کی رنگ دار آبادی سے سابقہ پڑنے پر مذکورہ مسائل اور خصائل فراموش نہ کریں تو کیا یہ بہت مشکل کام ہوگا؟؟ صاحبان محبت فاتح عالم ہے ——— !!

معلوم ہوتا تھا میں نے کوئی بہت کٹھن معاملہ ایک ساعت میں درست کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر گتھی سلجھا دی۔ ہر مشکل اور پیچیدگی دور کر دی۔ خوب تالیاں بجیں۔ میں کھڑا پائپ پیتا رہا۔ تالیوں کے بعد وہ سب پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا تھا۔ منہ سے پائپ نکال کر "شکریہ" کہا اور بیٹھ گیا۔ اب کے تالیوں کے سنگ قہقہے بھی سنائی دیے۔ ممکن ہے کوئی مجھے بہروپیا کہے۔ میرے ہم وطن ٹوڈی سمجھیں۔ ایک موقع ملا تھا۔ کھری کھری کیوں نہ سنائیں؟ یقین مانیے میرے نزدیک محبت ایک بہت بڑی قوت ہے۔ اس کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ وہاں میں جہاد کرنے نہیں گیا تھا ڈنر پر گیا تھا۔ لوگوں کے دل جیتنے گیا تھا۔ اس وقت اس ماحول میں میرے دل نے جس بات پر آمادگی محسوس کی میں نے وہی کہا۔ مجھے خوشی ہے وہاں تعلیم یافتہ، باشعور پروفیشنل اور ہنرمند لوگ بیٹھے تھے جنھوں نے کشادہ دلی سے میری معروضات سنیں، اور کیا چاہیے تھا ———

اس کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔ میں نے میک کے کان میں سرگوشی کی۔ میک نے چیرمین سے کچھ کہا۔ میں یہ دوستانہ تاثر زائل نہ کرنا چاہتا تھا اس لیے درخواست کی تھی کہ صرف ایک سوال پوچھا جائے ——— یہ بھی بہت پُر لطف لمحات تھے۔ وہاں موجود تمام حاضرین میں سے صرف ایک سوال کر سکتا تھا ———

جمی سے ہٹ کر تین آدمیوں بعد چوتھے فرنچ کٹ داڑھی والے نوجوان نے چیرمین سے اجازت لیتے ہوئے سوال کیا ———

"آپ کی تقریر سراسر ذاتی مشاہدات پر مبنی تھی اس لیے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کیا آپ کے ساتھ بھی کبھی تعصب برتا گیا؟ رنگ کی وجہ سے تنگ کیا گیا؟ پریشان کیا گیا؟ کوئی بے انصافی ہوئی ——— ؟ آپ نے نفرت کا چہرہ دیکھا ہے؟" ———

میں اپنی نشست سے وہیں سے اٹھا۔ پائپ ایش ٹرے میں رکھا اور دھیرج سے کہا، "نہیں" ———

نہ معلوم کس جذبے سے اتنا بڑا سفید جھوٹ اتنی آسانی سے بول گیا۔ میں نے دیکھا جمی کے چہرے کا رنگ جلدی جلدی بدلنے لگا ——— میں نے پائپ اٹھا کر دیا سلائی روشن کی۔ تمباکو جلایا اور دو کش لیے۔ آپ مجھے ایکٹر کہہ لیجیے مگر یہ سب قدرتی انداز میں ہو رہا تھا۔ نہ معلوم اس سے مجھ پر کس کا سایہ تھا ——— ؟

سب منتظر تھے میں وضاحت میں مزید کچھ کہوں گا۔ میں نے صرف اتنا اضافہ کیا "جواب میں دے چکا۔ دوسری تقریر کر کے آپ کو بور نہیں کروں گا ——— May be, I am the luckiest one اور بیٹھ گیا ———

سب تحیر میں ڈوب کر وقت بخیر گذشت کا تاثر چہروں پر سجائے چیرمین کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میک تو بے حد مسرور تھا۔ اُس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا گویا آج سے نیا دور شروع ہونے کو ہے Excuse me

عقب سے ایک آواز اُبھری——

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جمی مسکرا رہا تھا۔ سالا انگریز تھا نا بالکل Native انداز میں بولا:

Hello Stranger میں نے بھی کوکنی لہجے میں جواب دیا——

Long time No see جمی نے میک کو Waire کیا اور میرا بازو تھام کر بولا "چلو"—— باہر نکلتے ہوئے اس نے مشورہ سنایا۔ My wife makes very good coffee come and have some۔ میں آخر ایشیائی تھا۔ گومگو میں پڑ گیا۔ اگر ملاپ مقصود تھا تو عندلیب بن کر گلے لگتا۔ آہ وزاری ہوتی۔ چھلل چھلل آنسو بہائے جاتے۔ اچھا خاصا ڈائیلاگ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن صاحب —— کچھ نہیں—— چلو چل کر ہمارے ساتھ کافی پیو—— جذبات کے کارن گلے میں پھندا سا لگتا دکھائی پڑا مگر بھائی جیسا دیس ویسا بھیس۔ جذباتیت لپیٹتے ہوئے جتایا——

Me too جمی نے ہم قدم ہوتے ہوئے کہا. But you know I take black coffee

ہوٹل کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے جان پڑ رہا تھا ہمارے قدموں تلے بہت سی دیواریں بیٹھتی جا رہی ہیں ——

ممتاز افسانہ نگار

مقصود الٰہی شیخ

کے افسانوی مجموعے

پتھر کا جگر

برف کے آنسو

جھوٹ بولتی آنکھیں

ملنے کا پتہ:-

ہفت روزہ "راوی" ۲۷۱ تھارنٹن روڈ بریڈ فورڈ—— (انگلینڈ)

www.taemeernews.com

ش۔ صغیر ادیب

کتا، بھوک اور گالی

چھوٹا بچہ ریں ریں کیے چلا جا رہا تھا۔ بڑا بچہ صحن کے کونے میں بیٹھا اسے پیلی پیلی گرسنہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ مہرن نے بیزاری سے ان دونوں کو دیکھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ پھر اس نے خالی خالی نگاہوں سے باہر آنگن میں دیکھا۔ دھوپ، شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔ ہر طرف ایک عجیب سی، دل پر غمناک بوجھ طاری کر دینے والی اداسی اور نحوست طاری تھی۔ آسمان پر بادل کے اکا دکا ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ اور سامنے والے برگد کے درخت پر چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ ان کم بختوں کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ مہرن نے سوچا۔ پھر کروٹ بدل کر لیٹ گئی، اور چھوٹے بچے کو دیکھنے لگی جو بدستور ریں ریں کیے جا رہا تھا۔ اس کے ننگے بدن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور پانی جیسی پتلی ناک بہہ کر ٹھوڑی تک پہنچ رہی تھی۔ مہرن چند لمحے اس کے پچکے پیٹ اور ابھری ہوئی پسلیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر نفرت اور جھنجلاہٹ کے ساتھ بولی:

"ارے چپ ہو جا حرامی، چپ ہو جا ——"

لیکن وہ چپ نہیں ہوا۔ ریں ریں کرکے روتا رہا ——

مہرن پھر کچھ نہیں بولی۔ بس چپ چاپ اسے دیکھا کی۔ دراصل اسے بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بڑی تکلیف ہوتی تھی بولنے سے۔ اس کے سینے اور پسلیوں میں بڑا درد ہو رہا تھا اور سارے جسم میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ سر کے اندر چھوٹے بڑے دائرے بن رہے تھے اور بگڑ رہے تھے۔ اتنی بے چینی اور وحشت اور بے کلی کہ ایک لمحے کے لیے چین نہ تھا۔ کروٹ بدلتی تو جان اچھل کر حلق میں آ جاتی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے سوکھے ہوئے سیاہ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ہاتھ اٹھا کر کنپٹی کھجائی۔ پھر اس کی نگاہ پھٹی ہوئی دھوتی پر پڑی۔ جس میں سے اس کی سانولی ران کا کچھ حصہ صاف نظر آ رہا تھا، مگر اس نے پروا نہیں کی۔ حاصل بھی کیا تھا۔ اس کا تو بلاؤز بھی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کی ڈھلکی ہوئی چھاتیاں کہیں کہیں سے دکھائی دیتی تھیں، مگر وہ کیا کرے۔ کوئی کپڑا ابھی تو ڈھنگ کا نہیں ہے۔ اس کی زندگی ایک سوکھے درخت کے کھوکھلے تنے کی طرح تھی۔ ہر چیز کھوکھلی ہو چکی تھی، خالی ہو چکی تھی۔ اناج کے ڈبے اور کپڑوں کے صندوق اور پیٹ اور تقدیر اور امیدیں، ہر شے خالی تھی۔ بالکل خالی تھی ——

پھر اس کی نگاہ بڑے بچے پر پڑی۔ وہ کونے میں اب بھی چپ چاپ بیٹھا تھا اور بدستور اسے گرسنہ اور شکایت بھری نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ وہ یکایک چڑچڑا گئی اور نفرت سے چیخ کر بولی ——

www.taemeernews.com

"کیا بات ہے، کیوں دیکھے جا رہا ہے مجھے ــــــ"

بڑے لڑکے نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں بیچارگی تھی اور گریہ اور التجا "اماں بڑی بھوک لگی ہے ــــــ"

وہ معاً چراغ پا ہوگئی ــــ "تو پھر، خون پیئے گا میرا، حرامی ــــ"

"اماں، تھوڑا سا کھانا ــــ" بچے کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی ــــــ

"کھانا کہاں سے لاؤں" اُس کا لہجہ نفرت انگیز تھا "تیرے باپ کی قبر سے ــــــ"

بچہ یہ سُن کر رونے لگا۔ وہ پہلے ہی برافروختہ ہو رہی تھی۔ بچے کے رونے سے بالکل ہی آپے سے باہر ہوگئی۔ یک لخت اُٹھی اور بچے کی پیٹھ پر دو تھپڑ جما دیے۔ وہ زور سے رویا تو چھوٹا بچہ اور بھی چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حرامی، سور کے بچے، ذلیل، کھانا کھائیں گے۔ کہاں سے لاؤں کھانا۔ میرا خون کیوں نہیں پی لیتے، حرامیو، میری بوٹیاں کیوں نہیں کھا لیتے، کتے کے پلو۔ اس نے ایک تھپڑ چھوٹے بچے کے بھی جڑ دیا۔ "چپ حرامی کے بچے۔ بدذات، ورنہ جان سے ماردوں گی۔"

بچے زور زور سے روتے رہے۔ وہ انھیں گالیاں دیتی رہی۔ دل کی بھڑاس نکلی تو اس کی آواز بھرّا گئی۔ آخر کار وہ اس کے بچے تھے۔ اس کے جگر کے ٹکڑے، اُس کی آنکھوں کے لال۔ اس نے انھیں اپنا خون پلا کر پالا تھا۔ راتوں کو ان کے لیے جاگی تھی اور ان کے ذرا سے دکھ پر نمازیں پڑھ پڑھ کر ان کا دکھ اپنے سر لینے کی دعائیں مانگی تھیں۔ چنانچہ پھر اس نے انھیں گلے سے لگا لیا اور سینے سے بھینچ لیا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــــــ

لیکن کھانا کہاں سے لائے، اور پیٹ کیسے بھرے۔ یہ پیٹ بھی بڑا ظالم ہے۔ کبھی نہیں بھرتا، خالی ہی رہتا ہے۔ اب بھی خالی ہے۔ مہینہ بھر پہلے بھی خالی تھا اور ایک سال پہلے بھی خالی تھا۔ حالانکہ اس نے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ سب ہی کچھ تو کر ڈالا تھا۔ اپنے سارے زیور بیچ ڈالے تھے۔ پھر برتن بیچ ڈالے تھے، پھر اچھے کپڑے بیچ ڈالے تھے - - - - - - - - - پھر بھی پیٹ نہیں بھرا تھا، حتیٰ کہ اس نے اپنی بڑی لڑکی کو بھی بیچ ڈالا تھا، قمرن کو، اس کی عمر آٹھ نو سال تھی۔ سانولی سلونی، خوبصورت، جیسے وحشی ہرنی، مگر سہمی ہوئی، گھبرائی ہوئی، جیسے بھرے جنگل میں اپنی ماں سے بچھڑ گئی ہو۔ وہ بھی بھوکی تھی اور کھانے کے ایک ایک لقمے کو ترس رہی تھی۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر قمرن کو بیچ ڈالا تھا۔ تاکہ قمرن کا بھی پیٹ بھر جائے اور بچوں کا اور اس کا اپنا بھی۔ خریدنے والا یہ وعدہ کر کے قمرن کو لے گیا تھا کہ اسے بھوکا نہیں رکھے گا۔ پھر وہ قمرن کو چٹاگانگ یا سلہٹ یا نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔ اور مہرن کے ہاتھ پر چند روپے رکھ گیا تھا۔ اب اس بات کو چھ مہینے ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں قمرن کا پیٹ بھرا تھا یا نہیں۔ مگر اس کا اپنا پیٹ تو نہیں بھرا تھا۔ ویسا ہی خالی تھا۔ ویسی ہی بھوک تھی اور بھوک کی جلن اور آنتوں کی اینٹھن، بلکہ اب تو زیادہ بھوک لگنے لگی تھی ــــــ

قمرن کا خیال آیا تو اسے یوں لگا، جیسے کسی نے اس کا دل ہاون دستے میں رکھ کر کچل ڈالا ہو۔ ایک بار پھر بلک کر رو پڑی۔ ہائے ہائے، اس کی بچی کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ کیسی سنگ دل اور بے غیرت ماں ہے وہ، ذرا بھی حیا نہ آئی۔ ذرا بھی دل نہ تڑپا۔ اور اس نے اپنی چاند سی بیٹی کو محض چند روپوں کے عوض بیچ ڈالا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ کوئی بھی تو راستہ نہ تھا۔ وقت نے ایک ایک کر کے سارے دروازے بند کر دیے تھے اور وہ بے کسی کے زندان میں اس طرح محبوس ہو کر رہ گئی تھی کہ کسی بھی روزن، کسی بھی در سے روشنی کی کرن اندر نہیں آتی تھی۔ تازہ ہوا کی لہر اندر نہیں آتی تھی۔ امید کی جھلک اور محبت اور ہمدردی اور اپنائیت کی

www.taemeernews.com

رمق اندر نہیں آتی تھی۔ بس اندھیرا تھا۔ مایوسی اور معذوری اور بے مہری کا اندھیرا اور نفرت اور تعصب اور دشمنی کا اندھیرا اور سازشوں کا اندھیرا۔ یہ اندھیرا اتنا دبیز تھا کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود کو دیکھنے کی کوشش کرتی، مگر دیکھ نہ پاتی ——

شاید اب مہرن کو پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا ہو مگر وہ اور دونوں بچے تو بدستور بھوکے ہیں ——

جانے یہ اندھیرا اور یہ بھوک کہاں سے آئی تھی ——

کبھی کبھی دن کس طرح رات میں ڈھل جاتے ہیں، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ کبھی کبھی ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ کیسے اچانک دردانگیز چیخ بن جاتی ہے، یہ بھی اسے معلوم نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ ہنستی رہی تھی۔ بچپن میں بھی اور لڑکپن میں بھی اور جوانی میں بھی۔ پھر شادی ہوئی تو وہ ہنسی کچھ اور نکھر آئی، جیسے کلی مست ہو کر گلاب بنتی ہے۔ پھر ایک ایک کرکے اس کی گود میں تین چاند طلوع ہوئے، اور تب وہ ہنسی گویا اس کی ذات کا جز بن گئی۔ ہمیشہ کے لیے گویا مستقل ہو گئی۔ یہ یقین اس کے دل میں بیٹھ گیا کہ وہ ہمیشہ ہنستی رہے گی، اور کیوں نہ ہنسے، اتنا چاہنے والا شوہر ملا ہے۔ اتنے خوبصورت بچے ہیں اور اتنا پیارا گھر ہے۔ ارے جسے یہ سب کچھ حاصل ہو وہ کیوں نہ ہنسے گا۔ اسے رونے، آنسو بہانے کی ضرورت ہی کیا ہے ——

تو گویا خوشی اور خوبصورتی اس کی لونڈی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ حسین بھی بہت تھی۔ اس کے کھلتے ہوئے سانولے رنگ میں مکئی کے ریشوں جیسی سنہری چمک تھی۔ ایسی چمک کہ نگاہ اس کے سراپے پر پھسل پھسل جاتی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ ان میں کاجل کی لکیر کھینچتی تو اور بھی کشادہ ہو جاتیں۔ ابھرے ہوئے عنابی ہونٹ تھے، جیسے گندم کا گداز سادانہ۔ جسم اتنا سڈول اور حسین کہ ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ چلتی تو لگتا، کہ صبح دم، ہوا کے شریر جھونکوں سے گندم کے خوشے لہرا رہے ہوں۔ بال پنڈلیوں کو چومتے تھے اور ان میں ہزاروں سلوٹیں، قیامت خیزشامیں بسیرا کیے رہتی تھیں۔ مسکراتی تو چاول کے دانے چمک چمک جاتے۔ کبھی جب اس کا شوہر اسد بہت خوش ہوتا اور مہرن پر بڑا پیار آتا تو کہتا ——

"ارے تو بڑی بدنصیب ہے ——"

"کیوں ——؟" وہ حیران ہوتی ——

وہ مسکرا کر کہتا —— "یہ تیرا حسن، یہ تیرا جمال، ارے کم بخت تو میرے پلے کیوں بندھ گئی۔ تجھے تو کسی محل میں ہونا تھا۔ جہاں سیکڑوں نوکر ہوتے، کاریں ہوتیں اور دولت ہوتی ——"

مہرن کو اپنے شوہر کی گالیاں گوارا تھیں۔ لیکن یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ ایک دم خفا ہو جاتی ——

"چلو ہٹو، مجھے نہیں اچھا لگتا یہ سب کچھ ——"

وہ ہنسنے لگتا۔ پھر چھیڑتا ——

چل تجھے ایکٹرس بنا دوں۔ اب تو ڈھاکے میں بھی اردو فلمیں بننے لگی ہیں۔ آسانی سے تو ایکٹرس بن جائے گی۔ اور سچ کہتا ہوں ایک بار تو فلم میں آ گئی تو اک دنیا تیری دیوانی ہو جائے گی۔ لاکھوں قتل ہوں گے۔ کوئی تیری مسکراہٹ پر مرے گا تو کوئی تیری چال پر۔ کوئی تیری کمر کی لچک پر شہید ہو گا تو کوئی ان بڑی بڑی آنکھوں پر ——"

وہ ہنس کر کہتی —— "اور اگر ایکٹرس بننے کے بعد میں نے تمھیں چھوڑ دیا اور محمد علی سے شادی کر لی تو ——"

یہ سن کر وہ خوب زور سے قہقہہ لگاتا۔ مہرن حیران ہو کر پوچھتی ——

www.taemeernews.com

"تم ہنس کیوں رہے ہو ـــــ"

"ارے تو بڑی بھولی ہے ـــ" وہ کہتا ـــ "سمجھتی ہے میں بیوقوف بن جاؤں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں تو مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے کسی بھی حال میں نہیں چھوڑ سکتی ـــ"

"اتنا بھروسہ ہے ـــ"

"ہاں، تو مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتی ـــ"

اور یہ سچ بھی تھا، مہرن واقعی اس سے محبت کرتی تھی ـــ

اسد چمڑے کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک دن کام پر گیا تو واپس نہیں آیا۔ بلکہ اس کی لاش آئی ـــ

اور تب پہلی بار مہرن کو پتہ چلا کہ ہونٹوں پر ناچتی مسکراہٹ کبھی کبھی کس طرح اچانک ایک دردناک چیخ بن جاتی ہے۔ اس نے کبھی سپنے میں بھی گمان نہیں کیا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا حادثہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات اسے معلوم تھی کہ ملک کے حالات خراب ہیں۔ لوگ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ عجیب عجیب نعرے لوگ لگا رہے ہیں۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دیکھتی کہ لوگ آزادی کے نعرے لگا رہے ہیں تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ اور وہ حیران رہ جاتی۔ ارے بھئی، ہم لوگ آزاد تو ہیں۔ اب اور کیسی آزادی چاہیے۔ ۱۹۴۷ء میں جو آزادی حاصل کی تھی اور الگ وطن بنایا تھا، وہ سب کیا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ ۱۹۴۷ء والی آزادی کے بارے میں مہرن نے بہت ساری باتیں سن رکھی تھیں۔ یہ کہ اس آزادی سے پہلے اس کے والدین صاحب گنج بہار میں رہتے تھے اور آزادی کے بعد ڈھاکے آگئے تھے تو گویا وہ بنگالی نہیں بہاری ہے۔ مگر مہرن کو اس سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ تو ڈھاکے میں پیدا ہوئی تھی اور صاحب گنج اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہر طرف آزادی کے نعرے لگ رہے تھے اور بنگالی بہاری کے درمیان ایک نظر نہ آنے والی دیوار کھڑی ہو رہی تھی تب بھی وہ مطمئن تھی۔ اسے ان سب باتوں سے کیا مطلب۔ اس کا وطن تو یہی سلونا بنگال ہے۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں، ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ جو نظریں نفرت انگیز ہو گئی ہیں وہ پھر مہر و محبت سے سرشار ہو جائیں گی۔ جو ہاتھ خنجر اٹھا رہے ہیں وہ پھر ایک دوسرے کو گلے سے لگا لیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ بلکہ ہوا یہ کہ ان ہاتھوں نے وہ خنجر اسد کے سینے میں اُتار دیا ـــ

اس کے بعد وہ خوبصورت ہنسی مہرن کے چہرے سے روٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں چلی گئی ـــ

پھر اندھیرا بڑھتا چلا گیا۔ ہر طرف پھیلتا چلا گیا اور ہر شے کو نگلتا چلا گیا۔ ساری مروت ختم ہو گئی، دوستی اور محبت ختم ہو گئی۔ پڑوس کا پاس نہ رہا۔ مہرن نے صاحب گنج کبھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اپنے بڑوں سے بہار کے فسادات کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ تباہی، بربادی اور قتل و خون کی لرزہ خیز داستانیں، جو مہرن کی ماں کچھ اس طرح سناتی تھیں کہ کلیجہ دہل جاتا تھا۔ مگر جب مہرن نے فساد اور پھر جنگ کی تباہ کاری دیکھی تو اسے لگا کہ اس کی ماں سراسر جھوٹ بولتی تھی، جس طرح گھر جلائے گئے اور لوگ قتل کیے گئے اور بچوں کو کاٹا گیا اور عورتوں کی آبرو لوٹی گئی۔ وہ تو زمین کا سینہ شق کر دینے کے لیے بھی کافی ہے۔ بہار کا فساد تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کم از کم اس وقت بہار کے مسلمانوں کے لیے ایک جائے پناہ تو تھی، یعنی وہ بھاگ کر پاکستان آ سکتے تھے۔ مگر ستم کی انتہا یہ ہے کہ بنگال کے بہاری تو جائے پناہ سے بھی محروم تھے۔ وہ صرف مر سکتے تھے سسک سسک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ مگر بھاگ کر وہی سرزمین جو کبھی ان کا گلستان تھی، اب وہی ان کا مقتل بھی تھی اور جائے پناہ بھی۔

www.taemeernews.com

پھر وقت کیونکر گذرا، یہ مہرن کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ سب کچھ ایک بھیانک سپنے کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا سپنا جو چیخوں اور آہوں سے بھرا ہوا تھا۔ خون اور پیپ سے بھرا ہوا تھا، نفرت اور دشمنی سے بھرا ہوا تھا اور پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ وہ بھوکی ہے۔ اس کے دونوں بچے بھوکے ہیں اور بھوک سے مجبور ہو کر وہ تمرن کو بیچ چکی ہے، مگر پھر بھی بھوکی ہے۔ ہر ایک وہی کیا! بھوکے تو سبھی تھے، پورا ملک، اور کھانے کو کچھ نہیں تھا، نہ مچھلی کا ٹکڑا، نہ چاول کی مٹھی، نہ دودھ کا قطرہ۔ بس ہر طرف صرف بھوک تھی اور کچھ بھی نہیں تھا ——

مہرن بہت دیر تک روتی رہی۔ دونوں بچے بھی روتے رہے۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔ غصے اور جھنجلاہٹ کا غبار ڈھل گیا تھا۔ اب اپنے معصوم بچوں پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ وہ اس کے لختِ جگر تھے۔ اس کی دھڑکن تھے۔ اس کی زندگی تھے۔ وہ انھیں کیسے دکھ میں دیکھ سکتی تھی۔ وہ دونوں بھوکے تھے، اتنے کہ ان کی آنکھوں میں گرسنگی پیدا ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیر سوکھ گئے تھے اور پسلیاں خزاں رسیدہ درخت کی خشک ٹہنیوں کی طرح نظر آتی تھیں، اور یہ سارا دکھ جھیلنے میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو معصوم اور بے زبان تھے۔ انھیں تو زبان اور صوبے اور آزادی کا مطلب بھی نہیں معلوم تھا۔ پھر بھی انھیں ان تمام جرموں کی سزا ملی تھی۔ وہ صرف ایک ہی بات جانتے تھے کہ وہ بھوکے ہیں ——

بالآخر مہرن اٹھی —— اب کوئی ٹرا ستہ نہیں تھا۔ صرف ایک ہی راستہ تھا اور اس نے طے کر لیا کہ اب وہ اس راستے پر بھی چلے گی۔ حالانکہ جب اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا تو اس کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ آنکھیں چھلچھلا پڑی تھیں۔ اسد غلط نہیں کہتا تھا کہ وہ اس سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتی تھی۔ خود کو اس کی امانت سمجھتی تھی۔ مگر یہ تصورات کی دنیا نہیں تھی۔ تصورات کے سارے شیش محل پاش پاش ہو چکے تھے ——

اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ چراغ کا تھوڑا سا تیل لے کر چہرے پر ملا۔ بالوں کو سلیقے سے سنوار کر جوڑا باندھا۔ پھر بکس سے وہ واحد کالی دھوتی نکالی جو کسی جگہ سے پھٹی نہیں تھی۔ ساری پہن کر اس نے خود کو شیشے میں اچھی طرح دیکھا۔ اب وہ بہت ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔ تیل کے طفیل چہرے پر تھوڑی سی چمک آ گئی تھی۔ ہر طرح سے مطمئن ہو کر اس نے چپل پہنی، بچوں سے جلد ہی آنے کا وعدہ کیا، اور گھر سے نکل پڑی ——

شام ہو چکی تھی، گلی میں سناٹا تھا اور ویرانی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مہرن چپ چاپ چلتی رہی۔ کچھ ایسے محتاط قدموں سے گویا چوری کرنے جا رہی ہو، نیم تاریکی اور سناٹے میں وہ گلی سے باہر آئی، اور سڑک پر ایک طرف چلنے لگی۔ سڑک پر بھی بے رونقی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شے بیوہ کے سہاگ کی طرح اجڑ چکی تھی۔ مہرن دھیرے دھیرے چلتی رہی۔ دھڑکتے دل کو سنبھالتی، اپنا حوصلہ مضبوط کرتی، معمولی بات نہیں تھی۔ بہت بڑی بات تھی، جس نے کبھی دل میں بٹھایا تھا اب اسی کے در پر بھکاری بن کر جانا ایسا ہی تھا جیسے خود اپنے ہاتھ سے اپنی شہ رگ کاٹنا اور وہ بھی کند چھری سے ——!

مگر مہرن کو یقین تھا کہ چاہے ساری دنیا بے مہر ہو چکی ہو، پر شمس نہیں ہوگا۔ وہ تو بہت نیک انسان تھا۔ بڑا سادہ، مخلص اور شریف، وہ ان دنوں کو بھولا نہیں ہوگا جب مہرن اس کے لیے سب کچھ تھی۔ وہ مہرن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہر لمحہ بے قرار رہتا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے سے اس کے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ مہرن کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ اور شطرنج کے شوق کو بہانہ بنا کر اس کے والد کا دوست بن گیا تھا۔ دونوں بیٹھے شطرنج کھیلا کرتے اور مہرن کو بھی

www.taemeernews.com

چائے، کبھی پان اور کبھی پانی لانا پڑتا۔ وہ اسے دیکھتا رہتا اور نثار ہوتا رہتا۔ ایک بار اس نے مہرن سے کہا تھا___

"اگر تم نہ ملیں تو دیکھ لینا، تمھارے غم میں آخر کار ایک دن مر جاؤں گا___"

مہرن کو اس سے محبت نہیں تھی۔ مگر نفرت بھی نہیں تھی۔ وہ تو ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اگر شمس سے اُس کی شادی ہو جاتی تو بھی وہ خوش رہتی اور یقیناً اس سے محبت بھی کرنے لگتی کہ اس کی گھریلو روایات نے اسے یہی سکھایا تھا۔ مگر اس کی شادی اسد سے ہوگئی اور پھر اس کے لیے اسد ہی اس کے جسم و جان کا مالک بن گیا۔ اس کی شادی سے شمس کو واقعی دکھ ہوا تھا، اتنا کہ شکستہ دل ہو کر وہ مکان ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شمس یہ سب کچھ ابھی بھولا نہیں ہوگا۔ مہرن اسے بے شک نہیں ملی تھی، مگر وہ مہرن سے محبت تو کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ شمس کی محبت اب بھی زندہ ہوگی:

بالآخر وہ ایک تاریک سی گلی میں مڑی اور کچھ دور چل کر اچانک ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی موجود ہے۔ مہرن نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ تب مہرن نے ہاتھ اٹھا کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی___

وہ لمحے بے حد گراں تھے۔ قیامت کہیں آس پاس ہی موجود تھی۔ کم از کم اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ پھر اس نے قدموں کی چاپ سنی، کنڈی گرنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا، اور تب یکایک مہرن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ چہرے پر پسینہ آگیا۔ ہاتھ کانپنے لگے، اور جان اُچھل کر حلق میں آگئی۔ کیونکہ سامنے شمس کھڑا تھا___

"تم___" وہ متعجب ہو کر بولا___

مہرن نے کچھ نہیں کہا۔ بس تھوک سے حلق کو تر کرنے کی سعی ناکام کرتی رہی___

شمس کچھ اور کہے بغیر مڑ گیا۔ اس نے مہرن کو اندر آنے کے لیے نہیں کہا، وہ خود ہی اندر چلی گئی۔ صحن میں چٹائی بچھی تھی، اور اس پر کھانے کی تھالی دھری تھی، تو گویا اس وقت شمس کھانا کھا رہا تھا۔ صحن کے نیچے آنگن میں شمس کا کتا بیٹھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کانوں والا، گندہ چتکبرا تھا۔ اس نے بے حد اجنبیت کے ساتھ ایک نگاہ غلط انداز مہرن پر ڈالی اور پھر شمس کو دیکھنے لگا۔ شمس چٹائی پر بیٹھتا ہوا بولا___

"کیا بات ہے___"

مہرن نے لمحہ بھر توقف کیا۔ پھر ننگی زبان تلوار کی دھار پر رکھ دی___ "شمس، مجھے ایک روپیہ دے دو___"

شمس نے روٹی کا ایک ٹکڑا کتے کی طرف اُچھالا، جسے اس نے لپک کر منہ میں روک لیا۔ پھر اس نے مچھلی کی بوٹی اٹھا کر اپنے منہ میں رکھتے ہوئے کہا___ "کیوں___؟"

"میں بہت مجبور ہوں۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔ تمھارا بڑا احسان ہوگا___" اس نے لجاجت سے کہا___

"بھوکے ہیں تو میں کیا کروں۔ میں کیوں دوں روپیہ___"

"ایسا تو نہ کہو، شمس___" مہرن نے التجا کی___ "اس پوری دنیا میں اب میرا کوئی بھی نہیں۔ سب مار دیے گئے۔ یا پکڑ لیے گئے۔ بہت مجبور ہو کر تمھارے پاس آئی ہوں۔ تم تو مجھے مایوس نہ کرو___"

"اب بھی کیوں آئی ہو___" شمس نے طنز سے کہا___ "تب کیوں نہ آئیں جب جوان اور خوبصورت تھیں___"

www.taemeernews.com

مہرن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شمس کے الفاظ نے اس کا کلیجہ مسل ڈالا تھا۔ اس نے ہونٹوں کو زور سے دانتوں سے کاٹا۔ اور رقت بھرے لہجے میں بولی ــــ

"شمس، ایسا کیوں کہتے ہو۔ تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے ــــ"

"محبت کرتا تھا ــــ" شمس طنز سے ہنسا ــــ "مگر یہ تو پرانی بات ہے۔ اب ہم نے ماضی سے رشتہ توڑ لیا ہے ــــ"

مہرن چپ ہو گئی، اور عجیب سی نظروں سے شمس کو دیکھتی رہی، اور ہمت جمع کرتی رہی، حوصلوں کو سنبھالتی رہی۔ کئی لمحوں کی جان لیوا جدوجہد کے بعد اس نے کہا ــــ

"دیکھو شمس، میں نے کالی ساری پہنی ہے۔ تمھیں یہ رنگ بہت پسند ہے نا۔ آنکھوں میں کاجل بھی لگایا ہے۔۔ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔"

"تو پھر ــــ" شمس نے بات کاٹ کر کہا ــــ

"اگر تم کہو تو میں تمھارے ساتھ اندر کمرے میں چلنے پر تیار ہوں ــــ مجھے صرف ایک روپیہ دے دینا ــــ"

شمس معاً چونکا، اس نے عجیب سی تیکھی اور سرد نظروں سے مہرن کو دیکھا۔ پھر طنز یہ لہجے میں بولا ــــ

"آہا۔ شکل دیکھی ہے آئینے میں، نوّے سال کی بڑھیا تو ہو رہی ہے اور چلی ہے بدمعاشی کرنے، شرم نہیں آتی تجھے ــــ"

"شمس۔۔۔۔ شمس ــــ"

مہرن نے کہنا چاہا۔ مگر آواز حلق میں پھنس گئی ــــ

شمس یکایک اٹھا ــــ تھالی کا سارا کھانا اس نے کتے کے سامنے ڈال دیا۔ اور جب کتے نے لپک کر روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھایا تو وہ گھوم کر مہرن سے بولا ــــ!

"میں تجھے روپیہ کیوں دوں۔ یہاں تیرا کوئی نہیں ہے تو اپنے حمائتیوں کے پاس جا۔ وہی تجھے روپیہ دیں گے اور اپنے ساتھ سلائیں گے بھی ــــ"

یہ کہہ کر وہ آنگن میں چلا گیا۔ مہرن سکتے کے عالم میں پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، اور سانس کا جسم دم بدم سرد ہوتا جا رہا تھا، اور ذہن میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، اور شمس کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ آج تک کسی نے بھی اسے ایسی شرمناک گالی نہیں دی تھی ــــ

سحر انصاری کا پہلا شعری مجموعہ
نمود
(طبع دوم کی تیاری میں)

زیرِ طبع کتابیں
● تنقید اور لسانیات (مضامین)
● خوابِ رائیگاں (شعری مجموعہ)

www.taemeernews.com

محسن شمسی

گیت

یہ کہانی جن گیتوں سے بنی ہے اُن کے لکھنے والے، اُن کو گنگنانے والے اور اُن پر سر دھننے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مصنف اُن کی تعظیم میں سر جھکاتا ہے!

○

"میں انقلاب کی بیٹی ہوں — میرا نام آزادی ہے"

"وہاں جا رہا ہوں میں جہاں سورج طلوع ہوتا ہے اور موسلا دھار بارش میں بھی اپنا نور چمکاتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں جو یہاں مجھے روک سکے۔ یا جس کو ساتھ لے جانے کی خواہش میرے دل کو ستائے۔ بس شاید ایک گیت۔ دھندلکے کی سواری میں گنگنانے کو جب راتیں اپنی ہوں دنیا بہتر بنانے کو — خوابوں سے آشنائی ہو جائے جو سوال نہ اٹھائیں۔ اٹھا بادبان بادِ بہاراں ہم چلیں گے جب تک چلنے کو جگہ نہ رہ جائے۔ سمندروں کے پار۔ پانی پر جست لگاتے پتھر کی طرح۔ اپنی رفتار سے۔ کوئی سدِ راہ نہیں اب اکیلے ہیں ——"

"رات کو دیکھو۔ یہ چاند کی پھیلی روشنی۔ نہ چاہو گے کیا کہ اس چاندنی میں میرے ساتھ رقص میں مصروف ہو جاؤ۔ بند اور کھلتی آنکھ کی طرح اشارہ کرتے ستارے۔ نہ چاہو گے کہ ہاتھ پکڑ کر مجھ سے چمٹ جاؤ اور پھر آہستہ سے میرے کان میں سرگوشی کرو کہ میرے عاشق بن کر تم مجھ کو محبت سے آشنا کرانا چاہتے ہو۔ فضا شبنم کی نمی سے بوجھل ہے۔ بولو کیا تم پسند نہ کرو گے کہ آج چاندنی کے نیم اندھیرے میں میرے پورے جسم کو کھینچ کر ساری رات مجھ سے الفت کی باتیں کرو۔ نڈر ہو کر بازی نہ لگاؤ گے کیا اس احتمال کی خاطر۔ پسند نہ کرو گے کہ میرا ہاتھ تھام لو اور مجھے اپنا محبوب بنا لو۔ یا یہ کہ چاندنی کی اس رات میں میں تمہارا ہاتھ تھام لوں اور اپنا بنا کر پھر تم سے کہوں کہ تم ہی تو میرے محبوب ہو —— بولو چاند کی اس رات میں کیا میرے ساتھ رقص نہ کرو گے ——"

"یہ دل فریب باتیں۔ یہ دل نشیں اندازِ گفتار۔ یہ دل کش جسم اور چہرہ۔ جس چاہت کی کشش سے میرا دل معمور ہوا وہ یہ تو نہیں۔ یہ دل لگی نہ ہی آتشِ سیّال کی۔ نہ دلالت اس مستقل جھنکار کی، جس کی گونج نے کانوں کو سیراب کیا۔ یہ یقیں میرا دل جس سے آشنا نہ تھا۔ تمہاری قربت کی دین۔ رگوں میں لپکتی یہ برقِ حیات۔ موہوم۔ عقل کی سمجھ میں نہ آئیں۔ ایک لمحے

پہلے اجنبی تھے ۔ اپنے خوابوں کی دنیا میں سرگرداں ۔ فاصلوں کے تشدد سے تنہا۔ کل کی کچھ خبر ہی نہیں۔ ارمان ہئیت پاکر مجسم بنے اور سامنے آجائے۔ آنکھ بند کرکے چٹکی لیتا ہوں ۔ پھر آنکھ کھول کر دیکھتا ہوں ۔ تم پاس ہی ہو۔ آنکھیں بند کر لیتا ہوں، اور انگلیاں گنتا ہوں ۔ چشم وا ہوتی ہے اور یقین سے کہتی ہے کہ تمھارا ساتھ حقیقت ہے، خواب نہیں اور کل آئے گی اور پاس رہے گا۔"

"سرخ کلی ہے وہ ۔ گلاب کی سرخ کلی ۔ خاص الخاص ۔ پو پھٹتے سورج کی کرنوں سے آشنا نہیں ۔ تاریکی جب چاندنی کی فضاؤں کو گلے لگاتی ہے اور ستارے آنکھیں جھپکا کر محو خواب ہوجاتے ہیں ۔ تب تشنگی بجھانے کو وہ اپنا سرخ سر اٹھاتی ہے۔ فٹ پاتھ کے کنارے ۔ کنکریٹ کے انبار میں ۔ پٹرول کے دھوئیں میں دم لیتی ۔ جب رات کی شفٹ پر کام کرنے والے اگلی شفٹ والوں سے آنکھیں ملتے وداع ہوتے ہیں اور ریڈیو پر اناؤنسر کی آواز ۔ رخصت لے کر تنہا چھوڑ جاتی ہے اور پوسٹر دن کے دعووں کی روشنائی نمی سے بھیگ کر مدھم پڑ جاتی ہے اور چور سپاہی کی چاپ کی پروا نہ کرتے ہوئے نقب لگاتے ہیں ۔ تب مسکرا کر وہ ہاتھ تھام لیتی ہے اور اپنا گیت گنگناتی ہے ۔ کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی طرح کالی اس کی آنکھیں ۔ نظر پڑتی ہے تو آگ لگا جاتی ہے ۔ پھر ایک دھماکہ ہوتا ہے اور قابو کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں اور ایک نئی ترتیب ظہور میں آتی ہے ۔ اس گلاب کی کلی کو میں اپنے سینے سے لگاؤں گا اور پھر اپنے باغیچے میں بو دوں گا اور شدت سے انتظار کروں گا کہ کب وہ کھل کر پھول بن جائے۔"

"صبح ہوگئی ہے اس اولین صبح کی طرح ۔ پرندے یہی چہچہا رہے ہیں ۔ تعریف سب صبح کی روشنی کی ۔ حمد زندگی کے آغاز نو کی شان کی ۔ بوجھل ہوا تبدیلیوں سے وقت کے کسی اور دور سے آتی ہے ۔ اسرار سب پچھلے بوجھے گئے اور ذہنوں سے بھی بھولے ۔ ستائش نئی جستجو کی اور سوالوں کے جواب ڈھونڈ نکالنے کی ۔ امنگیں اب نئی سمتوں کو جاتی ہیں ۔ دل کی جولانی نئے مقابلوں کے لیے مخالف ڈھونڈتی ہے اور ہر لمحے احساس یہ بڑھتا جاتا ہے کہ دور خیر کی ابتدا ہوگئی ۔ توصیف حدود کو ٹھکرانے والے چھپے زور حیات کی ۔ ثنا اتفاق کو پابند خودی بنانے کی کوشش کرنے والی ذات کی ۔ صبح ہوگئی ۔ اس صبح نو کی طرح جب جذبہ زندگی کی پاکی کو چھوتا ہے ـــــ"

"چمک مجھ پر اتوار کے سورج ۔ چمک اپنی پوری آب و تاب سے ۔ پھر روشنی کا ہاتھ تھامے میں چل نکلوں ۔ میدانوں میں مٹی کے قریب ۔ چشموں میں ابلتے پانی کے درمیان ۔ آبادیوں میں کھیلتے بچوں کے سنگ ۔ مسکراہٹیں بر سیں ۔ میرا تیرا ساتھ رہے ـــــ ہمیشہ ہمیشہ ۔ کہ ایسا ہونا ہی بقا کے قابل ہے ۔ اتوار کے سورج ۔ کیا ہوا جو جیب میں سکے نہیں ۔ کیا ہوا جو چھوڑ کر رن وے پر ہوائی جہاز اڑ جاتے ہیں ۔ تیری کرنوں کی الفت تو میری ہے کہ اپنی سست رفتاری کے عوض اپنی غربت کو بیچ کر میں نے یہ ساتھ خریدا ہے ۔ میں تیرے ساتھ چلوں گا ۔ بدلتے موسموں میں سالوں کے سفر پر ۔ یہاں تک کہ تیری روشنی اس دنیا میں لے جائے، جس سے اب تک بس میرے خوابوں کو ہی واقفیت ہے ـــــ چمک اتوار کے سورج کہ تیری کرنوں کو تھام کے میں چل نکلوں ـــــ"

"پیر آئی" جیسے پیر آتی ہے، اور اسے اپنے ساتھ لے گئی جس کی الفت نے بے مائیگی کو میری وقعت کا بھاری پن بخشا تھا ۔ اب یادیں رہ گئی ہیں ۔ سنوان بچھڑی آوازوں کو ۔ عرصہ نہ گزرا جب تاروں بھری ویسی ہی ایک رات کو الاؤ کی آگ کی روشنی میں دھیرے سے تم نے ایک دھن گنگنائی تھی ۔ ہوا اس رات اپنے ساتھ جادو لائی تھی، اور ستارے چمک رہے تھے ۔ مجھ پر، تم پر، اس سرزمین کی آزادی پر ۔ اور میں نے سوچا ۔ اب ہمیں کبھی شکست نہ ہوگی ۔ اور میں اپنی خوشی میں مگن تھا معلوم نہ تھا

www.taemeernews.com

گیت

کہ شام ہونے تک میرا تمھارا ساتھ رہے گا۔ اعتبار ہی تو تھا پر دن گزر گیا، اور اب سارے پھول گم ہو گئے۔ قبروں کے کتبے ہیں کھلکھلاتے چہروں کی بجائے۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں ہے۔ پر یقین ہی کیوں کر لیا تھا میں نے۔ تم نے بھی کچھ ہوشیار نہ کیا۔ میں نے تو اپنی ہستی کا شریک تمھیں کیا تھا۔ پر وقت نے کب حسرتوں کا ساتھ دیا ہے۔ پیرآئی۔ جیسے پیرآتی ہے اور جس نے مجھے وحشت بخشی تھی اسے اپنے ساتھ لے گئی ــــــ"

"کتنی پشتیں ریت کے گھروندوں کو پکا کرنے میں لگ جائیں اور کتنے سمندر پار کریں۔ جو کشتی ساحل کو پہنچے۔ سب کہتے ہیں کب تک لڑیں۔ مقدر ہونا کامی تو قسمت کے مدمقابل ہونے سے کیا حاصل۔ تم چلی گئیں۔ دنیا بدلی۔ اب پھر ویسی نہ ہو گی۔ کیوں نہ تم کو بھول کر دنیا کے کاموں سے دل کو لگاؤں۔ کیسی تنہائی ہے۔ ایک طرف عدم ہستی تو دوسری طرف فنائے حیات۔ اور میں راہوں کے اندھیرے میں کھو یا۔ یہ بھی کہہ نہیں سکتا کہ کیوں' اور سننے سے بھی گریز کرتا ہے۔ جہاں میں ہوں وہ منزل نہیں ہے اور منزل جہاں ہے اب وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میں اور میرے خیال۔ اپنے خوابوں میں لپٹا۔ ایک ٹوٹی پرانی کرسی پر بیٹھا راہ تکا کرتا ہوں، اور سامنے جلتے سورج سے تپتی گرد کا بس ایک بگولہ ہے ــــــ"

"میں اور غم گزری کے۔ رونے سے کیا ہو گا۔ چلے جانے والے کیوں لوٹ کر آئیں۔ آنسو کیا بہاؤں۔ ایک تبسم۔ دل لگی کے لیے ہی صحیح۔ شاید کوئی کہیں پر خوش ہو جائے۔ مسکراشعلۂ حیات۔ دل کندن بن جائے۔ اس الفت نے اور دیا ہی کیا مجھ کو۔ پتھروں سے ٹکرا کر میری آواز کی بازگشت لوٹ آئی۔ سنسناتی ہوئی برفیلی ہوا کی سانسیں۔ پھر کس کے لیے الفت کا دم بھروں میں اب۔ جھوٹوں کے جالے میں گھرا ہوں۔ فریب سے کس کس کا دل بہلا ہے۔ کیوں پھر کیوں ــ جانِ حیات پھر کیوں۔ باوجود تسکین دل کی ان جھوٹی باتوں کے تیری الفت میں روتا ہوں ــــــ"

"آؤ پھر ایک نیا نغمہ چھیڑیں۔ من ہی من میں۔ پھر آواز کو بلند کر لیں۔ دل پر جو گزری جو دکھ اٹھائے ان کو گائیں۔ ہمت کو آدم میں سمو کر۔ عزم سے کہ وسعت کا وہ احساس پھر پاس آئے۔ کہ اب بے قید زباں ہی ایک حفاظت باقی ہے۔ غم کا گیت گائیں مسرت کی دھن پر۔ سوچ کر کہ راستے میں جو بچھڑا وہ ضایع نہ ہوا کھا دبنا اگلی مسرت کے لیے' اور دل جن صدموں کی گرفت میں ہے ان سے چھٹکارا پائے۔ جو ٹھوکر کھائی ہے راہ محبت میں یاد اس کی حوصلہ کو نہ ٹھہرائے۔ اور الفاظ کی زنجیریں جو میرے دل کو قابو میں رکھنے کو ڈھالی گئی تھیں ٹوٹ جائیں۔ کھلیں عقل و جذبات پر بند دروازے کہ یقین و شک روشنی میں سچائی کی جانچنے کو نکل آئیں۔ کیا پروا کہ میری آواز سریلی نہیں ہے۔ فکر کیسی کہ ہر ایک سننے والے کے لیے میرا نغمہ پرکشش نہیں ہے۔ رنج۔ گزری محبت کے دفن کرنے جاتا ہوں۔ درد کا گیت ہے خوشی کی لے میں گاتا ہوں۔"

"عرصہ ہوا مجھے ایک لڑکی ملی تھی یا یوں کہہ لو کہ میں اس لڑکی کو مل گیا تھا۔ کمرے پر لے جا کر بولی۔ جہاں جی چاہے بیٹھو ــــــ"

نظر ڈالی تو ایک چوڑے پلنگ کے سوا بیٹھنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ میں فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ گلاس بھر کر اس نے مجھے دے دیا۔ میں مدہوش باتوں میں کھو یا تو وہ انگڑائی لے کر بولی، پتہ ہے مجھے کل کام پر جانا ہے۔ میں نے جھلا کر کہا، میں بھی یہاں زمین پر کمر سیدھی کرنے نہیں آیا ہوں ــــــ

پھر دوسرے دن آنکھ کھلی تو میرا دھن' دولت، کپڑے لتے' سب کچھ لے کر وہ جا چکی تھی اور میں ننگا تھا ــــــ

"وہ انقلاب کی بیٹی تھی۔ اس کا نام ...."

www.taemeernews.com

بانو سنگھ

دس پونڈ کا نوٹ

پچھلے چار یا پانچ مہینے سے میں محسوس کر رہا تھا کہ جبین مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر نہ جانے کیوں کہہ نہیں رہی ہے۔ شاید کوئی بات اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھی۔ میں نے اس پریشانی کی وجہ کریدنا بھی چاہی، لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ آخر میرا اور جبین کا رشتہ ہی کیا ہے! صرف ویک اینڈ کا ساتھ تھا اور وہ بھی رات کی تاریکی میں جسمانی قربت کے چند لمحات کی حد تک۔ صبح کو وہ دس پونڈ کا نوٹ اپنے پرس میں رکھ کر چلی دیتی اور میں بھی معمول کی طرح اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ——

جبین کے رخصت ہوتے وقت بھی میرے دل میں پل بھر کے لیے یہ خیال آتا تھا کہ آج محبت بھی دنیا کے ہزاروں کاموں کی طرح ایک معمول سا بن کر رہ گئی ہے جیسے بھوک لگی تو کسی ریستوران میں گھس گئے، کچھ کھایا اور چل دیے۔ پیاس لگی تو کسی پب میں داخل ہو گئے۔ ایک دو بیئر کے گلاس پیے اور آگے بڑھ گئے۔ جسم میں کچھ اکساہٹ ہوئی تو کوئی ساتھی تلاش کیا، اعصاب کو سکون بخشا اور اپنی راہ لی۔ گویا زکام اور محبت میں کوئی تفریق ہی نہیں رہی۔ آخر انسان کے لیے اب کوئی ایسا کام، ایسا خیال یا ایسا جذبہ کیوں نہیں رہا، جو تمام عمر اس کے دل کو گدگدائے اور جس کے باعث اسے یہ دنیا حسین نظر آئے؟

دوسرے ہی پل مجھے خیال آتا کہ میں غلط سوچ رہا ہوں۔ دنیا میں ہر چیز اپنے اصل مقام پر ہے۔ گڑبڑ کہیں نہیں ہے۔ مجھے اپنی بیوی اور بچے سے علیحدہ ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اکیلے پن سے گھبرا کر تو لوگ پاگل تک ہو جاتے ہیں، خودکشی تک کر لیتے ہیں۔ میں اگر زندہ ہوں اور اپنے محلے میں کافی مہذب گردانا جاتا ہوں، تو کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں نے تنہائی کے آسیب کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا ہے؟ دوستی (اگر اسے "دوستی" کہا جا سکتا ہے) لگ بھگ پانچ سال پرانی ہے، یعنی اس وقت سے چلی آتی ہے جب میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی۔ مگر پہلے ملاقات بس گاہے گاہے ہوتی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ پابندی سے ہر ویک اینڈ پر آنے لگی۔ اب تو یہ معمول سا بن گیا تھا کہ وہ رات کو آتی، تھوڑی دیر گپ شپ ہوتی۔ چند ڈرنک لیے جاتے ٹیلی ویژن پر کوئی فلم دیکھی جاتی اور پھر بستر میں گھس کر ہم رات کی تاریکی میں نہ جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے۔ صبح کو وہ ایک مریل سی انگڑائی لیتی ہوئی باتھ روم چلی جاتی، وہاں سے آکر جلدی جلدی میک اپ کرتی، دیوار پر لگے قدآدم شیشے میں پل بھر کے لیے اپنے جسم کو ہر زاویہ سے دیکھتی اور دس پونڈ کا نوٹ سنبھال کر بائی بائی کہتی ہوئی چلی جاتی ——

شاید اس بندھے ٹکے معمول کی وجہ سے ہی وہ میرے لیے کوئی خاص عورت نہ تھی۔ اتنے سال کی رسم و راہ اور جسمانی قربت

www.taemeernews.com

کے بعد بھی مجھے اس کی یاد کبھی نہیں ستاتی تھی اور نہ کبھی میں نے اس کے انتظار میں لذت محسوس کی تھی یا شاید اس بے نیازی کا سبب وہ طلاق تھی جو میں نے بیوی کو دی تھی۔ شاید غیر شعوری طور پر مجھے عورت سے عجیب سی نفرت ہو گئی تھی۔ شاید میں کسی بھی عورت کو وہ پہلا جیسا مقام نہیں دینا چاہتا تھا۔ شاید وہ میرے لیے محض ایک دس پونڈ کا ایسا گھسا پٹا نوٹ تھی، جس کا نمبر تک مٹ چکا ہو اور جسے مجھے کہیں نہ کہیں پھینکنا ہی تھا۔

اس کے برعکس مجھے اپنی بیوی اکثر یاد آتی تھی، اس کا گنگنانا، اس کی مسکراہٹ کا دل نواز بانکپن، جیسے کھلتا ہوا پھول اچانک سمٹ جائے، جیسے کسی گویئے کا آخری بول دیر تک فضا میں لرزتا رہے۔ پھر اس کا بات چیت کے دوران "ہوں" کہنے کا انداز، اس کی ہر بات، ہر ادا میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ کبھی کبھی تو جب میں یوں ہی دیر تک بستر میں پڑا رہتا تو مجھے سچ مچ یقین سا ہونے لگتا، کہ وہ اچانک آکر کہے گی:

"اجی دوپہر ہو چلی ہے اور آپ ابھی تک سو رہے ہیں!"۔۔۔۔

اور اس کی معطر زلفیں بادِ صبا کے نرم جھونکے کی طرح مجھے ایک دم تر و تازہ کر دیں گی۔ ایسے لمحوں میں مجھے یہ خیال بہت تڑپاتا کہ کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنھیں میں خواہ مخواہ طول دیتا رہتا تھا۔ آخر جہاں دو برتن ہوتے ہیں وہ لازماً ٹکراتے بھی ہیں۔ مگر شاید اس میں میرا قصور بھی نہ تھا۔ میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور زندگی میں اپنا مقام بنانے کی دُھن مجھ پر اس بُری طرح سوار رہتی تھی کہ میں یہ بھول گیا کہ وہ ایک جوان عورت ہے۔ جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ امیر والدین کی اکلوتی لڑکی ہے اور عیش و عشرت میں پلی ہے۔ میرا روپے پیسے، شہرت اور عزت کا لالچ، اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ شاید اسی لیے آج میرے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں تپتے صحرا میں کہیں کھو گیا ہوں۔۔۔۔

غالباً بیوی کے تصور کی دنیا پر چھائے رہنے کے باعث میں اس پانچ سال کے عرصے میں ان تبدیلیوں کو نہ سمجھ سکا جو رفتہ رفتہ جین میں رونما ہوتی رہی تھیں۔ ویسے چار پانچ مہینے سے میں ضرور یہ محسوس کر رہا تھا کہ جین کا وہ پہلا سا رویہ نہ تھا، نہ پہلی سی اجنبیت تھی۔ نہ پہلی سی سرد مہری اور نہ پہلے کی طرح گھر واپس جانے کی بے قراری۔۔۔ اب تو ایسے لگتا تھا جیسے وہ میرے گھر میں ہی مستقل طور پر رہنا چاہتی ہو۔ پہلے وہ سنیچر کی رات کو آتی تھی اور اتوار کی صبح ہوتے ہی چلی جاتی تھی۔ لیکن اب وہ سنیچر کی صبح کو آ جاتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی جمعہ کی رات کو ہی آ دھمکتی تھی۔ میرے ساتھ شاپنگ کو نکل جاتی، گھر میں خود کھانا تیار کرتی، میرے چھوٹے موٹے کپڑے دھو کر استری کر دیتی، کبھی کبھی سینما جانے کے لیے بھی مجھے آمادہ کر لیتی اور پیسے اپنی جیب سے دیتی۔ اس کے سونے کے کپڑے ایک دو جوڑے سینڈل اور کچھ میک اپ کا سامان مستقل طور پر میرے گھر آ گیا تھا۔ کبھی کبھی جب مجھے اپنے مرد دوستوں کے ساتھ کہیں باہر جانا ہوتا تو وہ گھر پر میرا انتظار کرنے میں بھی فخر محسوس کرنے لگی تھی۔ اتوار کی صبح کو واپس جانے کی بجائے وہ کبھی کبھی پیر کی صبح کو سیدھی میرے گھر سے ہی کام پر چلی جاتی تھی۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ پچھلے چند مہینوں سے اس نے مجھ سے ایک پینی تک نہیں لی تھی۔ جب بھی میں دس پونڈ کا نوٹ معمول کی طرح اس کو دینا چاہتا تو وہ مسکرا کر کہتی۔

"اجی رکھیے بھی! اکٹھے ہی لے لوں گی"

اور میں بھی مسکرا کر جواب دیتا۔

"جیسی سرکار کی مرضی!"۔۔۔۔

www.taemeernews.com

لیکن شرمیلا سے علٰحدگی ہو جانے کے بعد جو خلا میری زندگی میں پیدا ہو گیا تھا، وہ کسی صورت بھی پُر نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے میں نے دل ہی دل میں آیندہ ساری عمر اکیلا رہنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

کل جب جینی میرے پیے بیڈ ٹی لے کر آئی، تو اس کی ہر ادا سے بے پناہ خلوص ٹپک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے کو آتا ولی ہو رہی ہے، کوئی جھجک اسے روک رہی ہے، میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا:

"جانِ من، اتنی خاموشی! کچھ تو بولو۔"

اس نے ایک پل میری طرف دیکھا، لیکن خاموش رہی، جیسے سوچ رہی ہو کہ آخر کچھ کہے بھی تو کیسے کہے۔ پھر زور دینے پر جب اُس نے اپنے دل کی بات مجھ پر ظاہر کر دی تو میں کافی دیر تک اُسے ان نظروں سے گھورتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"لیکن جینی میں تم سے شادی نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے کسی اور سے محبت ہے؟"

اس نے ایک سرد آہ لی اور بے دلی سے کہنے لگی:

"تو پھر اسی خوش قسمت سے ہی شادی کر لو۔"

"شادی!" — میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ جیسے اُس نے میری دُکھتی رگ چھیڑ دی ہو۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے آخر اسے بتا ہی دیا۔

"شادی اس لیے نہیں کر سکتا کہ میں نے اسے طلاق دے دی تھی اور اب وہ شادی شدہ ہے۔"

وہ کچھ دیر اسی طرح عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ اس کے چہرے پہ کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ آخر جب ایک آہ سی بھرتی ہوئی جانے لگی تو میں نے اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا:

"جینی تم نہ جانے کب سے یہ دھندا کر رہی ہو، کیا یہ اس سے اچھا نہیں کہ تم ہمیشہ کے لیے کسی ایک کی ہو کر رہو۔"!

"دھندا!" اس نے یکدم خونخوار سی نظروں سے مجھے گھورا، جیسے میں نے اُسے گالی دے دی ہو۔ کچھ دیر اسی طرح گھورتے رہنے کے بعد بولی:— "یہ دھندا تو میں صرف اسی ایک کی خاطر کرتی تھی۔"

"کیا مطلب؟" — اب میں حیرت کی تصویر بنا اُسے تک رہا تھا۔

"مطلب یہ کہ جب ہم پہلے پہل ایک دوسرے سے ملے تھے تو ہمیں آپس میں بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ ہم طرح طرح کے سنہری خواب دیکھنے لگے تھے۔ لیکن محبت کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا، یعنی نہ مکان کے لیے روپیہ پیسہ اور نہ گرہستی کا سامان خریدنے کی سکت۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی تھی۔ چنانچہ ہم دونوں نے ایک دن نہ جانے کیوں فیصلہ کر لیا کہ کیوں نہ ایک دو سال اسی طرح کا دھندا کر کے کچھ روپیہ جمع کر لیا جائے، تاکہ کوئی چھوٹا موٹا مکان خریدا جا سکے۔"

"تو پھر اب کس چیز کی کمی ہے؟ شادی کر لو۔"

"شادی—!"

اس نے عجیب سی حقارت بھری نظر سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب کہ ہم ایک دوسرے سے انتہائی نفرت کرتے ہیں۔"

●●

www.taemeernews.com

پروین مرزا

مٹی کی گود

تین چار دن کی سخت دھوپ کے بعد بارش کے پہلے ہی چھینٹے پر زمین سے مٹی کی سوندھی خوشبو اس طرح پھوٹ پڑی جس طرح پھیری والے کی آواز پر بچہ ہمک کر ماں کی گود سے نکل جائے۔ ایک ہاتھ میں شاپنگ کا تھیلا لٹکائے دوسرے میں جوتے کا ڈبہ اٹھائے رینو جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ نتھنے سکیڑ کر لمبا سانس کھینچا اور سرور میں آنکھیں بند کرلیں۔ خوبصورت چھتریوں کے نیچے پتلی سی ہیل پر ٹھک ٹھک کرتی آتی جاتی عورتوں نے حیرت اور مردوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا جو لندن کے بے اعتبار موسم میں ڈھاکہ کی کلف درم کی سوتی ساڑھی میں یوں بغیر چھتری اور کوٹ کے گھر سے نکل آئی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ اب رم جھم پڑتی پھوار میں آنکھیں بند کیے کھڑی بھیگ رہی تھی ———

"پگلی ہے"۔ کسی نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کی اور رینو کے لبوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ ایسی پاگل اب سے تو نہ تھی۔ مٹی سے تو اس کا جنم جنم کا رشتہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آمنہ بی مرتے وقت سوا مہینے کی جان کا ہاتھ مٹی کے ہاتھ میں سونپ گئی تھیں۔ جب ہی تو اسے مٹی سے ایسا پیار تھا، اور لوگوں کے کہنے کا کیا۔ لیکن خود رینو کو احساس تھا کہ اگر واقعی کسی نے اسے پال پوس کر بڑا کرکے ماں کا حق ادا کیا تھا تو وہ مٹی تھی۔ ہوتا یوں کہ گھر سے گھڑکی دھموکا یا دھکی کھا کر رینو گلی میں چلی آتی اور مٹی میں منہ اوندھا کر خوب خاک اڑاتی اور مُنّا سا دل جب پھول کی طرح کھلا ہوتا تب بھی وہ اپنی ماں کے پاس چلی آتی۔ نہانے کے ڈونگے میں پانی بھر کر مٹی بھگوتی اور کھلونے بناتی۔ دوسرے کھیلتے ہوئے بچوں میں سے اگر کوئی شرارت سے اس کے بنائے کھلونے کو چھوتا تو مسکین سی رینو بھو کی شیرنی بن جاتی۔ آہستہ آہستہ محلے کے بچوں نے اس سے لڑنا بھڑنا چھوڑ دیا۔ وہ ان کا لیتی ہی کیا تھی۔ گلی میں گھر کی دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی مٹی سے کھیلا کرتی، اور اُسے کسی کے سنگ ساتھ کی ضرورت ہی کب تھی، اکیلی خاک اڑایا کرتی۔ اس کے یوں دن رات مٹی میں کھیلنے پر دلہن امّی کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ وہ تو اس کے تلو دھندوں سے بچ جاتیں۔ لیکن اگر کبھی محلے کی کوئی بی بی یا ابّا کے دور دراز کے رشتے کی کوئی چچی، تائی آجاتیں تب دلہن امّی صحن کے دروازے میں لٹکتے ہوئے ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے کے سوراخ میں سے ایک آنکھ سے جھانک کر چلّاتیں ———

"رینو اری رینو۔ چل اندر آ"۔ مڑ مڑ کر اپنے کھلونوں کو تکتی رینو پردہ ہٹا کر اندر آجاتی۔ اس کے اُدھڑے کرتے، بکھرے

www.taemeernews.com

بالوں اور میلے ہاتھ پیروں کا جواب دلہن اس طرح دیتیں ــــــــ

"بھئی اس لڑکی سے تو میں عاجز ہوں۔ اِدھر نہلاؤ دھلاؤ ادھر خود کو سان لیتی ہے ــــ"

آنے والیوں کو پتہ تھا کہ رینو نہ کبھی نہائی ہوتی نہ دھوئی۔ لیکن وہ دور پرے سے جوتیاں چٹخاتی صرف رینو کی خیریت پوچھنے تو نہ آتی تھیں۔ کئی رُکے اڑے کام۔ کئی چھوٹی موٹی ضرورتیں انھیں یوں ابا کے در پہ کھینچ لاتی تھیں۔ تو ایسے میں اگر وہ دلہن امی کے قدم نہ لیتیں۔ اور ہر بات میں آمنا صدقنا کہہ کر گردن نہ ہلاتیں تو اور کیا کرتیں۔ دلہن امی اس کا خفیتا اڑاتی تیں اور صحن میں لگے سماوار کے نل کے نیچے اس کا منہ ایسے گھس گھس کر دھلاتیں اور ایسی دل جمعی سے اس کی ناک صاف کرتیں کہ اس کے نتھنوں کے دونوں طرف ان کے میلے ناخن کھب کر رہ جاتے۔ پھر اکڑے ہوئے تولیے سے رگڑ رگڑ کر اس کا منہ پونچھتیں۔ کھینچ کھینچ کر اس کے لٹوریاں لگے بالوں کو سلجھاتیں۔ کسی گھسے ہوئے کپڑے میں سے ایسے ہی آڑے وقتوں کے لیے سلی ہوئی فراک پہناتیں اور بادلِ ناخواستہ منہ چوم کر کہتیں :

"ہاں اب لگی رانی بٹیا ــــ"

دلہن امی کے سلوک پر لاکھ نکتہ چیں سہی، لیکن ان کی اس دو گھنٹے کی محنت کا اثر مہمان بیبیوں پہ ہو ہی جاتا ــــــ

"اے بی دلہن تمھارا ہی جگرا ہے۔ واقعی تم مٹی کی بنی ہو، ورنہ پرائی اولاد کو کون ایسی دل سوزی سے پالتا ہے؟"

رینو حیرت سے دلہن امی کو دیکھتی۔ اگر دلہن امی سچ مچ مٹی کی بنی ہوتیں، تو وہ انھیں سینے سے لگا لیتی، اپنے بنائے ہوئے سارے کھلونوں میں عزیز تر رکھتی، اور جو یوں ہوتا تو وہ مٹی سے کھیلنے باہر گلی میں جاتی ہی کیوں؟ ان کے ارد گرد منڈلاتی رہتی۔ ان کے نرم و گداز سینے کو ٹٹولتی اور سر رکھ کر سو رہتی۔ لیکن وہ مٹی کی کب تھیں؟ ان میں مٹی کی سی نرمی اور گرمی کہاں تھی؟ وہ تو ۔۔۔۔ وہ تو ۔۔۔۔ بس دلہن امی تھیں۔ وہ انھیں دلہن اس لیے کہتی کہ ایک صبح اس کی آنکھ کھلی تو اندر کمرے میں نئی چادر بچھی چارپائی پر ہری ساٹن کے گاؤ تکیے کا سہارا لیے جھم جھم کرتے سرخ کپڑوں میں دلہن کو بیٹھے دیکھا اور انھیں امی اس لیے کہتی کہ جیسے ہی وہ خوشی سے دلہن دلہن چلاتی آگے بڑھی۔ محلے کی کسی عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ــــــ

"امی کہو بٹیا ۔۔۔۔ اب یہ تمھاری امی ہیں" ــــ یوں وہ دلہن پل بھر میں اُس کی دلہن امی بن گئیں کتنی حیرت سے ٹھٹھکی ہوئی رینو کو گھونگھٹ کاڑھے دلہن کی گود میں بٹھا دیا۔ دلہن جو سرخ چمکتے کپڑوں میں انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ رینو کو اس کی گود ایسی ٹھنڈی سی محسوس ہوئی کہ گھبرا کر وہ گود سے نکل پڑی۔ اس سرد گود میں رینو اس دن کے بعد کبھی نہ گئی۔ ہاں اس روز گلی میں نکلی تو اس کے ننگے تلوؤں کو سوا نیزے کے سورج تلے تپتی ریت ایسی بھلی لگی کہ وہ وہیں کی ہو رہی۔ اور پھر یہ محبت ایسی بڑھی کہ ٹھنڈی، گرم، گیلی، سوکھی مٹی رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہو گئی ــــــ

لیکن جانے کیوں، ایک دن صبح اٹھتے ہی دلہن امی نے بے بات اس کے بال کھسوٹے۔ بلا وجہ پھٹکارا اور رے کا تنی بڑی کفنی دے دی کہ خبردار جو یہ سر سے کھسکی۔ اس دن سے گلی کی مٹی رینو کے لیے پرائی ہو گئی۔ صحن کے دروازے کا ٹاٹ کا پردہ نہ تھا، مانو لوہے کا پھاٹک تھا اور اس پر دلہن امی کی نظروں کا یہ بھاری تالا۔ نہ کوئی جھری نہ روزن۔ رینو جیسے اس دن سے بے ماں کی ہو گئی۔ دن رات کا جھاڑو دینا۔ برتن دھونا۔ کمر پہ آئے دن کے بہن بھائیوں کو ٹکائے اِدھر سے اُدھر ٹہلانا اور اس پر بھی دلہن امی کا جب جو جی چاہے کہہ لیں۔ رہے ابا تو وہ بس گیلی گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا کرتے۔ رینو کا دم گھٹتا رہتا ۔ وہ تو

www.taemeernews.com

پروین مرزا

مٹی کی گود

بھلا ہو پڑوسن کا کہ ایک دوا لٹے سیدھے رشتے لے آئیں۔ کوٹھری کے دروازے کی اوٹ میں چھپ کر رینو نے سنا۔ ابا نے نے کے ہزار کیڑے نکال دیے اور پھر مقطع کا ایک بند کہ ۔۔۔ "حمیدہ کی اماں ابھی تو لڑکی چھوٹی ہے "۔۔۔

لیکن جب دلہن امی نے بھوکی شیرنی کی طرح ان کے منہ سے فقرہ جھپٹا کہ ۔۔۔

" کون سی چھوٹی ہے؟ تیرھویں میں لگی ہے، اور کب تک کولھے سے لگا کر بٹھاؤ گے؟ "۔۔۔

تو اسے زندگی میں پہلی بار دلہن امی پر بے اختیار پیار آیا۔ ہاں نہیں تو کردیں کسی سے بھی بیاہ، یہ لوہے کا پھاٹک تو کھلے۔ اسے تازہ ہوا تو لگے۔ رمضو چپراسی یا منشی چاچا، جن کے رشتے ابا نے ٹھکرا دیے، ارے اس سے پوچھتے تو وہ کہہ دیتی کہ دونوں میں سے کوئی بھی دولھا بن کر بارات چڑھا لائے، اس ٹاٹ کے پردے والے صحن کے دروازے پر۔ کیا ہوا جو منشی چاچا کو سارا محلہ منشی چاچا کہتا ہے۔ ابا کا منہ ان کے ہاں کا پیغام سن کر سرخ ہو گیا تھا، اور کیا ہوا جو رمضو چپراسی ایک آنکھ سے بھینگا ہے۔ ارے کوئی اس سے تو پوچھتا!!۔۔۔ وہ جو کھلی ہوا کو ترس رہی تھی!!۔۔۔

کئی دن سرسر کرتی ہوا کی طرح گذر گئے۔ دولھا تو نہ آیا۔ ہاں ایک بڑا ہی بانکا سا چھیل چھبیلا ہاتھ میں ٹین کا ٹرنک اٹھائے چلا آیا۔ دلہن امی گلے سے لگا کر خوب روئیں۔ صحن میں نل کے نیچے برتن مانجھتی رینو خاک بھرے ہاتھ روکے آنکھیں پھاڑے اس شجرِ ممنوعہ کو دیکھتی رہ گئی جو عین اس کے گھر کے صحن میں اُگ آیا تھا۔۔۔

گرمیوں کے دن تھے سب کی چارپائیاں صحن میں بچھ گئیں۔ شفیع کا بستر اُس نے بڑی چاہت سے بچھایا۔ گھر کی سب سے ثابت، سب سے اچھی چادر چارپائی پر ڈال کر وہ آتے جاتے اس کی ہر سلوٹ اور ہر شکن دور کرتی رہی۔ اس کے چاروں کونے بار بار تناسب سے لٹکاتی رہی۔ یوں جیسے کہیں کے راجہ کی مسند تیار کر رہی ہو۔ اور اس رات رینو کا دل حلق میں بولتا رہا۔ جانے اُسے شفیع کیوں اچھا لگ رہا تھا۔ گھر کے ہر فرد سے زیادہ۔ اتنا اچھا کہ اس کا جی چاہا کہ اُسے دیکھتی رہے۔ اجلے بستر پر سفید کرتے پاجامے میں بے خبر سوتا کیا اچھا لگ رہا تھا۔ رینو بستر سے اٹھ بیٹھی۔ پاؤں لٹکا کر اسفنج کی دو پٹی کی چپل پیر میں ڈالی اور دھیرے سے چلتی گھڑونچی پر رکھے پانی کے مٹکوں کے پاس آئی۔ شام کو اس نے تازہ موتیا کے گجرے مٹکے پر لپیٹے تھے۔ منہ پر صاف سفید ململ کا رومال کسا تھا۔ اس وقت تانبے کے قلعی دار کٹورے میں غٹا غٹ پانی پیتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے چاندنی میں گھلی ہوئی خوشبو اس کے حلق میں ٹپک رہی ہو۔ اس کا سارا وجود موتیا کی منہ بند کلی کی طرح مہک اٹھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے پودے میں لگا پھول توڑا۔ اور جانے کون سی کشش اسے بے اختیار کھینچ لے گئی۔ جھک کر اس نے آہستہ سے پھول شفیع کے تکیے پر اس کے گھنے گھنگھریالے بالوں کے قریب رکھ دیا۔ صحن میں چارپائیوں پر سوتی مخلوق نے جیسے یکایک آنکھیں کھول دی ہوں۔ رینو ایسے تھرتھرائی جیسے سر سے پاؤں تک گناہ میں نہا گئی ہو۔ اپنے آپ کو گھسیٹتی۔ دھک دھک کرتے دل کو لیے وہ اپنی چارپائی پر آ کر گر گئی۔ لیکن جب دیر تک بھی کسی نے کروٹ نہ لی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اوپر نیچے ہوتی سانسوں میں وہ اپنی اس دلیری پر حیران ہوتی رہی۔ اور چاند پر نظریں جمائے صبح کا انتظار کرتی رہی، جب شفیع کی نظر اٹھتے ہی پھول پر پڑے گی تو وہ کیا سوچے گا؟ شفیع کی سوچ کے تصور میں اس کی اپنی سوچیں بھٹکنے لگیں۔۔۔

لیکن صبح ہوئی تو شفیع ایسے بے ڈھنگے پن سے اٹھا کہ تکیہ کہیں کمبل کہیں۔ موتیا کا خوبصورت ننھا سا پھول چادر کی سلوٹوں میں دب کر رہ گیا۔ بستر سمیٹتے ہوئے رینو نے اس کی مسلی ہوئی پتیاں دیکھیں تو اس کا جی چاہا کہ آج لوہے کا پھاٹک توڑ کر چلی جائے

www.taemeernews.com

مٹی کی گود

پروین مرزا

اور مٹی میں منہ اوندھا کر خوب روئے۔ اور ابھی اس کی آنکھوں کے ان بہے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے، ابھی اس کے نوخیز جذبے نے سر بھی نہ ابھارا تھا کہ شام کی گاڑی سے شفیع کے جانے کے انتظامات ہونے لگے۔ پراٹھوں میں بھنا ہوا قیمہ لپیٹتے ہوئے وہ گیلی لکڑی کے دھوئیں کے بہانے روتی رہی اور حیران بھی ہوتی رہی کہ وہ جو دلہن امی کی ہزاروں جلی کٹی سن کر ایک آدھ آنسو بہا دیتی تھی، آج بے بات آنکھوں کو ساون بھادوں بنانے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر گھنگھریالے بالوں والا سر جھکا کر شفیع صحن کے دروازے سے ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گیا۔ رینو پوری جان سے بے قرار ہو گئی۔ آج مٹی کی طلب نے اُسے بے چین کر دیا تھا۔ اتنے برسوں جو منّو کا گو موت کیا تو اُس نے آج اس کا حق ادا کر دیا۔ دلہن امی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مٹھی بھر مٹی عین صحن کے دروازے کے سامنے ٹاٹ کے پردے کے اس پار سے اٹھا لیا۔ رینو نے دیوانوں کی طرح ہاتھ کے کشکول میں مٹی بھر لی۔ مٹی سے بھری مٹھیوں کو چوما۔ آنکھوں سے رگڑا۔ گرم گرم آنسوؤں کے کئی قطرے انگلیوں کی درزوں سے ہو کر مٹی میں جذب ہو گئے۔ میری مٹی۔ میرے صحن کے دروازے کی مٹی اس پر شفیع اپنے بھاری قدموں سے دندناتا گزر گیا۔ شفیع کا خیال آتے ہی رینو نے مٹی میں انگلی لگا کر مانگ میں بھر لی، اور باقی مٹی بڑی ہی عقیدت سے لٹھے کے ٹکڑے میں باندھ کر پوٹلی ململ کے دوپٹے کے کونے میں باندھ لی ——

دوپٹے میں بندھی اس گرہ کو دو دن تو دلہن امی نے نظر انداز کیا اور تیسرے دن وہ اس پر چیل کی طرح جھپٹ پڑیں۔
"بول نامراد کس کا خط چھپا رکھا ہے پلو میں۔ کیا اسی دن کے لیے تجھے تختی لکھنی پڑھنی سکھائی تھی۔ کمبخت کلموہی کتنا منع کیا تھا کہ خبردار حمیدہ میں گھس گھس کر نہ بیٹھ، مر مر کر اس سے باتیں نہ بنایا کر۔ سیکھ گئی نا اس کی حرکتیں۔ بھولے باوا کو ابھی بیٹی ننھی ہی نظر آتی ہے۔ آ کر دیکھیں ننھی کے گل۔ بول بتا منحوس کیا چھپائے پھر رہی ہے"۔ دلہن امی نے اسے دھموکے مارے، تھپڑ لگائے۔ لیکن رینو لہولہان ہو کر بھی سینے سے بھینچے پلو کو کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ غصے سے کپکپا کر دلہن امی نے اسے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ رینو پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ دلہن امی کی بے تاب انگلیوں نے رینو کی اینٹھی ہوئی انگلیوں سے بالآخر دوپٹہ گھسیٹ۔ ایک ایک کر کے انھوں نے دوپٹے کی گرہیں کھولیں۔ لٹھے کی پوٹلی کو انھوں نے حیرت سے دیکھا اور جلدی جلدی ساری گرہیں کھول ڈالیں۔۔ افسوس اور تعجب سے ان کی آنکھیں پھٹ گئیں ——
"یہ مٹی . . . یہ حقیر بے وقعت مٹی اور اس کمبخت نے اس کے لیے اتنی مار کھائی، اس طرح جان سے لگا رکھی تھی جیسے زندگی بھر کی پونجی ہو——"

دلہن امی کو آج پہلی بار اپنے رویے پر دکھ ہوا۔ بے ماں کی بچی کو کس شک پر آج وہ مار بیٹھی تھیں۔ نیم بے ہوشی ہی میں رینو نے سر اٹھا کر حیرت و افسوس کی مورت بنی دلہن امی کے ہاتھ سے مٹی کی پوٹلی لے لی اور تھک کر آنکھیں بند کر لیں ——
اور کئی دن بعد جب وہ وداع ہو رہی تھی، تب بھی اپنے سرخ ساٹن کے گوٹے لچکے کے کپڑوں میں اس نے مٹی کی پوٹلی چھپا رکھی تھی۔ اس پھٹے ہوئے پردے والے صحن کے دروازے پر بارات چڑھا کر لے آنے والا دولھا نہ تو مضو چپراسی تھا نہ منشی چاچا۔ جانے کیوں دلہن امی نے حمیدہ کی اماں کو جو آئے ہوئے پیغاموں کا جواب لینے آئی تھیں، دروازے میں گھستے ہی بے نطق سنائی تھیں —— "معاف کرو بوا۔ . . . بال دھوپ میں سفید کیے ہیں کیا؟ کچھ تو جوڑ سے جوڑ ملاؤ۔ بے ماں کی بچی ہے۔ اس کی عمر منشی چاچا سے بیاہے جانے کی ہے؟ اور مضو بھینگے کے سوا اور کوئی نہیں جڑا تھا پورے شہر میں؟ . . ."

www.taemeernews.com

حمیدہ کی اماں بر جوئیوں نے دے مچی تو وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر سرفراز میاں کا پیغام لے آئی۔ کسی دفتر میں کلرکی کرتے تھے۔ ماں باپ سر پر نہیں تھے۔ اَبا نے جھٹ دو بول پڑھوا دیے۔ لیکن رینو میکے سے جو پوٹلی لے کر چلی تھی وہ سہاگ رات بھی اس کے تکیے کے نیچے چھپی رہی ــــــ

لوہے کے پھاٹک سے نکال لانے والے دولھا کے لیے رینو کے دل میں عزت ہی عزت تھی۔ سرفراز میاں کے چھوٹے سے کوارٹر کو اس نے جنت بنا دیا تھا۔ لیکن سرفراز میاں تو اپنے خیالوں کی جنت پردیس میں بنا رہے تھے۔ ایرپورٹ پر رینو اتنا روئی کہ وداع ہوتے وقت بھی نہ روئی تھی ــــــ

"ہائے دلہن امی کاش میں بھری بھری ریت بن کر یہیں بکھر جاؤں - - - اَبا پیارے اَبا مجھے اس مٹی سے جدا نہ کرو۔"
لیکن وہ بے آواز چیختی دھاروں دھار روتی سر جھکائے سیدھی سرفراز میاں کے پیچھے چل دی ــــــ

لندن کی دنیا اسے عجیب ہی لگی۔ اس کا بچپن کہانیاں سنتے نہ بیتا تھا، ورنہ شاید وہ اسے پردیس کی بجائے پریوں کا دیس کہتی۔ بٹن دباتے ہی گھر گھر ویکیوم کلینر سے جب وہ فرش پر بچھے قالینوں کو صاف کرتی تو اسے بے اختیار اپنے گھر کا کچا صحن اور سینک کی جھاڑو یاد آجاتی۔ اسٹین لیس اسٹیل کے ڈبل ڈرینر سنک پر برتن دھوتے وہ ٹونٹی لگا سما وار یاد آتا اور جب اپنے بچے کو "کاٹ" میں لٹا کر وہ میوزیکل باکس کی چابی گھما کر دودھ کی بوتل رکھ کر کمرے سے باہر آجاتی تو اسے اپنے بہن بھائی یاد آتے، جنھیں گھنٹوں وہ کندھے سے لگا کر ٹہلا ٹہلا کر سلایا کرتی تھی۔ یہاں ان باتوں کا کیا ذکر ان یادوں کو یاد کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ آتے جانے والے۔ نئے، پرانے لوگ اس سے وہی گھسا پٹا سوال کرتے جو یہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے کرتا ہے ــــــ

"آپ کو یہاں کیسا لگتا ہے ؟"ــــــ

"اچھا - - - خاصا اچھا - - - لیکن یہاں کی مٹی وہاں کی سی نہیں !!!"ــــــ

اس کا انوکھا جواب سن کر سوال پوچھنے والے اسے عجب سی نظروں سے دیکھتے ــــــ

پھر ایک دن رکتے جھجکتے سرفراز میاں نے اسے بتایا کہ اس کے اَبا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کپڑے دھونے کی مشین کا بٹن دباتے دباتے وہ رک گئی اور ایک ٹک انھیں دیکھے گئی۔ سرفراز میاں گھبرا گھبرا کر اس کے سکتے میں آئے وجود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پکارتے رہے ــــــ

"رینو - - - کچھ تو بولو - - - کچھ کہو - - - اَبا مر گئے - - - تم ان کے پاس جاؤ گی ؟ - - - جانا چاہتی ہو ؟"
رینو یکایک ہنس پڑی۔ دیر تک ہنستی رہی۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولی ــــــ
"گیلی گیلی - - - نم مٹی - - - سوندھی خوشبو والی نرم مٹی - - - مجھے - - - مجھے بھی مٹی میں ملا دو نا؟"
پھر سب نے کہا کہ رینو کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ ہر آتے جاتے کو لٹھے کی ایک پوٹلی دکھاتی ہے جب۔
"تمھیں اللہ کا واسطہ - - - اس مٹی کو اسی مٹی میں ملا دو جہاں کی یہ ہے - - - - - - یہاں تو اس کی مٹی خراب ہو رہی ہے ــــــ"

*

www.taemeernews.com

چاند کرن

زندگی کے اُس موڑ پر

رات کا سیاہ آنچل پوری کائنات کو سمیٹے تھا اور فضا خاموش تھی۔ مگر مینا نیند کی وادیوں سے کوسوں دور دھیرے دھیرے بچے کو تھپکیاں دے کر سُلانے کی کوشش کر رہی تھی، اور غور سے گود میں سوئے وِکی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وِکی اُس کا اپنا بچہ۔ معصوم اور خوبصورت! ۔ یوں تو بچپن ایک ایسی عمر ہے، جو ہر فریب سے پاک اور معصوم ہوتی ہے۔ مگر سوئے ہوئے بچے کے چہرے پر جو معصومیت نظر آتی ہے اُس کا تقدس فرشتوں کو بھی شرما دیتا ہے۔ وہ جب بھی اُس کے مستقبل کے بارے میں سوچتی تو نہ جانے کیوں پریشان ہو جاتی۔ کیا وِکی بھی اپنے باپ کی طرح ہوگا فریبی اور بے وفا ...... ؟ سوچتے سوچتے خیالات کی اڑان اُسے ماضی کی دہلیز پر لے جاتی ......

... مینا کی سونی زندگی اُس خزاں رسیدہ ویرانے کی مانند تھی جہاں غموں کا بسیرا تھا۔ جہاں بہار پاس سے ہو کر بھی نہیں گزری تھی ۔ وہ دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ حساس واقع ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی .... کاش اُس کا بھی کوئی ہو، جسے وہ اپنا کہہ سکے ۔ مگر مینا کے خواب اُس سراب کی طرح تھے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ زندگی کے یہی اُداس اور سونے ماہ و سال اُس کی زندگی کے اوراق الٹتے رہتے ——

اس دوران دیپک اُس کی زندگی میں داخل ہوا ——!

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے، انجام سے بے نیاز — جہاں زندگی اُن چند خوش گوار لمحوں میں قید ہو کر رہ جاتی ہے جہاں مستقبل کی فکر اس کے ارادے کو ڈگمگاتی نہیں۔ انسان کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پیار کی بھوک ہر ایک کو ہوتی ہے۔ یہ ایک مقدس جذبہ ہے جس پر کسی بھی رشتے کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ جہاں پیار نہ ہو۔ وہ چاہے خون کا ہی رشتہ کیوں نہ ہو۔ اُس کی کیا اہمیت ؟ — ہاں — لوگ پیار کا مصنوعی لبادہ بھی اوڑھ لیا کرتے ہیں، مگر جب تک یہ نقاب اُترے، پانی سر سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس پیار کے رنگ میں رنگ کر انسان سوچنے کی قوت تو کھو ہی چکا ہے پھر یہ خیالات اُس کے جنون پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ کہ کل کیا ہوگا ۔ ؟ جس ماحول میں وہ رہ رہی تھی وہاں گھٹن ہی گھٹن تھی۔ جب سے اس دنیا کے اُجالے میں آنکھ کھولی۔ وہ اُجالے ہی کی تلاش میں تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتی رہی، اور پھر ——

—— وہی ہوا جس کی اکثر توقع ہوتی ہے — سبھی کی مخالفت کے باوجود شادی ۔ اور ماں باپ سے قطع تعلق ——

www.taemeernews.com

جہاں بچپن بیتا۔ زندگی کے ۲۵ سال بتائے، وہ سب تنکے کی مانند طوفان میں بہہ گئے۔ اب وہ چاہے جیے یا موت کے گہرے غار میں کود جائے کسی کو کوئی سروکار نہیں ——

ہمارے سماج کا یہی رواج ہے، سوائے اُس طبقے کے جو مغربی تہذیب میں رنگ چکا ہے اور مشرقی قدروں سے اُنھیں کوئی واسطہ نہیں۔ باقی متوسط درجے میں آج بھی لڑکی تو کیا لڑکے کو بھی اپنا پسندیدہ ساتھی چننے کی اجازت نہیں۔ یہ ایک ناقابلِ معافی گناہ سمجھا جاتا ہے، گو کہ زندگی ماں باپ یا رشتہ داروں کو نہیں بلکہ لڑکے لڑکی کو گزارنی ہوتی ہے۔ اب بھی لڑکیوں کو بنا پوچھے یا دکھائے رشتے طے کر دیے جاتے ہیں، چاہے بعد میں تاعمر آنسو بہانا پڑیں۔ اگر کہیں خود کی مرضی کو دخل ہو جائے تو ماں باپ کنارا کر لیتے ہیں۔ مگر تقدیر کا لکھا کون مٹا پایا ہے۔ پسند کسی کی بھی ہو! ——

دیپک نے وعدہ کیا کہ یہاں لوگوں کی مخالفت کے نشتر سہنے کی بجائے ہم جرمنی میں جا بسیں گے۔ تب بس ہم ہوں گے۔ ہمارے پیار کی دنیا کو کسی کی نفرت بھری نگاہوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ مینا نے ان تمام باتوں پر یقین کیا اور خود کو اُس کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ کیونکہ مینا زندگی کے اس فلسفے میں اعتقاد رکھتی تھی —— اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہم پہ بھروسہ کریں، اُس سے قبل ہمیں اُن پر اعتماد کرنا زیادہ ضروری ہے۔ مگر کیا زندگی کے سبھی اصول عملی طور پہ اُتنے ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں؟ ——

وہ ہر روز یہ کہہ کر۔ کہ میں آج دہلی جا رہا ہوں —— آج سفارت خانے جاؤں گا —— آج کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں۔ آج ویزا کے لیے جانا ہے —— دو دن کا وعدہ کر کے کبھی پندرہ روز سے پہلے نہیں لوٹا، اور جواب —— ؟ ابھی کام نہیں ہوا پھر دوبارہ جانا پڑے گا، اور اس طرح قریب ایک برس ہونے کو آیا —— نہ وہ کوئی نوکری کرتا تھا۔ کبھی دوست کے ہاں چند ہفتے کبھی کسی رشتہ دار کے یہاں چند مہینے! —— مینا اُمید سے تھی۔ وہ چاہتی تھی کہیں کوئی مستقل رہنے کا انتظام ہو جائے، اس سے پیشتر کہ وہ ننھی جان اس دنیائے فانی میں سانس لے —— پھر ایک دن۔ دیپک نے کہا، وہ ایک دن کے لیے دہلی جا رہا ہے۔ کام مکمل ہو چکا ہے واپس آتے ہی جرمنی کے لیے روانہ ہو جائیں گے —— ایک ہفتہ —— دو ہفتے —— ایک مہینہ —— اور پھر وہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوا —— دھیرے دھیرے مینا کی تمام امیدیں خاک میں ملتی نظر آئیں۔ اس وقت جب کہ بچے کے آنے میں کچھ عرصہ باقی تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے کہاں جائے؟ پھر وہ ایک عزم سے کچھ کرنے کے لیے تیار ہو گئی! ——

اسے ہمیشہ اپنی سہیلیوں پہ بے حد ناز تھا، جو کافی کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ اُس کا اپنا گھرانہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ مگر آج —— !اُس نے ایک سہیلی سے پیسے اُدھار لیے، جلد ہی لوٹانے کا وعدہ کر کے، گو اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اُنھیں مینا پر اندھا وشواس تھا۔ اُس نے پاسپورٹ بنوایا اور کابل کے لیے روانہ ہو گئی۔ کیونکہ ہوائی جہاز پر سفر کرنا بیکار تھا، لینڈ روٹ سے جا کر کچھ پیسے بچائے جا سکتے تھے۔ جو ظاہر ہے کام آتے۔ اس روٹ کا ایک دن دیپک نے ذکر کیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی اسی روٹ سے جرمنی جا چکا تھا۔ وہاں کابل پہنچنے پر ایک دو ہوٹلوں سے پتہ کرنے پر جہاں کچھ اور ہندوستانی بھی ٹھہرے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ دیپک وہاں آیا تھا، لیکن چند دن پہلے جرمنی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ مینا نے بھی کمر کس کے زندگی کے طویل سفر میں خود کو طوفان کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا۔ بے شک اُسے اِس حالت میں سفر کرنے پر بے حد تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ذہنی و جسمانی دونوں ہی! —— اُسے ڈر تھا، کہیں بچہ سفر کے دوران ہی - - - - - یہ سوچ کر وہ کانپ جاتی۔

پھر —— پھر نہ معلوم کیا ہو ——؟

www.taemeernews.com

کابل کے بعد اُسے ایران سے گزرنا تھا۔ جب وہ تہران پہنچی تو اچانک ایک لڑکے پر نظر پڑی جو ان کے گھر (ہندوستان میں) کے قریب ہی رہتا تھا اور دیپک سے واقف تھا۔ مینا نے اُس سے دیپک کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے بتایا۔

"ہاں میں نے اُسے یہاں ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ تب اُس نے جرمنی جانے کا ذکر کیا تھا۔ یہ رہا اُس کا پتہ۔ میں بھی شاید اُسے وہاں ملوں گا۔۔۔۔"

مینا نے اُس سے ایڈریس لے لیا اور پھر اپنی منزل کی سمت گامزن ہو گئی۔ لیکن کیا واقعی وہ اُس کی منزل ہو گی یا ایک اور پڑاؤ ۔۔۔۔؟

خیر مینا اُس ایڈریس پہ جرمنی پہنچی۔ راستے میں تہران سے میونخ جاتے ہوئے ایک جرمن جوڑے سے واقفیت ہو گئی تھی۔ سات دن کا راستہ تھا۔ تمام وقت وہ تقریباً ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی تین بیڈ والا کمرہ لیتے تھے، تاکہ کہیں اُسے رات کو اُن کی ضرورت نہ پڑے۔ اس لیے ان سات دنوں میں اکٹھے کھاتے، بیٹھتے، سفر کرتے، وہ کافی قریب آ گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی ٹیچر تھے اور انگریزی جانتے تھے۔ اس لیے زبان کی دقت بھی نہیں پیش آئی تھی۔ وہ راستے بھر بے حد مددگار ثابت ہوئے تھے اور انھوں نے مینا کو اُس کے پتے پر پہنچانے کا بھی وعدہ کیا۔ کیونکہ انھیں میونخ پہنچنے کے بعد اگلے شہر ۴۰۰ کلومیٹر آگے جانا تھا۔ اور اُس کے درمیان اُن کے پاس چار پانچ گھنٹے کا وقفہ تھا۔۔۔۔۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر انھوں نے دروازے پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ ایک لڑکی نے دروازہ کھولا جو شاید جرمن ہی تھی مینا نے دیپک کے بارے میں پوچھا تو وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگی:

"کیا بکتی ہو تم دیپک کی بیوی ہو؟ اُس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی، ہم دونوں جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔ رجسٹرار کے یہاں تاریخ بھی بُک ہو چکی ہے!۔۔۔۔"

اور اس کے ثبوت میں اُس نے دیپک کا ایک خط دکھایا۔ جو 'میری جان من' سے شروع ہو کر۔ صرف تمھارا ہی' سے ختم کیا گیا تھا۔ جس میں اپنی محبوبہ کی شان میں قصیدے پڑھے گئے تھے اور وہ تمام باتیں جو ایک لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ تبھی اُس لڑکی نے مینا کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور اُسے یونہی کھڑی چھوڑ کر کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔۔۔

۔۔۔ ہوں ۔۔۔ تو اب ایک اور لڑکی کو محبت کا جھانسا دیا جا رہا تھا۔ اور ایران میں وہ لڑکی ۔۔۔۔۔؟ ۔۔۔

وہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑتی، مگر اُس کا کچھ کر گزرنے کا مصمم ارادہ، وہ عزم جس نے اُسے تقویت بخشی اور اُس معصوم جان کی فکر جو اس ظالم دنیا میں آنے کے لیے کشمکش میں تھی۔۔۔۔

لیکن اُس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا، وہ کیا کرتی۔؟ کسے سُناتی اپنی المناک داستان۔؟ اب کیا ہو گا۔؟ سر پہ چھت تک نہیں اور ایک اجنبی ملک۔ ماں باپ کے بعد دوسرا گھر شوہر کا ہوتا ہے 'وہ گھر۔ جہاں اُس نے آنکھ کھولی۔ اُسے خیرباد کہا۔ اور چپکے سے دیپک سے ناتا جوڑ بیٹھی، اس مبہم امید پہ کہ شاید وہ تمام مسرتیں جن سے وہ آج تک محروم رہی، اُس کے پیار میں ڈوب کر میسر ہو جائیں۔ یہ اُلفت کا سرچشمہ اُس کی بنجر زندگی کو شاداب کر دے۔ مگر یہاں بھی قدرت کی ستم ظریفی نے اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جسے اُس نے دل و جان سے چاہا، زندگی سے بڑھ کر محبت کی، جس کے لیے ماں باپ کی دشمنی مول لی۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کی حقارت بھری نظروں کے نشتر سہے۔ اُس نے کیا دیا۔ ۔۔۔؟ چند پیار بھرے میٹھے بول تک

www.taemeernews.com

نہیں ؟ — جس کے لیے وہ زندگی بھر ترستی رہی ۔ نہ کبھی ماں باپ کا پیار ملا ، نہ بڑے بھائیوں نے شفقت بھرا ہاتھ سر پہ رکھا ، اور بھابیاں ۔۔ ؟ خدا کی پناہ ۔ ! اُس نے ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کی تمنا کی تھی ، جس میں ایک مہکتا گلاب اُس خون سے سینچے گلستان کے سونے پن کو اپنی خوشبو سے آباد کرتا ۔۔ لیکن سب رنگین خواب ریت کے گیلے ڈھیر کی طرح بہہ نکلے !
گلاب ۔۔۔۔ ہاں گلاب اُگے گا تو ۔۔۔۔ لیکن کسی ویرانے میں ؟ ۔۔۔ جنگل کے کس دہانے پر ۔۔ ؟ جہاں کوئی اُس کی رنگ و بو کی نمایش کرنے والا نہ ہوگا ۔۔۔۔۔ !

نہ جانے کب تک وہ اس عالم میں کھڑی رہتی ، تبھی اُس نے جرمن لڑکی کو اپنے شوہر سے اپنی زبان میں کچھ کہتے سُنا ۔ وہ سمجھ تو نہیں سکی ، کہ اُن کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ۔ لیکن تبھی وہ مینا سے مخاطب ہوئی تو اُسے علم ہوا ۔ کہ وہ مینا کو اپنے ساتھ انھیں کے گھر جانے کی دعوت دے رہی تھی ، کیونکہ وہ خدا ترس لوگ اُسے اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھے ۔ اُنھوں نے اُس نام نہاد دلہن کی ، جو شادی کے خواب میں مگن تھی ، باتیں سُن لی تھیں ۔ اب مینا کے سامنے اور کوئی راستہ تو تھا نہیں ۔ اُسے محسوس ہوا جیسے خدا ہی ان فرشتوں کی صورت میں اُس کی مدد کو آن موجود ہوا ہو ۔ اُس نے سوچا ، یہ زندگی ۔ یہ دنیا بھی ایک پہیلی ہے ، ایک عجائب خانہ ہے ، جہاں خون کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور کیسے یوں غیر ملک ۔ غیر قوم کے یہ لوگ ، وہ جن کی زبان بھی نہیں جانتی ، آج اس نازک موڑ پر مل گئے جہاں وہ تنہا ہے ۔ جہاں اُس کا اپنا کوئی نہیں ۔۔۔۔۔ ؟ لیکن نہیں ۔ کیا یہ لوگ اپنوں سے بڑھ کر نہیں ۔۔۔۔ ؟

مینا نے جرمنی میں اُن کے یہاں ایک ہفتہ قیام کیا ۔ ہالیز (شوہر) کی تین بہنیں تھیں اور بوڑھی دل کی مریض ماں ، باپ کا انتقال ہو چکا تھا ۔ وہ خود اور چاروں (بہنیں اور ماں) اُس کے لیے بچھ بچھ گئے ۔ ان سات دنوں میں انھوں نے مینا کے آرام اور دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ۔ پہلی بار کوئی ہندوستانی اُن کی مہمان بنی تھی ۔ جیسے مینا کے لیے اُن کے دل میں پیار اور محبت ، ہمدردی ، سیوا کے لگن کے سوتے اُبل پڑے ہوں ۔ ان تمام جذبات میں وہ ڈوب ڈوب گئی ۔ بوڑھی ماں اپنی بیماری کے باوجود ہر لمحے اُس کی تیمارداری میں جٹی رہتی ۔ وہ ایک لفظ بھی انگریزی نہیں جانتی تھی ۔ مگر جرمن ۔ انگریزی ڈکشنری کی مدد سے چند لفظ سمجھانے کی کوشش کرتی ، مثلاً کھاؤ Essen سو جاؤ (Shalafen) شاید اُس کے خیال میں مینا کو انھیں دو چیزوں کی ضرورت تھی ۔ ایسے لمحوں میں "اُس ماں" کی آنکھوں میں اکثر اُسے آنسو نظر آئے جنھیں وہ ہمیشہ پی جانے کی کوشش کرتی ۔ شاید اُس کے تصور میں یہ آتا ہو ۔ اگر کہیں اُس کی لڑکی اِن حالات سے دوچار ہوتی ہے ۔ (گو مغرب کی دنیا میں کئی قسم کے واقعات ہوتے ہیں ، مگر ایسا کبھی نہیں ۔۔۔ !)

اُن دونوں میاں بیوی کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں ، بوڑھی ماں کہاں تک خدمت کرتی ، پھر زبان کا بھی مسئلہ تھا ۔ اس لیے انھوں نے طے کیا کہ مینا کو انگلستان بھیج دیا جائے ۔ انھوں نے اپنے کسی دوست سے ٹیلیفون پر رابطہ قایم کیا اور سب انتظامات کے ساتھ اُسے وہاں روانہ کر دیا ۔ اُس انگریز کنبے نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ مینا سوچتی رہی ۔ کیا یہ اتنے رحم دل مددگار انسان بھی اُسی جرمنی کے باشندے ہیں ۔ ؟ جہاں نازیوں نے یہودیوں کو یورپ کی سطح سے مٹانے کا عزم کیا تھا ، اور اُن پر کیا کیا ستم ڈھائے اور کیا کیا قہر توڑے ، جہاں ہٹلر جیسا شخص پیدا ہوا ! خیر سبھی چوپائے گدھے ہی تو نہیں ہوتے ۔۔۔ !

انگلینڈ پہنچنے کے چار روز بعد وکی نے اس اندھیری کائنات کا اُجالا دیکھا ، شاید اُس نے سوچا ہو وارد ہو جانے کے

www.taemeernews.com

کے لیے ٹھیک مقام پر آ پہنچا ہوں ——؟

وہ ہسپتال میں تنہا اپنے بیڈ پر پڑی تھی۔ کبھی کبھی اُس کے انگریز میزبان چند لمحوں کے لیے آجاتے تھے۔ مگر اس مشینی دنیا میں کہاں کسی کو اتنی فرصت ہے۔ کہ اس سے زیادہ وقت دے سکیں۔ شام کو جب ملاقات کا وقت ہوتا تو تمام بیڈوں کے گرد بے پناہ ہجوم سا نظر آتا، لوگ تحائف اور رنگ برنگے پھولوں کے گلدستوں سے لدے پھندے آتے۔ اُس ملک میں جہاں بوسہ لینے یا بغل گیر ہونے کی عام جگہوں پر بھی کوئی پابندی نہیں، ہسپتال میں بھی تمام مرد اور عورتیں نئے مہمان کی آمد پر خوشی میں ایک دوسرے کی باہوں میں جکڑے نظر آتے، اور مینا بے چاری اکیلی پڑی پڑی حسرت بھری نگاہوں سے انھیں تکا کرتی — یہ ملاقاتی گھنٹہ۔ ہر روز نئی کسک۔ بلکہ اضافہ کر کے آگے بڑھ جاتا۔! وہ سوچتی ---- کیا محبت کا یہی صلہ ہے؟ کہ آج اس گھڑی میں جب پیار اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی قریب تک نہ آئے ----؟ وہ دیپک کی بے وفائی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی —— مگر کون ہے جو اُس کے آنسو پونچھے؟ ان ملکوں میں رشتے اور جذبات صرف سطحی ہی ہوتے ہیں۔

ایک دن یوں ہی ملاقات کے وقت لوگوں کے تانتے کو دیکھ کر اُس نے سرد آہ بھری۔ کاش اُس کا بھی کوئی عزیز مزاج پُرسی کو آتا۔ وہ چہرے پہ چادر کھینچ کر سسک پڑی۔ تبھی اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کی چادر ہٹانے کی کوشش کر رہا ہو، وہ ادھیڑ عمر انگریز نرس تھی۔ اُس نے پوچھا:-

"آخر کیا بات ہے، تمھیں کوئی ملنے نہیں آیا؟ تم رو کیوں رہی ہو میری بچی ——؟"

مینا اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی، اس نے سسکیوں کے دوران اس نرس کو مختصراً اپنی روداد سُنائی، جسے سُن کر وہ بھی خود کو روک نہ سکی اور مینا کو سینے سے لگا کر رو دی، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی ——

"خدا تمھارا دامن کبھی خوشیوں سے بھرے گا، لیکن مردوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بڑے بے وفا ہوتے ہیں یہ ——!"

مینا کی نگاہوں کے سامنے گزرا زمانہ، ابھی بیتے کل کی طرح گھوم گیا، وقت کی گرد اڑتی گئی اور ماضی عیاں ہوتا گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو مینو؟ ——"

"اوں۔ ہوں کچھ بھی تو نہیں ——!"

"آخر کچھ تو ہے، ہمیں بتاؤ گی نہیں ——؟"

"سوچتی ہوں مستقبل کے بارے میں۔ کیا تم ہمیشہ مجھے یوں ہی پیار کرتے رہو گے؟۔ کہیں دنیا کی طرح بدل تو نہ جاؤ گے؟۔ کبھی کبھی ان جانے خوف سے لرز جاتی ہوں —— اگر ایسا ہوا ------ تو -----؟"

"آخر یہ کبھی کبھی تمھیں کیا ہو جاتا ہے، ایسا اول جلول کیا بکنے لگتی ہو، میری آنکھوں میں دیکھو۔ کیا تمھیں میری محبت پر اعتبار نہیں ——؟"

—— اور وہ سچ مچ ہی اُس کی نگاہوں کے آب گینوں میں کھو جاتی، دنیا و مافیہا سے بے نیاز ——! مستقبل سے بے خبر ——!

www.taemeernews.com

تبھی وِکی کے رونے کی آواز اُسے حال کی تلخ حقیقت میں کھینچ لائی، وہ اُسے چپ کرانے لگی ـــــ وہ لُوڈن کے وِکی کو لے کر ہسپتال سے اپنے انگریز مہربان دوستوں کے ہاں لوٹ آئی (اِن ملکوں میں لوگ دوست کہلوانا ہی پسند کرتے ہیں) وہ ہر چند کوشش کرتے کہ وہ خوشی سے رہے۔ کبھی اُس کے ماضی کو کُریدنے کی کوشش نہیں کرتے، تاکہ اُس کے سوئے ہوئے زخم بیدار نہ ہو جائیں۔ مگر اُن ناسوروں کو نیند آتی ہی کب تھی ـــــ؟ کیا اُلفت اتنا بڑا جرم ہے، کہ اُسے یہ سزا ملے ـــــ؟ یہ گم نامی کی زندگی جینا پڑے ـــــ؟ یہ تنہائی کے دن۔۔۔۔ یہ طویل کالی اُداس راتیں۔ ناگن کی طرح ڈستی ہوئی ـــــ کیا یہی زندگی ہے ـــــ؟ اس انگریز میاں بیوی کے دونوں بالغ بچے کسی دوسرے شہروں میں اپنی آزادی سے رہتے تھے۔ جو یہاں کا طرزِ زندگی ہے۔ بوڑھے ماں باپ کے پاس رہنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہ دونوں کام پہ چلے جاتے، اور مینا دن بھر ننھے وِکی کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ نہ وہ اڑوس پڑوس میں کسی سے واقف تھی۔ لوگ یہاں اپنے اپنے خول میں بند رہتے ہیں۔ آخر وہ کب تک اُن کے رحم و کرم پہ پڑی رہے گی۔ یوں وہ بے حد مہذبانہ ڈھنگ سے پیش آتے۔ پھر بھی اُسے زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا ہو گا ـــــ

رات کے دو بج چکے تھے، مگر مینا کی آنکھوں میں نیند کہاں ـــــ؟ اُس کے کمرے کی بتی ابھی تک روشن تھی۔ تبھی وہ انگریز عورت اُس کے کمرے میں اُجالا دیکھ کر اندر چلی آئی۔ شاید بتی بجھانے۔ اُس نے سوچا ہو گا کہیں مینا کو نیند آ گئی ہو اور بتی جلتی رہ گئی ہو۔ وہ کسی پارٹی سے لوٹے تھے ـــــ مینا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی جانب دیکھا ـــــ

"کیوں مینا ابھی تک سوئی نہیں ؟ ـــــ" وہ بولی۔۔ "یہ دن رات کا سوچنا، ہر وقت غم میں ڈوبے رہنا، یہ سرد آہیں، آخر کب تک یوں گھُلتی رہو گی ؟ اب اُن پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ ابھی بہت زندگی باقی ہے۔۔ دیکھو نا ـــــ اس ننھی سی جان کو بھی تو پروان چڑھانا ہے۔ اسی کے لیے اور اسی کے سہارے تو یہاں تک پہنچی ہو۔ اگر تم اپنی جان کھو دو گی تو یہ کس کے سہارے جیے گا ـــــ چلو سو جاؤ ـــــ"

اُس نے بڑھ کر مینا کے ماتھے پر ہلکا سا بوسہ دیا اور لائٹ آف کر کے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی ـــــ

مینا نے بچے کو چھاتی سے بھینچ لیا اور ایک نئی صبح کے انتظار میں نیند کی آغوش میں پناہ پانے کے لیے آنکھیں موند لیں ـــــ

بیرونِ ملک پاکستانی مطبوعات منگوانے کے لئے

محمد اینڈ محمد

۱۸۰۶ پاکستان سے رابطہ قائم کیجیے ۳/۶ - ڈی ۴/ ناظم آباد کراچی -

www.taemeernews.com

ن ۔ م ۔ راشد ۔ ابن انشا ۔ نسیم شمائلپوری ۔ اکبر حیدر آبادی ۔ جاوید قمر ۔ موج فرازی ۔
میر بشیر ۔ ساقی فاروقی ۔ بشیر کوثر ۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری ۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی ۔
سوہن راہی ۔ بخش لائلپوری ۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کریم ۔ حسین مشیر علوی ۔ ڈاکٹر
صفی حسن ۔ صدیق فن کار ۔ حکیم غلام نبی ۔ منیر احمد ۔ اندر آرزو ۔ غلام قادر آزاد
آصف فاروقی ۔ ابرار حسین ترمذی ۔ ایم ۔ اختر ۔ اختر ضیائی ۔ افتخار عارف ۔ امجد مرزا
انجم خیالی ۔ انیس انور ۔ ایمان اخلاقی ۔ ڈاکٹر برلاس ۔ جبیر سنگھ بسمل ۔ محمد شریف بقا ۔

شاعری

غلام علی بلبل
اشرف پرواز
محمد صادق جامی
جمیل احمد مدنی ۔
حامد محمود ۔

بہار کاشمیری
سکندر محمد خان تاج
سید احسن ہزاروی جاوید
جوہر زاہری ۔
حبیب حیدرآبادی

حسن ڈبائیوی ۔ خادم کاظمی ۔ خالد بزمی ۔ خالق بھٹی ۔ عقیل دانش ۔ راج کھیتی ۔ اطہر راز ۔
رانی شہناز ۔ رحمت قرنی ۔ رفیعہ قریشی ۔ رونق کاشفی ۔ رہبر مرزا ۔ زہرہ نگاہ ۔ سحاب قزلباش
سرور بخاری ۔ سعید آغا ۔ یٰسین رحمان خان سوری ۔ صداقت حسین سوز ۔ شاکر لدھیانوی
صدیقہ حبیب شبنم ۔ عبدالحمید شرار ۔ سجاد حسین شمسی ۔ سید ضمیر حسین ضمیر ۔ طلعت سلیم ۔
ظفر کاشمیری ۔ عابد نظامی ۔ عابد ودود ۔ موہن سنگھ عاجز ۔ عاصی کاشمیری ۔ عبدالعلیم صدیقی
عطا جالندھری ۔ عیش ناصری ۔ غیاث قریشی ۔ فیروزہ جعفر فضا ۔ قدیر احمد ۔ یوسف قمر ۔
جلیل احمد کامی ۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد ۔ حسن اجمل مسرت ۔ نجم نقوی ۔ نجمہ عثمان ۔
نرجس اسلام نگہت ۔ نیاز بھٹی ۔ ہادی شمسی ۔ یوسف مرزا ۔ بقرا نجم ۔

www.taemeernews.com

سخن ناگفتہ

پاکستان اور بھارت تو بلا شبہ اردو کے دو بڑے مرکز ہیں اور یہاں کے شعرا کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن ان مرکزوں کے علاوہ انگلستان ہی وہ تیسرا بڑا مرکز ہے جہاں اردو کے شعرا کی تعداد سیکڑوں میں ہے —

چار سال قبل جب ہم نے اس خاص ایڈیشن کی تیاری کا آغاز کیا تھا تو تمام ممکنہ ذرائع سے ہم نے انگلستان کے شعرا کی پہلے ایک جامع فہرست تیار کی پھر اُسے حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا اور اسے تین چار مرتبہ انگلستان بھیج کر بعض ادبی اداروں اور ذمے دار شخصیتوں سے درست کرایا تاکہ غلطی کا کم سے کم امکان رہے۔ اس فہرست کی رو سے بھی انگلستان میں دو سو کے لگ بھگ شاعر موجود ہیں۔ ادیب، محقق، ریسرچ اسکالر، ریڈیو اور ٹیلی وژن سے متعلق شخصیات ان کے علاوہ ہیں جو یقیناً سو سے زائد ہیں — شعری حصے میں جن شعرا کی تخلیقات اور انتخاب کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے بارے میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انگلستان کے یہی نمایندہ شاعر ہیں۔ تمام تر سعی و کاوش کے بعد شعری حصہ مرتب کیا گیا ہے۔ پھر بھی ہماری یہ پیش کش حرفِ آخر نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ شعرا کا جو وہاں دور دراز علاقوں میں آباد ہیں۔ ہمیں علم نہ ہو یا چند شعرا ایسے ہوں جن کا کلام ہمیں دستیاب نہ ہوا ہو۔ اس کوتاہی یا مجبوری کے لیے ہم یقیناً پیشگی معذرت خواہ ہیں۔ کیونکہ انگلستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر۔ برطانیہ میں اردو۔ ایڈیشن ایسی خاص اشاعت پیش کرنے کی پہلی بار صرف افکار نے ہی جرأت کی ہے جسے یقین ہے کہ انگلستان کے اردو دوست پسند فرمائیں گے اور آیندہ کے لیے رہبری بھی فرمائیں گے۔ شاید کبھی اس خاص اشاعت کو دوبارہ شایع کرنے کی نوبت آجائے۔ پاکستان اور بھارت کی طرح انگلستان میں بھی مشاعرے کی روایت پوری آب و تاب سے زندہ ہے۔ وہاں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصاً لندن میں۔ دور دراز علاقوں سے شعرا لندن آتے ہیں اور مشاعروں کی رونق ہی نہیں بڑھاتے، مشاعروں کی دیرینہ روایت کو بھی استحکام بخشتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اگر انگلستان کے اردو دوست ٹھوس علمی و ادبی کام بھی انجام دیتے رہیں۔ مثلاً ادبی کتابوں کی اشاعت 'شعرائے انگلستان کے مجموعے' تذکروں کی ترتیب و اشاعت وغیرہ تو انگلستان میں اردو ادب کی تاریخی حیثیت کا تعین کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے — شعری حصے کی ترتیب و تدوین دیگر ذرایع کے علاوہ فریدہ شیخ کے مشہور ہفت روزہ "راوی" اور محمد شریف بقا کے مرتب کردہ انتخاب "برطانیہ میں اردو شاعری" سے بھی ہم نے بھرپور استفادہ کیا ہے جس کے لیے ہم ان دونوں کے شکر گزار ہیں —

آخر میں ایک ضروری وضاحت — انگلستان میں مقیم پاکستان کے تین سربرآوردہ شعرا طویل یا مختصر قیام کے دوران وفات پاگئے۔ اُن کے قیام انگلستان کی یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے ہم نے حصۂ نظم کی ابتدا ن۔ م۔ راشد اور ابن انشا کی نظموں سے اور انتخاب غزلیات کا آغاز ابن انشا اور نسیم شاملپوری کی غزلیات سے کیا ہے۔ اس کے بعد بہ ترتیب حروفِ تہجی انگلستان کے اردو شعرا کا انتخاب شامل کیا ہے —

سحر انصاری — صہبا لکھنوی

www.taemeernews.com

ن۔م۔راشد

نیا آدمی

نوا اور سازِ طرب ——

یہ سازِ طرب ہیں نوائے تمنا
نوائے تمنا پہ کوچے کے لڑکوں کے پتھر
یہ پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سرور

نئی آگ، دل

دلِ ناتواں کی نئی آگ سب کا سرور
نئی آگ سب سے مقدس ہمیں
اسے آج کس کس کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھائیں!
نئی آگ کے کس کو معنی سمجھائیں؟
نئی آگ ہر چشم و لب کا سرور
نئی آگ سب کا سرور!

روایت، جنازہ

خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا!

www.taemeernews.com

جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے
گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب
ریا کار لوگوں کو شور و شغب کا سرور!

نئے آدمی کا نزول ——
اور اُس پر غضب کا سرور
[نئے آدمی کی اس آمد سے پہلے
مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں
— زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑیے —]
نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی
اور اس پر پُرانے نئے بھیڑیوں کی فغاں
فغاں کا غضب اور غضب کا سرور!

نئے آدمی کا ادب ——
ادب اور نیا آدمی
نئے آدمی کی طلب کا سرور
نئے آدمی کے گماں بھی یقیں
گماں، جن کا پایاں نہیں
گمانوں میں دانش، برہنہ درختوں میں بادِ نسیم
برہنہ درختوں کے دل چیرتی
نئے آدمی کا ادب
اور نئے آدمی کے ادب کا سرور!

www.taemeernews.com

ابن انشا

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو اُدھار کی حاجت ہے
ہے کوئی، جو ساہوکار بنے ؛
ہے کوئی جو دیون ہار بنے ؛
کچھ سال، مہینے، دن لوگو!
پر سُود بیاج کے بن لوگو!
ہاں، اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں، عمر کے توشہ خانے سے

کیا کوئی بھی ساہوکار نہیں؟
کیا کوئی بھی دیون ہار نہیں؟
جب نام اُدھار کا آیا ہے
کیوں سب نے سر کو جھکایا ہے
کچھ کام ہمیں نپٹانے ہیں
جنھیں جاننے والے جانتے ہیں
کچھ پیار دلار کے دھندے ہیں
کچھ جگ کے دوسرے پھندے ہیں

ہم مانگتے نہیں ہزار برس
دس پانچ برس، دو چار برس
ہاں، سُود بیاج بھی دے لیں گے
ہاں، اور خراج بھی دے لیں گے
آسان بنے، دشوار بنے
پر کوئی تو دیون ہار بنے

تم کون؟ تمھارا نام ہے کیا؟
کچھ ہم سے تم کو کام ہے کیا؟
کیوں اس مجمع میں آئی ہو؟
کچھ مانگتی ہو؟ کچھ لائی ہو؟
یہ کاروبار کی باتیں ہیں
یہ نقد اُدھار کی باتیں ہیں
ہم بیٹھے ہیں کشکول لیے
سب عمر کی نقدی ختم کیے
گر شعر کے رشتے آئی ہو
تب سمجھو جلد جُدائی ہو

www.taemeernews.com

اب گیت گیا، سنگیت گیا
ہاں شعر کا موسم بیت گیا
اب پت جھڑ آئی پات گریں
کچھ صبح گریں، کچھ رات گریں

یہ اپنے یار پُرانے ہیں
اک عمر سے ہم کو جانے ہیں
ان سب کے پاس ہے مال بہت
ہاں، عمر کے ماہ و سال بہت
ان سب کو ہم نے بُلایا ہے
اور جھولی کو پھیلایا ہے
تم جاؤ، ان سے بات کریں
ہم تم سے نا ملاقات کریں

کیا پانچ برس؟
کیا عمر اپنی کے پانچ برس؟
تم جان کی تھیلی لائی ہو؟
کیا پاگل ہو؟ سودائی ہو؟
جب عمر کا آخر آتا ہے
ہر دن صدیاں بن جاتا ہے

جینے کی ہوس ہی نرالی ہے
ہے کون جو اس سے خالی ہے
کیا موت سے پہلے مرنا ہے؟
تم کو تو بہت کچھ کرنا ہے

پھر تم ہو ہماری کون بھلا
ہاں تم سے ہمارا کیا رشتہ؟

کیا سُود بیاج کا لالچ ہے؟
کسی اور خراج کا لالچ ہے؟
تم سوہنی ہو، من موہنی ہو!
تم جا کر پوری عمر جیو!
یہ پانچ برس، یہ چار برس
چھِن جائیں تو لگیں ہزار برس

سب دوست گئے، سب یار گئے
تھے جتنے ساہوکار، گئے
بس ایک یہ ناری بیٹھی ہے!
یہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیسی ہے؟
ہاں عمر ہمیں درکار بھی ہے!
ہاں جینے سے ہمیں پیار بھی ہے

جب مانگیں زندگی کی گھڑیاں
"گستاخ انکھیاں کت جا لڑیاں"
ہم قرض تمہیں لوٹا دیں گے
کچھ اور بھی گھڑیاں لا دیں گے
جو ساعت و ماہ و سال نہیں
وہ گھڑیاں جن کو زوال نہیں
لو اپنے جی میں اُتار لیا
لو ہم نے تم سے اُدھار لیا

www.taemeernews.com

اکبر حیدرآبادی

مہا رتھ اور بوڑھا برگد

رتھ کے پہیے
کبھی تیزی سے کبھی آہستہ
گھومتے رہتے ہیں
اور وقت کا قالین سمٹتا ہی چلا جاتا ہے
سلوٹیں چہرۂ تازہ پہ ابھرتی ہی چلی جاتی ہیں
رتھ کے پہیے نہیں ممنون کسی روغن کے
گھومتے رہتے ہیں بے عہد ستاروں کی طرح
حلقۂ رنگ میں جکڑی ہوئی فصلوں کی طرح
سال خوردہ کوئی برگد کسی ویرانے میں
اپنی لہراتی ہوئی ریش مقدس کی درازی کا اسیر
اپنے گرتے ہوئے پتوں کی تڑختی ہوئی شاخوں کی صداؤں سے
سراسیمہ ہراساں، لرزاں
دور پھیلے ہوئے نادیدہ کسی جنگل میں
دیکھتا رہتا ہے انجانی بلاؤں کا بھیانہ خروش
وہی برگد وہی دانا —— وہی پیر
اپنی ہی ریشِ مقدس کی درازی کا اسیر
برف دل یادوں کے چھتنار میں یخ بستہ برہنہ اندام
دیرے ہجر زدہ
اُن پرندوں کی جدائی پہ لہو روتا ہے
جو کبھی اُس کے گھنے سائے میں دو پل کے لیے
شاخساروں پہ رُکے
زمزمہ پرداز ہوئے
اور پھر مائلِ پرواز ہوئے!

www.taemeernews.com

جاوید قمر

نام اور آدمی

آدمی رازِ فلک، روحِ زمیں
آدمی شعلہ فشاں، چیں برجبیں
آدمی دارالاماں، راحت مکیں
آدمی عظمت نشاں، عظمت نشیں
آدمی سب پر مقدم سب کا دیں

نام اک ننھی صدا رنگوں کی پوٹ
نام ہونٹوں کی ہنسی اور دل کی چوٹ
نام اک ننھا سا کانٹا ایک پھول
نام اُترن، نام سایہ، نام دھول

موت حادی، آدمی زیرِ نگیں
نام زندہ، آدمی زیرِ زمیں
نام گویا موت سے ناآشنا
نام سب کچھ آدمی کچھ بھی نہیں

www.taemeernews.com

موج فرازی

نذرِ خسرو

اے امیرِ مجلسِ مے خانۂ دیر و حرم
اے زبانِ لشکری کے تاجدار و یلدرم
خسروِ اقلیم اُردو خسروِ اہلِ قلم
اس زمیں پر تا ابد لہرائے گا تیرا علم
تجھ مبارک ہند میں اجداد کے تیرے قدم

تیری افتادِ طبیعت ہو نہیں سکتی رقم
اے امیرِ مجلسِ مے خانۂ دیر و حرم
خسروِ اقلیم اُردو خسروِ اہلِ قلم

تیری فطرت کا کرشمہ تیری جدت کا کمال
ہو نہیں سکتا کبھی کارِ نمایاں کو زوال
میر و سودا، ذوق و غالب، جوش و حسرت، ہیں مآل
عشق سکھلایا ہے تونے وہ بھی تا حدِ وصال
وصل کی اب اور بہتر ایسی کیا ہو گی مثال

اپنے مرشد کے لیے تو چل دیا سوئے عدم
اے امیرِ مجلسِ مے خانۂ دیر و حرم
خسروِ اقلیم اُردو خسروِ اہلِ قلم

www.taemeernews.com

موج فرازی

نذرِ خسرو

ہم رواں ہیں سیل کی منہ زور موجوں کی طرح
اب تو ہم بھی بولتے ہیں اور قوموں کی طرح
تیز رکھتے ہیں زباں بھی منھ میں اوروں کی طرح
ہم زمیں پر ثبت ہیں اب تیرے قدموں کی طرح
سر مہم سر کر چکے، جرار فوجوں کی طرح

ہے زبانِ لشکری پر کس قدر تیرا کرم
اے زبانِ لشکری کے تاج دار و یلدرم
خسروِ اقلیمِ اردو خسروِ اہلِ قلم

اک دیا تو نے جلایا سب دیے جلنے لگے
اک کلی کیا کھل گئی سرو سمن ہنسنے لگے
وقت کی آواز میں سنگیت بھی ڈھلنے لگے
شعر کے آغوش میں راگوں کے سُر پلنے لگے
بجوری چوری شیخ جی کے ہاتھ بھی چلنے لگے

کر دیا مضبوط تو نے رشتۂ دیر و حرم
اے زبانِ لشکری کے تاج دار و یلدرم
خسروِ اقلیمِ اردو خسروِ اہلِ قلم

خار و خس کا ڈھیر تھا اب تو نشیمن ہو گیا
سب سمجھتے تھے جسے صحرا وہ گلشن ہو گیا
ٹاٹ کا پردہ جو پہلے تھا وہ چلمن ہو گیا
رفتہ رفتہ اک نگاہِ تیر افگن ہو گیا
لذتِ غارت گرِ ایمان و خرمن ہو گیا

تو نے مقتل دے دیے تو نے کیے پیدا صنم
اے امیرِ مجلسِ مے خانۂ دیر و حرم
خسروِ اقلیمِ اردو خسروِ اہلِ قلم

(اکیڈیمی آف اردو اسٹڈیز کے زیرِ اہتمام "جشنِ خسرو" منعقدہ لندن میں پڑھی گئی)

www.taemeernews.com

میر بشیر

ڈولتی ناؤ

وقت کی لازوال گردش میں
فکر کی دار و گیر جاری ہے
کم نگاہی کی تیرہ بختی سے
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
اس زمان و مکاں کے قلزم میں
زندگانی کی ڈولتی ناؤ
ڈگمگاتی ہوئی نہ جانے کہاں
آنِ واحد میں ڈوب جائے گی

www.taemeernews.com

ساقی فاروقی

سائے کا سفر

سرپٹ بھاگتے آدمیوں کے
سائے کٹ کر
ریل کے ڈبوں کی قبروں میں گرتے جائیں
ہانپتے پہیے
سمتوں کے گونگے ساگر میں
شور مچائیں
آنکھوں میں آنسو لہرائیں
ہونٹوں پر بوسے کمھلائیں
جان اُلجھتی جائے

سوچ رہا ہوں
اپنے دھیان کا پردہ کھینچ کے
سب چہروں کے چاند بجھا دوں
سب سمتوں اور سب رستوں کو چکمہ دوں
اور کہیں نہ جاؤں

○

www.taemeernews.com

بشیر کوثر

سوچ

اپنی میز کے ایک ذرا سے خالی رخ پر میں بیٹھا ہوں
میں تنہا ہوں
ایک بڑی سی آنکھ کی وسعت مجھ کو ٹک ٹک دیکھ رہی ہے
جانے کب سے سوچ رہا ہوں
آنکھ میں جھانکوں
دیکھوں

اس میں کیسے کیسے عکس چھپے ہیں
جو کبھی نظروں سے ڈھل کر
اس میں پیہم ناچ رہے ہیں
مجھ کو ہر دم گھور رہے ہیں

میں تنہا ہوں
جانے کب سے سوچ رہا ہوں
اپنی میز کے ایک ذرا سے خالی رخ پر میں بیٹھا ہوں
اک مٹی کے پھول دان میں نرگس کی ایک شاخ رکھی ہے
اک پھول ہے
اک کلی ہے
اک پتی ہے

پھول کی نظریں ڈوب چکی ہیں
کلی نے پلکوں کو سرکایا
اک پتی کی اوٹ سے جیسے چپکے چپکے جھانک رہی ہے
شاید مجھ کو دیکھ رہی ہے

تاکہ اس کے راز کو پاؤں
اس کی پلکوں میں چھپ جاؤں

اک کالی سی ایش ٹرے ہے
چھوٹی چھوٹی جلتی آنکھیں
اپنے راکھ کے آنسو لے کر
شاید مجھ کو دیکھ رہی ہے
تاکہ پھر میں ہاتھ بڑھا لوں
اس لمحے کو امر بنا لوں
چند تراشی ہوئی چٹانیں
ساکت ساکت کتبے لے کر
سر جوڑے خاموش پڑی ہیں

ان میں کچھ موہوم لکیریں
گڈمڈ گڈمڈ ناچ رہی ہیں
شاید مجھ کو دیکھ رہی ہیں

ان کی الجھن کو سلجھاؤں
ان کو اپنے بس میں لاؤں
میں تنہا ہوں
تنہا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کے راز کو پا جاؤں
کس کی پلکوں میں چھپ جاؤں
کس کی خاطر ہاتھ بڑھاؤں
کس لمحے کو امر بناؤں
کس کی الجھن کو سلجھاؤں
کس کو اپنے بس میں لاؤں

میں تنہا ہوں
اپنی میز کے ایک ذرا سے خالی رخ پر میں بیٹھا ہوں
جانے کیا کیا سوچ رہا ہوں

www.taemeernews.com

ڈاکٹر خالد حسن قادری

سیم و جواہر کے رشتے

اب ہوش ٹھکانے ہیں اپنے اب وحشتِ غم بھی دور ہوئی
اب کوئی طلب باقی نہ رہی مہجوریِ دل منظور ہوئی

اس ترکِ تعلق کے دعوے پر ہم سے شکایت کیا معنی
یہ کم نگہی یہ کج کلہی اب عشق کا بھی دستور ہوئی

جو دل پہ بنی ہم پر بیتی چپ چاپ سہی خاموش رہے
ہم تیری شکایت کیا کرتے تو بھی تو بہت مجبور ہوئی

یہ ماہ نوردی انساں کی ناکامیِ انسانیت ہے
آکاشں تو پہلے دور ہی تھا اب آج زمیں بھی دور ہوئی

زخموں کے چراغاں خوں کی شفق اور اہلِ جنوں کی گل کاری
پھر کس نے کہا یہ راہِ طلب بے کیف ہوئی بے نور ہوئی

تقدیر کو جو چاہے کہہ لو تدبیر کوئی جاگیر نہیں
کیا قافلۂ اہلِ دل کا بس ناکامی مقدور ہوئی

یہ رنگِ شفق یہ نورِ سحر، یہ کاذب و صادق کے دھوکے
یاں مہرِ تمنا کب اُبھرا یاں ظلمتِ شب کب دور ہوئی

کلیوں کے دریچے وا نہ ہوئے کیا نکہتِ گل محبوس ہوئی
زہراب کے دو اک چھینٹوں سے شعلوں کی لپک کب دور ہوئی

افلاک کے پردے چاک ہوئے پھولوں کی قبائیں سِل نہ سکیں
انساں کی بالا دستی سے انسانیت مقہور ہوئی

کیا وصل کہاں کا ہجر یہ ہیں کیفیتِ ذہنی کے پردے
وہ راحتِ جاں وہ روحِ رواں کیا پاس ہوئی کیا دور ہوئی

اس شہرِ نگاراں میں ہم سے ہے سب کو تغافل کا شکوہ
کب کوہ ندا کے دیوانوں سے منزلِ جاں مستور ہوئی

جب ہجر کی لو سے یادوں کے سوکھے ہوئے پتے پھیل گئے
پھر شکوے کا کیا موقع ہے رنجش بھی دل سے دور ہوئی

برسات کی بھیگی راتوں میں چوٹوں کے اُبھر آتے ہیں نشاں
ہم یاد کے اپنی گھایل ہیں کس بات پہ تو مغرور ہوئی

معراجِ کمالِ قدوسی آغازِ شعورِ انساں ہے
کیا کوئی حقیقت تجریدی الفاظ میں بھی محصور ہوئی

یہ لطفِ نمایاں بھی ان کا اک پردۂ جورِ نہاں ہے
جو تیر لگا وہ پار ہوا جو بات ہوئی بھرپور ہوئی

پہنچا بھی نہ تھا لب تک اپنے ہاتھوں سے گرا اور ٹوٹ گیا
گو دل کی طلب باقی ہے وہی نظروں کی شکایت دور ہوئی

یہ غنچہ لبی یہ سیم بری یہ سیم و جواہر کے رشتے
سب درد کے ناتے ٹوٹ گئے آنکھوں کی شفق بھی دور ہوئی

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سعید اختر درانی

نشاطِ زندگی

سر در چمکتے ہوئے سورج کی یہ کرنیں
دیوار سے لپٹی ہوئی بیلوں کی یہ زلفیں
یہ سُرخ سے، یہ زرد سے، یہ سبز سے پتّے
آوارہ و آزاد ہواؤں کے یہ جھونکے
اک گہری مسرّت میں ہیں کھوئے ہوئے رقصاں

آزاد ہیں دنیا کے یہ آلام و محن سے
آغوش میں فطرت کی مسرّت سے ہیں کھوئے
دنیا میں جلائے ہوئے یوں حُسن کی شمعیں
اک خواب میں مدہوش ہیں، مست اپنی لگن میں
پروا نہیں ان کو کہ یہ ہیں کون، ہیں کیوں یاں

یہ تتلیاں، یہ پھول، یہ پنچھی، یہ پتنگے
ہر لمحہ مسرّت ہی رگ و پے میں ہے ان کے
فطرت نے کیا صدیوں ریاض اپنی لگن میں
جب جا کے پڑی جان مسرّت کے بدن میں
ہے ان کا سراپا، کہ مسرّت ہے یہ رقصاں؟

جب تک یہ رہے دہر میں، مسرور رہیں گے
انسان کے آلام سے یہ دور رہیں گے
اور آخرِ کار آئی اجل جب ـــ تو نہ ہوں گے
آلام اگر ان کو نہیں اب، تو نہ ہوں گے
کیوں دہر میں افسردہ ہے گر کوئی، تو انساں؟

انسان کو فطرت نے دیے کس لیے جذبات؟
کیوں اُس کو الم ناک بناتے ہیں خیالات؟
کیا اچھا تھا انسان بھی ہوتا اگر آزاد
احساس سے دُکھ درد کے، اور رہتا سدا شاد
کیا زیست بِلا سوزِ دروں ہوتی نہ آساں؟

○

www.taemeernews.com

سوہن راہی

گیت!

آنسو آنسو بکھر گئے ہے
من آنگن میں آگ
برہا نگری درد جگا کر
ناچ رہا ہے پھاگ
دُکھ کی منزل،
سوگ کے رشتے
نس نس آن سمائے
پلکن پلکن خواب جگا کر
چاند نظر نہ آئے
ایک رسیلا گیت پیت کا
ہو گیا دیپک راگ
برہا نگری درد جگا کر
ناچ رہا ہے پھاگ
جس کی صورت سُر میں ڈھل کر
ہونٹوں پہ لہرائے
جو کرنوں کا روپ بدل کر
پھول پھول مسکائے
اُس سورج
اس چاند ستارے
کا چھایا بیراگ
برہا نگری درد جگا کر
ناچ رہا ہے پھاگ

www.taemeernews.com

بخش لائلپوری

ناگن

سُندر خوشہ ڈالی کا — کھا گیا کنبہ مالی کا
سوکھ گیا ہے شاخوں پر — پات پات ہریالی کا
ہے پھولوں کی رنگت میں — خون پسینہ ہالی کا
گُن گاتے ہیں گل چیں کے — پیار جتائیں ڈالی کا
باغ کے اُجڑے چہرے پر — افسانہ ہے مالی کا
اللہ ہی اب حافظ ہے — لالہ رُخوں کی لالی کا
اسلامی اخباروں میں — چرچا ہے دجّالی کا
روپ پہ ہیں بہروپ کئی — صدقہ ہے نقّالی کا
بِک گیا کھوٹی دمڑی میں — رانجھن ہیر سیالی کا
ہاتھ جھٹک کر چھوڑ دیا — ٹوٹ گیا دل بالی کا
آنسو بن کر بہتا ہے — گجرا ہر متوالی کا
چاک گریباں پھرتے ہیں — دور آیا بدحالی کا
کُھل گیا حال فقیروں پر — صورت، مونچھوں والی کا
اپنے گھر کے آنگن میں — رقص ہے ناگن کالی کا
منصف بن کر بیٹھ گیا — ہر اک بینگن تھالی کا
صیادوں کا دعوےٰ ہے — گلشن کی رکھوالی کا
شہر میں سکّہ چلتا ہے — جرنیلوں کی سالی کا

بخش لہو کے دیپ جلا
موسم ہے دیوالی کا

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مصطفےٰ اکریم

دو مختصر نظمیں

لمب لین[1]

یہاں خیمہ زن مرے ہم وطن
جن کی قربت مثلِ شبنم
زیست کے تپتے صحرا میں
لطفِ جاں، لطفِ چمن
یہاں خیمہ زن دمساز مرے
جن کے گھر کے روزن سے
جھانکتی ہیں فسردہ یادیں —
— کھیت، کھلیان، شگفتہ چہرے
دھوپ، چاندنی، دمکتے تارے
حنائی ہاتھ، شریر آنکھیں

[1] بریڈ فورڈ کی ایک سڑک۔

تلاش

رات شفاف، جلوہ فگن مہتاب
شبنمی چاندنی، نیند کی دہلیز پہ خواب
— وادیاں سنسان
جہاں صدیوں پرانے اونچے چٹان
جن پہ کندہ مرے اجداد کے نام
مری جستجو کی وجہ پوچھتے ہیں
مرے پاس چند حروف ہیں
جو نسل در نسل مجھ کو ملے ہیں
ان کو جزا ہے
میں چراغ ڈھونڈتا ہوں

www.taemeernews.com

باقر انجم

اندھیرے کا مسافر

ہزار اشک اپنی خشک آنکھ میں چھپا لیے
ہزار زخم اپنے دل کے طشت میں سجا لیے
تمام رات انتظار کے الاؤ میں جلے
تھکے تو صبح کے کفن میں اپنے منہ چھپا لیے

گراؤ دل کی مورتیں سجاؤ اپنی صورتیں
یہ کھیل کیسا کھیل ہے کہ ہر گھڑی مہورتیں
نہ زحمتِ سکون اور نہ کلفتِ نشاطِ دل
نہ خواب کی مسافتیں نہ ہوش کی صعوبتیں

کہاں کہاں بھٹک رہا ہے رخشِ میرِ کارواں
نہ منزلوں کا علم ہے نہ اعتبارِ ساربان
بس ایک سر بُریدہ جسم دوش پر علم لیے
بسا رہا ہے گام گام اُجڑی اجڑی بستیاں

مرے خدا، مرے نوشتے میں کوئی خوشی تو دے
خوشی نہیں تو کم سے کم ذرا سی روشنی تو دے

www.taemeernews.com

حسین شیر علی

جنسِ کاسد

میں اک مرتی ہوئی تہذیب کا ناکارہ شاعر ہوں
جو اپنے ہی وطن میں رہ رہا ہے اجنبی بن کر
جسے خود باغباں نے سبزۂ بیگانہ ٹھہرایا
نہ ہو جس کا کوئی بھی حق چمن کی اِن بہاروں پر
مرا ہر دوست بس اب تو یہی تلقین کرتا ہے
دیارِ غیر میں کوشش کرو قسمت جگانے کی
ذرا آنکھیں تو کھولو وقت کے تیور تو پہچانو
بدلتی ہیں تمھیں بھی سرخیاں اپنے فسانے کی
خدا آباد رکھے. تجھ کو اے میری جنم بھومی
جہاں فن کار وشاعر دانے دانے کے لیے ترسیں
جہاں اپنی زباں میں بات کرنا جرم ٹھہرا ہو
جہاں جینے کی خاطر اہلِ دانش ایڑیاں رگڑیں
قسم اے ذاتِ واحد تجھ کو اس تخلیقِ عالم کی
تو مجھ سے درد کی یہ دولتِ بیدار بھی لے لے
قسم تجھ کو اسی لوح و قلم کی عرشِ اعظم کی
متاعِ سونے نطق گوہر بار بھی لے لے

کہ ایسی بزم میں نطق و زباں رکھنے سے کیا حاصل
بٹھاتے جا رہے ہوں عقل و دانش پر جہاں پہرے
جہالت. بولتی ہے جس جگہ محراب و منبر سے
جہاں ادراک پر چلتے ہوں ظلم و جور کے آرے
میں حیراں ہوں کہ کیا سمجھاؤں اور پھر کس توقع پر
کہ یوں کرتے رہو گے امتیازِ این و آں کب تک
یہ مانا آج سی سکتے ہو دنیا کی زباں لیکن
یوں ہی اٹھتا رہے گا قلبِ شاعر سے دھواں کب تک
زمانے کا تقاضا ہے یہی تاریخ کہتی ہے
مذاقِ انجمن رنگِ سخن طرزِ کہن بدلو
کہ نفرت کا چلن اب اٹھ رہا ہے بزمِ عالم سے
محبت سے عداوت کو بدل ڈالو وطن والو
محبت اسمِ اعظم ہے ضمیرِ ذاتِ باری ہے
محبت ہی مذاقِ نالۂ دل گیر دیتی ہے
محبت سے ہی دل جیتے ہیں خود سر تاج داروں نے
محبت ہی چٹانوں کا کلیجہ چیر دیتی ہے

www.taemeernews.com

ڈاکٹر صفی حسن

روسیاہی

مرے رفیقوں نے دوستوں نے
شبِ فسردہ کی ظلمتوں میں
نظر سے زہرِ ستم پلا کر
کبھی ہنسا کر کبھی رُلا کر

یہ سوچا میرے لہو سے شاید
نئی رُتوں کا شفیق سورج
پھر ان کے دامانِ آرزو کی
نڈھال صبحوں کو حسن دے گا
مرے لہو سے سحر بھی مہکی مرے لہو سے چمن بھی مہکا
مگر ابھی تک اُن آنگنوں کی خجالتوں کا چلن وہی ہے
نہ ان کے چہروں کے داغ ہی کم
نہ وہ ریا کے چراغ مدّھم
ابھی تقدّس کے آئینے میں
وہی خصومت وہ کج کُلاہی

وہی نصیبوں کی تیرہ بختی
وہی مقدر کی رُوسیاہی

www.taemeernews.com

صدیق فن کار

ایک نظم

میں جب قرطاس پر جُھک کر
تری نظموں کو پڑھتا ہوں
مرے نمناک نینوں سے
کئی موتی نکلتے ہیں
مری عینک کے شیشوں پر
ٹپک کر ٹوٹ جاتے ہیں
یہ موتی ٹوٹ کر دُھندلا سا کر دیتے ہیں شیشوں کو
مری عینک کے یہ شیشے،
یہ شیشے میری آنکھیں ہیں
تُو کیا جانے کہ کتنی بار شیشے صاف کرتا ہوں
تری نظموں کو پڑھتا ہوں

○

www.taemeernews.com

حکیم غلام نبی حکیم

بدمعاش

ایک بیگم نیم عُریاں، بر سرِ بازار فاش
کہہ رہی تھیں اک جواں کو بے حیا اور بدمعاش

راہ چلتی عورتوں کو گھورتا پھرتا ہے تُو
گوہرِ عزّ و شرافت کر دیا ہے پاش پاش

سُن کے وہ بولا ادب سے ہو خطا میری معاف
دعوتِ نظّارہ خود دیتا ہے حسنِ جلوہ پاش

تابشِ خورشید پانی کر رہی ہے برف کو
ماہ کی کرنوں سے موجِ بحر میں ہے ارتعاش

آبروئے حسن کا دریا بہا کر راہ میں
مجھ سے فرماتی ہو "دامن تر مکن ہشیار باش"

ترش روئی حُسنِ عریاں کی بھی کیوں جاذب نہ ہو
منہ میں بھر آتا ہے پانی دیکھ کر لیموں کی قاش

حسن ہنگامہ بپا ہے، عشق ہے شوریدہ سر
وہ ہے سرتاپا خروش اور یہ ہے سرتاپا خراش

ہے قوامِ طینتِ انساں، خمیرِ عشق سے
یہ نہ ہو تو آدمی کیا ہے؟ فقط بے کار لاش

چہرۂ فطرت کی یورپ نے ہے خوب اصلاح کی
آئینہ حسنِ ازل کا کر دیا ہے پاش پاش

کردگارِ حسن تو خود ہے حجاب اندر حجاب
دید کے مشتاق ہیں اہلِ نظر محوِ تلاش

ایک انسانِ معزز کی علامت ہے لباس
اے حکیم اس راز کو بھی تم سمجھ سکتے اے کاش

www.taemeernews.com

منیر احمد

لندن نامہ

(چند جھلکیاں)

انڈر گراؤنڈ ریلوے

مانتا ہی پڑ گیا ہم کو میاں
واقعی لندن میں ہیں کچھ خوبیاں

اس قدر مصروف کاروباری شہر
اور بہم ہر قسم کی آسانیاں

جا بجا انڈر گراؤنڈ ریلوے
سیکڑوں فٹ نیچے جشنِ رہرواں

بے شمار انڈر گراؤنڈ مستقر
لمحہ لمحہ آتے جاتے کارواں

برقی زینے، لِفٹ، سب وے[1]، رہنما
آدمی کو ایسی آسائش کہاں

صاف ستھرے جگمگاتے پلیٹ فارم
روشنی سے روزِ روشن کا سماں

مربوطِ دل، یک بیک آتی ٹرین
پٹریاں، بجتی ہوئی شہنائیاں

مطمئن، محفوظ، سرگرمِ سفر
فکرِ باراں ہے، نہ جورِ آسماں

ٹیوب[2] کا اک جال سا زیرِ زمیں
جوں زمیں کی گود میں ہو کہکشاں

ٹیمز[3] کے نیچے ٹرینوں میں سفر
راہ میں حائل نہیں کوہِ گراں

ریلوے کا راج ہے زیرِ زمیں
دندناتی پھر رہی ہیں گاڑیاں

فنِ تعمیر و ترقی کا کمال
کوشش و کاوش کی لمبی داستاں

جاں فشانی سے ہیں مصروفِ عمل
شہر کی آسائشوں کے پاسباں

انتظاماتِ رفاہِ عام سے
ہو گیا ہے شہر یہ جنّت نشاں

---

[1] بذریعہ انڈی کیٹر پلیٹ فارم پر آنے والی گاڑی کے متعلق ایک سائن بورڈ پر تفصیلات آتی رہتی ہیں کہ وہ کس کس اسٹیشن پر جائے گی۔
[2] ٹیوب یعنی سرنگ [3] ٹیمز سے مراد دریائے ٹیمز جو شہر سے ہو کر گزرتا ہے ——— (م - ا)

www.taemeernews.com

برٹش میوزیم

ضوفشاں ہر دور کے لیل و نہار
نوعِ انسانی کے چہرے کا نکھار

یہ عظیم الشان برٹش میوزیم
عصرِ حاضر کا مثالی شاہکار

اعترافِ عظمتِ علم و ہُنر
فکر و فن کی خوبصورت یادگار

اک ادارہ عالمی تحقیق کا
مرکزِ فیضانِ علم و اعتبار

نازشِ اقوام افروایشیا
ورثۂ تاریخ عالم آشکار

سابقہ سکّے، ظروف، آلاتِ حرب
اک قرینے سے قطار اندر قطار

پتھروں پر داستانیں مرتسم
کج کلاہوں کا درخشندہ وقار

کہنہ تابوتوں میں جھُلسی ممّیاں
جُھریوں سے جھانکتے نقش و نگار

مصر کے فرعون، قیصرہائے روم
وقت کے فرماں روا و شہریار

بازبانِ حال ماضی کے گواہ
حسرت آیاتی کے خود ہی سوگوار

دہر میں فرماں روائی وقت کی
وقت کی بخشش زوالِ اقتدار

کارگاہِ ہست و بود عبرت سرا
اک تماشا ہستیٔ ناپائیدار

ہیں وہی قومیں جہاں میں سربلند
قدرِ علم و فن ہوا جن کا شعار

نیشنل آرٹ گیلری

ماورائے سرحدِ وہم و گماں
دم بخود حیران جامِ جم یہاں

اک مُرقّع عالمِ اسباب کا
ایک نذرانہ بیادِ رفتگاں

کچھ تو یوں ہی کاغذی سے پیرہن
اور بکھرے موئے قلم کی شوخیاں

ڈھل گئے ہیں قالبِ تصویر میں
پیکرِ شعلہ نفس، آتش بجاں

جنّتِ گم گشتہ، فردوسِ خیال
شاہدِ معنیٰ، بیاضِ شاعراں

www.taemeernews.com

پھول سے نازک حسینوں کے بدن / انعکاسِ رامش و رنگِ بتاں
کتنے نادیدہ مناظر عکس ریز / مل گئی جن کو حیاتِ جاوداں
کن عوامل سے گزر کر آئی ہے / ارتقائے زندگی کی داستاں
جنگلوں میں کس طرح رہتے تھے لوگ / کیسے ویرانے ہوئے ہیں گلستاں
بعض سحر انگیز تخلیقی عمل / زندگی آموز راہِ قدسیاں
اپنی آغوشِ محبت وا کیے / مادرِ فطرت سراپا مہرباں
ایک رشتہ، ہر نئی تحریک سے / اک تعلق جسم و جاں کے درمیاں
علم، عرفان و عقائد کا ظہور / حسنِ عالم تاب کی رعنائیاں
پتھروں کے دور سے اس دور تک / نو بہ نو ہر عہد کی کچھ جھلکیاں
بولتی تہذیبِ یونان، مصر و چیں / جاگتا برِّ صغیر ہندوستاں

اتنے عرصے بعد بھی محفوظ ہیں
ارتقائے آدمیت کے نشاں!

دارالمطالعے

تازہ تر ہے نکہتِ فصلِ بہار / آج بھی لندن ہے فخرِ روزگار
شہر ہے گہوارۂ علم و ہنر / روشنی کا بحرِ ناپیدا کنار
جا بجا سرمایۂ لوح و قلم / برتر از اندیشۂ گرد و غبار
نادر و نایاب مخطوطے یہاں / کرتے ہیں صاحب نظر کا انتظار
بین الاقوامی شعوری کاوشیں / معنی و مضموں کے گوہر آب دار
فلسفہ، علمِ فلک، سائنس و طب / علم و دانش کے خزانے بے شمار
یہ کتابیں دعوتِ فکر و نظر / یہ کتابیں باعثِ صد افتخار
یہ کتابیں معدنِ تحقیقِ نو / فاتحِ سیارگاں، گردوں شکار
یہ کتابیں کاشفِ سرِّ نہاں / ہر حقیقت واشگاف و آشکار

www.taemeernews.com

یہ کتابیں مخزنِ سوزِ یقیں　　　یہ کتابیں وجہِ تسکین و قرار
یہ کتابیں کانِ علم و آگہی　　　مونسِ عزلت نشیں و غم گسار
یہ کتابیں درسِ امن و آشتی　　　یہ کتابیں رحمتِ پروردگار
یہ کتابیں دیدہ ریزی کی دلیل　　　یہ کتابیں شاہدِ شب زندہ دار
کشتگانِ وقت بھرتے ہی رہے　　　رنگِ نقشِ زندگانی ہیں ہزار
وقت کی بے رحمیوں کے باوجود
تازہ تر ہے نکہتِ فصلِ بہار

اسپیکرز کارنر[1]

بے جھجک آزادۂ سود و زیاں　　　اپنی اپنی دُھن میں ہر پیر و جواں
ایک گوشہ خوبصورت باغ کا　　　ہر کس و ناکس چہکتا ہے جہاں
قابلِ دید اجتماع اتوار کے　　　بولنے کی سب کو آزادی یہاں
اجنبی انجان لوگوں کے ہجوم　　　بھیڑ بھاڑ ایسی کہ میلے کا سماں
اُلٹی سیدھی بے سر و پا گفتگو　　　اپنا موضوع اپنا اندازِ بیاں
آدمی کی ہر ادا پر تبصرے　　　زندگی کی ایسی تعبیریں کہاں
گاہ ملکی مسئلوں پر گفتگو　　　گاہ زیرِ تبصرہ ہفت آسماں
گاہ جنسی اُلجھنوں کے تذکرے　　　اور مخاطب اک ہجومِ مہ وشاں
فطرتِ انساں پہ اظہارِ خیال　　　گاہ موضوعِ سخن اللہ میاں
گاہ انساں دوستی کے ولولے　　　ماورائے فرقِ تثلیث و اذاں
گاہ نسلی نفرتوں کے بدحواس　　　بولتے ہیں اپنی اپنی بولیاں
یوں نکلتی جائے ہے دل کی بھڑاس　　　چمنیوں سے جیسے بل کھاتا دھواں

---

[1] ہائیڈ پارک کا ایک مشہور گوشہ جہاں اتوار کے اتوار تقریروں کے شائقین مجمع لگاتے ہیں۔

(م - ۱۰)

www.taemeernews.com

معرکے ہیں گرمئ گفتار کے اور قایم ہر طرح امن واماں
"کینج اسپیکرز" ہے ہر طرح سے
گوشۂ آزاد، زیرِ آسماں

سوہو[1]

یہ جگہ ہے لیسٹر، پکاڈلی
جانِ لندن سیرگاہِ ویسٹ اینڈ
نوشگفتہ، دل کی پژمردہ کلی
ہے چراغاں شام ہی سے ہر گلی

جگمگاتی رقص گاہیں اور پب[2]
ایکس فلمیں اسٹرپٹیز ماڈلنگ
عیش و عشرت کے بہم سامان سب
ہر ادا سے دعوتِ عیش و طرب

حسنِ مغرب صد چمن اندر چمن
سرخوشی سے کھل کھلاتی اپسرائیں
پُرکشش سیمیں بدن غنچہ دہن
رنگ و بوئے پیرہن توبہ شکن

مشورہ دل کا ہے کوئی دم رُکو
شوق کا عالم کہ اب جو ہو سو ہو
جلوے بے تاب نظارا ہر طرف
عقل فریادی کہ واپس گھر چلو!

---

[1] سوہو۔ اس پورے علاقے کا نام ہے جس میں لیسٹر اور پکاڈلی واقع ہیں۔
[2] پب۔ پبلک ہاؤس کا مخفف ہے۔ مراد مے خانہ۔

(م - ۱)

www.taemeernews.com

ابن انشا

ہم ہیں آوارہ سو بہ سو لوگو
جیسے جنگل میں رنگ و بو لوگو

ساعتِ چند کے مُسافر سے
کوئی دم اور گفتگو لوگو

قریۂ عاشقی، سراپا حُسن
گھر ہمارے بھی تھے کبھو لوگو

ایک منزل سے ہو کے آئے ہیں
ایک منزل ہے روبرو لوگو

وقت ہوتا تو آرزو کرتے
جانے کس شے کی آرزو لوگو

تاب ہوتی تو جستجو کرتے
اب ہیں مایوسِ جستجو لوگو

(قیامِ لندن کی ایک نامکمل غزل)

www.taemeernews.com

نسیم شمائل پوری

ہو چکے وار جو تھے عشق میں ہونے والے
اب نہ روئیں گے مرے حال پہ رونے والے

دیکھ کر بند کواڑوں کو جگر پھٹتا ہے
ہائے کیا لوگ ہیں آرام سے سونے والے

یہ بلندی بھی ترے پیار نے بخشی ہم کو
ورنہ ہم لوگ تھے کب خاک پہ سونے والے

دیکھیے گزرے ہے کیا تیرے طلب گاروں پر
آج کچھ حادثے محفل میں ہیں ہونے والے

اک فقط ہم ہی نہیں نالہ کشِ شامِ فراق
اور بھی لوگ ہیں اس شہر میں رونے والے

(لندن میں وفات سے پہلے کی آخری غزل)

www.taemeernews.com

مرتبہ

سحر انصاری ــ صہبا لکھنوی

انتخابِ کلام

(بہ ترتیب حروف تہجی)

آرزو (اندر)

ساقی ترے انصاف سے شکوا نہیں ہم کو / رکھ سب پہ نظر ایک سی رندوں پہ مگر اور
کیا جانیے کیا کہہ دیا ساقی کی نظر نے / ہر سمت سے شور اٹھا ادھر اور ادھر اور

آزاد (غلام قادر)

کہاں وہ حرف و سخن کی مہارتوں سے ہوئے / وہ سلسلے تھے دلوں کی حرارتوں سے ہوئے
بڑھے تو سوکھ گئی شاخ شاخ رشتوں کی / یہ شہر اور بھی پتھر عمارتوں سے ہوئے
ہیں چہرہ چہرہ عجب وحشتوں کی تحریریں / یہ کیسے باب رقم کن عبارتوں سے ہوئے

آصف فاروقی

بے ربط زندگی کے جنوں خیز مرحلے / کتنا کٹھن ہے کاٹنا ہر لمحۂ حیات
خود اپنی ذات سے بھی میں اب مطمئن نہیں / ہوں منتظر کہ ختم ہو کب جادۂ حیات

ابرار حسین ترمذی

کاندھوں پر ناموس وطن کی گویا لاش سنبھالے لوگ / کال کے مارے کالک مل کر آئے ہیں کچھ کالے لوگ
اس پتھر کے شہر میں پتھر بن کر پوجیں پتھر کو / پتھر کی سی باتیں کر کے پتھر کرنے والے لوگ
میرے عیب تو کالک بن کر ہر سو پھیلے جاتے ہیں / اندھیاروں میں کیسے دیکھوں کیسے ہیں کالے لوگ

www.taemeernews.com

اختر (ایم)

مری آواز پہ لبیک کہتا ہے جہاں سارا
مری آواز آوازِ جہاں معلوم ہوتی ہے

اختر (ڈاکٹر سعید اختر درانی)

مجھے فقط گلۂ ترکِ گفتگو ہی نہ تھا
ستم تو یہ ہے کہ تو میرے روبرو ہی نہ تھا

قضا کے جور سے پُر ہو سکا نہ ظرف مرا
چھلک گیا جو سبو وہ مرا سبو ہی نہ تھا

ہوا جو بزم سے رخصت تو زندگی کیسی
وہ میری جاں تھا فقط جانِ آرزو ہی نہ تھا

ہیں کہکشاں کے ستاروں میں ڈھونڈتا تھا تجھے
تری تلاش میں آوارہ کو بہ کو ہی نہ تھا

اختر ضیائی

ہم نے ہر موج حوادث کو کنارا سمجھا
ہم کو ہر موج میں سمٹے ہوئے گرداب ملے

گردشِ وقت نے گہنا دیے کتنے سورج
صبح کی گود میں دم توڑتے مہتاب ملے

افتخار عارف

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

شاخ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
کوئی شکستہ پَر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

اکبر حیدر آبادی

زندانِ صبح و شام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
اک گردشِ مدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

بے فرش و بام سلسلۂ کائنات کے
اُلجھی ستوں نظام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

تیرا زیاں بھی میرے زیاں سے ہے منسلک
خوابوں کے انہدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

www.taemeernews.com

امجد مرزا

میسر کہاں سوزِ عشقِ حیات
بصد شکر ہر غم سہا کیجے
بڑے کام کا ہے یہ پتھر سا دل
جو غم سے اسے آشنا کیجے

انجم خیالی

آواز نہ بھائے تو سنائی نہیں دیتی
صورت نہ ہو زیبا تو دکھائی نہیں دیتی
وہ شب کہ ستارے بھی بھٹک جائیں فلک پر
یہ راہ کہ دن میں بھی سجھائی نہیں دیتی
شاید درو دیوار پہ انجم اُبھر آئے
آئینے میں جو شکل دکھائی نہیں دیتی

انیس انور

یہ خام مال کے انبار کارخانوں میں
ہے کس کے فن کی نمائش نگار خانوں میں

ایمان اخلاقی (ڈاکٹر)

سرمئی جھیلوں میں دیکھا ہے مچلتا موتی
نیلے آنچل پہ ہو جیسے کوئی تارا لرزاں
سرخئ شام و سحر رقص کناں ہو ایمان
کاش اُن کے لب لعلیں ہوں دوبارا لرزاں

بخش لائلپوری

دل میں نہیں ہے سوزِ غم آنکھ بھی شبنمی نہیں
ہاتھ دعا سے کھینچ لے وقتِ دعا ابھی نہیں
فرطِ جنوں نہیں اگر توڑ دے نیتِ نماز
بندگی اور بقیدِ ہوش کفر ہے بندگی نہیں

برلاس (ڈاکٹر)

گھر کو واپس لوٹنا لانا ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے پردیس میں تقدیر کا

www.taemeernews.com

بسمل (جبیر سنگھ)

خدا جانے نسیم شوق کیا پیغام لائی ہے
وطن کی راہ تکتے ہیں بڑی حسرت سے زندانی
مذاق جستجو کی اب یہی معراج ہے بسمل
چراغ راہِ منزل ہو نظر کی شعلہ فشانی

بشیر کوثر

تالیاں بجاتے تھے، جب گھٹا ئیں اٹھتی تھیں جھوم جھوم جاتے تھے
اب کے کیسی رت آئی، کس لیے ہوا سہمی، کیسے سو گئے پتے
سو جتن کرے فطرت، پھول تب بناوٹ ہے حسن عام پتوں کا
کم نظر نگاہوں نے پھول چن لیے سارے رہ گئے بھرے پتے

بقا (محمد شریف)

وصال یار کی دولت سے گرچہ ہوں تہی دامن
مگر یہ آرزو سینے میں ہے اب تک جواں میری
جہاں میں ہر جگہ ہے خیر و شر کا معرکہ برپا
یہاں پر زندگانی ہے سراپا امتحاں میری

بلبل (غلام علی)

لندن کی رات عشق و جوانی کی رات ہے
بہتا ہے عشرتوں کا سمندر تمام رات
بالشِ پہ زندگی کی سلگتی ہوئی سی آگ
بالیں کے پاس سرخ سا ہیٹر تمام رات
وہ بھی تھے پاس، پاس تھیں دو گرم بوتلیں
پھر بھی نہ گرم ہو سکا بستر تمام رات

بہار کاشمیری

اغیار کے طعنے ہیں تری یاد کے غم بھی
پھرتے ہیں کئی درد چھپائے ہوئے ہم بھی
کچھ تیری عنایات ہیں ہم پر غمِ جاناں
کچھ بخشے زمانے نے گہرہائے ستم بھی

www.taemeernews.com

پرواز (اشرف)

حیراں ہوں راہِ عشق میں بھی لوچھتے ہیں لوگ
کیا کیا خیالِ دوست نے سود و زیاں دیا
پرواز اُن کے دردِ محبت کا شکریہ
رونے کے ساتھ ساتھ غمِ جاوداں دیا

تاج (سکندر محمد خاں)

سم سے تو نہ آئی موت ہم کو
اب سم کے بجائے مے پئیں گے
تم کون سدا جواں رہوگے
ہم کون سے سو برس جئیں گے
اس تارِ نظر کو قطع کر کے
کل دامنِ آرزو سئیں گے

جامی (محمد صادق)

چین سے کٹتی جو تسلیم کی خو کر لیتے
طبعِ آزاد سے مجبور رہے ہیں کیا کیا
حُسن والوں میں ستم کا ہے سلیقہ فطری
اُن کو آجاتے ہیں اندازِ جفا آپ سے آپ

جاوید (سید احسن ہزاروی)

کتنا دیکھا چلتے چلتے
راکھ ہوا گھر جلتے جلتے
شاید ہم کو کوئی پکارے
رُک جاتے ہیں چلتے چلتے

جاوید قمر

ہم کہ حرفِ مدعا بن کر نہاں ہونٹوں میں تھے
جس طرف جاتا تھا کوئی ہم اُنھیں رستوں میں تھے
اب کے چُنوائے گئے لمحوں کی دیواروں میں ہم
ورنہ اک وہ وقت تھا جب دل کے آئینوں میں تھے
تہہ کیے رکھے ہیں کل کے روزنامے کی طرح
ایک وہ بھی وقت تھا جب آج کی خبروں میں تھے
کٹ گئی یہ عمر اپنی ساعتوں کے کھیل میں
مڑ کے تکتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم سپنوں میں تھے

www.taemeernews.com

جمیل احمد مدنی

اس ادا سے ہیں وہ پہلو میں کمیں آج کی رات
دل میں رہ کے بھی نہیں دل کے قریں آج کی رات
وہی لغزش جو محبت میں ہوا کرتی ہے
ہم سے ہو جائے نہ الفت میں کہیں آج کی رات

جوہر زاہری

نظر جب سے تماشائی ہوئی ہے
زمانے بھر میں رسوائی ہوئی ہے
غضب ہے روکشِ محراب کعبہ
کسی کافر کی انگڑائی ہوئی ہے
ازل سے نکہتِ گل مضطرب ہے
نہ جانے کس کی سودائی ہوئی ہے

حامد محمود

تھی شامِ ہجر قعرِ جہنم بنی ہوئی
آیا ترا خیال تو کچھ روشنی ہوئی
پھر جسم کی دوکان سجائے گی رات کو
صحنِ چمن میں پھول کی خوشبو تھکی ہوئی
جادو شکستِ خواب کا ٹوٹے تو کس طرح
خارِ خلش کی نوک ہے دل میں چبھی ہوئی

حبیب حیدرآبادی

زباں بندی پہ اس شدت سے کیوں اصرار ہوتا ہے
شریکِ انجمن ہیں، انجمن کی بات کرتے ہیں
جہاں انسانیت کی پستیوں کا ذکر آتا ہے
اچانک بے خودی میں ہم وطن کی بات کرتے ہیں
حبیب اس عظمتِ رفتہ کو دہرانے سے کیا حاصل
دکن میں کیا دھرا ہے جو دکن کی بات کرتے ہیں

حسن ڈبائیوی

صبح آلودۂ خون مہ و انجم تو نہیں
زندگی موت کے ہونٹوں پہ تبسم تو نہیں
آج ملتا ہی نہیں حسنِ گلستاں کا مزاج
سوچتا ہوں کہ پسِ پردۂ گل تم تو نہیں

www.taemeernews.com

حکیم غلام نبی حکیم

میکدوں میں ہی ادا ہوتی ہے رندوں کی نماز
اقتدا اُن کی پسِ پیرِ مغاں ہوتی ہے
اک نہ اک ناصح مشفق بھی ٹپک پڑتا ہے
مے گساری کی کوئی بات جہاں ہوتی ہے

خادم کاظمی

نہ جانے کون سی منزل میں چھپ گئے جاکر
وہ اہل دل جنھیں الفت سلام کرتی تھی
کبھی کبھی تو مجھے انتہائے مستی میں
بڑے ادب سے مشیت سلام کرتی تھی

خالد حسن قادری (ڈاکٹر)

ہم سے کہتے ہو تم ہوا کیا ہے
تو نہیں دیکھتے کیا کیا ہے
سنگریزانِ عشق کے آگے
لشکرِ فیل ابرہا کیا ہے
زندگی میں ہے کاروبار بہت
نہ ہوا ایک عشق کا کیا ہے
تو بھلا کیا تری حفاظت کیا
جاگنے والے جاگتا کیا ہے

خالد بزمی

سرِ مژگاں ستارے جھلملائے
شبِ ہجراں تم ایسے یاد آئے
تصور کا حسیں مرکز ہے ماضی!
کوئی عہدِ جنوں کیسے بھلائے
جگر کے داغ ناسفتہ رہیں گے
اگر تیری نگاہوں میں نہ آئے

خالق بھٹی

ایک وہ ہیں جن کی خاطر قصر ہیں ایوان ہیں
ایک ہم ہیں سائے کی خاطر نہیں دیوار بھی
عاشقی کو مصلحت سے کام کیا بندہ نواز
عاشقی میں صبر بھی لازم ہے کچھ ایثار بھی

دانش (عقیل)

فغاں بہ لب غم بیگانگی سے آج بھی ہیں
ہم اپنے شہر میں خود اجنبی سے آج بھی ہیں
نظر سے دور ہوئے کتنے سال بیت گئے
تصورات کے رشتے کسی سے آج بھی ہیں

www.taemeernews.com

شکستہ قلب و شکستہ نظر سہی لیکن
کئی امید بن اسی آدمی سے آج بھی ہیں

راج کھیتی

وہ میرے درد میں میرا شریک کیا ہوگا
جو اپنی ذات میں ہی کھو کے رہ گیا ہوگا

بکھر گیا جو خلاؤں میں بٹ کے میرا وجود
ہر ایک ذرے کا سینہ دھڑک اٹھا ہوگا

وہ دیکھو نیلے سمندر میں آگ کی لہریں
حسیں سنہری سی مچھلی کا سر کٹا ہوگا

راز (اطہر)

ہم شوق کی منزل میں خطا وار ہیں لیکن
پہلے تری جانب سے اشارا بھی تو ہوگا

ہم گردشِ گردابِ الم سے نہیں ڈرتے
طوفاں ہے اگر راز کنارا بھی تو ہوگا

رانی شہناز

ہو گئے دور زمانے بھر سے
اک تجھے پاس بلانے کے لیے

ہیں زمانے سے الگ ہوں شاید
مہرباں تو ہے زمانے کے لیے

راہی (سوہن)

ہونے لگتی ہے دل وجاں میں جلن رات ڈھلے
جب بھی لَو دیتے ہیں خوابوں کے بدن رات ڈھلے

نور ہے دیدۂ دل میں تو ذرا غور سے دیکھ
زخم کے چاند کو لگتا ہے گہن رات ڈھلے

چاندنی رات کے تابوت میں رکھ دے اس کو
دل نے پہنا ہے اندھیروں کا کفن رات ڈھلے

رحمت قرنی

ہر گام پہ ٹھوکر کھا کھا کر انسان سنبھلتا جاتا ہے
ہر تلخ حقیقت کی لَو سے احساس نکھرتا جاتا ہے

رفیعہ قریشی

تجھ کو کس نام سے پکاروں میں
یوں تو کہنے کو تیرے نام بہت

زندگی ہے تو دیکھنا ہوں گے
انقلاباتِ صبح و شام بہت

اب تغافل بھی اُن سے کر دیکھیں
ہو چکے نامہ و پیام بہت

www.taemeernews.com

رونق کاشفی

روکو نہ مجھے ناصحِ مشفق کہ چلا میں
کرنی ہے جو نیکی رہِ بے خانہ بتاؤ
تلخی ہے حقیقت میں بہت اس لیے رونق
اس دور کے انسان کو افسانہ سناؤ

رہبر مرزا

مری جاں آپ کے لطف و کرم سے
سکوں تھوڑا سا دامن میں بچا ہے
ضرورت ہو تو وہ بھی آپ لے لیں
غمِ دنیا مجھے راس آ گیا ہے

زہرہ نگاہ

شورشِ قلب و نظر آخر زباں تک آ گئی
بات یہ اتنی سی تھی لیکن کہاں تک آ گئی
ماتمِ حسنِ چمن، اہلِ چمن کرتے رہے
بڑھتے بڑھتے آگ لیکن باغباں تک آ گئی
کہتے کہتے حالِ دل اک واقعہ سا بن گیا
سنتے سنتے بات آخر داستاں تک آ گئی
اور ہی طرزِ فغاں سیکھیں فلک کی گردشیں
اب وفا بھی منزلِ سود و زیاں تک آ گئی

ساقی فاروقی

وہ سخی ہے تو کسی روز بلا کرے جائے
اور مجھے وصل کے آداب سکھا کرے جائے
ہجر میں جسم کے اسرار کہاں کھلتے ہیں
اب وہی سحر کرے پیار سے آ کرے جائے
یہ مری روح میں ندی کی تھکن کیسی ہے
وہ سمندر کی طرح آئے بہا کرے جائے

سحاب قزلباش

محبت میں سکوں محرومیوں کے بعد آتا ہے
کہ جب سہرا سراسر مٹ جائے تب دل چین پاتا ہے
یہ کیا جبر مشیت ہے، یہ کیا جبر صداقت ہے
کہ جس کو ہم بھلانا چاہتے ہیں یاد آتا ہے
کرم کیا ہے ہمیں تو نرم لہجے سے بھی وحشت ہے
طبیعت خوش تو ہو جاتی ہے پر دل تھرتھراتا ہے

سرور بخاری

اور بھی اک احسان فرماؤ
ممکن ہو تو یاد نہ آؤ

www.taemeernews.com

میں بھی پوری بات کروں گا — تم بھی اپنا قول نبھاؤ

سعید آغا

غمِ فراق کے نالے تو سُن چکا ہوں بہت — ملن کے گیت سناؤ بہار آئی ہے
ہوئی ہیں مدتیں اجڑے پڑے ہیں مے خانے — شرابِ ناب پلاؤ بہار آئی ہے

سوری (یٰسین رحمٰن خاں)

اگر قسمت سے میرا بھول بھی آجائے اس ہفتے! — تو میں بھی چاند پر جلدی سے چھوٹا سا مکاں لے لوں
زمیں پر اب تو تل دھرنے کی گنجایش نہیں باقی — اگر مل جائے کچھ سستا تو سارا آسماں لے لوں

سوز (صداقت حسین)

بہت ہی کٹھن ہے سفر زندگی کا — ترے پیار کا آسرا چاہتا ہوں
نظر ہی نظر میں پلا دی ہے ایسی — کہ میں بن پیے ہی گرا چاہتا ہوں

شاکر لدھیانوی

خرد کے ساتھ جنوں مثل نقشِ حیرت ہے — ہوا ہے چاک گریبانِ یار کیا کہیے
خزاں کا قتل ہوا ہے بدستِ موسمِ گل — لہو سے تر ہے لباسِ بہار کیا کہیے

شبنم (صدیقہ حبیب)

لالۂ و گل سے دور دور سرِ دمن سے دور دور — جا کے رہیں گے اب کہیں تیرے چمن سے دور دور
شبنم خوش بیان نے ڈالی بنائے طرزِ نو — عصرِ کہن کے پاس پاس عصرِ کہن سے دور دور

شرار (عبدالحمید)

ایسی تخلیق پہ اک عالمِ تنقید ہے دنگ — لبِ خاموش بھی اب دیدۂ حیراں مانگے
اک تلاطم ہے مرے ساتھ جدھر جاتا ہوں — موجِ ساحل بھی مجھے دیکھ کے طوفاں مانگے

شمسی (سجاد حسین)

یہ خوشی کی انجمن ہے کوئی کہہ دے چشمِ تر سے — یہاں کام کیا ہے غم کا، کہیں اور جا کے برسے

www.taemeernews.com

یہ حیاتِ چند روزہ اسی کشمکش میں گزری
کبھی موت کو پکارا کبھی زندگی کو ترسے

صفی حسن (ڈاکٹر)

بھرے گھروں میں صدائیں نہ دو مجھے یارو
کہ آج گزرے زمانے کا ہو چکا ہیں تو
وہی گلے، وہی شکوے، وہی رسوم و قیود
یہی وفا ہے تو پھر ہاتھ دھو چکا ہیں تو
صفی بلا سے کوئی حشر ہو کہ طوفاں ہو
سفینۂ غمِ ہستی ڈبو چکا ہیں تو

ضمیر (سید ضمیر حسین)

کوئی دیکھ کر مجھ کو شرما رہا ہے
تصور یہ تصویر دکھلا رہا ہے
جو دیکھے تھے طفلی کی معصومیت میں
زمانہ وہی خواب دہرا رہا ہے

طلعت سلیم

ہر اک کا ہے شعار یہاں سنگ افگنی
ہو خیر اے خدا مرے شیشوں کے شہر کی
بجھتی ہے پیاس روح کی جن کے جمال سے
مل کر وہ لوگ لگتے ہیں کیوں دل کو اجنبی

ظفر کاشمیری

یا رب طلوع ہوگا کب آفتاب آخر
ظلمت کے کب چھٹیں گے گہرے سحاب آخر
دعوائے پاسبانی بے سود کر رہے ہو
گلچیں سے بچ سکے گا کیسے گلاب آخر

عابد نظامی

قایم ہے آگہی کا بھرم آپ کے طفیل
گوہر فشاں ہے میرا قلم آپ کے طفیل
سینے کے داغ غیرتِ گل ہیں فراق میں
صحرا میں ہے بہارِ ارم آپ کے طفیل

عابد ودود

درد روِ یا کہ آنکھ برسی ہے
یا دِ جاناں تو بے خبر سی ہے
اب کے اس طرح آندھیاں آئیں
ساری دنیا اُجاڑ گھر سی ہے
وہ تعلق کہ روگ تھا پہلے
اُس تعلق کو یاد ترسی ہے

www.taemeernews.com

عاجز (موہن سنگھ)

ہو وقت نیم شب کا اور خامشی ہو چھائی
ہاتھوں میں جام ہو تو پہلو میں دلربا ہو
فرطِ طرب سے ٹوٹے سازِ دلِ پریشاں
خوفِ قضا کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

عاصی کاشمیری

اس طرح دشت کو گلزار بنایا ہم نے
داغ جو تم نے دیا دل میں سجایا ہم نے
کہہ دیا سب نے ہی آوارہ ہے، دیوانہ ہے
آئینہ جب بھی زمانے کو دکھایا ہم نے

عبدالعلیم صدیقی

ظلمت کو مٹا کر دنیا سے انوار سماں دیکھیں گے
ہم شامِ غریباں دیکھ چکے اب صبحِ غریباں دیکھیں گے

عطا جالندھری

جو تلخابے ہمیں پینے پڑے راہِ تمنا میں
وہ اک جرعہ کہیں تو نے پیا ہوتا تو کیا ہوتا
جفاؤں کا تسلسل بھی نہ تجھ سے رہ سکا قایم
وفاؤں پر تری تکیہ کیا ہوتا تو کیا ہوتا

عیش ناصری

تصور میں رہا کرتے ہیں پیکانِ نظر اُن کے
کہیں بیٹھے بٹھائے دل مرا بسمل نہ بن جائے
حقیقت میں اُسے انسان کہنا بھی نہیں زیبا
غمِ عالم کا مسکن جس کسی کا دل نہ بن جائے

غیاث قریشی

نصیحت سُن کے جن کی ہم گناہوں سے ہوئے تائب
بتوں کو توڑ ڈالا اور خدا کے گھر میں آ بیٹھے
خدا جانے ہوا کیا اُن کے تقوے اور تقدس کو
سُنا کل شب وہی ناصح صنم خانے میں جا بیٹھے

فیروزہ جعفر فضا

سیلِ غمِ حوادث اور میری چشمِ پُرنم
جلتا ہوا آندھیوں میں جیسے چراغ مدھم
دنیا کی بے ثباتی ہم پر عیاں ہے یارو
بے موت بھی مرے ہم، بے زیست بھی جیے ہم

www.taemeernews.com

قدیر احمد

پوچھتے کیا ہو حالتِ بیمار | حال یہ ہے کہ کچھ بھی حال نہیں
چشمِ تر کے مرے مقابل ہو | ابرِ باراں کی یہ مجال نہیں

قمر (یوسف)

دیارِ غیر میں اپنے دیار کی باتیں | ہوں جیسے عہدِ خزاں میں بہار کی باتیں
مرا دماغ ہے مجبور، دل بھی ہے مجبور | میں کس زباں سے کروں اختیار کی باتیں

کامی (جلیل احمد)

میں لکھتا ہوں گناہوں میں گھرا ہوں اپنی آہوں میں | جگہ تھوڑی سی مل جائے مجھے تیری نگاہوں میں

مختار الدین احمد (ڈاکٹر)

میں دشتِ وقت میں ہوں اپنے پاؤں کی زنجیر | کھلا ہے گرگِ زمانہ بندھا ہوا ہوں میں
تو ہو رفیق تو ہوتا ہے مجھ کو یہ احساس | تمام عالمِ ہستی پہ چھا گیا ہوں میں
جہاں میں کچھ نہیں مشکل مگر یہ مشکل ہے | تمھارے نام سے اپنے کو ڈھونڈتا ہوں میں
مٹا رہا ہے زمانہ کچھ اس طرح مختار | کہ جیسے ریت پہ صحرا کی نقش پا ہوں میں

مسرت (حسن اجمل)

کچھ اس میں دخل زمانے کی دشمنی کا نہ تھا | یہ واقعہ ہے کہ وہ آدمی کسی کا نہ تھا
ترے بچھڑنے سے پہلے ہی رو لیا تجھ کو | کہ اعتبار مجھے تیری دوستی کا نہ تھا
خبر ہی عام تھی سہرسو دلوں کے بجھنے کی | وگرنہ شہر میں کچھ قحط روشنی کا نہ تھا
نفس نفس رہے آشوبِ آرزو کے اسیر | عذاب ہم پہ فقط جبرِ آگہی کا نہ تھا

منیر احمد

نغمۂ دل نہ سہی زمزمۂ ساز سہی | بات کہنی ہی تو ہے کوئی بھی انداز سہی
گریۂ نیم شبی سلسلۂ ہجر و فراق | زندگی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سہی

www.taemeernews.com

یک بیک عالم اظہار میں سناٹے کی گونج
آنے والے کسی طوفان کی غماز سہی
وقت کے جبر سے کب کار جنوں خیز رُکا
کوشش سنگ زنی، نقطۂ آغاز سہی

موج فرازی

مقبرے عشق کے ہر دل میں سجاتے رہنا
مرگ عالم کو مسیحا سے چھپاتے رہنا
بجھ گیا دل کا دیا رات ہوائے غم سے
تم چراغ رُخ زیبا کو جلاتے رہنا
مجھ کو ہر موڑ پہ چہروں کے علم روکتے ہیں
کتنا مشکل ہے ترے شہر میں آتے رہنا
خوب ہے پائے حنائی کا قصیدہ لیکن
قصۂ دشت لرزاں بھی سناتے رہنا

نجم نقوی

چاند ہنستا رہا، تارے سوتے رہے، چاندنی دل میں نشتر چبھوتی رہی
شام کے سائے میں دل تڑپتا رہا، آنکھ اشکوں کے موتی پروتی رہی
ہم لپٹتے رہے جام و مینا سے بھی تشنگی دل کی لیکن نہ کچھ کم ہوئی
نجم غم کا مداوا نہ کچھ کر سکے، صبح ہوتی رہی، شام ہوتی رہی

نجمہ عثمان

حیات میں کسی لمحہ سکون پانے دو
فسانۂ دلِ غم گیں کو بھول جانے دو
زمانہ پھر نئی کروٹ بدلنے والا ہے
ہر ایک یاد کرو دفن دکھ بھلانے دو
نئی سحر کے لیے آس، دل کرو روشن
فسردہ چاند ستاروں کو ڈوب جانے دو

نکہت (رزجس اسلام)

کوئی مونس کوئی ہمدم کوئی بھی ساتھی پاس نہیں
انجانے ساتھی کی خاطر کتنے ساتھ گنوائے ہیں
غیروں سے پیمانِ وفا اب باندھیں گے یہ سوچا ہے
اپنوں سے تو ہم نے ہمیشہ زخم ہی دل پر کھائے ہیں

نیاز بھٹی

شاہد ہے چاند رات کو سوتا نہیں ہوں میں
لیکن یہ اور بات کہ روتا نہیں ہوں میں

ہادی شمسی

بیابانوں کو خونِ دل سے سینچوں گا جہاں تک ہو
کہ میں ہر دشت کو رشک گلستاں کر کے چھوڑوں گا

یوسف مرزا

دیارِ غربت میں ہر قدم پر کبھی ہے بزم نشاط و لذت
بچا ہی لوں گا میں اپنا دامن اگر چہ چلتا ہے دل تو چلے
عجیب وادی ہے دل کی وادی، بہار پر در بہشت منظر
یہاں جہاں سوز حادثے بھی ہمیشہ کھلتے ہیں پھول بن کے

محمد احمد سبزواری

حرفِ آخر

برطانیہ میں اردو ایڈیشن کا حرفِ آخر توقع ہے کہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس تاریخ ساز پیش کش سے دو رخ اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اول برطانیہ اور دوم برصغیر۔ اس موقع پر تاریخ کے فراموش کردہ اوراق پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا نامناسب نہ ہوگا۔ ان تاریخی واقعات کے پس منظر میں عبرت اور دلچسپی دونوں ہی کا سامان ہے، مثلاً یہ کہ سلطنت مغلیہ کا زوال، ہندوستانیوں کی باہمی رقابتیں، انگریزوں کی آمد، برطانوی حکومت کا قیام، برطانوی مستشرقین کی علمی خدمات سے لے کر آزادی کی جدوجہد، برصغیر میں دو آزاد مملکتوں کا قیام اور برصغیر کے لوگوں کی بڑی تعداد میں برطانیہ میں بس جانا ایسی مسلسل تاریخی کڑیاں ہیں جو برطانیہ میں اردو کی اشاعت کی ذمہ دار ہیں ——

پانچ شلنگ کی رقم نے تاریخ کا رخ موڑ دیا

ایسٹ انڈیا کمپنی صرف ایک ہی مشہور ہے، حالانکہ پہلے یہ کمپنی ولندیزیوں نے بنائی، بعد میں فرانسیسیوں نے اور سب کے بعد انگریز اس میدان میں داخل ہوا۔ آج سے کوئی چار سو سال پہلے کا ذکر ہے، ولندیزی بحری قزاق سمندروں میں لوٹ مار کرتے تھے اور جنوبی ایشیا کی مسالوں کی تجارت پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ یہ ان علاقوں کے مسالے خریدتے اور یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے کالی مرچ کی قیمت میں پانچ شلنگ فی پونڈ کا اضافہ کر دیا۔ اس ناواجبی حرکت پر لندن کے بیوپاری مشتعل ہو گئے اور وہاں کے ۲۴ تاجروں نے مل کر ایک چھوٹی سی فرم بنائی، جس کا سرمایہ ۷۲ ہزار پونڈ تھا اور جس کے حصہ داروں کی تعداد سوا سو تھی۔ اس کا نام ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی رکھا گیا۔ ملکہ الزبتھ اول نے ۳۱ دسمبر ۱۵۹۹ء کو شاہی فرمان کے ذریعے اس کو راس امید سے آگے تمام ممالک سے تجارت کرنے کی اجازت دے دی ——

انگریزوں کا پہلا جہاز "ہیکٹر" ۲۴ اگست ۱۶۰۸ء کو سورت پہنچا، جو اس وقت ایک بہت بڑی بندرگاہ اور بارونق شہر تھا جس کی آبادی دس لاکھ سے اوپر تھی۔ جہاز کا کپتان ولیم ہاکنس تھا جو خود بھی ایک بحری لٹیرا تھا۔ ہاکنس نے پچاس پٹھان سپاہیوں کو کرائے پر ملازم رکھا اور اس سرزمین میں داخل ہوا جس کے افسانے اس وقت انگلستان میں عام تھے کہ یہاں کبوتر کے انڈوں کے برابر یاقوت ہوتے ہیں۔ کالی مرچ، ادرک، نیل، دارچینی، شکر کی بہتات ہے، ایسے عظیم درخت ہیں جن کے تنوں کے درمیان سے گاڑیاں گزر جاتی ہیں۔ ہاتھی کے بیضوں سے ایسی طلسمی شباب آور دوائیں بنائی جاتی ہیں جن سے مرد کی جوانی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ہاکنس ندی، نالوں اور جنگلوں کو عبور کرتا آگرہ جا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر وہ سفر کی ساری صعوبتیں بھول گیا۔ کیونکہ اس کی رسائی عظیم شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں ہو گئی جس کے سامنے ملکہ الزبتھ ایک دیسی ریاست کی فرمان روا لگتی تھی۔

www.taemeernews.com

دربار کی شان و شوکت دیکھ کر ہانکس کی آنکھیں کھل گئیں۔ جہانگیر دختِ رز کا بڑا شیدائی تھا، ہانکس نے جو تحفے پیش کیے اُس میں اعلیٰ قسم کی شرابیں بھی شامل تھیں۔ پھر وہ ترکی زبان بھی جانتا تھا، لہٰذا بادشاہ مہربان ہو گیا۔ اس کو چار ہزاری منصب اور ایک عیسائی آرمینی لونڈی بھی عطا کی۔ ساتھ ہی کمپنی کو سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس طرزِ عمل سے ہانکس کو جو ذاتی فائدہ پہنچا وہ تو الگ رہا مگر کمپنی کے وارے نیارے ہو گئے۔ سہرا چھینے شکر، گوند، مسالوں، نیل، ریشم اور ململ سے لدے ہوئے دو جہاز لندن پہنچنے لگے۔ اور وہاں سے برطانوی اور یورپی مصنوعات برِصغیر آنے لگیں، کمپنی کا منافع دو سو فی صد تک پہنچ گیا ـــــ

جب ہانکس نے لندن واپس جا کر جہانگیر کے دربار کے تزک و احتشام، عیش و تجمل، سونے اور چاندی کے سکوں کی بہتات، ہندوستانی تاجروں کی امارت کی داستانیں اپنے اہلِ وطن کو سنائیں تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور جب یہ قصے برطانوی شاہی دربار میں پہنچے تو جیمس اوّل نے سرطامس رو کو اپنا سفیر بنا کر مغلیہ دربار میں بھیجا۔ طامس، شاہ انگلستان کا خط، قیمتی تحائف، نفیس شرابیں لے کر سورت پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک پادری ٹیری بھی تھا، جس نے واپس جا کر اپنا سفرنامہ بھی شائع کیا۔ یہ ۴ برس ہندوستان میں رہا۔ طامس کا روزنامچہ (جرنل) بھی چھپ چکا ہے مگر ان دونوں کتابوں میں اس قدر لغویات ہیں کہ مورخ الفنسٹن نے ان کو "وحشیانہ جھوٹ کا پلندا" قرار دیا۔ بعض تاریخوں میں ان کے اقتباسات ملتے ہیں۔ جہانگیر اس زمانے میں اجمیر میں تھا۔ طامس وہیں پہنچا۔ اس نے جہانگیر کو ایک پیٹی بھی دی جس پر ہیرے جڑے تھے۔ جہانگیر بھرے دربار میں اس کو بجا کر لطف لیا کرتا تھا۔ طامس بادشاہ کی مے کشی کی محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو ایک عمدہ تصویر اور ایک بگھی بھی پیش کی۔ ہندوستان اہلِ فن کی کمی نہ تھی، شاہی مصوروں نے تصویر کی ایسی نقلیں تیار کیں کہ خود طامس اصل تصویر نہ پہچان سکا۔ شاہی کاریگروں نے طامس کی دی ہوئی بگھی سے عمدہ طرز کی گاڑیاں بنا دیں ـــــ

اب مغلیہ دربار میں انگریزوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی، چنانچہ جب شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا ایک خادمہ کے کپڑوں کی آگ بجھانے دوڑی تو خود اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ اس کے علاج کے لیے مختلف اشخاص کے ساتھ ایک انگریز ڈاکٹر نے بھی علاج کیا اور یہ بھی انعام و اکرام سے نوازا گیا ـــــ

بحری قزاقی کا سلسلہ جاری رہا

کمپنی برابر اپنے تجارتی علاقے بڑھانے میں مصروف رہی۔ ۱۶۳۸ء میں اس نے جنوبی ہند کے مشرقی ساحل پر چینا پٹم کے راجہ سے ایک بدبودار علاقہ پٹے پر لیا اور مدراس کا قلعہ سینٹ جارج یہیں تعمیر ہوا۔ مغربی ساحل پر ایک دلدلی جزیرہ جہاں مچھروں کی کثرت تھی اور جہاں صرف مچھیرے رہا کرتے تھے، پرتگالیوں نے لاوارث جان کر قبضہ کر لیا کہ لوٹ مار میں چھپنے کی جگہ مل سکے۔ جب ایک پرتگالی شہزادی کی شادی انگلستان کے چارلس دوم سے ہوئی تو یہ جزیرہ اس کے جہیز میں دے دیا گیا، چارلس نے اس کو دس پونڈ سالانہ پر کمپنی کو پٹے پر دے دیا۔ پھر یہ ممبئی سے "بام بے" کہلایا۔ کمپنی نے کچھ زمین صاف کرا کے یہاں اپنے گودام اور مکان بنائے۔ ۱۶۸۷ء میں اپنا صدر کارخانہ سورت سے یہیں منتقل کر لیا۔ اُدھر بنگال میں مرشد آباد وہاں کا سب سے بڑا اور بارونق شہر تھا۔ بعد میں تو اس نے مزید ترقی کی اور کلائیو نے جب اسے دیکھا تو لندن پر ترجیح دی۔ شاہجہاں کا دوسرا بیٹا شجاع کافی عرصے بنگال کا صوبے دار رہا۔ اسی نے کمپنی کو ہگلی کے کنارے ایک قطعہ زمین عنایت کیا جہاں کلکتہ آباد ہوا ـــــ شجاع بھی مے خوار تھا، لہٰذا اس کی انگریزوں سے گاڑھی چھنی۔ یورپ سے جو مصنوعات آتی تھیں، ان میں نئی وضع کی توپیں بھی ہوتی تھیں جو شہزادہ شجاع نے کافی تعداد میں خریدیں۔ جب شاہجہاں کے انتقال کی افواہیں پھیلیں تو

www.taemeernews.com

شجاع نے نہ صرف اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا بلکہ اپنا لشکر لے کر دارا شکوہ سے لڑنے آگرہ روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ بھاری تعداد میں نئی توپیں تھیں جن پر اس کو بڑا ناز تھا۔۔۔

اورنگ زیب کے دور میں انگریز لٹیروں کی چیرہ دستیاں کافی بڑھ گئیں۔ انھوں نے بحیرۂ عرب میں حاجیوں کے جہاز لوٹنا شروع کر دیے۔ ادھر شاہ جیمس ثانی کے حکم پر چند جنگی بیڑے چاٹ گام پر حملہ کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ یہ چھوٹی سی بندرگاہ چند سال پہلے ہی مغلوں نے فتح کی تھی۔ ان واقعات پر اورنگ زیب نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے حکم دے دیا کہ ہر جگہ انگریزی تجارتی خانے بند اور ان کا سامان ضبط کر لیا جائے۔ کمپنی کے بہت سے گماشتے فرار ہو گئے اور چند گرفتار ہو گئے۔ ادھر اس کی اطلاع جب لندن پہنچی تو کمپنی بند کر دی گئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے دس سال بعد ۱۷۱۷ء اس کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ ویسے اورنگ زیب کی زندگی ہی میں شائستہ خان کو خوش کرنے کے بعد ان کو معافی مل گئی تھی۔۔

اس حادثے کے بعد کمپنی کوئی چالیس سال تک خاموش رہی۔ لندن میں بھی اس کی ساکھ بگڑ گئی تھی بلکہ ایک اور تجارتی کمپنی میدان میں آ گئی۔ کئی سال تک دونوں میں جنگ زرگری ہوتی رہی۔ آخر برطانوی حکومت نے درمیان میں پڑ کر صلح کرائی اور دونوں کو متحد کر دیا۔ آئندہ اسی متحدہ کمپنی سے اہلِ ہند کو واسطہ پڑا۔۔۔

تجارت سے تاج داری تک

انگریزوں کی پہلی پیش قدمی ارکاٹ میں ہوئی جس میں انھوں نے چندا صاحب کے خلاف کامیابی حاصل کی اور محمد علی کو ارکاٹ کا نواب بنوا دیا۔ اس کامیابی کا سہرا کپتان کلائیو کے سر بندھا اور اس کو کرنل بنا دیا گیا۔ چند سال بعد بنگال میں علی وردی خان کے انتقال کے بعد ان کا نواسہ سراج الدولہ نواب ہوا۔ اس نے محصولوں کی ادائیگی میں گڑبڑ کرنے پر ان کی سرزنش کی اور انھیں کلکتے سے نکال دیا۔ اسی موقع پر "بلیک ہول" کی کہانی وضع کی گئی جس کی انگلستان میں کافی تشہیر کرائی گئی۔ لوگوں نے چندے دیے، فوجی سامان جمع کیا، رضاکار بھرتی ہوئے اور کئی جنگی جہاز کلکتہ پہنچے۔ انگریزوں نے دیوان مانک چند اور میر جعفر کو ملا کر سراج الدولہ کے خلاف لشکر کشی کی۔ اس کو ہزیمت ہوئی اور میر جعفر انگریزوں کی سرپرستی میں بنگال کا نواب بنایا گیا۔ چند دن بعد اس سے بے زار ہو کر میر قاسم کی پیٹھ تھپتھپائی اور وہ نواب ہو گیا مگر اس کو من مانی کارروائیوں پر بڑا غصہ آیا۔ نتیجتاً اس سے بھی لڑائی ہوئی اور پھر میر جعفر نواب ہو گیا۔ انگریزوں کو یہ کھیل بہت پسند آیا کیونکہ ہر مرتبہ ان کی ذاتی جیب گرم ہو جاتی تھی بلکہ اب تو انھیں بنگال کی دیوانی (مال گزاری وصول کرنے کا حق) بھی مل گیا تھا۔ رہی سہی کسر بادشاہ وقت شاہ عالم نے پوری کر دی اور ۲۶ لاکھ سالانہ کے عوض بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور اس طرح ان سب علاقوں کا انتظام انگریزوں نے سنبھال لیا۔۔۔

کلائیو کو واپس بلا لیا گیا اور اس پر رشوت ستانی کے سلسلے میں مقدمہ چلا۔ اگرچہ اس کو بری کر دیا گیا مگر اس نے خودکشی کر لی۔ لارڈ میکالے نے اس کی سوانح لکھی ہے۔ کلائیو کے بعد جو صاحب آئے وہ بڑے رنگین مزاج تھے یہ مختصر مضمون ان کی رومانی داستانوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، مگر یہ کلائیو سے دو چار ہاتھ آگے ہی رہے۔ بنگال کے نواب کا وظیفہ نصف کر دیا۔ شاہ عالم کو دیوانی کا روپیہ دینا اس وجہ سے بند کر دیا کہ وہ الٰہ آباد سے دہلی چلا گیا تھا۔ آصف الدولہ والیٔ اودھ سے زرِ نقد مانگا جب اس نے جواب دیا کہ میری ساری دولت تو میری ماں اور دادی کے پاس ہے، تو ان کو فیض آباد میں نظر بند کر کے اُن کی ساری جمع پونجی پر قبضہ کر لیا جو ۷۶ لاکھ بنتی تھی۔ اسی زمانے میں مرہٹوں سے پہلی اور میسور کی دوسری لڑائی ہوئی جس میں کمپنی کو بھاری اخراجات کرنا پڑے۔ جب برطانوی پارلیمنٹ میں حسابات پیش ہوئے تو ایک نیا قانون نافذ

www.taemeernews.com

کیا گیا جس کا مقصد ہندوستان میں اضافہ مقبوضات کو روکنا تھا۔ اس پر ہیسٹنگز نے استعفیٰ دے دیا اور لاکھوں کا سامان جس میں ہیرے جواہر، فرنیچر، گھوڑے، بگھیاں، گائیں سب ہی چیزیں شامل تھیں لے کر واپس چلا گیا۔ وہاں اس پر بھی مقدمہ چلا جو سات سال تک چلتا رہا اگرچہ پارلیمنٹ نے اس کو بری کر دیا مگر اس کی دولت کا بڑا حصہ اس مقدمے کی بھینٹ چڑھ گیا ـــــ

ولیزلی نے میسور، ٹراونکور، بڑودہ، حیدر آباد اور گوالیار کو اپنے حلقۂ اثر میں لیا۔ میسور سے تو بیش بہا دولت، نادر مخطوطات، قیمتی اسلحہ، اور دوسرا سامان ہاتھ لگا، سپاہیوں سے لے کر جرنل تک کو نقد روپیہ ملا۔ ڈلہوزی نے اودھ، پنجاب، جھانسی، ناگ پور اور پونا کو ختم کیا، کوہ نور ہیرا پنجاب سے انگریزوں کے ہاتھ لگا جو برطانوی تاج کی زینت بنا۔ کمپنی ڈلہوزی کو اپنا سب سے بڑا محسن گردانتی ہے جس نے پورا ہندوستان بلکہ برما بھی اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ مگر اس کے ظلم و تعدی کا ردعمل بھی شدید ہوا اور ۱۸۵۷ء میں حصول آزادی کی پہلی جنگ ہوئی جس کو انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا۔ میرٹھ، دہلی، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، جھانسی، بھوپال، اندور وغیرہ میں ہنگامے ہوئے۔ انگریزوں نے مجاہدین آزادی کو سکھوں اور گورکھوں کی مدد سے چپ دیا۔ ۲ لاکھ سے زائد ہندوستانی مارے گئے۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوئے، ان پر مقدمہ چلا اور ان کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے بیٹوں اور پوتوں کو قتل کیا گیا اور ان کے سر خوان پوشوں سے ڈھانک کر ۷۰ سالہ بوڑھے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے۔ ہزاروں افراد کو درختوں سے باندھ کر پھانسیاں دی گئیں۔ سیکڑوں کو زندہ توپوں کے دہانوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا، بہت سوں کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ اگست ۱۸۵۸ء میں اس ساری کارروائی کے بعد "کمپنی بہادر" کے خاتمے کا اعلان ہوا اور ۳۹ سالہ ملکہ وکٹوریہ قیصرہ کے نام سے ہند کی فرماں روا قرار پائیں ـــــ

لندن میں اُردو کی پہلی تصنیف

۱۸۵۷ء کے واقعات نے ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً بے چین کر دیا۔ سر سید احمد خان نے رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند لکھا جو اس وقت کے حالات میں ایک بڑا دلیرانہ کارنامہ تھا۔ سر سید پہلے فرد تھے جو محض ریسرچ کے لیے سب سے پہلے انگلستان گئے۔ انھوں نے وہاں کے درسی نظام اور جامعہ کیمبرج کا تفصیل سے معائنہ کیا۔ لندن میں بیٹھ کر انھوں نے "خطباتِ احمدیہ" لکھی جس میں ہر بات مستند حوالوں سے درج کی۔ ریسرچ کا یہ طریقہ انگریزی میں بھی بہت بعد میں اختیار کیا گیا۔ یہ سر ولیم میور کی "سیرتِ رسولؐ" کے جواب میں لکھی گئی۔ ان کے ایک انگریز دوست نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو "ایسیز آن دی لائف آف محمدؐ" کے نام سے شائع ہوئی۔ اشاعت میں تخمینے سے بڑھ کر خرچ ہوا کچھ روپیہ انھوں نے دوستوں سے قرض منگایا اور کچھ دہلی کے مکان سے اپنے فرش فروش اور برتنوں کو فروخت کر کے منگوا لیا۔ ایک اور کتاب ڈیون پورٹ کی "اپالوجی فار قرآن" ہے، جس کے مضامین سے سر سید کافی متاثر ہوئے اور جس کو لندن کا کوئی ناشر چھاپنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کو اپنے خرچ سے چھپوایا۔ ۱۸۶۸ء میں حکومت نے ولایت کو تعلیم کے لیے چند سرکاری وظیفے مقرر کیے اور ان میں سے ایک سر سید کے بیٹے سید محمود کو مل گیا۔ اس طرح سید محمود سرکاری وظیفے پر ولایت جانے والے چند اولین طلبہ میں سے تھے ـــــ

انڈین سول سروس اور دیسی زبانوں کی تعلیم

۱۸۵۸ء کے بعد سے انڈین سول سروس کے ڈھائی ہزار افسران، دس ہزار برطانوی فوجی افسران، اور ۷۰ ہزار برطانوی سپاہیوں کی مدد سے برطانوی اقتدار کوئی نوّے سال تک بڑے طمطراق سے چلتا رہا۔ ابتدا میں بڑے عرصے تک انڈین سول سروس میں کوئی ہندوستانی نہیں

www.taemeernews.com

ہوتا تھا۔ گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولس، انجنیر غرض کہ سارے عہدے، انگریزوں کے پاس ہوتے تھے۔ اسی طرح فوج میں جنرل، کرنل، بریگیڈیر، میجر، کپتان انگریز ہوتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے چھوٹے عہدے مثلاً صوبیدار، صوبیدار میجر، جمعدار، دفعدار وغیرہ مخصوص تھے۔ انڈین سول سروس اور فوج کے اعلیٰ عہدے داروں کو ہندوستان کی طرز معاشرت اور زبانوں سے واقف کرانا ضروری تھا اس کے لیے آکسفورڈ، کیمبرج، ڈنچیسٹر، چارٹر ہاؤس اور ہیلی بری کی کلاسیں مخصوص تھیں جہاں ان افسران کو اردو۔ ہندوستانی اور علاقائی زبانیں عموماً رومن رسم الخط میں سکھائی جاتی تھیں۔ اس طرح پلہ انگریزی ہی کا بھاری رہتا تھا۔ جب یہ لوگ ہندوستان آتے تھے تو ان کے سکونتی علاقے، فوجی چھاؤنیاں، کلب، ریل میں سفر کرنے کے ڈبے حتیٰ کہ قبرستان تک الگ ہوتے تھے۔ یہاں ان کو زندگی کی وہ تمام برطانوی سہولتیں حاصل ہوتی تھیں جن کا یہ اپنے ملک میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے علاقوں، کلبوں، اور ریل کے ڈبوں میں عام دیسیوں کا داخلہ بند تھا حتیٰ کہ لاہور کی "مال" کے فٹ پاتھوں پر سورج غروب ہونے کے بعد ہندوستانیوں کو گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔

پہلی عالمگیر جنگ

اوائل سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ انگریز اس برصغیر سے بیک بنی و دو گوش رخصت ہو جائیں گے، مگر جنگ نے اس کی داغ بیل ڈال دی۔ ہندوستانی سپاہی بغداد، موصل، ترکی اور یورپ کے محاذوں پر پہنچے، نئے لوگوں سے ملے، مساوات اور آزادی کی جھلکیاں دیکھیں۔ ان کے خیالات میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔ دوسری طرف سلطنت عثمانیہ (جہاں ابھی تک رسمی خلافت باقی تھی) نے جرمنی کا ساتھ دیا اور برطانیہ نے اس کے خلاف تلوار اٹھائی۔ مسلمان جذباتی طور پر سلطان المعظم کے ہم نوا تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ تحریک خلافت شروع ہوئی، ترک موالات نے زور پکڑا۔ ہمدرد، الہلال اور زمیندار نے ان کی ہم نوائی کی۔ مولانا عبید اللہ سندھی مولانا محمود الحسن اور دوسرے علما نے جہاد کے فتوے دیے اور اس طرح اپنی بگڑتی ساکھ کو بچانے کے لیے ہندوستان میں اصلاحات دینے کا وعدہ کیا گیا اور جنگ ختم ہونے کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے جدید اصلاحات کا قانون منظور کیا مگر اب ملک کی اکثریت اس لیپا پوتی سے مطمئن نہیں ہوئی، اور آزادی کی تحریکیں پروان چڑھنے لگیں۔ دیہات میں بیداری پھیلانے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس نے دیہات میں اپنے سالانہ جلسے منعقد کرنا شروع کیے۔ قائد اعظم نے چودہ نکات کا محضر تیار کیا اور کانگریس کے اکثر اکابر نے اس کو تسلیم کر لیا، مگر کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ اس کا مقاطعہ کیا گیا۔ اس کے بعد پے در پے لندن میں تین گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ یہیں مولانا محمد علی جوہر نے وہ مشہور فقرہ کہا کہ "میں غلام وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر تم ملک کو آزادی نہیں دیتے تو مجھے یہاں دو گز زمین دینا پڑے گی" اور وہ واقعی غلام ملک واپس نہیں آئے ۔۔۔ اسی لندن میں گاندھی جی اور ان کی بکری کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، اور اس وقت تو اہل برطانیہ ششدر رہ گئے۔ جب گاندھی جی اپنی لنگوٹی میں جس میں ان کی رانوں کا بڑا حصہ ننگا نظر آ رہا تھا، معمولی سی دیسی چپل پہنے بکنگھم پیلس میں ملک معظم کے ساتھ چائے پینے گئے۔

آزادی کا مختتم وعدہ

دوسری عالمگیر جنگ نے برطانیہ کے تار و پود بکھیر دیے۔ ایک وقت تو وہ آ گیا تھا کہ برطانوی حکومت نے کینیڈا میں جلا وطن حکومت بنانے کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں مگر ان کی خوش قسمتی آڑے آئی کہ جرمنوں نے ڈنکرک کے پار جانے والوں کا تعاقب نہیں کیا، ورنہ اس طرح

www.taemeernews.com

بلا ٹل گئی۔ لندن کا دارالعوام ایک چھوٹا سا ہال ہے جہاں عرصہ دراز تک مٹھی بھر لوگ جمع ہو کر دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرتے رہے۔ اس کے در و دیوار برک، پٹس، ڈزرائیلی، گلیڈ اسٹون، چیمبرلین، چرچل جیسے آتش بیانوں کی تقریروں سے گونجتی رہیں اور ان کی سیاسی تقریروں کے اکثر جملے ادب عالیہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہاں بیشتر ہندوستان اور اس کے باسیوں کے متعلق کچھ زیادہ اچھی باتیں نہیں کہی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی ہمدردانہ خیالات کا اظہار کرتا مگر اس کی مثال آٹے میں نمک کے برابر ہوا کرتی تھی۔ اسی تاریخی ہال میں ۱۸ر فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم اٹیلی نے یہ اعلان کیا کہ "ملک معظم کی حکومت اس امر کو بالکل واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار اعلیٰ ہندوستان کے ذمے دار افراد کے سپرد کر دے گی"۔ اس اعلان پر فوری خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد چرچل نے گرج دار آواز میں کہا:۔

"ہم میں سے اکثر نے دشمنوں کے مقابلے میں برطانیہ کا دفاع کیا ہے، مگر اپنوں ہی کے خلاف اس کا دفاع کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ باعث شرم ہے کہ میں اس سلطنت برطانیہ کے پرچم اترتے دیکھ رہا ہوں جس نے دنیا اور انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے۔"

مگر ڈوبتے سورج کو کون روک سکتا ہے۔ اکثریت نے اٹیلی کا ساتھ دے کر آیندہ کی راہ ہموار کر دی۔

پاکستان اور لندن

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے قائد اعظم اور علامہ اقبال لندن گئے۔ علامہ یہاں اپنے طور پر ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ والے اجلاس کے خطبۂ صدارت کی تشریح و توضیح کرتے رہے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ایک پُرجوش نوجوان چودھری رحمت علی نے شمالی مغربی صوبوں کے حروف سے ایک نیا نام "پاکستان" وضع کیا تھا جس کا مقصد یہی تھا کہ ان علاقوں میں ایک آزاد مسلم مملکت قایم کی جائے۔ انھوں نے لندن کے مسلم طلبہ کی ایک انجمن بھی بنائی جس کا نام "پاکستان نیشنل مومنٹ" رکھا۔ اس وقت تک پاکستان کے نام کو مسلم لیگ یا دوسرے اداروں نے نہیں اپنایا تھا۔ چودھری صاحب نے لندن کے مشہور ونڈارا ف ہوٹل میں اپنی جماعت کی طرف سے ایک ڈنر ترتیب دیا جس میں قائد اعظم، علامہ اقبال اور دوسرے مسلم زعما شریک ہوئے۔ قائد اعظم مہمان خصوصی تھے۔ اس کی تصویر بھی موجود ہے جس میں علامہ اقبال، قائد اعظم کے برابر بیٹھے ہیں، اور اسی ڈنر میں مسلم اکابر کو پاکستان کے لفظ سے روشناس کرایا گیا۔ چودھری صاحب نے ایک لیٹر پیڈ بھی چھپوایا تھا جس کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا نقشہ تھا جس میں پاکستان کا علاقہ گہرے سبز رنگ میں دکھایا گیا تھا اور بقیہ ہندوستان سفید رنگ میں (ان کا ایک خط نواب صاحب بھوپال کے نام تھا جو تیسری گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے مجھے مل گیا تھا لیکن ترک وطن میں کہیں کھو گیا) انھوں نے مضامین اور پمفلٹوں کے ذریعے بھی اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کی۔ خالدہ ادیب خانم نے اپنے ہندوستان کے سفرنامے میں ان سے ملاقات اور نظریۂ پاکستان پر ان کے خیالات کا ذکر کیا ہے ــــــ

آزادی کابل

برس ہا برس سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جب کوئی اہم قانون نافذ ہوتا تھا تو شاہ برطانیہ کا پیام بردار الامرا میں آتا تھا۔ اس موقع پر دارالعوام کے ایک وفد کو بھی بلایا جاتا تھا تاکہ وہ شاہی منظوری کا مشاہدہ کر سکے۔ ۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ دارالامرا میں ممبران موجود تھے، وزیر اعظم اٹیلی ۲۰ ارکان کے وفد کے ساتھ جن میں چرچل بھی شامل تھے، ہال میں ایک

www.taemeernews.com

طرف نشست سنبھالے ہوئے تھے۔ درمیان میں شاہی اقتدار کی نشانی وہ دو سنہری کرسیاں تھیں جن پر تاج پوشی یا دربار کے خصوصی موقع پر ایک مرصع شامیانے کے نیچے بادشاہ اور ملکہ بیٹھا کرتے ہیں۔ تخت کے سامنے لارڈ آف ہائی چانسلر کی ادنیٰ "گدی والی نشست تھی۔ ان کے برابر ایک لانبی میز پر ان قوانین کی کاپیاں رکھی تھیں جنھیں اس روز جارج ششم کی منظوری درکار تھی۔۔۔

شاہ کا نمائندہ، میز کے ایک سرے پر بیٹھا تھا، پارلیمنٹ کے کلرک نے ایک مسودہ اٹھایا، اس کا نام پڑھا اور شاہ کے نمائندے کو دیکھا۔ اس نے جواب دیا، اور پھر دوسرا مسودہ اٹھایا گیا۔۔۔

تیسرا مسودہ جو بیس دفعات اور ۱۶ ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل تھا پارلیمنٹ کے کلرک نے اٹھایا اور کہا :۔

"ہندوستان کی آزادی کا مسودہ"

"لی رول لی ویولٹ" (بادشاہ کی رضا ہے)۔۔

شاہ کے نمائندے نے قدیم نارمن محاورے میں جواب دیا۔۔

اس چار لفظی محاورے نے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے اقتدار کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔۔۔

اس مختصر پس منظر میں آپ پھر انکار کے ان مضامین کا مطالعہ کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ بہت سے گوشے جو پہلے آپ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے اب زیادہ صاف اور واضح نظر آ رہے ہیں۔۔۔

فکر انگیز دستاویزی اشاعتیں

اسلامیات

سیرت رسول اللہ	پروفیسر نواب علی		۲۴/-
تاریخ صحف سماوی	"	"	۱۲/-
معارج الدین	"	"	۱۰/-

ادب ــ شخصیت ــ فن

مجاز ایک آہنگ	مرتبہ صہبا لکھنوی		۳۵/-
جوبلی نمبر	"	"	۵۰/-
جوش نمبر	"	"	۴۰/-
حفیظ نمبر	"	"	۴۰/-
فیض نمبر	"	"	۴۰/-
ندیم نمبر	"	"	۴۰/-
امیر خسرو ایڈیشن	مرتبہ صہبا لکھنوی		۱۵/-
رومی پر خاص ایڈیشن	"	"	۱۲/-
نذر اقبال	"	"	۱۲/-
غالب نمبر	"	"	۲۰/-
کرشن چندر ایڈیشن	"	"	۱۲/-
مصطفےٰ زیدی ایڈیشن	"	"	۱۲/-
حمید احمد خاں ایڈیشن	"	"	۱۰/-
حفیظ ہوشیارپوری ایڈیشن	"	"	۱۰/-
سجاد ظہیر ایڈیشن	"	"	۱۰/-

ناول

ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر	۱۲/-

مکتبۂ افکار ــ رابسن روڈ ــ کراچی ــ فون ۲۱۴۰۷۹

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

شہزاد منظر

آئینۂ برطانیہ

مختصر خبریں

پروفیسر رالف رسل نے اردو مردان کے ایک پٹھان سے سیکھی تھی

انگریز مستشرقین میں وہ پہلے غالب شناس ہیں

کرنل محمد خاں رسل کی شستہ و پاکیزہ اردو سن کر عش عش کر اٹھے

پروفیسر رالف رسل اُن برطانوی اسکالروں اور محققوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے غالب اور مطالعۂ غالب کے سلسلے میں لازوال شہرت حاصل کی ہے اور غالب شناسوں سے اپنی غالب شناسی کا لوہا منوایا ہے۔ وہ غالب اور اس سے متعلق موضوعات کی تحقیقات کے سلسلے میں کئی ایشیائی ممالک کا دورہ بھی کر چکے ہیں، آج کل وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے اردو کس طرح سیکھی۔ اس کا انکشاف انھوں نے مشہور طنز نگار (ریٹائرڈ) کرنل محمد خاں سے ایک ملاقات کے دوران کیا۔ اس ملاقات کا انتہائی دلچسپ احوال کرنل صاحب نے اپنی مشہور کتاب " بسلامت روی " میں رالف رسل غالب کو آگرے سے دلی پھسلا لائے تھے " کے عنوان سے تحریر کیا ہے ——

رالف رسل نے کرنل صاحب کو بتایا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ ہندوستان اور برما کے محاذ پر لیفٹیننٹ رہ چکے ہیں۔ ان محاذوں کی سرگرمیوں کے دوران انھوں نے برما کے ایک رفیق لفٹننٹ محمد نواز (بعد میں کرنل محمد نواز ممبر انتظامیہ سی ڈی - اے اسلام آباد) سے اردو سیکھی۔ محمد نواز صاحب مردان کے رہنے والے تھے —— اُردو سیکھنے کے بعد رفتہ رفتہ انھیں غالب سے دلچسپی ہوئی اور پھر انھوں نے غالب کی تمام تصانیف نظم و نثر کا تحقیقی مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام کتابیں بھی پڑھیں جو غالب پر لکھی گئی تھیں۔ رالف رسل کے پاس غالب سے متعلق جتنا قیمتی ذخیرۂ کتب موجود ہے وہ شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں جب کبھی غالب کا نام آتا ہے نگاہیں رالف رسل کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ رالف رسل دلی، آگرہ، علی گڑھ، لکھنؤ کے علاوہ کراچی اسلام آباد اور لاہور بھی کئی بار آ چکے ہیں اور انگلستان میں اردو کی توسیع و ترقی اور غالب پر اردو میں کئی لکچر دے چکے ہیں۔ محسنہ جیلانی کے مشمولہ انٹرویو سے بھی رالف رسل کی اردو دوستی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اُن کی شستہ اور پاکیزہ اُردو سن کر

www.taemeernews.com

کرنل محمد خاں بھی عش عش کر اُٹھے تھے۔

اردو کی پہلی گرامر

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحقیق کے مطابق اردو زبان کی سب سے پہلی گرامر ایک ڈچ اردو شاعر نے تحریر کی تھی، جس کا نام "کٹیلر" تھا۔ یہ شخص ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر تھا۔ شاہ عالم (۱۷۰۸ء۔ ۱۷۱۲ء) اور جہاں دار شاہ کے دربار میں ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا تھا۔ اس نے "صرف و نحو ہندوستانی" کے نام سے اردو زبان کی گرامر ۱۷۱۵ء میں لکھی تھی۔

برطانیہ میں اردو صحافت پر پہلی کتاب

ممتاز صحافی سلطان محمود نے "برطانیہ میں اردو صحافت" کے عنوان سے پہلی کتاب تحریر کی ہے یہ کتاب ۱۴۴ صفحات اور اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اسے مرکزی ترقی اردو بورڈ۔ لاہور نے ٹائپ میں شایع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں شایع ہوئی ہے۔

برطانیہ کے چند علمی و ادبی ادارے

برطانیہ میں جو علمی و ادبی ادارے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

ادارے کا نام	سن قیام
(۱) بزم تفریح لندن	۱۹۵۰ء
(۲) انجمن ترقی اردو انگلستان۔ لندن	۱۹۶۲ء
(۳) پاکستان سوسائٹی۔ بریڈ فورڈ	۱۹۶۵ء
(۴) انجمن ترقی اردو لندن	۱۹۷۰ء
(۵) انجمن ترقی اردو برمنگھم	۱۹۷۱ء
(۶) انجمن ارباب دانش۔ بریڈ فورڈ	۱۹۷۴ء
(۷) انجمن ارباب سخن۔ برطانیہ۔ لندن	۱۹۷۵ء
(۸) انجمن ترقی و ترویج اردو۔ برمنگھم	۱۹۷۶ء
(۹) حلقۂ اہلِ سخن۔ لندن	۱۹۷۹ء
(۱۰) اکیڈیمی آف اردو اسٹڈیز۔ لندن	

بی بی سی کی اردو دوستی اور مقبولیت

برطانیہ میں جو ادارے اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں، اُن میں بی بی سی (لندن) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ ادارہ اگرچہ نیم سرکاری ہے اور اس کا اردو سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اس کا اردو پروگرام اردو زبان و ادب کی بالواسطہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ بی بی سی کا اردو پروگرام نہ صرف برطانیہ میں بلکہ یورپ اور ایشیا کے دور افتادہ علاقوں میں بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے خصوصاً اس کا ادبی پروگرام "برگِ گل" جسے پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے سابق پروڈیوسر افسانہ نگار اور شاعر انور خالد مرتب کرتے ہیں۔ قابلِ ذکر ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "زرد پتے" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔

برطانیہ میں "برگِ گل" کے نام سے ایک ادبی سوسائٹی قایم کرنے کا خیال اپریل ۱۹۷۸ء میں پیدا ہوا۔ ایک روز شام کو اردو کے چند ادیب و شاعر "بش ہاؤس" کے کینٹین میں بیٹھے چائے نوشی میں مصروف تھے کہ فیصلہ کیا گیا کہ "برگِ گل"

لندن کی پہلی ادبی انجمن

سر عبدالقادر اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اس صدی کی تیسری دہائی میں، جب وہ وزیر ہند کی کونسل کے ممبر تھے لندن پہنچ کر پہلی بار "اردو مجلس" کی داغ بیل ڈالی جس کے زیر اہتمام ہر ماہ ادبی نشست منعقد ہوتی تھی جس میں لندن میں مقیم اردو کے ادیب و شاعر بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے شرکت کرنے والوں میں سے چند بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں میں مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور حفیظ جالندھری قابلِ ذکر ہیں۔

سر عبدالقادر نے اردو زبان و ادب پر اسی زمانے میں انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جو کافی مقبول ہوئی۔

www.taemeernews.com

کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا جائے۔ اس کی نشست ہر ماہ کسی ایک ممبر کے گھر پر منعقد ہو۔ اس میں عورتوں کے علاوہ مردوں کو بھی شامل کیا جائے جو اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات افسانے، نظمیں، غزلیں، ڈرامے، اور تنقیدی مقالات پڑھ کر سنائیں۔ اسی کے ساتھ اس کا بی بی سی کے اردو پروگرام سے بھی رابطہ قائم کیا جائے اور ادبی نشستوں میں جو معیاری تخلیقات پڑھی جائیں انھیں بی بی سی کے اردو پروگرام میں نشر کیا جائے چنانچہ ابھی تک متعدد ادبی تخلیقات بی بی سی سے نشر ہو چکی ہیں۔ لندن میں مقیم ادیب و شاعر ایک معیاری ادبی جریدہ بھی شایع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو نظموں کا انگریزی میں ترجمہ شایع کرنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔

بی بی سی۔ اپنی خبروں اور اُن کے پس منظر میں اکثر و بیشتر پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے اندرونی خلفشار کو نمک مرچ لگا کر نہایت چٹ پٹے انداز میں پیش کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ ملکوں ملکوں بی بی سی کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

برطانیہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد

ایک اندازے کے مطابق اس وقت برطانیہ میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ ہے جو اس کی جملہ آبادی کی دو فی صد ہے۔ انگریزی کے بعد یہ واحد زبان ہے جو ہندوستان، پاکستان اور افریقہ سے آئے ہوئے تارکینِ وطن کی اہم ترین رابطے کی زبان ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انگریزی سے بڑھ کر ایشیائی تارکینِ وطن میں سمجھی اور بولی جانے والی زبان ہے۔ اردو کے دو روزنامے، تین ہفتے وار اور بے شمار ماہنامے برطانیہ کے شہر لندن، برمنگھم اور ساؤتھ ہال سے نکلتے ہیں۔ اطلاعات کے بموجب اردو کے روزنامہ "جنگ انٹرنیشنل" کی تعدادِ اشاعت سب سے زیادہ ہے۔ یہ اخبار برطانیہ سمیت یورپ کے تمام ممالک میں پڑھا جاتا ہے۔

برطانیہ میں اردو کے تقریباً ۲۰ مرکزی شہر ہیں جہاں اردو بولنے والوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ ایسے مرکزی شہروں میں لندن کے علاوہ برمنگھم، بریڈفورڈ، مانچسٹر، ساؤتھ ہال، لیورپول، لسٹر، ناٹنگھم قابلِ ذکر ہیں۔ جنوب مشرقی انگلستان، مغربی مڈلینڈس، یارکس اور ہمبر سائیڈ کے علاقے میں ایشیائی تارکینِ وطن بہت بڑی تعداد میں بس گئے ہیں۔ لگ بھگ ۸۵ فی صد ایشیائی تارکینِ وطن ان ہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیش کے تارکینِ وطن کی تعداد ۵½ لاکھ تھی جب کہ ۱۹۷۵ء کے وسط میں ایک اندازے کے مطابق یہ آبادی ۸ لاکھ تھی۔ اس مردم شماری میں ان بچوں کو شامل نہیں کیا گیا جو برطانیہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

تین لاکھ سے زائد قلمی کتابیں

انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تین لاکھ سے زاید قلمی کتابیں موجود ہیں۔ اسی طرح انڈیا ریکارڈ آفس میں بھی ان تمام سیاسی اور تاریخی دستاویزات کا ذخیرہ موجود ہے جس کا ہماری تحریک آزادی سے تعلق ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس
۲۳ ممالک میں

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دنیا بھر میں سب سے بڑا اکیڈیمک پریس ہے۔ برطانیہ میں اس کا عملہ تین ہزار افراد پر مشتمل ہے جب کہ ۲۳ مختلف ممالک میں اس کی شاخیں قایم ہو چکی ہیں، جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔

برٹش پبلک لائبریری میں مشرقی زبانوں کا سرمایہ

برٹش پبلک لائبریری جس کا ایک بہت بڑا حصہ عربی، فارسی اور اردو کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کے قیام کو ایک سو ۹ سال گذر چکے ہیں اور انگلستان کا ہر چوتھا شخص اس کا ممبر ہے۔ اس سہولت سے سب سے زیادہ فائدہ تارکین اٹھاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

آنکھوں کے مرثیے کا انگریز مترجم

جب مغل فرماں روا شاہ عالم کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ نے نوکِ خنجر سے نکالی تھیں، شاہ عالم نے فارسی میں ایک دل دوز مرثیہ لکھا تھا جس میں غلام قادر روہیلہ کے مظالم نظم کیے گئے تھے اس مرثیے کو انگریز مورخ فرینکلن نے انگریزی میں منتقل کیا تھا، اور اب وہ تاریخ عہد شاہ عالم میں شامل ہے ——

ٹیپو سلطان اور شاہ عالم کے کتب خانے

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سب سے پہلے جو بڑا علمی خزانہ ہندوستان میں ملا وہ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کا شاہی کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانے کے تقریباً دو ہزار مخطوطات اور دستاویزات کا ایک بہت بڑا مجموعہ برطانوی فوج کے ہاتھ لگا۔ ان میں سے تقریباً دو ہزار مخطوطات اور کچھ اہم دستاویزات کی ایک فہرست ۱۸۰۹ء میں چارلس سٹورٹ نے مرتب کر کے کیمبرج سے شایع کی۔ ان مخطوطات اور دستاویزات کا ایک بڑا حصہ جس میں ٹیپو سلطان کے خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے شامل ہیں۔ اب انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز میں موجود ہے ——

انڈیا آفس لائبریری کے ریکارڈ میں ایک اشتہار موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ عالم کے کتب خانے کا ایک بہت بڑا حصہ ۱۸۱۸ء میں کلکتہ میں نیلام کر دیا گیا۔ یہ نیلام متواتر ۹ دن تک جاری رہا جس سے مخطوطات کی کثیر تعداد کا تھوڑا بہت اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد شاہانِ مغلیہ کے جو کتب خانے برطانوی فوج کے ہاتھ لگے ان میں سے بیشتر نیلام کے ذریعہ فروخت کر دیے گئے اور ان کا کچھ حصہ انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیا گیا، جہاں وہ دہلی سیکشن کے نام سے موسوم ہے ——

انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ جرائد

انڈیا آفس لائبریری میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کے نگراں سلیم الدین قریشی نے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ قیمتی اردو رسائل و جرائد کی مکمل فہرست بھی مرتب کر لی ہے۔ ان رسائل میں "اخبارِ توحید"، رفیقِ ہند، ہندوستانی غدر (سان فرانسسکو)، اخوت (استنبول)، حکمران (لکھنؤ) جنگی اخبار (برلن)، اور جہانِ اسلام (استنبول) شامل ہیں جنھیں حکومتِ برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کا تاریخی مشاعرہ

مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف "آبِ حیات" میں بیلی گارد والے نواب بیلی کے یہاں منعقد ہونے والے مشاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ اودھ کے شاہی دور کے ایک مسلمان عہدے دار کی انگریز بیگم مسز حسن علی کی یادداشتوں میں بھی (جو پچھلی صدی میں شایع ہوئی تھی) انگریز خاندانوں پر مسلم ہند کی تہذیب کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اب تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عمل داروں کی تعلیم و تربیت کے لیے قایم شدہ فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے زیرِ اہتمام کسی مشاعرے کی روئیداد کی قلمی تصویر کا علم نہیں تھا۔ "بی بی سی" کے مشہور پروگرام "کتب خانہ" میں پچھلے دنوں ایک ایسے مشاعرے کے بارے میں انکشاف کیا گیا جس کے متعلق محققین حضرات اپنی توجہ اور دلچسپی ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتے ——

یہ مشاعرہ آج سے ۱۸۰ سال پہلے منعقد ہوا تھا اور فورٹ ولیم کالج کے ایک استاد بینی نرائن جہاں نے اسے اپنے تذکرۂ شعرا میں قلم بند کیا تھا، لیکن واللہ اعلم کیا وجہ تھی کہ یہ تذکرہ میں شامل نہ ہو سکا۔ بی بی سی نے اپنے سامعین کے لیے کتابِ مذکور میں فورٹ ولیم کالج کے اس مشاعرے کی بابت گم شدہ اوراق کی ڈرامائی تشکیل کے ذریعے لاکھوں سامعین کو محظوظ کیا اور بہت سوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں فورٹ ولیم کالج میں مظہر علی خاں ولا، میر حیدر بخش حیدری، اور مرزا کاظم علی جیسے جوان اساتذہ موجود تھے۔

یہ مشاعرہ ۲۵ جولائی ۱۸۱۵ء کو فورٹ ولیم کالج کے چودھویں یومِ تاسیس کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ اس کے لیے طرح بھی دی گئی تھی ——

اسے پروفیسر کلیم الدین احمد نے "دیوانِ جہاں" کے نام سے شایع کر دیا ہے۔ بینی رائے جہاں نے اس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ

www.taemeernews.com

شاعروں کے مختصر حالات بھی شامل کر دیے ہیں جس سے اس مشاعرے کی حیثیت تذکرے کی سی ہو گئی ہے۔

"تاریخ کشمیر کا اردو ترجمہ"

مفتی صدرالدین خاں کے کتب خانے میں تاریخ کشمیر کا ایک قدیم نسخہ تھا۔ اسپرنگر جن دنوں دہلی کالج کا پرنسپل تھا ان دنوں کی بات ہے کہ وہ ایک شام مفتی صاحب کے کتب خانے کا معائنہ کر رہا تھا۔ تاریخ کشمیر پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں چنانچہ اس نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کروایا۔ یہ اردو ترجمہ اس کی نگرانی میں دہلی کالج پریس میں طبع ہوا اور بتاریخ سوم اگست ۱۸۴۶ء شایع ہو کر منظر عام پر آیا۔

تذکرہ یورپین شعرائے اردو

مارچ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد دکن سے محمد سردار علی نے "تذکرہ یورپین شعراء اردو" شایع کیا تھا جس میں انگریز مستشرقین کا اردو کلام مع حالات (حروف تہجی) سے پیش کیا گیا ہے۔ اس تذکرے کے دو ایڈیشن (باضافہ) شایع ہوئے۔ پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں مرتب نے انگریزوں کی اردو سے غیر معمولی دلچسپی اور مشاعروں میں ان کی شرکت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے۔

ڈیوڈ میتھیوز کو دکنی ادب پر ڈاکٹریٹ

اورنیٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے شعبۂ اردو کے استاد ڈیوڈ میتھیوز نے لندن یونیورسٹی سے دکنی اردو پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر صفیہ بانو کو انجمن پنجاب پر ڈاکٹریٹ

پی ای سی ایچ ایس گرلس کالج کی شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر صفیہ بانو کو انجمن پنجاب پر تحقیقی مقالہ تحریر کرنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔ اُن کا یہ سیر حاصل مقالہ کتابی صورت میں شایع ہو چکا ہے۔

برصغیر میں انگریزوں کی لسانی پالیسیوں پر پانچ کتابیں

کراچی کے ممتاز ادیب مصطفےٰ علی بریلوی نے کافی تلاش و تجسس کے بعد "انگریزوں کی لسانی پالیسی" کے علاوہ "مسلمانان پنجاب کی تعلیم"، "مسلمانان بنگال کی تعلیم"، "مسلمانان صوبۂ سرحد کی تعلیم" اور "مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم" کے عنوان سے انگریزوں کے دور حکومت میں لسانی پالیسیوں پر جامع کتابیں شایع کر دی ہیں جن کا مطالعہ تاریخ اور تعلیم دونوں حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔

تارکینِ وطن کے لیے حکومت برطانیہ کی اردو خدمات

برطانیہ میں مقیم اردو بولنے والوں کے علاوہ خود حکومت برطانیہ بھی بعض ضرورتوں کی بنا پر اردو کی ترویج کا ذریعہ بنی ہے۔ یہاں کئی لاکھ اردو بولنے والے باشندے برطانوی سماج کا اہم حصہ ہیں اور اُن میں سے بیشتر انگریزی زبان سے واقف ہیں۔ بعض لوگ جو انگریزی زبان نہیں سمجھتے ان کے لیے حکومت نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو رایج کی ہے۔

یہ سلسلہ انگریزی سے ناخواندہ تارکینِ وطن کے برطانیہ میں داخلے سے شروع ہوتا ہے۔ تارکینِ وطن سے انگریزی میں سوالات پوچھے جاتے ہیں اور جواب نہ ملنے کی صورت میں ایسے امیگریشن آفیسر کو بلایا جاتا ہے جو اردو بولتا اور سمجھتا ہے۔ ایسے آفیسر کے لیے لندن کے "ہول برن کالج آف لا اینڈ لینگویج" میں باقاعدہ اردو نصاب کا انتظام ہے۔ انتظامی آسانی کی خاطر پورے ملک کو مختلف علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر علاقہ "بورو کونسل" کہلاتا ہے۔ یہ کونسل ایک طرح کی لوکل گورنمنٹ ہے۔ متعلقہ کونسل میں رہنے والے تارکینِ وطن کے لیے جو انگریزی نہیں سمجھتے اور جن کی زبان اردو ہے، مختلف قوانین۔ اشتہارات۔ خبریں اردو میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے یا تو مقامی کونسل کے اردو جاننے والے ملازم کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں یا پھر ریس ریلیشن بورڈ کے ذریعے اکثر کتابچوں کا ترجمہ کرایا جاتا ہے۔

بیشتر کونسلز کے کالجوں میں ابتدائی اردو پڑھانے کا انتظام ہے جہاں یا تو مقامی لوگ اردو پڑھتے ہیں یا وہ تارکینِ وطن جو افریقی ممالک سے آتے ہیں جن کی زبان اردو ہے، لیکن افریقی ممالک میں پیدا ہونے یا مدت تک رہنے کی وجہ سے اُن کے لیے

www.taemeernews.com

اردو بولنا اور سمجھنا دشوار ہے۔ لندن یونیورسٹی کا شعبۂ اردو انگلستان میں اردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے جس میں ایم۔اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ تحقیق کی آسانیاں بھی میسر ہیں۔ ملک کے مختلف اسکولوں میں منعقد ہونے والے "او" لیول اور "اے" لیول کے امتحانات کا انتظام عموماً لندن یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ہی کرتا ہے۔ عدالتوں یا دوسرے قانونی معاملات میں متعلقہ اردو کاغذات کا ترجمہ بھی عموماً یہیں ہوتا ہے ——

تارکینِ وطن کو حالات سے باخبر رکھنے کے لیے جہاں اردو بولنے والوں نے متعدد اخبارات اور رسائل جاری کر رکھے ہیں ... وہیں حکومتِ برطانیہ کی وزارتِ اطلاعات نے سنٹرل بیورو آف امیگریشن کے تحت بعض خبروں کے اردو ترجمے کا انتظام کیا ہے۔ قومی ٹیلی ویژن "بی۔بی۔سی" ہر اتوار کی صبح کو ایشیائی تارکینِ وطن کے لیے نصف گھنٹے کا پروگرام نشر کرتا ہے۔ جس میں تارکینِ وطن کے مختلف مسائل پر بات چیت۔ تارکینِ وطن کے وطن سے آنے والی اہم شخصیات کا تعارف: تارکینِ وطن کے بارے میں مقامی حکومت کے رویے اور تارکینِ وطن کی تفریحِ طبع کے لیے گانے، رقص اور اداکاری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس پروگرام کا بڑا حصہ اردو پر مشتمل ہوتا ہے خصوصاً ارزد شعرا اور ادبا کا خصوصی تعارف اور کبھی کبھی مشاعرے غریب الوطنی میں وطن کی یاد تازہ کر دیتے ہیں ——

برطانیہ کے بعض اہم شہروں سے ہفتے میں ایک گھنٹے کے لیے ریڈیو سے اردو گانوں اور دیگر اردو فیچرز کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ اس ذیل میں سب سے زیادہ مقبول لندن سے نشر ہونے والا اردو پروگرام جھروکہ ہے! اس کے علاوہ آکسفورڈ، برمنگھم، ڈربی، بریڈفورڈ اور چند دوسرے شہروں کے مقامی ریڈیو بھی ہر ہفتے کم از کم ایک گھنٹے کے لیے اردو پروگرام پیش کرتے ہیں۔ بعض تارکینِ وطن خصوصاً دیہات سے آنے والی خواتین کو انگریزی پڑھانے کے لیے ہر مقامی کونسل نے خواتین استانیاں مقرر کی ہیں جو اکثر تارکینِ وطن کے گھر جا کر اور کبھی کبھی کسی مرکز میں انگریزی کا درس دیتی ہیں! اس کے لیے ذریعۂ تعلیم چونکہ اردو ہونا چاہیے۔ لہٰذا یہ استانیاں باقاعدہ اس مقصد کے لیے حکومت کے خرچ پر اردو پڑھتی ہیں۔ عدالتی معاملات میں انگریزی نہ جاننے والے تارکینِ وطن کے مافی الضمیر کو سمجھنے کے لیے حکومت اپنے خرچ پر مترجمین فراہم کرتی ہے۔ تارکینِ وطن کی اکثریت کے علاقوں میں متعین پولیس کو بھی باقاعدہ اردو پڑھائی جاتی ہے تاکہ وہ اُن کے معاملات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس طرح بلاواسطہ یا بالواسطہ حکومتِ برطانیہ بہ خلوصِ قلب یا بدرجۂ مجبوری اردو زبان کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کر رہی ہے ——

اردو شعری مجموعہ کی ترسیل پر جرمانہ

برطانیہ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ

کچھ عرصہ پہلے برطانیہ کے شاعر ڈاکٹر مجیب ایمان کے شعری مجموعہ "اشکِ شب" نے برطانیہ کے ادبی اور سماجی حلقوں میں خاصا ہنگامہ برپا کیا۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر ایمان نے اپنے شعری مجموعے لندن کی میونسپل لائبریریوں میں بھیج دیا تھا، تاکہ برطانیہ میں مقیم تارکینِ وطن اس کا مطالعہ کر سکیں لیکن یہ بات برطانیہ کے بعض نسل پرستوں کو ناگوار گزری، چنانچہ لندن کے ایک مجسٹریٹ نے شاعر پر ۲۰۰ پونڈ جرمانہ عائد کر دیا۔ اس پر پاکستان کی مختلف انجمنوں کی مرکزی تنظیم۔ "اسٹینڈنگ کانفرنس آف پاکستانی آرگنائزیشنز" نے نسلی فسادات کے کمیشن سے رجوع کیا جس نے تحقیقات کے بعد ڈاکٹر مجیب ایمان کے خلاف کی جانے والی کارروائی کو نسلی امتیاز پر مبنی قرار دیا۔ برطانیہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر مجیب ایمان نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی ہے ——

انگلستان میں مقیم چند ممتاز اہلِ قلم اور صحافی

مشتاق احمد یوسفی۔ حسن مثنیٰ ندوی۔ ڈاکٹر فاخر حسین۔ انعام عزیز۔ سید معین الدین شاہ۔ بیگم حمیدہ معین۔ ابوالخطیب۔ ایوب اولیاء۔ آصف جیلانی۔ ضمیر الدین احمد۔ عمران الارشد فاروقی۔

www.taemeernews.com

یحییٰ سید۔ بشیر ریاض۔ دتا راحمد۔ اطہر علی۔ منصور معجز۔ راشد الغفور۔ سید یونس واسطی۔ یاور عباس۔ وسیم صدیقی۔ سائرہ نقوی، اور رضا علی عابدی انگلستان میں قیام پذیر ہیں اور ادب وصحافت کے مختلف شعبوں کے ذریعے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں کوشاں ہیں۔ پاکستان کے مشہور آرٹسٹ شمزا بھی لندن میں بس گئے ہیں۔

سوہن راہی کا شعری مجموعہ

انگلستان کے معروف شاعر سوہن راہی کے گیتوں کا مجموعہ "گھونگھٹ کے پٹ" حال ہی میں لندن سے شایع ہوا ہے اور ادبی حلقوں نے اس کی پذیرائی کی ہے ـــــ

مجید میرٹھی کا پہلا مجموعۂ کلام

مجید میرٹھی کا پہلا شعری مجموعہ "کلام مجید" کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مجموعے پر جوش ملیح آبادی۔ راغب مرادآبادی اور سکندر محمد خاں تاج کی آرا شامل ہیں۔ گزشتہ دنوں مجید میرٹھی کا انتقال ہوگیا۔ یہ مجموعہ انجمن اردو (انگلستان) کے زیر اہتمام شایع کیا گیا تھا ـــــ

برطانوی دور کی مشہور جنرل لائبریری

جنرل لائبریری۔ سکھر برصغیر ہندو پاکستان کی قدیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس لائبریری کی بنیاد ۱۸۳۷ء میں اسٹیشن لائبریری کے نام سے رکھی گئی تھی۔ سکھر کی اس لائبریری میں نایاب کتب کے بیش قیمت قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ اس وقت اس لائبریری میں چودہ ہزار کتابوں اور کئی ہزار رسالوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس لائبریری کو انڈس فلوٹیلا کمپنی کے بانی ہنری پاٹنگر نے کمپنی کے عملے اور برطانوی ملازمین کے لیے قایم کیا تھا۔ ۱۸۹۳ء میں اس کا باضابطہ رجسٹریشن عمل میں آیا۔ اس وقت سے اس لائبریری کو شمالی سندھ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری کی حیثیت حاصل ہے۔

زبانوں کا بینک

مانچسٹر۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے طالب علموں نے شہر کے لوگوں کے لیے زبانوں کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے زبانوں کا ایک بینک قایم کیا ہے۔ عوامی ادارے مثلاً اسپتال، پولیس، مواصلاتی ادارے اور سوشل سروس کے ادارے اس بینک سے مترجم حاصل کرسکیں گے۔ یہ منصوبہ یونیورسٹی کے بین الاقوامی کلب نے شروع کیا ہے اور یہ بینک روزانہ ۲۴ گھنٹے کھلا رہے گا۔ یونیورسٹی میں ایک ہزار بیرونی طالب علم زیر تعلیم ہیں ـــــ

گلکرسٹ شاعر بھی تھے

ڈاکٹر جان گلکرسٹ ایک زباں داں، ماہر لسانیات اور اردو کے محسن کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن پہلی بار یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ اس کا ثبوت مسیح قریشی مقیم کراچی نے مدیر افکار کو فراہم کیا ہے۔ مسیح قریشی کے پرنانا قاضی قنبر علی سے گلکرسٹ نے اردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اُن کا حسب ذیل شعر جو اُن کے پاس محفوظ ہے ایک طرحی مشاعرے میں پڑھا گیا تھا ؎

گو بظاہر نہ ہوئی تجھ سے خطا اے ناداں
کچھ تو باطن میں کیا تھا کہ ہوا پھیرے میں

رالف رسل کی تصانیف

اسکول آف اورنیٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے ریڈر وصدر شعبۂ اردو کی حسب ذیل کتابیں اب تک شایع ہوچکی ہیں ـــــ

- تھری مغل پوئٹس

www.taemeernews.com

- غالب۔ لائف اینڈ لیٹرس
- اردو نصاب ــ انگریز طالب علموں کے لیے
- غالب کی اردو غزلوں کا انگریزی ترجمہ (زیر طبع)

اکبر حیدرآبادی کا نیا شعری مجموعہ

گزشتہ دنوں انگلستان کے ممتاز شاعر اکبر حیدرآبادی کا نیا شعری مجموعہ "نمو کی آگ" گزشتہ جنوری ۱۹۸۱ء میں نئی دہلی سے شایع ہوا جس کی تقریبات رونمائی دہلی اور مارچ ۱۹۸۱ء میں کراچی میں زیر اہتمام ارباب قلم پاکستان منعقد ہوئیں۔

اس سے قبل اکبر حیدرآبادی کا پہلا مجموعہ "خط رہگذر" حیدرآباد دکن سے ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا تھا۔ وہ عرصۂ دراز سے آکسفورڈ میں قیام پذیر ہیں۔

سیاحت نامہ شایع ہوگیا

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے قیام لندن کے دوران "سیاحت نامہ" نواب کریم خان برٹش میوزیم سے ڈھونڈ نکالا تھا جس کا کچھ حصہ۔ اس اشاعت خاص میں "نادر و نایاب" عنوان کے تحت شامل ہے۔ وہ اب کتابی صورت میں تفصیلی مقدمے اور حواشی کے ساتھ لاہور سے شایع ہوگیا ہے۔

کامن ویلتھ انسٹی ٹیوٹ آرٹ گیلری

اس گیلری میں ممتاز مصوروں کی نمایش ہوچکی ہے

لندن۔ پاکستان اگرچہ کامن ویلتھ میں اب شامل نہیں ہے۔ لیکن کامن ویلتھ انسٹی ٹیوٹ آرٹ گیلری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی کے علاوہ پاکستان کے کئی ممتاز اور نامور مصوروں کی تصاویر کی نمائشیں منعقد ہوچکی ہیں۔ ان مصوروں میں صادقین اور شمزا بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

ساقی فاروقی کا نیا مجموعہ

انگلستان کے ممتاز شاعر ساقی فاروقی کا دوسرا شعری مجموعہ "رادار" کچھ عرصہ پہلے پاکستان سے شایع ہوچکا ہے۔ سنا ہے کہ وہ اپنے تیسرے مجموعے کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ ساتھ ہی ن۔م۔راشد پر بھی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

لندن کی ڈائری ــ چار جلدوں میں

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے قیام لندن ۶۸-۱۹۶۲ء کے دوران التزام کے ساتھ لندن کی ڈائری تحریر کی تھی جو عنقریب چار جلدوں میں شایع ہورہی ہے۔ اس ڈائری میں لندن کی علمی، ادبی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اطہر راز کی ۵ مطبوعہ کتابیں

معروف شاعر اطہر راز کی جو کتابیں شایع ہوچکی ہیں اُن ہیں ــ آئینہ پیش پیش، کلی اور کرن (بچوں کے لیے) کلام توفو، اسکول میں بلی (مزاحیہ ناول) مرغ دل (لندن میں شایع ہوئی) ایک اور ایک (بچوں کے لیے ریاضی کی کتاب) قابلِ ذکر ہیں۔ اطہر راز شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

پاکستان سوسائٹی بریڈ فورڈ کے اغراض و مقاصد

(۱) فروغِ اردو و فنون لطیفہ

www.taemeernews.com

(۲) تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کی کاوشیں۔
(۳) مجالس۔ سیمینار۔ سمپوزیم اور مباحث و تقاریر کا انعقاد۔
(۴) اسلامی اقدار کی اشاعت۔
(۵) ضرورت مندوں کی بے لوث مالی و اخلاقی امداد۔
(۶) پک نک، سیر و سیاحت اور تفریحی و تحقیقی سفر
(۷) حکومتِ پاکستان و مقامی حکام سے ضروری تعاون۔
(۸) ایسی مجلسی و ادبی انجمنوں سے تعاون جن کے اغراض و مقاصد سوسائٹی کے دستور سے متصادم نہ ہوں۔

جاوید نامہ کا انگریزی ترجمہ

راولپنڈی۔ علامہ اقبال کے جاوید نامہ" کا انگریزی ترجمہ لندن سے شایع ہوچکا ہے۔ یہ ترجمہ تمام دنیا میں، اور خصوصاً برطانیہ کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہورہا ہے اخبارات نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ڈانٹے کی "ڈوائن کامیڈی" (مقدس طربیہ) سے تشبیہہ دی ہے۔" جاوید نامہ" کا یہ ترجمہ مشہور مستشرق پروفیسر آربری نے کیا ہے۔—

آغا حسن عابدی کی معارف پروری

لندن۔ یونائٹڈ بنک لمیٹڈ کے پہلے سربراہ آغا حسن عابدی جو ان دنوں بی سی سی آئی کے سربراہ ہیں بنکاری کی دنیا میں غیر معمولی صلاحیت کار کے باعث نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بنکاری کے طویل تجربے کے ساتھ ساتھ آغا صاحب نے اردو زبان و ادب اور علم و ثقافت کے سلسلے میں جو خاموش خدمات انجام دی ہیں اردو دنیا کو ان کا بہت کم علم ہے۔ موجودہ عہد میں اردو کے سب سے بڑے زندہ شاعر جوش ملیح آبادی سے ذاتی عقیدت و محبت کی بنا پر آپ نے جوش صاحب کی ہر طرح معاونت کی۔ ساتھ ہی کئی ثقافتی اور فنی، علمی اداروں کو بھی فیض پہنچایا۔ گزشتہ دنوں انجمن اسلامیہ کراچی کو آپ نے ایک لاکھ سے زائد کا عطیہ عنایت کیا۔ بیرونِ ملک بھی اردو دوستوں اور صاحبانِ علم کو۔ آپ برابر مالی تعاون فراہم کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ زبان و ادب کی رفتارِ ترقی کو مہمیز ملتی رہے —

برطانیہ میں فروغ اردو کے لیے پاکستان کا عطیہ

لندن برطانیہ میں مقیم پاکستانی برادری کے بچوں کے لیے اُردو کی درسی کتب کی اشاعت میں مدد دینے کی غرض سے پاکستانی سفیر جناب علی ارشد نے گزشتہ دنوں مشرقی و افریقی علوم کے لندن یونیورسٹی اسکول کے شعبۂ اُردو کے سربراہ پروفیسر رالف رسل کو ۵۰۰۰ پونڈ کا ایک چیک پیش کیا۔ یہ رقم حکومت پاکستان کی جانب سے پروفیسر رسل کے منصوبے کے لیے ابتدائی امداد کے طور پر دی گئی ہے۔ جناب علی ارشد نے یہ چیک پاکستانی سفارت خانے میں ہونے والی ایک تقریب میں پیش کیا۔ اپریل کے آخر میں ایک اردو کانفرنس بھی منعقد کی جارہی ہے جس میں اس بارے میں غور کیا جائے گا کہ برطانیہ میں اردو کو کیونکر فروغ دیا جائے اور برطانوی اسکولوں میں اردو تعلیم کس طرح متعارف کرائی جائے —

ڈاکٹر سعید اختر درانی کا مجموعۂ کلام

گزشتہ دنوں ڈاکٹر سعید اختر درانی جو چاند سے لائی ہوئی مٹی اور شہاب ثاقب پر اپنی سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں شہرت حاصل کرچکے ہیں، پاکستان آئے تھے اور اپنے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت کے انتظامات مکمل کرگئے ہیں —

ڈاکٹر درانی نہایت باصلاحیت ادیب و شاعر ہیں۔ توقع ہے کہ اُن کا پہلا مجموعہ جسے وہ ترتیب دے رہے ہیں، عنقریب شایع ہوجائے گا —

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ادارہ

ہمارے مشتہرین اور تشہیری ادارے

(مختصر تعارف و جائزہ)

قیام پاکستان کو ۴۴ سال ہوا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارا ملک ابھی تک ترقی پذیر ملکوں میں شمار ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم بہت سی صنعتوں اور کئی شعبوں میں خودکفالت کی منزل تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ پھر بھی یہ امر خوش آیند ہے کہ ہم نے بہت تیز رفتاری سے نہ سہی معمولی رفتار سے ہی اپنے ملک کی صنعتی اور زراعتی ترقی میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں جس کا سہرا ہمارے محب وطن اور جفاکش صنعت کاروں اور سرکاری و غیر سرکاری انتظامی اداروں کے سر ہے ــــ

ابلاغ عامہ کے ذرائع میں ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات کا ذکر ہی آتا ہے لیکن سچ پوچھیے تو ان اداروں کی شہ رگ کی حیثیت سے دراصل ہماری صنعت ہی ہے جس نے ابلاغ عامہ کے ذرائع کو تقویت بخشی ہے۔ صنعتی ترقی اپنی جگہ پر ایک اکائی ہے جسے عوام تک پہنچانے اور انھیں اشیائے صرف سے متعارف کرانے کا تمام تر انحصار موثر، کامیاب اور پرکشش تشہیر پر ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے ملک کے تشہیری اداروں (ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں) نے اس فرض کو جس فنی مہارت، کامیابی اور خوبی سے انجام دیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ یوں اس ملک کی ہمہ جہتی ترقی اور خوش حالی میں جہاں حکومت نے اپنے ذرائع و وسائل کو عوام کی خدمت کے لیے وقف کیا ہے وہیں یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ ملک کی صنعتوں کو صحیح اور مستحکم بنیادوں پر عوام تک پہنچانے میں تشہیری اداروں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ قومی ترقی میں غیر سرکاری حیثیت سے ان تشہیری اداروں نے گزشتہ ۴۴ سال کے دوران جو بے مثال خدمات انجام دی ہیں اور سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی جو مالی معاونت بصورت اشتہارات انجام دی ہے۔ اس کے پیش نظر ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ پاکستان کے صنعتی اداروں، ان کی مشہور و ممتاز مصنوعات اور دیگر قومی اداروں کی چند در چند خصوصیات کا مختصر سا تعارف و جائزہ اس

www.taemeernews.com

یادگار پیشکش میں شامل کردیں تاکہ ملک اور بیرونِ ملک میں بسنے والے ہزاروں، لاکھوں قارئین کو پاکستان کی ہمہ جہتی ترقی کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکے ـــ

جہاں تک ہمیں علم ہے مشتہرین اور تشہیری اداروں کے بارے میں "افکار" سے پہلے کسی ادبی ماہنامے نے اس نوعیت کا جائزہ اس سے قبل کبھی شایع نہیں کیا ـــ

ـــــــ (ادارہ)

ہمدرد دواخانہ (وقف)

ہمدرد دواخانہ برِصغیر ہند اور پاکستان کا قدیم ترین دواخانہ ہے جو متحدہ ہندوستان میں ۱۹۰۶ء میں قایم ہوا۔ پاکستان میں اس کا قیام ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا۔ اس کے چیرمین حکیم محمد سعید اور جنرل منیجر ڈاکٹر حافظ محمد الیاس ہیں۔ ہمدرد کا مقصد طبِ مشرقی کی بحیثیت سائنس حفاظت اور ترقی، اصولِ دوا سازی کی اصلاح اور فنِ دوا سازی کی ترقی و بلند معیاری ہے۔ اس کا دوسرا مقصد صحیح مفردات و مرکبات کی ارزاں فراہمی، اصولِ صحت اور علمِ طب کی تعلیم اور نشر و اشاعت اور عوام کی پُرخلوص خدمت ہے۔

ادویۂ ہمدرد ہزاروں کی تعداد میں جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ اس ادارے کی تیار کردہ بے شمار مقبول ادویہ میں شربت روح افزا، صافی، کارمینا، جوشینا، خوبانی، نونہال، گرائپ واٹر، سعالین، لحمینا، ہمدرد منجن اور ماء اللحم بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

ہمدرد دواخانہ ہر سال اپنی متعدد دوائیں غیر ممالک میں برآمد کرتا ہے۔ ان میں شربت روح افزا اور دیگر ادویہ شامل ہیں۔ اس نے ۱۹۸۰ء میں تہتر لاکھ سے زائد روپے کی برآمدات کیں جن میں صرف شربت روح افزا ۶۹ لاکھ روپے سے زائد اور دیگر ادویہ ۴ لاکھ سے زائد روپے کی شامل ہیں ـــ

ملک کے مختلف حصوں میں ہمدرد کے تقسیم کنندگان موجود ہیں علاوہ ازیں کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں زونل دفاتر اور مطب ہائے ہمدرد کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ غیر ممالک مثلاً دوبئی، ابوظہبی، کویت، دوہا، قطر، سعودی عرب اور لندن میں ایجنٹس اور کینیڈا اور امریکہ میں اسٹاکسٹ موجود ہیں۔ کراچی میں موجود دو فیکٹریوں کے علاوہ بارہ ایکڑ کے رقبے پر ایک جدید فیکٹری کی بھی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ لاہور میں بھی دو فیکٹریز موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کوٹ لکھپت (لاہور) میں بھی تیسری فیکٹری کا زیرِ تعمیر ہے، جہاں روزانہ پچاس ہزار بوتلیں شربت روح افزا تیار ہوسکیں گی۔ ایکسپورٹ کی مانگ پوری کرنے اور پروڈکشن میں سہولت کی خاطر پاکستان سے باہر روح افزا کی فیکٹری کا قیام بھی زیرِ غور ہے۔ کراچی میں ایک طبی کمپلیکس اور شہرِ ثقافت و علم کا قیام بھی زیرِ غور ہے۔ ادارۂ ہمدرد ادویہ سازی کے علاوہ علم، ادب اور فن کی سرپرستی میں بھی قومی اداروں میں سرِ فہرست ہے اور اس کے روحِ رواں حکیم محمد سعید ہیں جو خود بھی ایک بلند ادیب اور دانشور اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں مثلاً کراچی، لاہور، پشاور اور اسلام آباد۔ راولپنڈی میں "شامِ ہمدرد" نے پاکستان کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی میں بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ افکار کو ہمدرد دواخانے کی سرپرستی ۱۹۴۷ء سے حاصل ہے ـــ

کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ

(گروپ آف انڈسٹریز)

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کوہِ نور کیمیکل کمپنی نے حسن و صحت اور گھریلو استعمال کی مشہور مصنوعات تیار کی ہیں جنھیں ملک و بیرونِ ملک مہیا کرکے قومی اداروں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اس کمپنی کے چیرمین ایس۔ ایم عثمان اللہ والا

www.taemeernews.com

اور ڈائرکٹروں میں ایس۔ ایم۔ الیاس اللہ والا، ایس۔ ایم۔ ادریس اللہ والا، ایس۔ ایم۔ اقبال اللہ والا، ایس۔ ایم۔ نسیم اللہ والا، ایس۔ ایم۔ اسلم اللہ والا اور ایس۔ ایم سعید اللہ والا شامل ہیں۔ کوہ نور کیمیکل کمپنی کی تیار کردہ مصنوعات میں تبت اسنو، تبت ٹوتھ پیسٹ، تبت ٹالکم پاؤڈر، تبت ٹائلٹ سوپ، جیٹ واشنگ پاؤڈر اور چندا بیٹری سیل بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جنھیں تعلیم یافتہ اور باشعور گھرانوں میں ذوق و شوق سے استعمال کیا جاتا ہے ——

یہ ادارہ ۱۹۵۲ء سے افکار کی مسلسل سرپرستی کر رہا ہے۔ کسی ادبی ماہنامے کو شاید ہی کسی صنعتی ادارے کا اتنا طویل عرصے تک تعاون نصیب ہوا ہو ——

نیشنل بنک آف پاکستان

نیشنل بنک آف پاکستان کا ۸ نومبر ۱۹۴۹ء کو ایک آرڈی ننس کے تحت قیام عمل میں آیا تھا۔ اس بنک کے پہلے جنرل منیجر (بعد میں منیجنگ ڈائرکٹر) احمد مہاجر تھے اور موجودہ صدر محمد نواز خاں ہیں ——

اس بنک کی تقریباً ۱۵۰۰ شاخیں ملک میں اور تقریباً ۳۰ شاخیں بیرونِ ملک بنکاری کی نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اس بنک نے پہلی بار عوامی قرضہ اسکیم کو متعارف کرایا جو دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہو گئی۔ بعد میں پاکستان کے دوسرے بنکوں نے بھی اس کا اتباع کیا ——

نیشنل بنک کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ وہ اسٹیٹ بنک کی جانب سے حکومت کی ٹریژری (خزانے) کے فرائض بھی نہایت خوبی اور مستعدی سے انجام دیتا ہے ——

ملکی معاشیات و اقتصادیات کی ترقی کے دوش بدوش جب اس بنک کے سربراہ ممتاز حسن مرحوم اپنے ممتاز ادیب و دانشور مقرر ہوئے تو انھوں نے قومی بنک کو علم، ادب اور ثقافت کی ترقی کے لیے بھی استعمال کیا۔ چنانچہ حبیب بنک اور یونائٹڈ بنک کی طرح نیشنل بنک بھی سال کی بہترین کتابوں پر "نیشنل بنک ایوارڈ" دیتا ہے۔ بلا سود بنکاری کو فروغ دینے کے لیے بھی اس بنک نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ——

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز ملک کے اُن اداروں میں شامل ہے جس نے ملک اور بیرونِ ملک ہوائی سفر کی تمام تر جدید سہولتیں مہیا کی ہیں۔ یہ ادارہ نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ کثیر زرِ مبادلہ بھی ملک کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اس ادارے میں ہزاروں افراد شبانہ روز اپنی ایرلائن کی سود و بہبود کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قومی زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً تجارت، سیاحت، ثقافت اور کھیلوں کے فروغ کے سلسلے میں بھی پی آئی اے کی گراں مایہ خدمات ناقابلِ تردید ہیں۔ علاوہ ازیں پی آئی اے دیگر فضائی کمپنیوں کو انتظامی، تربیتی اور فنی سہولتیں بھی مہیا کرتی ہے اور یوں اس کا دائرۂ کار دور دراز علاقوں اور ملکوں تک پھیل گیا ہے۔ بلاشبہ پی آئی اے کا شمار دنیا کی گنی چنی فضائی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ اور اس کے جدید ترین طیارے ملک اور بیرونِ ملک ہوائی سفر کی تمام ممکنہ سہولتیں بہم پہنچا رہے ہیں ——

حبیب بنک لمیٹڈ

اس بنک کا قیام متحدہ ہندوستان میں اگست ۱۹۴۱ء میں عمل میں آیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس بنک نے پورے ملک اور بیرونِ ملک شاخیں قایم کرکے عوام کی بہتر خدمت کی اعلیٰ مثالیں قایم کیں چونکہ یہ بنک پاکستان کا سب سے قدیم بنک ہے اس لیے ملک میں اس کی ۱۸۵۰ سے زائد

www.taemeernews.com

شاخیں اور بیرونِ ملک ۸۰ شاخیں بنکاری کے تمام شعبوں میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اس کے موجودہ صدر حاجی عبدالجبار خاں ہیں۔ یہ بنک علم و ادب کے فروغ کے لیے "حبیب بنک ایوارڈ" بھی ہر سال دیتا ہے۔ یوں قومی بنکوں میں اس بنک کی خدمات لائق صد ستائش ہیں۔ جب سے ملک میں بلا سود بنکاری کا نظام رائج ہوا ہے۔ حبیب بنک نے اس ضمن میں بھی ریکارڈ کھاتے کھول کر خدمت کا منفرد معیار قایم کیا ہے۔

یونین انڈسٹریز لمیٹیڈ

یونین انڈسٹریز لمیٹیڈ کا قیام ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ بسکٹ اور کنفیکشنری اس ادارے کی خاص مصنوعات ہیں جو ملک بھر میں مقبول ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ گلوکوز۔ڈی بسکٹ، ملکی بسکٹ، ٹانی بار، فینٹسی ڈراپس اور گارڈن کینڈی بچوں اور بڑوں میں یکساں پسند کی جاتی ہیں۔ پاکستان میں ہر جگہ یونین انڈسٹریز لمیٹیڈ کے سول ڈسٹری بیوٹرز مقرر ہیں۔ خلیجی ملکوں اور مشرقِ وسطیٰ میں بھی اس ادارے کی اشیاء ایجنٹ حضرات کے ذریعے فروخت ہوتی ہیں اور پیداوار کا ۲۰ فی صد حصہ برآمد ہوتا ہے جس سے زرِمبادلہ ملک میں آتا ہے۔ اس ادارے کے سربراہ عبدالحبیب احمد ہیں جو علم و ادب و فن و ثقافت کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔۔۔

نیشنل انوسمنٹ ٹرسٹ لمیٹیڈ

نیشنل انوسمنٹ ٹرسٹ لمیٹیڈ (این۔ آئی۔ ٹی) اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں سرمایہ کاری کا واحد قومی ادارہ ہے جس نے یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے اپنے کاروبار کو کلی طور پر سود سے مبرا شراکت کی بنیاد پر استوار کیا ہے۔ این۔ آئی۔ ٹی یونٹ کی فروخت سے جمع شدہ کثیر رقوم کی سرمایہ کاری ۲۵۰ سے زائد پبلک لمیٹیڈ کمپنیوں کے حصص میں کی گئی ہے اور این آئی ٹی کے موجودہ اثاثہ جات ایک ارب روپے سے متجاوز ہیں۔ اس کی سرمایہ کاری سے حاصل شدہ آمدنی کو اس کے حصے داروں میں ہر سال بطور منافع تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۶۲ء سے ہر سال بڑی باقاعدگی سے معقول شرح پر منافع تقسیم کر رہا ہے۔ سالانہ منافع کے علاوہ این۔ آئی۔ ٹی۔ یونٹ کی قیمت میں بتدریج اضافہ ہونے سے اصل سرمائے میں ۳۰ رجون کو ختم ہونے والے مالی سال کے دوران این۔ آئی۔ ٹی۔ کے مجموعی منافع کی مالیت ۱۲ کروڑ ہو چکی ہے۔ این۔ آئی ٹی ۳۰ رجون ۱۹۸۰ء تک ایک ارب سے زائد روپے کے یونٹ فروخت کر چکا ہے۔

ین آئی ٹی یونٹ خریدنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مقررہ حد تک سرمایہ کاری سے انکم ٹیکس کے مروجہ قوانین کے تحت ٹیکس کی چھوٹ یعنی انوسمنٹ الاؤنس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ این۔ آئی۔ ٹی سے حاصل شدہ منافع بھی مقررہ حد تک انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اس وقت این آئی ٹی کے حصہ داروں کی تعداد ۸۰ ہزار سے زائد ہے اور ان میں غالب اکثریت متوسط طبقے کے افراد کی ہے۔ ان حصے داروں کا اعتماد اس ادارے کے استحکام کی ضمانت ہے۔ ان دنوں نیشنل انوسمنٹ ٹرسٹ لمیٹیڈ کے چیرمین ایس۔ این۔ جعفری ہیں۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

اس انشورنس کمپنی کا قیام ۱۹۲۵ء میں عمل میں آیا تھا اور یہ پاکستان کی قدیم ترین انشورنس کمپنی ہے جس کے بانی تحریکِ پاکستان کے ایک ممتاز رہنما عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم تھے جو کلکتہ کے میئر اور سابق مشرقی پاکستان کے گورنر رہ چکے ہیں۔ ان دنوں اس کے سربراہ روشن علی بھیم جی ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے خاص قدردان اور مداح ہیں۔ اس انشورنس کی کمپنی کی شاخیں پورے پاکستان میں قایم ہیں اور یہ حادثات، آتش زدگی، ہر قسم کی میرین اور جنرل انشورنس کی معیاری خدمات سرانجام دیتی ہے۔

www.taemeernews.com

یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ

یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کا قیام ۱۹۵۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس بنک کے پہلے سربراہ آغا حسن عابدی تھے جو اب بی سی سی آئی کے سربراہ ہیں۔ بنک نے قیام کے بعد سے ہی سائنٹفک بنیادوں پر ملک اور بیرون ملک اپنی شاخیں قایم کردیں اور اس وقت اس بنک کی ۱۷۰۰ سے زائد شاخیں ملک میں اور ۴۵ شاخیں بیرونی ملکوں میں بنکاری کی اعلیٰ خدمات انجام دے رہی ہیں ——

اس بنک نے جن نئی اسکیموں سے عوام وخواص کی خدمت کا نیا معیار قایم کیا اُن میں آل ٹائم انکم اسکیم رکھ رکھاؤ، اپنی رقم بچا کرتا ابد کمانے والی اسکیم اور کمپیوٹر کے ذریعے بنکاری کی سہولتیں فراہم کرنا شامل ہیں ——

یونائیٹڈ بنک کے دو ذیلی بنک سوئٹزرلینڈ اور لبنان میں کام کر رہے ہیں اور ایک مشترکہ سرمائے سے قایم شدہ بنک اومان میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس بنک کے موجودہ سربراہ عبدالسمیع ہیں ——

پاکستان میں علم وادب کے فروغ کے لیے بھی یہ بنک ہر سال "یونائیٹڈ بنک ایوارڈ" دیتا ہے۔ بلا سود بنکاری کے سلسلے میں بھی یہ بنک قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ — ملک کا قدیم ترین سگرٹ ساز ادارہ ہے جس کے معیاری سگرٹ عوام وخواص میں یکساں مقبول ہیں۔ مشہور سگریٹوں میں گولڈ لیف، کیپسٹن، ولز فلٹر، ڈنھائن وغیرہ کے علاوہ ولز پریمیم قابلِ ذکر ہے جو حال ہی میں متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ ادارہ کرکٹ کی ترویج وترقی میں خصوصی کردار ادا کر رہا ہے ——

آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن

آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن ملک میں تیل اور گیس کی تلاش میں بہت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد ملک میں تیل اور گیس تلاش کرنا اور ملک کے ایندھن کی ضروریات کو پورا کرنا ہے چنانچہ اس ادارے نے ملک کے مختلف حصوں میں تیل اور گیس کی تلاش شروع کر رکھی ہے۔ اس وقت توت آئل فیلڈ سے تیل اور ساری اور ہنڈی گیس فیلڈ سے گیس کی پیداوار جاری ہے۔ جس سے بڑی تعداد میں زرِ مبادلہ کی بچت ہو رہی ہے ——

اس وقت آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے سات کنوؤں کی کھدائی کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس وقت جن مقامات پر تیل کی تلاش جاری ہے۔ ان میں ذریال۔ مولا رلوہ۔ جھمبور۔ دھرمنڈ۔ ڈوسپرہ سورجان۔ ڈھوڈک اور پیرکوہ شامل ہیں۔ کارپوریشن نے فیلڈ سروے کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ کی غرض سے ایک خصوصی پروگرام مرتب کیا ہے جس کے تحت دو اور سروے پارٹیوں کا اضافہ کیا جائے گا۔ اس طرح جو سروے پارٹیاں مصروفِ عمل رہیں گی ان کی تعداد دس ہو جائے گی۔ ان میں سے چھ پارٹیاں سیسمک سروے کا کام انجام دیں گی۔ تین پارٹیاں جیولوجیکل سروے اور ایک گریویٹی تحقیق کا کام انجام دیں گی۔ آئل اینڈ گیس کے موجودہ چیرمین افتخار الدین احمد ہیں جو اس شعبے کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں ——

گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ پاکستان کا مشہور دوا ساز ادارہ ہے جو دواؤں کے علاوہ بچوں کے لیے دودھ اور دیگر توانائی بخش غذائی اشیا بھی تیار کرتا ہے جو عوام وخواص میں یکساں مقبول ہیں۔ بچوں کے لیے گلیکسو کے تیار کردہ وٹامنک

www.taemeernews.com

آسٹر ملک، فیریکس اور فارلیک اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لیے سپلیمنٹ -۲۲ کے علاوہ ہر عمر کے لوگوں کے لیے مکمل اور متوازن غذا - کمپلان اور توانائی بخش گلیکسوز-ڈی اسس ادارے کی کثرت سے استعمال ہونے والی اشیا ہیں۔

دوا سازی کے میدان میں سر کے درد اور بخار کی کیفیت میں - پیراسیٹامول اور گلے کی خراش کے لیے ڈائبنال لازنجس قابلِ اعتماد ادویہ ہیں ــــ

بخاری موٹرز

بخاری موٹرز پاکستان کا ایک ممتاز اور معتبر ادارہ ہے جو ۱۹۷۳ء سے ملک کی معاشی زندگی میں نہایت تعمیری کردار ادا کر رہا ہے۔اس ادارے نے مختصر سے عرصے میں اپنی کارکردگی سے عوام و خواص کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ اس کے مالک خادم علی شاہ بخاری ہیں جن کی سرکردگی میں بخاری موٹرز ملک کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ادارہ سرکاری اور نجی دائرۂ عمل میں قایم ہونے والی صنعتوں کے لیے پلانٹ بھی درآمد کرتا ہے۔ بخاری موٹرز ملک کی زراعت خصوصاً خوراک کی پیداوار بڑھانے میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ مشینی زراعت اور سائنسی طریقۂ کاشت کے فروغ کے لیے کاشت کاروں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے اور فروخت کے بعد اس کی دیکھ بھال اور مرمت کا فرض بھی انجام دیتا ہے - اس طرح بخاری موٹرز کسانوں کو زراعت کی جدید مشینری فراہم کر کے ملک کی زرعی پیداوار بڑھانے میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

بخاری موٹرز (ورکشاپ) جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ایک بڑا ورکشاپ ہے - جہاں ہر قسم کی موٹر گاڑیوں کی ریپیرز اور سروس کی بہترین سہولتیں دستیاب ہیں - یہ ورکشاپ ناصر علی شاہ کی اعلیٰ صلاحیت کار کے سبب مسلسل ترقی کر رہا ہے اور اس کے دائرۂ کار کو مزید وسعت دی جا رہی ہے ــــ

اسی طرح بخاری ایکسپریس - اس ادارے کا ایک اور اہم شعبہ ہے جو کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹس کی حیثیت سے کسٹم ہاؤس سے درآمد شدہ کاروں کی کلیرنس کی تمام تر ذمہ داریاں بہ حسن و خوبی انجام دیتا ہے ــــ

آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی

آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی پاکستان میں فاؤنٹن پین بنانے والا مشہور اور قدیم قومی ادارہ ہے جس کا قیام ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے تیار کردہ فاؤنٹن پین نہ صرف پاکستان میں مقبول ہیں بلکہ اس کی پیداوار کا کچھ حصہ بیرونِ ملک بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ اس ادارے میں چار سو سے زائد افراد کام کرتے ہیں اور اس کی شرح پیداوار یومیہ سترہ سے اٹھارہ ہزار قلم ہے۔ کم قیمت اور پائیدار قلموں میں اس ادارے کی مصنوعات اپنا خاص معیار رکھتی ہیں جس کے سبب اس کے تیار کردہ قلم ہر طبقے میں یکساں مقبول ہیں ــــ

اس ادارے کے بانی اور مینیجنگ ڈائرکٹر شیخ علاءالدین ہیں اور ڈائرکٹروں میں لطیف محمد، سراج الدین، جمال الدین اور محمد احمد شامل ہیں - یہ تمام حضرات نہ صرف علم و ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں بلکہ صاحبانِ علم کے قدرداں بھی ہیں ــــ

فلپس الیکٹریکل کمپنی آف پاکستان

الیکٹریکل سامان تیار کرنے والا مشہور ترین ادارہ جس کی مصنوعات عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں۔ بین الاقوامی مہارت بے مثال تکنیکی کمال اور کوالٹی کنٹرول کی بنا پر فلپس کے بلب، ریفریجریٹر، ریڈیو، رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی وژن اور دیگر تیار کردہ بجلی کی اشیا ساری دنیا میں شہرت رکھتی ہیں ــــ

پاکستان اسٹیٹ آئل

یہ کمپنی اپنی موجودہ صورت میں ۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو وفاقی

www.taemeernews.com

ادارہ

حکومت کے نئے تنظیمی منصوبے کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہے اور اس کا نام "اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ" رکھا گیا - مذکورہ کمپنی مینجنگ ڈائرکٹر کی زیرِ نگرانی تجارتی خطوط پر اپنا کام انجام دیتی ہے جسے وفاقی حکومت مقرر کرتی ہے - اس وقت اس ادارے کے مینجنگ ڈائرکٹر سعید ابراہیم ہیں —

کراچی میں پی - ایس - او کے چار ٹرمینل ہیں جہاں ڈیڑھ لاکھ ٹن سے زائد تیل رکھنے کی گنجائش ہے - ملک کے مختلف حصوں میں ۳۲ ڈپو ہیں جہاں ۸۵ ہزار ٹن تیل جمع رکھنے کی گنجائش ہے - اس کے چار بلینڈنگ پلانٹ ہیں جہاں سالانہ تقریباً ۴۰ ہزار ٹن بلینڈنگ کی گنجائش ہے - ملک کے مختلف حصوں میں پی - ایس - او کے ۱۰۵۲ پٹرول پمپ اور سروس اسٹیشن ہیں - یہ ادارہ ملک میں پٹرولیم کے کاروبار کا ۵۶ فی صد کنٹرول کرتا ہے —

ملک کے مختلف حصوں میں خصوصاً شمالی علاقوں میں اسٹوریج کی گنجائش بڑھانے کے لیے توسیعی پروگرام پر عمل کیا جا رہا ہے تاکہ مزید ۴۳ ہزار ٹن تیل اسٹور کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکے ملک کے دور افتادہ علاقوں میں مزید ۵۰ ہزار ٹن تیل جمع رکھنے کے لیے ایک منصوبے پر غور و خوض جاری ہے - بہپری میں بھی ۸۰ ہزار ٹن کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے ایک بڑی تنصیب کی کوشش کی جا رہی ہے —

کراچی پائپ ملز لمیٹڈ

کراچی پائپ ملز کا قیام ۱۹۵۵ء میں عمل میں آیا تھا - اس ملز میں اسٹیل کے اعلیٰ درجے کے پائپ تیار کیے جاتے ہیں جو پانی، گیس اور ٹیوب ویل میں استعمال ہوتے ہیں - اسٹیل کے مچان اور بجلی کے کھمبے بھی اس ملز میں تیار ہو کر قومی ضروریات کو پورا کرتے ہیں - پاکستان کا یہ سب سے بڑا اسٹیل کے پائپ تیار کرنے والا ملز ہے - اس ملز کے موجودہ سربراہ مسعود بیگ ہیں —

بلال کارپٹ انڈسٹریز لمیٹڈ

بلال کارپٹ انڈسٹریز لمیٹڈ پاکستان کا مشہور قالین ساز ادارہ ہے جو نجی ملکیت میں مئی ۱۹۷۳ء میں قایم ہوا اور اس نے نہ صرف ہاتھ سے بُنے ہوئے کارپٹ اور قالین نہایت عمدگی اور چابکدستی سے تیار کیے، بلکہ غیر ممالک میں انھیں برآمد بھی کیا - چنانچہ پاکستان کے اس مشہور و معروف قالین ساز ادارے نے مختصر سی مدت میں پاکستان سے قالین برآمد کرنے والوں میں نہ صرف سب سے نمایاں حیثیت حاصل کر لی - بلکہ بین الاقوامی منڈیوں میں بھی پاکستان کا نام سربلند کیا - اس ادارے کی تیار کردہ اشیا" بلال کوالٹی" کے نام سے فروخت ہوتی ہیں جو معیاری اور قابلِ اعتماد ہونے کی ضمانت سمجھی جاتی ہیں —

اس ادارے کو فخر ہے کہ پہلی بار اس نے پاکستان میں ہاتھ سے بُننے والی قالینوں میں مشہور و معروف ۲۰ × ۱۰ موری کوالٹی کی بنا ڈالی بلال انڈسٹری میں بننے والی قالینوں میں ملکی اور برآمد شدہ خام اشیا استعمال کی جاتی ہیں - اس کی تیار کردہ قالین نہ صرف مغربی یورپ امریکہ، جاپان اور مشرقِ وسطیٰ بلکہ سوویٹ روس میں بھی برآمد کی جاتی ہیں - کمپنی کو توقع ہے کہ آئندہ برسوں میں اس کی برآمدات میں مزید اضافہ ہو جائے گا - فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری نے ہاتھ سے بُنے ہوئے اونی کارپٹ تیار کرنے پر کمپنی کو ۸۰-۱۹۷۹ء کو "بیسٹ ایکسپورٹ پرفارمینس ٹرافی" دی ہے - ۷۷-۱۹۷۶ء کے بعد سے، جب سے انعامات دینے کا سلسلہ شروع ہوا ہے - بلال کارپٹ انڈسٹریز کو چوتھی بار یہ انعام ملا ہے - یہ انعام کمپنی کی جانب سے اس کے ڈائرکٹر جناب اے - ملک نے گزشتہ دنوں وصول کیا —

بروک بانڈ (پاکستان) لمیٹڈ

بروک بانڈ پاکستان لمیٹڈ اعلیٰ کوالٹی کی چائے تیار کرنے والا ایک مشہور اور مقبول ادارہ ہے - اس کی تیار کردہ اقسام مختلف ناموں سے عوام و خواص میں ذوق و شوق سے استعمال کی جاتی ہیں - خصوصیت کے ساتھ گولڈ لیبل بے حد مقبول ہے —

www.taemeernews.com

علم وادب کے فروغ میں بھی اس ادارے نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس ادارے نے پروفیسر محمد منور، شاعر لکھنوی، اقبال عظیم اور عبدالشکور وغیرہ کی کتابیں مثالی حسن واہتمام سے شایع کر کے جو شہرت اور نیک نامی حاصل ہے وہ پاکستان کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گی۔

اسمتھ کلائن اینڈ فرینچ (پاکستان) لمیٹڈ

اسمتھ کلائن اینڈ فرینچ (پاکستان) لمیٹڈ پاکستان کا مشہور ومستند دواساز ادارہ ہے۔ اس کی تیار کردہ بے شمار ادویات عوام وخواص کی صحت وتندرستی کی ضمانت ہیں۔ آیوڈیکس، اسٹیلا بیڈ، کا ٹیک اور فیفال چند مشہور دوائیں ہیں جنھیں خواتین، مرد اور بچے ڈاکٹروں کے مشورے سے استعمال کرتے ہیں۔

کلورائیڈ پاکستان لمیٹڈ

کلورائیڈ پاکستان لمیٹڈ، اکسائیڈ بیٹری تیار کرنے والا مشہور ومعروف ادارہ ہے جو اس صنعت میں ۹۰ سالہ تجربہ رکھتا ہے۔ اس کی تیار کردہ جینوئن ڈرائی بیٹریاں ہر قسم کی موٹر کاروں کے استعمال میں آتی ہیں کیونکہ یہ پائیدار اور قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ یہ بیٹریاں بین الاقوامی سطح پر تحقیق وتجسس کے بعد تیار کی جاتی ہیں اور کارکردگی میں بے مثال ہیں۔ اکسائیڈ بیٹریاں ملک کے ہر گوشے میں ڈیلروں کے پاس دستیاب ہیں۔ ہر خریدار کو ۱۵ ماہ کی ضمانت دی جاتی ہے۔ نیز بعد از فروخت خدمت کی سہولتیں بھی ڈیلر حضرات مہیا کرتے ہیں۔

لیور برادرس پاکستان لمیٹڈ

لیور برادرس پاکستان لمیٹڈ عوام وخواص کی گھریلو ضروریات کے لیے اعلیٰ درجے کے صابن اور کپڑے دھونے کا پاؤڈر تیار کرتا ہے اس کے تیار کردہ صابنوں میں لکس سپریمیم، رکسونا، لائف بوائے

اور نیا سرف وغیرہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر پاکستان میں تقریباً ہر جگہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

انگلش بسکٹ مینوفیکچررز لمیٹڈ

انگلش بسکٹ مینوفیکچررز لمیٹڈ۔ پیک فرینیز کے نام سے نہایت اعلیٰ قسم کے بسکٹ تیار کرتے ہیں اور عوام وخواص میں یکساں طور پر پسند اور استعمال کیے جاتے ہیں۔

پیک فرینیز کے ارارُوٹ بسکٹ، بٹر پف، پائن ایپل، ڈائجسٹو، لیمن اور وائس کریم، بون بون چاکلیٹ، میری، ناشن، شارٹ کیک، سالٹش اور اسپائسی بسکٹ وغیرہ متنوع لذت، تازگی، خستگی اور اعلیٰ درجے کی پیکنگ کے سبب امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

صدیق سنز انڈسٹریز لمیٹڈ

بہترین اور اعلیٰ قسم کی ترپال، کینوس، موٹر کورز اور ٹینٹس وغیرہ تیار کرنے والا پاکستان کا ایک مشہور ادارہ جس کی تیار کردہ مصنوعات پاکستان میں ہر جگہ مستعمل کی جاتی ہیں اور وسیع پیمانے پر برآمد بھی ہوتی ہیں جس سے ملک کے لیے قیمتی زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ

آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ۔ پاکستان کا ایک قدیم، مشہور اور معتبر صنعتی ادارہ ہے جس کے تحت متعدد صنعتی ادارے ملک وقوم کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں آدم جی کاٹن ملز کے تیار کردہ اعلیٰ قسم کے پارچہ جات پورے ملک میں شہرت رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ گرمیوں کے موسم کے لیے آدم جی کی سمر بریز لان اور شبنم لان بے حد مقبول ہیں۔ یہ پارچہ جات دل کش رنگوں اور ڈیزائنوں میں تیار کیے جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اور استعمال کے دوران ان میں شکنیں نہیں پڑتیں۔ یہ سکڑنے سے بھی محفوظ ہیں۔

آدم جی انڈسٹریز نے پاکستان کی علمی، ادبی اور ثقافتی ترقی کے سلسلے میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور ہر سال کی بہترین ادبی کتابوں پر آدم جی ادبی انعامات دیے جاتے ہیں۔

ایڈ میرل آف نیویارک

ایڈمیرل آف نیویارک کے تیار کردہ برچ کے پرفیوم، کولون اسپرے ۵۵ ساری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں اور نفاست پسند گھرانے اسے ذوق وشوق سے استعمال کرتے ہیں۔

اسپرو۔ نکولس (پاکستان) لمیٹڈ

اسپرو نکولس (پاکستان) لمیٹڈ ملک کا مشہور دواساز ادارہ ہے۔ اس کی تیار کردہ انٹی بایوٹک ادویہ عوام وخواص میں صحت وتندرستی کی ضامن سمجھی جاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اسپرو کی تیار کردہ۔ پیراسیٹامال، سر کے درد، نزلہ، کھانسی اور بخار کی کیفیت میں نہایت زود اثر دوا کی حیثیت رکھتی ہے اور کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔ پیراسیٹامال اب نئی پیکنگ میں جس پر شیر کا نشان ہے پیش کی جارہی ہے۔ کیونکہ بعض جعلی ادارے اس کامیاب دوا کی نقل کرکے عوام کو دھوکا دے رہے تھے۔ اسپرو کی پیراسیٹامال خریدتے وقت شیر کا نشان ضرور دیکھ لیں۔

ایسلو الیکٹریکل انڈسٹریز لمیٹڈ

پاکستان اور ہنگری کے اشتراک سے قایم شدہ ایسلو الیکٹریکل انڈسٹریز لمیٹڈ تقریباً سات کروڑ کے سرمائے سے حب چوکی پر قایم ہوا ہے اور ہنگری اور پاکستان کے باہمی تعاون سے شروع کیا جانے والا یہ پہلا بڑا منصوبہ ہے۔ اس ادارے نے تنگزرم کے بلب سے پاکستانی عوام وخواص کو متعارف کرایا ہے۔ تنگزرم کے بلب کارکردگی میں اپنی آپ مثال ہیں۔ تنگزرم روشنی کی دنیا میں ایک مشہور نام ہے، جس کے پیچھے اُن کا ۸۵ سالہ طویل تجربہ ہے۔ یہ ادارہ ہر قسم کی روشنی کی اشیا تیار کرے گا۔ فی الحال تنگزرم نے بلب فروخت کے لیے پیش کیے ہیں۔ آیندہ ٹیوب لائٹس اور بجلی کا دیگر سامان فروخت کے لیے پیش کیا جائے گا۔

اس ادارے کے سربراہ وامق عزیز زبیری ہیں۔

ہوٹل مڈوے ہاؤس

ہوٹل مڈوے کا شمار کراچی کے ممتاز ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ یہ ہوٹل کراچی ایئرپورٹ کے قریب اسٹار گیٹ سے چند گز کے فاصلے پر واقع ہے، جہاں اعلیٰ درجے کے لذیذ مغربی اور مشرقی کھانوں کے علاوہ چاق وچوبند عملہ ہمیشہ میزبانی کے لیے مستعد رہتا ہے۔ اس ہوٹل کی خصوصیات میں مہمانوں پر انفرادی توجہ کے علاوہ صاف ستھرا گھریلو ماحول بھی، جہاں قیام کے دوران ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے مسافر آسودگی اور طمانیت سے وقت گزارتے ہیں۔

ہوٹل مڈوے میں ۱۸۰ کمروں کے علاوہ ریستوران، اسنیک بار، سوئمنگ پول، سونا، ٹینس کورٹ۔ کانفرنس روم۔ آرٹ گیلری اور بوتیک کا بھی خصوصی انتظام ہے۔ ایئرپورٹ سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ہونے کے باعث فضائی مسافر اس ہوٹل کو ترجیح دیتے ہیں۔

البیوسی ایٹس لیری برو لمیٹڈ۔ انگلینڈ

اس ادارے نے حال ہی میں "شائن" کو وسیع پبلسٹی کے ذریعے پاکستان میں متعارف کرایا ہے۔ اسے لیری بروک آف انگلینڈ نے خصوصی فارمولا سے تیار کیا ہے۔ کپڑے دھونے کا یہ محلول کاسٹک سوڈا جیسے مضر اجزا سے پاک ہے۔ ان کا نعرہ ہے کہ پاؤڈر اور صابن کو بھول جائیے۔ دھلائی کے لیے شائن اپنائیے۔

www.taemeernews.com

پیٹر و مارک لمیٹڈ

پیٹر و مارک لمیٹڈ پٹرولیم کی مصنوعات تیار کرنے والا ایک ممتاز ادارہ ہے۔ اس ادارے کا تیار کردہ نیا ٹی۔ لوڈ واسٹروک انجن آئل اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بے حد مقبول ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے گاڑی کے انجن کی نہ صرف عمر میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ وہ ٹوٹ پھوٹ اور زنگ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور اسپارک پلگ بھی صاف رہتے ہیں ۔۔۔

ولیکا وولن ملز کمپنی لمیٹڈ

قیام پاکستان کے فوراً بعد جس صنعتی ادارے نے سب سے پہلے ملک کے صنعتی میدان میں قدم رکھا ۔ وہ ولیکا ہے۔ ملک میں عظیم صنعتوں کے قیام اور معیشت کے استحکام میں ولیکا کی خدمات ناقابلِ تردید ہیں ۔۔

ولیکا وولن ملز کی تیار کردہ مصنوعات پورے ملک میں اپنی بے مثال خوبیوں کی بنا پر ہر طبقے میں یکساں مقبول ہیں ۔۔

مڈل ایسٹ بنک لمیٹڈ

دوبئی میں عربوں کا اپنا کوئی بنک نہیں تھا اس لیے دوبئی کے روشن خیال حکمراں نے مڈل ایسٹ بنک لمیٹڈ کا قیام ضروری سمجھا۔ یہ بنک العظیم گروپ دوبئی اور مسلم کمرشیل بنک لمیٹڈ کے اشتراک سے ۲۵ راکتوبر ۱۹۷۶ء کو دوبئی میں قایم ہوا۔ اور دو سال بعد یعنی پہلی اگست ۱۹۷۸ء کو یہ بنک کراچی میں قایم ہوا۔ مختصر سے عرصے میں اس بنک نے اپنے دائرۂ کار کو وسعت دی۔ چنانچہ اس وقت اس بنک کی ۱۰ شاخیں متحدہ عرب امارات میں ۳ شاخیں پاکستان میں۔ ایک لندن میں۔ ایک ساؤتھ پیسیفک میں اور ایک شاخ مڈل ایسٹ فائننس انٹرنیشنل لمیٹڈ کے نام سے ہانگ کانگ میں کام کر رہی ہے۔ حال ہی میں اس بنک نے کینیا کے اشتراک سے بھی مڈل ایسٹ بنک کینیا لمیٹڈ کے نام سے بنکاری کا آغاز کر دیا ہے ۔۔

یہ بنک عام بنکاری کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے عرب ملکوں اور پاکستان کے درمیان قومی معیشت کے استحکام اور اقتصادی ترقی اور عوام کی خوش حالی کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے جس سے مسلم ملکوں کو یکساں فوائد حاصل ہو رہے ہیں ۔۔

مسلم کامرشیل بنک لمیٹڈ

مسلم کامرشیل بنک قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے کلکتے میں قایم ہوا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا صدر دفتر ڈھاکہ منتقل ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد کراچی سے اس نے بنکاری کی جدید سہولتیں فراہم کرنے کی ابتدا کی۔ اس وقت اس بنک کی ملک بھر میں ۱۳۴۷ شاخیں اور بیرونِ ملک ۲۵ شاخیں عوام و خواص کی مستعدی سے خدمات انجام دے رہی ہیں۔ صنعت و زراعت کی ترقی کے لیے یہ بنک تمام ممکنہ سہولتیں بہم پہنچاتا ہے ۔۔

۱۹۷۸ء میں مسلم کامرشیل بنک نے مڈل ایسٹ بنک لمیٹڈ کے ساتھ اشتراک و تعاون سے بھی اپنے دائرۂ کار کو کافی وسعت دی ہے ۔۔ ساتھ ہی بلا سود بنکاری اور اسلامی معیشت کے نظام کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں بھی اس بنک کی خدمات ناقابلِ تردید ہیں۔ اس بنک کے موجودہ سربراہ محمد اجمل خلیل ہیں جو بنکاری کا طویل تجربہ رکھتے ہیں ۔۔

قومی بچت کا ادارہ

عرصۂ دراز سے قومی بچت کا ادارہ عوام و خواص کو اُن کی بچائی ہوئی رقوم پر غیر معمولی منافع دے کر ملک

www.taemeernews.com

ہیں، بچت کو عادت بنانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ چنانچہ کئی منافع بخش اسکیمیں اس وقت رائج ہیں۔ جن میں خاص ڈیپازٹ سرٹیفکیٹس۔ خاص ڈیپازٹ اکاؤنٹس (۱۲ فی صد منافع — بلاٹیکس۔ ہر ۶ ماہ میں ادائیگی) ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹس (۲۹ فی صد بلاٹیکس منافع اور ۴۰ فی صد ٹیکس میں بچت) نیشنل ڈیپازٹ سرٹیفکیٹس۔ نیشنل ڈیپازٹ اکاؤنٹ (۲۳ فی صد بلاٹیکس منافع) سیونگز اکاؤنٹ (۱۰ فی صد بلاٹیکس منافع) پریمیم سیونگز سرٹیفکیٹس (۱۲ تا ۱۵ فی صد منافع بلاٹیکس) کے علاوہ پرائز بانڈ کے ذریعے ہر ماہ لاکھوں روپے کے انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بچے، بوڑھے اور جوان سبھی بچت کرکے اور بچت کی مندرجہ بالا اسکیموں میں روپیہ لگا کر بیش از بیش منافع حاصل کرسکتے ہیں۔ قومی معیشت میں استحکام اور اسلامی نظام کی کامیابی بھی ہماری بچت اور منافع بخش کاروبار میں سرمایہ کاری کی رہینِ منت ہے۔ اسی لیے ہم میں سے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور پس انداز کرتے رہنا چاہیے —

سب رنگ ڈائجسٹ

سب رنگ اردو کا مقبول ترین ڈائجسٹ ہے جسے شکیل عادل زادہ ایسے نہایت باصلاحیت، جفاکش اور نئی سوچ رکھنے والے نوجوان ادیب نے شبانہ روز محنت کے بعد پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ شایع ہونے والا ڈائجسٹ بنادیا۔ ملک کے بہترین لکھنے والوں کی بہترین کہانیوں، شوکت صدیقی کے مسلسل ناول "جانگلوس" رنگا رنگ خصوصیات اور منفرد پیش کش کے باعث سب رنگ۔ عوام و خواص میں یکساں مقبول ہے۔ اور یہ بات اردو کے لیے قابلِ فخر ہے۔

ممبران ایڈورٹائزنگ ایسوسی ایشن

(ملک کے ممتاز تشہیری ادارے)

پاکستان ایڈورٹائزنگ ایسوسی ایشن کے حسبِ ذیل ممبران کی فہرست ہم اس سال کے منتخب صدر اے۔ غفور کے شکریے کے ساتھ شایع کر رہے ہیں۔ یہ فہرست انگریزی حروفِ تہجی سے ترتیب دی گئی ہے —

ممبران کراچی

(۱) اڈارٹس۔ کراچی۔ لمیٹڈ (۲) اڈیرا ایڈورٹائزنگ (۳) ایڈگروپ لمیٹڈ (۴) ایڈکو لمیٹڈ (۵) ایڈسیل ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۶) ایڈونچرس (۷) ایڈورٹائزنگ کارپوریشن لمیٹڈ (۸) ایڈورلڈ ٹرسٹرز (۹) ایمسل ایڈورٹائزنگ سروسز (۱۰) آرگس ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ۔ (۱۱) ایشیاٹک ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۱۲) بانڈ ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۱۳) کرسمیڈس لمیٹڈ (۱۴) کریسنٹ کمیونیکیشنز انٹرنیشنل (۱۵) ڈی۔ جے۔ کیمر اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ (۱۶) ایمیرڈ ایڈ ٹریڈ ایجنسی۔ (۱۷) جی۔ ایچ تھادر اینڈ کمپنی (۱۸) جی۔ ایس۔ ایسوسی ایٹس (۱۹) انٹرنیشنل ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۲۰) کیمز ایڈورٹائزنگ اینڈ اسٹوڈیو لمیٹڈ (۲۱) کے۔ ایس۔ کے۔ ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ۔ (۲۲) مینہٹن انٹرنیشنل لمیٹڈ (۲۳) مینہٹن پاکستان لمیٹڈ۔ (۲۴) مارکٹنگ اینڈ ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۲۵) ماس ایڈورٹائزنگ (۲۶) ایم سی ایم ایڈورٹائزنگ (۲۷) ایم این جے کمیونیکیشنز لمیٹڈ (۲۸) منہاترے کمیونیکیشنز لمیٹڈ۔ (۲۹) نیشنل ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۳۰) اورینٹ ایڈورٹائزرس لمیٹڈ (۳۱) آسکر ایڈورٹائزنگ کمپنی (۳۲) پیراگن ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۳۳) پرسٹیج ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ (۳۴) راوی ڈیلین لمیٹڈ (۳۵) آر۔ لنٹاس لمیٹڈ (۳۶) ساسا ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ۔ (۳۷) اسکرین پبلسٹی (۳۸) اسپیکٹرم کمیونیکیشنز لمیٹڈ — (۳۹) اسپاٹ لٹ ایڈورٹائزنگ (۴۰) یونائٹڈ ایڈورٹائزرس

ممبران لاہور

(۴۱) کریسنٹ پبلسٹی سروس (۴۲) مارشل ایڈورٹائزنگ (۴۳) اسکین کمیونیکیشنز لمیٹڈ (۴۴) ایس۔ دی اینڈ کمپنی (۴۵) یونٹی ایڈورٹائزنگ ایجنسی —